Presented by Ziaraat.Com

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں.
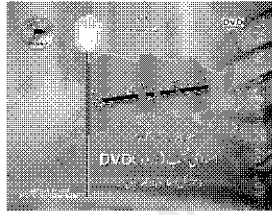
منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

آفرینش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

اُستادِ محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد ۵

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

مصباح القرآن ٹرسٹ

پیشکش: حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب ——— تفسیر نمونہ

جلد ——— ۵

زیر نظر ——— آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

مترجم ——— حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفیؒ

ناشر ——— مصباح القرآن ٹرسٹ

مطبع ——— معراج دین پرنٹرز، لاہور

تاریخ اشاعت ——— ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ

ہدیہ ———

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر

۲۳۔ الفضل مارکیٹ اردو بازار، لاہور

فون: ۷۳۱۴۳۱۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

قارئین محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ ــــ کلام حکیم اور عہد حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغاز کار میں موجودہ دور کی شہرہ آفاق تفسیر ــــ تفسیر نمونہ ــــ کو فارسی سے اردو زبان میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر محسن ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلی اللہ مقامہ، کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونین کی فراخدلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر مشتمل یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ستائیس جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکراً للہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ، کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی "پیام قرآن" از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور "قرآن کا دائمی منشور" از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل یک جلدی قرآن پاک عہد حاضر کے مقبول اردو تراجم کے ساتھ زیر طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں روشن فکر اور جید عالم دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہ کا ترجمۂ "انوار القرآن" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری امت مسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، لہٰذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی

طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہلِ علم کی تجویز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ ستائیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پیدا کی جا سکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیبِ نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں مکمل ہو جائیں لیکن اس میں یہ سُقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سُورتوں کا کچھ حصہ ایک جلد میں اور بقایا حصہ اس سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت سے بچانے کی خاطر اس تفسیر کو سُورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سُورت دو حصوں میں تقسیم نہیں ہو سکے گی اور ہر جلد کسی نہ کسی سورت کی کامل تفسیر پر ختم ہو گی۔ اس طرح پوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں آگئی ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد پنجم آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں سابقہ جلد ہشتم میں سے صفحہ ۱۷ تا ۳۳۲، پوری جلد نہم اور دہم میں سے صفحہ ۲۹ تا ۲۱۲ شامل کیے گئے ہیں، چنانچہ یہ جلد سورۂ یونسؑ، سُورہ ہودؑ، سُورہ یوسفؑ اور سُورہ رعد کی تفسیر پر مشتمل ہے۔

ہم نے زیرِ نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی آراء ہمارے لیے بہتری کا ذریعہ ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیر مردِ مومن الحاج شیخ محمود علی منگلا سے اظہارِ تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعاگو ہیں کہ خدا تعالیٰ بحق معصومینؑ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسلام

اراکین
مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اهداء

"مرکزِ مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو تمام طبقات میں عموماً — اور

نوجوانوں میں خصوصاً

اسلام کی حیات بخش تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا

گیا ہے۔

اس نفیس تالیف کو

ان اہلِ مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو قرآن مجید کے متعلق

بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات

حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

حسن علی مختم

۱۔ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
۲۔ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
۳۔ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے عبدالرسول حسنی
۴۔ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے حسن شجاعی
۵۔ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبداللہی
۶۔ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
۷۔ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

1. تفسیر مجمع البیان — از — مشہور مفسر علامہ طبرسی
2. تفسیر تبیان — از — دانشمند فقید بزرگ شیخ طوسی
3. تفسیر المیزان — از — علامہ طباطبائی
4. تفسیر صافی — از — علامہ محسن فیض کاشانی
5. تفسیر نور الثقلین — از — عبد علی بن جمعہ حویزی
6. تفسیر برہان — از — علامہ سید ہاشم بحرینی
7. تفسیر روح المعانی — از — علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
8. تفسیر المنار — از — محمد رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبدہ۔
9. تفسیر فی ظلال القرآن — از — سید قطب مصری
10. تفسیر قرطبی — از — محمد بن احمد انصاری قرطبی
11. اسباب النزول — از — واحدی (ابو الحسن علی بن متویہ نیشاپوری)
12. تفسیر مراغی — از — احمد مصطفےٰ مراغی
13. تفسیر مفاتیح الغیب — از — فخر رازی
14. تفسیر روح الجنان — از — ابو الفتوح رازی

تفسیر نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اُردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ محسنِ ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہٗ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوندِ کریم مولانا مرحوم کو جوارِ معصومینؑ میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

اس تفسیر میں مدِ نظر اہداف

پوری دُنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان بھی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک - ایران کا اسلامی انقلاب - اور - دُنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی تحریکیں - ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک سطح کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

بالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمۂ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

مذکورہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکارِ علماً میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققینِ اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کرتے ہوئے جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گرہیں کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسّر ....؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسّر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسّر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوتے یا جان بوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسرین اور عالی قدر محققینِ اسلام نے آغازِ اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پرتو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعیھم)۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے وسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریات زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دور کی تفاسیر کو دینا ہوگا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے نا قابل ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کر سکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیش نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہٰذا میں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اپنے ہمقدم اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہو سکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شامل حال ہوئی اور ایسا ثمرہ نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقے نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی جلدیں جو اس وقت تک منظر عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی ویں جلد ہے) بارہا چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیق الٰہی کا میں ازحد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بات میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بارہا یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی[1]

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرض خدمت ہے کہ ہماری ہمیشہ کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلاوطنی کے مقام پر، حتیٰ کہ بستر بیماری پر بھی میں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس طرح سے کام کرنا چاہیے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

---

[1] بعد ازاں تعداد ۲۷ تک جا پہنچی۔ (مترجم)

[2] سابق شاہ ایران محمد رضا کے دور میں حکومت کی طرف سے جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

اس میں ہم آہنگی نہیں ہوگی۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا۔ لیکن پھر اس صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔
(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے)۔

خداوندا!

ہماری آنکھوں کو بینا، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب، کارساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کرسکیں۔

خداوندا!

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنان اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے، اس امت اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کردے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگا لیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں۔

بارالٰہا!

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کرسکیں، اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یکجا مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کرسکیں۔

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے)۔

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ قم۔ ایران

یکم محرم الحرام ۱۴۰۱ ہجری
۱۹-۸-۱۳۵۹ ہجری شمسی

تفسیر نمونہ جلد ۵

فہرست

سورہ یونس

سورہ یوسف — ۴۱۸

سورہ رعد

⁂

تفسیر نمونہ جلد ۵

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں

۱۔ سورہ یونسؑ ۲۔ سورہ ہودؑ ۳۔ سورہ یوسفؑ ۴۔ سورہ رعد

سورۂ یونس: مکی سورت ہے اور اس کی ۱۰۹ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۱۱

سورۂ ھود: مکی سورت ہے اور اس کی ۱۲۳ آیات ہیں۔

پارہ ۱۱ ــــ ۱ تا ۵ پارہ ۱۲ ــــ ۶ تا ۱۲۳

سورۂ یوسف: مکی سورت ہے اور اس کی ۱۱۱ آیات ہیں۔

پارہ ۱۲ ــــ ۱ تا ۵۲ پارہ ۱۳ ــــ ۵۳ تا ۱۱۱

سورۂ رعد: مدنی سورت ہے اور اس کی ۴۳ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۱۳

سورۂ یونس

- مکی ہے۔
- اس کی ۱۰۹ آیات ہیں۔

اس سُورہ کے مضامین اور فضیلت

یہ سورۃ مکی ہے بعض مفسرین کے بقول سورہ بنی اسرائیل کے بعد اور سُورۂ ہود سے پہلے نازل ہوئی۔ دیگر مکی سورتوں کی طرح یہ بھی چند اصولی اور بنیادی مسائل پر مشتمل ہے ان میں سے سب سے اہم مبداء اور معاد کا مسئلہ ہے البتہ پہلے وحی اور مقام پیغمبرؐ کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اس کے بعد عظمتِ آفرینش کی نشانیاں بیان کی گئی ہیں جو کہ عظمتِ خدا کی علامت ہیں۔ بعدازاں لوگوں کو مادی زندگی کی ناپائیداری اور دارِ آخرت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور اس کے لیے ایمان اور عملِ صالح کے ذریعے تیاری پر ابھارا گیا ہے۔ انہی مسائل کی مناسبت سے بزرگ انبیاء کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً حضرت نوح، حضرت موسیٰ اور حضرت یونس علیہم السلام کے تذکرے ہیں۔ اسی حوالے سے سُورہ کا نام سُورۂ یونس رکھا گیا ہے۔

اس کے بعد مذکورہ مباحث کی تائید کے لیے بُت پرستوں کی ہٹ دھرمی اور سخت مزاجی کا ذکر ہے۔ ہر جگہ خدا کا حضور و شہود ان کیلئے ثابت کیا گیا خصوصیت سے اس مسئلہ کے اثبات کے لیے ان کی فطرت کی آگاہی سے مدد لی گئی ہے ——— وہی فطرت کہ جو مشکلات کے وقت ظاہر ہوتی ہے اور وہ خدائے یکتا کو یاد کرتے ہیں۔

آخر میں مندرجہ بالا مباحث کی تکمیل کے لیے بشارت و نذارت کا تذکرہ ہے۔ ہر مناسب مقام پر صالحین کے لیے خدا کی بے انتہا نعمتوں کی بشارت ہے اور سرکشوں کے لیے انذار اور خوف سے استفادہ کیا گیا ہے۔

اسی لیے امام صادق علیہ السّلام سے ایک روایت میں مروی ہے:

من قرء سورة یونس فی کل شهرین او ثلاثه لم یخف علیه ان یکون من الجاهلین وکان یوم القیامة من المقربین۔

جو شخص سورۂ یونس ہر دو یا تین ماہ میں ایک دفعہ پڑھے تو اس کے لیے یہ خوف نہیں کہ وہ جاہلوں میں سے قرار پائے۔ نیز قیامت کے دن وہ مقربین میں سے ہوگا۔[1]

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۲ ص ۲۹۰ اور دیگر تفاسیر

یہ اس بناء پر ہے کہ اس سورہ میں خبردار اور بیدار کرنے والی بہت سی آیات ہیں اور اگر انھیں غور و خوض سے پڑھا جائے تو جہالت کی تاریکی انسانی روح سے دور کر دیتی ہیں اور اس کے اثرات کم از کم چند ماہ تک انسان کے وجود میں رہتا ہے اور اگر سورہ کے مضامین کو سمجھ لینے کے علاوہ ان پر عمل بھی کیا جائے تو یقینی طور پر قیامت کے دن پڑھنے والا مقربین کے زمرہ میں قرار پائے گا۔

شاید یاددہانی کی ضرورت نہ ہو کہ سورتوں کے فضائل جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں، صرف آیات کی تلاوت سے بغیر معانی سمجھے اور بغیر اس کے مضامین پر عمل کیے فراہم نہیں ہوتے۔

کیونکہ

تلاوت سیکھنے کا مقدمہ اور سمجھنا عمل کرنے کی تمہید ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ الٓرٰ ۚ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡحَکِیۡمِ ○

۲۔ اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی رَجُلٍ مِّنۡہُمۡ اَنۡ اَنۡذِرِ النَّاسَ وَ بَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنَّ لَہُمۡ قَدَمَ صِدۡقٍ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ قَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ اِنَّ ہٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیۡنٌ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ ا۔ ل۔ ر۔ وہ کتاب حکیم کی آیات ہیں۔

۲۔ کیا یہ چیز لوگوں کے لیے باعثِ تعجب ہے کہ ان میں سے ایک کی طرف ہم نے وحی بھیجی کہ لوگوں کو ڈراؤ، اور جو ایمان لائے ہیں انھیں بشارت دو کہ ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس مسلّم جزا ہے، مگر کافر کہتے ہیں کہ یہ شخص (پیغمبر اکرمؐ) واضح جادوگر ہے۔

تفسیر

اس سورہ میں پھر ہمیں حروفِ مقطعات کا سامنا ہے اور یہ ہیں الف، لام اور راء۔ سورۂ بقرہ، سورہ آلِ عمران اور سورۂ اعراف کی ابتداء میں ہم ایسے حروف کے بارے میں کافی بحث کر چکے ہیں۔ آئندہ بھی انشاء اللہ اس سلسلے میں مناسب مواقع پر بحث کریں گے، اور اس میں نئے مطالب کا اضافہ کریں گے۔

حروفِ مقطعات کے بعد پہلے آیاتِ قرآن کی عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ کتاب حکیم کی آیات ہیں (تلك ایٰت الکتٰب الحکیم)۔

"یہ" (اسم اشارہ قریب) کی بجائے "وہ" (اسم اشارہ بعید) سے ابتداء کی گئی ہے اس کی نظیر سورہ بقرہ کی ابتداء میں بھی ہے یہ قرآن کریم کی لطیف تعبیرات میں سے شمار ہوتی ہے اور یہ قرآن کے مفاہیم کی عظمت اور بلندی کے لیے کنایہ ہے۔ کیونکہ سامنے

پڑے ہوئے اور عام مطالب کے لیے زیادہ تر اسم اشارہ قریب استعمال کیا جاتا ہے لیکن اہم مطالب جو بلند سطح کے ہوں جو گویا آسمانوں کی بلندی میں ایک افقِ اعلیٰ میں موجود ہیں انھیں اسم اشارہ بعید کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور اتفاق کی بات ہے کہ ہم روزمرہ کی تعبیرات میں بھی ایسی تعبیر استعمال کرتے ہیں مثلاً بعض اشخاص کی عظمت کے اظہار کے لیے "آنجناب" یا "آنحضرت" استعمال کرتے ہیں اگرچہ وہ پاس ہی بیٹھے ہوں لیکن انکساری کے اظہار کے لیے "اینجانب" کہا جاتا ہے۔

آسمانی کتاب یعنی قرآن کی تعریف کے لیے لفظ "حکیم" استعمال کیا گیا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ آیاتِ قرآنی استحکام، نظم و ضبط اور حساب و کتاب کی حامل ہیں اور ہر قسم کے باطل سے، فضول باتوں سے اور ہزل گوئی سے دور ہیں اور قرآن حق کے سوا کچھ نہیں کہتا اور سوائے راہِ حق کے کسی چیز کی دعوت نہیں دیتا۔

اس اشارے کی مناسبت سے جو پہلی آیت میں قرآن مجید میں وحی آسمانی کے لیے ہے دوسری آیت میں رسول اللہؐ کے بارے میں مشرکین کا ایک اعتراض بیان کیا گیا ہے۔ یہ وہی اعتراض ہے جس کا قرآن مجید میں کئی مرتبہ ذکر کیا گیا ہے اس کا تکرار نشاندہی کرتا ہے، کہ مشرکین یہ اعتراض بار بار کیا کرتے تھے اور وہ یہ کہ آسمانی وحی کیوں خدا کی طرف سے ایک انسان پر نازل ہوئی ہے اور عظیم رسالت کی یہ ذمہ داری کسی فرشتے کے ذمہ کیوں نہیں ہوئی۔

ایسے سوالات کے جواب میں قرآن کہتا ہے: کیا لوگوں کے لیے یہ امر باعثِ تعجب ہے کہ ہم نے ان میں سے ایک شخص کی طرف وحی بھیجی ہے (اکان للناس عجباً ان اوحینا الی رجل منھم)۔

درحقیقت ان کے اعتراض کا جواب لفظ "منھم" (ان کی نوع میں سے) کے ذریعہ دیا گیا ہے یعنی اگر رہبر و راہنما اپنے پیروکاروں کا ہم نوع ہو اور ان کے درد اور تکالیف کو جانے اور ان کی ضروریات سے آگاہ ہو تو کوئی تعجب کا مقام نہیں ہے بلکہ تعجب کا مقام تو یہ ہے کہ ان کی نوع میں سے نہ ہو اور ان کی کیفیت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے ان کی رہبری نہ کر سکے۔

اس کے بعد اس آسمانی وحی سے مضمون کا دو چیزوں میں خلاصہ بیان کیا گیا ہے پہلی یہ کہ ہم نے تیری طرف وحی کی "تاکہ لوگوں کو کفر و گناہ کے انجام سے ڈراؤ" (ان انذر الناس)۔ اور دوسرا یہ کہ "صاحبِ ایمان افراد کو بشارت دو کہ ان کے لیے بارگاہِ خدا میں "قدم صدق" ہے (و بشر الذین اٰمنوا ان لھم قدم صدق عند ربھم)۔

"قدم صدق" سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن ان کی پیش کردہ تمام تفاسیر میں سے تین ایسی ہیں جن میں سے ایک تفسیر قابلِ قبول ہے یا پھر تینوں اکٹھی قبول کی جا سکتی ہیں۔

پہلی یہ کہ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ایمان "فطری سابقہ" رکھتا ہے اور حقیقت میں مومنین نے ایمان کو ظاہر کر کے اپنے تقاضائے فطرت کی تصدیق اور تاکید کی ہے (کیونکہ "قدم" کا ایک معنی "سابقہ" ہے) جیسا کہ کہتے ہیں:

لفلان قدم فی الاسلام او قدم فی الحرب۔

یعنی ——— فلاں شخص اسلام یا جنگ میں سابقہ رکھتا ہے۔

دوسری یہ کہ یہ مسئلہ معاد و قیامت اور آخرت کی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ "قدم" کا ایک معنی "مقام" اور "منزلت" بھی ہے (اس مناسبت سے کہ انسان اپنے پاؤں کے ساتھ اپنی منزل میں داخل ہوتا ہے) یعنی صاحب ایمان افراد کے لیے خدا کی بارگاہ میں مسلّماً اور یقیناً مقام و منزلت ہے کہ جسے کوئی چیز متغیر نہیں کر سکتی۔

تیسری یہ کہ "قدم" پیشوا اور رہبر کے معنی میں ہے یعنی مومنین کے لیے سچا پیشوا اور رہبر بھیجا گیا ہے اس آیت کے ذیل میں سنی اور شیعہ تفاسیر میں متعدد روایات میں "قدم صدق" کی تفسیر پیغمبر اکرمؐ کی ذات یا ولایت علیؑ سے کی گئی ہے۔ یہ روایات اس معنی کی مؤید ہیں۔[1]

جیسا کہ ہم نے کہا ہے، ہو سکتا ہے اس تعبیر کا مقصد ان تمام امور کی بشارت دینا ہو۔

آیت کے آخر میں پھر ایک ایسے اتہام کی طرف اشارہ ہے جو مشرکین بار بار رسول اللہ پر باندھتے تھے ارشاد ہوتا ہے، کافر کہتے ہیں کہ یہ شخص واضح جادوگر ہے (قال الکافرون ان ھذا لساحر مبین)۔

لفظ "اِنّ" "لام تاکید" اور صفت "مبین" یہ سب اس تاکید کی علامت ہیں جو وہ اس تہمت کے بارے میں کرتے تھے اور "ھذا" (جو کہ اسم اشارہ قریب ہے) کی تعبیر اس لیے تھی کہ وہ مقام پیغمبرؐ کی تحقیر کریں۔

رہا یہ سوال کہ وہ پیغمبر اکرمؐ کی طرف جادو کی نسبت کیوں دیتے ہیں ۔ تو اس کا جواب واضح ہے کیونکہ آپؐ کی پر اعجاز باتوں، درخشاں منصوبہ جات، روشن قوانین اور دیگر معجزات کا ان کے پاس کوئی اطمینان بخش جواب نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ انہیں خارق عادت اور غیر معمولی ہونے کی وجہ سے جادو قرار دے دیں تاکہ اس طرح وہ سادہ لوح افراد پر جہالت کا پردہ ڈال سکیں۔ رسول اللہؐ کے دشمنوں کی طرف سے ایسی تعبیریں خود اس بات کی دلیل ہیں کہ آپؐ کے کام خارق عادت اور غیر معمولی تھے جو لوگوں کے قلب و نظر کو اپنی طرف جذب کر لیتے تھے۔ خصوصاً ان کا قرآن مجید کو جادو قرار دینا اس بات کا زندہ شاہد ہے کہ وہ اس آسمانی کتاب کی انتہائی قوت جاذبہ سے لوگوں کو روکنے کے لیے اس تہمت کا سہارا لیتے تھے۔

انشاء اللہ متعلقہ آیات کے ذیل میں اس سلسلے میں ہم پھر گفتگو کریں گے۔

---

[1] تفسیر برہان۔ ج ۲ ص ۱۶۹ اور تفسیر قرطبی۔ ج ۵ ص ۳۱۴۵

۳۔ إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۖ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۖ مَا مِن شَفِيعٍ إِلَّا مِن بَعْدِ إِذْنِهِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ○

۴۔ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ إِنَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ○

ترجمہ

۳۔ تمھارا پروردگار وہ خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا اس کے بعد عرش (قدرت) پر برقرار ہوا اور (عالم کے) کام کی تدبیر کی۔ اس کے اذن کے بغیر کوئی شفاعت کرنے والا نہیں، یہ ہے خدا تمھارا پروردگار، پس اس کی پرستش کرو، کیا تم غور نہیں کرتے۔

۴۔ تم سب کی بازگشت اس کی طرف ہے، خدا نے حق وعدہ فرمایا ہے اس نے مخلوق کا آغاز کیا اس کے بعد انھیں پلٹائے گا تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو عادلانہ جزا دے اور جو کافر ہوگئے ہیں ان کے پینے کے لیے جلانے والا مائع اور دردناک عذاب ہے کیونکہ انھوں نے کفر اختیار کیا ہے۔

تفسیر

خداشناسی اور قیامت

وحی اور نبوت کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد، اس سورہ کی ابتدائی آیات میں قرآن تمام انبیاء کی تعلیمات کے دو بنیادی اصولوں یعنی مبداء اور معاد کا رُخ کرتا ہے زیر نظر دو آیات میں ان دو اہم اصولوں کو مختصر اور واضح عبارت میں بیان کیا گیا ہے پہلے فرمایا گیا ہے، تمھارا پروردگار وہی خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا (ان ربکم اللہ الذی خلق السمٰوٰت والارض فی ستۃ ایام)۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں لفظ "یوم" عربی زبان میں اور "روز" فارسی زبان میں اور اسی طرح دوسری زبانوں میں ان کے متبادل الفاظ بہت سے مواقع پر دور کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ ایک دن صاحب استبداد کا دور تھا اور اس دور کے خاتمے پر لوگوں کی نجات اور آزادی کا دور آن پہنچا ہے۔[1]

اس بناء پر مندرجہ بالا جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ پروردگار نے آسمان اور زمین کو چھ ادوار میں پیدا کیا اور چونکہ ان چھ ادوار کے بارے میں ہم پہلے گفتگو کر چکے ہیں لہٰذا یہاں تکرار نہیں کرتے۔[1]

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: خدا نے عالم کو پیدا کرنے کے بعد اس کے امور کی باگ ڈور اپنے دستِ قدرت میں لی (ثم استوی علی العرش)۔

تمام کام اس کے فرمان سے ہوتے ہیں اور تمام چیزیں اس کے قبضۂ تدبیر میں ہیں (یدبر الامر)۔

لفظ "عرش" بعض اوقات چھت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی اس چیز کے معنی میں بولا جاتا ہے جو چھت رکھتی ہو اور بعض اوقات یہ اونچے پاؤں والے تخت کے معنی میں آتا ہے اس کا اصلی معنی ہے "قدرت" مثلاً ہم کہتے ہیں فلاں شخص تخت پر بیٹھا یا اس کے تخت کے پائے گر گئے یا اسے تخت سے اتار دیا گیا۔ یہ سب اقتدار حاصل کرنے یا اقتدار کھو دینے کے لیے کنایہ ہیں حالانکہ ہو سکتا ہے، تخت اصلاً ہو ہی نہیں۔ لہٰذا "استوی علی العرش" کے معنی ہیں خدا نے امورِ عالم کی باگ ڈور اپنے دستِ قدرت میں لی۔[2]

"تدبیر" "تدبیر" کے مادہ سے مشتق ہے اور در اصل "دبر" (بروزن "ابر") کسی چیز کے پیچھے اور انجام کے معنی میں ہے اس بناء پر "تدبیر" کاموں کے انجام کی تحقیق کرنے اور مصالح کو منظم کر کے ان کے مطابق عمل کرنے کے معنی میں ہے۔

جب یہ واضح ہو گیا کہ خالق اللہ ہے اور عالم ہستی کو وہی چلاتا ہے اور تمام امور کی تدبیر اس کے فرمان سے ہوتی ہے واضح ہے کہ بے جان، عاجز اور ناتواں بتوں کا انسانوں کی سرگزشت میں کوئی اثر نہیں ہے اس لیے بعد والے جملے میں فرمایا گیا ہے: اس کے اذن کے بغیر کوئی شفاعت کرنے والا نہیں (ما من شفیع الا من بعد اذنہ)۔[3]

جی ہاں ---- حقیقت یہی ہے کہ اللہ تمہارا پروردگار ہے لہٰذا اسی کی پرستش کرو نہ کہ اس کے غیر کی (ذٰلکم اللہ ربکم فاعبدوہ)۔

کیا اس واضح دلیل سے تم متذکر اور متوجہ نہیں ہوتے (افلا تذکرون)۔

جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، بعد والی آیت میں معاد اور قیامت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں یہ مسئلہ، اس کی دلیل اور اس کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔

---

[1] ، [1] مزید تشریح اور اس سلسلے میں عربی فارسی مثالوں کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۴ سورۂ اعراف کی آیہ ۵۴ کے ذیل ہی رجوع کریں۔

[2] زیادہ وضاحت اور "عرش" کے مختلف معانی سے باخبر ہونے کے لیے تفسیر نمونہ ج ۲ ص ۱۳۳ (اردو ترجمہ) اور ج ۱ ص ۵۹۸ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

[3] شفاعت جیسے اہم مسئلہ پر ہم بحث پہلے ہی کر چکے ہیں اس کے لیے جلد اول ص ۱۸۳ (اردو ترجمہ) اور جلد اول ص ۵۹۵ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

پہلے قرآن کہتا ہے، تم سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے (الیہ مرجعکم جمیعًا)۔
اس کے بعد تاکیداً فرمایا گیا ہے: یہ خدا کا قطعی وعدہ ہے (وعد اللہ حقًا)۔
بعد ازاں اس کی دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: خدا نے خلقت کی ابتداء کی اور پھر اس کی تجدید کرے گا (انہ یبدؤ الخلق ثم یعیدہ) یعنی جو لوگ معاد اور قیامت کے بارے میں شک کرتے ہیں انھیں آغاز خلقت کے بارے میں غور و فکر کرنا چاہیے۔ خدا جس نے دنیا کو ابتداء میں ایجاد کیا ہے وہ اسے دوبارہ پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہے یہ استدلال ایک دوسری شکل میں سورۂ اعراف آیہ ۲۹ میں ایک مختصر سے جملے میں بیان ہوا ہے اس کی تفصیل سورۂ اعراف کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔
قیامت اور معاد سے مربوط آیات نشاندہی کرتی ہیں کہ مشرکین اور مخالفین کے شک کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ انھیں ایسی چیز کے امکان میں شک تھا اور وہ تعجب سے سوال کرتے تھے کہ کیا یہ بوسیدہ اور خاک بنی ہوئی ہڈیاں دوبارہ لباس حیات پہنیں گی اور اپنی پہلی شکل میں پلٹ آئیں گی۔
اسی لیے قرآن نے بھی اس مسئلہ کے امکان پر انگلی رکھی ہے اور کہتا ہے: اس ذات کو فراموش نہ کرو جو اس جہان کو از سر نو سازو سامان بخشے گا اور مردوں کو زندہ کرے گا کیونکہ وہی آفریدگار ہے جس نے آغاز میں بھی کام کیا تھا۔
اس کے بعد معاد کے مقصد کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ اس بناء پر ہے کہ خدا ایسے افراد کو جو ایمان لائے ہیں اور انھوں نے نیک اعمال انجام دیئے ہیں انھیں عادلانہ جزا اور بدلہ دے۔ بغیر اس کے کہ ان کا کوئی چھوٹا سا عمل بھی لطف و رحمت کی نظر سے مخفی رہے اور اجر و ثواب کے بغیر رہ جائے (لیجزی الذین اٰمنوا و عملوا الصّٰلحٰت بالقسط)۔
"اور وہ لوگ کہ جنہوں نے کفر اور انکار کا راستہ طے کیا ہے اور پھر فطری طور پر ان کا کوئی نیک عمل بھی نہ تھا (کیونکہ اچھے عمل کی جڑ اچھا عقیدہ ہے) ان کے لیے دردناک سزا ہے۔ ان کے پینے کے لیے گرم اور جلانے والا پانی ہے اور ان کے کفر کی وجہ سے عذاب الیم ان کے انتظار میں ہے (والذین کفروا لھم شراب من حمیم وعذاب الیم بما کانوا یکفرون)۔

دو قابلِ توجہ نکات

۱۔ "الیہ مرجعکم جمیعًا" کا مفہوم: اگرچہ خدا کے لیے مکان و محل نہیں ہے۔ اس کے باوجود اس جہان میں ہر جگہ ہے اور ہم سے ہماری نسبت زیادہ قریب ہے۔ اس امر کے سبب مفسرین نے زیرِ نظر آیت میں "الیہ مرجعکم جمیعًا" اور قرآن کی ایسی دیگر آیات کی مختلف تفسیریں کی ہیں۔
کبھی کہا جاتا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ثواب اور جزا کی طرف پلٹ جائیں گے۔
نیز شاید بعض جاہل افراد اسے قیامت میں خدا کے مجسم ہونے کی دلیل سمجھیں کہ جس عقیدہ کا بطلان اس قدر واضح ہے کہ محتاجِ بیان نہیں لیکن ــــــ جو کچھ آیاتِ قرآن میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ عالمِ حیات ایسے کارواں کی طرح ہے جو جہانِ عدم سے چلا ہے اور اپنے لامتناہی سفر اور گردش میں لامتناہی کی طرف ہی آگے بڑھ رہا ہے جو کہ خدا کی ذاتِ پاک ہے اگرچہ مخلوق محدود ہے اور محدود کبھی لامتناہی (INFINITE) نہیں ہوتا پھر بھی اس کا سفر تکامل نہیں رکتا۔ یہاں تک کہ قیامِ قیامت کے بعد بھی یہ

پرورش میں عمدہ اور بنیادی کردار ادا کرتا ہے اصولی طور پر ہر حرکت و جنبش جو کرۂ زمین میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ ہواؤں کے چلنے میں دریاؤں کی موجوں میں، نہروں کی لہروں میں اور آبشاروں کی روانی میں، اگر صحیح طور پر غور و فکر کیا جائے تو یہ نور آفتاب کی برکت ہے اور اگر کسی دن یہ حیات بخش شعاعیں ہمارے کرۂ خاکی سے منقطع ہو جائیں تو قلیل عرصے میں تاریکی، سکوت اور موت تمام جگہوں پر چھا جائے۔

چاند اپنے خوبصورت نور کے ساتھ ہماری تاریک راتوں کا چراغ ہے۔ ماہ تاباں نہ صرف بیابانوں میں رات کے مسافروں کی رہبری کرتا ہے بلکہ اس کی مناسب اور ملائم روشنی سارے کرۂ ارضی کے رہنے والوں کے لیے سکون و آرام اور نشاط و مسرت کا باعث ہے۔

اس کے بعد چاند کے وجود کے ایک اور مفید اثر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا نے اس کے لیے کئی منزلیں مقرر کی ہیں تاکہ وہ اپنے برسوں کی تعداد اور زندگی کے حسابات جان سکیں (وقدره منازل لتعلموا عدد السنين والحساب)۔

یعنی اگر تم دیکھتے ہو کہ پہلی رات میں چاند ایک باریک سا ہلال ہوتا ہے اور پھر ہر روز بڑھتا رہتا ہے، تقریباً آدھے مہینے تک یوں ہی بڑھتا چلا جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ کم ہوتا جاتا ہے یہاں تک مہینے کے آخری ایک دو دن میں محاق[1] کی تاریکی میں ڈوب جاتا ہے اور پھر دوبارہ ہلال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور اپنی پہلی منزلوں کو طے کرتا ہے تو یہ تبدیلی عبث اور فضول نہیں ہے بلکہ یہ ایک بہت ہی دقیق اور زندہ طبیعی تقویم[2] ہے جسے عالم و جاہل پڑھ سکتے ہیں اور اس سے اپنے امور حیات کا حساب رکھ سکتے ہیں اور روشنی کے علاوہ ہمارے لیے چاند کا یہ ایک اور فائدہ ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ منظومہ کی یہ آفرینش و گردش بغیر سوچے سمجھے اور کھیل کود کے لیے نہیں ہے "خدا نے انہیں صرف حق کے ساتھ پیدا کیا ہے" (ما خلق الله ذلك الا بالحق)۔

آیت کے آخر میں تاکیداً فرمایا گیا ہے: خدا سمجھنے والوں کے لیے اپنی نشانیاں شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتا ہے (یفصل الآيات لقوم يعلمون)۔

باقی رہے بے خبر و بے بصر تو وہ بارہا خدا کی ان نشانیوں کے پاس سے گزر جاتے ہیں لیکن ان سے کچھ نہیں سمجھتے۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ آسمان و زمین میں اپنے وجود کی کچھ مزید نشانیاں اور دلائل بیان کرتا ہے، فرماتا ہے: رات دن کے آنے جانے میں اور جو کچھ خدا نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا اس میں پرہیزگاروں کے لیے نشانیاں ہیں (ان فی اختلاف الليل والنهار وما خلق الله في السموت والارض لأيات لقوم يتقون)۔

نہ صرف آسمان و زمین خدا کی نشانیاں ہیں بلکہ موجودات کے تمام ذرات جو ان میں موجود ہیں ہر کوئی ایک نشانی ہے لیکن انہیں

---

[1] چاند کا گھٹنا، چاند کی وہ آخری تین تاریخیں جن میں وہ نظر نہیں آتا۔ ہندی میں اسے اداس کہتے ہیں۔ (مترجم)

[2] اس بارے میں کہ چاند ایک فطری تقویم ہے، اس کے مختلف حالات سے مہینے کے دنوں کو طور و طریق سے معین کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم تفسیر نمونہ جلد اول ص ۴۴۲ (اردو ترجمہ) پر بحث کر چکے ہیں۔

پہلے قرآن کہتا ہے، تم سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے (الیه مرجعکم جمیعًا)۔
اس کے بعد تاکیداً فرمایا گیا ہے، یہ خدا کا قطعی وعدہ ہے (وعد الله حقًا)۔
بعد ازاں اس کی دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: خدا نے خلقت کی ابتداء کی اور پھر اس کی تجدید کرے گا (انه یبدؤا الخلق ثم یعیده) یعنی جو لوگ معاد اور قیامت کے بارے میں شک کرتے ہیں انھیں آغازِ خلقت کے بارے میں غور و فکر کرنا چاہیے۔ خدا جس نے دنیا کو ابتداء میں ایجاد کیا ہے وہ اسے دوبارہ پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہے یہ استدلال ایک دوسری شکل میں سورۂ اعراف آیہ ۲۹ میں ایک مختصر سے جملے میں بیان ہوا ہے اس کی تفصیل سورۂ اعراف کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔
قیامت اور معاد سے مربوط آیات نشاندہی کرتی ہیں کہ مشرکین اور مخالفین کے شک کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ انھیں ایسی چیز کے امکان میں شک تھا اور وہ تعجب سے سوال کرتے تھے کہ کیا یہ بوسیدہ اور خاک بنی ہوئی ہڈیاں دوبارہ لباسِ حیات پہنیں گی اور اپنی پہلی شکل میں پلٹ آئیں گی۔
اسی لیے قرآن نے بھی اس مسئلہ کے امکان پر انگلی رکھی ہے اور کہتا ہے: اس ذات کو فراموش نہ کرو جو اس جہان کو از سرِ نو ساز و سامان بخشے گا اور مردوں کو زندہ کرے گا کیونکہ وہی آفریدگار ہے جس نے آغاز میں یہی کام کیا تھا۔
اس کے بعد معاد کے مقصد کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ اس بناء پر ہے کہ خدا ایسے افراد کو جو ایمان لائے ہیں اور انھوں نے نیک اعمال انجام دیے ہیں انھیں عادلانہ جزا اور بدلہ دے۔ نیز اس لیے کہ ان کا کوئی چھوٹا سا عمل بھی لطف و رحمت کی نظر سے مخفی نہ رہے اور اجر و ثواب کے بغیر رہ جائے (لیجزی الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت بالقسط)۔
"اور وہ لوگ کہ جنھوں نے کفر اور انکار کا راستہ طے کیا ہے اور پھر فطری طور پر ان کا کوئی نیک عمل بھی نہ تھا (کیونکہ اچھے عمل کی جڑ اچھا عقیدہ ہے) ان کے لیے دردناک سزا ہے۔ ان کے پینے کے لیے گرم اور جلانے والا پانی ہے اور ان کے کفر کی وجہ سے عذابِ الیم ان کے انتظار میں ہے (والذین کفروا لهم شراب من حمیم وعذاب الیم بما کانوا یکفرون)۔

دو قابلِ توجہ نکات

۱۔ "الیه مرجعکم جمیعًا" کا مفہوم: اگرچہ خدا کے لیے مکان و محل نہیں ہے۔ اس کے باوجود اس جہان میں وہ ہر جگہ ہے اور ہم سے ہماری نسبت زیادہ قریب ہے۔ اس امر کے سبب مفسرین نے زیرِ نظر آیت میں "الیه مرجعکم جمیعًا" اور قرآن کی ایسی دیگر آیات کی مختلف تفسیریں کی ہیں۔
کبھی کہا جاتا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ثواب اور جزا کی طرف پلٹ جائیں گے۔
نیز شاید بعض جاہل افراد اسے قیامت میں خدا کے مجسم ہونے کی دلیل سمجھیں کہ جس عقیدہ کا بطلان اس قدر واضح ہے کہ محتاجِ بیان نہیں لیکن ——— جو کچھ آیاتِ قرآن میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ عالمِ حیات ایسے کارواں کی طرح ہے جو جہانِ عدم سے چلا ہے اور اپنے لاانتہائی سفر اور گردش میں لاانتہائی کی طرف ہی آگے بڑھ رہا ہے جو کہ خدا کی ذاتِ پاک ہے اگرچہ مخلوق محدود ہے اور محدود کبھی لاانتہائی (INFINITE) نہیں ہوتا پھر بھی اس کا سفرِ تکامل نہیں رکتا۔ یہاں تک کہ قیامِ قیامت کے بعد بھی یہ

سیر تکامل جاری و ساری رہے گی (جیسا کہ ہم نے معاد کی بحث میں اس کی تشریح کی ہے)[1]

قرآن کہتا ہے:

یا ایها الانسان انک کادح الی ربک کدحا۔

اے انسان! تو سعی و کوشش کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہے۔

نیز کہتا ہے:

یا ایتها النفس المطمئنة ارجعی الی ربک

اے وہ روح کہ جو ایمان اور عمل صالح کے ذریعے سکون و اطمینان کی سرحد تک پہنچ گئی ہے، اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آ۔

اس تحریک کی ابتداء خدا کی طرف سے ہوتی ہے اور زندگی کا پہلا شعلہ اسی کی طرف سے ظاہر ہوا ہے نیز یہ ارتقائی سفر اور حرکت اسی کی طرف ہے جسے "رجوع" اور "بازگشت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

المختصر ایسی تعبیریں علاوہ اس کے کہ موجودات کی خدا کی طرف عمومی حرکت کی طرف اشارہ ہیں اس حرکت کے مقصد کو بھی مشخص کرتی ہیں اور وہ اس کی پاک ذات ہے۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ لفظ "الیہ" مقدم ہے اور اس کا مقدم ہونا انحصار کی دلیل ہے واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کی ارتقائی اور تکاملی حرکت کا مقصد اس کی پاک ذات کے علاوہ کوئی وجود نہیں ہو سکتا نہ بت اور نہ ہی کوئی اور مخلوق۔ کیونکہ یہ سب چیزیں محدود ہیں اور انسان کی راہ غیر محدود ہے۔

۲۔ "قسط" کا مفہوم: "قسط" لغت میں دوسرے کا حصہ ادا کرنے کے معنی میں ہے لہٰذا اس میں انصاف کا مفہوم چھپا ہوا ہے یہ بات جاذب نظر ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں یہ لفظ صرف ان افراد کے لیے بولا گیا ہے جو عمل صالح بجا لاتے ہیں اور اچھی جزا پاتے ہیں لیکن بدکاروں کی سزا کے ذکر میں یہ لفظ نہیں آیا کیونکہ عذاب اور سزا میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ بالفاظ دیگر "قسط" صرف نیک جزا کیلئے مناسب ہے، سزا کے لیے مناسب نہیں ہے۔

---

[1] زیادہ وضاحت کے لیے کتاب "معاد و جہان پس از مرگ" کی طرف رجوع کریں۔

۵۔ هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ○

۶۔ إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَّقُونَ ○

ترجمہ

۵۔ وہ وہ ہے کہ جس نے سورج کو روشنی اور چاند کو نور قرار دیا ہے اور اس کے لیے منزلیں مقرر کی ہیں تاکہ تم برسوں کی تعداد اور (کاموں کا) حساب جان لو۔ خدا نے اسے سوائے حق کے پیدا نہیں کیا۔ وہ (اپنی) آیات صاحبانِ علم کے لیے تفصیل و تشریح کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

۶۔ مسلّم ہے کہ رات اور دن کے آنے جانے میں اور ان چیزوں میں کہ جنھیں خدا نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے، ان لوگوں کے لیے آیات (اور نشانیاں) ہیں جو پرہیزگار ہیں (اور گناہ نے ان کے دل کی آنکھ کو اندھا نہیں کر دیا)۔

تفسیر

عظمتِ الٰہی کی نشانیاں

گزشتہ آیات میں مبدا اور معاد کے مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا تھا لیکن ان آیات کے بعد ان دو اصولی مسائل کو شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے کیونکہ یہ مسائل دعوتِ انبیاء کے اہم ترین ارکان میں۔ بالفاظِ دیگر آنے والی آیات گزشتہ آیات کی نسبت تفصیلی ہیں۔

زیرِ نظر پہلی آیت میں جہانِ آفرینش میں عظمتِ خدا کی نشانیوں کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ وہ ہے کہ جس نے سورج کو ضیاء اور چاند کو نور قرار دیا (ھو الذی جعل الشمس ضیاء و القمر نورًا)۔

سورج اپنے عالمگیر نور سے نہ صرف موجودات کے وجود کو گرم کرتا اور روشنی بخشتا ہے بلکہ سبزہ زاروں کی نشوونما اور جانوروں کی

پرورش میں مدد اور بنیادی کردار ادا کرتا ہے اصولی طور پر ہر حرکت و جنبش جو کرۂ زمین میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ ہواؤں کے چلنے میں دریاؤں کی موجوں میں، نہروں کی لہروں میں اور آبشاروں کی روانی میں، اگر صحیح طور پر غور و فکر کیا جائے تو یہ نورِ آفتاب کی برکت ہے اور اگر کسی دن یہ حیات بخش شعاعیں ہمارے کرۂ خاکی سے منقطع ہو جائیں تو قلیل عرصے میں تاریکی، سکوت اور موت تمام جگہوں پر چھا جائے۔

چاند اپنے خوبصورت نُور کے ساتھ ہماری تاریک راتوں کا چراغ ہے۔ ماہِ تاباں نہ صرف بیابانوں میں رات کے مسافروں کی رہبری کرتا ہے بلکہ اس کی مناسب اور ملائم روشنی سارے کرۂ ارضی کے رہنے والوں کے لیے سکون و آرام اور نشاط و مسرت کا باعث ہے۔

اس کے بعد چاند کے وجود کے ایک اور مفید اثر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا نے اس کے لیے کئی منزلیں مقرر کی ہیں تاکہ وہ اپنے برسوں کی تعداد اور زندگی کے حسابات جان سکیں (وقدرہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب)۔

یعنی اگر تم دیکھتے ہو کہ پہلی رات میں چاند ایک باریک سا ہلال ہوتا ہے اور پھر ہر روز بڑھتا رہتا ہے، تقریباً آدھے مہینے تک پورا بڑھتا چلا جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ کم ہوتا جاتا ہے یہاں تک مہینے کے آخری ایک دو دن میں محاق[1] کی تاریکی میں ڈوب جاتا ہے اور پھر دوبارہ ہلال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور انہی پہلی منزلوں کو طے کرتا ہے تو یہ تبدیلی عبث اور فضول نہیں ہے بلکہ یہ ایک بہت ہی دقیق اور زندہ طبیعی تقویم[2] ہے جسے عالم و جاہل پڑھ سکتے ہیں اور اس سے اپنے امورِ حیات کا حساب رکھ سکتے ہیں اور روشنی کے علاوہ ہمارے لیے چاند کا یہ ایک اور فائدہ ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ مہرومہ کی یہ آفرینش و گردش بغیر سوچے سمجھے اور کھیل کود کے لیے نہیں ہے "خدا نے انہیں صرف حق کے ساتھ پیدا کیا ہے" (ما خلق اللہ ذٰلک الا بالحق)۔

آیت کے آخر میں تاکیداً فرمایا گیا ہے: خدا سمجھنے والوں کے لیے اپنی نشانیاں شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتا ہے (یفصل الاٰیات لقوم یعلمون)۔

باقی رہے بے خبر و بے بصر تو وہ بارہا خدا کی ان نشانیوں کے پاس سے گزر جاتے ہیں لیکن ان سے کچھ نہیں سمجھتے۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ آسمان و زمین میں اپنے وجود کی کچھ مزید نشانیاں اور دلائل بیان کرتا ہے، فرماتا ہے: رات دن کے آنے جانے میں اور جو کچھ خدا نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا اس میں پرہیزگاروں کے لیے نشانیاں ہیں (ان فی اختلاف اللیل والنھار وما خلق اللہ فی السمٰوٰت والارض لاٰیات لقوم یتقون)۔

نہ صرف آسمان و زمین خدا کی نشانیاں ہیں بلکہ موجودات کے تمام ذرات جو ان میں موجود ہیں ہر کوئی ایک نشانی ہے لیکن انھیں

---

[1] چاند کا گھٹنا، چاند کی وہ آخری تین تاریخیں جن میں وہ نظر نہیں آتا۔ ہندی میں اسے اداس کہتے ہیں۔ (مترجم)

[2] اس بارے میں کہ چاند ایک فطری تقویم ہے، اس کے مختلف حالات سے مہینے کے دنوں کو خود و خوض سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم تفسیر نمونہ جلد اوّل صفحہ ۴۶۲ (اردو ترجمہ) پر بحث کر چکے ہیں۔

صرف وہی لوگ سمجھ جاتے ہیں جنھوں نے تقوٰی اور گناہ سے پرہیز کے سائے میں روح کی پاکیزگی اور روشن بینی حاصل کی ہے کہ جو حقیقت اور جمال کا مشاہدہ کر سکتے ہیں ۔

چند اہم نکات

۱۔ ضیاء اور نور میں فرق : اس سلسلے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے ۔

بعض دونوں کو مترادف اور ہم معنی سمجھتے ہیں ۔

بعض کہتے ہیں کہ ضیاء جو مندرجہ بالا آیت میں سورج کی روشنی کے لیے استعمال ہوا ہے وہ قوی اور طاقتور نور ہے لیکن لفظ "نور" جو چاند کے بارے میں آیا ہے، کمزور نور کے معنی میں ہے ۔

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ "ضیاء" ذاتی طور پر نور کے معنی میں ہے لیکن نور ایک عام مفہوم رکھتا ہے جو ذاتی اور دوسرے سے حاصل کردہ دونوں کے لیے ہے ۔ اس صورت میں مندرجہ بالا آیت میں تعبیر کا فرق اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے سورج کو نور پھوٹنے کا منبع قرار دیا ہے جبکہ چاند کا نور دوسرے سے حاصل کردہ ہے اور اس کا سرچشمہ سورج ہے ۔

قرآن کی کچھ اور آیات کی طرف توجہ کرنے سے یہ فرق زیادہ واضح طور پر دکھائی دیتا ہے ۔

سورۂ نوح کی آیہ ۱۶ میں ہے :

وجعل القمر فیھن نورًا وجعل الشمس سراجًا

ان میں سے چاند کو نور اور سورج کو چراغ قرار دیا ہے ۔

سورۂ فرقان آیہ ۶۱ میں ہے :

وجعل فیھا سراجًا و قمرًا منیرًا ۔

اور اس میں چراغ اور روشنی دینے والا چاند قرار دیا ہے ۔

اور اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "سراج" (یعنی چراغ) اپنی طرف سے نور برساتا ہے اور وہ نور کا منبع اور سرچشمہ ہے اور سورج کو مندرجہ بالا دو آیات میں چراغ سے تشبیہ دی گئی ہے واضح ہوجاتا ہے کہ زیر بحث آیات میں بھی یہ فرق بہت ہی مناسب معلوم ہوتا ہے ۔

۲۔ "ضیاء" جمع ہے یا مفرد : اس سلسلے میں اہل ادب اور اہل لغت میں اختلاف ہے ۔ مؤلف قاموس کی طرح بعض نے اسے مفرد سمجھا ہے لیکن زجاج کی طرح بعض دوسرے افراد نے "ضیاء" کو "ضوء" کی جمع قرار دیا ہے ۔ تفسیر المنار اور تفسیر قرطبی کے مؤلفین نے بھی دوسرا معنی قبول کیا ہے ۔

خصوصاً المنار کے مؤلف نے اسی بنیاد پر آیت سے بہت استفادہ کیا ہے ۔ وہ کہتا ہے :

سورج کے نور کے بارے میں قرآن میں "ضیاء" کا جمع کی صورت میں ذکر اس چیز کی طرف اشارہ ہے جسے اس زمانہ کی سائنس نے کئی صدیوں کے بعد ثابت کیا ہے ۱

سورج کا نور سات انوار سے مرکب ہے یا دوسرے لفظوں میں سات
رنگوں میں سے وہی رنگ جو قوس قزح میں اور بلوریں سوراخوں سے گزرتے
ہوئے روشنی میں نظر آتے ہیں۔

لیکن یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ چاند کا نور اگرچہ ضعیف ہے پھر بھی کیا مختلف رنگوں سے مرکب نہیں ہے؟

۲۔ "قدرہ منازل" کی ضمیر: "قدرہ منازل" (اس کے لیے کئی منزلیں مقرر کیں) کی ضمیر کا مرجع صرف چاند ہے یا یہ چاند اور سورج دونوں کی طرف اشارہ ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض کا نظریہ ہے کہ یہ ضمیر اگرچہ مفرد ہے پھر بھی دونوں کی طرف لوٹتی ہے۔ ایسی تعبیریں عربی ادب میں بہت ہیں۔ اس نظریے کا انتخاب اس بنیاد پر کیا گیا ہے کہ صرف چاند ہی کی نہیں بلکہ سورج کی بھی منزلیں ہیں اور وہ ہر وقت کسی مخصوص برج میں ہوتا ہے۔ برجوں کا یہی اختلاف تاریخ اور شمسی مہینوں کے بننے کی بنیاد ہے۔

لیکن انصاف یہ ہے کہ آیت کا ظہور نشاندہی کرتا ہے کہ یہ ضمیر مفرد صرف "قمر" کی طرف لوٹتی ہے جو اس کے قریب ہے اور اس میں بھی ایک نکتہ ہے ——— کیونکہ:

وہ مہینے کہ جنہیں اسلام میں قانونی طور پر قبول کیا گیا ہے، قمری مہینے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ چاند ایک متحرک کرہ ہے اور اس کی کئی منزلیں ہیں لیکن سورج نظام شمسی کے وسط میں ہے اور اس نظام میں اس کی کوئی حرکت نہیں۔

باقی رہا برجوں کا اختلاف اور بارہ فلکی برجوں میں سورج کی سیر کہ جو حمل سے شروع ہو کر حوت پر جا کر ختم ہوتی ہے تو وہ سورج کی حرکت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ زمین کی چاند کے گرد حرکت کی وجہ سے ہے اور زمین کی یہ گردش سبب بنتی ہے کہ ہم سورج کو ہر مہینے میں بارہ آسمانی برجوں میں سے ایک میں دیکھتے ہیں۔ لہٰذا سورج کی مختلف منزلیں نہیں ہیں بلکہ صرف چاند ہی کی منزلیں ہیں۔

(غور کیجیے گا)

مندرجہ بالا آیت درحقیقت ایک علمی مسئلے کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جو آسمانی کرات سے مربوط ہے۔ اس زمانے میں یہ بات نوع بشر کے علم کی نگاہ سے پوشیدہ تھی اور وہ یہ کہ چاند حرکت کرتا ہے لیکن سورج حرکت نہیں رکھتا۔

۳۔ رات دن کا آنا جانا: زیر نظر آیت میں رات دن کے آنے جانے کو خدا کی ایک نشانی شمار کیا گیا ہے اور یہ اس بنا پر ہے کہ اگر سورج کی روشنی ایک ہی طرح مسلسل زمین پر پڑتی رہتی تو یقیناً زمین کا درجہ حرارت اتنا بڑھ جاتا کہ وہ زندگی گزارنے کے قابل نہ رہتی (جیسے چاند پر جانے والوں کی اطلاعات ہیں کہ اس کے دنوں میں زمین کے دن اور شب سے بہت زیادہ ہے) اور اگر اسی طرح رات مسلسل جاری رہتی تو تمام چیزیں سردی کی شدت سے خشک ہو جاتیں (جیسا کہ چاند کی طویل راتیں ہیں) لیکن خدا نے ان دونوں کو یکے بعد دیگرے قرار دیا ہے تاکہ زندگی کرۂ ارض پر باقی رہ سکے۔[1]

مدد، حساب، تاریخ، سال اور مہینہ کا انسانی نظام حیات، اس کے معاشرتی روابط اور کام کاج پر اثر سب پر واضح ہے۔

---

[1] جلد اول تفسیر نمونہ صفحہ ۲۵ (اردو ترجمہ) اور جلد دوم صفحہ ۳۳۵ (اردو ترجمہ) پر بھی اس کے بارے میں وضاحت کی جا چکی ہے۔

۵۔ **تقویم اور تاریخ کا مسئلہ:** مندرجہ بالا آیت میں تقویم اور تاریخ کے حساب کے جس مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ انسانی زندگی کے اہم ترین مسائل میں سے ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ کسی نعمت کی اہمیت اس وقت واضح ہوتی ہے جب زندگی کو اس کے بغیر دیکھیں اگر ہم اس حوالے سے غور کریں کہ اگر تاریخ (DATE) (جو کہ دنوں، مہینوں اور سالوں کا امتیاز کرتی ہے) انسانی زندگی سے ہٹا دی جائے مثلاً ہفتے کے دن واضح نہ ہوں، نہ مہینے کا حساب ہو اور نہ سال کا حساب ہو تو تمام تجارتی و اقتصادی معاملات، تمام معاہدے اور مدت کے تعین کا نظام درہم برہم ہو جائے اور کسی کام میں نظم وضبط برقرار نہ رہے یہاں تک کہ کھیتی باڑی، سرمایہ کاری اور کارخانوں کی حالت بھی ہرج مرج کا شکار ہو جائے لیکن خدا نے چونکہ انسان کو ایک سعادت بخش زندگی کے لیے پیدا کیا ہے جس کا ایک نظم وضبط ہے اس لیے اس نظام کے وسائل بھی اسے مہیا کیے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان کسی ایک نظام تاریخ کے مطابق کسی حد تک اپنے کاموں کو منظم کر سکتا ہے لیکن اگر یہ حساب کسی فطری میزان کے مطابق نہ ہو تو نہ اس میں عمومیت ہو سکتی ہے اور نہ ہی یہ قابلِ اعتماد ہو سکتا ہے۔

گردش مہر وماہ (یا زیادہ صحیح لفظوں میں زمین کی سورج کے گرد گردش) اور اس کی منزلیں ایک فطری تقویم کی بنیاد قائم کرتی ہیں جو ہر جگہ اور تمام لوگوں کے لیے واضح اور قابلِ اعتماد ہے۔

جیسا کہ رات دن کی مقدار جو کہ ایک چھوٹا سا عرصہ ہے ایک طبیعی عامل کے ماتحت یعنی زمین کے اپنے محور کے گرد حرکت کرنے سے وجود میں آتی ہے اسی طرح مہینہ اور سال کا حساب بھی کسی طبیعی گردش کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ اس کے لیے کرۂ ارض کے گرد چاند کی حرکت ایک بڑی اکائی ہے (اسی کی بنیاد پر مہینہ بنتا ہے جو تقریباً تیس دن کے مساوی ہے) اور زمین کی سورج کے گرد حرکت عظیم تر اکائی ہے جس سے سال معرضِ وجود میں آتا ہے۔

ہم نے کہا ہے کہ اسلامی تقویم چاند کی گردش کی بنیاد پر ہے۔ یہ درست ہے کہ بارہ برجوں میں سورج کی گردش بھی تقویم کے حساب کے لیے ایک اچھا ذریعہ ہے اور اس سے شمسی مہینوں کا تعین ہوتا ہے۔ تاہم یہ سب کے لیے فائدہ مند نہیں ہے اور اس کی تشخیص صرف علمِ فلکیات کے ماہرین رصدگاہوں کے ذریعے کر سکتے ہیں لہٰذا دوسرے لوگ مجبور ہیں کہ ان تقویموں کی طرف رجوع کریں جو علمِ فلکیات کے ماہرین نے مرتب کی ہیں۔ لیکن زمین کے گرد چاند کی منظم گردش ایسی واضح تقویم پیش کرتی ہے کہ ان پڑھ اور بیابانوں میں رہنے والے بھی اس کے نقوش اور خطوط پڑھ سکتے ہیں اس کی وضاحت یہ ہے کہ آسمان پر ہر رات چاند کی ایک خاص کیفیت ہوتی ہے جو پہلے اور بعد کی رات سے مختلف ہوتی ہے اس طرح سے کہ پورے مہینوں کی دو راتوں میں آسمان پر چاند کی کیفیت اور شکل وصورت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ ہر رات کے چاند کی کیفیت پر اگر ہم تھوڑا سا غور کریں تو آہستہ آہستہ ہمیں عادت ہو جائے گی اور ہم پورے طور پر معین کر سکیں گے کہ یہ مہینے کی کون سی رات ہے۔

ہو سکتا ہے بعض لوگ یہ تصور کریں کہ مہینے کے دوسرے نصف میں بعینہٖ پہلے نصف کے منظر کا تکرار ہوتا ہے مثلاً اکیسویں شب چاند کا چہرہ ٹھیک ساتویں رات کے چہرے کی طرح ہوتا ہے لیکن یہ ایک بڑا اشتباہ ہے کیونکہ چاند کا ناقص حصہ پہلے نصف مہینے میں اوپر کی طرف ہوتا ہے جبکہ دوسرے نصف حصہ میں ناقص حصہ نیچے کی طرف ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آغازِ ماہ میں ہلال کے کونے مشرق کی

سمت ہوتے ہیں جبکہ مہینے کے دوسرے حصے میں چاند کی نوکیں مغرب کی طرف ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں مہینے کے اوائل میں چاند مغرب کی طرف نظر آتا ہے لیکن نصف ماہ کے بعد زیادہ تر مشرق کی طرف ہوتا ہے اور بہت دیر کے بعد طلوع کرتا ہے۔

اس طرح چاند کی بدلتی صورت سے ایک دن کا حساب کیا جاسکتا ہے اور شکل ہی پر غور و خوض کرنے سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مہینے کی کون سی تاریخ ہے بہرحال یہ نظامِ تقویم ایک بڑی نعمت ہے جس پر ہم آفرینشِ خداوندی کے ممنونِ احسان ہیں اور اگر چاند، سورج اور زمین کی حرکات نہ ہوتیں تو ہماری زندگی میں ایسا ہرج مرج ہوتا اور ہم ایسی پریشانی سے دوچار ہوتے کہ جس کا اس وقت ہم تصور بھی نہیں کرسکتے۔

وہ قیدی جو کسی تاریک کوٹھڑی میں قید تنہائی میں ہوتے ہیں اور انھیں وقت کا پتہ نہیں چلتا وہ اس مصیبت کا پورے طور پر احساس کرتے ہیں۔

ہمارے زمانے میں ایک قیدی تقریباً ایک ماہ کے لیے استبداد کے ایجنٹوں کے ہاتھوں گرفتار رہا، اسے ایک تاریک کوٹھڑی میں قید تنہائی میں رکھا گیا تھا وہ بیان کرتا ہے:

"میرے پاس وقتِ نماز کی تشخیص کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ جب وہ دوپہر کا کھانا لاتے تو میں ظہر اور عصر کی نمازیں پڑھ لیتا اور جس وقت وہ رات کا کھانا لاتے تو میں مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کرلیتا اور نماز صبح بھی عموماً جب وہ ناشتہ لاتے پڑھ لیتا۔ اگر دنوں کو شمار کرنا چاہتا تو کھانوں کی تعداد اور حساب کو نظر میں رکھتا۔ کھانے کے تین اوقات کو ایک دن شمار کرتا تھا لیکن نہ معلوم کیا ہوا کہ جب میں زندان سے باہر نکلا تو میرا حساب باہر کے لوگوں کے حساب سے مختلف ہوچکا تھا۔"

۷۔ إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ ۝

۸۔ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝

۹۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُم بِإِيمَانِهِمْ ۖ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۝

۱۰۔ دَعْوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ۚ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

ترجمہ

۷۔ وہ جو ہماری ملاقات (اور قیامت) کی امید نہیں رکھتے اور دنیاوی زندگی پر خوش ہیں اور اس پر تکیہ کیے ہوئے ہیں اور وہ جو ہماری آیات سے غافل ہیں۔

۸۔ ان (سب) کے رہنے کی جگہ آگ ہے، ان کاموں کی وجہ سے جو وہ انجام دیتے تھے۔

۹۔ (لیکن) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے خدا انھیں ان کے ایمان کے سبب ہدایت کرتا ہے، ان کے (قصر اور محلات کے) نیچے سے جنت کے باغوں میں نہریں جاری ہیں۔

۱۰۔ جنّت میں ان کی گفتگو (اور دعا) یہ ہے کہ خدایا؛ تو منزہ ہے اور ان کا تحیہ سلام ہے اور ان کی آخری بات یہ ہے کہ حمد اور تعریف مخصوص ہے عالمین کے پروردگار اللہ کے لیے۔

تفسیر

جنتی اور دوزخی

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے اس سورہ کی ابتداء میں قرآن نے پہلے مبداء اور معاد کے مسئلے کے بارے میں ایک اجمالی بحث کی ہے

اور بعد میں اس کی تفصیل شروع کی ہے۔

گزشتہ آیات میں مسئلہ مبداء کے بارے میں تشریح تھی اور زیر نظر آیات میں معاد اور دوسرے جہان میں لوگوں کی سرنوشت کے بارے میں تشریح نظر آتی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے، وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور قیامت پر عقیدہ نہیں رکھتے اور اس بناء پر صرف دنیاوی زندگی پر خوش ہیں اور اسی پر تکیہ کیے ہوئے ہیں (ان الذین لا یرجون لقاءنا ورضوا بالحیوٰة الدنیا واطمأنوا بھا)۔

اور اسی طرح وہ لوگ جو ہماری آیات سے غافل ہیں اور ان میں غور و فکر نہیں کرتے کہ ان کے دل بیدار ہوں اور ان میں احساس مسئولیت پیدا ہو (والذین ھم عن اٰیٰتنا غٰفلون)۔

" ان دونوں گروہوں کے رہنے کی جگہ آگ ہے، ان اعمال کے سبب جو وہ انجام دیتے تھے (اولٰئک مأوٰھم النار بما کانوا یکسبون)۔

فی الحقیقت معاد اور قیامت پر ایمان نہ لانے کا سیدھا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اس محدود زندگی اور عارضی مادی مقام و منصب سے دل بستگی پیدا کرتا ہے اور اسی پر بھروسہ کر لیتا ہے۔ زندگی کے کاموں میں اس کا نتیجہ آلودگی کی صورت میں نکلتا ہے اور اس کا انجام آتشِ جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

اسی طرح آیاتِ الٰہی سے غفلت خدا سے بیگانگی کا سرچشمہ ہے اور خدا سے بیگانگی عدم احساسِ مسئولیت کا سرچشمہ ہے اور اس کے نتیجے میں انسان ظلم، فساد اور گناہ سے آلودہ ہوتا ہے اور اس کا انجام آتشِ جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

لہٰذا مذکورہ دونوں گروہ ———— یعنی وہ جو مبداء یا معاد پر ایمان نہیں رکھتے یقیناً عمل کے لحاظ سے آلودہ ہوں گے اور دونوں گروہوں کا مستقبل تاریک ہے۔

یہ دو آیات دوبارہ اس حقیقت کی تاکید کرتی ہیں کہ ایک معاشرے کی اصلاح اور ظلم و گناہ کی آگ سے نجات کے لیے خدا اور معاد پر ایمان کی بنیادوں کو قوی کرنا ناگزیر ہے کیونکہ خدا پر ایمان لائے بغیر ضمیرِ انسانی میں احساسِ مسئولیت پیدا نہیں ہو سکتا اور معاد و قیامت کی طرف توجہ کیے بغیر سزا اور عذاب کا خوف پیدا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ دونوں اعتقادی ستون تمام اجتماعی اصلاحات کی بنیاد ہیں۔

اس کے بعد دونوں گروہوں کے مقابل ایک اور گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کیے، ان کے ایمان کی تقویت کے لیے خدا انھیں ہدایت کرتا ہے (ان الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت یھدیھم ربھم بایمانھم)۔

ہدایتِ الٰہی کا یہ نور جس کا سرچشمہ ان کا نورِ ایمان ہے، ان کی زندگی کے تمام افق روشن کر دیتا ہے اس نور کے ذریعے ان میں ایسی روشن بینی پیدا ہو جاتی ہے کہ مادی مکاتب و نظریات، شیطانی وسوسے، گناہوں کی چمک دمک، زر و دولت اور اقتدار ان کی فکر و نظر میں نہیں کھپتے اور وہ صحیح راستے کو چھوڑ کر بے راہ روی میں قدم نہیں رکھتے۔

یہ تو ان کی دنیا کی حالت ہے " اور دوسرے جہان میں خدا بہشت کے پرنعمت باغوں میں انھیں عنایت عطا کرے گا کہ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (تجری من تحتھم الانھٰر فی جنّٰت النعیم)۔

وہ ایک ایسے ماحول میں زندگی بسر کریں گے جو صلح و آشتی، پاکیزگی اور عشقِ پروردگار سے معمور ہوگا اور جہاں طرح طرح کی نعمتیں ہوں گی جس وقت خدا کی ذات و صفات سے عشق ان کے وجود کو روشن کردے گا تو وہ "کہیں گے پروردگار! تو ہر قسم کے عیب اور نقص سے منزہ اور پاک ہے" (دعواھم فیھا سبحٰنک اللّٰھم). جب وہ ایک دوسرے سے ملیں گے تو صلح و صفائی کی باتیں کریں گے اور ان کا تحیہ سلام ہوگا (وتحیتھم فیھا سلام).

اور آخرکار وہ وہاں خدا کی گوناگوں نعمتوں سے بہرہ ور ہوں گے تو اس کا شکر ادا کریں گے اور کہیں گے کہ "حمد و ثنا اس خدا کے لیے مخصوص ہے جو عالمین کا پروردگار ہے" (واٰخر دعواھم ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین).

چند اہم نکات

۱۔ پروردگار سے ملاقات: سوال پیدا ہوتا ہے کہ لقاء الٰہی سے کیا مراد ہے جس کا ذکر زیر نظر پہلی آیت میں ہے۔ مسلّم ہے کہ ملاقات حسی تو نہیں ہے بلکہ مراد پروردگار کی جزا و سزا سے ملاقات ہے اور اس کے علاوہ ایک قسم کا شہود باطنی بھی ہے جو قیامت میں انسان کے اندر ذاتِ اقدس باری تعالیٰ کے بارے میں پیدا ہوگا کیونکہ انسان وہاں پر اس کی آیات اور نشانیوں کو ہر مقام سے بڑھ کر واضح اور آشکار دیکھ پائے گا اور وہاں انسان معرفت کی نئی نظر اور قدرت حاصل کرلے گا۔[1]

۲۔ یھدیھم ربھم بایمانھم کے بارے میں کچھ گفتگو: اس جملے میں ایمان کے سائے میں ہدایت انسانی کے متعلق گفتگو ہے یہ ہدایت دوسرے جہان کی زندگی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس جہان میں بھی ایک مومن ایمان کی وجہ سے بہت سے اشتباہات، فریب کاریوں اور لغزشوں سے نجات حاصل کرلیتا ہے کیونکہ یہ بیماریاں، حرص، خود غرضی اور ہوا و ہوس سے پیدا ہوتی ہیں اور اسی ایمان کے ذریعے مومن دوسرے جہان میں اپنے لیے جنت کی طرف راستہ بنا لیتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

> یوم تری المؤمنین والمؤمنات یسعیٰ نورھم بین ایدیھم وبایمانھم
>
> اس دن تو صاحبِ ایمان مردوں اور عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کے نور کی شعاع ان کے سامنے اور دائیں طرف چل رہی ہوگی۔ (حدید — ۱۲)

نیز ایک حدیث میں رسول اللہؐ سے مروی ہے:

> ان المؤمن اذا خرج من قبرہ صور لہ عملہ فی صورۃ حسنۃ فیقول لہ انا عملک فیکون لہ نورا وقائدا الی الجنۃ[2]
>
> جب مومن اپنی قبر سے نکلے گا تو اس کے اعمال ایک پیاری صورت میں نمایاں ہوں گے اور اس سے کہیں گے کہ میں تیرا عمل ہوں اور ایک نور سا آئے گا جو اسے جنت کی طرف ہدایت کرے گا۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد اول ص۱۰ (اردو ترجمہ) سورۂ بقرہ کی آیہ ۴۶ کے ذیل کی طرف رجوع کریں۔

[2] تفسیر مجمع البیان جلد ۱۷ ص ۴۰

۳۔ "تجری من تحتھم الانھار" کا مفہوم: زیرِ نظر آیات میں "تجری من تحتھم الانھار" آیا ہے جبکہ قرآن کی دیگر آیات میں "تجری من تحتھا الانھار" نظر آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں دیگر مواقع پر ہے کہ "جنت کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی"۔ جبکہ زیرِ نظر آیت میں ہے کہ "جنت والوں کے پاؤں تلے نہریں جاری ہوں گی" ممکن ہے یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہو کہ اہلِ بہشت کے محلات بھی نہروں کے اوپر ہوں گے اور یوں یہ منظر نہایت حسین دکھائی دے گا۔

یا پھر یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جنت کی نہریں ان کے تابع فرمان ہوں گی اور ان کے قبضۂ قدرت میں ہوں گی۔ جیسا کہ فرعون کے واقعہ میں ہے، وہ کہتا ہے:

الیس لی ملک مصر وھذہ الانھار تجری من تحتی۔

کیا مصر کی حکومت میرے قبضے میں نہیں اور یہ نہریں میرے حکم سے نہیں چلتیں۔

(زخرف ..... ۵۲)

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ لفظ "تحت" "بین ایدی" کے معنی میں ہو یعنی ان کے سامنے نہریں جاری ہوں گی۔

۴۔ اہلِ جنت کے لیے تین عظیم نعمتیں: یہ امر جاذبِ توجہ ہے کہ زیرِ بحث آخری آیت میں اہلِ بہشت کی تین حالتوں یا ان کے لیے تین نعمتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلی ـــــ ذاتِ پروردگار کی طرف توجہ ـــــ اس توجہ سے جو لذت انھیں حاصل ہوگی اس کا موازنہ کسی اور لذت سے نہیں کیا جاسکتا۔

دوسری ـــــ وہ لذت کہ جو مومنین کے ایک دوسرے سے صلح و تفاہم سے معمور اس ماحول میں ملاقات اور میل جول سے حاصل ہوگی اور یہ لذت خدا کی طرف متوجہ ہونے کی لذت کے بعد ہر چیز سے بہتر اور برتر ہوگی۔

تیسری ـــــ وہ لذت کہ جو انھیں طرح طرح کی نعمات بہشت سے بہرہ ور ہونے سے حاصل ہوگی اور پھر وہ انھیں خدا کی طرف متوجہ کرے گی اور وہ اس کی حمد، سپاس اور شکر بجالائیں گے۔

(غور کیجیے گا)

۱۱۔ وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ ۖ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ○

۱۲۔ وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَسَّهُ ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○

ترجمہ

۱۱۔ جس طرح لوگ اچھائیوں کو اپنے قبضے میں لینے کے لیے جلدی کرتے ہیں اگر خدا (ان کے اعمال کے بدلے) انھیں سزا دے تو ان کی زندگی اختتام کو پہنچ جائے (اور سب کے سب ختم ہو جائیں) لیکن وہ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے انھیں ہم ان کی حالت پر چھوڑ دیں گے تاکہ وہ اپنے طغیان میں سرگرداں پھریں۔

۱۲۔ اور جس وقت کسی انسان کو کوئی نقصان (اور پریشانی) چھوئے تو جب وہ پہلو کے بل سویا ہو یا بیٹھا ہو یا کھڑا ہو (ہر حالت میں ہمیں) پکارتا ہے لیکن جب ہم اس کی پریشانی دور کر دیتے ہیں تو ایسے گزرتا ہے گویا اس نے کسی مشکل کے حل کے لیے کبھی ہمیں پکارا ہی نہ ہو۔ اس طرح سے اسراف کرنے والوں کے لیے ان کے اعمال زینت دیے جاتے ہیں۔

تفسیر

خود غرض انسان

ان آیات میں بھی بدکاروں کی پاداش کے بارے میں گفتگو جاری ہے۔

پہلی آیت میں قرآن کہتا ہے، اگر خدا بدکار لوگوں کو جلدی اور اسی جہان میں سزا دے دے اور جیسے وہ نعمت اور خیر کے حصول میں جلدی کرتے ہیں خدا بھی ان کی سزا میں تعجیل کرے تو سب کی عمر ختم ہو جائے اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہے

(ولو یعجل اللہ للناس الشر استعجالھم بالخیر لقضی الیھم اجلھم)۔

لیکن خدا کا لطف چونکہ تمام بندوں کے شاملِ حال ہے یہاں تک کہ بدکاروں، کافروں اور مشرکوں کے لیے بھی ہے اس لیے وہ ان کی سزا میں جلدی نہیں کرتا کہ شاید وہ بیدار ہو جائیں، توبہ کر لیں اور بے راہ روی سے پلٹ آئیں۔ علاوہ ازیں اگر سزا اتنی جلدی مل جاتی تو اختیاری حالت جو کہ مسئولیت کی بنیاد ہے، تقریباً ختم ہو جاتی اور اطاعت گزاروں کی اطاعت بھی، پھر اضطراری کیفیت میں ہوتی کیونکہ خلاف ورزی کی صورت میں فوراً وہ دردناک سزا کا سامنا کرتے۔

اس جملے میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ کچھ ہٹ دھرم کفار ایسے تھے جو انبیاء سے کہتے تھے کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو جتنا جلدی ہو سکے خدا سے کہو ہمیں نابود کر دے یا سزا دے اس بات کو قرآن نے بارہا ذکر کیا ہے اب اگر خدا ان کے اس تقاضے کو قبول کر لیتا تو ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہتا ــــــــــ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

آیت کے آخر میں قرآن فرماتا ہے: ان کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ جو لوگ قیامت اور ہماری ملاقات پر ایمان نہیں لائے انھیں ہم ان کی حالت پر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے طغیان میں حیران و سرگرداں رہیں، نہ حق کو باطل سے جدا کر سکیں اور نہ راہ کو چاہ سے (فنذر الذین لا یرجون لقاءنا فی طغیانھم یعمھون)۔

اس موقع پر آدمی کی فطرت اور روح کی گہرائی میں نورِ توحید کے وجود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: جب انسان کو کوئی نقصان اور ضرر پہنچتا ہے اور ہر جگہ سے اس کا ہاتھ کوتاہ ہو جاتا ہے تو ہماری طرف ہاتھ بلند کرتا ہے اور جب وہ پہلو کے بل سوتا ہے یا بیٹھتا ہے یا کھڑا ہوتا ہے، ہر حالت میں ہمیں پکارتا ہے (واذا مس الانسان الضر دعانا لجنبہ او قاعدا او قائما)۔

جی ہاں! مشکلات اور دردناک حوادث کی خاصیت یہ ہے کہ وہ انسان کی پاک فطرت سے پردوں اور حجابوں کو برطرف کر دیتے ہیں۔ حوادث کی بھٹی میں تمام سیاہ پردے جنھوں نے اس فطرت کو چھپا رکھا ہوتا ہے، جل جاتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں اور ایک عرصے کے لیے چاہے وہ کتنا ہی کم ہو اس نورِ توحیدی کی چمک آشکار ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ باقی رہے یہ لوگ تو یہ اس قدر کم ظرف اور بے عقل ہیں کہ "صرف اتنی دیر میں کہ ہم بلا و پریشانی ان سے برطرف کر دیں، اس طرح غفلت میں ڈوب جاتے ہیں گویا انھوں نے ہم سے کوئی بالکل تقاضا ہی نہ کیا تھا" اور ہم نے کبھی جیسے ان کی کوئی مدد نہیں کی (فلما کشفنا عنہ ضرہ مر کان لم یدعنا الی ضر مسہ)۔

جی ہاں! اس طرح سے مسرفین کے اعمال کو ان کی نظر میں مزین کیا گیا ہے (کذلک زین للمسرفین ما کانوا یعملون)۔

ایسے افراد کے اعمال کو ان کی نظر میں کون مزین کر کے پیش کرتا ہے؟ اس بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۳ سورۂ انعام کی آیہ ۱۲۲ کے ذیل میں (صفحہ ۳۱ اردو ترجمہ) پر بحث کر چکے ہیں اس بحث کا اجمالی خاکہ یہ ہے کہ زینت دینے والا خدا ہے لیکن اس طرح سے کہ اس نے برے اور قبیح اعمال میں یہ خاصیت پیدا کی ہے کہ جس قدر انسان ان سے آلودہ ہوتا ہے اس قدر ان کا زیادہ عادی ہوتا جاتا ہے اور نہ صرف ان کی برائی اور قباحت اس کی نظر میں ختم ہو جاتی ہے بلکہ وہ اسے آہستہ آہستہ اچھے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

بیک ایسے افراد کو زیرِ نظر آیت میں "مسرفین" (اسراف کرنے والے) کیوں کہا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے زیادہ اسراف

کیا ہوگا کہ انسان اپنے وجود کا اہم ترین سرمایہ یعنی عمر، سلامتی، جوانی اور اپنی مختلف صلاحیتوں کو فضول کاموں میں اور گناہ، عصیان اور نافرمانی میں برباد کر دے یا اس دنیا کے بے وقعت اور ناپائیدار مال ومتاع کے حصول میں ضائع کر دے اور اس سرمایہ کے بدلے میں اسے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو ـــــــ کیا یہ کام اسراف نہیں ہے اور کیا ایسے لوگ مسرف شمار نہیں ہوتے؟

انسان قرآنِ کریم کی نظر میں

انسان کے بارے میں قرآن مجید میں مختلف تعبیرات آئی ہیں،

بہت سی آیات میں انسان کے لیے لفظ "بشر" استعمال ہوا ہے ۔ بہت سی دیگر آیات میں لفظ "انسان" آیا ہے کچھ آیات میں "بنی آدم" کی تعبیر آئی ہے ہاں البتہ بہت سے مواقع پر اس کے لیے مذموم صفات ذکر ہوئی ہیں۔

مثلاً زیر بحث آیات میں انسان کا تعارف ایک زود فراموش اور حق ناشناس موجود کے طور پر کروایا گیا ہے۔

ایک اور مقام پر اسے ایک ضعیف اور کمزور موجود کہا گیا ہے؛

خلق الانسان ضعیفا۔ (نساء-۲۸)

ایک اور جگہ اسے ستمگر اور کفر کرنے والا قرار دیا گیا ہے؛

ان الانسان لظلوم کفار۔ (ابراھیم-۳۴)

ایک اور مقام پر انسان کو بخیل کہا گیا ہے؛

وکان الانسان قتورا۔ (بنی اسرائیل-۱۰۰)

ایک اور جگہ جلد باز کہا گیا ہے؛

وکان الانسان عجولا۔ (بنی اسرائیل-۱۱)

دوسری جگہ کفران کرنے والے قرار دیا گیا ہے؛

وکان الانسان کفورا۔ (بنی اسرائیل-۶۷)

ایک مقام پر اسے جھگڑالو کہا گیا ہے؛

کان الانسان اکثر شیء جدلا۔ (کہف-۵۴)

ایک اور جگہ انسان کو ظلوم وجہول قرار دیا گیا ہے؛

انہ کان ظلوما جھولا۔ (احزاب-۷۲)

ایک اور جگہ اسے واضح کفر کرنے والا کہا گیا ہے؛

ان الانسان لکفور مبین۔ (زخرف-۱۵)

ایک اور جگہ اسے کم ظرف اور متلون مزاج کہا گیا ہے کہ جو دم بدم بدلتا رہتا ہے، نعمت ملے تو بخیل ہو جاتا ہے اور مصیبت کے وقت رونا پیٹنا شروع کر دیتا ہے؛

ان الانسان خلق هلوعا اذا مسه الشر جزوعا و اذا مسه الخير منوعا۔
(معارج ۱۹، ۲۰، ۲۱)

ایک اور جگہ اسے مغرور ——— یہاں تک کہ خدا کے سامنے بھی مغرور بتایا گیا ہے:
یا ایها الانسان ما غرك بربك الكريم۔ (انفطار - ٦)

ایک اور مقام پر اسے ایک ایسا موجود بتایا گیا ہے کہ جو نعمت کے وقت طغیان و سرکشی کرتا ہے:
ان الانسان ليطغى ان راٰه استغنٰى۔ (علق - ٦، ٧)

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں انسان کو ایک ایسا موجود کہا گیا ہے جو بہت زیادہ منفی پہلو رکھتا ہے اور جس میں کمزوری کے بہت سے نقطے موجود ہیں۔

کیا یہ وہی انسان ہے جسے خدا نے "احسن تقویم" اور بہترین ساخت میں پیدا کیا ہے:
لقد خلقنا الانسان فی احسن تقويم۔ (التين - ۴)

کیا یہ وہی انسان ہے جس کا معلم اور استاد خدا تھا اور جس چیز کو وہ نہیں جانتا تھا اللہ نے اسے اس کی تعلیم دی:
علم الانسان ما لم يعلم۔ (علق - ۵)

کیا یہی وہ انسان ہے جسے خدا نے بیان سکھایا ہے:
خلق الانسان علمه البيان۔ (رحمٰن - ۳، ۴)

کیا یہ وہی انسان ہے جسے خدا نے اپنی راہ میں کاوش کے لیے ابھارا ہے:
يا ايها الانسان انك كادح الى ربك كدحا۔
(انشقاق - ٦)

یہ بات قابل غور ہے کہ خدا کی طرف سے ایسے شرف اور ایسی محبت کے حامل انسانوں میں کمزوری کے یہ پہلو کیسے آ گئے۔

ظاہر یہ ہے کہ یہ تمام مباحث ایسے انسانوں کے بارے میں ہیں جو خدائی رہبروں کے زیر تربیت نہیں رہے بلکہ انھوں نے خودرو پودوں کی طرح پرورش پائی ہے ان کا نہ کوئی معلم تھا نہ رہبر و راہنما اور نہ انھیں کوئی بیدار کرنے والا تھا۔ ان کی خواہشات آزاد تھیں اور وہ ہوا و ہوس میں غوطہ زن تھے۔

واضح ہے کہ ایسے انسان نہ صرف یہ کہ فراواں وسائل اور اپنے وجود کے سرمایۂ عظیم سے فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ انھیں انحرافی راستوں اور غلط کاموں میں استعمال کرتے ہیں۔ یوں وہ ایک خطرناک موجود کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور آخرکار ناتواں و بے نوا موجود بن جاتے ہیں۔

ورنہ وہ انسان جو ہادیان برحق کے وجود سے استفادہ کرتے ہیں، اپنی فکر و نظر سے استفادہ کرتے ہیں اور تکامل و ارتقاء اور حق و عدالت کا راستہ اختیار کرتے ہیں وہ مرحلہ آدمیت میں قدم رکھ کر بنی آدم ہونے کی اہلیت کا اظہار کرتے ہیں اور اس طرح وہ

اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ خدا کے علاوہ انھیں کچھ نہیں سوجھتا۔

جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ولقد کرمنا بنی اٰدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا۔

ہم نے بنی آدم کو تکریم و عزت بخشی اور خشکی اور دریا کو ان کی جولان گاہ قرار دیا اور انھیں پاکیزہ رزق دیا اور انھیں اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی۔

(بنی اسرائیل — ۷۰)

۱۳۔ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ○

۱۴۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۱۳۔ تم سے پہلے کی امتوں نے جب ظلم کیا تو ہم نے انھیں ہلاک کر دیا حالانکہ ان کے پیغمبر واضح دلائل لے کر ان کے پاس آئے تھے اور وہ لوگ ایمان نہ لائے اور مجرم گروہ کو ہم اس طرح سے جزا دیتے ہیں۔

۱۴۔ ان کے بعد پھر ہم نے تمھیں روئے زمین پر ان کا جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو۔

تفسیر

پہلے ظالم اور تم

ان آیات میں بھی ظالموں اور مجرموں کی اس جہان میں سزاؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو گزشتہ زمانے کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ان کے گوش گزار کیا گیا ہے کہ اگر ان کی راہ پر چلے تو ان جیسی سرنوشت میں گرفتار ہوگے۔

پہلی آیت میں کہا گیا ہے: ہم نے تم سے پہلے کی امتوں کو ہلاک اور نابود کر دیا جبکہ انھوں نے ظلم کیا اور وہ ان انبیاء پر ہرگز ایمان نہ لائے جو ان کے پاس واضح دلائل اور معجزات کے ساتھ ان کی ہدایت کے لیے آئے تھے (ولقد اھلکنا القرون من قبلکم لما ظلموا وجاءتھم رسلھم بالبینات وما کانوا لیؤمنوا)۔

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: ایسا انجام کسی خاص جماعت سے مخصوص نہیں ہے۔ ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں (کذلک تجزی القوم المجرمین)۔

بعد والی آیت میں اس بات کو زیادہ صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس کے بعد ہم نے تمھیں زمین پر ان کا جانشین قرار دیا تاکہ دیکھیں کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو (ثم جعلناکم خلائف فی الارض من بعدھم لننظر کیف تعملون)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ "قرون" کا مطلب: "قرون" "قرن" کی جمع ہے۔ "قرن" عام طور پر ایک طویل زمانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ علماء لغت نے کہا ہے ایسی قوم اور جمعیت کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے جو ایک ہی زمانے میں زندگی بسر کرتی ہو کیونکہ اس کا اصلی مادہ "اقتران" سے ہے جس کا مطلب ہے نزدیک ہونا۔ زیر بحث آیت میں بھی "قرون" اس معنی میں یعنی ہم عصر گروہوں اور قوموں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

۲۔ قوموں کی بربادی کی وجہ: مندرجہ بالا آیات میں قوموں کی بربادی اور نابودی کی علت ظلم قرار دی گئی ہے یہ اس بنا پر ہے کہ لفظ "ظلم" ایسا وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس میں ہر قسم کی برائی اور گناہ شامل ہے۔

۳۔ "وما کانوا لیؤمنوا" کا مفہوم: اس کا معنی ہے "ایسا نہ تھا کہ وہ ایمان لاتے" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا صرف اس گروہ کو ہلاک کرنے کی سزا دیتا ہے جس کے آیندہ ایمان لانے کی امید بھی نہ ہو۔ اس طرح سے وہ قومیں کہ جن کے لیے ممکن ہو کہ آیندہ ایمان لے آئیں گی انہیں ایسی سزائیں نہیں دی جاتیں کیونکہ ان دونوں میں بہت فرق ہے کہ "وہ ایمان نہیں لائے" اور "ایسا نہ تھا کہ وہ ایمان لائیں" (غور کیجیے گا)۔

۴۔ "لننظر کیف تعملون" کا مطلب: اس کا لفظی معنی ہے، "تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو" مسلّم ہے کہ اس کا مقصود آنکھ سے دیکھنا ہے نہ دل کی نگاہ سے دیکھنا ہے کیونکہ خدا میں دونوں چیزیں نہیں ہیں بلکہ اس کا مفہوم ہے ایک حالت جو انتظار سے مشابہت رکھتی ہے، یعنی تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیا ہے اور ہمیں انتظار ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔

۱۵۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○

۱۶۔ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

۱۷۔ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ○

ترجمہ

۱۵۔ اور جس وقت ہماری واضح آیات انھیں سنائی جاتی ہیں تو جو لوگ ہماری ملاقات (اور قیامت) کی امید نہیں رکھتے کہتے ہیں: کوئی قرآن لے آؤ اس کے علاوہ یا اسے تبدیل کر دو (اور اس میں سے بتوں کی مذمت والی آیتیں نکال دو)، کہہ دو: مجھے حق نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے تبدیل کر دوں میں تو صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی ہوتی ہے اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو (قیامت کے) عظیم دن کی سزا سے ڈرتا ہوں

۱۶۔ کہہ دو: اگر خدا چاہتا تو میں تم پر آیات تلاوت نہ کرتا اور تمھیں ان سے آگاہ نہ کرتا کیونکہ میں نے مدتوں اس سے پہلے تم میں زندگی گزاری ہے، کیا سمجھتے نہیں ہو۔

۱۷۔ اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو خدا پر جھوٹ باندھتا ہے اور اس کی آیات کو جھٹلاتا ہے۔ مسلّم ہے کہ مجرم فلاح نہیں پائیں گے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیات چند بت پرستوں کے بارے میں نازل ہوئیں وہ خدمتِ پیغمبرؐ میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے

کہ جو کچھ قرآن میں ہمارے بڑے بتوں لات، عزیٰ، منات اور ہبل کی عبادت نہ کرنے اور ان کی مذمت میں نازل ہوا ہے، ہمارے لیے قابلِ برداشت نہیں ہے اگر تم چاہتے ہو کہ ہم تمہاری پیروی کریں تو دوسرا قرآن لے آؤ جس میں ایسی کوئی بات نہ ہو یا پھر کم از کم موجودہ قرآن میں سے ایسی باتیں نکال دو۔ اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انھیں جواب دیا گیا۔

تفسیر

گزشتہ آیات کی طرح ان آیات میں بھی مبداء و معاد سے مربوط مسائل سے متعلق بحث جاری ہے۔

پہلے بُت پرستوں کے ایک بہت بڑے اشتباہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو جو لوگ قیامت اور ہماری ملاقات پر ایمان نہیں رکھتے، کہتے ہیں: اس کی بجائے کوئی دوسرا قرآن لے آؤ یا پھر کم از کم اس قرآن میں تبدیلی کر دو (واذا تتلیٰ علیھم اٰیٰتنا بینات قال الذین لا یرجون لقاءنا ائت بقراٰن غیر ھذا او بدلہ)

یہ بے خبر بے نوا پیغمبر کی رہبری کو قبول نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے خرافات اور باطل افکار کی پیروی کی دعوت دیتے تھے۔ آنحضرتؐ سے ایسے قرآن کی خواہش کرتے تھے جو ان کے خرافات کے تابع ہو نہ کہ ان کے معاشرے کا اصلاح کنندہ ہو۔ وہ نہ صرف یہ کہ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور اپنے کاموں میں احساسِ مسئولیت نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کی یہ گفتگو نشاندہی کرتی تھی کہ انھوں نے نبوت کے مفہوم کو بالکل سمجھا ہی نہ تھا یا وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

قرآن صراحت کے ساتھ انھیں اس عظیم اشتباہ سے باہر نکالتا ہے اور پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیتا ہے کہ ان سے کہہ دو: میرے لیے ممکن نہیں کہ میں خود اس میں تبدیلی کر دوں (قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی)[1] اس کے بعد تاکید کے طور پر مزید فرمایا گیا ہے: میں فقط اس کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی ہوتی ہے (ان اتبع الا ما یوحیٰ الی)۔

نہ صرف یہ کہ میں اس آسمانی وحی میں تبدیلی نہیں کر سکتا بلکہ اگر میں اپنے پروردگار کے حکم سے تھوڑا سا بھی تخلف کروں تو (قیامت کے) اس عظیم دن کی سزا سے ڈرتا ہوں (انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم)۔

اگلی آیت میں اس بات کی دلیل پیش کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے، ان سے کہہ دو: "اس کتاب میں میرے ارادے کا ذرہ بھر بھی دخل نہیں اور اگر خدا چاہتا تو ان آیات کی میں تمہارے سامنے تلاوت نہ کرتا اور تمہیں اس سے آگاہ نہ کرتا" (قل لو شاء اللہ ما تلوتہ علیکم ولا ادراکم بہ)، اس لیے کہ میں نے قبل ازیں بہت عرصہ تم میں زندگی گزاری ہے اور تم نے کبھی بھی مجھ سے ایسی باتیں نہیں سنیں اگر یہ آیات میری طرف سے ہوتیں تو لامحالہ اس چالیس سال کی مدت میں میری فکر سے میری زبان پر جاری ہو جاتیں۔ کم از کم ان کا کچھ حصہ تو بعض لوگ مجھ سے سنتے (فقد لبثت فیکم عمرًا من قبلہ)۔ کیا یہ واضح بات نہیں سمجھ سکتے (افلا تعقلون)۔

پھر مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ ظلم کی بدترین قسم یہ ہے کہ کوئی شخص خدا پر افتراء باندھے۔

---

[1] لفظ "تلقاء" مصدر ہے یا اسم مصدر ہے یہ تقابل اور آمنے سامنے کے معنی میں آیا ہے اس آیت میں اور ایسے دیگر مقامات پر "نزدیک" اور "ناحیہ" کے معنی میں ہے یعنی میں اپنی طرف سے اور خود سے تبدیلی نہیں کر سکتا۔

" اس سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے کہ جو خدا کی طرف جھوٹی نسبت دے " (فمن اظلم ممن افترى على الله كذبا) ۔

لہٰذا کیونکر ممکن ہے کہ میں ایسے بڑے گناہ کا مرتکب ہوں۔ اسی طرح جو شخص آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرے ——— تو یہ بھی بہت بڑا ظلم ہے (او كذب باياته)۔

اگر تم آیاتِ حق کی تکذیب اور انکار کے گناہ کی عظمت سے بے خبر ہو تو میں بے خبر نہیں ہو سکتا۔ بہر حال تمہارا یہ کام بہت بڑا جرم ہے " اور مجرم کبھی فلاح اور کامیابی حاصل نہیں کر سکتے " (انه لا يفلح المجرمون)۔

چند اہم نکات

۱۔ مشرکین کی دو متبادل خواہشوں میں فرق : مشرکین پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ خواہش کرتے تھے کہ یا تو قرآن کو کسی اور کتاب سے بدل دیں یا قرآن میں تبدیلی کریں ان دونوں کے درمیان فرق واضح ہے۔ ان کے پہلے تقاضے میں ان کا مقصد یہ تھا کہ یہ کتاب بالکل ختم ہو جائے اور اس کی جگہ پیغمبرؐ کی طرف سے دوسری کتاب آجائے لیکن دوسرے تقاضے میں وہ چاہتے تھے کہ کم از کم وہ آیات جو بتوں کے خلاف ہیں وہ تبدیل ہو جائیں تاکہ انھیں اس طرف سے کسی قسم کی پریشانی لاحق نہ ہو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کیسے قطعی لہجے میں انھیں جواب دیتا ہے کہ نہ کتاب کا تبادلہ پیغمبرؐ کے اختیار میں ہے نہ رد و بدل اور نہ وحی کی تاخیر یا جلدی۔

واقعاً ان کے افکار و نظریات کیسے پست اور ناقص تھے وہ اپنے پیغمبر کی اطاعت کرنا چاہتے تھے کہ جو ان کے خرافات اور ہوا و ہوس کا پیرو ہو نہ کہ جو خود پیشوا، رہبر، مربی اور راہنما ہو۔

۲۔ پیغمبر اکرمؐ کے جواب پر ایک نظر : یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ پیغمبر خدا ان کے دو تقاضوں کے جواب میں صرف ان کی دوسری خواہش کے انجام دینے کی توانائی نہ رکھنے کا ذکر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں اپنی طرف سے اس میں کوئی رد و بدل نہیں کر سکتا۔ اس بیان سے دراصل ان کی پہلی خواہش کی بطریق اولیٰ نفی ہو جاتی ہے کیونکہ جب بعض آیات میں تغیر و تبدل پیغمبرؐ کے اختیار میں نہیں تو کیا اس ساری آسمانی کتاب کو بدل دینا ان کے لیے ممکن ہو سکتا ہے اس تعبیر میں ایک خاص وضاحت پائی جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ایک بھی اضافی جملہ یا لفظ کہے بغیر انتہائی پیچ دار اور مختصر الفاظ میں تمام مسائل بیان کرتا ہے۔

۳۔ ایک اشکال اور اس کی وضاحت : ہو سکتا ہے کہا جائے کہ جو دلیل قرآن کے پیغمبر کی طرف سے ہونے کی نفی کے لیے اور اس کے خدا کی طرف سے ہونے کے بارے میں زیر نظر آیات میں پیش کی گئی ہے وہ مطمئن کرنے والی نہیں ہے یہ کیا ضروری ہے کہ اگر یہ کتاب پیغمبرؐ کی طرف سے ہو تو تم اس جیسا کلام انہوں نے اس سے قبل آپ سے سنا ہو۔

لیکن تھوڑا سا غور کرنے سے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کیونکہ جو کچھ ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں اس کے مطابق نبوغ، ایجاد اور تخلیق کی صلاحیتوں کا اظہار عموماً انسان میں بیس سال کی عمر میں شروع ہو جاتا ہے اور زیادہ سے زیادہ پینتیس سے چالیس سال تک رہتا ہے یعنی اگر انسان اس عمر تک اپنی ان صلاحیتوں سے کام نہ لے تو اس کے بعد عام طور پر ممکن نہیں رہتا۔

یہ امر جو آج کل علم نفسیات کے حوالے سے معلوم ہوا ہے، مسلماً اس سے پہلے اس حد تک واضح نہیں تھا مگر اکثر لوگ فطرت کی ہدایت سے

اس امر کی طرف توجہ رکھتے ہیں کہ عقل کے مطابق ممکن نہیں ہے کہ ایک انسان ایک روش، مکتب اور نظریہ رکھتا ہو اور چالیس سال ایک قوم میں زندگی گزارے اور بالکل اسے ظاہر نہ کرے قرآن بھی اسی بنیاد کا سہارا لیتا ہے کہ اس سن و سال میں کس طرح ممکن تھا کہ پیغمبر ایسے افکار و نظریات رکھتا ہو اور انہیں بالکل چھپائے رکھے۔

۴۔ سب سے زیادہ ظالم کون ہے ؟ : جیسا کہ ہم سورہ انعام کی آیہ ۲۱ کے ذیل میں اشارہ کر چکے ہیں کہ قرآن میں بہت سے مواقع پر کسی ایک گروہ کو سب سے بڑھ کر ظالم (اظلم) قرار دیا گیا ہے۔ ابتداء میں شاید نظر آئے کہ ان میں ایک دوسرے سے تضاد پایا جاتا ہے کیونکہ جب ایک گروہ کو سب سے زیادہ ظالم قرار دیا جائے تو پھر دوسرے کو کیسے یہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔

اس سوال کے جواب میں ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ تمام عناوین دراصل ایک ہی عنوان کی طرف لوٹتے ہیں اور وہ ہے شرک، کفر، عناد آیاتِ خداوندی کی تکذیب اور خدا پر افتراء۔ زیر بحث آیات میں بھی یہی صورت ہے۔

مزید وضاحت کے لیے جلد ۴ صفحہ ۳۰۵ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

۱۸ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○

ترجمہ

۱۸۔ اور وہ خدا کی بجائے کچھ چیزوں کی پرستش کرتے ہیں کہ جو نہ انھیں نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ فائدہ دیتی ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کے پاس یہ ہمارے شفیع ہیں، کہہ دو: کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ آسمانوں اور زمین میں نہیں جانتا وہ ان شریکوں سے منزّہ اور بلند و برتر ہے جو تم قرار دیتے ہو۔

تفسیر

بے اثر معبود

اس آیت میں بھی بحثِ توحید جاری ہے یہاں بتوں کی الوہیت کی نفی کی گئی ہے اور ایک واضح دلیل کے ذریعے بتوں کا بے وقعت اور بے قیمت ہونا ثابت کیا گیا ہے فرمایا گیا ہے: وہ خدا کی بجائے کچھ معبودوں کی پرستش کرتے ہیں کہ جو نہ انھیں نقصان پہنچا سکتے ہیں کہ ان کی طرف سے نقصان کے خوف سے ان کی پرستش کریں اور نہ ہی انھیں کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں کہ ان کی جانب سے فائدے کی وجہ سے ان کی عبادت کریں (ویعبدون من دون الله مالا یضرھم ولا ینفعھم)۔

واضح ہے کہ اگر فرض کریں بت سود و زیاں پہنچا سکتے پھر بھی عبادت کے لائق نہ تھے لیکن قرآن اس تعبیر کے ذریعے یہ نکتہ سمجھاتا ہے کہ بت پرستوں کے پاس اس بات کا چھوٹے سے چھوٹا بہانہ بھی نہیں ہے اور وہ ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں کہ جن میں بالکل کوئی خاصیت نہیں ہے اور یہ بدترین اور قبیح ترین پرستش ہے۔

اس کے بعد قرآن بت پرستوں کا ایک بے ہودہ دعویٰ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: وہ کہتے ہیں کہ بت بارگاہِ الٰہی میں ہمارے شفیع اور سفارشی ہیں۔ یعنی خود ان سے کچھ نہیں ہو سکتا تو شفاعت کے ذریعے سود و زیاں کر سکتے ہیں (ویقولون ھؤلاء شفعاؤنا عند الله)۔

بت پرستی کا ایک سبب بتوں کی شفاعت کا اعتقاد تھا اور جیسا کہ تاریخ میں آیا ہے جس وقت عربوں کا ایک بزرگ عمرو بن لحی شام کے معدنی پانیوں سے استفادہ کر لیا اور اپنا علاج کر نے اس علاقے میں گیا تو اسے بت پرستوں کا طریقہ بہت اچھا لگا جب اس نے ان سے

اس پرستش کی دلیل پوچھی تو انھوں نے اس سے کہا کہ یہ بُت بارش برسنے، مشکلات حل ہونے اور بارگاہِ خدا میں شفاعت کا ذریعہ ہیں وہ چونکہ ایک فضول سا آدمی تھا اس سے متاثر ہوگیا اور خواہش کی کہ کچھ بُت اسے دیئے جائیں تاکہ وہ انھیں حجاز میں لے جائے اس طریقے سے بُت پرستی اہلِ حجاز میں رائج ہوگئی۔ تو اس خیال کے جواب میں قرآن کہتا ہے، کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جسے آسمانوں اور زمین میں وہ نہیں جانتا (قل اتنبئون الله بما لا یعلم فی السمٰوٰت ولا فی الارض)۔

یہ امر اس کے لیے کنایہ ہے کہ اگر خدا کے پاس ایسے شفیع ہوتے تو وہ زمین و آسمان کے جس نقطے میں ہوتے ان کے وجود سے آگاہ ہوتا کیونکہ علم خدا کی وسعت اس طرح سے ہے کہ آسمان اور زمین میں چھوٹے سے چھوٹا ذرہ بھی ایسا نہیں جس سے وہ آگاہ نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ بالکل اس طرح ہے کہ کسی سے کہا جائے کہ کیا تمھارا کوئی اس طرح کا نمائندہ ہے؟ اور وہ جواب دے کہ میں ایسے نمائندے کے وجود کی خبر نہیں رکھتا، تو یہ اس کے وجود کی نفی کے لیے بہترین ہے کیونکہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص اپنے نمائندہ کے وجود سے بے خبر ہو۔

آیت کے آخر میں تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: خدا ان کے شریکوں سے منزہ اور برتر ہے جو وہ بتاتے ہیں (سبحانہ وتعالٰی عما یشرکون)۔

شفاعت کے بارے میں جلد اوّل ص ۱۸۳ (اُردو ترجمہ) اور جلد اوّل ص ۵۹۵ (اُردو ترجمہ) پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔

۱۹۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ○

ترجمہ

۱۹۔ اور (ابتداء میں) سب لوگ ایک ہی امت تھے پھر وہ اختلاف کرنے لگے اور اگر تیرے پروردگار کی طرف سے (انھیں فوری سزا نہ دینے کے بارے میں) حکم نہ ہوتا تو جس چیز کے بارے میں وہ اختلاف کرتے ہیں اس کا فیصلہ ہوجاتا۔

تفسیر

یہ آیت اس بحث کی مناسبت سے جو گزشتہ آیت میں شرک اور بت پرستی کی نفی کے سلسلے میں گزر چکی ہے تمام انسانوں کی توحیدی فطرت کی طرف اشارہ کرتی ہے اور کہتی ہے "ابتداء میں تمام انسان امت واحدہ تھے اور توحید کے علاوہ کسی کا کوئی دین نہ تھا (وما کان الناس الا امۃ واحدۃ)۔

ابتداء میں تو اس توحیدی فطرت کو کسی کا ہاتھ نہیں لگا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پست افکار اور شیطانی رجحانات کے زیر اثر یہ دگرگوں ہوگئی کچھ لوگ جادۂ توحید سے منحرف ہوگئے اور انھوں نے شرک کا رخ کرلیا یوں فطرتاً انسانی معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ایک گروہ موحد اور دوسرا مشرک (فاختلفوا)۔

اس بناء پر شرک درحقیقت ایک قسم کی بدعت اور فطرت سے انحراف ہے جس کا سرچشمہ کچھ اوہام اور بے بنیاد خیالات ہیں۔

ممکن تھا اس موقع پر یہ سوال کیا جاتا کہ خدا تعالیٰ مشرکین کو فوری طور پر سزا دے کر یہ اختلاف کیوں نہیں ختم کر دیتا تاکہ تمام انسانی معاشرہ پھر موحد بن جائے۔

اس سوال کے جواب کیلئے قرآن بلافاصلہ کہتا ہے: اگر پہلے سے ہدایت کے بارے میں انسانی آزادی کے متعلق خدا کا فرمان نہ ہوتا جو کہ انسانی تکامل اور ترقی کی بنیاد ہے تو خدا بہت جلدی ان کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کر دیتا جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے اور مشرکین و منحرفین کو کیفر کردار تک پہنچا دیتا

(ولولا کلمۃ سبقت من ربک لقضی بینھم فیما فیہ یختلفون)۔

اس بناء پر مندرجہ بالا آیت میں لفظ "کلمۃ" انسانوں کی آزادی کے بارے میں سنت اور حکم فطرت کی طرف اشارہ ہے جو ابتداء سے اسی طرح ہے اگر منحرفین اور مشرکین کو فوراً سزا دے دی جائے تو موحدین کا ایمان تقریباً اضطراری اور جبری ہو جائے گا اور مثلاً خوف اور دہشت کی بناء پر ہوگا ایسا ایمان نہ سرمایہ ایمان ہے نہ تکامل و ارتقاء کی دلیل ہے یہ فیصلہ اور یہ سزا خدا نے زیادہ تر دوسرے جہان کے لیے چھوڑ دی ہے تاکہ نیک اور پاک لوگ آزادی سے اپنی راہ منتخب کریں۔

۲۰۔ وَيَقُولُونَ لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ ءَايَةٌ مِّن رَّبِّهِۦ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا ٱلْغَيْبُ لِلَّهِ فَٱنتَظِرُوٓا۟ إِنِّى مَعَكُم مِّنَ ٱلْمُنتَظِرِينَ ۝

ترجمہ

۲۰۔ اور کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے کیوں کوئی معجزہ نہیں نازل ہوتا کہہ دو، غیب (اور معجزات) خدا کے لیے (اور اس کے حکم سے) ہیں۔ تم انتظار کرو اور میں بھی تمھارے ساتھ انتظار میں ہوں (تم من پسند اور بہانہ جویانہ معجزات کے انتظار میں رہو اور میں بھی تمھاری سزا کے انتظار میں ہوں)۔

تفسیر

من پسند معجزات

ایمان اور اسلام سے روگردانی کرتے ہوئے مشرکین جو بہانے بناتے تھے قرآن دوبارہ ان کا ذکر کر رہا ہے کہتا ہے، مشرکین کہتے ہیں کہ خدا کی طرف سے پیغمبر پر کوئی معجزہ کیوں نازل نہیں ہوتا (ویقولون لولا انزل علیہ اٰیۃ من ربہ)۔

البتہ ان قرائن سے جن کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مراد ہر قسم کا معجزہ نہیں تھا۔ کیونکہ مسلم ہے کہ پیغمبر اسلام کے قرآن کے علاوہ اور بھی معجزات تھے تاریخ اسلام اور بعض آیات قرآن اس حقیقت پر گواہ ہیں بلکہ ان کی مراد یہ تھی کہ جب بھی وہ کسی من پسند معجزے کی خواہش کریں فوراً اسے پورا کیا جائے وہ خیال کرتے تھے کہ اعجاز ایک ایسی چیز ہے جو پیغمبر کے اختیار میں ہے اور آپ خود جس وقت جس قسم کے معجزے کا ارادہ کریں انجام دے سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں شاید وہ سمجھتے تھے کہ اپنی اس قوت سے ہر ہٹ دھرم اور بہانہ جو ضدی کے سامنے کام لیں اور اس کی خواہش کے مطابق عمل کریں۔

لہٰذا بلا فاصلہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے، ان سے کہہ دو کہ معجزہ خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور عالم غیب اور ماوراء الطبیعت سے مربوط ہے (فقل انما الغیب للّٰہ)۔ اس بناء پر معجزہ کوئی ایسی چیز نہیں جو میرے اختیار میں ہو اور میں تمھاری خواہش کے مطابق ہر روز ایک نیا معجزہ دکھاؤں اور پھر بھی تم حیلے بہانے کرکے ایمان نہ لاؤ۔

آیت کے آخر میں تحقیق دھمکی کے انداز میں کہا گیا ہے، اب جبکہ تم ہٹ دھرمی سے دستبردار نہیں ہوتے تو انتظار میں رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ انتظار میں ہوں (فانتظروا انی معکم من المنتظرین)۔ تم خدائی سزا کے انتظار میں رہو اور میں بھی کامیابی کا منتظر ہوں یا یہ کہ تم اس قسم کے معجزہ کے انتظار میں رہو اور میں بھی تم ہٹ دھرم لوگوں کی سزا کے انتظار میں ہوں۔

دواہم نکات

۱۔ آیت میں معجزہ سے کیا مراد ہے ؛ جیسا کہ ہم سطور بالا میں اشارہ کر چکے ہیں لفظ "آیۃ" (معجزہ) اگرچہ مطلق ہے اور اس کے مفہوم میں ہر قسم کا معجزہ شامل ہے لیکن ہمارے پاس ایسے قرائن موجود ہیں جو نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ معرفت پیغمبرؐ کے لیے معجزہ طلب نہیں کرتے تھے بلکہ دل پسند معجزات کے خواہاں تھے یعنی وہ ہر روز ایک نئے معجزے کے طلب گار ہوتے تھے اور اس کے لیے روزانہ رسول اللہؐ سے ایک نیا مطالبہ کرتے تھے اور توقع رکھتے تھے کہ آپؐ ان کا مطالبہ قبول کر لیں گویا ان کی نظر میں پیغمبرؐ ایک بیکار انسان تھے کہ جنہوں نے تمام معجزات کی کلید اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی اور منتظر رہتے تھے کہ کوئی کسی طرف سے آجائے اور ان سے معجزے کی فرمائش کرے وہ اس بات سے غافل تھے کہ اول تو معجزہ فعلِ خدا ہے اور اسی کے فرمان سے انجام پاتا ہے اور دوم یہ کہ معجزہ پیغمبر کی شناخت کے لیے اور لوگوں کی ہدایت کے لیے ہے لہٰذا اس کا ایک ہی موقع اس مقصد کے لیے کافی ہے۔ علاوہ ازیں پیغمبر اسلامؐ نے کافی معجزات ان کے سامنے پیش بھی کیے تھے۔ مزید برآں ان لوگوں کا مقصد اپنی ذاتی خواہشوں کی تسکین کے اور کچھ نہ تھا۔

مندرجہ بالا جملے میں "آیۃ" سے مراد من پسند کے معجزات ہیں۔ اس بات کیلئے مندرجہ ذیل امور کو بطور شاہد پیش کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ آیت کے ذیل میں انھیں دھمکی دی گئی ہے اور اگر واقعاً وہ حقیقت شناسی کے لیے معجزہ طلب کرتے تو انھیں ہرگز تہدید نہ کی جاتی۔

۲۔ پہلے کی چند آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ وہ اس قدر ہٹ دھرم تھے کہ رسول اللہؐ سے کہتے تھے کہ اپنی آسمانی کتاب کو تبدیل کر کے کوئی دوسری کتاب لے آئیں یا کم از کم وہ آیات جو بت پرستی کی نفی کرتی ہیں۔ ان میں ردوبدل کر دیں۔

۳۔ قرآن حکیم میں آیات کی تفسیر کے لیے ایک تسلیم شدہ طریقہ بتایا گیا ہے کہ

القرآن یفسر بعضہ بعضاً۔

یعنی ـــــــ قرآنی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں۔

اس حوالے سے اگر قرآن کی آیات مثلاً سورۂ بنی اسرائیل ۹۰ اور ۹۳ کو دیکھا جائے تو اچھی طرح سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ ہٹ دھرم بت پرست ہدایت کے لیے معجزہ طلب نہیں کرتے تھے اسی لیے کبھی کہتے تھے کہ ہم اس وقت تک آپؐ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک اس خشک زمین سے چشمے نہ نکال کر دکھاؤ۔ کوئی کہتا یہ بھی کافی نہیں ہے بلکہ تمہارے پاس سونے کا محل ہونا چاہیے کوئی اور کہتا کہ اس سے بھی ہماری تسلی نہیں ہوگی بلکہ ہماری آنکھوں کے سامنے آسمان کی طرف پرواز کرو کوئی کہتا کہ آسمان کی طرف پرواز کرنا بھی کافی نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف سے ہمارے نام خط لے کر آؤ۔ اسی طرح کی یاوہ گوئیاں اور فضول باتیں کرتے تھے۔

جو کچھ ہم نے اس ضمن میں کہا ہے اس سے واضح ہوگیا ہے کہ جو لوگ چاہتے ہیں کہ زیر بحث آیت کو ہر قسم کے معجزے یا قرآن کے علاوہ معجزات کی نفی کی دلیل قرار دیں وہ اشتباہ میں ہیں۔

اس مسئلے کے بارے میں مزید وضاحت انشاء اللہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیہ ۹۰ کے ذیل میں آئے گی۔

۲۔ "انما الغیب للہ " میں غیب کا مفہوم، ہوسکتا ہے یہ اس طرف اشارہ ہو کہ معجزہ ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلق عالم غیب سے ہے اور وہ میرے اختیار میں نہیں ہے اور خدا کے ساتھ مخصوص ہے یا اس طرف اشارہ ہو کہ مصالح امور اور یہ کہ کس موقع پر حکمت، مصلحت، تقاضا ہے کہ معجزہ پیش کیا جائے۔ دوسرا یہ غیب میں سے ہے اور خدا کے ساتھ مخصوص ہے۔ وہ جس موقع پر مصلحت دیکھتا ہے اور معجزہ طلب کرنے والے کو حقیقت کا متلاشی سمجھتا ہے، معجزہ نازل کرتا ہے، کیونکہ غیب اور اسرار نہاں اس کی ذات پاک سے مخصوص ہیں۔

ان میں سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

۲۱۔ وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ۭ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۭ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ○

۲۲۔ هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ○

۲۳۔ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۲۱۔ جب لوگوں کو پہنچنے والے نقصان کے بعد ہم انھیں رحمت کا مزہ چکھائیں تو وہ ہماری آیات کے بارے میں مکر کرتے ہیں (اور اس نعمت و رحمت کے لیے غلط سلط توجیہات کرتے ہیں) کہہ دو کہ خدا تم سے زیادہ جلدی چارہ جوئی کرتا ہے اور جو کچھ مکر (اور سازش) تم کرتے ہو ہمارے رسول اُسے لکھتے ہیں۔

۲۲۔ وہ وہ ہے جو تمھیں خشکی اور دریا میں سیر کراتا ہے یہاں تک کہ تم کشتی میں ہوتے ہو اور موافق ہوائیں انھیں (منزلِ مراد کی طرف) لے جاتی ہیں اور وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ اچانک سخت آندھیاں چلنے لگتی ہیں اور ہر طرف سے موجیں انھیں گھیر لیتی ہیں اور وہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ وہ ہلاک ہو جائیں گے تو اس وقت اپنے عقیدے کو خالص کرکے اسی کے واسطے کہہ کے خدا کو پکارتے ہیں کہ اگر تو ہمیں نجات دے دے تو ہم یقیناً شکر ادا کریں گے۔

۲۳۔ لیکن جب اس نے انھیں نجات بخشی تو وہ (دوبارہ) زمین میں ناحق ظلم کرتے ہیں۔ اے لوگو! تمھارے ظلم و ستم تمھارے ہی لیے نقصان دہ ہیں۔ دنیاوی زندگی سے فائدہ (اٹھاتے ہو) پھر جلد ہی تمھاری بازگشت ہماری طرف ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو (خدا) تمھیں اس کی خبر دے گا۔

تفسیر

ان آیات میں دوبارہ گفتگو عقائد کے بارے میں اور مشرکین کے کرتوتوں کے بارے میں ہے۔ نیز انھیں توحید کی طرف اور شرک کی نفی کی جانب دعوت دی گئی ہے۔

زیر نظر پہلی آیت میں مشرکین کی ایک جاہلانہ سازش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: جب لوگوں کو بیداری اور آگاہی کے لیے ہم مشکلات اور نقصانات میں گرفتار کرتے ہیں پھر انھیں دور کرکے ہم انھیں سکون اور اپنی رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ ہماری طرف متوجہ ہوں ان آیات اور نشانیوں کا مذاق اڑاتے ہیں یا غلط توجیہات کرکے ان کا انکار کرنے لگتے ہیں مثلاً مصائب و مشکلات کو بتوں کے غیظ و غضب کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور راحت و نعمت کو ان کی شفقت و محبت کی دلیل کہتے ہیں یا پھر سب کو اتفاقات شمار کرتے ہیں
(واذا اذقنا الناس رحمة من بعد ضراء مستهم اذا لهم مكر في اٰياتنا)۔

لفظ "مکر" جو مندرجہ بالا آیت میں آیا ہے، ہر قسم کی چارہ جوئی کے معنی میں ہے یہ ان غلط توجیہات اور فرار کی راہوں کی طرف اشارہ ہے جو مشرکین آیات الٰہی کے نزول، بلاؤں کی آمد اور نعمتوں کے ظہور کے وقت سوچتے تھے۔

لیکن اللہ انھیں اپنے پیغمبر کے ذریعے خبردار کرتا ہے کہ "ان سے کہہ دو: کہ خدا ہر کسی سے بڑھ کر سرکوبی کرنے والی چارہ جوئی اور منصوبہ بندی پر قادر ہے اور زیادہ تیز ہے (قل الله اسرع مكرا)۔

جیسا کہ ہم نے بارہا اشارہ کیا ہے "مکر" ہم قسم کی ایسی چارہ جوئی کو کہتے ہیں جسے خفیہ طور پر بجا لایا جائے اور اس کا وہ معنی نہیں جو آج کل فارسی میں مروج ہے۔ فارسی میں آج کل "مکر" میں شیطانی کاموں کا مفہوم بھی شامل ہے لہٰذا اس لفظ کے حقیقی معنی کو سامنے رکھا جائے تو یہ خدا کے بارے میں بھی صادق آتا ہے اور بندوں کے بارے میں بھی۔[1]

باقی رہا یہ کہ زیر بحث آیت میں اس "مکر" کا مصداق کیا ہے تو ظاہراً پروردگار کی انھی سزاؤں کی طرف اشارہ ہے کہ جن میں سے بعض انتہائی مخفی طور پر اور بغیر کسی تمہید کے بڑی تیز رفتاری سے آپہنچتی ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات تو مجرمین کو خود انھی کے ہاتھ سے سزا دی جاتی ہے۔

واضح ہے کہ وہ ذات جو سب سے زیادہ قادر ہے، موانع دور کرنے اور اسباب مہیا کرنے کی سب سے زیادہ طاقت رکھتی ہے اس کے منصوبے اور تدبیریں بھی سب سے زیادہ تیز ہوں گی دوسرے لفظوں میں وہ جس وقت کسی کو سزا دینے اور تنبیہ کرنے کا ارادہ کرے

---

[1] مزید وضاحت کے لیے جلد ۱ صفحہ ۱۳۱، جلد ۲ صفحہ ۱۸۹ اور جلد ۳ صفحہ ۲۳۰ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

تیسرا فوراً عملی صورت اختیار کر لیتی ہے جبکہ دوسرے اس طرح سے نہیں ہیں۔

اس کے بعد انھیں تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ گمان نہ کرو کہ یہ سازشیں اور منصوبے فراموش ہو جائیں گے بلکہ ہمارے بھیجے ہوئے یعنی اعمال ثبت کرنے والے فرشتے ان تمام منصوبوں اور سازشوں کو لکھ لیتے ہیں جنھیں تم لوگوں کو خاموش کرنے کے لیے تیار کرتے ہو (ان رسلنا یکتبون ماتمکرون)۔ لہٰذا تم اپنے آپ کو جوابدہی اور دوسرے جہان میں سزا پانے کے لیے تیار کر لو۔

ثبت اعمال اور اس کام پر مامور فرشتوں کے بارے میں ہم متعلقہ آیات کے ذیل میں بحث کریں گے۔

اگلی آیت میں انسانی فطرت کی گہرائیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے سامنے توحید فطری کا ایک نمونہ پیش کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ عظیم مشکلات اور خطرے کے وقت کس طرح انسان خدا کے علاوہ تمام چیزوں کو بھول جاتا ہے لیکن جونہی مصیبت ٹلتی ہے اور مشکلات کی آگ ٹھنڈی پڑتی ہے تو وہ دوبارہ ظلم و ستم کی راہ اختیار کر لیتا ہے اور خدا سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ خدا وہ ہے جو تمھیں صحرا اور دریا میں سیر کراتا ہے (ھو الذی یسیرکم فی البر والبحر)، یہاں تک کہ جب تم کشتی میں سوار ہوتے ہو اور کشتی میں سوار لوگوں کو موافق ہوائیں آہستہ آہستہ مقصد کی طرف لے جا رہی ہوتی ہیں اور سب کے سب شاداں اور خوش ہوتے ہیں" (حتّٰی اذا کنتم فی الفلک وجرین بھم بریح طیبۃ وفرحوا بھا)۔" اچانک شدید طوفان اور تباہ کن آندھیاں چلنے لگتی ہیں اور ہر طرف سے موجیں اٹھتی ہیں اس طرح سے کہ انھیں اپنی موت نظر آنے لگتی ہے اور وہ زندگی سے گویا ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں (جاءتھا ریح عاصف وجاءھم الموج من کل مکان وظنوا انھم احیط بھم)۔ ٹھیک اس وقت وہ خدا کو یاد کرنے لگتے ہیں اور اسے خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں اور اپنے دین کو ہر قسم کے شرک اور بت پرستی سے پاک کر لیتے ہیں (دعوا اللّٰہ مخلصین لہ الدین)۔

اس وقت وہ دست دعا بلند کرتے ہیں اور کہتے ہیں: خدایا اگر تو نے ہمیں اس ہلاکت انگیزی سے نجات بخش دی تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے، قسم کریں گے نہ تیرے غیر کی طرف رُخ موڑیں گے (لئن انجیتنا من ھٰذہ لنکونن من الشاکرین)۔

لیکن جب خدا انھیں نجات دے دیتا ہے اور وہ ساحل مراد تک جا پہنچتے ہیں تو زمین میں ظلم و ستم شروع کر دیتے ہیں (فلما انجاھم اذا ھم یبغون فی الارض بغیر الحق)۔

مگر اے لوگو! جان لو کہ جیسے ظلم کے مرتکب ہو گے اور حق سے جس قدر انحراف کرو گے اس کا نقصان خود تمھی ہی کو ہو گا" (یا ایھا الناس انما بغیکم علی انفسکم)۔ آخری کام جو تم انجام دے سکتے ہو یہ ہے کہ "چار روزہ حیاتِ دنیا کی متاع سے فائدہ اٹھا لو" (متاع الحیٰوۃ الدنیا)۔[1] "اس کے بعد تمھاری بازگشت ہماری طرف ہے" (ثم الینا مرجعکم)۔ "اس وقت ہم تمھیں اس سے آگاہ کریں گے جو تم انجام دیتے تھے (فننبئکم بما کنتم تعملون)۔

---

[1] لفظ "متاع" ایک فعل مقدر کے مفعول ہے اصل میں یوں تھا: تتمتعون متاع الحیٰوۃ الدنیا۔

چند اہم نکات

۱۔ لوگ عموماً ایسا کرتے ہیں:- مندرجہ بالا آیت میں جو کچھ ہم نے پڑھا ہے وہ مشرکین کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ گناہ آلودہ، دنیا پرست، کم ظرف اور فراموش کار افراد ایسا کرتے ہیں جب انھیں بلا و مصیبت کی موجیں گھیر لیتی ہیں وہ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں لیکن کچھ نہیں بنتا گویا تلوار ان کی شہ رگ تک آپہنچتی ہے اور انھیں کوئی یار و مددگار نظر نہیں آتا تو بارگاہِ خدا میں ہاتھ اٹھاتے ہیں اس سے ہزاروں عہد و پیمان کرتے ہیں اور نذر و نیاز مانتے ہیں کہ اگر بلاؤں اور مصائب سے نجات ملی تو یہ کریں گے اور وہ کریں گے لیکن یہ بیداری اور آگاہی جو توحید فطری کا انعکاس ہے ایسے افراد میں زیادہ دیر نہیں رہتی ——— جونہی طوفانِ بلا ختم ہوجاتا ہے اور مشکل حل ہو جاتی ہے، غفلت کے پردے ان کے دل پر پڑجاتے ہیں ——— ایسے بھاری پردے کہ جنہیں طوفانِ بلا کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہٹا سکتی۔

یہ وقتی بیداری اگرچہ زیاں آلودہ افراد پر کوئی تربیتی اثر نہیں کرتی تاہم ان پر حجت تمام کر دیتی ہے اور یہی ان کے مذموم و محکوم ہونے کی دلیل بن جائے گی۔

دوسری طرف کم آلودہ افراد ایسے حوادث میں عموماً بیدار ہوجاتے ہیں اور اپنے طریق کار کی اصلاح کرلیتے ہیں۔

باقی رہے بندگانِ خدا تو ان کا حساب کتاب واضح ہے وہ عالمِ سکون میں بھی خدا کی طرف اتنا ہی متوجہ رہتے ہیں، جتنا سختی اور تنگی کے عالم میں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہر خیر و برکت جو ظاہراً طبیعی اور فطری عوامل کے ذریعہ انھیں پہنچتی ہے درحقیقت خدا کی طرف سے ہے۔

بہرحال یہ یاد آوری اور تذکر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ہے۔

۲۔ "ضراء" کے مقابلے میں "رحمت" مندرجہ بالا آیات میں "ضراء" (یعنی پریشانی اور نقصان) کے مقابلے میں "رحمت" کا ذکر ہے نہ کہ "سراء" (خوشی اور مسرت) کا۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جیسی بھی اچھائی اور بھلائی انسان کو پہنچے وہ خدا کی طرف سے ہے اور اس کی رحمت بے پایاں ہے جب کہ مشکلات اگر درسِ عبرت کے طور پر نہ ہوں تو خود انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

۳۔ ضمیروں کا فرق کیوں ہے؟ زیر بحث دوسری آیت کی ابتدا میں مخاطب کی ضمیریں ہیں لیکن بعد میں غائب کی ضمیر ہیں۔

یقیناً اس میں کوئی نکتہ ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آیت کے لب و لہجہ میں یہ تبدیلی اس بناء پر ہے کہ مشرکین کی حالت جب وہ گرفتارِ بلا ہوں تو دوسروں کے لیے درسِ عبرت کے طور پر ان کا ذکر کیا جائے اس لیے انھیں غائب فرض کیا گیا ہے اور باقی کو حاضر۔

بعض دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ اس میں یہ نکتہ ہے کہ ان سے بے اعتنائی اور ان کی تحقیر کا اظہار ہو گویا پہلے خدا تعالیٰ انھیں حاضر کے طور پر قبول کرکے مخاطب قرار دیتا ہے اس کے بعد انھیں اپنے سے دور کرکے چھوڑ دیتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ آیت لوگوں کی ایک فطری تصویر پیش کر رہی ہے کہ جب تک وہ کشتی میں بیٹھے ہیں اور ساحل سے دور نہیں ہوئے تو دیگر لوگوں کے درمیان ہیں لہٰذا مخاطب قرار پا سکتے ہیں لیکن جب کشتی انھیں ساحل سے دور کر دیتی ہے۔ اور وہ آہستہ آہستہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں تو غائب شمار ہوتے ہیں اور یہ دو مختلف حالتوں میں ان کی فطری تصویر کشی ہے

۴۔ "احیط بھم" کا مفہوم : اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ہر طرف سے امواج بلا میں گھرے ہوئے ہیں لیکن یہ یہاں ہلاکت اور نابودی کے لیے کنایہ ہے جو اس حالت کا لازمی نتیجہ ہے۔

۲۴۔ اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا یَاْكُلُ النَّاسُ وَ الْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّیَّنَتْ وَ ظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْهَاۤ ۙ اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا لَیْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِیْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ○

۲۵۔ وَ اللّٰهُ یَدْعُوْۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ○

ترجمہ

۲۴۔ دنیاوی زندگی اس پانی کی طرح ہے جسے ہم نے آسمان کی طرف سے نازل کیا ہے کہ جس کے اثر سے طرح طرح کے نباتات اُگتے ہیں جنھیں انسان اور چوپائے کھاتے ہیں، یہاں تک کہ زمین (ان سے) اپنی زیبائی حاصل کرتی ہے اور مزین ہو جاتی ہے اور اس کے رہنے والے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے کہ (اچانک ان کی نابودی کے لیے) ہمارا حکم آ پہنچتا ہے (اور ہم سردی یا بجلی کو ان پر مسلط کر دیتے ہیں) اور اس طرح سے کاٹ ڈالتے ہیں کہ گویا بالکل کچھ تھا ہی نہیں۔ یوں ہم اپنی آیات اس گروہ کے لیے تفصیل سے بیان کرتے ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔

۲۵۔ اور خدا صلح و سلامتی کے گھر کی طرف دعوت دیتا ہے اور جسے چاہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

تفسیر

دنیاوی زندگی کی دُور نمائی

گزشتہ آیات میں دنیاوی زندگی کی ناپائیداری کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ زیر نظر پہلی آیت میں اس حقیقت کو ایک عمدہ مثال کے

ذریعے بیان کیا گیا ہے تاکہ غرور اور غفلت کے پردے غافل اور طغیان گروں کی نظروں کے سامنے سے ہٹا دیئے جائیں۔

ارشاد ہوتا ہے: دنیاوی زندگی کی مثال اس پانی کی طرح ہے جسے ہم نے آسمانوں سے نازل کیا ہے (انما مثل الحیوۃ الدنیا کماء انزلناہ من السماء)۔ بارش کے یہ حیات بخش قطرے آمادہ زمینوں پر گرتے ہیں اور ان کے ذریعے طرح طرح کے نباتات اگتے ہیں ان میں سے بعض انسانوں کے لیے مفید ہیں اور بعض جانوروں کے لیے (فاختلط بہ نبات الارض مما یاکل الناس والانعام)۔

یہ نباتات زندہ موجودات کے لیے غذا بھی فراہم کرتے ہیں اور علاوہ ازیں سطح زمین کو بھی ڈھانپ دیتے ہیں اور اسے زینت بخشتے ہیں یہاں تک کہ زمین بہترین زیبائی حاصل کرتی ہے اور مزین ہو جاتی ہے (حتی اذا اخذت الارض زخرفھا وازینت)۔

اس طرح شگوفے شاخساروں کو زینت بخشتے ہیں، پھول کھلے ہیں، سبزہ زار نور آفتاب سے چمکنے لگے ہیں۔ پتے اور شاخیں ہواؤں کے چلنے سے رقص کرنے لگتے ہیں۔ اناج کے دانے اور پھل آہستہ آہستہ نکلنے لگتے ہیں اور حسن دنیا میں بھرپور زندگی مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے، دل امید سے اور آنکھیں سرور سے معمور ہو جاتی ہیں اس طرح کہ "اہل زمین مطمئن ہو جاتے ہیں کہ وہ نباتات کی ان نعمات سے بہرہ مند ہوں گے" پھلوں سے بھی استفادہ کریں گے اور حیات بخش دانوں سے بھی (وظن اھلھا انھم قادرون علیھا)۔

لیکن اچانک ہمارا حکم آپہنچتا ہے (سخت سردی، شدید ژالہ باری یا تباہ کن طوفان ان پر مسلط ہو جاتا ہے) اور ہم انھیں اس طرح سے کاٹ دیتے ہیں گویا وہ اصلاً تھے ہی نہیں (اتاھا امرنا لیلا او نھارا فجعلناھا حصیدا کان لم تغن بالامس)۔

"تغن" مادہ "غنا" سے کسی جگہ قیام کرنے کے معنی میں ہے۔ اسی بناء پر "لم تغن بالامس" کا معنی ہے "کل وہاں مکان میں نہ تھا" اور یہ کنایہ کے طور پر اس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جو اس طرح سے بالکل ختم ہو جائے کہ گویا اس کا ہرگز وجود ہی نہ تھا۔

آیت کے آخر میں زیادہ تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: یوں ہم تفکر کرنے والے لوگوں کے لیے تفصیل سے آیات بیان کرتے ہیں (کذٰلک نفصل الاٰیات لقوم یتفکرون)۔

جو کچھ کہا جا چکا ہے وہ ناپائیدار، پُر فریب اور زرق برق مادی دنیا کی واضح اور دلچسپ تصویر ہے۔ اس زندگی کا مقام پائیدار ہے نہ ثروت اور نہ ہی یہ امن و سلامتی کی جگہ ہے لہٰذا بعد والی آیت میں ایک مختصر سے جملے کے ذریعے اس کے مقابل دوسری زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا دار السلام، صلح و سلامتی اور امن و آشتی کے گھر کی طرف دعوت دیتا ہے (واللّٰہ یدعوا الیٰ دار السلام)۔ وہ جگہ کہ جہاں مادی زندگی کے ان غارت گروں کی کشمکش کی کوئی خبر ہے اور نہ ہی خدا سے بے خبر ذخیرہ اندوزوں کی ناجائز مزاحمت کا کوئی پتہ اور نہ ہی وہاں جنگ، خونریزی، استعمار اور استثمار ہے اور یہ تمام مفاہیم لفظ

"دارالسلام" (یعنی امن و سلامتی کا گھر) میں جمع ہیں۔
اگر اس دنیا کی زندگی بھی توحیدی اور آخرت والی شکل اختیار کرے تو یہ بھی دارالسلام میں تبدیل ہو جائے اور اس کی صورت "مزرعہ جادیدہ طوفان زدہ" والی نہیں رہے گی۔
اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: خدا جسے چاہے (اور اہل پائے) راہِ مستقیم کی طرف دعوت دیتا ہے کہ جو راہ دارالسلام ہے اور جو امن و آشتی کے مرکز تک جا پہنچتی ہے (ویھدی من یشاء الی صراط مستقیم)۔

دو قابلِ توجہ نکات

۱۔ دنیا کی ناپائیداری کے لیے مثال: قرآن ایک انسان ساز اور تربیت کرنے والی کتاب ہے لہٰذا بہت سے مواقع پر حقائقِ عقلی کو واضح کرنے کے لیے اس میں مثال پیش کی گئی ہے۔ بعض اوقات ایسا امور جو کئی سال طویل ہوتے ہیں انھیں بھی ایک زود گزر اور قابلِ غور منظر کے طور پر مجسم کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔
ایک انسان یا ایک نسل کی بھرپور زندگی کی تاریخ کہ جو کبھی ایک سو سال پر مشتمل ہوتی ہے کا مطالعہ عام افراد کے لیے کوئی آسان کام نہیں لیکن جب بہت سے نباتات کی زندگی کہ جو چند ماہ میں ختم ہو جاتی ہے (پیدائش، نشو و نما، خوبصورتی اور پھر نابودی) کا منظر اس کے سامنے پیش کر دیا جائے تو وہ بڑی سہولت سے اپنی زندگی کی کیفیت اس صاف و شفاف آئینہ میں دیکھ سکتا ہے۔
اس منظر کو ٹھیک طرح سے اپنی آنکھوں کے سامنے لایئے کہ ایک باغ ہے جو درختوں، سبزہ زاروں سے بھرا پڑا ہے۔ سب کے سب درخت پھل دار ہیں۔ باغ میں ہر طرف زندگی پھیل رہی ہے مگر کسی تاریک رات میں یا روزِ روشن میں اچانک سیاہ بادل آسمان پر امنڈ آتے ہیں۔ بادل گرجتے ہیں اور بجلی چمکتی ہے۔ طوفان، موسلا دھار بارش اور زبردست ژالہ باری شروع ہو جاتی ہے۔ باغ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔
دوسرے روز جب ہم باغ میں آتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ درخت ٹوٹے پڑے ہیں۔ سبزہ زار ویران اور پژمردہ ہو چکے ہیں اور ہر چیز برباد ہو کر زمین پر پڑی ہے۔ ہمیں یقین نہیں آتا کہ یہ وہی سرسبز اور آباد باغ ہے جو کل ہرا بھرا اور کھلا ہوا تھا۔
جی ہاں! انسان کی زندگی کا بھی یہی ماجرا ہے خصوصاً ہمارے زمانے میں کہ کبھی ایک زلزلہ یا چند گھنٹوں کی ایک جنگ یا ایک آباد اور خوش و خرم شہر کو اس طرح سے برباد اور ویران کر دیتی ہے کہ اس میں ایک ویرانے کے اور کچھ ٹکڑے جسموں کے کچھ باقی نہیں رہتا۔
وہ لوگ کس قدر غافل ہیں جنھوں نے ایسی ناپائیدار زندگی سے دل لگا لیا ہے۔
۲۔ "اختلط بہ نبات الارض" کا مفہوم: اس جملے میں توجہ کرنا چاہیے کہ اختلاط اصل میں، جیسا کہ راغب نے کہا ہے دو یا دو سے زیادہ چیزوں کو جمع کرنا ہے چاہے وہ مائع ہوں یا ٹھوس۔ "امتزاج" کی نسبت "اختلاط" عام ہے (کیونکہ امتزاج عموماً مایعات میں ہوتا ہے) لہٰذا جملے کا معنی یہ ہوگا کہ بارش کے ذریعے ہر طرح کے نباتات ایک دوسرے

مل جاتے ہیں ۔ وہ نباتات جو انسان کے کام آتے ہیں یا جانوروں کے کام آتے ہیں ۔[1]

یہ جملہ ضمنی طور پر اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ خدا بارش کے پانی سے جو ایک ہی طرح کا ہوتا ہے، انواع و اقسام کے نباتات اگاتا ہے کہ جو انسانوں اور جانوروں کی مختلف ضروریات کے لیے مختلف قسم کے غذائی مواد مہیا کرتے ہیں۔

---

[1] جو کچھ سطورِ بالا میں کہا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ " بہ " میں " باء " سببیت کے معنی میں ہے لیکن بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ " مع " کے معنی میں ہے یعنی پانی آسمان سے نازل ہوتا ہے اور نباتات سے مل جاتا ہے اور انہیں نشوونما دیتا ہے لیکن یہ احتمال آیت کے اس جملے سے مناسبت نہیں رکھتا جس میں کہا گیا ہے " مما یاکل الناس والانعام " کیونکہ اس جملے کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اختلاط مختلف قسم کے نباتات کے درمیان مراد ہے نہ کہ پانی اور نباتات کا اختلاط۔ (غور کیجیے گا)

۲۶۔ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

۲۷۔ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

ترجمہ

۲۶۔ جو لوگ نیکی کرتے ہیں وہ اس کے لیے اچھی اور زیادہ جزا رکھتے ہیں اور تاریکی و ذلت ان کے چہروں کو نہیں ڈھانپتی۔ وہ بہشت کے ساتھی ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

۲۷۔ باقی رہے وہ لوگ جو گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں وہ اس کے برابر بری جزا رکھتے ہیں اور ذلت و خواری ان کے چہروں کو ڈھانپ لیتی ہے اور کوئی چیز انھیں خدا (کی سزا) سے نہیں بچا سکتی (ان کے چہرے اس قدر سیاہ ہیں کہ) گویا تاریک رات کے ٹکڑوں نے ان کے چہروں کو ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ آگ کے ساتھی ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

تفسیر

سفید اور سیاہ چہروں والے

گزشتہ آیات میں دار آخرت اور روز قیامت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اسی مناسبت سے زیر بحث آیات دار آخرت میں نیکوکاروں اور گناہگاروں کا انجام بیان کر رہی ہیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ اچھے کام کرتے ہیں ان کے لیے اچھی اور زیادہ جزا ہے (للذین احسنوا الحسنٰی و زیادۃ)[1]

---

[1] توجہ رہے کہ اس جملے میں "حسنیٰ" مبتدائے مؤخر ہے اور آیت کا معنی اس طرح ہے: الحسنیٰ للذین احسنوا ـــــــ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ کہ اس جملے میں "زیادۃ" سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آیات قرآن ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کئی گنا جزا اور ثواب کی طرف اشارہ ہے یہ جزا کبھی دس گنا ہوتی ہے اور کبھی ہزاروں گنا (خلوص، پاکیزگی، تقویٰ اور عمل کی قدر و حیثیت کے اعتبار سے)۔

سورۂ انعام آیہ ۱۶۰ میں ہے:

من جاء بالحسنة فله عشر امثالها۔

جو شخص کوئی اچھا کام انجام دے گا اسے اس کے دس گنا جزا ملے گی۔

ایک اور مقام پر ہے:

فاما الذين امنوا وعملوا الصلحت فيوفيهم اجورهم ويزيدهم من فضله

رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے تو خدا انھیں پوری جزا دے گا اور اپنے فضل و کرم سے بھی اس پر زیادہ کرے گا۔ (نساء — ۱۷۳)

سورۂ بقرہ میں انفاق سے مربوط آیات میں بھی نیکوکار لوگوں کی جزا سات صد یا کئی گنا بیان کی گئی ہے۔

(بقرہ — ۲۶۱)

ایک اور نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ یہ بات ممکن ہے کہ یہ زیادتی دوسرے جہان میں متواتر اور ہمیشہ بڑھتی رہے یعنی ہر روز خدا کی طرف سے انھیں نئی نعمت اور لطف و کرم عطا ہوتا رہے۔ در حقیقت یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ دوسرے جہان کی زندگی ایک ہی طرح کی نہیں ہے اور غیر محدود طور پر تکامل وارتقاء کی طرف بڑھتی رہے گی۔

اس آیت کی تفسیر میں پیغمبر اکرمؐ سے جو روایات نقل ہوئی ہیں ان کے مطابق "زیادۃ" سے مراد پروردگار کی ذات پاک کے جلوہ کی طرف توجہ اور اس عظیم معنوی نعمت سے استفادہ کرنا ہے۔ ممکن ہے یہ اسی مذکورہ نکتے کی طرف اشارہ ہو۔

چند ایک روایات جو آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول ہیں ان میں لفظ "زیادۃ" کا مطلب دنیاوی نعمات بیان کیا گیا ہے۔ یعنی دوسرے جہان کی جزا کے علاوہ خدا تعالیٰ نیک لوگوں کو دنیاوی نعمات سے بھی بہرہ مند کرے گا۔

لیکن کوئی امر مانع نہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں لفظ "زیادۃ" تمام نعمات کی طرف اشارہ ہو۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ اس روز نیک لوگوں کے چہرے درخشاں اور چمکتے ہوئے ہوں گے اور تاریکی و ذلت ان کے چہروں کو نہیں چھپائے گی (ولا يرهق وجوههم قتر ولا ذلة)۔

"یرھق" مادہ "رھق" سے جبری طور پر چھپانے کے معنی میں ہے اور "قتر" کا معنی ہے غبار یا دھواں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ لوگ اہل بہشت ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے (اولئك اصحب الجنة هم فيها خلدون)۔

(بقیہ حاشیہ) اور لفظ "زیادۃ" جس کا اس پر عطف ہے معرفہ آیا ہے نیز "الحسنی"، "المثوبۃ" کی صفت ہے کہ جو مقدر ہے اور یہ موصوف کی جگہ پر ہے۔

"اصحاب" کی تعبیر اس مناسبت کی طرف اشارہ ہے جو اس گروہ کی روحانیت اور جنت کے ماحول کے درمیان ہے۔

دوسری آیت میں دوزخیوں کے بارے میں گفتگو ہے جو پہلے گروہ کے مدِ مقابل ہیں فرمایا گیا ہے: جو لوگ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں انھیں ان کے عمل کے مطابق بُری جزا ملے گی (والذین کسبوا السیئات جزاء سیئة بمثلها)۔

یہاں "زیادة" کا ذکر نہیں ہے کیونکہ جزا میں زیادتی فضل و رحمت ہے لیکن سزا میں عدالت کا تقاضا ہے کہ وہ ذرہ برابر بھی گناہ سے زیادہ نہ ہو۔ لیکن یہ لوگ پہلے لوگوں کے برعکس سیاہ چہرے والے ہوں گے اور ان کے چہروں کو ذلت و رسوائی نے ڈھانپ رکھا ہوگا (وترهقهم ذلة)[1]۔

ممکن ہے سوال کیا جائے کہ عدالت کا تقاضا ہے کہ انھیں گناہ سے زیادہ سزا نہ دی جائے جبکہ ان کے چہرے کی سیاہی، ذلت کی گرد ان کے لیے ایک زیادتی ہے۔ لیکن توجہ رہے کہ یہ عمل کی خاصیت اور اثر ہے جو انسان کی روح کے اندر سے باہر منعکس ہوتا ہے یہ بالکل اسی طرح ہے کہ ہم کہیں کہ شرابیوں کو کوڑے لگانے چاہییں جبکہ شراب معدہ، دل، جگر اور اعصاب میں طرح طرح کی بیماریاں بھی پیدا کر دیتی ہے۔

بہر حال ممکن ہے بدکار یہ گمان کریں کہ انھیں کوئی راہِ فرار مل جائے گی یا بُت وغیرہ ان کی شفاعت کر سکیں گے لیکن اگلا جملہ صراحت کہتا ہے: کوئی شخص اور کوئی چیز انھیں خدائی سزا سے نہ بچا سکے گی (ما لهم من الله من عاصم)۔

ان کے چہروں کی تاریکی اور سیاہی اتنی زیادہ ہوگی "گویا ایک رات کے ٹکڑے یکے بعد دیگرے ان کے چہروں پر پڑے ہوئے ہیں" (كانما اغشيت وجوههم قطعا من الليل مظلما)

"وہ اہلِ نار ہیں اور ہمیشہ اس (جہنم) میں رہیں گے" (اولئك اصحب النار هم فيها خلدون)۔

---

[1] ہوسکتا ہے گزشتہ آیت کے قرینہ سے "ترهقهم ذلة" تقدیراً "ترهقهم قتر و ذلة" ہو اور مقابلہ کے قرینہ سے اختصار کے لیے "قتر" وہاں سے حذف ہوا ہو۔

۲۸۔ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ ۖ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ○

۲۹۔ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ○

۳۰۔ هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَا أَسْلَفَتْ ۚ وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ ۖ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ○ ع

ترجمہ

۲۸۔ اس دن کو یاد کرو جب ہم ان سب کو جمع کریں گے اس کے بعد مشرکین سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے معبود اپنی جگہ پر رہو (تاکہ تمہارا حساب کتاب لیا جائے) پھر انھیں ہم ایک دوسرے سے جدا کر دینگے (اور ہر ایک سے الگ الگ سوال کریں گے) اور ان کے معبود (ان سے) کہیں گے کہ تم (ہرگز) ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔

۲۹۔ ہمارے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے خدا کافی ہے کہ ہم کسی طرح بھی تمہاری عبادت سے آگاہ نہ تھے۔

۳۰۔ اس وقت (اور وہاں) ہر شخص نے جو پہلے سے عمل کیا ہو گا اسے آزمائے گا اور سب کے سب اللہ، اپنے مولا اور حقیقی سرپرست کی طرف پلٹ جائیں گے اور جنھیں وہ جھوٹ موٹ خدا کا شریک قرار دیتے تھے ان سے کھو جائیں گے اور نابود ہو جائیں گے۔

تفسیر

قیامت میں بت پرستوں کا ایک منظر

ان آیات میں بھی گزشتہ مباحث جاری ہیں جو کہ مبداء و معاد اور مشرکین کی کیفیت کے بارے میں تھیں۔ ان آیات میں ان کی

اس حالت بے چارگی کی تصویر کشی کی گئی ہے جب وہ دن اپنی کے حضور اور ان کی بارگاہ و حساب و کتاب میں حاضر ہوں گے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اس دن کو یاد کرو جس میں ہم تمام بندوں کو جمع اور محشور کریں گے (ویوم نحشرهم جمیعًا)۔ اس کے بعد ہم مشرکین سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے معبود اپنی جگہ پر ٹھہرو تاکہ تمہارا حساب کتاب دیکھا جائے" (ثم نقول للذین اشرکوا مکانکم انتم وشرکاؤکم)[1]

یہ بات توجہ طلب ہے کہ زیر نظر آیت میں بتوں کو "شرکاؤکم" کہا گیا ہے یعنی "تمہارے شریک" جبکہ مشرکین بتوں کو خدا کا شریک قرار دیتے تھے نہ کہ اپنا۔

یہ تعبیر درحقیقت اس نکتے کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ بُت دراصل خدا کے شریک نہیں تھے اور یہ بُت پرستوں کے موہوم خیالات تھے کہ جن کی بنا پر انھوں نے انھیں یہ حیثیت دے رکھی تھی یعنی وہ تمہارے انتخاب شدہ شریک تھے۔

یہ بات بالکل اسی طرح ہے کہ ہم کہیں کہ آؤ دیکھو تمہارے اس استاد اور سربراہ نے کیا کچھ نہیں کیا (حالانکہ وہ اس کا استاد اور سربراہ نہیں ہے بلکہ مدرسہ کا معلم اور سربراہ ہے لیکن اس نے اسے اپنا لیا ہے)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: "ان دو گروہوں (معبود اور عابد) کو ہم ایک دوسرے سے الگ کر دیں گے" اور ہر ایک سے الگ الگ سوال کریں گے (جیسا کہ تمام عدالتوں میں یہ معمول ہے کہ ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ سوال کیا جاتا ہے) بُت پرستوں سے سوال کریں گے کہ کس دلیل کی بناء پر تم نے ان بتوں کو خدا کا شریک قرار دیا تھا اور ان کی عبادت کرتے تھے اور معبودوں سے بھی پوچھیں گے کہ تم کس بنا پر معبود بنے تھے یا اس کام کے لیے تیار ہوئے تھے (فزیلنا بینهم)[2]

جنھیں انھوں نے شریک بنایا تھا اس وقت وہ بول اٹھیں گے" اور کہیں گے تم ہرگز ہماری پرستش نہیں کرتے تھے" (وقال شرکاؤهم ما کنتم ایانا تعبدون) تم درحقیقت بتوں اور اپنے اوہام و خیالات کی پرستش کرتے تھے نہ کہ ہماری۔ علاوہ ازیں تمہارا یہ ہماری عبادت کرنا ہمارے فرمان سے نہ تھا اور نہ ہی ہماری رضا سے تھا اور ایسی عبادت دراصل عبادت ہی نہیں ہے۔

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے کہیں گے: ہمارے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے خدا کافی ہے کہ ہم کسی طرح بھی تمہاری عبادت سے

---

[1] "مکانکم" اصل میں فعل مقدر کا مفعول ہے اور حقیقت میں یوں تھا: الزموا مکانکم انتم وشرکاؤکم حتی تسئلوا"۔ یہ جملہ فی الحقیقت سورہ الصّٰفّٰت کی آیہ ۲۴ کے مشابہ ہے جہاں فرمایا گیا ہے:

وقفوهم انهم مسئولون۔

انھیں ٹھہراؤ ان سے سوال ہوتا ہے۔

[2] "فزیلنا" "تزییل" کے مادہ سے ہے اور جدا کرنے کے معنی میں ہے نیز جیسا کہ بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ اس کا مادہ ثلاثی زال یزیل ہے جو جدا ہونے کے معنی میں ہے۔ نہ کہ زال یزول کے مادہ سے زوال قبول کرنے کے معنی میں ہے۔

آگاہ نہ تھے (فکفی باللہ شہیداً بیننا وبینکم ان کنا عن عبادتکم لغفلین)۔[1]

یہ کہ زیر نظر آیت میں بتوں اور شرکاء سے کون سے معبود مراد ہیں اور یہ کہ وہ کس طرح ایسی گفتگو کریں گے، اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ مراد انسانی اور شیطانی معبود ہیں یا پھر یہ فرشتوں میں سے ہیں کہ جو عقل و شعور رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں یہ خبر نہیں ہے کہ کوئی گروہ ان کی عبادت کرتا ہے کیونکہ یا تو وہ ان کی غیبت میں ایسی عبادت کرتے تھے اور یا ان کی موت کے بعد ان کی عبادت کی گئی ہے (جیسے بعض انسانوں کی موت کے بعد ان کی عبادت کی گئی ہے)

لہٰذا ان کی یہ گفتگو بالکل فطری اور طبعی ہوگی اس احتمال کی بناء پر یہ آیت سورۂ سبا کی آیہ ۴۰ کی طرح ہوگی، جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

ویوم یحشرھم جمیعاً ثم یقول للملٰئکۃ اھؤلاء ایاکم کانوا یعبدون

وہ دن کہ جس میں خدا سب کو محشور کرے گا۔ اس کے بعد فرشتوں سے کہے گا: کیا یہ لوگ تمہاری ہی عبادت کرتے تھے۔

دوسرا احتمال کہ جسے بہت سے مفسرین نے ذکر کیا ہے یہ ہے کہ اس روز خدا تعالیٰ بتوں کو زندگی اور شعور عطا کرے گا اس طرح سے کہ وہ حقائق بیان کر سکیں گے مندرجہ بالا جملہ کو جو بتوں کی زبانی نقل ہوا ہے کہ وہ خدا کو اپنا گواہ بنائیں گے کہ وہ عبادت کرنے والوں کی عبادت سے غافل تھے اس سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے کیونکہ پتھر اور لکڑی کے بت بالکل کسی چیز کو نہیں سمجھتے۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تمام معبودوں کے لیے ہے البتہ جو معبود عقل و شعور رکھتے ہیں وہ اپنی زبان سے حقیقت بیان کریں گے لیکن جو معبود عقل و شعور نہیں رکھتے وہ زبان حال اور آثار عمل کے ذریعے بات کریں گے بلکہ اسی طرح جیسے ہم کہتے ہیں کہ تیرے چہرے کی رنگت تیرے اندر کی بات بیان کر رہی ہے۔

قرآن بھی سورۂ فصلت آیہ ۲۱ میں کہتا ہے:

انسانی جلد اور چہرے عالم قیامت میں گفتگو کریں گے۔

اسی طرح سورۂ زلزال میں کہتا ہے:

وہ زمینیں جن پر انسان زندگی بسر کرتا ہے، حقائق بیان کریں گی۔

یہ معاملہ دور حاضر میں کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے جبکہ ایک بے زبان ٹیپ ہماری تمام باتوں کو ریکارڈ کرتی ہے اور ضرورت کے وقت بیان کرتی ہے لہٰذا تعجب کا مقام نہیں کہ بت بھی اپنی عبادت کرنے والوں کی حقیقت کو ظاہر کریں۔

---

[1] مندرجہ بالا جملے میں لفظ "ان" اصطلاح کے مطابق مثقلہ سے مخففہ ہے اور تاکید کے لیے ہے اور جملے کا معنی یہ ہے:۔

اننا کنا عن عبادتکم لغفلین۔

یعنی ——— ہم یقیناً تمہاری عبادت سے غافل تھے۔

بہرحال اس دن، اس جگہ یا اس حالت میں جیسا کہ قرآن زیرِ نظر آخری آیت میں کہتا ہے: ہر شخص اپنے انجام دیئے گئے اعمال کا نتیجہ دیکھے گا بلکہ خود انہیں دیکھے گا چاہے وہ عبادت کرنے والا ہو یا گمراہ معبود کہ جو لوگوں کو اپنی عبادت کی دعوت دیتا تھا، چاہے مشرک ہو یا مومن اور چاہے کسی گروہ یا کسی قبیلے سے ہو (هنالك تبلوا كل نفس ما اسلفت)۔

اور اس دن سب کے سب اللہ کی طرف پلٹ جائیں گے جو ان کا حقیقی مولا اور سرپرست ہے اور قیامت کی عدالت میں ظاہر ہو جائے گا کہ حکومت صرف اس کے زیرِ فرمان ہے" (وردوا الى الله مولٰهم الحق)۔ " آخرکار تمام بت اور جعلی معبود کہ جنہیں وہ غلط طور پر خدا کا شریک قرار دے چکے تھے گم اور نابود ہو جائیں گے" (وضل عنهم ما كانوا يفترون)۔

کیونکہ وہ بندوں کے اسرارِ نہاں کے ظہور کا میدان ہے اور کوئی حقیقت ایسی نہیں رہے گی کہ جو اپنے آپ کو آشکار نہ کر دے۔ وہاں اصولی طور پر ایسی صورتحال ہے کہ نہ سوال کی ضرورت ہے نہ گفتگو کی بلکہ کیفیت و حالات ہر چیز کی ترجمانی کرے گی اور بات چیت کی ضرورت نہیں ہو گی۔

۳۱۔ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○

۳۲۔ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ○

۳۳۔ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○

ترجمہ

۳۱۔ کہہ دو، کون تمھیں آسمان و زمین سے روزی دیتا ہے یا کون کان اور آنکھوں کا مالک (اور خالق) ہے اور کون زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مُردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور کون (دنیا کے) امور کی تدبیر کرتا ہے، جلد ہی وہ (جواب میں) کہیں گے: اللہ۔ تو کہو کہ پھر کیوں تقوٰی اختیار نہیں کرتے ہو (اور خدا سے نہیں ڈرتے ہو)۔

۳۲۔ اور یہ ہے تمھارا اللہ، تمھارا حقیقی پروردگار، تو اس صورت میں حق کے بعد گمراہی کے علاوہ کچھ ہے؟ پس کیوں (اس کی عبادت سے) رُخ پھیرتے ہو؟

۳۳۔ اس طرح سے تیرے پروردگار کا حکم فاسقوں پر مسلّم ہوا ہے کہ وہ (اس سرکشی اور گناہ کے بعد) ایمان نہیں لائیں گے۔

تفسیر

ان آیات میں وجودِ پروردگار کی نشانیوں اور اس کے لائق معبودیت ہونے کے بارے میں گفتگو ہے اور اس سلسلے میں گزشتہ مباحث جاری ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ مشرکین اور بُت پرست کہ جو بے راہ روی میں سرگرداں ہیں ان سے کہہ دو، کون تمھیں آسمان اور

زمین سے روزی دیتا ہے" (قل من یرزقکم من السماء والارض)۔

"رزق" لگاتار اور دائمی عطا اور بخشش کے معنی میں ہے اور چونکہ تمام نعمتیں بخشنے والا در حقیقت خدا ہے لہٰذا "رزاق" اور "رازق" کے الفاظ حقیقی معنی کے لحاظ سے صرف اسی کے لیے بولے جاتے ہیں اور اگر اس کے علاوہ کسی اور کے لیے استعمال ہوں تو بلا شبہ مجازی حوالے سے ہوں گے جیسا کہ سورۂ بقرہ آیہ ۲۳۳ میں دودھ پلانے والی عورتوں کے بارے میں ہے:

وعلی المولود لہ رزقھن وکسوتھن بالمعروف۔

باپ پر فرض ہے کہ جو عورتیں اس کی اولاد کو دودھ پلائیں انھیں مناسب رزق دے اور لباس پہنائے۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انسان کی زیادہ تر روزی آسمان سے مربوط ہے۔ حیات بخش بارش آسمان سے برستی ہے۔ ہوا جو کہ تمام زندہ موجودات کی ضرورت ہے وہ بھی زمین کے اوپر ہے اور سب سے زیادہ اہم سورج کی روشنی ہے کہ جس کے بغیر زمین پر کوئی موجود زندہ نہیں رہ سکتا اور جس کے بغیر ساری زمین پر کوئی حرکت و جنبش نہیں ہو سکتی۔ اس روشنی کا تعلق بھی آسمان سے ہے۔ یہاں تک کہ جو جانور دریاؤں کی گہرائی میں ہیں وہ بھی نور آفتاب ہی کی بدولت زندہ ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے بہت سوں کی غذا بہت ہی چھوٹے نباتات ہیں کہ جو سمندر کی سطح پر موجوں کے درمیان سورج کی روشنی پڑنے سے ہی نشو و نما حاصل کرتے ہیں۔ کچھ اور جانور، دریا کے ان دوسرے جانوروں کے گوشت سے استفادہ کرتے ہیں جو یہ نباتات کھا کر پلے بڑھے ہیں۔ لیکن زمین صرف اپنے نباتات کو غذا دیتی ہے شاید اسی بنا پر مندرجہ بالا آیت میں پہلے آسمان سے روزی مہیا کیے جانے کا تذکرہ ہے اور بعد میں زمین سے (درجۂ اہمیت کے فرق کے ساتھ)۔

اس کے بعد حواسِ انسانی میں سے دو اہم ترین کا ذکر کیا گیا ہے جن کے بغیر انسان علم حاصل نہیں کر سکتا، ارشاد ہوتا ہے: اور کہہ دو کہ کان اور آنکھوں کا خالق، مالک اور انسان کے ان دو حواس کو قدرت دینے والا کون ہے (امن یملک السمع والابصار)۔

در حقیقت اس آیت میں پہلے تو مادی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے اور اس کے بعد معنوی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جن کے بغیر مادی نعمتیں اپنا مقصد کھو دیتی ہیں۔

لفظ "سمع" مفرد (اور کان کے معنی میں ہے) اور "ابصار" "بصر" کی جمع ہے، بینائی اور آنکھ کے معنی میں ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ "سمع" قرآن میں تمام جگہوں پر مفرد آیا ہے جبکہ "بصر" کبھی جمع کی صورت میں آیا ہے کبھی مفرد، آخر اس کی کیا وجہ ہے اس سوال کا جواب جلد اول ص ۹ (اردو ترجمہ) پر پیش کیا جا چکا ہے۔

اس کے بعد ظاہر ہونے والی چیزوں یعنی موت و حیات کا ذکر ہے کہ جو عالم خلقت کی عجیب و غریب چیزیں ہیں، ارشاد ہوتا ہے: اور کون ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے (ومن یخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی)۔

یہ وہی موضوع ہے کہ جس میں ابھی تک طبیعی علوم کے ماہرین اور حیات شناس لوگوں کی عقل حیران و پریشان ہے کہ ایک بے جان چیز سے ایک زندہ موجود کس طرح وجود میں آتا ہے کیا ایسی چیز جس کے بارے میں علماء اور سائنس دانوں کی مسلسل کوشش ابھی تک کسی مقام تک نہیں پہنچی۔ ایک معمولی، اتفاقی، بے مقصد، بغیر کسی ہدایت کے رونما ہونے والی حادثاتی اور بلا مقصد طبیعی ہو سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ظاہر ہونے والی پیچیدہ

ظریف اور اسرار آمیز زندگی حد سے زیادہ علم و قدرت اور عقل کلی کی محتاج ہے۔

اس نے نہ صرف ابتداء میں زندہ موجود کو زمین کی بے جان موجودات سے پیدا کیا ہے بلکہ اس کی سنت یہ رہی ہے کہ زندگی بھی جاودانی نہ ہو۔ اسی بناء پر اس نے موت کو زندگی کے دل میں پیدا کیا ہے تاکہ اس طریقے سے تغیر و تکامل کے لیے میدان کھلا رکھے۔

مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ آیت مادی موت و حیات کے علاوہ معنوی موت و حیات کے بارے میں بھی ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی گمراہ اور بے ایمان ماں باپ سے ایک ہوش مند، پاک دامن اور باایمان انسان پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ قانونِ وراثت کے برخلاف نہایت لائق اور باوقار انسان سے بے وقعت اور مردہ انسان وجود میں آتے ہیں۔[1]

البتہ اس میں کوئی مانع نہیں کہ زیرِ نظر آیت دونوں قسموں کی موت و حیات کی طرف اشارہ ہو کیونکہ دونوں ہی عجائب آفرینش اور عالم کے تعجب انگیز مظاہر میں سے ہیں اور اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ طبیعی عوامل کے علاوہ ان میں عالم و حکیم خالق کا دستِ قدرت کار فرما ہے۔

اس کے بارے میں جلد ۳ صفحہ ۳۲۱ (اردو ترجمہ) سورہ انعام کی آیہ ۹۵ کے ذیل میں ہم کچھ دیگر توضیحات بھی ذکر کر چکے ہیں۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: کون ہے جو اس جہان کے امور کی تدبیر کرتا ہے (ومن یدبر الامر)۔

درحقیقت پہلے توسمات کی خلقت و آفرینش کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور اس کے بعد اس کے محافظ، نگہبان اور مدبّر کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

ان تین سوالات کو پیش کرنے کے بعد قرآن بلا فاصلہ کہتا ہے، وہ فوراً ہی جواب میں کہیں گے "اللہ"۔

اس جملے سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے مشرکین اور بت پرست بھی عالم ہستی کا خالق، رازق، حیات بخش اور مدبّر امور اللہ ہی کو جانتے ہیں اور وہ اس حقیقت کو طریق عقل اور راہ فطرت سے جان چکے تھے کہ یہ نظام اور حساب شدہ جہان بے عقلی کی پیداوار یا بتوں کی مخلوق نہیں ہو سکتا۔

آیت کے آخر میں پیغمبر اکرم کو حکم دیا گیا ہے: ان سے کہہ دو کہ کیا اس حالت میں تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو (فقل افلا تتقون)۔

صرف وہ ذات پرستش کے لائق ہے جس کے ہاتھ میں دنیا کی خلقت و تدبیر ہے۔ اگر عبادت معبود کی اہلیت اور عظمت کی بنا پر کی جائے تو پھر یہ اہلیت، لیاقت اور عظمت صرف خدا میں پائی جاتی ہے اور اگر اس بناء پر کی جائے کہ معبود سود و زیاں کا سرچشمہ ہے تو یہ بھی خدا کے ساتھ مخصوص ہے۔

آسمان و زمین میں خدا کی عظمت و تدبیر کے کچھ آثار ذکر کرنے کے بعد اور مخالفین کے وجدان و عقل کو دعوت دینے کے بعد جب وہ اعتراف کر چکے تو اگلی آیت میں قطعی لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: یہ ہے خدا، تمہارا برحق پروردگار (فذٰلکم اللہ ربکم الحق) نہ کہ بت اور دوسرے موجودات کہ جنہیں تم خدا کی معبودیت میں شریک قرار دیتے ہو اور ان کے سامنے سجدہ کرتے ہو اور ان کی تعظیم کرتے ہو۔

---

[1] تفسیر برہان ج ۲ ص ۴۴۸ سورہ انعام کی آیہ ۹۵ کے ذیل میں متعدد روایات کے حوالے سے یہ مضمون ذکر کیا گیا ہے۔

وہ کس طرح معبودیت کے لائق ہو سکتے ہیں حالانکہ یہی نہیں کہ وہ تخلیق و تدبیر جہان میں شریک نہیں ہو سکتے بلکہ خود بھی سرتاپا محتاج ہیں۔
اس کے بعد نتیجۃً فرمایا گیا ہے: اب جبکہ تم حق کو واضح طور پر پہچان چکے ہو تو کیا حق کے بعد گمراہی کے علاوہ کچھ رہ جاتا ہے (فما ذا بعد الحق الا الضلال) اس کے باوجود کیوں تم خدا کی عبادت اور پرستش سے منہ پھیرتے ہو۔ حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ معبود برحق اس کے علاوہ کوئی نہیں (فانی تصرفون)۔

یہ آیت درحقیقت باطل کی شناخت اور اسے ترک کرنے کے لیے ایک واضح منطقی راستہ بتاتی ہے اور وہ یہ کہ پہلے تو حق کی پہچان کے لیے عقل سے کام لینا چاہیے اور جب حق کو پہچان لیا جائے تو جو کچھ اس کے مخالف ہے وہ باطل اور گمراہی ہے اور اس سے کنارہ کشی کرنا چاہیے۔

آخری آیت میں یہ نکتہ بیان کرنے کے لیے کہ وہ لوگ مطلب واضح اور حق آشکار ہو جانے کے باوجود کیوں اس کے پیچھے نہیں جاتے قرآن کہتا ہے: اسی طرح خدا کا فرمان ان افراد کے بارے میں کہ جو جان بوجھ کر اور عقل کے خلاف چلتے ہوئے اطاعت سے رُخ پھیرتے ہیں، صادر ہوا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے (کذٰلک حقت کلمۃ ربک علی الذین فسقوا انھم لا یؤمنون)۔[1]
حقیقت میں یہ اُن کے مسلسل غلط اعمال کی خاصیت ہے کہ جو ان کے دل کو اس طرح سے تاریک اور ان کی روح کو اس طرح سے آلودہ کر دیتی ہے کہ حق کے واضح اور روشن ہونے کے باوجود اسے نہیں دیکھتے اور بے راہ روی اختیار کرتے ہیں۔ اس بناء پر مندرجہ بالا آیت کسی طرح سے بھی مسئلہ جبر پر دلالت نہیں کرتی بلکہ انسان کے خود اپنے اعمال کی طرف اشارہ ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ ان اعمال میں یہ خصوصیت فرمانِ خدا ہی سے ہے۔
یہ بالکل اس طرح ہے جیسے ہم کسی سے کہیں کہ ہم نے تجھے سو مرتبہ کہا ہے کہ نشہ آور چیزوں اور شراب کے پیچھے نہ جاؤ، اب جبکہ تو نے کان نہیں دھرے اور ان کا سخت عادی ہو چکا ہے تو اب تیرے لیے یہی حکم ہے کہ مدتوں بدبختی میں رہے۔

---

[1] "کاف" تشبیہ یہاں ایک مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ گزشتہ آیت سے کہ کوئی مطلب ہی ذکر ہوا ہے اور آیت کا معنی اس طرح ہے: کما انہ لیس بعد الحق الا الضلال کذٰلک حقت کلمۃ ربک یعنی جیسے حق کے بعد گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہے اسی طرح خدا کا حکم صادر ہو چکا ہے۔

۳۴۔ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ○

۳۵۔ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ○

۳۶۔ وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ○

ترجمہ

۳۴۔ کہہ دو! کیا تمھارے معبودوں میں سے کوئی مخلوق کو ایجاد کر سکتا ہے اور پھر اسے پلٹا سکتا ہے؟ کہہ دو! صرف خدا نے مخلوق کو پیدا کیا ہے اور پھر واپس پلٹائے گا۔ اس کے باوجود حق سے کیوں روگرداں ہوتے ہو۔

۳۵۔ کہہ دو! کیا تمھارے معبودوں میں سے کوئی حق کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ کہہ دو صرف خدا حق کی ہدایت کرتا ہے۔ کیا وہ جو حق کی ہدایت کرتا ہے پیروی کے زیادہ لائق نہیں ہے یا وہ کہ جسے ہدایت نہ کی جائے تو وہ خود ہدایت حاصل نہیں کرتا تمھیں کیا ہو گیا ہے تم کس طرح فیصلہ کرتے ہو۔

۳۶۔ اور ان میں سے اکثر سوائے گمان (اور بے بنیاد خیالات) کے کسی چیز کی پیروی نہیں کرتے (حالانکہ) گمان کبھی انسان کو حق سے بے نیاز نہیں کرتا (اور حق تک نہیں پہنچاتا) اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے باخبر اور آگاہ ہے۔

تفسیر

حق و باطل کی ایک پہچان

ان آیات میں بھی مبداء و معاد سے مربوط استدلالات کا سلسلہ جاری ہے۔ پہلی آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے، ان سے کہہ دو کہ تمہارے معبودوں کہ جنہیں تم خدا کا شریک قرار دیتے ہو میں سے کوئی ہے جو عالم آفرینش کو ایجاد کر کے پھر لوٹا سکتا ہے (قل هل من شرکائکم من یبدؤا الخلق ثم یعیده)۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: کہہ دو کہ خدا نے عالم آفرینش کو پیدا کیا ہے اور پھر اسے لوٹائے گا (قل الله یبدؤ الخلق ثم یعیده) "اس کے باوجود حق سے کیوں روگردانی کرتے ہو اور بے راہ روی میں سرگرداں ہو" (فانی تؤفکون)۔

یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں:

پہلا یہ کہ مشرکینِ عرب عام طور پر معاد اور قیامت کا عقیدہ خصوصاً جیسے قرآن کہتا ہے، نہیں رکھتے تھے اس کے باوجود قرآن ان سے کیونکر اعتراف چاہتا ہے۔

دوسرا یہ کہ گزشتہ آیت میں مشرکین کے اعتراف کا ذکر تھا لیکن یہاں پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اس حقیقت کا اعتراف کرو ——— تعبیر کا یہ فرق کیوں ہے؟

لیکن ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے دونوں سوالوں کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ مشرکین معاد (معاد جسمانی) کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے ان کا بس یہ اعتقاد تھا کہ خلقت کی ابتداء خدا کی طرف سے ہے اور یہی بات معاد کو تسلیم کرنے کے لیے کافی ہے کیونکہ جس نے ابتداء کی ہے وہ اعادہ بھی کر سکتا ہے لہٰذا مبداء کے عقیدے پر تھوڑا سا بھی غور و فکر کیا جائے تو اس سے معاد کا عقیدہ ثابت ہو جاتا ہے۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ کس بناء پر مشرکین کی بجائے پیغمبر اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کیونکہ اگرچہ معاد پر ایمان مبداء کے ایمان کے لوازمات میں سے ہے لیکن چونکہ وہ اس تلازم کی طرف متوجہ نہیں تھے لہٰذا طرز تعبیر بدل گئی اور پیغمبرؐ نے ان کی جگہ اعتراف کیا۔

دوبارہ پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے: ان سے کہہ دو کیا کوئی تمہارے جعلی معبودوں میں سے حق کی طرف ہدایت کر سکتا ہے (قل هل من شرکائکم من یهدی الی الحق) کیونکہ معبود کو اپنی عبادت کرنے والوں کا رہبر ہونا چاہیے اور رہبری بھی حق کی طرف کرنا چاہیے۔ حالانکہ مشرکین کے معبود چاہے وہ بے جان بُت ہوں یا جاندار، کوئی بھی یہ طاقت نہیں رکھتا کہ ہدایت الٰہی کے بغیر حق کی طرف رہبری کر سکے کیونکہ حق کی طرف ہدایت کرنا مقام عصمت اور خطا و اشتباہ سے محفوظ ہونے کا مقام ہے اور یہ خدا کی ہدایت اور حمایت کے بغیر ممکن نہیں ہے، لہٰذا بلا فاصلہ مزید فرمایا گیا ہے: کہہ دو کہ صرف خدا ہی حق کی طرف ہدایت کرتا ہے (قل الله یهدی للحق)۔ تو ایسے میں "کیا وہ جو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے پیروی کے زیادہ لائق ہے یا وہ کہ جس کی ہدایت

اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ اسے ہدایت کی نہ جائے (افمن یھدی الی الحق احق ان یتبع امن لا یھدی الا ان یھدی)۔[1]

آیت کے آخر میں سرزنش کے انداز میں اور جھنجوڑتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تمہیں کیا ہو گیا ہے کس طرح کا فیصلہ کرتے ہو (فما لکم کیف تحکمون)۔

زیرِ نظر آخری آیت میں ان کے انحراف کی بنیاد اور سرچشمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان میں سے اکثر خیال اور گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کرتے جبکہ خیال اور گمان کبھی بھی انسان کو نہ حق سے بے نیاز کر سکتا ہے اور نہ حق تک پہنچا سکتا ہے (وما یتبع اکثرھم الا ظنا ان الظن لا یغنی من الحق شیئا)۔

جو لوگ کسی منطق اور حساب کتاب کے تابع نہیں، آیت کے آخر میں انھیں تہدید آمیز لہجے میں کہا گیا ہے: جو کچھ وہ انجام دیتے ہیں، خدا اس کا عالم اور جاننے والا ہے (ان اللّٰہ علیم بما یفعلون)۔

چند اہم نکات

۱۔ "خدا ہی حق کی طرف ہدایت کرتا ہے": مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ صرف خدا حق کی طرف ہدایت کرتا ہے یہ انحصار یا تو اس بناء پر ہے کہ ہدایت سے مراد صرف راستہ دکھانا نہیں ہے بلکہ مقصد تک پہنچانا بھی ہے اور یہ کام صرف خدا کے ہاتھ میں ہے اور یا اس بناء پر ہے کہ راستہ دکھانا اور اس کی نشاندہی کرنا بھی پہلے درجے میں خدا ہی کا کام ہے اور اس کے غیر یعنی انبیاء الٰہی اور رہبران برحق صرف اس کے طریقِ ہدایت سے ہدایت کے راستوں سے آگاہ ہوتے ہیں اور اس کی تعلیم سے عالم ہوتے ہیں۔

۲۔ مشرکین کے معبود خود ہدایت کے محتاج ہیں: یہ جو زیر بحث آیات میں آیا ہے کہ مشرکین کے معبود نہ صرف کسی کو ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ خود بھی ہدایتِ الٰہی کے محتاج ہیں اگرچہ پتھر اور لکڑی کے بتوں کے بارے میں صادق نہیں آتا کیونکہ وہ تو بالکل شعور نہیں رکھتے لیکن صاحبِ شعور معبودوں کے بارے میں مثلاً جن فرشتوں اور انسانوں کو معبود قرار دیا گیا ہے پر مکمل طور پر صادق آتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ مذکورہ جملہ ایک قضیہ شرطیہ کے معنی میں ہو یعنی فرض کریں کہ بت عقل و شعور رکھتے ہوتے تو خدائی راہنمائی کے بغیر خود راہ تلاش نہ کر سکتے چہ جائیکہ دوسروں کی راہنمائی کرتے۔

بہر حال مندرجہ بالا آیات اچھی طرح سے نشاندہی کرتی ہیں کہ بندوں کے لیے خدا کا ایک طرف سے ہدایت کا ایک بنیادی پروگرام ہے جس کے تحت انھیں حق کی طرف ہدایت کی جاتی ہے اور یہ کام عقل و خرد بخشنے، طریقِ فطرت سے انھیں مختلف درس دیتے، جہانِ خلقت میں اپنی آیات دکھلانے اور اسی طرح انبیاء اور آسمانی کتب بھیجنے کے ذریعے عمل پذیر ہوتا ہے۔

۳۔ بت پرست گمان کی پیروی کرتے ہیں: زیر بحث آخری آیت میں ہم نے پڑھا ہے کہ اکثر بت پرست اور مشرک

---

[1] "یھدی" اصل میں "یھتدی" تھا اور "تا" اس میں "دال" سے بدل کر "دال" میں مدغم ہو گئی ہے۔

اپنے ظن و گمان کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ کیوں نہیں فرمایا کہ وہ سب کے سب ایسے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تمام بت پرست اس گمانِ باطل میں شریک ہیں کہ وہ بتوں کو حقیقی معبود، نفع و نقصان کا مالک اور بارگاہِ خدا میں شفیع خیال کرتا ہوں۔ اسی بناء پر بعض مجبور ہوئے ہیں کہ لفظ "اکثر" سے تمام کے معنی مراد لیں اور ان کا نظریہ ہے کہ یہ لفظ بعض اوقات تمام اور کل کے معنی میں آتا ہے۔

لیکن یہ جواب کوئی زیادہ قابلِ لحاظ نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم کہیں کہ بت پرست دو طرح کے ہیں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو بے ہودہ، نادان اور جاہل ہیں اور غلط سلط خیالات اور گمانوں کے زیرِ اثر رہتے ہیں اور انھوں نے بتوں کو پرستش کے لیے منتخب کر رکھا ہے جبکہ اقلیت میں وہ بت پرست ہیں جو سیاہ دل اور آگاہ ہیں اور اکثریت کے رہبر و راہنما ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو بت پرستی کے بے بنیاد ہونے کو جاننے کے باوجود اپنے مفادات کے لیے لوگوں کو بتوں کی طرف دعوت دیتے ہیں لہٰذا خدا صرف پہلے گروہ کو جواب دیتا ہے کیونکہ وہ قابلِ ہدایت ہیں۔ لیکن دوسرا گروہ جو جان بوجھ کر غلط راستے پر چل رہا ہے اسے بالکل قابلِ اعتناء قرار نہیں دیتا۔

۴۔ **علماءِ اصول کی ایک بحث:** کچھ علماء اصول زیرِ نظر آیت اور اس قسم کی آیات کو اس امر کی دلیل سمجھتے ہیں کہ ظن اور گمان کسی طرح بھی حجت اور سند نہیں بن سکتے اور صرف قطعی دلائل پر ہی اعتماد کیا جا سکتا ہے لیکن بعض دیگر علماء کہتے ہیں کہ فقہی دلائل میں ہمارے پاس بہت سے ظنی دلائل ہیں (مثلاً الفاظ کے ظواہر کا حجت ہونا، دو عادل گواہوں کی گواہی، یا خبرِ واحد ثقہ اور اس قسم کے دیگر دلائل) وہ کہتے ہیں کہ زیرِ نظر آیت اس امر کی دلیل ہے کہ اصلی قاعدہ کے مطابق ظن حجت نہیں ہے مگر یہ کہ کسی ظن کا حجت ہونا قطعی دلیل سے ثابت ہو جائے، جیسے مذکورہ چند مثالوں کے بارے میں ہے۔

مگر ——— انصاف یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت صرف بے اساس خیالات اور بے ہودہ گمانوں کے بارے میں بات کر رہی ہے جیسے بت پرستوں کے گمان۔ اس آیت کا تعلق اس ظن سے نہیں جو عقلاء کے نزدیک قابلِ اعتماد ہے لہٰذا مندرجہ بالا آیت اور اس طرح کی دیگر آیات سے ظن کے حجت نہ ہونے کے بارے میں سند پیش نہیں کی جا سکتی۔ (غور کیجیے گا)

۳۷۔ وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

۳۸۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۗ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

۳۹۔ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ۗ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۝

۴۰۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ۗ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝

ترجمہ

۳۷۔ مناسب نہیں (اور ممکن نہ تھا) کہ بغیر وحیِ الٰہی کے اس قرآن کی نسبت خدا کی طرف دی جائے لیکن (آسمانی کتب میں سے) جو کچھ موجود ہے یہ اس کی تصدیق ہے اور اس کی تفصیل ہے اور اس میں شک نہیں کہ عالمین کے پروردگار کی طرف سے ہے۔

۳۸۔ وہ کہتے ہیں کہ اس نے قرآن کو خدا کی طرف جھوٹی نسبت دی ہے کہہ دو کہ اگر سچ کہتے ہو تو اس جیسی ایک سورت لے آؤ اور خدا کے علاوہ جسے چاہتے ہو (اپنی مدد کے لیے) بلا لو۔

۳۹۔ (وہ علم و دانش کی بناء پر قرآن کا انکار نہیں کرتے) بلکہ وہ ایسی چیز کی تکذیب کرتے ہیں جس سے آگاہی نہیں رکھتے اور ابھی تک اس کی حقیقت ان کے لیے واضح نہیں ہوئی اسی طرح سے ان سے پہلے لوگوں نے بھی تکذیب کی تھی۔ پس دیکھو کہ ظالموں کا انجام کیا ہوا۔

۴۰۔ اور ان میں سے بعض اس پر ایمان لے آتے ہیں اور بعض ایمان نہیں لاتے اور تیرا پروردگار فساد کرنے والوں سے زیادہ باخبر اور آگاہ (اور انھیں اچھی طرح سے جانتا) ہے۔

تفسیر

دعوتِ قرآن کی عظمت اور حقانیت

یہ آیات مشرکین کی کچھ اور ناروا باتوں کا جواب دے رہی ہیں۔ کیونکہ وہ صرف مبداء کی پہچان کے بارے میں انحراف اور کجروی کا شکار نہ تھے بلکہ پیغمبر اسلام پر بھی افتراء باندھتے تھے کہ انھوں نے قرآن خود اپنی فکر و نظر سے بنا کر خدا کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اسی لیے ہم نے گزشتہ آیات میں پڑھا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تقاضا کرتے تھے کہ اس کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آئیں یا پھر کم از کم اس میں رد و بدل کر دیں۔ ان کا یہ تقاضا خود اس امر کی دلیل ہے کہ وہ قرآن کو فکرِ پیغمبرؐ کی تخلیق خیال کرتے تھے۔

زیرِ بحث پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: مناسب نہیں کہ وحی الٰہی کے بغیر اس قرآن کی خدا کی طرف نسبت دی جائے (وما کان ھٰذا القراٰن ان یفترٰی من دون اللہ)۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ سادہ نفی کی بجائے مناسبت کی نفی کی گئی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ سادہ نفی کی بجائے ایسی تعبیر زیادہ رسا اور موثر ہے یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص اپنا دفاع کرتے ہوئے کہے کہ یہ میری شان کے خلاف ہے کہ میں جھوٹ بولوں۔ ظاہر ہے اس طرح سے کہنا یہ کہنے سے زیادہ پُرمعنی اور گہرائی کا حامل ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔

اس کے بعد قرآن کی اصالت اور اس کے وحیِ آسمانی ہونے کی دلیل کے طور پر کہتا ہے: لیکن یہ قرآن اپنے سے پہلی کتبِ آسمانی کی تصدیق کرتا ہے (ولکن تصدیق الذی بین یدیہ) یعنی وہ تمام بشارتیں اور حقانیت کی نشانیاں جو گزشتہ آسمانی کتب میں آئی ہیں وہ مکمل طور پر قرآن اور قرآن لانے والے پر منطبق ہوتی ہیں اور یہ امر خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ خدا پر تہمت نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔ اصولی طور پر قرآن خود "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب" کے مصداق اپنے مشمولات کی سچائی پر شاہد ہے۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ جو اس قسم کی آیاتِ قرآن کو تورات اور انجیل میں عدمِ تحریف کی دلیل سمجھتے ہیں، اشتباہ میں ہیں کیونکہ قرآن ان کتب کے مندرجات کی جو نزولِ قرآن کے زمانے میں تھیں، تصدیق نہیں کرتا بلکہ صرف پیغمبر اکرمؐ اور قرآن کے بارے میں ان کتب میں جو نشانیاں تھیں ان کی تائید کرتا ہے (غور کیجئے گا)۔

اس سلسلے میں مزید توضیحات تفسیر نمونہ جلد اول سورۂ بقرہ کی آیہ ۴۱ کے ذیل میں پیش کی جا چکی ہیں۔

اس کے بعد اس آسمانی وحی کی صداقت کے بارے میں ایک اور دلیل پیش کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس قرآن میں گزشتہ انبیاء کی اصل کتب کی تشریح، بنیادی احکام اور اصولی عقائد بیان کیے گئے ہیں اور اسی وجہ سے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ پروردگارِ عالمین

کی طرف سے ہے (وتفصیل الکتاب لاریب فیہ من رب العلمین)۔

دوسرے لفظوں میں ــــــــ گزشتہ انبیاء کے پیش کردہ پروگرام سے اس کا کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ اس میں ان تعلیمات اور پروگراموں کی تکمیل کی گئی ہے اور اگر یہ قرآن جعلی ہوتا تو یقیناً ان کے مخالف اور متضاد ہوتا۔

یہیں سے معلوم ہوتا ہے، کہ اصولی مسائل میں چاہے وہ دینی عقائد ہوں، چاہے اجتماعی پروگرام، چاہے حفظِ حقوق کے معاملات ہوں چاہے جہالت کے خلاف جہاد، حق و عدالت کی دعوت ہو یا اخلاقی اقدار کا احیاء اور یا اس قسم کے دیگر مسائل، ان کے بارے میں کتب آسمانی میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ بعد میں نازل ہونے والی کتاب پہلی کتاب سے بالاتر اور کامل تر سطح کی تھی۔ جیسا کہ تعلیم کی مختلف کلاسیں ہوتی ہیں۔ پرائمری، میٹرک، کالج اور یونیورسٹی میں ایک ہی علم کی کتاب مختلف سطح کی ہوتی ہے۔ اسی طرح آخری آسمانی کتاب امتوں کی دینی تعلیم کے آخری دور کے لیے مخصوص تھی جو کہ قرآن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ احکام کی جزئیات اور فروع میں آسمانی مذاہب میں فرق ہے لیکن یہاں ہم ان کے بنیادی اصولوں کی بات کر رہے ہیں جو کہ ہر جگہ ہم آہنگ ہیں۔

اگلی آیت میں قرآن کی اصالت کے لیے تیسری دلیل پیش کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس قرآن کی خدا کی طرف غلط نسبت دی ہے، ان سے کہہ دو کہ اگر سچ کہتے ہو تو تم بھی اس جیسی ایک سورت لے آؤ اور خدا کے علاوہ جس سے چاہو مدد طلب کرلو (لیکن تم یہ کام ہرگز نہیں کر سکو گے اور اس سے ثابت ہو جائے گا کہ یہ وحی آسمانی ہے) (ام یقولون افترٰیہ قل فأتوا بسورۃ مثلہ وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صادقین)۔

یہ آیت ان آیات میں سے ہے کہ جو صراحت سے اعجاز قرآن کا ذکر کرتی ہیں اس آیت میں نہ صرف سارے قرآن کے اعجاز کا ذکر ہے بلکہ بیان یہاں تک کہ ایک سورت کے اعجاز کو بیان کیا گیا ہے اور بلا استثناء تمام عالمین کو دعوت دی گئی ہے کہ اگر تم یہ نظریہ رکھتے ہو کہ یہ آیات خدا کی طرف سے نہیں ہیں تو اس قرآن کی مانند یا کم از کم اس کی ایک سورہ کی مثل تم بھی آیات لے آؤ۔

جیسا کہ ہم پہلی جلد میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۳ کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں۔ آیاتِ قرآن میں کبھی سارے قرآن کے مقابلے کے لیے چیلنج کیا گیا ہے کبھی دس سورتوں کی دعوت دی گئی اور کبھی ایسی ایک سورت بنا کر لانے کی دعوت دی گئی ہے یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ قرآن کا جزو اور کل سب معجزہ ہے۔ نیز چونکہ کسی معین سورہ کا ذکر نہیں ہوا لہٰذا قرآن کی ہر سورت کے مقابلے کی دعوت اس میں شامل ہے۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ قرآن کا اعجاز فصاحت و بلاغت، شیرینیٔ بیان اور محدود سا تعبیرات میں منحصر نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض پہلے مفسرین کا نظریہ ہے بلکہ اس کے علاوہ اس کے دینی معارف، اس وقت تک کشف نہ ہونے والے علوم کا اس میں ذکر، اس کے احکام و قوانین، ہر غلطی اور خرافات سے پاک گزشتہ لوگوں کی تاریخ اور اس میں تضاد و اختلاف کا نہ ہونا بھی اعجازی پہلو رکھتے ہیں[1]

اعجازِ قرآن کا ایک نیا جلوہ

یہ امر جاذبِ توجہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اعجاز قرآن کے نئے جلوے آشکار ہوتے ہیں جن کی طرف گزشتہ زمانے میں

[1] برائے شرح بیشتر

توجہ نہیں ہوسکی ان میں سے ایک یہ ہے کہ کمپیوٹر کے ذریعہ الفاظِ قرآن، قرآنی جملوں کی بندش اور ہر سورت کے زمانۂ نزول سے انکے ربط کی نئی نئی خصوصیات سامنے آئی ہیں، اس کا ایک نمونہ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

آج کے محققین اور دانشوروں نے تحقیق و جستجو اور چھان بین سے آیاتِ قرآن اور سورتوں کے نہایت پیچیدہ باہمی روابط معلوم کیے ہیں اور اس سلسلے میں حیرت انگیز حتمی فارمولے معلوم کیے ہیں۔ اس امر کے یقین کے ساتھ کہ ایسا علمی نظم و نسق قرآن کی عبارت میں موجود ہے کہ اعداد و شمار کی تحقیق و مطالعہ سے اور ریاضی کے دقیق قواعد کے ذریعہ آیاتِ قرآن میں ریاضی کے فارمولوں کے مطابق حسابات اور کامل منحنی خطوط (COMPLETE CURVES) اور پیچیدہ اصول معلوم ہوئے اور یہ دریافت اتنی اہم ہے کہ زمین کی کشش کے بارے میں نیوٹن کے قانون کی دریافت کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔

ایک عظیم قرآن شناس نے اپنے کام کا آغاز اس محلی مسئلے سے کیا ہے کہ مکہ میں نازل ہونے والی آیات چھوٹی ہیں جبکہ مدینہ میں نازل ہونے والی آیات طویل ہیں۔ یہ ایک فطری سی بات ہے کہ ہر لکھنے اور بولنے والا اپنے جملوں کی طوالت اور الفاظ کا آہنگ موضوعِ سخن کے اعتبار سے بدلتا ہے۔

توصیفی و تعریفی مسائل چھوٹے چھوٹے جملوں میں بیان ہوتے ہیں اور تحلیلی و استدلالی مسائل طویل جملوں میں بیان کیے جاتے ہیں۔ جہاں گفتگو تحریک کے لیے ہو یا اعتقادی اور تنقیدی حوالے سے عمومی اصول سے متعلق ہو یا اعتقاد کے حوالے سے کلی اصول بیان کرنا مقصود ہو تو لب و لہجہ شعار اور نعرے کا اختیار کیا جاتا ہے اور عبارتیں چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں لیکن جہاں کوئی داستان بیان کرنا ہو، کوئی واقعہ ذکر کرنا ہو، یا اخلاقی حوالے سے کوئی نتیجہ نکالنا ہو تو لب و لہجہ میں ٹھہراؤ ہوتا ہے اور عبارتیں لمبی ہوتی ہیں اور آہنگ میں نرمی ہوتی ہے۔

مکہ میں جو مسائل درپیش تھے وہ پہلی قسم کے تھے اور مدینہ میں پیش آنے والے معاملات دوسری قسم کے تھے۔ کیونکہ مکہ میں ایک تحریک یا انقلاب کی ابتدا تھی۔ وہاں بات اعتقادی اور استنادی حوالے سے کلی اصول کے مطابق کرنا تھی۔ لیکن مدینہ میں ایک معاشرہ کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ یہاں حقوق و اخلاق سے متعلق بات کرنا تھی، تاریخی واقعات بیان کرنا تھے اور ان سے فکری و علمی نتائج اخذ کرنا تھے۔

قرآن ایک فطری کلام ہے لہٰذا یہ امر ناگزیر ہے کہ یہ آسان، خوبصورت اور بلیغ طریقے کے مطابق ہو اور اس کے نتیجے میں آیات کے اختصار اور طوالت میں بھی مفاہیم کی مناسبت کو ملحوظ رکھے۔ اگر ہم قبول کریں کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو فطرت کے ہی مطابق ہے تو پھر اس کا یہ اختصار اور طوالت بغیر کسی حساب کتاب کے نہیں ہو سکتا ایک دقیق علمی قاعدہ کے مطابق اس کی ابتدا مختصر آیات سے ہوئی ہے اور آہستہ آہستہ آیات طویل ہوتی گئی ہیں لہٰذا ہر آیت اگلے برس نازل ہونے والی آیت سے چھوٹی ہے اور کسی ایک برس نازل ہونے والی آیت گزشتہ برس نازل ہونے والی آیت سے طویل تر ہے اس طرح سے ۲۳ سال کی مدت میں مجموعی نازل ہوئی ہے آیات کی اوسط طوالت کے لحاظ سے اسے تئیس حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اس قاعدہ کی بنا پر تئیس کالم ہونے چاہییں کہ جن میں ان آیات کو ان کی طوالت کے لحاظ سے تقسیم کیا جا سکے۔ اب ہمیں کیسے علم ہو سکتا ہے کہ یہ تقسیم بندی صحیح ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بعض آیاتِ قرآن کی شانِ نزول معلوم ہے۔ بعض کے سالِ نزول کو تاریخی روایات نے معین کیا ہے اور صراحت کے ساتھ بتایا ہے کہ وہ کس سال میں نازل ہوئی ہیں اور بعض کو ان کے مفاہیم کے ذریعہ معین

کیا جاسکتا ہے مثلاً قبلہ کی تبدیلی، حرمتِ شراب، وضع حجاب اور احکام خمس وزکوٰۃ کے بارے میں جو آیات ہیں اور اسی طرح وہ آیات جن میں ہجرت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

ہم انتہائی تعجب سے دیکھتے ہیں کہ یہ آیات کہ جن کا سالِ نزول معلوم ہے ٹھیک انہی سالوں میں آتی ہیں جو آیات کی اوسط طوالت کے حوالے سے ہر سال کے لحاظ سے خاص طور پر معین کیے گئے ہیں (غور کیجیے گا)۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اس سلسلے میں دو تین استثنائی مواقع پیدا ہوئے ہیں۔ مثلاً:

سورۂ مائدہ نازل ہونے والی آخری بڑی سورت ہے جبکہ اس کی چند آیات کو فارمولے کے مطابق پہلے سالوں میں نازل ہونا چاہیے تھا۔ تفاسیر اور اسلامی روایات کی تحقیق کے بعد ہمیں معتبر مفسرین کے اقوال ملتے ہیں کہ جنہوں نے کہا ہے کہ یہ چند آیات ابتدا میں نازل ہوئی تھیں لیکن تدوین کے لحاظ سے پیغمبرؐ کے حکم سے سورۂ مائدہ میں موجود ہیں۔ لہٰذا اس طریقے سے ہر آیت کے سالِ نزول کو ریاضی کے قاعدے سے معین کیا جاسکتا ہے اور قرآن کی تدوین سالِ نزول کے حساب سے بھی کی جاسکتی ہے۔

دنیا میں کون ایسا خطیب ہے جس کی عبارت کی طوالت سے اس کے ہر جملے کی ادائیگی کے سال کو معین کیا جاسکے خصوصاً جب کہ وہ کسی مؤلف کی علمی یا ادبی کتاب کا متن نہ ہو کہ جسے اس نے ایک معین مدت میں تسلسل کے ساتھ تحریر کیا ہو اور پھر اس کی زبان پر جاری ہوئی ہو، خصوصاً جبکہ وہ ایسی کتاب نہ ہو جسے لکھنے والے نے کسی ایک موضوع یا حتیٰ کہ معین شدہ مضامین میں تالیف کیا ہو۔ بلکہ اس میں گوناگوں مسائل ہوں کہ جو تدریجاً معاشرے کی ضرورت کے مطابق اور پیش آنے والے سوالات کے جواب میں بیان کیے گئے ہوں، ایسے مسائل جو ایک طویل جدوجہد اور مقابلے کے دوران پیدا ہوئے ہوں اور ایک رہبر کے ذریعے بیان ہوتے ہوں اور پھر انھیں جمع کرکے منظم کیا گیا ہو اور کتابی شکل دی گئی ہو۔[1]

بلکہ بعض مفسرین کے بقول قرآن کے مخصوص لغات والفاظ کی طرز بھی اپنی نوع میں ایک معجزہ ہے۔ انھوں نے اس کے لیے مختلف اور جاذب نظر شواہد پیش کیے ہیں۔ ان میں سے ایک وہ واقعہ ہے جو مشہور مفسر سید قطب کو پیش آیا۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں وہ کہتے ہیں: میں ان خوارق و واقعات کے بارے میں بات نہیں کرتا جو دوسروں کو پیش آئے صرف وہ واقعہ بیان کرتا ہوں جو خود مجھے پیش آیا اور میرے علاوہ اسے دیکھنے والے پانچ افراد اور تھے ہم چھ مسلمان ایک مصری بحری جہاز میں سوار تھے۔ بحری جہاز نیویارک جانے کے لیے اوقیانوس اطلس کو عبور کر رہا تھا جہاز میں کل ۱۲۰ مسافر تھے جن میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی تھے اور ہمارے سوا مسافروں میں سے کوئی اور مسلمان نہ تھا۔ جمعہ کے روز ہم نے سوچا کہ نماز جمعہ وسط سمندر میں جہاز کے اوپر ادا کی جائے ہم چاہتے تھے کہ مذہبی فریضہ کی ادائیگی کے علاوہ ایک عیسائی مبلغ کے سامنے اسلامی جرأت کا مظاہرہ کیا جائے جس نے کشتی میں بھی اپنا تبلیغی پروگرام ترک نہیں کیا تھا اور پھر خصوصاً جبکہ وہ ہمیں بھی مسیحیت کی تبلیغ کرنا چاہتا تھا۔ جہاز کا کپتان ایک انگریز تھا اس نے جہاز کے اوپر نماز با جماعت کی ہمیں اجازت دے دی۔ نیز جہاز پر کام کرنے والوں کو بھی ہمارے ساتھ نماز پڑھنے کی اجازت دے دی جو کہ سب افریقی مسلمان تھے وہ بھی اس واقعہ سے بڑے خوش ہوئے کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ جہاز پر نماز جمعہ انجام پا رہی تھی۔

---

۱ نشریہ حق (یونیورسٹی طلبہ کا نشریہ)۔

میں نمازِ جمعہ کا خطبہ پڑھنے لگا اور امامت کے لیے تیار ہوا۔ یہ بات جاذب توجہ ہے کہ تمام غیر مسلم مسافر ہمارے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور بڑے غور سے اس اسلامی فریضے کی انجام دہی دیکھتے رہے۔

نماز کے اختتام پر ان میں سے بہت لوگ ہمارے پاس آئے اور ہمارے اس کام کی تعریف کی۔ ان میں سے ایک خاتون تھی کہ جس کے بارے میں مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ یوگوسلاویہ کی ایک عیسائی عورت تھی جو ٹیٹو اور اس کے کمیونزم کے جہنم سے فرار کیے ہوئے تھی وہ ہماری نماز سے بے حد متاثر ہوئی اس حد تک کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ اپنے اوپر کنٹرول نہیں کر پا رہی تھی۔

وہ اپنی عام انگریزی زبان میں جو شدید تاثر اور ایک خاص خضوع و خشوع میں ملی ہوئی تھی، گفتگو کر رہی تھی، اس کی گفتگو کے کچھ الفاظ یہ تھے:

> بتاؤ کہ میں دیکھوں کہ تمہارا کشیش کس زبان میں باتیں کرتا تھا اس کا خیال تھا کہ یقیناً ایسی نماز فقط کشیش یا کوئی عالم ہی قائم کر سکتا ہے جیسا کہ عیسائیوں کے ہاں نماز ہوتی ہے لیکن ہم نے اسے جلدی ہی سمجھا دیا کہ اس اسلامی پروگرام کو ہر صاحبِ ایمان مسلمان انجام دے سکتا ہے)

آخر میں ہم نے اس سے کہا: ہم تو عربی زبان میں بول رہے تھے۔

وہ کہنے لگی: میں اگرچہ تمہارے مطالب میں سے ایک لفظ بھی نہ سمجھ پائی تھی تاہم میں نے صراحت سے دیکھا کہ تمہارے الفاظ عجیب و غریب طرز کے تھے۔

اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: اور اس کی وہ بات جو زیادہ اہم ہے اور جس نے مجھے بہت زیادہ متوجہ کیا یہ تھی، کہ تمہارے پیش نماز کے خطبے کے دوران کچھ جملے ایسے تھے جو باقی جملوں سے ممتاز تھے وہ بہت زیادہ مؤثر تھے اور گہرے معلوم ہوتے تھے یہاں تک کہ انھوں نے مجھے لرزہ براندام کر دیا۔ یقیناً ان جملوں میں کچھ اور مطالب تھے۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ تمہارا پیش نماز جب ان جملوں کو ادا کرتا ہے تو وہ روح القدس سے ملا ہوتا ہے۔

ہم نے تھوڑا سا غور و فکر کیا تو متوجہ ہوئے کہ یہ جملے آیاتِ قرآن ہی تھیں جو میں نے خطبے کے دوران اور نماز میں پڑھی تھیں۔

اس بات نے ہمیں ہلا کے رکھ دیا اور اس نکتے کی طرف متوجہ کیا کہ قرآن کی مخصوص طرز اس قدر مؤثر ہے کہ حتیٰ کہ ایک ایسی خاتون جو اس کے ایک لفظ کا مفہوم نہیں سمجھتی وہ بھی اس سے شدید طور پر متاثر ہو جاتی ہے۔ (تفسیر فی ظلال جلد ۴ صفحہ ۴۴۲)

بعد والی آیت میں مشرکین کی مخالفتوں کی ایک بنیادی علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ وہ قرآن کا انکار اشکالات اور اعتراضات کی بناء پر نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی تکذیب اس وجہ سے تھی کہ وہ اس کے مضامین سے آگاہ نہیں تھے (بل کذبوا بمالم یحیطوا بعلمہ) در حقیقت ان کے انکار کا عامل اور سبب ان کی عدم آگہی اور جہالت تھی۔

رہا یہ سوال کہ اس سے مراد کن امور کے بارے میں ان کی جہالت تھی اس سلسلے میں مفسرین نے کئی احتمالات ذکر کیے ہیں کہ جو

سب کے سب آیت میں مراد ہو سکتے ہیں، منجملہ ان کے :

معارف دینی اور مبداء و معاد سے جہالت ـــــ جیسا کہ قرآن معبودِ حقیقی ـــــ اللہ ـــــ کے بارے میں مشرکین کا قول نقل کرتا ہے کہ وہ کہتے تھے :

اجعل الالهة الها واحدا ان هذا لشیء عجاب ۔

کیا اس نے ہمارے خداؤں کو ایک معبود میں بدل دیا ہے، یہ عجیب و غریب چیز ہے (ص ـــ ۵)

یا پھر وہ معاد کے بارے میں کہتے تھے :

هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ (سبا ـ ۷، ۸)۔

کیا ہم تمہیں ایسے شخص کے بارے میں بتائیں جو تم سے بیان کرے گا کہ جب تم (مر کر گل سڑ جاؤ گے اور) بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو تم ایک نیا جنم لوگے کیا اس شخص (محمدؐ) نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے یا اسے جنون (ہو گیا) ہے ۔

درحقیقت ان لوگوں کے پاس مبداء و معاد کی نفی کے لیے کوئی دلیل نہیں تھی صرف جہالت اور بے خبری خرافات اور بڑے بوڑھوں کے مذہب کے عادی ہو جانے سے ان کے لیے سدِّ راہ تھی ۔

یا پھر وہ احکام کے اسرار سے جاہل تھے اسی طرح بعض آیاتِ متشابہ کے مفہوم سے جاہل تھے یا حروفِ مقطعات کے مفہوم سے نابلد تھے ۔

یہ سب جہالتیں انھیں تکذیب اور انکار پر ابھارتی تھیں جب کہ ابھی تک مسائلِ مجہولہ کی تاویل، تفسیر اور حقیقت ان پر واضح نہیں ہوئی تھی (ولما یأتهم تأویله)۔

"تاویل" اصل لغت میں کسی چیز کو لوٹانے کے معنی میں ہے لہٰذا کوئی کام اور بات اپنے اصلی مقصد تک پہنچ جائے تو ہم کہتے ہیں کہ اس کی تاویل آگئی ہے۔ اس بناء پر کسی اقدام کے اصلی ہدف کا بیان، کسی بات کی حقیقی تشریح یا کسی خواب کی تعبیر اور نتیجہ یا کسی بات کا عملی صورت اختیار کر جانا، سب کو تاویل کہا جاتا ہے (اس سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۱۴ اردو ترجمہ پر ہم تفصیل سے گفتگو کر آئے ہیں)۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے کہ یہ غلط روش صرف زمانہ جاہلیت کے مشرکین میں ہی منحصر نہیں ہے بلکہ گزشتہ گمراہ قومیں بھی اسی ابتلاء میں مبتلا تھیں وہ بھی حقائق کی پہچان اور تحقیق کے بغیر اور ان کے تحقق کی انتظار کے بغیر ان کا انکار اور تکذیب کرتے تھے (کذلك کذب الذین من قبلهم)۔

سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۱۳ اور ۱۱۸ میں بھی گزشتہ امتوں کی کیفیت کی طرف اس حوالے سے اشارہ کیا گیا ہے۔ درحقیقت ان سب کا عذر ان کی جہالت ہی تھی اور حقائق کے بارے میں تحقیق نہ کرنا ان کی بدبختی کا باعث تھا جبکہ عقل و منطق کا تقاضا ہے کہ انسان جس چیز کو نہیں جانتا اس کا ہرگز انکار نہ کرے بلکہ اس کی جستجو اور تحقیق کرے ۔

آخر میں روئے سخن پیغمبر کی طرف کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے، دیکھو کہ ان ستمگروں کا انجام کار کیا ہوا (فانظر کیف کان

عاقبۃ الظالمین) یعنی وہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں گے۔

زیر بحث آخری آیت میں مشرکین کے دو بڑے گروہوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ سب کے سب اسی حالت میں باقی نہیں رہیں گے بلکہ "ان میں سے ایک گروہ جس میں حق طلبی کی روح مردہ نہیں ہوئی، آخرکار اس قرآن پر ایمان لے آئیگا جبکہ دوسرا گروہ اسیطرح اپنی جہالت اور ہٹ دھرمی پر قائم رہے گا اور ایمان نہیں لائیگا" (ومنہم من یؤمن بہ ومنہم من لا یؤمن بہ)

واضح ہے کہ یہ دوسرا گروہ فاسد اور مفسد ہے اسی وجہ سے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: تیرا پروردگار مفسدین کو بہتر جانتا ہے (وربک اعلم بالمفسدین)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جو افراد حق کو قبول نہیں کرتے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے معاشرے کا شیرازہ بکھیر دیا ہے اور معاشرے کے نظام کو خراب کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

جہالت اور انکار

جیسا کہ مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اصولی طور پر زیادہ تر حق کی مخالفتوں، دشمنیوں اور حق کے خلاف جنگ کا سرچشمہ جہالت اور نادانی ہے۔ اس لیے کہتے ہیں جہالت کا انجام کفر ہے۔

پہلا فریضہ جو ہر حق طلب انسان کے ذمہ ہے یہ ہے کہ جسے وہ نہیں جانتا اس کے بارے میں سکوت اور خاموشی اختیار کرے، انتظار کرے اور تحقیق و جستجو کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ جس مطلب کو نہیں جانتا اس کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ کرے اور تحقیق کرے۔ جبتک اس کی نفی پر کوئی قطعی دلیل نہ مل جائے اس کی نفی نہ کرے جیسا کہ بغیر قطعی دلیل کے اثبات بھی نہ کرے۔

مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں امام صادق علیہ السلام سے اس سلسلے میں ایک نہایت عمدہ حدیث نقل کی ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

> اللہ نے قرآن کی دو آیات میں اس امت کو دو اہم درس دیئے ہیں پہلا یہ کہ جسے جانتے ہو اس کے سوا کوئی بات نہ کہو اور دوسرا یہ کہ جسے جانتے نہیں ہو اس کا انکار نہ کرو۔

اس کے بعد آپؑ نے یہ دو آیات تلاوت کیں:

> الم یؤخذ علیہم میثاق الکتاب ان لا یقولوا علی اللہ الا الحق۔
>
> کیا خدا نے ان سے آسمانی کتاب کا عہد و پیمان نہیں لیا کہ خدا کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہیں۔
>
> بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ۔
>
> مشرکین نے ایسی چیزوں کا انکار کیا کہ جن سے وہ آگاہی نہیں رکھتے تھے جبکہ جہالت کسی چیز کے انکار کے لیے دلیل نہیں ہے۔

۴۱۔ وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

۴۲۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ○

۴۳۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ○

۴۴۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔـا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○

ترجمہ

۴۱۔ اگر انھوں نے تیری تکذیب کی ہے تو کہہ دے کہ میرا عمل میرے لیے اور تمھارا عمل تمھارے لیے۔ جو کچھ میں انجام دیتا ہوں تم اس سے بیزار ہو اور میں اس سے بیزار ہوں جو تم کرتے ہو۔

۴۲۔ اور ان میں سے ایک گروہ تیری طرف کان دھرتا ہے (لیکن گویا وہ بالکل نہیں سنتا اور بہرہ ہے) کیا تو اپنی بات بہروں کے کانوں تک پہنچا سکتا ہے، اگر وہ نہ سمجھیں۔

۴۳۔ اور ان میں سے ایک گروہ تیری طرف دیکھتا ہے (لیکن گویا وہ بالکل نہیں دیکھتا) کیا تو نابینوں کو ہدایت کر سکتا ہے۔ اگرچہ ان کے پاس کوئی بصیرت نہ ہو۔

۴۴۔ خدا انسانوں پر بالکل ظلم نہیں کرتا لیکن انسان ہیں کہ جو اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

تفسیر

اندھے اور بہرے

گزشتہ آیات میں ہٹ دھرمی پر مبنی مشرکین کے انکار اور تکذیب کے بارے میں بحث آئی ہے۔ یہاں بھی اسی بحث کو

آگے بڑھایا گیا ہے۔

پہلی آیت میں ایک نئے طریقے سے پیغمبر کو مقابلے کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اگر وہ تیری تکذیب کریں تو ان سے کہہ دو کہ میرا عمل میرے لیے اور تمہارا عمل تمہارے لیے (وان کذبوک فقل لی عملی ولکم عملکم)۔

جو میں انجام دیتا ہوں اس سے تم بیزار ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو میں اس سے بیزار ہوں (انتم بریئون مما اعمل وانا بری مما تعملون)۔

بے زاری اور بے اعتنائی کا یہ اعلان جس سے اپنے مکتب پر قطعی اعتماد اور ایمان جھلکتا ہے خاص طور پر ہٹ دھرم منکرین پر ایک مخصوص نفسیاتی اثر رکھتا ہے یہ اعلان ان پر واضح کرتا ہے کہ اس مکتب کو قبول کرنے میں کوئی اصرار اور جبر نہیں ہے وہ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنے کی وجہ سے اپنے آپ کو محرومیت کی طرف لے گئے ہیں اور اس طرح صرف اپنے آپ ہی کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

ایسی تعبیریں قرآن کی دیگر آیات میں بھی ہیں۔ جیسا کہ سورۂ کافرون میں ہے۔

لکم دینکم ولی دین۔

تمہارا دین تمہارے لیے، میرا دین میرے لیے۔

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایسی آیات کا مفہوم مشرکین کے مقابلے میں تبلیغ اور جہاد کے حکم کے منافی نہیں ہیں کہ ہم انہیں منسوخ سمجھنے لگیں بلکہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ یہ بے اعتنائی اور بے نیازی کے انداز میں ہٹ دھرم اور کینہ پرور افراد سے ایک منطقی مقابلہ ہے۔

بعد والی دو آیات میں حق سے ان کے انحراف اور عدم تعلیم کی دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: ایک انسان کی ہدایت کے لیے صرف صحیح تعلیمات، ہلا دینے والی اور پُر اعجاز آیات اور واضح دلائل کافی نہیں ہیں بلکہ قبول کرنے کے لیے آمادگی اور قبولیتِ حق کی لیاقت بھی ضروری ہے جیسا کہ سبزہ اور پھول اگانے کے لیے صرف تیار شدہ بیج کافی نہیں ہے۔ آمادہ زمین بھی ضروری ہے

اسی لیے پہلے فرمایا گیا ہے، ان میں سے ایک گروہ تیری طرف کان تو دھرتا ہے لیکن گویا یہ لوگ بہرے ہیں (ومنھم من یستمعون الیک)[1] باوجودیکہ وہ سننے والا کان نہیں رکھتے، کیا تم ان بہروں کے کانوں تک اپنی آواز پہنچا سکتے ہو، چاہے وہ عقل و ادراک نہ رکھتے ہوں (افانت تسمع الصم ولو کانوا لا یعقلون)۔

"اور ایک اور گروہ تیرے طرف آنکھ لگائے ہوئے ہے اور تیرے اعمال دیکھتا رہتا ہے کہ جن میں سے ہر ایک تیری حقانیت اور راست گوئی کی نشانیوں کو دیکھ سکتا ہے لیکن گویا یہ لوگ اندھے ہیں[2] (ومنھم من ینظر الیک)۔ کیا اس کے باوجود تو ان نابینوں کو ہدایت کر سکتا ہے اگرچہ ان کے پاس کوئی بصیرت نہ ہو (افانت تھدی العمی ولو کانوا لا یبصرون)"

---

[1] اس آیت میں درحقیقت " کانھم صم لا یستمعون " کا جملہ مقدر ہے۔

[2] یہاں " کانھم عمی لا یبصرون " کا جملہ مقدر ہے۔

لیکن جان لو اور وہ بھی جان لیں کہ یہ فکری نارسائی، عدم بصیرت، حق کا چہرہ دیکھنے کے بارے میں اندھا پن اور کلام الٰہی کیلیے ناشنوائی کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جسے وہ شکم مادر سے اپنے ساتھ لائے ہیں اور خدا نے ان پر کوئی ظلم کیا ہو بلکہ خود انھی نے اپنے غلط اعمال، ہٹ دھرمی اور گناہوں سے اپنی روح کو تاریک کرکے اپنی دیکھنے والی آنکھ اور اپنے سننے والے کان کو بیکار کر دیا ہے، کیونکہ "خدا کسی شخص پر ظلم نہیں کرتا لیکن یہ لوگ ہیں جو خود اپنے اوپر ظلم روا رکھتے ہیں" (ان اللّٰہ لا یظلم الناس شیئًا ولکن الناس انفسھم یظلمون)۔

دو قابلِ توجّہ نکات

۱۔ "من یستمعون" اور "من ینظر" سے کیا مراد ہے: یہ جو دوسری آیت میں ہے کہ "ان میں سے کچھ لوگ تیری بات سنتے ہیں" اور تیسری آیت میں ہے کہ "ان میں سے کچھ ہیں جو تیری طرف دیکھتے ہیں" اور یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ تیری اعجاز نما باتوں کو سنتے ہیں اور کچھ دوسرے ہیں جو تیرے معجزنشان اعمال دیکھتے ہیں کہ جو سب کے سب تیری صدقِ گفتار اور تیری دعوت کی حقانیت کی دلیل ہیں لیکن کان دھرنے اور دیکھنے والے ان دونوں گروہوں میں سے کوئی بھی فائدہ نہیں اٹھاتا، کیونکہ انکی نگاہ فہم و ادراک کی نگاہ نہیں ہے۔ بلکہ تنقید، عیب جوئی، اور مخالفت کی نظر ہے۔ وہ کان دھر کے سننے سے بھی فائدہ نہیں اٹھاتے کیونکہ ان کا مقصد مفہوم حق سمجھنا نہیں ہوتا بلکہ وہ تو تکذیب اور انکار کے لیے بہانے تلاش کرتے پھرتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ انسان کے اعمال کی بنیاد اس کا ارادہ اور نیت ہی ہے۔ نیت اور ارادہ ہی انسانی اعمال کے اثرات کو دگرگوں کر دیتا ہے۔

۲۔ "ولو کانوا لا یعقلون" اور "ولو کانوا لا یبصرون" کا مفہوم: زیرِ نظر دوسری آیت کے آخر میں "ولو کانوا لا یعقلون" آیا ہے۔ اور تیسری آیت کے اختتام پر "ولو کانوا لا یبصرون" آیا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ فقط کانوں سے الفاظ کا سننا کافی نہیں بلکہ تفکر و تدبر بھی ضروری ہے تاکہ انسان الفاظ کے مفاہیم سے فائدہ اٹھائے اسی طرح کسی چیز کو آنکھوں سے صرف دیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ بصیرت اور جن چیزوں کو انسان دیکھتا ہے انھیں سمجھنا بھی ضروری ہے تاکہ ان کی گہرائی تک پہنچے اور ہدایت حاصل کرے۔

۴۵۔ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَّمْ يَلْبَثُوٓا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ ۚ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ○

۴۶۔ وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُونَ ○

۴۷۔ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ۖ فَإِذَا جَآءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ○

ترجمہ

۴۵۔ اس دن کو یاد کرو جب انھیں جمع (اور محشور) کرے گا اور انھیں ایسا محسوس ہوگا جیسے (دنیا میں) انھوں نے دن کی ایک گھڑی سے زیادہ توقف نہیں کیا۔ بس اتنی مقدار کہ ایک دوسرے کو (دیکھیں اور) پہچان لیں۔ وہ کہ جنھوں نے لقائے الٰہی (اور قیامت) کا انکار کیا وہ خسارے میں رہے، اور انھوں نے ہدایت حاصل نہ کی۔

۴۶۔ اور اگر ہم کچھ سزائیں کہ جن کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے (تیری زندگی میں) تجھے دکھائیں یا (قبل اس کے کہ وہ عذاب میں گرفتار ہوں) تجھے دنیا سے لے جائیں، بہر حال ان کی بازگشت ہماری طرف ہے۔ اس کے بعد خدا ان پر گواہ ہے جو کچھ وہ انجام دیتے ہیں۔

۴۷۔ اور ہر اُمت کے لیے ایک رسول ہے۔ جب ان کا رسول اُن کی طرف آئے تو خدا ان کے درمیان عدل سے فیصلہ کرتا ہے اور ان پر ظلم نہیں ہوگا۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں مشرکین کی بعض صفات بیان کرنے کے بعد اب ان آیات میں قیامت میں ان کی دردناک کیفیت کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ اس دن کو یاد کرو جب خدا ان سب کو محشور کرے گا اور جمع کرے گا اس عالت میں کہ وہ محسوس کریں گے کہ دنیا میں ان کی ساری عمر دن کی ایک گھڑی سے زیادہ نہ تھی بس اتنی مقدار کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ لیں، اور پہچان لیں (ویوم یحشرھم کان لم یلبثوا الا ساعۃ من النھار یتعارفون بینھم)۔

دنیا میں تھوڑی سی دیر کا یہ احساس اس بناء پر ہے کہ آخرت کی دائمی زندگی کے مقابلے میں یہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ہے۔

یا اس بناء پر ہے کہ یہ ناپائیدار دنیا ان پر یوں تیزی سے گزری ہے گویا ایک ساعت سے زیادہ نہ تھی۔

یا پھر اپنی زندگی سے صحیح فائدہ نہ اٹھانے کی وجہ سے یوں خیال کریں گے کہ ان کی ساری عمر ایک گھڑی سے زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتی تھی۔

جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے اس کے پیش نظر "یتعارفون بینھم" (ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں) کا جملہ دنیا میں ان کے قیام کی مقدار کی طرف اشارہ ہے یعنی اس طرح وہ اپنی عمر کو مختصر اور کم محسوس کریں گے گویا صرف اتنی مقدار تھی کہ جس میں دو آدمی ایک دوسرے کو دیکھ کر آپس میں متعارف ہوں اور پھر ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ مراد یہاں زمانہ برزخ کی کمی کا احساس ہے یعنی وہ لوگ دوران برزخ نیند کی سی کیفیت میں ڈوب جائیں گے جس میں سالہا سال اور صدیوں اور زمانوں کے گزرنے کا احساس نہیں کریں گے اور قیامت کے دن ہزار ہا سال پر مشتمل زمانہ برزخ انھیں ایک ساعت سے زیادہ محسوس نہیں ہوگا۔

اس تفسیر کے لیے شاہد سورۂ روم کی آیہ ۵۵ اور ۵۶ ہے، جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

ویوم تقوم الساعۃ یقسم المجرمون ما لبثوا غیر ساعۃ کذلک کانوا یؤفکون وقال الذین اوتوا العلم والایمان لقد لبثتم فی کتاب اللہ الی یوم البعث فھذا یوم البعث ولکنکم کنتم لا تعلمون۔

ان دو آیات سے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت قیامت برپا ہوگی، مجرمین کا ایک گروہ قسم کھائے گا کہ ان کے برزخ کا دور ایک ساعت سے زیادہ نہیں تھا لیکن مومنین ان سے کہیں گے کہ وہ طولانی دور تھا اور اب قیامت برپا ہو چکی ہے اور تمھیں معلوم نہیں ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ برزخ تمام لوگوں کے لیے ایک جیسی نہیں ہے اور اسکی تفصیل ہم متعلقہ آیات کے ذیل میں بیان کریں گے۔

اس تفسیر کے مطابق "یتعارفون بینھم" کا معنی یہ ہوگا کہ وہ لوگ زمانۂ برزخ کی مقدار اتنی کم محسوس کریں گے کہ انھیں دنیا کی کوئی بات بھولی نہیں ہوگی اور وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سے پہچان لیں گے۔

اور یا یہ کہ وہ وہاں ایک دوسرے کے بُرے اعمال کو دیکھیں گے اور ایک دوسرے کے باطن کو پہچان لیں گے اور یہ خود ان کے لیے ایک بہت بڑی رسوائی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ اس دن ان سب پر یہ ثابت ہو جائیگا کہ وہ افراد جنھوں نے روز قیامت اور لقائے الٰہی کی تکذیب کی، انھوں نے نقصان اٹھایا۔ اور وہ اپنے وجود کا سارا سرمایہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے اور اس سے کوئی نتیجہ بھی حاصل نہ کیا (قد خسر الذین کذبوا بلقاء اللہ)۔

اور یہ لوگ اس تکذیب، انکار، گناہ پر اصرار اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہدایت کی اہلیت نہیں رکھتے تھے (وما کانوا مھتدین) کیونکہ ان کا دل سیاہ اور ان کی روح تاریک تھی۔

اگلی آیت میں کفار کی تہدید کے لیے اور پیغمبر کو تسلی دینے کی خاطر فرمایا گیا ہے، جن سزاؤں کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے اگر ان کا کچھ حصہ ہم تجھے دکھائیں اور اپنی زندگی کے دوران اگر تو ان کے عذاب اور سزا کو دیکھ لے اور یا پھر اس سے قبل کہ وہ ایسے انجام سے دوچار ہوں ہم تجھے دنیا سے لے جائیں، بہرحال ان کی بازگشت ہماری طرف ہے اور خدا ان کے انجام دیئے ہوئے اعمال پر شاہد ہے (واما نرینک بعض الذی نعدھم او نتوفینک فالینا مرجعھم ثم اللہ شھید علیٰ ما یفعلون)۔

زیرِ نظر آخری آیت میں بشمول پیغمبر اسلام تمام انبیاء کے بارے میں اور تمام امتوں کے بارے میں کہ جن میں رسول اللہؐ کے زمانے کی امت بھی شامل ہے، ایک کلی قانون بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ہدایت کے لیے خدا کی طرف سے ایک رسول اور فرستادۂ الٰہی ہوتا ہے (ولکل امۃ رسول)۔

جب ان کی طرف رسول آیا اور اس نے ابلاغِ رسول کیا اور کچھ لوگوں نے حق کو قبول کر لیا اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیا اور ایک گروہ مخالفت اور تکذیب کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو خدا ان کے درمیان اپنے عدل سے فیصلہ کرتا ہے اور کسی پر ظلم نہیں ہوگا، یہ مومن اور نیک لوگ باقی رہ جاتے ہیں اور برے اور مخالف یا تو نابود ہو جاتے ہیں اور یا پھر شکست سے دوچار ہوتے ہیں (فاذا جاء رسولھم قضی بینھم بالقسط وھم لا یظلمون)۔

اسی طرح پیغمبر اسلام اور ان کی معاصر امت کے ساتھ ہوا کہ ان کی دعوت کے مخالف یا تو جنگوں میں ختم ہو گئے اور یا آخر کار شکست کھا کر معاشرے سے مسترد ہو گئے اور مومنین نے امور کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔

لہٰذا جس فیصلے کی طرف آیت میں اشارہ ہوا ہے یہ وہی تکوینی قضاوت اور فیصلہ ہے جو اسی دنیا میں جاری ہوا ہے۔ باقی رہا یہ جو بعض نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ روزِ قیامت خدا کے فیصلے کی طرف اشارہ ہے، خلافِ ظاہر ہے۔

۴۸۔ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○

۴۹۔ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ○

۵۰۔ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُهُ بَيَاتًا أَوْ نَهَارًا مَاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ ○

۵۱۔ أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنْتُمْ بِهِ ۚ آلْآنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ ○

۵۲۔ ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ○

ترجمہ

۴۸۔ وہ کہتے ہیں یہ جو (سزا کا) وعدہ ہے، اگر سچ کہتے ہو تو کب اس پر عمل ہوگا۔

۴۹۔ کہہ دو میں اپنے لیے نقصان اور نفع کا مالک نہیں ہوں (چہ جائیکہ تمہارے لیے) مگر وہ جو خدا چاہے۔ ہر قوم و ملت کے لیے ایک اجل اور انجام ہے جب ان کی اجل آجاتی ہے (اور ان کی سزا یا موت کا حکم صادر ہو جائے) تو نہ ایک گھڑی تاخیر کرتے ہیں اور نہ ہی ایک گھڑی آگے ہوتے ہیں۔

۵۰۔ کہہ دو کیا تم سمجھتے ہو کہ اگر اس کی سزا رات کے وقت یا دن کو تمہیں آپہنچے (تو کیا تم اسے دور کر سکتے ہو) پس مجرمین کس بنا پر جلدی کرتے ہیں۔

۵۱۔ یا یہ کہ جب واقع ہوگی تو ایمان لے آؤ گے (لیکن جان لو کہ تمہیں کہا جائے گا کہ) اب جبکہ پہلے اس کے لیے جلدی کرتے تھے (اس وقت کیا فائدہ)۔

۵۲۔ پھر جنھوں نے ظلم کیا ہے ان سے کہا جائے گا : ابدی عذاب چکھو ، جو کچھ تم انجام دیتے تھے کیا تمھیں اس کے علاوہ کی سزا دی جائے گی ۔

تفسیر

خدائی سزا میرے ہاتھ میں نہیں ہے

منکرینِ حق کو عذاب اور سزا کی تہدیدوں کے بعد اب ان آیات میں پہلے تو ان کی تکذیب اور تمسخر بھری بات بیان کی گئی ہے ، وہ کہتے ہیں کہ عذاب کے بارے میں تم جو وعدہ کرتے ہو اگر سچ کہتے ہو تو وہ کب ہے ؟ (ویقولون متٰی ھٰذا الوعد ان کنتم صادقین) ۔

یقیناً یہ باتیں پیغمبرِ اسلام کے زمانے کے مشرکین کرتے تھے ۔ کیونکہ بعد والی آیات جن میں پیغمبرِ اکرمؐ کا جواب موجود ہے اس امر پر شاہد ہے ۔

بہر حال اس طرح سے وہ پیغمبر کی تہدیدوں کے بارے میں اپنی بے اعتنائی کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے اور جو افراد ان تہدیدوں کی وجہ سے متزلزل ہو گئے تھے ان کے قوتِ قلب اور سکونِ فکر کا سامان کرنا چاہتے تھے ۔ اس کے جواب میں خدا تعالیٰ پیغمبرِ اکرمؐ کو حکم دیتا ہے کہ انھیں چند طریقوں سے جواب دیں ۔

پہلا یہ کہ فرماتا ہے : ان سے کہہ دو کہ اس کام کا وقت اور وعدہ گاہ میرے اختیار میں نہیں ہے ۔ میں اپنے لیے نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں ، چہ جائیکہ تمھارے لیے ، مگر جو کچھ خدا چاہے ۔ اور جو وہ ارادہ کرے (قل لا املک لنفسی ضرًّا ولا نفعًا الا ما شاء اللّٰہ) ۔ میں تو صرف اس کا بھیجا ہوا اور پیغمبر ہوں ۔ نزولِ عذاب کے لیے وعدہ گاہ اور وقت کا تعین اسی کے ہاتھ میں ہے ۔ جب میں اپنے بارے میں نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں تو تمھارے بارے میں بدرجہ اولیٰ نہیں ہوں گا ۔

یہاں درحقیقت توحیدِ افعالی کی طرف اشارہ ہے ۔ یعنی اس عالم میں تمام چیزوں کی بازگشت خدا کی طرف ہے ۔ ہر کام اسی کی طرف سے ہے کہ جو اپنی حکمت سے مومنین کو کامیابی عطا کرتا ہے اور وہی ہے جو منحرفین کو اپنے عدل سے سزا دیتا ہے ۔

واضح ہے کہ یہ اس بات کے منافی نہیں کہ اللہ نے ہمیں قدرت و طاقت دی ہے کہ جس کے ذریعے ہم اپنے بعض منافع اور نقصانات کے مالک ہیں اور اپنی سرنوشت کے بارے میں ہم ارادہ کر سکتے ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں یہ آیت مالکیت بالذات کی نفی کرتی ہے نہ کہ مالکیت بالغیر کی اور " الا ما شاء اللّٰہ " اس کے لیے واضح قرینہ ہے ۔

یہاں سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس آیت سے جو بعض متعصب افراد مثلاً مؤلف المنار نے پیغمبرؐ سے توسّل کے جواز کی نفی کا مطلب لیا ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ اگر توسّل سے مراد یہ ہو کہ ہم پیغمبرِ اکرمؐ کو بالذات صاحبِ قدرت اور مالکِ سود و زیاں سمجھیں تو مسلّم ہے

کہ یہ شرک ہے اور کوئی مسلمان یہ عقیدہ نہیں رکھ سکتا اور اگر یہ مالکیت خدا کی طرف سے ہو اور " اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ " کے مفہوم کے مطابق ہو تو اس میں کوئی مانع نہیں ہے اور یہ عین ایمان و توحید ہے ۔ مذکورہ مؤلف نے اس نکتے سے غفلت کی وجہ سے طویل بحثوں سے اپنا اور اپنے قارئین کا وقت ضائع کیا ہے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کی تفسیر کی تمام تر خصوصیات کے باوجود اس میں اشتباہات بہت زیادہ ہیں ۔ جن کا سرچشمہ تعصب کو سمجھا جاسکتا ہے ۔

دوسرا یہ کہ فرماتا ہے : ہر قوم اور جمعیت کے لیے ایک معیّن زمانہ اور اجل ہے جب ان کی اجل آجاتی ہے تو وہ اس میں نہ ایک گھڑی تاخیر کرسکتے ہیں نہ گھڑی بھر کے لیے آگے بڑھ سکتے ہیں (لکل امة اجل اذا جاء اجلھم فلا یستاخرون ساعة ولا یستقدمون) ۔

دوسرے لفظوں میں کوئی قوم و ملت جب راہِ حق سے منحرف ہو تو اپنے اعمال کے نتیجے میں خدا کی سزا سے محفوظ نہیں رہ سکتی ۔ جب لوگ ایسے راستوں پر چل پڑیں اور آفرینش کے قطعی قوانین سے انحراف کریں تو اپنے وسائل کھو بیٹھتے ہیں اور آخر کار قعرِ مذلت میں جا گرتے ہیں ۔ تاریخِ عالم ایسے لوگوں کی مثالوں سے بھری پڑی ہے ۔

مشرکین جو عذابِ الٰہی کے آنے میں تعجیل کا تقاضا کرتے تھے ، قرآن درحقیقت انھیں خبردار کرتا ہے کہ وہ بلاوجہ جلدی نہ کریں ، جب وقت آئے گا تو اس عذاب میں لمحہ بھر کی تاخیر و تقدیم نہیں ہوگی ۔

ضمنی طور پر متوجہ رہنا چاہیے کہ لفظ " ساعت " کبھی لحظہ اور لمحہ کے لیے آتا ہے اور کبھی زمانے کی تھوڑی سی مدت کے لیے آتا ہے اگرچہ آج کل رات دن کے چوبیسویں حصہ (ایک گھنٹہ) کو " ساعت " کہتے ہیں ۔

تیسرا جواب اگلی آیت میں پیش کرتے ہوئے کہتا ہے ، ان سے کہہ دو کہ اگر رات یا دن کے وقت پروردگار کا عذاب تم پر آجائے تو یہ کوئی غیر ممکن بات نہیں ہے ۔ کیا تم اس ناگہانی عذاب کو دور کرسکتے ہو ۔ (قل ارءیتم ان اتاکم عذابه بیاتا او نھارا) ۔

ان حالات میں مجرم اور گنہ گار آخر کیوں جلدی کرتے ہیں (ماذا یستعجل منه المجرمون) [1] ۔

دوسرے لفظوں میں ان جسور مجرموں کو اگر نزولِ عذاب کا یقین نہیں ہے تو کم از کم اس کا احتمال تو انھیں ہے ہی کہ اچانک

---

[1] جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ زیرِ نظر آیت قضیۂ شرطیہ پر مشتمل ہے جس کی شرط ذکر ہوئی ہے اور جزا مقدر ہے ۔ اور " ماذا یستعجل منه المجرمون " ایک مستقل جملہ ہے ۔ آیت کی تقدیر اس طرح ہے :

ارءیتم ان اتاکم عذابه بیاتا او نھارا أکنتم تقدرون علی دفعه او تعدونه امرا محالا فاذا کان الامر کذلک ماذا یستعجل منه المجرمون ۔

یعنی ـــــ کیا تم سمجھتے ہو کہ اگر تم پر رات یا دن کے وقت عذاب آجائے تو تم اسے روکنے کی قدرت رکھتے ہو یا اسے امرِ محال سمجھتے ہو ۔ جب معاملہ ایسا ہے تو پھر مجرمین آخر کس طرح اس کی تعجیل چاہتے ہیں ۔

بعض نے یہ جو احتمال پیش کیا ہے کہ " ماذا یستعجل ...... " جزائے شرط ہے ، بہت بعید ہے ۔ (غور کیجیے گا)

عذاب ان کے پیچھے آجائے ۔ ان کے پاس اس کے لیے کیا بندوبست، ضمانت اور دلیل ہے کہ پیغمبر کی تہدیدیں بالکل وقوع پذیر نہیں ہوں گی ۔ عقلمند انسان کو ایسے احتمالِ ضرر کی صورت میں بھی کچھ نہ کچھ احتیاط کرنا چاہیے اور اس سے ڈرنا چاہیے ۔

ایسا ہی مفہوم دیگر تعبیرات کی صورت میں قرآن کی دوسری آیات میں موجود ہے ۔ مثلاً:

افامنتم ان یخسف بکم جانب البر او یرسل علیکم حاصبا ثم لا تجدوا لکم وکیلا ۔

کیا تم اس سے مامون ہو کر خدا تمہیں زمین کے کسی حصہ میں اندر سما دے (یعنی تم زمین میں دھنس جاؤ) یا تم پر آسمان سے سنگریزے برسائے اور پھر تم اپنے لیے کوئی نگہبان نہ پاؤ ۔
(بنی اسرائیل ـــــ ۶۸)

یہ وہی چیز ہے جسے علم کلام اور علم اصول میں "لزوم دفع ضرر محتمل" کہا جاتا ہے ۔

چوتھا جواب اس سے بعد والی آیت میں دیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے ، اگر تم گمان کرتے ہو کہ نزول عذاب کے وقت ایمان لاؤ گے اور تمہارا ایمان قبول کر لیا جائے گا تو یہ خیال باطل ہے (اثم اذا ما وقع آمنتم بہ)۔ کیونکہ نزولِ عذاب کے بعد توبہ کے دروازے تم پر بند ہو جائیں گے اور پھر ایمان لانے کا ذرہ بھر اثر بھی نہ ہوگا ، بلکہ " تم سے کہا جائے گا کہ اب ایمان لا رہے ہو جب کہ پہلے تم تمسخر اور تکذیب کرتے ہوئے عذاب کے لیے تعجیل کرتے تھے (آلآن وقد کنتم بہ تستعجلون)۔

یہ ان کی دنیاوی سزا ہے " پھر روز قیامت جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ، ان سے کہا جائے گا ابدی اور ہمیشہ کا عذاب چکھو" (ثم قیل للذین ظلموا ذوقوا عذاب الخلد)۔

کیا جو کچھ تم نے انجام دیا ہے تمہیں اس کے سوا سزا دی جائے گی (ھل تجزون الا بما کنتم تکسبون)۔

یہ درحقیقت تمہارے ہی اعمال ہیں جو تمہیں دامن گیر ہوئے ہیں ، وہی تمہارے سامنے مجسم ہوئے ہیں اور وہی تمہیں ہمیشہ تکلیف و آزار پہنچاتے ہیں ۔

چند اہم نکات

۱۔ قرآنی آیت سے غلط استدلال : جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیہ ۳۴ کے ذیل میں ہم نے کہا ہے کہ ہمارے زمانے کے بعض دین ساز لوگوں نے " لکل امۃ اجل ـ" جیسی آیات سے جو قرآن میں دو مرتبہ آئی ہے ، پیغمبر اسلام کی خاتمیت کی نفی کے لیے استدلال کیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہر دین و مذہب آخر کار ختم ہو جاتا ہے اور اپنی جگہ دوسرے کو دے دیتا ہے حالانکہ لفظ "اُمّت" گروہ اور جماعت کے معنی میں ہے نہ کہ مذہب کے معنی میں خصوصاً ایک مذہب کے پیروکار۔

ان آیات کا مقصد یہ ہے کہ قانونِ موت و حیات افراد سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ملتوں اور گروہوں پر بھی یہ قانون حاوی ہے ، اور جب وہ ظلم و گناہ اختیار کریں گے تو ختم ہو جائیں گے ۔ خصوصاً زیر بحث آیت سے پہلے اور بعد کی آیات کی طرف توجہ سے حقیقت واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ یہاں کسی مذہب کے منسوخ ہونے سے متعلق گفتگو نہیں ہے بلکہ نزولِ عذاب اور ایک گروہ و ملت کے نابود

ختم ہو جانے کے بارے میں ہے کیونکہ قبل اور بعد کی دونوں آیات دنیاوی عذاب اور سزا کے بارے میں بات کر رہی ہیں۔

۲۔ دنیا میں مسلمانوں کے لیے سزا: مندرجہ بالا آیات کی طرف توجہ کرنے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلمانوں کے معاشرے بھی اس دنیا میں سزا اور عذاب میں گرفتار ہوں گے؟

اس سوال کا جواب ہاں میں ہے کیونکہ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ اُمت دنیاوی عذاب سے مستثنیٰ ہے بلکہ یہ قانون تمام امتوں اور ملتوں کے بارے میں ہے اور یہ جو ہم نے بعض آیات قرآن (مثلاً انفال ۳۳) میں پڑھا ہے کہ خدا اس امت کو سزا نہیں دے گا وہ دو میں سے ایک شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ پہلی پیغمبر اکرمؐ کا امت میں موجود ہونا اور دوسری استغفار اور گناہ سے توبہ کرنا۔ لہٰذا یہ فرمان غیر مشروط نہیں ہے۔

۲۔ نزول عذاب کے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی: مندرجہ بالا آیات دوبارہ اس حقیقت کی تاکید کرتی ہیں کہ نزول عذاب کے وقت توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور عذاب کے وقت کی پشیمانی بے فائدہ ہے۔ اس کی دلیل بھی واضح ہے اور وہ یہ کہ اس حالت میں توبہ اجباری اور اضطراری صورت میں ہوگی اور ایسی توبہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔

۵۳۔ وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ۭ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ڤ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝

۵۴۔ وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ۭ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

۵۵۔ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

۵۶۔ هُوَ يُـحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

ترجمہ

۵۳۔ تجھ سے پوچھتے ہیں کیا وہ (خدائی سزا والا وعدہ) حق ہے؟ کہہ دو خدا کی قسم یقیناً حق ہے اور تم اس سے بچ نہیں سکتے۔

۵۴۔ اور جس نے ظلم کیا ہے اگر وہ تمام کچھ جو روئے زمین پر ہے اس کے اختیار میں ہو تو وہ (سب کچھ عذاب کے خوف سے) اپنی نجات کے لیے دے دیگا اور جب عذاب کو دیکھے گا تو (پشیمان ہوگا لیکن) اپنی پشیمانی کو چھپائیگا (کہ کہیں زیادہ رسوا نہ ہو) اور ان کے درمیان عدل سے فیصلہ ہوگا اور ان پر ظلم و ستم نہیں ہوگا۔

۵۵۔ آگاہ رہو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خدا کا ہے۔ آگاہ رہو کہ خدا کا وعدہ حق ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۵۶۔ وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

تفسیر

خدائی سزا میں شک نہ کرو:

گزشتہ آیات میں مجرمین کے لیے اس جہان میں اور آخرت میں سزا اور عذاب کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر نظر آیات میں

یہی بحث جاری ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: مجرمین اور مشرکین تجھ سے تعجب سے سوال کرتے ہیں کہ کیا اس جہان میں اور دوسرے جہان میں خدائی سزا والا وعدہ حق ہے (ویستنبئونک احق ھو)۔

یاد رہے کہ یہاں "حق" باطل کے مقابلے میں نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ کیا یہ سزا اور کیفر کردار واقعیت رکھتا ہے اور متحقق ہوگا؟ کیونکہ "حق" اور "تحقق" دونوں ایک ہی مادہ سے ہیں البتہ اگر یہاں وہ "حق" مراد لیا جائے جو "باطل" کے مقابلے میں ہے تو پھر اس کا ایک وسیع معنی ہوگا اور یہ ہر موجود کی حقیقت پر محیط ہوگا اور اس کا نقطۂ مقابل معدوم اور باطل ہوگا۔

خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ اس سوال کے جواب میں بڑی تاکید سے کہہ دو: مجھے اپنے پروردگار کی قسم! یہ حقیقت ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے (قل ای وربی انہ لحق)۔

اور اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ تم خدائی سزا کی گرفت سے بھاگ سکتے ہو تو تم نے بہت بڑا اشتباہ کیا ہے کیونکہ "تم ہرگز اس سے نہیں بچ سکتے اور نہ ہی اپنی طاقت سے تم اسے عاجز کر سکتے ہو" (وما انتم بمعجزین)۔

درحقیقت یہ جملہ مندرجہ بالا جملے کے ساتھ مقتضی اور مانع کے بیان کے قبیل میں سے ہے۔ پہلے جملے میں فرمایا گیا ہے، کہ مجرمین کی سزا ایک حقیقت ہے اور دوسرے جملے میں مزید کہا گیا ہے کہ کوئی طاقت اس سے بچا نہیں سکتی۔ سورہ طور کی آیت ۷، اور ۸ میں بالکل اسی طرح ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ان عذاب ربک لواقع مالہ من دافع۔

یقیناً تیرے رب کا عذاب واقع ہو کر رہے گا اور کوئی اس سے بچانے والا نہیں ہے

زیر بحث آیت میں جو تاکیدیں دکھائی دیتی ہیں وہ قابلِ توجہ ہیں۔ ایک طرف قسم کھا کر بات کی گئی ہے دوسری "انّ" اور لامِ تاکید ہے اور تیسری طرف "وما انتم بمعجزین" کا جملہ ہے یہ سب اس امر پر تاکید ہیں کہ سنگین جرائم کے ارتکاب پر خدائی سزا حتمی ہے۔

بعد والی آیت میں اس سزا کے عظیم ہونے خصوصاً قیامت میں اس کے بڑے ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: عذابِ الٰہی اس طرح سے وحشت ناک اور ہول انگیز ہے کہ ظالموں میں سے ہر ایک زمین کی تمام تر ثروت کا مالک ہو تو وہ تیار ہوگا کہ سب کچھ دے دے تاکہ اس عذاب اور سزا سے رہائی پالے (ولو ان لکل نفس ظلمت ما فی الارض لافتدت بہ)[1]

درحقیقت وہ عذابِ الٰہی سے بچنے کے لیے بڑی سے بڑی رشوت دینے کو تیار ہیں لیکن ان سے کچھ بھی قبول نہیں کیا جائے گا اور سوئی کی نوک کے برابر بھی ان کی سزا میں کمی نہیں کی جائے گی۔

خصوصاً ان میں سے بعض سزائیں تو معنوی پہلو رکھتی ہیں اور وہ یہ کہ وہ عذابِ الٰہی کے مشاہدے پر پشیمان ہوتے ہیں لیکن دوسرے مجرموں یا اپنے پیروکاروں کے سامنے زیادہ رسوائی سے بچنے کے لیے اظہارِ ندامت نہیں کرتے (واسروا الندامۃ لما راوا العذاب)۔

اس کے بعد تاکیداً کہا گیا ہے کہ ان تمام چیزوں کے باوجود ان کے درمیان عدل سے فیصلہ ہوگا اور ان کے بارے میں ظلم نہیں ہوگا (وقضی بینھم بالقسط وھم لا یظلمون)۔

---

[1] درحقیقت مندرجہ بالا جملے میں یہ عبارت مقدر ہے: من ھول القیامۃ والعذاب۔

یہ جملہ قرآنی روش کے مطابق تمام معاملات پر سزا میں عدالت کے سلسلے میں تاکید ہے کیونکہ گزشتہ آیت میں سزا کے بارے میں موجود تاکیدوں سے غافل لوگ یہ وہم کرتے کہ یہاں انتقام جوئی کا جذبہ کارفرما ہے لہٰذا قرآن پہلے کہتا ہے کہ ان کے درمیان عدل سے فیصلہ ہوگا اور پھر تاکید کے طور پر کہتا ہے کہ ان پر ظلم نہیں ہوگا۔

اس کے بعد اس بناء پر کہ کہیں لوگ اللہ کے اس وعدہ اور وعید کو مذاق نہ سمجھیں اور یہ خیال نہ کریں کہ خدا اُسے انجام دینے سے قاصر ہے، قرآن مزید کہتا ہے: آگاہ رہو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خدا کا مال ہے اور اس کی مالکیت و حکومت تمام جہانِ ہستی پر محیط ہے اور کوئی اس کی سلطنت سے باہر نہیں جا سکتا (الا ان للّٰہ ما فی السمٰوات والارض)۔

نیز آگاہ رہو کہ مجرمین کی سزا کے بارے میں خدا کا وعدہ حق ہے اگرچہ بہت سے لوگ کہ جن کے نفس پر جہالت نے اپنا منحوس سایہ ڈال دیا ہے اس حقیقت کو نہیں جانتے (الا ان وعد اللّٰہ حق ولکن اکثرھم لا یعلمون)۔

زیر نظر آخری آیت بھی اسی مسئلہ حیات کے بارے میں مزید تاکید ہے، ارشاد ہوتا ہے: خدا ہے کہ جو زندہ کرتا ہے اور وہی ہے جو مارتا ہے (ھو یحیی و یمیت)۔ لہٰذا وہ بندوں کو مارنے اور انھیں قیامت کی عدالت کے لیے زندہ کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔

اور آخرکار تم سب کے سب اس کی طرف پلٹ جاؤ گے (والیہ ترجعون) اور وہاں پھر اپنے اعمال کی جزا اور سزا پاؤ گے۔

دو اہم نکات

۱۔ ایک سوال اور اس کا جواب: زیر بحث آیات کے بارے میں ایک سوال کیا جاتا ہے کہ کیا خدائی سزا کے واقعی ہونے کے بارے میں مشرکین کا سوال تمسخر تھا یا حقیقی سوال تھا بعض کہتے ہیں کہ حقیقی سوال شک کی نشانی ہے اور یہ مشرکین کی کیفیت نہ تھی۔

لیکن بہت سے مشرکین شک اور تردد کی حالت میں تھے اور ان میں ایک گروہ پیغمبر اکرمؐ کی حقانیت کا علم رکھنے کے باوجود ہٹ دھرمی تعصب اور عناد وغیرہ کی وجہ سے مخالفت پر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس صورتِ حال کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی طرف سے حقیقی سوال کیا جانا کوئی بعید نہیں ہے۔

۲۔ "ندامت" کا مفہوم: "ندامت" کا مطلب ہے ایسے کام پر پشیمانی جس کے غیر مطلوب آثار واضح ہو چکے ہوں، چاہے انسان اس کا علاج کر سکے یا نہ کر سکے۔ مجرمین کی قیامت میں پشیمانی دوسری طرح کی ہے اور اسے پوشیدہ رکھنا اس بناء پر ہے کہ اسے واضح کرنا زیادہ رسوائی کا موجب ہے۔

۵۷۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○

۵۸۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ○

ترجمہ

۵۷۔ اے لوگو! تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے لیے نصیحت اور موعظہ آیا ہے اور جو کچھ سینوں میں ہے اس کے لیے باعث شفا ہے اور مومنین کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

۵۸۔ کہہ دو کہ خدا کے فضل اور رحمت سے خوش رہو، کیونکہ جو کچھ انھوں نے جمع کر رکھا ہے وہ اس سے بہتر ہے۔

تفسیر

قرآن خدا کی عظیم رحمت ہے

بعض گزشتہ آیات میں قرآن کے بارے میں کچھ مباحث آئی ہیں اور ان میں مشرکین کی مخالفت کا کچھ ذکر آیا ہے۔ زیرِ نظر آیات میں بھی اسی مناسبت سے قرآن کے بارے میں گفتگو آئی ہے۔

پہلے ایک ہمہ گیر اور عالمی پیغام کے حوالے سے تمام انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اے لوگو! تمھارے لیے تمھارے پروردگار کی طرف سے وعظ و نصیحت آئی ہے (یا ایھا الناس قد جاء تکم موعظة من ربکم)۔ اور ایسا کلام کہ جو تمھارے دلوں کی شفاء کا سبب ہے (وشفاء لما فی الصدور) ایسی چیز کہ جو ہدایت اور راہنمائی کا باعث ہے (وھدی) مومنین کے لیے رحمت ہے (ورحمة للمؤمنین)۔

اس آیت میں قرآن کی چار صفات بیان ہوئی ہیں انھیں سمجھنے کے لیے پہلے ان کے لغوی معانی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا "وعظ" (اور "موعظہ") جیسا کہ مفردات میں آیا ہے، ایسی نہی کو کہتے ہیں جس میں تہدید کی آمیزش ہو لیکن ظاہراً "موعظہ" کا معنی اس سے وسیع تر ہے جیسا کہ مشہور عرب دانشور خلیل کا قول مفردات ہی میں لکھا ہے کہ "موعظہ" نیکیوں کا تذکرہ اور یاددہانی ہے جس میں رقتِ قلب بھی موجود ہو۔

درحقیقت ہر قسم کی پند و نصیحت جو مخاطب پر اثر کرے، اسے برائیوں سے ڈرائے یا اس کے دل کو نیکیوں کی طرف متوجہ کرے

اسے "وعظ" اور "موعظہ" کہتے ہیں البتہ اس بات کا یہ مطلب نہیں کہ ہر موعظہ کا اثر ہونا چاہیے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ آمادہ دلوں پر اس طرح سے اثر کرے۔

دلوں کی بیماری سے شفاء کا باعث یا قرآن کی تعبیر میں اس سے شفاء کا سبب جو سینوں میں ہے ـــــــ اس سے مراد معنوی اور روحانی آلودگیوں سے شفاء ہے، مثلاً بخل، کینہ، حسد، بزدلی، شرک اور نفاق وغیرہ سے شفاء ـــــــ کہ جو سب کی سب روحانی بیماریاں ہیں۔

"ہدایت" سے مراد ہے مقصود کی طرف راستہ مل جانا۔ یعنی انسان کا تکامل، ارتقاء اور پیش رفت تمام مثبت پہلوؤں کے سلسلے میں۔

نیز "رحمت" سے مراد خدا کی بخشی ہوئی وہ مادی اور معنوی نعمتیں ہیں جو اہل انسانوں کو میسر آتی ہیں جیسا کہ مفردات میں ہے کہ "رحمت" کی جب خدا کی طرف نسبت دی جائے تو اس کا معنی نعمت بخشنا ہے اور جب انسانوں کی طرف اس کی نسبت ہو تو اس کا مطلب ہے رقت قلبی اور مہربانی۔

قرآن کے سائے میں انسان کی تربیت اور اس کے تکامل و ارتقاء کو مندرجہ بالا آیات میں درحقیقت چار مراحل میں بیان کیا گیا ہے۔

پہلا مرحلہ ـــــــ موعظہ اور پند نصیحت ہے
دوسرا مرحلہ ـــــــ طرح طرح کے اخلاقی رذائل سے روح انسانی کو پاک کرنا ہے۔
تیسرا مرحلہ ـــــــ ہدایت کا ہے جو پاکسازی کے بعد انجام پاتا ہے ـــــــ اور
چوتھا مرحلہ ـــــــ وہ ہے کہ انسان اس لائق ہو جاتا ہے کہ پروردگار کی رحمت و نعمت اس کے شامل حال ہو۔

ان میں سے ہر مرحلہ دوسرے کے بعد آتا ہے اور جاذب نظر یہ ہے کہ یہ سب مراحل قرآن کے زیر سایہ انجام پاتے ہیں۔

قرآن ہے کہ جو انسانوں کو پند و نصیحت کرتا ہے، قرآن ہے کہ جو گناہ کے زنگ اور بری صفات کو اس کے دل سے دھوتا ہے۔ قرآن ہے کہ جو انسانوں کے دلوں میں نور ہدایت کی روشنی کرتا ہے اور قرآن ہی ہے جو فرد اور معاشرے پر خدائی نعمتوں کے نزول کا باعث ہے۔

نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام نے اپنی جامع گفتگو میں نہایت خوبصورت انداز میں اس حقیقت کی وضاحت فرمائی ہے، آپ فرماتے ہیں:

فاستشفوه من ادوائكم واستعينوا به على لأوائكم فان فيه شفاء من اكبر الداء وهو الكفر والنفاق والغي والضلال۔

قرآن سے اپنی بیماریوں کی شفاء طلب کرو اور اپنی مشکلات کے حل کے لیے اس سے مدد طلب کرو کیونکہ قرآن میں سب سے بڑی بیماری یعنی کفر، نفاق، گمراہی کی شفاء ہے[1]

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶

یہ چیز بتاتی ہے کہ قرآن ایک ایسا نسخہ ہے جو فرد اور معاشرے کی مختلف اخلاقی اور اجتماعی بیماریوں کے علاج کے لیے کارگر ہے اور یہ وہ حقیقت ہے، جسے مسلمان بھلا چکے ہیں اور بجائے اس کے کہ وہ اس شفا بخش دوا سے فائدہ اٹھائیں، اپنا علاج دوسرے مکاتب میں تلاش کرتے پھرتے ہیں اور انھوں نے اس عظیم آسمانی کتاب کو فقط پڑھنے کے لیے رکھ چھوڑا ہے اور یہ نہیں کہ وہ اس میں غور و فکر کریں اور اس پر عمل کریں۔

اگلی آیت میں بحث کی تکمیل کے لیے اور اس عظیم خدائی نعمت یعنی قرآن مجید کو جو ہر نعمت سے برتر ہے کے بارے میں تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اے پیغمبر! کہہ دو کہ لوگ پروردگار کے فضل اور اس کی بے پایاں رحمت پر اور اس عظیم آسمانی کتاب کے نزول پر خوش ہو جائیں کہ جو تمام نعمتوں کی جامع ہے۔ نہ کہ دولت کے انباروں پر، بڑے مقام و منصب پر اور قوم و قبیلہ کی کثرت پر (قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذلک فلیفرحوا) کیونکہ یہ سرمایہ ان تمام چیزوں سے بہتر اور بالاتر ہے کہ جو انھوں نے جمع کر رکھی ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی اس سے موازنہ کے قابل نہیں ہے (ھو خیر مما یجمعون)۔

دو قابلِ توجہ نکات

۱۔ کیا دل احساسات کا مرکز ہے؟ زیرِ بحث پہلی آیت اور اس قسم کی بعض دیگر قرآنی آیات کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اخلاقی بیماریوں کا مرکز دل ہے۔ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ابتداء میں یہ اعتراض پیدا ہو کہ ہم جانتے ہیں کہ تمام اخلاقی اوصاف اور فکری و جذباتی مسائل کا تعلق روحِ انسانی سے ہے اور دل تو صرف ایک خودکار پمپ کے طور پر خون کی نقل و انتقال اور بدن کے سالموں کی آبیاری اور انھیں غذا پہنچانے کا کام کرتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ——— حق یہی ہے کہ دل صرف جسمِ انسانی کو منظم رکھنے پر مامور ہے اور نفسیاتی مسائل کا تعلق روح سے ہے لیکن یہاں ایک دقیق نکتہ موجود ہے کہ جس کی طرف توجہ کرنے سے قرآن کی اس تعبیر کا مقصد واضح ہو جائے گا اور وہ یہ کہ جسمِ انسانی میں دو مرکز موجود ہیں کہ جن میں سے ہر ایک انسان کے نفسانی اعمال کا مظہر ہے یعنی ان دو مراکز میں سے ہر ایک نفسانی فعل اور انفعال پر فوراً ردِ عمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ان میں سے ایک دماغ ہے اور دوسرا دل ہے۔ جس وقت ہماری روح فکری مسائل سے گزرتی ہے تو فوراً اس کا ردِ عمل ہمارے دماغ پر ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں دماغ روح کو فکری مسائل میں مدد دینے کے لیے ایک آلہ ہے۔ اسی لیے غور و فکر کرتے وقت خون دماغ میں تیزی سے حرکت کرتا ہے، دماغ کے سالمے (MOLECULES) زیادہ فعل و انفعال کرتے ہیں، زیادہ غذا جذب کرتے ہیں اور زیادہ لہریں بھیجتے ہیں۔ مگر جب معاملہ جذبات سے متعلق ہو، مثلاً عشق و محبت، عزم، غصہ، کینہ، حسد اور درگزر وغیرہ تو انسان کے دل میں عجیب طرح کی ہیجانیت پیدا ہو جاتی ہے بعض اوقات دل کی دھڑکن بڑی تیز ہو جاتی ہے اور کبھی حرکتِ قلب اتنی کمزور پڑ جاتی ہے کہ گویا اب دل کام کرنا چھوڑ دے گا۔ گاہے ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا دل پھٹنے لگا ہے۔ یہ سب کچھ اس قریبی تعلق کی بناء پر ہے جو دل اور ان نفسیاتی معاملات کے مابین ہے۔

اسی بناء پر قرآن مجید ایمان کی نسبت دل کی طرف دیتا ہے :

ولما یدخل الایمان فی قلوبکم۔

اور تمہارے دلوں میں ہرگز ایمان داخل نہ ہوگا۔

(حجرات ــــــــ ۱۴)

اسی طرح جہالت، ہٹ دھرمی اور حق کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کو دل کے اندھے پن سے تعبیر کیا گیا ہے :

ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور

اور لیکن وہ دل جو سینوں میں ہیں، اندھے ہیں۔ (حج ــــــــ ۴۶)

یہ بات کہے بغیر نہ رہ جائے کہ انسان ہمیشہ سے عشق، کینہ یا حسد وغیرہ کے وقت ایک خاص اثر اپنے دل میں محسوس کرتا کرتا ہے یعنی ان نفسیاتی مسائل کے شعلے کی تپش جسم انسانی میں سب سے پہلے دل میں محسوس ہوتی ہے۔

البتہ ان تمام باتوں کے علاوہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ "قلب" کے معانی میں سے ایک معنی انسانی عقل اور روح بھی ہے۔ لہٰذا اس کا معنی اسی عضو کے ساتھ مخصوص نہیں جو سینے کے اندر ہے اور یہ امر آیات قلب کے لیے خود ایک اور تفسیر ہے۔ لیکن تمام آیاتِ قلب کے لیے نہیں بلکہ بعض آیات میں تصریح کی گئی ہے کہ وہ دل جو سینوں میں ہیں۔

(غور کیجیے گا)

۲۔ "فضل" اور "رحمت" میں کیا فرق ہے؟ : زیر بحث دوسری آیت میں "فضل" اور "رحمت" کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے۔

الف :۔ بعض نے فضلِ الٰہی کو ظاہری نعمتوں کی طرف اور رحمت کو باطنی نعمتوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک نعمتِ مادی کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا لفظ نعمتِ معنوی کی طرف (اور بارہا قرآنی آیات میں "وابتغوا من فضلہ" یا "لتبتغوا من فضلہ" تحصیل روزی اور مادی نعمتوں کے لیے آیا ہے)۔

ب :۔ کچھ اور مفسرین نے کہا ہے کہ فضلِ الٰہی نعمت کا آغاز ہے اور اس کی رحمت نعمت کا دوام ہے (البتہ اس طرف تو جہ کرتے ہوئے کہ فضل نعمت بخشنے کے معنی میں ہے اور اس کے بعد رحمت کے ذکر میں کسی چیز کا اضافہ ہونا چاہیے یہ تفسیر قابلِ فہم ہے)۔

ج :۔ متعدد روایات میں ہے کہ فضلِ الٰہی سے مراد وجودِ پیغمبرؐ اور نعمتِ نبوت ہے اور رحمت پروردگار سے مراد وجود علیؑ اور نعمتِ ولایت ہے، شاید اسی تفسیر کی طرف اشارہ ہو کیونکہ رسول اللہؐ سر آغازِ اسلام ہیں، علیؑ اس کی بقاء اور حیاتِ دوام کا سبب ہیں (ایک علت محدثہ اور ایجاد کنندہ ہیں اور دوسرے علت مبقیہ اور بقا دینے والے ہیں)[1]

[1] ان روایات سے آگاہی کے لیے تفسیر نور الثقلین ج ۲ ص ۲۰۷ اور ص ۳۰۰ کی طرف رجوع کریں۔

ج :۔ یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ "فضل" پروردگار کی اس نعمت کی طرف اشارہ ہے جو دوست دشمن کے لیے عام ہے اور گزشتہ آیت میں "للمؤمنین" کی طرف توجہ کرتے ہوئے "رحمت" اس کی مخصوص رحمت کی طرف اشارہ ہے جو باایمان افراد سے مختص ہے۔

د :۔ ایک اور تفسیر جو ان دونوں الفاظ کے لیے ذکر ہوئی ہے یہ ہے کہ پروردگار کا فضل ایمان کی طرف اشارہ ہے اور رحمت قرآن مجید کی طرف کہ جس کے بارے میں اس سے پہلے کی آیت میں گفتگو ہوئی ہے۔

ان میں سے زیادہ تر معانی آپس میں تضاد نہیں رکھتے اور ہو سکتا ہے یہ سب مفاہیم فضل اور رحمت کے ایک جامع معنی میں جمع ہوں۔

۵۹۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝

۶۰۔ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝

۶۱۔ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝

ترجمہ

۵۹۔ کہہ دو: کیا وہ رزق جو خدا نے تم پر نازل کیا ہے تم نے اسے دیکھا ہے کہ اس میں سے کچھ کو تم نے حلال قرار دے دیا ہے اور کچھ کو حرام۔ کہہ دو: کیا تمہیں خدا نے اجازت دی ہے یا خدا پر افترا باندھتے ہو (اور اپنی طرف سے کسی کو حلال قرار دیتے ہو اور کسی کو حرام)۔

۶۰۔ جو خدا پر افتراء باندھتے ہیں وہ روزِ قیامت (کی سزا) کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ خدا سب لوگوں کیلیے فضل (اور بخشش) کرنے والا ہے لیکن ان میں سے اکثر شکر گزاری نہیں کرتے۔

۶۱۔ تم کسی حالت (اور فکر) میں نہیں ہوتے، نہ قرآن کے کسی حصے کی تلاوت کرتے ہو اور نہ ہی تم کوئی عمل انجام دیتے ہو مگر یہ کہ جب تم ان میں وارد ہوتے ہو ہم تم پر نگران ہوتے ہیں اور زمین و آسمان میں کوئی چیز تیرے پروردگار سے مخفی نہیں رہتی نہ ذرہ برابر اور نہ اس سے کم و بیش۔ مگر یہ کہ وہ سب کچھ واضح کتاب (اور علمِ خدا کی لوحِ محفوظ) میں ثبت ہے۔

تفسیر

خدا ہر جگہ ناظر ہے

گزشتہ آیات میں قرآن اور قرآن میں خدا کے وعظ و نصیحت اور ہدایت و رحمت کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر نظر آیات میں اسی مناسبت سے مشرکین کے گھڑے ہوئے قوانین اور جھوٹے احکام کے بارے میں بات کی گئی ہے کیونکہ جو شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے اور جانتا ہے کہ تمام نعمات اور رزق اس کی طرف سے ہے اسے چاہیے کہ وہ یہ حقیقت بھی قبول کرے کہ ان نعمات کے بارے میں حکم دینا اور ان کے بارے میں حلال و حرام کا تعین خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس کے اذن اور حکم کے بغیر اس کام میں دخل اندازی صحیح نہیں ہے۔

زیر نظر پہلی آیت میں روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، ان سے کہہ دو کہ خدا نے جو رزق تمہارے لیے نازل کیا ہے اس میں سے کیوں کچھ کو حرام قرار دیتے ہو اور کچھ کو حلال (قل ارء يتم ما انزل الله لكم من رزق فجعلتم منه حراما وحلالا) اپنی بے ہودہ رسوم کے مطابق کچھ چوپایوں کو سائبہ، کچھ کو بحیرہ اور کچھ کو وصیلہ[1] کہتے ہو۔ اسی طرح تم نے اپنی کھیتی باڑی کے بعض محصولات کو حرام قرار دے رکھا ہے اور خود کو ان پاک نعمتوں سے محروم کر رکھا ہے علاوہ ازیں یہ امر تم سے مربوط نہیں ہے کہ کس چیز کو حلال ہونا چاہیے اور کس چیز کو حرام۔ یہ امر تو صرف ان کے پروردگار اور خالق کے اختیار میں ہے۔

کہہ دو: کیا خدا نے تمہیں اجازت دی ہے کہ ایسے قوانین وضع کرو یا خدا پر افتراء باندھتے ہو (قل ءٰالله اذن لكم ام على الله تفترون) یعنی اس کام کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں کوئی تیسری نہیں یا تو ایسا پروردگار کی اجازت سے ہو اور یا پھر یہ تہمت اور افتراء ہے اور چونکہ پہلی بات نہیں ہے لہٰذا تہمت اور افتراء کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔

اب جبکہ یہ مسلّم ہو گیا ہے کہ وہ اپنے ان خود ساختہ اور بے ہودہ احکام کے ذریعے نعماتِ الٰہی سے بھی محروم ہوئے ہیں اور پروردگار کی ذاتِ مقدس پر افتراء بھی باندھا ہے لہٰذا مزید فرمایا گیا ہے جو خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ روز قیامت کی سزا کے بارے میں کیا سوچتے ہیں کیا انھوں نے اس دردناک سزا سے نجات کا کوئی بندوبست کیا ہے (وما ظن الذين يفترون على الله الكذب يوم القيامة)۔

لیکن "لوگوں پر خدا کا فضل اور رحمت وسیع ہے" لہٰذا وہ انھیں ایسے برے اعمال پر سزا نہیں دیتا (ان الله لذو فضل على الناس) مگر وہ لوگ بجائے اس کے کہ اس خدائی مہلت سے فائدہ اٹھائیں، عبرت حاصل کریں، اس کا شکر بجا لائیں اور خدا کی طرف پلٹ آئیں۔

"ان میں سے اکثر غافل ہیں" اور وہ اس عظیم نعمت کا شکر بجا نہیں لاتے (ولكن اكثرهم لا يشكرون)۔

---

[1] "بحیرہ" اس جانور کو کہتے ہیں جس نے کئی مرتبہ بچہ جنا ہو۔ "سائبہ" اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس نے دس یا بارہ بچے دیے ہوں اور "وصیلہ" اس گوسفند کو کہتے ہیں جس نے سات بچے دیئے ہوں (مزید وضاحت کے لیے جلد ۴ صفحہ ۳۴۳ کی طرف رجوع کریں)۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ ان تمام نعمات اور رزق کا حلال ہونا (سوائے چند نقصان دہ اور ناپاک مستثنیٰ چیزوں کے) خود خدا کی ایک عظیم نعمت ہے اور بہت سے لوگ اس عظیم نعمت کی شکر گزاری کی بجائے ناشکری کرتے ہیں اور بے ہودہ احکام اور چیزوں کو بلا دلیل ممنوع قرار دے کر اپنے آپ کو ان سے محروم رکھتے ہیں۔

اس بناء پر کہیں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ خدا کی یہ مہلت اس لیے ہے کہ وہ ان کے کرتوتوں کو نہیں جانتا، زیر بحث آخری آیت میں یہ حقیقت نہایت عمدہ عبارت سے بیان کی گئی ہے کہ وہ آسمان و زمین کی وسعت میں تمام ذرات موجودات اور بندوں کے اعمال کی جزئیات سے باخبر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تو کسی حالت اور کسی اہم کام میں نہیں ہوتا اور تو قرآن کی کسی آیت کی تلاوت نہیں کرتا، اور وہ کوئی عمل انجام نہیں دیتے مگر یہ کہ ہم اس پر شاہد اور ناظر ہوتے ہیں جب بھی تم وہ کام کرنے لگتے ہو (وما تکون فی شأن وما تتلوا منه من قرآن ولا تعملون من عمل الا کنا علیکم شھودًا اذ تفیضون فیه)۔[1]

"شھود" "شاھد" کی جمع ہے یہ اصل میں حضور اور موجودگی کے معنی میں ہے۔ جس میں آنکھ یا قلب و فکر کا مشاہدہ شامل ہو۔

جمع کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ نہ صرف خدا بلکہ فرشتے جو اس کے فرمانبردار ہیں اور انسانوں کے اعمال کے نگران ہیں ان کے سب کاموں سے باخبر ہیں اور ان کے شاہد و ناظر ہیں۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ خدا کے بارے میں جمع کا صیغہ جبکہ اس کی ذات پاک ہر لحاظ سے یکتا و یگانہ ہے، اس کے مقام کی عظمت کی طرف اشارہ ہے اور ہمیشہ اس کے مامور اس کے فرمان کے تابع ہیں اور اس کے امر کی اطاعت کے لیے تیار ہیں۔ اور درحقیقت گفتگو صرف اس کے بارے میں نہیں بلکہ اس کے تمام مطیع مامورین کے بارے میں بھی ہے۔

اس کے بعد خدا کی تمام چیزوں سے آگاہی کے مسئلے پر زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: زمین اور آسمان میں چھوٹی سے چھوٹی چیز یہاں تک کہ کوئی ذرہ بے مقدار بھی تیرے پروردگار کے علم کی نظر سے مخفی نہیں رہتا۔ نہ اس سے کوئی چھوٹی چیز ہے اور نہ اس سے بڑی، مگر یہ کہ وہ سب کی سب لوح محفوظ اور علم خدا کی واضح کتاب میں ثبت ہے (وما یعزب عن ربك من مثقال ذرة فی الارض ولا فی السماء ولا اصغر من ذٰلك ولا اکبر الا فی کتٰب مبین)۔

"یعزب" "عزوب" کے مادہ سے در اصل گھر اور گھر والوں سے چوپایوں کے لیے چراگاہ تلاش کرنے کے لیے جدائی کے معنی میں ہے بعد ازاں یہ لفظ مطلقاً غیبت اور جدائی کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

"ذرة" نہایت چھوٹے سے جسم کے معنی میں ہے۔ اسی لیے چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کو بھی "ذرة" کہا جاتا ہے۔
مزید وضاحت کے لیے جلد ۲ صفحہ ۲۵۲ کی طرف مراجعت کیجیے۔

"کتاب مبین" پروردگار کے وسیع علم کی طرف اشارہ ہے کہ جسے بعض اوقات "لوح محفوظ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (اس بارے میں جلد ۳ صفحہ ۲۲۳، اردو ترجمہ پر بھی بات کی گئی ہے)۔

---

[1] بعض مفسرین ضمیر "منه" کو خدا کی طرف پلٹاتے ہیں یعنی جو آیات تو خدا کی طرف سے پڑھتا ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ ضمیر لفظ شان یا قرآن کی طرف لوٹتی ہے جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے یعنی وہ آیات جن کی کسی اہم کام کے بارے میں تو تلاوت کرتا ہے یا قرآن کی جو آیات تو تلاوت کرتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ قانون بنانے کا حق صرف خدا کو ہے : مندرجہ بالا آیات کی مختصر سی عبارتوں کے ذریعہ یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ قانون بنانے کا حق خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور جو شخص اس کے فرمان اور اجازت کے بغیر ایسا کرے تو وہ خدا پر تہمت اور افتراء کا ارتکاب کرتا ہے کیونکہ تمام رزق اور عالم ہستی کی تمام نعمات اس کی جانب سے نازل ہوتی ہیں اور در حقیقت ان سب کا حقیقی مالک وہی ہے۔ اسی لیے اسی کو حق پہنچتا ہے کہ کسی کو جائز یا ناجائز قرار دے۔ البتہ اس سلسلے میں اس کے احکام خود بندوں کے مفاد میں اور انہی کے تکامل وارتقاء کے لیے ہیں اور اسے ان کی ذرہ بھر بھی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن بہر حال صاحب اختیار اور قانون گزار وہی ہے مگر یہ کہ وہ جتنا مناسب سمجھے کسی پیغمبر کو یا کسی اور کو کسی حد تک کوئی اجازت دے دے۔

جیسا کہ بہت سی روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعض امور کو واجب یا حرام قرار دیتے تھے کہ جنہیں روایات کی زبان میں "فرض النبیؐ" کہا جاتا ہے البتہ یہ سب کے سب خدا کے حکم کے تابع ہیں اور ایسے اختیارات ہیں جو پیغمبر اکرمؐ کو ودیعت کیے گئے ہیں۔

"اللّٰہ اذن لکم" اس پر دلیل ہے کہ ہوسکتا ہے کہ خدا اس قسم کی اجازت کسی کو دے۔

یہ مسئلہ "ولایت تشریعی" کی بحث سے مربوط ہے جو انشاء اللہ تعالیٰ کسی دوسرے مقام پر ہم تشریح کے ساتھ بیان کریں گے۔

۲۔ رزق کا نزول : مندرجہ بالا آیات میں ارزاق کے لیے نزول کی تعبیر استعمال ہوئی ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ صرف بارش کا پانی آسمان سے اُترتا ہے۔ یہ یا تو اس بناء پر ہے کہ بارش کے یہ حیات بخش قطرے تمام تر رزق کی اصل بنیاد ہیں اور یا اس بناء پر ہے کہ مراد نزولِ مقامی ہے کہ جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے۔ یہ تعبیر روزمرہ کی گفتگو میں نظر آتی ہے کہ اگر ایک بزرگ شخص کی طرف سے کوئی حکم یا احسان کسی چھوٹے شخص کے لیے ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ "اوپر" سے معین کیا گیا ہے یا اوپر سے ہمیں ملا ہے۔

۳۔ علماءِ علمِ اصول کا ایک استدلال : علماءِ علمِ اصول نے "أٰللّٰہ اذن لکم ام علی اللّٰہ تفترون" سے اصل عدم حجیت ظن" کو ثابت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ احکام الٰہی میں سے کوئی حکم یقین کے بغیر ثابت نہیں کیا جاسکتا ورنہ خدا پر افتراء ہوگا جو کہ حرام ہے۔

البتہ اس استدلال پر ہمارے کچھ اعتراضات ہیں کہ جو ہم نے علم اصول کے مباحث میں ذکر کیے ہیں۔

۴۔ ایک درس : مندرجہ بالا آیات سے ہمیں ایک اور درس بھی ملتا ہے اور وہ یہ کہ قانونِ خدا کے مقابلے میں قانون بنانا جاہلیت کا طریقہ ہے۔

ایسے لوگ اپنے آپ کو حق دار سمجھتے تھے کہ اپنے نارسا اور ناپختہ افکار سے احکام تراش لیں۔ ایک حقیقی خدا پرست ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو ایمان باخدا اور اسلام کا دم بھی بھرتے ہیں اس کے باوجود دوسروں کے غیر اسلامی قوانین کی طرف دستِ سوال دراز کرتے ہیں یا جو قوانینِ اسلام کو ناقابلِ عمل قرار دے کر خود قانون وضع کرتے ہیں۔ وہ بھی جاہلیت کے طریقوں کے پیروکار ہیں۔

حقیقی اسلام قابلِ تقسیم اور تجزیہ پذیر نہیں ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں تو اس کے تمام قوانین کو قبول کرنا چاہیے اور یہ جو بعض کہتے ہیں کہ اس کے سب قوانین قابلِ اجراء نہیں ہیں، ان کی سوچ بے بنیاد ہے اور یہ خیال ایک قسم کی مغرب زدگی اور خود نمائی پر مبنی ہے۔

البتہ اسلام اپنی جامعیت کے لحاظ سے بعض مسائل میں اصول بیان کر کے ہمارے ہاتھ کھلے رکھتا ہے تاکہ ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق شوریٰ کے اصولوں کی روشنی میں ہم تعلیم کریں اور انھیں جاری کریں۔

۵۔ علمِ الٰہی کے تین پہلو: محلِ بحث آخری آیت میں علمِ پروردگار کی وسعت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تین نکتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ تو کسی کام اور حالت میں نہیں ہے اور کوئی آیت تلاوت نہیں کرتا اور تم لوگ کوئی عمل انجام نہیں دیتے مگر یہ کہ ہم تم پر شاہد اور ناظر ہیں۔

یہ تین تعبیریں اصل میں انسانوں کے افکار، گفتار اور کردار کی طرف اشارہ ہیں، یعنی جس طرح خدا ہمارے اعمال دیکھتا ہے، ہماری باتوں کو بھی سنتا ہے اور ہمارے افکار اور نیتوں سے بھی آگاہ ہے اور ان میں سے کوئی چیز بھی علمِ پروردگار کے دائرے سے خارج نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ نیت اور روح کی کیفیت کا مرحلہ پہلے آتا ہے، گفتگو اس کے بعد ہوتی ہے اور کردار کا مرحلہ آخر میں آتا ہے۔ اسی لیے آیت میں بھی اسی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے اور دوسرے مرحلے کا ذکر مفرد کی شکل میں پیغمبرؐ سے خطاب کی صورت میں ہے اور تیسرے مرحلے کا ذکر جمع کی صورت میں ہے اور تمام مسلمانوں سے خطاب ہے، ممکن ہے اس لحاظ سے ہو کہ اسلامی پروگراموں میں ارادے کا مرحلہ رہبرِ امت اور پیغمبرِ اسلامؐ سے مربوط ہے، جیسا کہ خدا کی طرف سے آیاتِ قرآن لے کر انھیں لوگوں کے سامنے تلاوت کرنا بھی آنحضرتؐ سے مربوط ہے۔ لیکن ان پروگراموں پر عمل کرنا ساری ملت سے مربوط ہے اور کوئی شخص اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

۶۔ ہماری ہر کیفیت کی نگرانی ہو رہی ہے: زیرِ نظر آخری آیت میں تمام مسلمانوں کے لیے ایک عظیم درس موجود ہے کہ جو انھیں راہِ حق پر ڈال سکتا ہے اور انحرافات سے روک سکتا ہے بلکہ ایسا درس ہے کہ جس کی طرف توجہ کرنے سے صالح اور پاکیزہ معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے اور وہ یہ کہ ہمیں یہ حقیقت نظر میں رکھنا چاہیے کہ ہم جو بھی قدم اٹھاتے ہیں، جو بھی بات کرتے ہیں، جو کچھ بھی سوچتے ہیں، جس طرف بھی دیکھتے ہیں اور ہم جس حالت اور کیفیت میں بھی ہوتے ہیں نہ صرف خدا کی پاک ذات بلکہ اس کے فرشتے بھی ہمارے نگران ہوتے ہیں اور پوری توجہ سے ہمیں دیکھتے ہیں۔ زمین و آسمان کے طول و عرض میں چھوٹی سے چھوٹی حرکت بھی خدا کی نگاہ سے پنہاں نہیں ہوتی، نہ صرف پنہاں نہیں ہوتی بلکہ لوحِ محفوظ میں بھی ثبت ہوتی ہے اور اس میں تبدیلی، اشتباہ یا غلطی

نہیں ہو سکتی۔ نہ خدا کے علم بے پایاں کے صفحے میں نہ مقرب فرشتوں اور بندوں کے اعمال لکھنے والوں کی سوچ میں اور نہ ہماری ڈائری اور ہمارے نامہ اعمال میں ——— کہیں بھی تبدیلی، اشتباہ یا غلطی نہیں ہو سکتی۔

بلاوجہ نہیں ہے کہ امام صادقؑ فرماتے ہیں:

كان رسول الله اذا اقرء هذه الأية بكى بكاء شديدا۔

جب رسول اللہؐ اس آیت کی تلاوت کرتے تھے تو شدت سے گریہ کرتے تھے[1]

جب رسول اللہؐ اپنے خلوص و بندگی، خدمتِ خلق اور عبادتِ خالق کے باوجود علمِ خدا کے سامنے ترساں ہوں تو ہماری اور دوسروں کی حالت واضح ہے۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۵ صفحہ ۱۱۹، مذکورہ آیت کے ذیل میں

۶۲۔ أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

۶۳۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۝

۶۴۔ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

۶۵۔ وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۚ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

ترجمہ

۶۲۔ آگاہ رہو کہ خدا کے اولیاء (اور دوست) نہ ڈرتے ہیں اور نہ غمگین ہوتے ہیں۔

۶۳۔ وہی کہ جو ایمان لائے اور جنھوں نے (حکم خدا کی مخالفت سے) پرہیز کیا۔

۶۴۔ وہ دنیاوی زندگی میں اور آخرت میں خوش (اور مسرور) ہیں۔ خدا کے وعدوں کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی اور یہ عظیم کامیابی ہے۔

۶۵۔ ان کی گفتگو تجھے غمگین نہ کرے۔ تمام عزت (وقدرت) خدا کے لیے ہے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

تفسیر

روحانی سکون ایمان کے زیر سایہ ہے

گزشتہ آیات میں مشرکین اور بے ایمان افراد کے حالات کا کچھ حصہ پیش کیا گیا تھا۔ ان آیات میں ان کے مدمقابل مخلص، مجاہد اور پرہیزگار مومنین کی کیفیت بیان ہوئی ہے تاکہ موازنہ ہو سکے۔ جیسا کہ قرآن کی روش ہے کہ وہ نور کو ظلمت سے اور سعادت کو بدبختی سے ممیز کرتا ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: آگاہ رہو کہ اولیاء خدا پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ انھیں کوئی حزن و غم ہے (الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون)۔

اس بات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اولیاء کا معنی خوب معلوم ہونا چاہیے "اولیاء" "ولی" کی جمع ہے یہ اصل میں "ولی"

کے مادہ سے لیا گیا ہے جو دو چیزوں کے نزدیک واسطہ نہ ہونے اور ان کے ایک دوسرے کے نزدیک پے در پے ہونے کے معنی میں ہیں لہٰذا ہر اس چیز کو جو دوسری سے مکان، زمان، نسب یا مقام کے لحاظ سے قرابت رکھتی ہے "ولی" کہا جاتا ہے۔ اس لفظ کا "سرپرست" اور "دوست" وغیرہ کے لیے استعمال بھی اسی بناء پر ہے اس لیے اولیاء خدا وہ لوگ ہیں جن کے اور خدا کے درمیان کوئی فاصلہ نہ ہو۔ اولیاء خدا معرفت اور ایمان کے نور سے اور اپنے پاک عمل کی بناء پر خدا کو دل کی آنکھ سے اس طرح دیکھتے ہیں کہ ان کے دل میں کسی قسم کا کوئی شک اور تردد پیدا نہیں ہوتا اور خدا کہ جو بے انتہا ہے جس کی قدرت بے پایاں ہے اور جو کمالِ مطلق ہے، سے اسی آشنائی کے سبب جو کچھ خدا کے علاوہ ہے، ان کی نگاہ میں حقیر، بے وقعت، ناپائیدار اور بے مقدار ہے۔ جو شخص سمندر سے آشنا ہے قطرہ اس کی نگاہ میں کوئی قیمت نہیں رکھتا اور جو آفتاب کو دیکھتا ہے وہ ایک شمع بے فروغ سے بے اعتناء ہے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ انھیں کیوں خوف و اندوہ نہیں ہے کیونکہ خوف عام طور پر میسر نعمتوں کے فقدان کے احتمال پر ہوتا ہے یا ان خطرات سے ہو سکتا ہے جبکہ خدا کے اولیاء اور سچے دوست مادی دنیا کی ہر قسم کی وابستگی اور عقدہ سے آزاد ہیں اور "زہد" اپنے حقیقی مفہوم میں ان کے وجود پر حکومت کرتا ہے وہ نہ مادی وسائل کے چھن جانے پر واویلا کرتے ہیں اور نہ آئندہ کے لیے ایسے مسائل کا احتمال ان کے اذہان کو اپنی طرف مشغول رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ رنج و غم اور خوف و اندیشہ جو دوسروں کو ہمیشہ گزشتہ اور آئندہ کے بارے میں اضطراب و پریشانی میں مبتلا رکھتا ہے، ان کے وجود میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

کسی چھوٹے سے برتن کا پانی انسان کی ایک پھونک ہی سے متلاطم ہو جاتا ہے لیکن ایک وسیع سمندر کے لیے طوفان بھی کم اثر ہوتے ہیں۔ اسی لیے سمندر کو سکون کہا جاتا ہے۔

لکی لا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اٰتاکم۔

تاکہ نہ افسوس کرو تم اس چیز کا جو تم سے چھن جائے اور نہ خوش ہو تم اس چیز پر جو تم کو دی جائے۔ (حدید — ۲۳)

نہ وہ دن کہ جب دنیا ان کے پاس تھی انھوں نے اس سے دل لگایا اور نہ آج جبکہ اس سے جدا ہو رہے ہیں انھیں اس کا غم ہے۔ ان کی روح بزرگ تر ہے اور ان کی روح اس سے بالاتر ہے کہ ایسے حوادث ان کے گزشتہ اور آئندہ پر اثر انداز ہوں گے۔

اس طرح سے حقیقی امن و سکون ان کے وجود پر حکم فرما ہے۔ قرآن کے مطابق:

اولٰئك لهم الامن۔

انہی لوگوں کے لیے امن اور سلامتی ہے۔ (انعام — ۸۲)

یا دوسرے لفظوں میں:

الا بذکر الله تطمئن القلوب۔

خدا کی یاد ان کے دلوں کے سکون کا باعث ہے۔ (رعد — ۲۸)

خلاصہ یہ کہ عموماً غم اور خوف انسانوں میں دنیا پرستی کی روح کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جو لوگ اسی روح سے تہی داماں ہیں اگر انھیں کوئی غم اور خوف نہ ہو تو یہ بہت ہی فطری اور طبیعی بات ہے یہ اس مسئلہ کا استدلالی بیان ہے کبھی اس مسئلے کو عرفانی صورت میں

یوں بیان کیا جاتا ہے:

اولیاء اللہ اس طرح صفات جمال و جلال میں مستغرق ہیں اور اس کی ذات پاک کے مشاہدہ میں محو ہوتے ہیں اور اس کے غیر کو بھول جاتے ہیں کہ کسی چیز کے کھو جانے کے غم اور کسی خطرناک دشمن کے خوف کی ان کے دل میں کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ جس کے دل میں خدا کے سوا کسی کیلئے کوئی گنجائش نہ ہو اور جو اس کے غیر کی فکر نہ کرے اور اس کی روح اس کے علاوہ کسی کو قبول نہ کرنے تو کیسے ممکن ہے کہ وہ کسی غم واندوہ یا خوف ووحشت سے دوچار ہو۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ اس سے مراد مادی رنج و غم اور دنیاوی خوف وہراس ہے۔ ورنہ اللہ کے دوستوں کا وجود اس کے خوف سے مالا مال ہوتا ہے۔ فرائض اور ذمہ داریوں کے انجام نہ دینے کا خوف اور ان مواقع کا دکھ کہ جو ان سے ضائع ہو گئے یہ حزن وملال روحانی بطور رکھتا ہے اور وجود انسان کے تکامل اور ترقی کا باعث ہے جبکہ اس کے برعکس مادی خوف اور غم انحطاط اور تنزل کا سبب ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اپنے مشہور خطبہ ہمام میں اولیاء اللہ کے حالات کی نہایت خوبصورت تصویر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قلوبهم محزونة وشرورهم مامونة۔

ان کے دل محزون ومغموم ہیں اور لوگ ان کے شر سے امان میں ہیں۔

آپ مزید فرماتے ہیں:

ولولا الاجل الذی کتب الله علیهم لم تستقر ارواحهم فی اجسادهم طرفة عین شوقا الی الثواب وخوفا من العقاب۔

اگر وہ اجل جو خدا نے ان کے لیے مقرر کی ہے نہ ہوتی تو ثواب الٰہی کے شوق میں اور عذاب الٰہی کے خوف سے ان کے جسموں میں ان کی روح چشم زدن کی دیر بھی نہ ٹھہرتی۔[1]

قرآن مجید بھی مومنین کے بارے میں کہتا ہے:

الذین یخشون ربهم بالغیب وهم من الساعة مشفقون۔

وہ لوگ جو پروردگار سے اس کے غضب کو نہ دیکھنے کے باوجود ڈرتے ہیں (انبیاء۔ ۴۹)

اس بناء پر ان کا خوف وہراس دوسری قسم کا ہے۔[2]

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۳ (صبحی صالح)

[2] اس وقت جبکہ ہم یہ آیات لکھ رہے ہیں، اللہ کے ایک سچے ولی کی شہادت کی خبر ہمیں پہنچی ہے یعنی ——— فلسفی، عالم، مجاہد عظیم استاد مرتضیٰ مطہری کی خبر شہادت۔ اس شہادت نے ہمارے لیے یہ حقیقت ایک مرتبہ پھر ثابت کر دی ہے کہ عظیم اسلامی انقلاب کی حفاظت کے لیے جسے ہم نے بے شمار قربانیوں کے ساتھ اس ملک میں شروع کر رکھا ہے اور جس میں قوم کے تمام طبقے شریک ہیں، ابھی بہت سے مراحل اور بہت سی قربانیاں دینی ہوں گی ——— (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ کہ اولیاء خدا سے مراد کون سے افراد ہیں، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے لیکن دوسری آیت اس مطلب کو واضح کرتی ہے اور بحث ختم کردیتی ہے ——— ارشاد ہوتا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ہمیشہ تقویٰ اور پرہیزگاری کو اختیار کیے رکھا (الذین اٰمنوا وکانوا یتقون)۔

یہ امر جاذبِ توجہ ہے کہ ایمان کا ذکر ماضی مطلق کی صورت میں ہے اور تقویٰ کا ذکر ماضی استمراری کی شکل میں ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا ایمان حدِ کمال کو پہنچ گیا ہے لیکن تقویٰ جو کہ روزمرہ کے عمل میں منعکس ہوتا ہے، ہر گھڑی نئے کام کا مطالبہ کرتا ہے اور تدریجی پہلو رکھتا ہے یہ ان کے لیے ایک دائمی ذمہ داری کی صورت میں ہے۔

جی ہاں یہ وہ لوگ ہیں جو دین اور شخصیت کے ان دو بنیادی ارکان کے حامل ہیں اور اس کی وجہ سے اپنے اندر ایک ایسا سکون محسوس کرتے ہیں کہ جسے زندگی کا کوئی طوفان مضطرب نہیں کرسکتا بلکہ:

المؤمن کالجبل الراسخ لا تحرکہ العواصف۔

مومن مضبوط پہاڑ کی طرح ہے جسے تیز آندھیاں ہلا نہیں سکتیں۔

یعنی وہ پہاڑ کی طرح حوادث کی تند ہوا کے سامنے استقامت اور پامردی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

تیسری آیت میں اولیاء حق کے وجود میں خوف و غم اور وحشت و اضطراب کے نہ ہونے کی تاکیدیں کی گئی ہے: ان کے لیے دنیاوی زندگی میں اور آخرت میں بشارت ہے (لھم البشریٰ فی الحیٰوۃ الدنیا و فی الاٰخرۃ)۔

اس طرح سے نہ صرف یہ کہ انھیں کوئی خوف اور غم نہیں بلکہ فراواں نعمتوں اور بے پایاں خدائی عنایتوں کی وجہ سے انھیں اس زندگی میں اور اس زندگی میں بشارت، خوشحالی اور سرور نصیب ہوگا (توجہ رہے کہ البشریٰ میں الف لام جنس کے حوالے سے اور مطلق ذکر ہوا ہے اور اس میں طرح طرح کی بشارتوں کا مفہوم موجود ہے)۔

دوبارہ تاکید کیلیے فرمایا گیا ہے: پروردگار کی باتوں اور خدائی وعدوں میں تغیر نہیں ہوتا اور خدا اپنے دوستوں کے بارے میں اپنا یہ وعدہ پورا کریگا (لا تبدیل لکلمات اللہ) اور یہ جسے نصیب ہو اس کیلیے عظیم کامیابی اور سعادت ہے (ذٰلک ھو الفوز العظیم)۔

آخری آیت میں روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے جو اولیاء اللہ اور دوستانِ خدا کے سردار ہیں۔ ان کی دلجوئی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: غافل اور جاہل مخالفین اور مشرکین کی غیر موزوں باتیں تجھے غمگین نہ کریں (ولا یحزنک قولھم)۔ کیونکہ تمام عزت و قدرت

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) لیکن اب تک دشمنوں نے ہم سے ایک ایسے جواں مرد کو چھینا ہے جس کی ساری عمر علم و دانش کی خدمت میں صرف ہوئی تھی اور اس کے گراں بہا آثار علمی اس دعویٰ پر شاہد ناطق ہیں۔ وہ مخلص مجاہد اور آزاد مومن تھے۔ وہ انہی افراد میں سے تھے کہ جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ:

"وانھیں خوف ہے اور نہ غم و حزن" کیونکہ اس شہید نے اپنے پیغام اور ذمہ داری کو عمدہ طریقے سے انجام دیا اور اپنے پیغام اور ذمہ داری کی راہ میں شہید ہو گیا۔

(۱۲ / اردی بہشت ۱۳۵۸ ہجری شمسی)

خدا کے لیے ہے اور خدا کے ارادہ حق کے سامنے دشمن کچھ نہیں کر سکتے (ان العزة لله جمیعا)۔ خدا ان کی سب سازشوں سے باخبر ہے۔ ان کی باتوں کو سنتا ہے اور ان کے اندرونی اسرار و رموز سے آگاہ ہے (هو السمیع العلیم)۔

دو اہم نکات

۱۔ "بشارت" سے کیا مراد ہے؟ مندرجہ بالا آیات میں خدا نے اپنے دوستوں کے لیے دنیا و آخرت میں جس بشارت کا تذکرہ کیا اس سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں تمام مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض نے اس آیت کو اس بشارت کے ساتھ مخصوص سمجھا ہے جو فرشتے مومنین کو موت اور اس جہان سے انتقال کے وقت دیتے ہیں اور کہتے ہیں:

وابشروا بالجنة التی کنتم توعدون۔

خوشخبری ہو تمہیں اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ (حم السجدہ - ۳۰)

بعض دوسرے اسے ان کے مومن اور صالح ہونے تک کے لیے دشمنوں پر غلبہ اور روئے زمین پر حکومت کرنے کے وعدہ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ لفظ مطلق ہے اور "البشریٰ" پر الف لام جنس کے حوالے سے ہے اس طرف توجہ کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک وسیع مفہوم پنہاں ہے، جس میں ہر قسم کی بشارت، کامیابی اور موفقیت شامل ہے اور جن امور کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ سب اس میں شامل ہیں اور درحقیقت ان میں سے ہر ایک خدا کی اس وسیع بشارت کے ایک گوشے کی طرف اشارہ ہے اور شاید یہ جو بعض روایات میں عمدہ خوابوں اور رویائے صالحہ سے اس کی تفسیر کی گئی ہے اس طرف اشارہ ہے کہ ہر قسم کی بشارت یہاں تک کہ چھوٹی بشارتیں بھی "البشریٰ" کے مفہوم میں موجود ہیں اور یہ نہیں کہ اس کا مفہوم ان میں منحصر ہے۔

درحقیقت جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے کہ ایمان اور تقویٰ کا یہ تکوینی اور طبیعی اثر ہے کہ جو انسان کی روح اور جسم کو ہر قسم کے خوف و وحشت سے دور کر دیتا ہے کہ جو شک اور تردد سے اور اسی طرح گناہ اور مختلف آلودگیوں سے پیدا ہوتا ہے کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے اندر ایمان اور معنویت نہ رکھتا ہو پھر بھی سکون محسوس کرے۔ ایک شخص ایک بے لنگر کشتی کی طرح ہے جو طوفان میں پھنس گئی ہو کہ جسے وہ پیکر موجیں ہر لحظہ الٹ دینا چاہتی ہوں اور گرداب اسے نگلنے کے لیے منہ کھولے ہوئے ہوں۔

کس طرح سے ممکن ہے کہ وہ شخص جس نے لوگوں پر ظلم و ستم کیا ہو، انسانوں کا خون بہایا ہو اور دوسروں کے اموال و حقوق غصب کیے ہوں چین سے بیٹھا ہو۔ مومنین کے برعکس اسے سکون کی نیند نہیں آسکتی۔ وہ زیادہ تر ڈراؤنے خواب دیکھتا رہے گا کہ جن میں وہ اپنے آپ کو دشمنوں میں گھرا ہوا پائے گا اور یہ خود ان کی بے آرامی اور روح میں موجود تلاطم پر ایک دلیل ہے۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ ایک مجرم اور ظالم، خصوصاً جب اس کا تعاقب ہو رہا ہو عالم خواب میں اپنے آپ کو ہولناک خیالوں کے سامنے دیکھتا ہے کہ جو اس کا پیچھا کرنے اور اسے پکڑنے کے درپے ہیں یا یہ کہ مقتول و مظلوم کی روح اس کے ناآگاہ ضمیر کے اندر سے فریاد

کرتی ہے اور اسے سخت مضطرب کرتی ہے۔ اسی لیے جب وہ بیدار ہوتا ہے تو یزید کی طرح کہتا ہے :

مالی وللحسین ؟

مجھ سے حسین سے کیا تعلق ہے ؟

یا حجاج کی طرح کہتا ہے :

مالی ولسعید بن جبیر ؟

مجھے سعید بن جبیر سے کیا واسطہ ؟

۲۔ آئمہ ہدیٰ کی چند روایات : زیر بحث آیات کے ذیل میں آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے بڑی عمدہ روایات منقول ہیں ان میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کرتے ہیں۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام نے آیت الا ان اولیاء اللہ .... کی تلاوت فرمائی اور پھر اپنے اصحاب سے سوال کیا، جانتے ہو کہ اولیاء خدا کون لوگ ہیں ؟

انھوں نے عرض کیا : یا امیرالمومنین ! آپ ہی فرمائیے کہ وہ کون ہیں ؟

امام نے فرمایا :

هم نحن و اتباعنا فمن تبعنا من بعدنا طوبیٰ لنا، وطوبیٰ لهم افضل من طوبیٰ لنا ،

قالوا : یا امیر المؤمنین ما شأن طوبیٰ لهم افضل من طوبیٰ لنا ؟

السنا نحن وهم علی امر ؟

قال : لا ، انهم حملوا مالم تحملوا علیه ، واطاقوا مالم تطیقوا۔

خدا کے دوست ہم اور ہمارے پیروکار ہیں جو ہمارے بعد آئیں گے۔ کیا کہنا ہمارا اور اس سے بڑھ کر کیا کہنا ان کا۔

بعض نے پوچھا : ان کے لیے آپ نے بڑھ کر کیوں کہا ، کیا ہم اور وہ ایک ہی مکتب کے پیرو نہیں ہیں کیا ہمارا معاملہ ایک جیسا نہیں ہے۔

آپ نے فرمایا :

نہیں کیونکہ ان کی اس قسم کی ذمہ داریاں ہیں جیسی تمھاری نہیں ہیں اور وہ ایسی مشکلات سے دوچار ہوں گے کہ جن سے تم دوچار نہیں ہو[1]

---

[1] تفسیر نورالثقلین جلد ۲ ص ۳۰۹

کتاب کمال الدین میں ابو بصیر کے واسطے سے امام صادقؑ سے منقول ہے۔

آپؑ نے فرمایا:۔

طوبیٰ لشیعۃ قائمنا المنتظرین لظہورہ فی غیبتہ، والمطیعین له فی ظہورہ، اولئك اولیاء الله الذین لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون۔

خوشحال امام قائمؑ کے پیروکاروں کا کہ جوان کی غیبت میں (اپنی خودسازی کے ساتھ) ان کے ظہور کا انتظار کریں گے اور ان کے ظہور کے وقت ان کے فرماں بردار ہوں گے وہ اولیاء خدا ہیں کہ جنھیں نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ محزون و مغموم ہوتے ہیں[1]

حضرت صادق علیہ السلام کا ایک موالی نقل کرتا ہے کہ امامؑ نے فرمایا:

اس مکتب کے پیروکار زندگی کے آخری لمحات میں ایسی چیزیں دیکھتے ہیں کہ جن سے ان کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔

راوی کہتا ہے: میں نے اصرار کیا کہ وہ کیا دیکھتے ہیں؟ اس سوال کا میں نے دس سے زیادہ مرتبہ تکرار کیا۔ لیکن امام ہر مرتبہ صرف اتنا کہتے۔

وہ دیکھیں گے . . . .

مجلس کے اختتام پر آپؑ نے میری طرف رُخ کیا اور مجھے پکار کر فرمایا:

گویا تو اصرار کرتا ہے کہ یہ جانے کہ وہ کیا دیکھتے ہیں؟

میں نے عرض کیا:

یقیناً ——— پھر میں رونے لگا۔

امام کو میری حالت پر رحم آیا اور کہا:

ان دونوں کو دیکھیں گے۔

میں نے اصرار کیا:

کن دونوں کو؟

فرمایا:۔

پیغمبر اکرمؐ اور حضرت علیؑ کو ——— کوئی صاحب ایمان دنیا سے آنکھ بند نہیں کریگا

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۳۰۹

مگر یہ کہ ان دو بزرگواروں کو دیکھے گا کہ وہ اسے بشارت دے رہے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا:

اسے خدا نے قرآن میں بیان کیا ہے۔

سوال ہوا: کہاں اور کس سورہ میں؟

فرمایا:

سورۂ یونس میں جہاں فرمایا گیا ہے:

الذین اٰمنوا و کانوا یتقون لھم البشرٰی فی الحیٰوۃ الدنیا وفی الاٰخرۃ[1]

اسی مضمون کی اور روایات بھی موجود ہیں۔

واضح ہے کہ یہ روایات اشارہ ہیں صاحب ایمان و تقویٰ افراد کے لیے کچھ بشارتوں کی طرف، نہ کہ ان سب بشارتوں کی طرف۔ نیز واضح ہے کہ یہ مشاہدہ مادی جسم کا نہیں ہے بلکہ برزخی نگاہ سے برزخی جسم کے مشاہدے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ عالم برزخ جو کہ اس جہان اور عالمِ آخرت میں حدِ فاصل ہے، میں انسانی روح برزخی جسم میں باقی رہ جائے گی۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۲ ص ۳۱۰ (تلخیص کے ساتھ)

۶۶۔ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ ؕ وَمَا یَتَّبِعُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ○

۶۷۔ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ○

ترجمہ

۶۶۔ آگاہ رہو کہ وہ تمام جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں، خدا کے ہیں اور جو غیر خدا کو اس کا شریک بناتے ہیں وہ دلیل و منطق کی پیروی نہیں کرتے وہ صرف ظن اور گمان کی پیروی کرتے ہیں اور وہ صرف جھوٹ بولتے ہیں۔

۶۷۔ وہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے رات کو پیدا کیا تاکہ اس میں سکون حاصل کرو اور اس نے دن کو روشنی بخش قرار دیا اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو سننے والے کان رکھتے ہیں۔

تفسیر

عظمتِ الٰہی کی کچھ نشانیاں

زیر نظر آیات دوبارہ مسئلہ توحید و شرک کی طرف لوٹتی ہیں یہ مسئلہ اسلام اور اس سورہ کے اہم ترین مباحث میں سے ہے۔ ان آیات میں مشرکین کی خبر لی گئی ہے اور ان کی عاجزی و ناتوانی کو ثابت کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: آگاہ رہو کہ وہ تمام لوگ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں خدا کے لیے ہیں (اور اس کی ملکیت ہیں) (الا ان للہ من فی السمٰوٰت و من فی الارض)

جہاں اشخاص اس کی ملکیت ہوں اور اس کے لیے ہوں وہاں اشیاء اس جہان میں بدرجہ اولیٰ اس کی ہیں اور اس کے لیے ہیں اس بنا پر وہ تمام عالم ہستی کا مالک ہے اس حالت میں کیونکر ممکن ہے کہ اس کے مملوک اس کے شریک ہوں۔

مزید ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ غیر خدا کو اس کا شریک قرار دیتے ہیں وہ دلیل و منطق کی پیروی نہیں کرتے اور ان کے پاس اپنے قول کیلیے کوئی سند اور شاہد نہیں ہے (وما یتبع الذین یدعون من دون اللہ شرکآء) وہ صرف بے بنیاد تصورات اور گمانوں کی پیروی

کرتے ہیں (ان یتبعون الا الظن) بلکہ وہ تو صرف تخمینے سے بات کرتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں (و ان ھم الا یخرصون)۔

"خرص" لغت میں "جھوٹ" کے معنی میں بھی آیا ہے اور تخمین اور وہم و خیال کے معنی میں بھی آیا ہے۔ در اصل جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے یہ پھلوں کی جمع آوری کے معنی میں ہے اور بعد ازاں حساب کے لیے جمع کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ نیز درختوں پر پھلوں کا تخمینہ اور اندازہ لگانے کو کہتے ہیں اور چونکہ کبھی کبھی تخمینہ غلط نکل آتا ہے لہٰذا یہ مادہ "جھوٹ" کے معنی میں بھی آیا ہے۔

اصولی طور پر بے بنیاد گمان کی پیروی کی یہ خاصیت ہے کہ آخرکار انسان جھوٹ کی وادی میں جا پہنچتا ہے جنھوں نے بتوں کو خدا کا شریک قرار دیا تھا ان کی بنیاد اوہام سے بڑھ کر نہ تھی۔ وہ اوہام کہ جن کا تصور کرنا ہمارے لیے مشکل ہے کیونکر ممکن ہے کہ انسان بے روح شکلیں اور مجسمے بنائے اور پھر اپنی بنائی ہوئی چیز کو اپنا رب اور صاحبِ اختیار سمجھنے لگے، اپنی تقدیر اس کے سپرد کر دے اور اپنی مشکلات کا حل اس سے طلب کرے۔ کیا یہ چیز جھوٹ اور جھوٹ قبول کر لینے کے سوا کچھ اور کہلا سکتی ہے۔

اس آیت میں تھوڑا سا غور کرکے اس سے ایک عمومی قانون اخذ کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ جو شخص بے بنیاد گمان کی پیروی کرتا ہے آخرکار جھوٹ تک جا پہنچتا ہے۔ صداقت اور سچائی یقین کی بنیاد پر استوار ہے اور جھوٹ کی عمارت بے بنیاد وہم و گمان کے سہارے قائم ہے۔

اس کے بعد بحث کی تکمیل، راہِ خدا شناسی کی نشاندہی اور شرک و بت پرستی سے دوری کے لیے خدائی نعمات کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ پہلو نظامِ خلقت اور اللہ کی عظمت، قدرت اور حکمت کی نشاندہی کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ وہ ہے جس نے رات کو تمھارے لیے باعثِ سکون قرار دیا ہے (ھو الذی جعل لکم اللیل لتسکنوا فیہ) اور دن کو روشنی بخش بنایا ہے (والنھار مبصرًا)

نور و ظلمت کا یہ نظام جس کا ذکر قرآن میں بارہا آیا ہے، حیرت انگیز اور پُربار نظام ہے جس میں کچھ عرصہ میں تابشِ نور سے انسانوں کے صحنِ حیات کو روشن کیا گیا ہے یہ عرصہ حرکت آفرین ہے اور انسان کو جستجو اور عمل پر آمادہ کرتا ہے۔ دوسرا عرصہ سیاہ پردوں میں لپٹی ہوئی آرام بخش رات کا ہے۔ اس رات کے ذریعے تھکی ہوئی روح اور جسم کام اور حرکت کے لیے پھر سے تیار ہوتا ہے۔

جی ہاں ـــــــ اس حساب شدہ نظام میں پروردگار کی قدرت کی آیات اور نشانیاں ہیں لیکن ان کے لیے جو سننے والے کان رکھتے ہیں اور حقائق کو سنتے ہیں (ان فی ذلک لایات لقوم یسمعون)۔ وہ جو سنتے اور ادراک کرتے ہیں اور جو ادراک حقیقت کے بعد اسے استعمال میں لاتے ہیں اور کام کرتے ہیں۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ رات آرام و سکون کے لیے ہے: رات کے بنانے کا مقصد آیت میں آرام و سکون قرار دیا گیا ہے یہ ایک

مسلّم علمی حقیقت ہے جسے آج کے علم نے درجۂ ثبوت تک پہنچایا ہے کہ تاریکی کے پردے نہ صرف دن بھر کے کام کاج کے لیے جبری تعطیل ہیں بلکہ انسان اور دوسرے جانداروں کے اعصاب پر ان کا مستقیم اثر ہے اور انھیں استراحت، نیند اور سکون بخشتے ہیں کس قدر نادان ہیں وہ لوگ کہ جو رات کو ہوس رانی میں بسر کر دیتے ہیں اور دن کو، خصوصاً نشاط انگیز صبح کو نیند میں گزار دیتے ہیں۔ اسی بنا پر ایسے لوگوں کے اعصاب ہمیشہ غیر معتدل اور بے آرام رہتے ہیں۔

۲۔ "والنھار مبصرا" کا مفہوم: مادہ "ابصار" بینائی کے معنی میں ہے۔ اس طرح "والنھار مبصرا" کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا نے "دن کو بینا قرار دیا ہے" حالانکہ دن بینا کرنے والا ہے نہ کہ خود بینا ہے یہ ایک خوبصورت تشبیہ اور مجاز ہے جو "توصیف سبب با اوصاف مسبب" کے قبیل سے ہے۔ جیسا کہ رات کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ "لیل نائم" یعنی "سوئی ہوئی رات" حالانکہ رات تو نہیں سوتی بلکہ رات سبب ہے لوگوں کے سونے کا۔

۲۔ کیا آیت ہر طرح کے ظن کی نفی کرتی ہے: زیر نظر آیات میں ظن اور گمان کی ایک مرتبہ پھر مذمت کی گئی ہے اور اسے مردود قرار دیا گیا ہے لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گفتگو بت پرستوں کے بے ہودہ اور بے بنیاد خیالات کے بارے میں ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں "ظن" عقلی اعتبار سے سوچے سمجھے گمان کے لئے نہیں ہے کہ جو بعض مواقع پر مثلاً شہادت و شہود، ظاہر الفاظ، اقرار اور تحریروں میں حجت ہے لہذا یہ آیات "ظن" کے حجت نہ ہونے پر دلیل نہیں ہو سکتیں۔

۶۸۔ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِیُّ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

۶۹۔ قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ○ؕ

۷۰۔ مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِیْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ ○ع

ترجمہ

۶۸۔ انھوں نے کہا ہے کہ خدا نے اپنے لیے بیٹا چُنا ہے (وہ ہر عیب، نقص اور احتیاج سے) منزہ ہے، وہ بے نیاز ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس کے لیے ہے۔ تمھارے پاس اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیا خدا کی طرف ایسی نسبت دیتے ہو جسے جانتے نہیں ہو۔

۶۹۔ کہہ دو کہ جو خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں (وہ کبھی بھی) فلاح نہیں پائیں گے۔

۷۰۔ (زیادہ سے زیادہ) انھیں دنیا کا فائدہ ہوگا پھر ان کی بازگشت ہماری طرف ہے۔ اس کے بعد ان کے لیے عذابِ شدید ہے، ان کے کفر کے بدلے کہ جو ہم انھیں چکھائیں گے۔

تفسیر

ان آیات میں بھی اسی طرح مشرکین کے بارے میں بحث جاری ہے یہاں خدا کی ذاتِ مقدس کے بارے میں انکی ایک تہمت بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: انھوں نے کہا ہے کہ خدا نے اپنے لیے ایک بیٹا چُنا ہے (قالوا اتخذ اللّٰه ولدا)۔

یہ بات سب سے پہلے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کے بارے میں کی۔ پھر زمانہ جاہلیت کے بُت پرستوں نے فرشتوں کے بارے میں کی، وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں خیال کرتے ہیں اور اسی طرح یہودیوں نے حضرت عزیر کے بارے میں یہ بات کی۔

قرآن ان لوگوں کا جواب دو طریقوں سے دیتا ہے۔

پہلا یہ کہ خدا ہر قسم کے عیب اور نقص سے منزہ ہے اور تمام چیزوں سے بے نیاز ہے (سبحانہ ھو الغنی)۔ یہ

اس طرف اشارہ ہے کہ اولاد کی ضرورت یا تو جسمانی قوت کی احتیاج اور مدد کے طور پر ہوتی ہے اور یا روحانی اور جذباتی ضرورت کے تحت اور چونکہ خدا ہر عیب و نقص اور ہر قسم کی کمی سے منزہ ہے اور اس کی ذات پاک غنی اور بے نیاز ہے لہٰذا ممکن نہیں کہ وہ اپنے لیے بیٹے کا انتخاب کرے "وہ آسمانوں اور زمین میں موجود تمام موجودات کا مالک ہے" (لہٗ ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض) اس صورت میں اس کے لیے بیٹے کا کیا مفہوم رہ جاتا ہے کہ جو اسے سکون بخشے یا اس کی مدد کرے۔

یہ امر جاذب نظر ہے کہ یہاں " اتخذ " (انتخاب کیا اور اختیار کیا) استعمال ہوا۔ یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ ان کا نظریہ تھا کہ خدا سے بیٹا پیدا نہیں ہوا بلکہ وہ کہتے تھے کہ خدا نے ایک موجود کو اپنے فرزند کے طور پر چن لیا ہے جیسے بعض لوگوں کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تو وہ کوئی بچہ کسی پرورش گاہ وغیرہ سے گود لے لیتے ہیں بہرحال یہ کوتاہ نظر جاہل خالق و مخلوق کے موازنہ میں اشتباہ میں پڑ گئے تھے اور انھوں نے خدا کی بے نیاز ذات کو اپنے ضرورت مند اور نیاز مند وجود کی طرح سمجھ لیا تھا۔

دوسرا جواب جو قرآن انھیں دیتا ہے یہ ہے کہ جو شخص بھی کوئی دعویٰ کرتا ہے اسے اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل پیش کرنا چاہیے۔ "کیا تمھارے پاس اس بات کی کوئی دلیل ہے"۔ نہیں تمھارے پاس اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں ہے (ان عندکم من سلطان بھٰذا)۔ تو اس کے باوجود "کیا خدا کی طرف ایسی نسبت دیتے ہو کہ جس کے بارے میں تم تھوڑی سی آگاہی بھی نہیں رکھتے ہو (اتقولون علی اللہ ما لا تعلمون)۔ یعنی بالفرض اگر تم پہلی دلیل کو قبول نہیں کرتے تو پھر بھی تم اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتے کہ تمھاری بات ایک تہمت ہے ایسا قول ہے جس کی بنیاد میں کوئی علم نہیں ہے۔

اگلی آیت میں خدا پر تہمت باندھنے کے منحوس انجام کا تذکرہ ہے۔ خدا تعالیٰ روئے سخن اپنے پیغمبرؐ کی طرف کرتے ہوئے کہتا ہے ان سے کہہ دو: وہ لوگ جو خدا پر افتراء باندھتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں ہرگز فلاح کا منہ نہیں دیکھیں گے (قل ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون)۔

فرض کریں کہ وہ اپنے جھوٹ اور تہمتوں سے چند دن کے لیے دنیا کے مال و منال تک پہنچ بھی جائیں تو یہ صرف اس جہان کا ایک زود گزر مال و متاع ہی ہے۔ اس کے بعد یہ ہماری طرف پلٹ کر آئیں گے اور ہم ان کے کفر کی وجہ سے انھیں عذاب شدید کا مزہ چکھائیں گے (متاع فی الدنیا ثم الینا مرجعھم ثم نذیقھم العذاب الشدید بما کانوا یکفرون)۔

درحقیقت اس آیت میں اور اس سے پہلے کی آیت میں خدا کی طرف بیٹے کے انتخاب کی نسبت دینے والے جھوٹوں کیلیے دو قسم کی سزائیں بیان کی گئی ہیں ایک یہ کہ یہ جھوٹ اور افتراء کبھی ان کی فلاح کا سبب نہیں بنے گا اور کبھی انھیں ان کے مقصد تک نہیں پہنچائے گا بلکہ وہ بے راہ رویوں میں سرگرداں رہیں گے اور بدبختی اور شکست انھیں دامن گیر ہوگی۔ دوسرا یہ کہ فرض کریں کہ وہ ان باتوں سے چند دن لوگوں کو غفلت میں رکھ لیں اور بت پرستی کے مذہب سے کوئی مقصد حاصل کر لیں تاہم اس مفاد میں دوام و بقا نہیں ہے اور خدا کا دائمی عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

چند الفاظ کا مفہوم

۱۔ "سلطان": یہ لفظ یہاں "دلیل" کے معنی میں ہے جیسے لفظ "دلیل" سے بھی زیادہ پُرمعنی اور رسا تر ہے کیونکہ "دلیل" راہنما کے معنی میں ہے۔ لیکن "سلطان" کا مطلب ہے وہ چیز جو انسان کو اپنے مدمقابل پر مسلط کر دے۔ یہ لفظ بحث، مجادلہ اور گفتگو کے مواقع سے مناسبت رکھتا ہے اور سرکوبی کرنے والی دلیل کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ "متاع": اس کا معنی ہے "وہ چیز جس سے انسان فائدہ اٹھائے" اس کا مفہوم بہت وسیع ہے اور اس میں زندگی کے تمام وسائل اور مادی نعمات شامل ہیں۔ مفردات میں راغب کہتا ہے: "کلما ینتفع به علی وجه ما، فهو متاع ومتعة"

ہر وہ چیز جس سے انسان فائدہ اٹھائے اسے "متاع" یا "متعہ" کہتے ہیں۔

۳۔ "نذیقهم": اس کا معنی ہے "ہم انہیں چکھائیں گے"۔ یہ تعبیر جو عذاب الٰہی کے بارے میں استعمال ہوئی ہے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ سزا ان تک اس طرح سے پہنچتی ہے کہ گویا وہ اسے اپنی زبان سے چکھتے ہیں۔ یہ تعبیر مشاہدہ سے حتی کہ عذاب کو مس کرنے سے بھی کہیں زیادہ مطلب دیتی ہے۔

۷۱۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُونِ ○

۷۲۔ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ○

۷۳۔ فَكَذَّبُوهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنَاهُمْ خَلَائِفَ وَأَغْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِينَ ○

ترجمہ

۷۱۔ ان کے سامنے نوح کا قصہ پڑھو کہ جب اس نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اگر میری حیثیت اور میرا آیاتِ الٰہی کا یاد دلانا تم پر گراں (اور ناقابلِ برداشت) ہے تو (جو کچھ تم سے ہو سکے کر لو) میں نے خدا پر توکل کیا ہے اپنی فکر اور اپنے معبودوں کی قوت کو مجتمع کر لو اور کوئی چیز تم پر مخفی نہ ہو پھر میری زندگی کا خاتمہ کر دو (اور لمحہ بھر کے لیے) مجھے مہلت نہ دو (لیکن تم اس کی قدرت نہیں رکھتے)۔

۷۲۔ اور اگر تم میری دعوت قبول کرنے سے منہ موڑتے ہو تو (تم غلط کرتے ہو کیونکہ) میں تم سے کوئی مزدوری نہیں چاہتا۔ میرا اجر صرف خدا پر ہے اور میرے ذمہ ہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں (کہ جو خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں)۔

۷۳۔ لیکن انھوں نے اس کی تکذیب کی اور ہم نے اسے اور اس کے ساتھ جو کشتی میں تھے انھیں نجات دی اور انھیں (کافروں کی جگہ) جانشین قرار دیا اور جن لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی انھیں غرق کر دیا

پس دیکھو کہ جو ڈرائے گئے تھے (لیکن انھوں نے اللہ کی طرف سے ڈرائے جانے کو اہمیت نہ دی) ان کا کیا انجام ہوا؟

تفسیر

حضرت نوحؑ کے جہاد کا ایک پہلو

زیرِ نظر آیات سے تاریخِ انبیاء اور گزشتہ اقوام کی سرگزشت کے ایک حصے کا آغاز ہوتا ہے۔ مشرکوں اور مخالف گروہوں کی بیداری کے لیے خدا اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ مشرکین کے بارے میں جاری گفتگو کی تکمیل گزشتہ لوگوں کی عبرت انگیز تاریخ کے حوالے سے کریں۔

پہلے حضرت نوحؑ کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ان کے سامنے نوح کی سرگزشت پڑھو، جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! تمھارے درمیان میرا توقف اور آیاتِ الٰہی کا یاد دلانا اگر تمھارے لیے گراں ہے اور ناقابلِ برداشت ہے تو پھر جو کچھ تم سے ہو سکے کر گزرو اور اس میں کوتاہی نہ کرو (واتل علیھم نبا نوح اذ قال لقومہ یٰقوم ان کان کبر علیکم مقامی وتذکیری بایات اللہ)۔ "کیونکہ میں نے اللہ پر توکل کیا ہے" لہٰذا اس کے غیر سے نہیں ڈرتا اور نہ میں کسی سے ہراساں ہوں (فعلی اللہ توکلت)۔

اس کے بعد تاکیداً کہا گیا ہے: اب جبکہ ایسا ہے تو اپنی فکر مجتمع کرلو اور اپنے بتوں کو بھی دعوتِ عمل دو تاکہ وہ تمھارے ارادے میں تمھاری مدد کریں (فاجمعوا امرکم وشرکاءکم)۔ "اس طرح سے کہ کوئی چیز تم پر مخفی نہ رہے اور نہ تمھارے دل میں کوئی غم رہے" بلکہ پوری وضاحت سے میرے بارے میں پختہ ارادہ کرلو (ثم لا یکن امرکم علیکم غمۃ)۔

"غمۃ"، "غم"، کے مادہ سے کسی چیز کے چھپانے کے معنی میں ہے۔ یہ جو رنج واندوہ اور حزن وملال کو غم کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ انسان کے دل کو چھپا لیتا ہے۔

اس کے بعد کہا گیا ہے: اگر تم سے ہو سکے تو "اٹھ کھڑے ہو اور میری زندگی کا خاتمہ کر دو اور مجھے لمحہ بھر کی بھی مہلت نہ دو" (ثم اقضوا الی ولا تنظرون[1])۔

حضرت نوحؑ خدا کے عظیم رسول ہیں۔ ان کے بہت تھوڑے سے ساتھی تھے اور دشمن نہایت سخت اور طاقتور لیکن وہ

---

[1] "ان کان کبر علیکم" کی جزاء شرط کیا ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے اس کے لیے جس قدر احتمالات ذکر ہوئے ہیں ان میں سے دو زیادہ قرینِ عقل ہیں۔ ایک یہ کہ "فاجمعوا امرکم" جزائے شرط ہے اور "فعلی اللہ توکلت" شرط اور جزا کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ دوسرا یہ کہ جزا محذوف ہے اور بعد والے جملے اس پر دلالت کرتے ہیں اور تقدیر اس طرح ہے: فافعلوا ما تریدون فانی متوکل علی اللہ۔ درحقیقت جملہ "فعلی اللہ توکلت" علت کے قبیل سے ہے جو معلول کی جانشین ہے اور بعد والے جملے میں "شرکاءکم" تمھارے بتوں کی طرف اشارہ ہے اور اس سے پہلے جو واؤ ہے وہ "مع" کے معنی میں ہے (غور کیجیے گا)۔

اپنے یقین کے ساتھ کہ جو اولوالعزم پیغمبروں کا خاصہ ہے بڑی شجاعت اور پامردی سے دشمنوں کے مقابلے میں ڈٹ جاتے ہیں۔ ان کی قوت و طاقت کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کے سازشوں، افکار اور بتوں کے بارے میں اپنی بے اعتنائی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اسطرح ان کے افکار و نظریات پر ایک شدید نفسیاتی ضرب لگاتے ہیں۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ آیات مکہ میں نازل ہوئیں اس زمانے میں کہ جب رسول اللہؐ بھی حضرت نوحؑ جیسے حالات سے دوچار تھے اور مومنین اقلیت میں تھے، قرآن چاہتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کو بھی یہی حکم دے کہ وہ دشمن کی طاقت کو اہمیت نہ دیں، بلکہ یقین اور شجاعت و شہامت کا مظاہرہ کریں کیونکہ ان کی پناہ گاہ خدا ہے اور اس کی قدرت کے سامنے کوئی طاقت نہیں ٹھہر سکتی۔

بعض مفسرین حضرت نوحؑ کے اس قیام کو یا تاریخ انبیاء میں ایسے واقعات کو اعجاز کی ایک قسم قرار دیتے ہیں کیونکہ انھوں نے ظاہری وسائل نہ ہونے کے باوجود دشمنوں کو شکست کی دھمکی دی اور انجام کار اپنی فتح کی خبر دی اور یہ چیز معجزے کے سوا ممکن نہیں۔

بہرحال یہ تمام اسلامی رہبروں کے لیے ایک درس ہے کہ وہ دشمنوں کی کثرت سے ہرگز ہراساں نہ ہوں بلکہ پروردگار پر بھروسہ اور توکل کرتے ہوئے، حتمی و قطعی فیصلے کے ساتھ جتنا زیادہ ہو سکے انھیں مقابلے کی دعوت دیں اور ان کی طاقت کی تحقیر و تذلیل کریں کیونکہ یہ اسلام کے پیروکاروں کی روحانی تقویت اور دشمنوں کی روحانی شکست کے لیے ایک اہم عامل ہے۔

اگلی آیت میں حضرت نوح کی طرف سے اپنی حقانیت کے اثبات کے لیے ایک اور بیان نقل ہوا ہے ارشاد ہوتا ہے:

اگر تم میری دعوت سے روگردانی کروگے تو مجھے کوئی نقصان نہیں ہوگا کیونکہ میں نے تم سے کسی اجر یا مزدوری کا تو تقاضا نہیں کیا (فان تولیتم فما سئلتکم من اجر)۔[1] کیونکہ میرا اجر اور جزا صرف خدا پر ہے" (ان اجری الا علی اللہ)۔

میں اس کے لیے کام کرتا ہوں اور اسی سے اجر و جزا چاہتا ہوں اور" میں مامور ہوں کہ فقط فرمانِ خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کروں" (و امرت ان اکون من المسلمین)۔

یہ جو حضرت نوحؑ کہتے ہیں کہ میں تم سے کوئی اُجرت نہیں چاہتا خدائی رہبروں کے لیے یہ ایک اور درس ہے کہ وہ اپنی دعوت اور تبلیغ میں لوگوں سے کسی قسم کی کوئی مادی اور معنوی جزا کی توقع نہ رکھیں کیونکہ ایسی توقعات ایک قسم کی وابستگی پیدا کر دیتی ہیں اور ان کی صریح تبلیغات اور آزادانہ کارکردگی کی راہ میں دیوار بن جاتی ہیں لہٰذا فطرتاً ان کی تبلیغات اور دعوت کا اثر کم ہو جائے گا اس بناء پر اسلام اور اس کی تبلیغ اور دعوت کے لیے صحیح راستہ بھی یہی ہے کہ مبلغین اسلام اپنی گزر بسر کرنے اور معاش کے لیے بیت المال کا سہارا لیں نہ کہ وہ لوگوں کے محتاج ہوں۔

---

[1] اس شرط کا جواب بھی محذوف ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے،

فان تولیتم فلا تضرونی۔

یا اس طرح ہے:

فان تولیتم فانتم وشأنکم۔

زیر بحث آخری آیت میں حضرت نوح کے دشمنوں کے انجام اور آپ کی پیش گوئی کی صداقت کو یوں بیان کیا گیا ہے، انھوں نے نوح کی تکذیب کی لیکن ہم نے اسے اور ان تمام افراد کو جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے نجات دی (فنجّینٰہ ومن معہ فی الفلک)۔[1]

"ہم نے نہ صرف انھیں نجات دی بلکہ ستمگر قوم کی جگہ انھیں جانشین بنایا" (وجعلنٰھم خلائف) "اور جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا تھا انھیں ہم نے غرق کر دیا" (واغرقنا الذین کذبوا بآیاتنا)۔

آخر میں روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اب ان لوگوں کا انجام دیکھو جنھیں ڈرایا گیا تھا لیکن انھوں نے خدائی تنبیہوں کو کچھ نہ سمجھا (فانظر کیف کان عاقبۃ المنذرین)۔

---

[1] "فلک" "کشتی" کے معنی میں ہے، یہ لفظ "سفینہ" سے مختلف ہے۔ فرق یہ ہے کہ "سفینہ" مفرد ہے اور اس کی جمع "سفائن" ہے، جبکہ "فلک" مفرد اور جمع دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

۷۴۔ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِ رُسُلًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ فَجَاءُوهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ ۚ كَذَٰلِكَ نَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْمُعْتَدِينَ ○

ترجمہ

۷۴۔ پھر ہم نے نوح کے بعد کچھ رسول ان کی قوم کی طرف بھیجے وہ واضح دلائل لے کر ان کے پاس گئے لیکن وہ اس چیز پر ایمان نہ لائے جس کی پہلے تکذیب کر چکے تھے۔ اس طرح ہم تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر مُہر لگا دیتے ہیں (تاکہ وہ کچھ نہ سمجھ سکیں)۔

تفسیر

حضرت نوح کے بعد آنے والے انبیاء

حضرت نوحؑ کی سرگزشت کے بارے میں اجمالی گفتگو کے بعد ان کے بعد لوگوں کی ہدایت کے لیے آنے والے انبیاء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہاں انبیاء کا تذکرہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے آئے مثلاً ابراہیمؑ، ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ اور یوسفؑ۔ ارشاد ہوتا ہے: پھر نوح کے بعد ہم نے کچھ رسول ان کی قوم اور جمعیت کی طرف بھیجے (ثم بعثنا من بعدہ رسلاً الی قومھم)۔

"وہ واضح روشن اور آشکار دلائل لے کر اپنی قوم کی طرف آئے" اور نوح کی طرح ان کے پاس بھی منطق و اعجاز کے تربیت کنندہ ہتھیار اور پروگرام تھے (فجاءوھم بالبینات)۔

"لیکن وہ لوگ جو عناد اور ہٹ دھرمی کی راہ پر چل رہے تھے اور گزشتہ انبیاء کی تکذیب کے لیے بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے ان انبیاء کی بھی تکذیب کی اور ان پر ایمان نہ لائے (فما کانوا لیؤمنوا بما کذبوا بہ من قبل)۔

اور یہ اس بناء پر تھا کہ گناہ اور حق دشمنی کی وجہ سے ان کے دلوں پر پردہ پڑا ہوا ہے" جی ہاں ہم اس طرح تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں (کذٰلک نطبع علی قلوب المعتدین)۔

دو قابلِ توجہ نکات

۱۔ ہٹ دھرم گروہ: "فما کانوا لیؤمنوا بما کذبوا بہ من قبل" یہ جملہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ امتحان میں

پھر ایسے گروہ بھی تھے جو کسی پیغمبر اور مصلح کی دعوت پر سر تسلیم خم نہیں کرتے تھے اور اسی طرح اپنی بات پر اڑے رہتے تھے انبیاء کی بار بار کی دعوت سے ان پر ذرہ بھر بھی اثر نہیں ہوتا تھا لہٰذا مذکورہ جملہ ایک ہی گروہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جس نے دو مختلف اوقات میں مختلف انبیاء کی دعوت سنی (کیونکہ جملے کا ظہور یہ ہے کہ تمام ضمیریں ایک ہی مرجع کی طرف لوٹتی ہیں)۔

آیت کے معنی میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ دو مختلف گروہوں کی طرف اشارہ کرتی ہے ایک گروہ حضرت نوحؑ کے زمانے میں تھا اور ان کی دعوت کی تکذیب کرتا تھا جبکہ دوسرا گروہ اس کے بعد آیا جو انبیاء کی تکذیب میں پہلے گروہ کا پیروکار تھا۔ اس بناء پر جملے کا معنی اس طرح ہوگا: دوسری قوموں کے تجاوز کرنے والوں نے اس چیز پر ایمان لانے سے منہ پھیر لیا کہ جس سے پہلی قوموں نے روگردانی کی تھی۔

البتہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کی مخالفت کرنے والے طوفان کے دوران ختم ہو گئے تھے دوسرا احتمال زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے بہرحال اس کا لازمہ یہ ہے کہ ہم جملے کی ضمیروں کے مرجع (کانوا، لیؤمنوا اور کذبوا، میں جمع کی واؤ) میں تفکیک اور الگ الگ ہونے کے قائل ہوں۔

۲۔"کذٰلک نطبع علٰی قلوب المعتدین" جبر کی دلیل نہیں: واضح ہے کہ یہ جملہ جبر کی دلیل نہیں ہے اور اس کی تفسیر خود اسی میں موجود ہے کیونکہ فرمایا گیا ہے کہ ہم تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں تاکہ وہ کسی چیز کا ادراک نہ کر سکیں۔ یعنی پہلے وہ احکامِ الٰہی اور حق و حقیقت کے بارے میں پے در پے تجاوز اور زیادتیوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ان کی یہ زیادتیاں تدریجاً ان کے دلوں پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ان سے حق کی تشخیص کی قدرت چھین لیتی ہیں ان کا معاملہ یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ سرکشی، نافرمانی اور گناہ ان کی عادت اور طبیعتِ ثانیہ بن جاتا ہے چنانچہ اب وہ کسی حقیقت کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے[1]

---

[1] اس مطلب کی تفصیل ہم جلد اول میں سورۂ بقرہ کی آیت ۷ کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں۔

۷۵۔ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ○

۷۶۔ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○

۷۷۔ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ○

۷۸۔ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ○

ترجمہ

۷۵۔ ان کے بعد ہم نے موسٰی اور ہارون کو اپنی آیات دے کر فرعون اور اس کے آس پاس والوں کی طرف بھیجا لیکن انھوں نے تکبّر کیا (اور حق قبول نہ کیا کیونکہ) وہ مجرم گروہ تھا۔

۷۶۔ اور جب ہماری طرف سے ان کے پاس حق آیا تو کہنے لگے یہ واضح جادو ہے

۷۷۔ (لیکن) موسٰی نے کہا کیا اس حق کو تم جادو شمار کرتے ہو جو تمھاری طرف آیا ہے؟ کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر تو رستگار (اور کامیاب) نہیں ہوں گے۔

۷۸۔ کہنے لگے کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس سے پھیر دے جس پر ہمارے آباؤ اجداد تھے اور تو دونوں زمین کی بزرگی (اور حکومت حاصل کرے) ہم تم دونوں پر ایمان نہیں لائیں گے۔

تفسیر

موسٰیؑ اور ہارونؑ کے جہاد کا ایک پہلو

گزشتہ انبیاء اور ان کی امتوں کے واقعات کو زندہ نمونہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت نوحؑ کے

بارے میں گفتگو کی گئی ہے پھر حضرت نوحؑ کے بعد کے پیغمبروں کا ذکر ہوا ہے۔ اب زیر نظر آیات میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ کے بارے میں بات کی گئی ہے یہاں فرعون اور اس کے ساتھیوں سے ان کے مسلسل مبارزات اور جہاد کا کچھ ذکر کیا گیا ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: گزشتہ انبیاء کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کی جماعت کی طرف آیات و معجزات[1] کے ساتھ بھیجا (ثم بعثنا من بعدهم موسیٰ و هٰرون الیٰ فرعون و ملائه بایٰتنا)۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے ان زرق برق اشراف کو ملاء کہا جاتا ہے کہ جن کا ظاہر آنکھ کو پُر کر دے اور اجتماع میں یہی نمایاں ہوں۔ زیر بحث آیت میں اور ایسی دیگر آیات میں یہ لفظ حواریوں، اطرافیوں اور مشیروں کے معنی میں آیا ہے۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ گفتگو صرف فرعون اور فرعونیوں کی طرف حضرت موسیٰؑ کے مبعوث ہونے کے بارے میں ہے جبکہ حضرت موسیٰ تمام فرعونیوں اور بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرے کی نبض برسرِ اقتدار پارٹی اور ان کے خاندان کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہر اصلاحی اور انقلابی پروگرام میں پہلے انھیں ہدف بنایا جائے۔ جیسا کہ سورہ توبہ کی آیہ ۱۲ میں بھی ہے:

فقاتلوا ائمة الکفر۔

پس کفر کے حکمرانوں اور والیوں سے جنگ کرو۔

لیکن فرعون اور فرعونیوں نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت سے روگردانی کی اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی بجائے اس سے تکبر کیا (فاستکبروا)۔

انھوں نے تکبر کی وجہ سے اور انکساری کی روح نہ ہونے کے باعث حضرت موسیٰؑ کی دعوت کے واضح حقائق کی پرواہ نہ کی۔ اس طرح اس مجرم اور گنہ گار قوم نے اپنا جرم و گناہ جاری رکھا۔ (وکانوا قوما مجرمین)۔

اگلی آیت میں حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی سے فرعونیوں کے بعض مبارزات کے بارے میں گفتگو ہے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ انھوں نے انکار، تکذیب اور افتراء کا راستہ اختیار کیا ان کی نیت کو بُرا قرار دیا، بڑوں سے کارِ نیک کو درہم برہم کرنے کا الزام دیا اور اجتماعی نظام میں خلل ڈالنے کی تہمت لگائی۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: جس وقت ہماری طرف سے حق ان کے پاس آیا (تو باوجود یکہ انھوں نے اس کے چہرے سے اسے پہچان لیا) کہنے لگے کہ یہ واضح جادو ہے (فلما جاءهم الحق من عندنا قالوا ان هٰذا لسحر مبین)۔

حضرت موسیٰؑ کی دعوت کی قوتِ جاذبہ ایک طرف، آنکھوں میں سما جانے والے معجزات دوسری طرف ہدایت افروز اور حیران کن اثر و نفوذ تیسری طرف سبب بنے کہ فرعونی فکر میں پڑ گئے۔ انھیں اس سے بہتر کوئی بات نہ سوجھی کہ انھیں جادوگر کہیں اور ان کے کام کو جادو قرار دیں اور یہ ایسی تہمت ہے جو پوری تاریخ انبیاء میں اور خصوصاً پیغمبرِ اسلام کے بارے میں نظر آتی ہے لیکن حضرت موسیٰؑ نے اپنے دفاع میں دو دلیلوں سے نقاب الٹ دیئے اور ان کے جھوٹ اور تہمت کو آشکار کر دیا۔

آپؑ نے پہلے ان سے کہا کہ کیا تم حق کی طرف جادو کی نسبت دیتے ہو کیا یہ جادو ہے اور اس کی جادو سے کوئی مشابہت

---

[1] "آیات" سے مراد وہی حضرت موسیٰؑ کے متعدد مشہور معجزات ہیں جو ابتداء میں اپنے ساتھ لائے تھے۔

ہے؟ (قال موسیٰ اتقولون للحق لما جاءکم أسحر هٰذا)[1]

یعنی یہ درست ہے کہ سحر اور معجزہ دونوں ہی اثر رکھتے ہیں یہ حق اور باطل ممکن ہے دونوں لوگوں کو متاثر کریں لیکن جادو کا چہرہ کہ جو ایک باطل چیز ہے، معجزے سے کہ جو حق ہے بالکل جدا ہے۔ انبیاء کے اثر کو جادوگروں کے اثر پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ جادوگروں کے کام بے ہدف، محدود اور بے وقعت ہوتے ہیں۔ جب کہ انبیاء کے معجزات کے مقاصد روشن، اصلاحی، انقلابی اور تربیتی ہوتے ہیں جو وسیع اور غیر محدود ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہوتے (ولا یفلح الساحرون)۔

یہ تعبیر دراصل انبیاء کے کام کے جادو سے ممتاز اور جدا ہونے پر ایک اور دلیل ہے پہلی دلیل میں جادو اور معجزے کا فرق بیان کیا گیا ہے ان دونوں کے مختلف رُخ کی طرف اشارہ ہے اور ان کے ہدف اور مقصد کا اختلاف ثابت کیا گیا ہے لیکن یہاں جادوگر اور معجزہ لانے والے کے حالات و صفات کے اختلاف کے حوالے سے مطلب کے اثبات میں مدد لی گئی ہے۔

جادوگر کا کام اور فن انحراف پیدا کرنے اور غافل کرنے کا پہلو رکھتا ہے۔ جادو سے فائدہ اٹھانے والے افراد منحرف، لوگوں کو غافل کرنے والے اور دھوکا باز ہوتے ہیں۔ جبکہ پیغمبر حق طلب، دلسوز، پاک دل، باہدف، نیک پارسا اور مادی امور کی پروا نہ کرنے والے بہادر مرد ہوتے ہیں۔

جادوگر کبھی بھی رستگاری اور فلاح کا چہرہ نہیں دیکھتے وہ دولت و ثروت، مقام و منصب اور ذاتی مفادات کے سوا کسی چیز کے لیے کام نہیں کرتے۔ جبکہ انبیاء کا ہدف و مقصد ہدایت، خلق خدا کا مفاد اور انسانی معاشرے کے تمام معنوی اور مادی پہلوؤں کی اصلاح ہوتا ہے۔

پھر انھوں نے اپنی تہمتوں کے سیلاب کا رخ موسیٰ کی طرف کیے رکھا اور ان سے کُھل کر کہنے لگے، کیا تو ہمیں ہمارے آباؤ اجداد اور بزرگوں کے طور طریقے سے پھیر دینا چاہتا ہے (قالوا اجئتنا لتلفتنا عما وجدنا علیه اٰباءنا)۔

درحقیقت انھوں نے بڑوں کے طور طریقے، رسومات، خیالی عظمت اور ان کے افسانوی بتوں کا سہارا لیا تاکہ عوام کو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ سے متنفر کر سکیں اور انھیں یقین دلائیں کہ یہ تمہارے معاشرے اور ملک کے مقدسات اور عظمتوں کو پامال کرنا اور ان سے کھیلنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے اپنی پہلی بات کو جاری رکھا اور کہا کہ خدا کے دین کے بارے میں تمہاری دعوت جھوٹ سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ تو سب اس سرزمین پر حکومت کرنے کے لیے چال اور عاشقانہ سازشیں ہیں (وتکون لکما الکبریاء فی الارض)۔

درحقیقت چونکہ ان کی اپنی سر کوشش لوگوں پر ظالمانہ حکومت کے لیے تھی لہٰذا دوسروں کو بھی ایسا ہی خیال کرتے

---

[1] مندرجہ بالا جملے میں محذوف مقدر ہے کہ جو پہلے کلام سے سمجھا جاتا ہے، جو اصل میں اس طرح ہے،
"اتقولون للحق لما جاءکم سحر، أسحر هٰذا"

تھے۔ وہ انبیاء کی مصلحانہ کوششوں کو بھی یہی معنی پہناتے تھے اور کہتے تھے کہ "تم جان لو کہ ہم تم دو افراد پر کبھی ایمان نہیں لائیں گے" کیونکہ ہم نے تمہارے مقاصد سمجھ لیے ہیں اور تمہارے تخریبی پروگرام سے ہم آگاہ ہیں (وما نحن لکما بمؤمنین)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف ان کی جنگ کا یہ پہلا مرحلہ ہے۔

۷۹۔ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُونِي بِكُلِّ سَاحِرٍ عَلِيمٍ ○

۸۰۔ فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُوسَىٰ أَلْقُوا مَا أَنْتُمْ مُلْقُونَ ○

۸۱۔ فَلَمَّا أَلْقَوْا قَالَ مُوسَىٰ مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ ۖ إِنَّ اللَّهَ سَيُبْطِلُهُ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ ○

۸۲۔ وَيُحِقُّ اللَّهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ○

ترجمہ

۷۹۔ فرعون نے کہا: ہر آگاہ جادوگر (اور ساحر) کو میرے پاس لے آؤ۔

۸۰۔ جس وقت جادوگر آئے تو موسیٰ نے ان سے کہا: تم (جادو کے اسباب میں سے) جو کچھ ڈال سکتے ہو ڈال دو۔

۸۱۔ جب انھوں نے (جادو کے اسباب) ڈالے تو موسیٰ نے کہا کہ جو کچھ تم لائے ہو وہ جادو ہے جسے خدا جلدی باطل کر دے گا کیونکہ خدا فساد کرنے والوں کے عمل کی اصلاح نہیں کرتا۔

۸۲۔ اور حق کو وہ اپنے وعدے سے ثابت کر دکھاتا ہے اگرچہ مجرم ناپسند کرتے ہوں۔

تفسیر

حضرت موسیٰؑ کے خلاف جنگ کا دوسرا مرحلہ

ان آیات میں مقابلے کا اگلا مرحلہ بیان کیا گیا ہے۔ ان میں حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی کے خلاف فرعون کے عملی اقدام کی بات کی گئی ہے۔

جب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے کچھ معجزات مثلاً ید بیضا اور بہت بڑے اژدہا کو حملہ کرتے دیکھا اور اسے نظر آیا کہ موسیٰؑ کا دعویٰ بلا دلیل نہیں اور یہ دلیل کم از کم اس کے اطرافیوں یا دوسروں میں سے بعض پر اثر انداز ہوگی تو اس نے عملی طور پر جواب دینے کا فیصلہ کیا۔ قرآن کہتا ہے، فرعون نے پکار کے کہا کہ تم آگاہ جادوگروں کو میرے پاس لے آؤ تاکہ ان کے ذریعے میں موسیٰ والی مصیبت اپنے سے دور کر سکوں (وقال فرعون ائتونی بکل ساحر علیم)۔

وہ جانتا تھا کہ ہر کام میں اس کے راستے سے داخل ہونا چاہیے اور اس کے ماہروں سے مدد لینا چاہیے۔

کیا واقعاً فرعون حضرت موسیٰ کی دعوت کی حقانیت میں شک رکھتا تھا اور اس طریقے سے انھیں آزمانا چاہتا تھا یا وہ جانتا تھا

کہ موسٰی خدا کی طرف سے ہیں لیکن اس کا خیال تھا کہ جادوگروں کے شور و غل سے لوگوں کو مطمئن کیا جا سکتا ہے اور وقتی طور پر عامۃ الناس کے افکار کو موسٰی کے اثر و نفوذ سے بچایا جا سکتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر موسٰی خارق عادت کام انجام دیتا ہے تو ہم بھی اس جیسے کام کی انجام دہی سے عاجز نہیں ہیں اور اس کا خیال تھا کہ اگر اس کا عمل کا دعوٰی اس طرح سے پورا ہو جائے تو یہ چیز سہل و آسان ہے۔

دوسرا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے نیز حضرت موسٰیؑ کے واقعہ سے مربوط دوسری آیات جو سورہ طٰہٰ میں یا اور جگہوں پر ہیں اس نظریے کی تائید کرتی ہیں کہ وہ جان بوجھ کر حضرت موسٰی علیہ السلام کے مقابلے میں کھڑا ہوا تھا۔

بہر حال جب مقابلے کے معین تاریخی دن کہ جس دن کے لیے لوگوں کو شرکت کی عام دعوت دی گئی تھی، جادوگر اکٹھے ہوئے تو حضرت موسٰیؑ نے ان کی طرف رخ کیا اور کہا: پہلے جو کچھ تم لا سکتے ہو میدان میں لے آؤ (فلما جاء السحرة قال لهم موسى القوا ما انتم ملقون)۔

"القوا ما انتم ملقون" کا اصلی معنی یہ ہے کہ جو کچھ تم پھینک سکتے ہو پھینکو اور یہ اشارہ ہے ان مخصوص رسیوں اور لاٹھیوں کی طرف جو اندر سے خالی تھیں اور انھوں نے ان میں خاص کیمیائی مواد ڈال رکھا تھا کہ جسے سورج کی روشنی میں رکھا جائے تو اس میں حرکت اور جوش پیدا ہوتا ہے۔ اس بات کی شاہد وہ آیات ہیں جو سورہ اعراف اور شعراء میں آئی ہیں۔ سورہ شعراء کی آیت ۴۳ اور ۴۴ میں ہے۔

قال لهم موسىٰ القوا ما انتم ملقون فالقوا حبالهم وعصيهم
وقالوا بعزة فرعون انا لنحن الغالبون۔

موسٰی نے ان سے کہا جو پھینک سکتے ہو پھینکو پھر انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں
پھینکیں اور کہنے لگے فرعون کی عزت کے صدقے ہم کامیاب ہیں۔

البتہ اس میں یہ معنی بھی پنہاں ہے کہ جو کچھ تمہاری قدرت میں ہے اسے میدان میں لے آؤ۔

بہر حال انھوں نے اپنی تمام قدرت مجتمع کی اور جو کچھ وہ اپنے ساتھ لائے تھے انھوں نے میدان کے بیچ میں ڈال دیے" تو اس وقت موسٰی نے ان سے کہا کہ جو کچھ تم لے کر آئے ہو یہ جادو ہے اور خدا جلدی اسے باطل کر دے گا (فلما القوا قال موسى ما جئتم به السحر ان الله سيبطله)۔ تم فاسد اور مفسد افراد ہو کیونکہ ایک جابر، ظالم اور سرکش کی خدمت انجام دے رہے ہو اور تم نے اپنے علم کو اس خود غرض حکومت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے بیچ دیا ہے اور یہ خود تمہارے مفسد ہونے پر ایک بہترین دلیل ہے اور خدا مفسدین کے عمل کی اصلاح نہیں کرتا (ان الله لا يصلح عمل المفسدين)۔

درحقیقت جو شخص بھی عقل، ہوش اور دانش رکھتا تھا، حضرت موسٰی کے جادوگروں پر غلبہ حاصل کرنے سے پہلے بھی اس حقیقت کو سمجھ سکتا تھا کہ ان کا عمل بے بنیاد ہے کیونکہ وہ ظلم کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لیے کام کر رہے تھے۔ کون نہیں جانتا تھا کہ فرعون غاصب، غارت گر، ظالم اور مفسد ہے تو کیا ایسی طاقت کے خدمتگزار اس کے ظلم و فساد میں شریک نہ تھے کیا ممکن تھا کہ ان کا عمل ایک صحیح اور خدائی عمل قرار پا سکے، ہرگز نہیں۔ لہٰذا واضح ہے کہ خدا ایسی مفسدانہ کوششوں کو باطل کر دے گا۔

کیا "سيبطله" (خدا اسے جلد باطل کر دے گا) اس بات کی دلیل ہے کہ جادو ایک حقیقت ہے لیکن خدا اسے باطل کر سکتا ہے

یا اس جملے سے مراد یہ ہے کہ خدا ان کے باطل ہونے کو واضح کر دے گا۔

سورہ اعراف کی آیہ ۱۱۶ میں ہے:

قلما القوا سحروا اعین الناس و استرهبوهم۔

یعنی۔ جادوگروں کے جادو نے لوگوں کی آنکھوں کو متاثر کیا اور انھیں وحشت میں ڈال دیا۔

لیکن یہ تعبیر اس بات کے منافی نہیں کہ ان کے پاس مرموز وسائل تھے جیسا کہ "سحر" کے لغوی معنی میں پوشیدہ ہے۔ انھوں نے معنوی طور پر مختلف اجسام کے طبیعی اور کیمیائی خواص سے استفادہ کیا اور اس سے ان رسیوں اور لاٹھیوں میں واقعاً حرکات پیدا کر دیں البتہ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جیسا کہ ظاہراً معلوم ہوتا تھا معاملہ اس کے برعکس تھا یہ رسیاں اور لاٹھیاں زندہ موجودات نہیں بن گئی تھیں۔ جیسا کہ قرآن سورہ طٰہٰ کی آیت ۶۶ میں کہتا ہے:

فاذا حبالهم وعصيهم يخيل اليه من سحرهم انها تسعیٰ۔

اس وقت رسیاں اور لاٹھیاں جادوگروں کے جادو کی وجہ سے یوں لگتی تھیں جیسے وہ زندہ موجودات ہیں جو دوڑ رہی ہیں۔

لہٰذا جادو کا ایک حصہ تو حقیقت پر مبنی ہے اور دوسرا وہم و خیال ہے۔

زیر نظر آخری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ موسیٰ نے ان سے کہا کہ اس مقابلے میں ہمیں اعتقاد ہے کہ کامیابی ہماری ہے کیونکہ خدا کا وعدہ ہے کہ وہ حق کو آشکار کرے گا اور شکست دینے والی منطق اور غالب آنے والے معجزات کے ذریعے اپنے پیغمبروں کی مدد کرے گا اور یوں اہل فساد و باطل کو رسوا اور ذلیل کرے گا اگرچہ مفسد فرعون اور اس کے حواری اسے ناپسند کرتے ہیں (ويحق الله الحق بكلماته ولو كره المجرمون)۔

"بکلماته" سے مراد یا تو انبیاء برحق کی کامیابی کے لیے خدائی وعدہ ہے یا اس کے قاہر اور قوی معجزات ہیں۔[1]

---

[1] حضرت موسیٰؑ کے فرعون اور فرعونیوں سے مقابلہ کے بارے میں تفصیلات اور اس سلسلے میں کئی اہم نکات پر ہم جلد ۴ میں سورہ اعراف کی آیہ ۱۱۲ کے بعد سے تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ نیز جادو اور اس کی حقیقت کے بارے میں ہم پہلی جلد میں سورہ بقرہ کی آیہ ۱۰۲ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں۔ رجوع کیجیے۔

۸۳۔ فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ○

۸۴۔ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ○

۸۵۔ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○

۸۶۔ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○

ترجمہ

۸۳۔ (شروع میں) کوئی شخص موسیٰ پر ایمان نہ لایا مگر صرف اس کی قوم کی اولاد میں سے ایک گروہ۔ (وہ بھی) فرعون اور اس کے حواریوں کے خوف سے کہ کہیں وہ (انھیں دباؤ یا گمراہ کن پروپیگنڈہ سے) ان کے دین سے منحرف نہ کردیں۔ فرعون زمین میں بالادستی اور طغیان کے لیے کوشاں تھا اور وہ زیادتی کرنے والوں میں سے تھا۔

۸۴۔ موسیٰ نے کہا: اے میری قوم! اگر تم خدا پر ایمان لائے ہو تو اس پر توکل کرو اگر اس کے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہو۔

۸۵۔ انھوں نے کہا ہم صرف خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ پروردگار! ہمیں ظالم گروہ کے زیرِ اثر قرار نہ دے۔

۸۶۔ اور ہمیں اپنی رحمت سے کافر گروہ (کے ہاتھ) سے نجات دے۔

تفسیر

طاغوتِ مصر سے حضرت موسیٰؑ کے جہاد کا تیسرا مرحلہ

ان آیات میں فرعون سے حضرت موسیٰؑ کے انقلابی مقابلوں میں سے ایک اور واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ابتداء میں حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانے والے گروہ کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس واقعہ کے بعد موسیٰ پر ایمان لانے والے صرف ان کی قوم کے فرزند تھے (فما اٰمن لموسیٰ الا ذریۃ من قومہ)۔

یہ چھوٹا اور مختصر سا گروہ تھا۔ لفظ "ذریۃ" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بھی زیادہ تر جوان اور نوجوان تھے۔ وہ فرعون اور اس کے حواریوں کی طرف سے سخت دباؤ کا شکار تھے۔ انھیں ہر وقت یہی خوف رہتا تھا کہ فرعونی حکومت کہیں شدید دباؤ کے ذریعے کہ جو وہ اہل ایمان پر روا رکھتی ہے، انھیں موسیٰ کا دین ترک کرنے پر مجبور نہ کرے (علی خوف من فرعون وملائهم ان یفتنهم)۔ کیونکہ فرعون ایک ایسا شخص تھا جو زمین پر بالادستی چاہتا تھا (وان فرعون لعال فی الارض)۔ وہ اسراف کرنے والا اور تجاوز کرنے والا تھا اور کسی حد اور سرحد کو قانونی نہیں سمجھتا تھا (وانہ لمن المسرفین)۔

اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ موسیٰ پر ایمان لانے والی "ذریہ" کون سی تھی اور یہ کہ "من قومہ" کی ضمیر موسیٰ کی طرف لوٹتی ہے یا فرعون کی طرف۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ فرعون کی قوم اور قبطیوں میں سے چند افراد تھے جیسے مومن آل فرعون، فرعون کی بیوی، اس کی مشاطہ[1] اور اس کی کنیز۔ ظاہراً اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے اکثر افراد ایمان لا چکے تھے لہٰذا یہ صورت "ذریۃ من قومہ" سے مناسبت نہیں رکھتی۔ کیونکہ یہ تو ایک چھوٹے سے گروہ کا ذکر ہے۔

بعض دوسرے مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ گروہ بنی اسرائیل میں سے تھا اور "بہ" کی ضمیر موسیٰ کی طرف لوٹتی ہے کیونکہ اس سے پہلے موسیٰ کا نام آیا ہے لہٰذا ادبی قواعد کے مطابق اس ضمیر کا تعلق موسیٰ ہی سے ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دوسرا معنی ظاہر آیت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے نیز بعد والی آیت میں اس کے لیے ایک اور شاہد ہے جس میں فرمایا گیا ہے۔

وقال موسیٰ یاقوم ...

موسیٰ نے مومنین سے کہا: اے میری قوم ....

یعنی مومنین کو اپنی قوم قرار دیا ہے۔

ایک ہی اعتراض ہے جو اس تفسیر پر باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل تو تمام حضرت موسیٰ پر ایمان لائے تھے نہ کہ

---

[1] مشاطہ پرانے زمانے میں اس عورت کو کہتے تھے جو امیر کبیر گھرانوں کی عورتوں کی آرائش و زیبائش کرتی تھی (مترجم)۔

ان کا ایک چھوٹا سا گروہ ایمان لایا تھا البتہ ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے یہ اعتراض دور ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ہم جانتے ہیں کہ ہر انقلاب کی طرف جذب ہونے والا پہلا گروہ نوجوانوں کا ہوتا ہے۔ نوجوان زیادہ پاکیزہ دل اور صاف و شفاف افکار رکھتے ہیں۔ مزید برآں ان میں انقلابی جوش و خروش زیادہ ہوتا ہے۔ مادی وابستگیاں جو بڑے بوڑھوں کو احتیاط اور مصلحت کوشی کی طرف دعوت دیتی ہیں ان میں نہیں ہوتیں نہ ان کے پاس مال و دولت ہوتا ہے کہ جس کے ضائع ہونے کا انھیں ڈر ہو اور نہ ہی مقام و منصب کہ جس کے خطرے میں پڑ جانے پر وہ مضطرب ہوں لہٰذا یہ بات فطری ہے کہ یہ گروہ حضرت موسیٰ کی طرف بہت جلد جذب ہو گیا، اور "ذریة" کی تعبیر اس معنی سے بہت زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

اس کے علاوہ بڑے بوڑھے بھی بعد میں اس گروہ سے ملحق ہو گئے تھے کیونکہ وہ اس وقت کے معاشرے میں کوئی مقام نہیں رکھتے تھے اور ضعیف و ناتواں تھے۔ جیسا کہ ابن عباس سے منقول ہے یہ تعبیر ان کے لیے کوئی بعید نہیں ہے یہ بالکل اس طرح ہے جیسے اپنے تمام دوستوں کو دعوت دیتے ہوئے ہم کہتے ہیں "آگے چلو جوانو! دعوت ہے" اگرچہ وہ بڑے بوڑھے ہوں اور اگر اس تعبیر کو ہم بعید سمجھیں تو پہلا احتمال پوری طرح سے باقی ہے۔

مزید برآں لفظ "ذریة" اگرچہ عام طور پر اولاد کے لیے بولا جاتا ہے لیکن اصل لغت کے اعتبار سے جیسا کہ مفردات میں راغب نے کہا ہے، چھوٹے اور بڑے دونوں کا مفہوم لیے ہوئے ہے۔

ایک اور نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ لفظ "فتنة" کہ جو "ان یفتنهم" میں ہے سے مراد ہے ڈرانے، دھمکانے اور تکلیف پہنچانے کے ذریعہ منحرف کرنا یا ہر طرح سے پریشانی اور درد سر پیدا کرنا چاہے وہ دینی حوالے سے ہو یا غیر دینی حوالے سے۔

بہر حال حضرت موسیٰ نے ان کی فکر اور روح کی تسکین کے لیے محبت آمیز لہجے میں ان سے کہا: اے میری قوم! اگر تم لوگ خدا پر ایمان لائے ہو اور اپنی گفتار میں اور ایمان و اسلام کے اظہار میں سچے ہو تو تمھیں اس پر توکل اور بھروسہ کرنا چاہیے۔ امواج و طوفانِ بلا سے نہ ڈرو۔ کیونکہ ایمان توکل سے جدا نہیں ہے (وقال موسٰی یا قوم ان کنتم اٰمنتم باللّٰه فعلیه توکلوا ان کنتم مسلمین)۔

"توکل" کا مفہوم ہے کام کسی کے سپرد کرنا اور اسے وکالت کے لیے منتخب کرنا۔ "توکل" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان کوشش کرنا چھوڑ دے، گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھے اور کہے کہ میرا سہارا خدا ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے جب انسان کام کے لیے اپنی پوری کوشش کر چکے اور مشکل حل نہ ہو اور راہ سے رکاوٹیں نہ ہٹیں تو پھر اضطراب اور وحشت کو اپنی طرف نہ آنے دے بلکہ لطفِ الٰہی پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کی ذاتِ پاک اور قدرتِ بے پایاں سے مدد چاہتے ہوئے پامردی کا مظاہرہ کرے۔ مسلسل جہاد جاری رکھے یہاں تک کہ اگر اس میں طاقت بھی ہو تو اپنے آپ کو لطفِ خدا سے بے نیاز نہ سمجھے کیونکہ جو طاقت بھی ہے اسی کی طرف سے ہے۔

یہ ہے توکل کا مفہوم کہ جو ایمان و اسلام سے جدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایک مومن کہ جس کا سر فرمانِ پروردگار کے سامنے خم ہے وہ اسے ہر چیز پر قادر و توانا سمجھتا ہے۔ ہر مشکل کو اس کے ارادے کے سامنے سہل اور آسان سمجھتا ہے اور اس کے کامیابی کے وعدوں پر اعتقاد رکھتا ہے۔

ان سچے مومنین نے موسٰی کی دعوت کو توکل کے ساتھ قبول کیا اور کہا کہ ہم صرف خدا پر توکل کرتے ہیں (فقالوا علی اللہ توکلنا)۔

اس کے بعد انھوں نے بارگاہ قدس سے تقاضا کیا کہ وہ انھیں دشمنوں کے شر، دھوکوں اور دباؤ سے امان میں رکھے اور عرض کیا: اے پروردگار ہمیں فتنہ کا ذریعہ اور ظالموں کے زیر اثر قرار نہ دے (ربنا لا تجعلنا فتنة للقوم الظالمین) پروردگا ہمیں اپنی رحمت سے بے ایمان قوم سے نجات دے (ونجنا برحمتك من القوم الكافرين)۔

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ پہلی آیت میں فرعون کو مسرفین میں سے قرار دیا گیا ہے، تیسری آیت میں فرعون اور اس کے حواریوں کو ظالم کہا گیا ہے اور آخری آیت میں انھیں کافر قرار دے دیا گیا ہے۔ تعبیروں کا یہ فرق شاید اس بناء پر ہو کہ انسان گناہ کے راستے میں پہلے اسراف کرتا ہے۔ یعنی حدود سے تجاوز کرتا ہے، پھر ظلم و ستم کی بنیاد رکھتا ہے اور آخر کار معاملہ کفر و انکار پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔

۸۷۔ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰى وَاَخِيۡهِ اَنۡ تَبَوَّاٰ لِقَوۡمِكُمَا بِمِصۡرَ بُيُوۡتًا وَّاجۡعَلُوۡا بُيُوۡتَكُمۡ قِبۡلَةً وَّاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ‌ ؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ○

۸۸ وَقَالَ مُوۡسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيۡتَ فِرۡعَوۡنَ وَمَلَاَهٗ زِيۡنَةً وَّاَمۡوَالًا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِكَ‌ ۚ رَبَّنَا اطۡمِسۡ عَلٰٓى اَمۡوَالِهِمۡ وَاشۡدُدۡ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ فَلَا يُؤۡمِنُوۡا حَتّٰى يَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَ لِيۡمَ ○

۸۹۔ قَالَ قَدۡ اُجِيۡبَتۡ دَّعۡوَتُكُمَا فَاسۡتَقِيۡمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيۡلَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ○

ترجمہ

۸۷۔ اور موسیٰ اور اس کے بھائی کو ہم نے وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے سرزمین مصر میں گھروں کا انتخاب کرو اور اپنے گھروں کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے (اور قریب) رکھو اور نماز قائم کرو اور مومنین کو بشارت دو (کہ آخر کار وہ کامیاب ہو جائیں گے)۔

۸۸۔ موسیٰ نے کہا: پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے اطرافیوں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور (بھرپور) اموال دیئے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ (تیرے بندوں کو) تیری راہ سے گمراہ کرتے ہیں۔ پروردگار! ان کے اموال نابود کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کیونکہ جب تک دردناک عذاب نہ دیکھیں گے ایمان نہ لائیں گے۔

۸۹۔ فرمایا: تم دونوں کی دعا قبول ہو گئی ہے۔ تم استقامت دکھاؤ اور ان لوگوں کے طور طریقے کی پیروی نہ کرو جو نہیں جانتے۔

۳۔ عبادت کی طرف متوجہ ہوں، خصوصاً نماز کی طرف کہ جو انسان کو بندوں کی بندگی سے جدا کرتی ہے اور اس کا تعلق تمام قدرتوں کے خالق سے قائم کر دیتی ہے۔ اس کے دل اور روح کو گناہ کی آلودگی سے پاک کرتی ہے اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کا احساس زندہ کرتی ہے اور قدرتِ پروردگار کا سہارا لے کر انسانی جسم میں ایک تازہ روح پھونک دیتی ہے۔

۴۔ ایک رہبر کے طور پر حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی روحوں میں موجود طویل غلامی اور ذلت کے دور کا خوف و دہشت نکال باہر پھینکیں اور حتمی فتح و نصرت، کامیابی اور پروردگار کے لطف و کرم کی بشارت دے کر مومنین کے ارادے کو مضبوط کریں اور ان میں شہامت و شجاعت کی پرورش کریں۔

یہ امر جاذبِ توجہ ہے کہ بنی اسرائیل حضرت یعقوبؑ کی اولاد میں سے ہیں۔ ظاہراً ان میں سے ایک گروہ حضرت یوسفؑ کی اولاد میں سے ہے اور وہ اور ان کے بھائی سالہا سال تک مصر پر حکومت کرتے رہے ہیں۔ اس طرح اس سرزمین کی آبادی اور تعمیر میں کوشاں رہے ہیں لیکن خدا کی نافرمانی، غفلت اور داخلی اختلاف کی وجہ سے ان کی زندگی اس رقت بار قابلِ رحم کیفیت تک پہنچ گئی تھی ضروری تھا کہ اس مصیبت زدہ فرسودہ معاشرے کی تعمیرِ نو ہو ان کے منفی پہلوؤں کی اصلاح ہو اور ان کی بجائے ان میں تعمیری اور اصلاحی، روحانی خصائل پیدا ہوں تا کہ ان کی عظمتِ رفتہ پلٹ آئے۔

اس کے بعد فرعون اور فرعونیوں کی سرکشی کے ایک سبب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت موسیٰؑ کی زبانی فرمایا گیا ہے:
پروردگارا! تو نے فرعون اور اس کے حواریوں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور مال بخشا ہے (وقال موسٰی ربنا انک اٰتیت فرعون وملاٴہ زینة واموالاً فی الحیوٰة الدنیا) لیکن اس ثروت و زینت کا انجام یہ ہوا کہ وہ تیرے بندوں کو تیری راہ سے منحرف اور گمراہ کرتے ہیں (ربنا لیضلوا عن سبیلک)۔
"لیضلوا" میں لام اصطلاح کے مطابق لامِ عاقبت ہے یعنی اشراف کی دولت مند تجمل پرست قوم لوگوں کو راہِ خدا سے گمراہ کرنے کی خواہ مخواہ کوشش کرے گی اور اس سے آخر کار اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔ کیونکہ انبیاء کی دعوت اور خدائی پروگرام لوگوں کو بیدار، ہوشیار، متحد اور مجتمع کر دیں گے ان حالات میں غارتگروں اور لٹیروں کے لیے حلقہ تنگ ہو جائیگا اور ان کیلیے زندگی میلہ ہو جائے گی وہ رد عمل کا مظاہرہ کریں گے اور انبیاء کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوں گے۔
اس کے بعد حضرت موسیٰؑ درگاہِ الٰہی میں تقاضا کرتے ہوئے کہتے ہیں: پروردگار! ان کے اموال کو محو اور بے اثر کر دے تا کہ وہ اس سے بہرہ ور نہ ہو سکیں (ربنا اطمس علی اموالھم)۔
لغت میں "طمس" کسی چیز کو محو اور بے اثر کرنے کے معنی میں ہے۔
یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ اس نفرین اور بد دعا کے بعد فرعونیوں کا مال پتھر اور راکھ میں تبدیل ہو گیا۔ شاید یہ اس امر کی طرف اشارہ ہو کہ وہ اس طرح سے اقتصادی بحران کا شکار ہوئے کہ ان کی ثروت بے وقعت ہو گئی اور راکھ کی طرح بے قیمت ہو گئی۔

تفسیر

چوتھا مرحلہ ــــ انقلاب کی تیاری

ان آیات میں فرعونوں کے خلاف بنی اسرائیل کے قیام اور انقلاب کا ایک اور مرحلہ بیان کیا گیا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ خدا فرماتا ہے: ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ سرزمین مصر میں اپنی قوم کے لیے گھروں کا انتخاب کرو (واوحینا الی موسٰی واخیہ ان تبوّا لقومکما بمصر بیوتا) اور خصوصیت کے ساتھ "ان گھروں کو ایک دوسرے کے قریب اور آمنے سامنے بناؤ" (واجعلوا بیوتکم قبلۃ)۔ پھر روحانی طور پر اپنی خودسازی اور اصلاح کرو" اور نماز قائم کرو" اس طرح سے اپنے نفس کو پاک اور قوی کرو (واقیموا الصلٰوۃ)۔

اور اس لیے کہ خوف اور دہشت کے آثار ان کے دل سے نکل جائیں اور وہ روحانی وانقلابی قوت پالیں "مومنین کو بشارت دو" کامیابی اور خدا کے لطف ورحمت کی بشارت (وبشر المؤمنین)۔

ان آیات کے مجموعی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بنی اسرائیل منتشر، شکست خوردہ، وابستہ، طفیلی، آلودہ اور خوف زدہ گروہ کی شکل میں تھے، نہ ان کے پاس گھر تھے نہ کوئی مرکز تھا۔ نہ ان کے پاس معنوی اصلاح کا کوئی پروگرام تھا اور نہ ہی ان میں اس قدر شجاعت، عزم اور حوصلہ تھا جو شکست دینے والے انقلاب کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو حکم ملا کہ وہ بنی اسرائیل کی مرکزیت کے لیے خصوصاً روحانی حوالے سے، چند امور پر مشتمل پروگرام شروع کریں۔

۱۔ مکان تعمیر کریں اور اپنے مکانات فرعونیوں سے الگ بنائیں۔ اس میں متعدد فائدے تھے۔

ایک یہ کہ سرزمین مصر میں ان کے مکانات ہوں گے تو وہ اس کا دفاع زیادہ لگاؤ سے کریں گے۔

دوسرا یہ کہ قبطیوں کے گھروں میں طفیلی زندگی گزارنے کی بجائے وہ اپنی ایک مستقل زندگی شروع کرسکیں گے۔

تیسرا یہ کہ ان کے حالات اور تدابیر کے راز دشمنوں کے ہاتھ نہیں لگیں گے۔

۲۔ اپنے گھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے اور قریب قریب بنائیں کیونکہ دراصل "قبلہ" "حالت تقابل" کے معنی میں ہے۔ آجکل لفظ "قبلہ" کا جو معنی مشہور ہے وہ اس کا ثانوی معنی ہے[1] بنی اسرائیل کی مرکزیت کے لیے یہ ایک موثر کام تھا اس طرح سے وہ اجتماعی مسائل پر مل کر غور و فکر کرسکتے تھے اور مراسم مذہبی کے حوالے سے جمع ہو کر اپنی آزادی کے لیے ضروری پروگرام بنا سکتے تھے۔

---

[1] البتہ بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیت میں "قبلہ" کو آمنے سامنے کے معنی میں نہیں لیا بلکہ اسی قبلہ نماز کے معنی میں لیا ہے اور "واقیموا الصلٰوۃ" کے جملے کو اس کا قرینہ سمجھا ہے لیکن پہلا معنی اس لفظ کے اصلی لغوی معنی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں دونوں معانی مراد لینے میں بھی کوئی اشکال نہیں اور اس کی بہت سی نظیریں موجود ہیں۔

حضرت موسیٰ مزید عرض کرتے ہیں: پروردگار! اس کے علاوہ ان سے غور و فکر کی، سوچنے سمجھنے کی قدرت بھی لے لے (واشدد علی قلوبھم) کیونکہ یہ دوسرا نئے گناہ کر کے زوال اور تباہی کے قریب پہنچ جائیں گے۔ اس طرح انقلاب کیطرف ایمان پر آخری ضرب لگانے کے لیے راستہ کھل جائے گا۔ خداوندا! یہ جو میں فرعونیوں کے بارے میں ایسی خواہش رکھتا ہوں تو یہ جذبۂ انتقام اور کینے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس بنا پر ہے کہ اب ان میں ایمان کے لیے کسی قسم کی کوئی آمادگی نہیں ہے، جب تک تیرا دردناک عذاب نہ پہنچ جائے وہ ایمان نہیں لائیں گے (فلا یؤمنوا حتی یروا العذاب الالیم)۔

البتہ واضح ہے کہ عذاب کو دیکھ کر ایمان لانا ان کے لیے فائدہ مند نہیں ہوگا جیسا کہ عنقریب آئے گا۔

خدا نے حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی سے کہا کہ اب جبکہ تم بنی اسرائیل کی تربیت اور اصلاح کے لیے تیار ہو گئے ہو تمہارے دشمنوں کے بارے میں تمہاری دعا قبول ہوئی (قال قد اجیبت دعوتکما)۔ پس مضبوطی سے اپنی راہ پر کھڑے ہو جاؤ اور استقامت و پامردی دکھاؤ، کثرت مشکلات سے نہ ڈرو اور اپنے کام کے بارے میں حتمی فیصلہ کرو (فاستقیما)۔ اور نادان اور بے خبر افراد کی تجاویز کے سامنے ہرگز سر تسلیم خم نہ کرو اور جاہلوں کے راستے پہ نہ چلو بلکہ مکمل آگاہی کے ساتھ اپنے انقلابی پروگرام کو جاری رکھو (ولا تتبعان سبیل الذین لا یعلمون)۔

۹۰۔ وَجَاوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰٓی اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ○

۹۱۔ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ○

۹۲۔ فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً ؕ وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ○ع

۹۳۔ وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰی جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ○

ترجمہ

۹۰۔ ہم نے بنی اسرائیل کو (نیل کے عظیم) دریا سے گزارا اور فرعون اور اس کا لشکر ظلم و تجاوز کرتے ہوئے ان کے پیچھے گیا۔ جب وہ غرقاب ہونے لگا تو اس نے کہا کہ میں ایمان لایا کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلمین میں سے ہوں۔

۹۱۔ (لیکن اسے کہا گیا) اب؟ حالانکہ پہلے تو نے نافرمانی کی اور تو مفسدین میں سے تھا۔

۹۲۔ لیکن آج ہم تیرے بدن کو (پانی سے) بچالیں گے تاکہ تو آنے والوں کے لیے عبرت بن جائے اور بہت سے لوگ ہماری آیات سے غافل ہیں۔

۹۳۔ ہم نے بنی اسرائیل کو صدق (اور سچائی) کی منزل میں جگہ دی اور انھیں پاکیزہ رزق میں سے عطا کیا (لیکن وہ نزاع و اختلاف میں پڑ گئے) اور انھوں نے اختلاف نہ کیا مگر اس کے بعد کہ علم و آگہی حاصل کر چکے تھے۔ تیرا پروردگار قیامت کے روز اس چیز کا فیصلہ کرے گا جس کے بارے میں وہ اختلاف کرتے تھے۔

تفسیر

ظالموں سے مقابلے کا آخری مرحلہ

ان آیات میں فرعونیوں سے بنی اسرائیل کے مقابلے کے آخری مرحلے کی منظر کشی کی گئی ہے۔ فرعونیوں کے انجام کی مختصر لیکن دقیق اور واضح عبارتوں کے ذریعے تصویر پیش کی گئی ہے اور ان میں قرآن نے اپنی روش کے مطابق اضافی مطالب ترک کر دیئے ہیں جنھیں پہلے اور بعد کے جملوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جبکہ بنی اسرائیل دباؤ میں تھے اور فرعونی ان کا تعاقب کر رہے تھے ہم نے انھیں دریا پار کروا دیا (وجاوزنا ببنی اسرائیل البحر) دریائے نیل اتنا بڑا تھا کہ اس کے لیے لفظ "بحر" استعمال کیا گیا ہے۔ جس کا معنی "سمندر" ہے۔

فرعون اور اس کا لشکر بنی اسرائیل کی سرکوبی کے لیے اور ان پر ظلم و تجاوز کرتے ہوئے ان کے تعاقب میں آیا لیکن جلد ہی وہ سب کے سب نیل کی موجوں میں غرق ہو گئے (فاتبعھم فرعون وجنودہ بغیا وعدوا)۔

"بغی" کا معنی ہے "ظلم و ستم" اور "عدو" کا مطلب ہے "تجاوز" یعنی انھوں نے ظلم اور تجاوز کرتے ہوئے بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔

لفظ "فاتبعھم" نشاندہی کرتا ہے کہ فرعون اور اس کے لشکر نے اپنے اختیار اور ارادے سے بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔ بعض روایات بھی اس معنی کی تاکید کرتی ہیں۔ بعض دوسری روایات اس سے زیادہ مناسبت نہیں رکھتیں بہرحال جو کچھ ظاہر آیت سے معلوم ہوتا ہے وہی ہمارے لیے مدرک ہے باقی رہا یہ کہ بنی اسرائیل دریا سے کیسے گزرے اور اس موقع پر کون سا معجزہ وقوع پذیر ہوا اس کی تفصیل انشاء اللہ سورۂ شعراء کی آیہ ۶۳ کے ذیل میں آئے گی۔

بہرکیف یہ معاملہ چل رہا تھا" یہاں تک کہ فرعون غرقاب ہونے لگا اور وہ عظیم دریائے نیل کی موجوں میں تنکے کی طرح غوطے کھانے لگا تو اس وقت غرور و تکبر اور جہالت و بے خبری کے پردے اس کی آنکھوں سے ہٹ گئے اور فطری نور توحید چمکنے لگا۔ وہ پکار اٹھا: "میں ایمان لے آیا کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں" (حتّٰی اذا ادرکه الغرق قال اٰمنت انه لا اله الا الذی اٰمنت به بنوا اسرائیل) کہنے لگا کہ نہ صرف میں اپنے دل سے ایمان لایا ہوں بلکہ عملی طور پر بھی ایسے توانا پروردگار کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں (وانا من المسلمین)۔

درحقیقت جب حضرت موسیٰ کی پیشین گوئیاں یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہوئیں اور فرعون اس عظیم پیغمبر کی گفتگو کی صداقت سے آگاہ ہوا اور اس کی قدرت نمائی کا مشاہدہ کیا تو اس نے مجبوراً اظہار ایمان کیا، اسے امید تھی کہ جیسے "بنی اسرائیل کے خدا" نے انھیں کوہ پیکر موجوں سے نجات بخشی ہے اسے بھی نجات دے گا۔ لہٰذا وہ کہنے لگا میں اسی بنی اسرائیل کے خدا پر ایمان لایا ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسا ایمان جو نزول بلا اور موت کے چنگل میں گرفتار ہونے کے وقت ظاہر کیا جائے درحقیقت ایک قسم کا اضطراری ایمان ہے

جس کا اظہار سب مجرم اور گنہگار کرتے ہیں ایسے ایمان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی اور نہ یہ حسنِ نیت اور صدقِ گفتار کی دلیل ہو سکتا ہے۔

اسی بناء پر خدا تعالیٰ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے: اب تو ایمان لایا ہے؟ حالانکہ اس سے پہلے تو نافرمانی اور طغیان کرنے والوں، مفسدین فی الارض اور تباہ کاروں کی صف میں موجود تھا (اٰلْاٰنَ وقد عصیت قبل و کنت من المفسدین)۔

پہلے بھی ہم نے سورہ نساء کی آیہ ۱۸ میں پڑھا ہے۔

ولیست التوبة للذین یعملون السیئات حتیٰ اذا حضر احدھم الموت قال انی تبت الاٰن۔

ان کی کوئی توبہ نہیں جو برے کام کرتے ہیں اور جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچے تو کہنے لگے کہ اب میری توبہ ہے۔

اسی بناء پر بہت مرتبہ دیکھا گیا ہے کہ اگر مصیبت کا وقت ٹل جائے اور وہ موت کے چنگل سے نجات پا لیں تو دوبارہ پہلے سے کاموں کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔

اس تعبیر کی نظیر کہ جو ہم نے سطور بالا میں پڑھی ہے عرب عجم کے ادباء کے کلام اور گفتگو میں بھی آئی ہے۔ مثلاً:

اتت وحیاض الموت بینی و بینھا
وجادت بوصل حین لا ینفع الوصل

وہ میری طرف آئی جبکہ میرے اور اس کے درمیان موت موجزن تھی وہ آمادۂ وصال تھی جبکہ وصال کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

لیکن آج ہم تیرے بدن کو موجوں سے بچالیں گے تاکہ تو آنے والوں کے لیے درسِ عبرت ہو اور سرا تمام مستکبرین کے لیے، تمام ظالموں اور مفسدوں کے لیے اور مستضعف گروہوں کے لیے بھی (فالیوم ننجیک ببدنک لتکون لمن خلفک اٰیة)۔

یہ کہ "بدن" سے مراد یہاں کیا ہے ——— اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے ان میں سے اکثر کا نظریہ ہے کہ اس سے مراد فرعون کا بے جان جسم ہے کیونکہ اس ماحول کے لوگوں کے ذہن میں فرعون کی اس قدر عظمت تھی کہ اگر اس کے بدن کو پانی سے باہر نہ اچھالا جاتا تو بہت سے لوگ یقین ہی نہ کرسکتے کہ اس کا غرق ہونا بھی ممکن ہے اور ہو سکتا تھا کہ اس ماجرے کے بعد فرعون کی زندگی کے بارے میں افسانے تراش لیے جاتے۔

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ لغت میں لفظ "بدن" جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے "جسدِ عظیم" کے معنی میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے خوشحال لوگوں کی طرح کہ جنکی بڑی زرق برق افسانوی زندگی تھی حالانکہ سخت اور ہلکے پھلکے بدن تھے مگر بعض دوسرے افراد نے کہا ہے کہ "بدن" کا ایک معنی "زرہ" بھی ہے یہاں اس طرف اشارہ ہے کہ خدا نے فرعون کو اس کی زرہ سمیت پانی سے باہر نکالا جو اس کے بدن پر تھی تاکہ اس کے ذریعے پہچانا جائے اور کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہے۔

یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ بعض نے "ننجیک" سے اس طرح استفادہ کیا ہے کہ خدا نے حکم دیا کہ موجیں اس کے بدن کو ساحل کی ایک اونچی جگہ پر پھینک دیں کیونکہ "نجوۃ" کا مادہ مرتفع اور بلند جگہ کے معنی میں ہے۔

دوسرا نکتہ جو آیت میں نظر آتا ہے یہ ہے کہ "فالیوم ننجیک" کا آغاز فاء تفریع کے ساتھ ہوا ہے ممکن ہے یہ اس طرف اشارہ ہو کہ ناامیدی کے عالم میں اور موت کے چنگل میں گرفتاری کے وقت فرعون کے بے روح ایمان نے جو جسم بے جان کی طرح تھا یہ اثر کیا کہ خدا نے فرعون کے بے جان جسم کو پانی سے نجات دی تاکہ وہ دریا کی مچھلیوں کی غذا نہ بنے اور آنے والے لوگوں کے لیے عبرت کا باعث بھی ہو۔

اب بھی مصر اور برطانیہ کے عجائب گھروں میں فرعونوں کے مومیائے ہوئے بدن موجود ہیں۔ کیا ان میں حضرت موسیٰ کے ہم عصر فرعون کا بدن بھی ہے کہ جسے بعد میں حفاظت کے لیے مومیایا گیا ہو یا نہیں۔ اس سلسلے میں کوئی صریح دلیل ہمارے پاس نہیں ہے لیکن "لمن خلفک" کی تعبیر ہو سکتا ہے اس احتمال کو تقویت دے کہ اس فرعون کا بدن بھی ان میں ہو تاکہ آنے والوں کیلیے باعث عبرت ہو کیونکہ آیت کی تعبیر مطلق ہے اور اس میں تمام آنے والے شامل ہیں (غور کیجیے گا)۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: لیکن خدا کی ان تمام آیات، نشانیوں اور عبرت انگیز درسوں کے ہوتے ہوئے کہ جن سے تاریخ انسانی بھری پڑی ہے بہت سے لوگ ہماری آیات اور نشانیوں سے غافل ہیں (وان کثیرا من الناس عن اٰیاتنا لغافلون)۔

زیر بحث آخری آیت میں بنی اسرائیل کی آخری کامیابی اور فرعونیوں کے چنگل سے نجات پانے کے بعد ان کی مقدس سرزمین کی طرف واپسی کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے بنی اسرائیل کو صدق اور سچائی کے مقام پر جگہ دی (ولقد بوأنا بنی اسرائیل مبوأ صدق)۔

"مبوأ صدق" (سچی منزل) ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ خدا نے بنی اسرائیل سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دیا اور انہیں اس سرزمین میں پہنچا دیا جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ "صدق" اس سرزمین کی پاکی اور نیکی کی طرف اشارہ ہو جس طرح یہ بات شام اور فلسطین کی سرزمین سے مناسبت رکھتی ہے جو کہ انبیاء خدا کی جائے سکونت ہے۔

ایک گروہ نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد سرزمین مصر ہے کیونکہ قرآن جیسے سورۂ دخان میں کہتا ہے:

کم ترکوا من جنات وعیون وزروع ومقام کریم ونعمة کانوا فیها فاکهین کذلک واورثناها قوما اخرین۔

فرعونیوں کی نابودی کے بعد باغ، چشمے، زمینیں، محلات اور ان کی جو نعمتیں رہ گئی تھیں ہم نے دوسرے گروہ (یعنی بنی اسرائیل) کو دے دیں۔ (دخان ۲۵ - ۲۸)

یہی مضمون سورۂ شعراء کی آیہ ۵۷ سے ۵۹ تک آیا ہے اور اس کے آخر میں ہے:

واورثناها بنی اسرائیل۔

ہم نے یہ باغ، چشمے، خزانے اور محل بنی اسرائیل کو دے دیئے۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل سرزمین شام کی طرف ہجرت سے پہلے کچھ مدت مصر میں بھی رہے اور اس زرخیز سرزمین کی برکات سے بھی بہرہ مند ہوئے تھے البتہ کوئی مانع نہیں کہ سرزمین مصر، شام اور فلسطین سب مراد ہوں۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: ہم نے انھیں پاکیزہ رزق سے بہرہ مند کیا (ورزقناھم من الطیبات) لیکن انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی اور ایک دوسرے سے اختلاف اور نزاع میں پڑ گئے۔ وہ بھی لاعلمی کی وجہ سے نہیں بلکہ جانتے بوجھتے ہوئے اور حضرت موسیٰ کے ان معجزات اور ان کی صداقت کے دلائل کا مشاہدہ کرنے کے باوجود (فما اختلفوا حتی جاءھم العلم)۔

لیکن "تیرا پروردگار آخرکار روز قیامت ان میں اس چیز کے بارے میں فیصلہ کرے گا" اور اگر آج وہ اختلاف کی سزا نہ پائیں تو کل اس کا موقع ملیں گے (ان ربک یقضی بینھم یوم القیامۃ فیما کانوا فیہ یختلفون)۔

مندرجہ بالا آیت کے بارے میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اختلاف سے مراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم عصر یہودیوں کا اختلاف ہے کہ جو آنحضرتؐ کی دعوت قبول کرنے کے بارے میں ان میں موجود تھا یعنی اگرچہ انھوں نے اپنی آسمانی کتب کی نشانیوں کے مطابق آپؐ کی صداقت جان لی تھی پھر بھی اختلاف کیا۔ تھوڑے سے لوگ ایمان لائے اور زیادہ تر نے آپؐ کی دعوت قبول کرنے سے روگردانی کی اور خدا قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔

پہلا احتمال ظاہر آیت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

یہ تھا بنی اسرائیل کی عبرت انگیز سرگزشت کا ایک حصہ جو اس سورہ کی کئی آیات میں بیان ہوا ہے ان کی حالت آج مسلمانوں سے کس قدر مشابہت رکھتی ہے۔ خدا اپنے فضل و کرم سے مسلمانوں کو کامیابیاں عطا کرتا ہے اور ان کے طاقتور دشمن کو بُری طرح شکست دیتا ہے اور اس مستضعف اور پس ماندہ قوم کو اپنے فضل و رحمت سے فتح دیتا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کامیابی کو دین اسلام کی عالمگیر فتح کے حصول کا ذریعہ بنانے کی بجائے تفرقہ، نفاق اور اختلاف کا ذریعہ بنا لیتے ہیں اس طرح ان کی ساری کامیابیاں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ خدا تعالیٰ ہمیں اس کفران نعمت سے نجات بخشے۔

۹۴۔ فَاِنۡ كُنۡتَ فِیۡ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكَ فَسۡـَٔلِ الَّذِیۡنَ یَقۡرَءُوۡنَ الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكَ‌ۚ لَقَدۡ جَآءَكَ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ۙ‏

۹۵۔ وَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الَّذِیۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوۡنَ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ‏

۹۶۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ حَقَّتۡ عَلَیۡهِمۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۙ‏

۹۷۔ وَلَوۡ جَآءَتۡهُمۡ كُلُّ اٰیَةٍ حَتّٰی یَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَلِیۡمَ‏

ترجمہ

۹۴۔ جو کچھ ہم نے تجھ پر نازل کیا ہے اگر اس میں تجھے شک و شبہ ہے تو ان سے جو تجھ سے پہلے آسمانی کتب پڑھتے ہیں سوال کرو (جان لو) قطعی طور پر "حق" تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ تک پہنچا ہے لہذا شک کرنے والوں میں سے ہرگز نہ ہوجا (البتہ وہ اس میں ہرگز شک نہیں کرتا جسے وہ شہود کے ذریعے جانتا ہے، یہ لوگوں کے لیے ایک درس تھا)۔

۹۵۔ اور ان میں سے نہ ہوجا جنھوں نے آیاتِ خدا کی تکذیب کی ہے ورنہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوجائے گا۔

۹۶۔ (اور جان لو کہ) جن پر حکم خدا ثابت ہوچکا ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

۹۷۔ اگرچہ (اللہ کی) تمام آیات (اور اس کی نشانیاں) ان تک پہنچ جائیں، یہاں تک کہ وہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں (کیونکہ ان کے دلوں پر گناہ کی تاریکی چھائی ہوئی ہے اور روشنی ان تک پہنچنے کے لیے ان کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے)۔

تفسیر

شک کو اپنے قریب نہ آنے دو

گذشتہ آیات میں چونکہ انبیاء اور گزشتہ اقوام کی سرگذشت کے کچھ حصے بیان کیے گئے ہیں لہٰذا ممکن تھا کہ بعض مشرکین اور دعوتِ پیغمبر کے منکران کی صداقت میں شک کرتے۔ قرآن ان سے چاہتا ہے کہ ان کہی ہوئی باتوں کی صداقت سمجھنے کے لیے اہل کتاب کی طرف رجوع کریں اور ان کے بارے میں ان سے معلوم کریں کیونکہ ان کی کُتب میں اس قسم کے بہت سے مسائل آئے ہیں لیکن مخالفین کی طرف روئے سخن کرنے کی بجائے پیغمبرؐ کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے اگر تجھے اس کے بارے میں شک و تردد ہے تو ان سے جو تجھ سے پہلے آسمانی کتب میں پڑھتے ہیں پوچھ لے (فان کنت فی شك مما انزلنا الیك فاسئل الذین یقرؤن الکتاب من قبلك) تاکہ اس طرح سے یہ ثابت ہو جائے کہ "جو کچھ ہم نے تجھ پر نازل کیا ہے وہ تیرے پروردگار کی طرف سے حق ہے (لقد جاءك الحق من ربك) لہٰذا کسی قسم کے شک و شبہ کو ہرگز اپنے قریب نہ آنے دے (فلا تکونن من الممترین)۔

یہ احتمال بھی ہے کہ مندرجہ بالا آیت دعوتِ پیغمبر کی صداقت کے بارے میں ایک نئی اور مستقل بحث شروع کر رہی ہو اور مخالفین سے کہتی ہو کہ اگر اس کی حقانیت کے بارے میں انہیں کوئی شک اور تردد ہے تو اس کی نشانیاں جو گزشتہ کتب مثلاً تورات اور انجیل میں ہیں اہل کتاب سے پوچھ لیں۔

ایک شانِ نزول جو بعض کتبِ تفسیر[1] میں نقل ہوئی ہے وہ بھی اس معنی کی تائید کرتی ہے۔ اور وہ یہ ہے:

کفار قریش کا ایک گروہ کہتا تھا کہ یہ قرآن خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوا بلکہ (معاذ اللہ) محمد پر شیطان القاء کرتا ہے۔ ان کی اس گفتگو کی وجہ سے بعض لوگ شک و تردد کا شکار ہو گئے اس آیت کے ذریعے اللہ نے انہیں جواب دیا۔

کیا رسول اللہ کو شک تھا؟

ہو سکتا ہے کہ ابتدائی نظر میں یوں لگے کہ آیت کہہ رہی ہے کہ پیغمبر خدا ان آیات کی حقانیت کے بارے میں شک رکھتے تھے کہ جو ان پر نازل ہوتی تھیں اور خدا نے اس طریقے سے ان کا شک و شبہ دور کر دیا۔

لیکن اس طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ پیغمبر خدا نے تو وحی کو شہود اور مشاہدے سے پایا تھا۔ جیسا کہ آیاتِ قرآنی اس بات کی حکایت کرتی ہیں لہٰذا اس صورت میں شک اور تردد کا کوئی مفہوم ہی نہیں۔ علاوہ ازیں یہ بات واضح ہے کہ دوسرے لوگوں کو تنبیہ کرنے کیلیے

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی ج ۶ ص ۲۲۰، مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

نزدیک کے افراد کو مخاطب کیا جاتا ہے ۔ جیسے عربوں میں مثل مشہور ہے :

ایاك اعنی واسمعی یا جارۃ

تجھے کہہ رہا ہوں لیکن اے پڑوسن تو بھی سن لے ۔

اس کی نظیر فارسی میں بھی ہے ایسی گفتگو بہت سے مواقع پر صریح خطاب سے زیادہ موثر ہوتی ہے ۔ مزید براں جملہ شرطیہ ہمیشہ احتمالِ وجودِ شرط کی دلیل نہیں ہے ۔ بلکہ بعض اوقات ایک بات کی تاکید کے لیے یا ایک عمومی قانون بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے ۔ مثلاً سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۲۳ میں ہے :

وقضیٰ ربك الا تعبدوا الا ایاہ و بالوالدین احسانًا واما یبلغن عندك الکبر احدھما او کلاھما فلا تقل لھما اف ۔

تمہارے پروردگار نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو ۔ جب ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے کبھی تھوڑی سی بھی دکھ دینے والی اور ناراحت کرنے والی بات نہ کہو ۔

توجہ رہے کہ اس جملے میں ظاہراً مخاطب صرف رسول اللہؐ ہیں جبکہ ہم جانتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے والد تو ان کی ولادت سے قبل ہی وفات پا چکے تھے ابھی آپ بچپن ہی میں تھے کہ والدہ بھی چل بسیں تو اس حالت میں ماں باپ کے احترام کا حکم ایک عمومی قانون کے طور پر بیان ہوا ہے اگرچہ ظاہراً مخاطب پیغمبر خدا ہی ہوں ۔

نیز سورہ طلاق میں ہے :

یا ایھا النبی اذا طلقتم النساء

اے پیغمبر ! جس وقت تم لوگ عورتوں کو طلاق دو ۔

یہ تعبیر اس امر پر دلیل نہیں کہ پیغمبر خدا نے اپنی زندگی میں کسی بیوی کو طلاق دی ہے بلکہ یہاں بھی ایک عمومی قانون بیان کیا گیا ہے ۔ یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ اس جملے کی ابتداء میں رسول اللہؐ مخاطب ہیں اور جملے کے آخر میں سب لوگ مخاطب ہیں ۔

بہت سے قرائن جو تائید کرتے ہیں کہ آیت میں اصلی مقصود مشرکین اور کفار ہیں ان میں سے ایک اس آیت کے بعد کی آیات ہیں جو ان کے کفر اور بے ایمانی کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اس کی نظیر حضرت عیسیٰؑ سے مربوط آیات میں دکھائی دیتی ہیں کہ جس وقت خدا اس سے قیامت کے دن پوچھے گا کہ کیا تو نے لوگوں کو اپنی اور اپنی ماں کی عبادت کی دعوت دی تھی وہ صراحت سے اس کا انکار کرتے ہیں اور مزید کہتے ہیں :

ان کنت قلتہ فقد علمتہ ۔

اگر میں نے یہ بات کی ہوتی تو تیرے علم میں ہوتا ۔ (مائدہ - ۱۱۶)

بعد والی آیت میں مزید ارشاد ہوتا ہے : اب جبکہ آیاتِ پروردگار اور اس دعوت کی حقانیت تجھ پر واضح ہو چکی ہے تو ان

لوگوں کی صف میں کھڑا نہ ہو جنھوں نے آیاتِ الٰہی کی تکذیب کی ہے ورنہ زیاں کاروں میں سے ہو جائیگا (و لاتکونن من الذین کذبوا بآیات اللہ فتکون من الخاسرین)۔

درحقیقت قرآن پہلی آیت میں کہتا ہے کہ اگر شک و تردد رکھتے ہو تو ان سے پوچھو جو آگاہی اور علم رکھتے ہیں اور اس آیت میں کہتا ہے کہ اب جبکہ تردد کے عوامل برطرف ہو چکے ہیں تو ان آیات کے سامنے تجھے سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے ورنہ حق کی مخالفت کا نتیجہ خسارے اور نقصان کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔

یہ آیت اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ گزشتہ آیت میں حقیقی مقصود عام لوگ تھے اگرچہ روئے سخن پیغمبرِ خدا کی طرف تھا کیونکہ واضح ہے کہ پیغمبر ہرگز آیاتِ الٰہی کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ وہ تو سختی سے اپنے دین کی حمایت اور دفاع کرتے ہیں۔

اس کے بعد رسول اللہؐ کو بتایا گیا کہ تیرے مخالفین میں متعصب اور ہٹ دھرم لوگ موجود ہیں جن کے ایمان لانے کی توقع عبث ہے۔ وہ فکری لحاظ سے اسقدر مسخ ہو چکے ہیں اور وہ باطل راستے پر اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ ان کا بیدار انسانی وجدان کھو چکا ہے اور وہ ناقابلِ اثر وجود میں تبدیل ہو چکے ہیں البتہ قرآن اس بات کو یوں بیان کرتا ہے: وہ لوگ کہ جن پر تیرے پروردگار کا فرمان ثابت ہو چکا ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے (ان الذین حقت علیھم کلمۃ ربک لایؤمنون)۔

یہاں تک کہ اگر خدا کی تمام آیات اور نشانیاں ان کے پاس آجائیں وہ تب بھی ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ وہ خدا کے دردناک عذاب کو اپنی آنکھ سے دیکھ نہ لیں۔ جبکہ اس وقت کے ایمان کا انھیں کوئی فائدہ نہیں (و لو جاءتھم کل آیۃ حتیٰ یروا العذاب الالیم)۔

درحقیقت زیرِ بحث پہلی آیت تمام لوگوں کو مطالعہ، تحقیق اور باخبر لوگوں سے سوال کرنے کی دعوت دیتی ہے اور پھر تقاضا کرتی ہے کہ حق واضح ہو جانے پر اس کی حمایت اور دفاع کے لیے کھڑے ہو جائیں لیکن آخری آیات میں فرمایا گیا ہے کہ تمھیں سب کے ایمان لانے کی توقع نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ کچھ لوگ تو اس قدر فاسد ہو چکے ہیں کہ اب وہ اصلاح کے قابل نہیں رہے لہٰذا نہ تو ان کے ایمان نہ لانے پر دل سرد ہو اور نہ ہی ان کی ہدایت کے لیے صرف ہونے والی توانائی کو رائیگاں سمجھ بلکہ ان لوگوں کی طرف توجہ دے جو زیادہ تعداد میں ہیں اور قابلِ ہدایت ہیں۔

جیسا کہ ہم بارہا تکرار کر چکے ہیں کہ ایسی آیات ہرگز کسی "جبر" پر دلالت نہیں کرتیں بلکہ یہ تو عملِ انسانی کے آثار بیان کیے گئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ چونکہ ہر چیز کا اثر حکمِ خدا سے ہے اس لیے بعض اوقات ان امور کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قبل کی چند آیات میں ہم نے فرعون کے بارے میں پڑھا ہے کہ اس نے نزولِ عذاب اور طوفان میں پھنسنے کے بعد اظہارِ ایمان کیا لیکن ایسا ایمان چونکہ اضطراری پہلو رکھتا ہے اس لیے اسے اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا لیکن زیرِ بحث آیات میں فرمایا گیا ہے، یہ صرف فرعون کا طریقہ نہ تھا بلکہ تمام ہٹ دھرم، خود دار، ستمگر اور سیاہ دل افراد کہ جو طغیان و سرکشی کی آخری منزل پر پہنچے ہوئے ہیں ان کی بھی یہی حالت ہے وہ بھی دردناک عذاب کو دیکھے بغیر ایمان نہیں لاتے۔ وہی ایمان جو ان کیلئے بالکل بے اثر ہے۔

۹۸- فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَؕ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ○

ترجمہ

۹۸- تمام آبادیاں اور شہر کیوں ایمان نہیں لائے کہ (جن کا ایمان برمحل ہو اور) ان کی حالت کے لیے مفید ہو، مگر یونس کی قوم کہ جب وہ ایمان لائی تو ان کی زندگی سے ہم نے رسوا کن دنیاوی عذاب برطرف کر دیا اور ہم نے مدت معین (زندگی کے اختتام اور ان کی اجل) تک انھیں بہرہ مند کیا۔

تفسیر

صرف ایک گروہ برمحل ایمان لایا

گزشتہ آیات میں فرعون اور فرعونیوں کے متعلق خصوصاً اور دوسری اقوام کے متعلق عموماً یہ نکتہ بیان ہوا ہے کہ انھوں نے اختیار اور سلامتی کے عالم میں خدا پر ایمان لانے سے اعراض کیا لیکن جب موت اور خدا کی سزا نے انھیں آلیا تو انھوں نے اظہار ایمان کیا کہ جو ان کے لیے سودمند نہیں ہوا۔ زیر نظر آیت میں یہ بات ایک عمومی قانون کے طور پر بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: گزشتہ قومیں برمحل اور برموقع ایمان کیوں نہیں لائیں کہ ان کا ایمان ان کے لیے فائدہ مند ہوتا (فلولا کانت قریة اٰمنت فنفعها ایمانها)۔

اس کے بعد حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کو مستثنیٰ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: سوائے یونس کی قوم کے کہ جب وہ ایمان لائے تو ان کی زندگی سے ہم نے رسوا کن دنیاوی عذاب برطرف کر دیا (الا قوم یونس لما اٰمنوا کشفنا عنهم عذاب الخزی فی الحیٰوة الدنیا)۔ اور انھیں معین مدت (ان کی زندگی کے اختتام) تک ہم نے بہرہ مند کیا (ومتعناهم الیٰ حین)۔

لفظ "لولا" بعض مفسرین کے مطابق یہاں نفی کے معنی میں ہے لہٰذا "الا" کے ذریعے اس سے استثناء ہوا ہے۔ اس بنا پر جملے کا معنی اس طرح ہوگا: کوئی قوم و ملت جو گزشتہ زمانے میں شہروں اور آبادیوں میں زندگی بسر کرتی تھی اکٹھے مل کر خدائی پیغمبر پر ایمان نہیں لائی سوائے قوم یونس کے۔

بعض دوسرے مفسرین کا نظریہ ہے کہ "لولا" نفی کے پہلے نہیں آیا بلکہ ہمیشہ یہ "تحضیض" کے معنی میں ہوتا ہے۔ ("تحضیض" اس سوال کو کہتے ہیں جس میں تحریک اور سرزنش پائی جاتی ہے) لیکن ایسے مواقع پر اس کا مفہوم لازمی طور پر نفی ہی ہوتا ہے۔ اسی بناء پر "الا" کہہ کر کسی چیز کا ہم استثناء کرتے ہیں۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ دوسری قوموں میں بھی بہت سے لوگ ایمان لائے تھے لیکن جو بات قوم یونس کو دوسری اقوام سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ سب کے سب مل کر ایمان لائے اور وہ بھی عذاب الٰہی کے قطعی اور یقینی طور پر آجانے سے پہلے جبکہ دوسری قوموں میں سے بہت سے لوگ سختی سے مخالفت پر ڈٹے رہے۔ یہاں تک کہ پروردگار کا قطعی عذاب کا حکم صادر ہوا۔ عام طور پر ایسے لوگوں نے عذاب الٰہی کو دیکھ کر اظہار ایمان کیا۔ لیکن ان کا ایمان اسی دلیل کی بناء پر جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں سودمند نہ ہوا۔

قوم یونس کے ایمان لانے کا واقعہ

جیسا کہ تواریخ میں آیا ہے ان کا ماجرا کچھ یوں ہے:

حضرت یونس کی قوم نینوا (عراق) میں زندگی بسر کرتی تھی۔ جب آپ اس سے مایوس ہوگئے تو ایک عابد کی درخواست پر کہ جو ان میں رہتا تھا ان کے لیے بددعا کی جبکہ انہی میں ایک عالم بھی تھا جو حضرت یونسؑ سے درخواست کرتا تھا کہ آپ قوم کے بارے میں دوبارہ دعائے خیر کریں، ان کے لیے پھر ارشاد و ہدایت شروع کریں اور مایوس نہ ہوں۔

لیکن حضرت یونس اس واقعے کے بعد اپنی قوم سے باہر چلے گئے ان کی قوم کو جس نے آپ کی سچائی کو بارہا آزمایا ہوا تھا اس عالم کے گرد جمع ہوگئی جبکہ ابھی نزول عذاب کا فرمان صادر نہیں ہوا تھا لیکن اس کی نشانیاں کم و بیش نظر آتی تھیں۔ ان لوگوں نے موقع غنیمت جانا اور اس عالم کی راہنمائی میں شہر سے باہر نکل آئے۔ ان کی حالت یہ تھی کہ دعا و تضرع کر رہے تھے نامۂ اعمال رکھے تھے، اظہار ایمان کر رہے تھے، توبہ کناں تھے، انھوں نے ماؤں کو بچوں سے جدا کر دیا تھا تاکہ ان کی روح میں زیادہ انقلاب برپا ہو اور انھوں نے معمولی قسم کا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ اپنے پیغمبر کی تلاش میں نکل پڑے مگر ان کا تو کہیں کوئی نشان نظر نہ آیا۔ لیکن ان کی یہ توبہ، ایمان اور پروردگار کی طرف بازگشت چونکہ برمحل تھی اور علم، آگاہی اور خلوص کی بنیاد پر تھی لہٰذا وہ اپنا کام کر گئی۔ عذاب کی نشانیاں برطرف ہوگئیں، آرام و سکون ان کی طرف پلٹ آیا۔ ایک طویل واقعے کے بعد جب حضرت یونسؑ اپنی قوم کی طرف پلٹ آئے تو دل و جان سے قوم نے ان کی پذیرائی کی۔

خود حضرت یونس علیہ السلام کی زندگی کی تفصیل انشاء اللہ سورۂ صٰفٰت کی آیات ۱۲۴ تا ۱۴۸ کے ذیل میں بیان کی جائے گی۔

اس نکتے کی یاددہانی بھی ضروری ہے قوم یونسؑ کو خدا کے قطعی عذاب کا ہرگز سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ورنہ ان کی توبہ بھی قبول نہ ہوتی بلکہ خطرے کے الارم اور نشانیاں جو عام طور پر حقیقی عذاب سے پہلے نمایاں ہوتی ہیں ان کی بیداری کے لیے کافی ثابت ہوگئیں حالانکہ فرعون خطرے کے ایسے الارم بارہا سن چکا تھا۔ خطرے کی نشانیاں ان کے لیے نمایاں ہو چکی تھیں۔ مثلاً طوفان، ٹڈی دل کا

حملا اور نیل کے پانی کا دگرگوں ہو جانا وغیرہ ایسے واقعات رونما ہو چکے تھے لیکن انھوں نے عمر بھر کی ان گھنٹیوں کو کبھی کوئی اہمیت نہ دی اور ہر مصیبت پر صرف حضرت موسیٰ سے خواہش کی کہ اس تکلیف اور مصیبت کو خدا ان سے برطرف کر دے تو ایمان لے آئیں گے لیکن وہ کبھی ایمان نہیں لائے۔

مندرجہ بالا واقعہ ضمنی طور پر نشاندہی کرتا ہے کہ ایک آگاہ اور دلسوز رہبر کا وجود ایک قوم کے درمیان کس قدر مؤثر اور حیات بخش ہے جبکہ وہ عابد جو کافی علم نہ رکھتا ہو وہ زیادہ سختی اور خشونت ہی کا سہارا لیتا ہے۔ عدم آگہی سے عبادت اور علم جو احساس ذمہ داری کے ساتھ ہو میں اسلام جس فرق کا قائل ہے، اس کی منطق بھی اس روایت سے سمجھ میں آجاتی ہے۔

۹۹۔ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○

۱۰۰۔ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَي الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ○

ترجمہ

۹۹۔ اور اگر تیرا پروردگار چاہتا تو روئے زمین کے تمام رہنے والے (جبری طور پر) ایمان لے آتے۔ کیا تو مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ ایمان لے آئیں (جبری ایمان کا کیا فائدہ ہے)۔

۱۰۰۔ (لیکن) کوئی شخص خدا کے حکم (اس کی توفیق، مدد اور ہدایت) کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا اور (کفر و گناہ کی) ناپاکی وہ ان کے لیے قرار دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

تفسیر

جبری ایمان بے کار ہے

گزشتہ آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ اضطراری ایمان کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسی بناء پر زیر بحث پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے اگر اضطراری اور اجباری ایمان کا کوئی فائدہ ہوتا اور تیرا پروردگار چاہتا تو روئے زمین کے تمام لوگ ایمان لے آتے (ولو شاء ربك لاٰمن من فی الارض کلهم جمیعًا) لہٰذا ان میں سے ایک گروہ کے ایمان نہ لانے سے دلگیر اور پریشان نہ ہو۔ ارادہ و اختیار کی بنیادی آزادی کا لازمہ ہے کہ کچھ لوگ مومن ہوں گے اور کچھ غیر مومن۔ ان حالات میں کیا تو چاہتا ہے کہ لوگوں کو ایمان لانے کے لیے مجبور کرے (افانت تکرہ الناس حتّٰی یکونوا مؤمنین)۔

آیت اس تہمت کی دوبارہ نفی کرتی ہے جو اسلام کے دشمن بارہا لگاتے رہے ہیں اور لگاتے رہتے ہیں اور وہ یہ کہ اسلام تلوار کا دین ہے اور زبردستی اور جبری طور پر دنیا کے لوگوں پر ٹھونسا جاتا ہے۔

زیر بحث آیت قرآن کی دیگر بہت سی آیات کی طرح کہتی ہے کہ جبری ایمان کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور اصولی طور پر دین و ایمان ایسی چیز ہے جو روح کے اندر سے اٹھے نہ کہ باہر سے اور تلوار کے ذریعے سے ہو، خصوصاً جبکہ خدا تعالٰی پیغمبر اسلام کو ایمان و اسلام کیلیے لوگوں پر جبر و اکراہ کرنے سے ڈرا رہا ہے اور منع کر رہا ہے اس کے باوجود بعد والی آیت میں اس حقیقت کی یاد دہانی کروائی گئی ہے

کہ یہ ٹھیک ہے کہ انسان مختار اور آزاد ہے پھر بھی جب تک لطفِ الٰہی اور حکم پروردگار شامل حال نہ ہو تو کوئی شخص ایمان نہیں لاتا (وما کان لنفس ان تؤمن الا باذن الله)۔ لہٰذا وہ لوگ جو جہالت اور بے عقلی کی راہ میں قدم رکھتے ہیں اور اپنی عقل و خرد کے سرمائے سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں خدا ان کے لیے رجس اور ناپاکی قرار دیتا ہے اس طرح سے کہ انھیں ایمان کی توفیق نہیں ہوتی (و یجعل الرجس علی الذین لا یعقلون)۔

دو قابلِ توجہ نکات

۱۔ایک وضاحت : ہوسکتا ہے کہ ابتدائی نظر سے یوں معلوم ہو کہ پہلی اور دوسری آیت آپس میں ایک دوسرے کی نفی کرتی ہیں۔ کیونکہ پہلی آیت کہتی ہے کہ خدا کسی کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کرتا جبکہ دوسری آیت کہتی ہے کہ جب تک پروردگار کا فرمان اور ارادہ نہ ہو کوئی شخص ایمان نہیں لاتا۔

ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے ظاہری اختلاف برطرف ہوجاتا ہے اور وہ یہ کہ ہم عقیدہ رکھتے ہیں کہ نہ "جبر" صحیح ہے اور نہ ہی "تفویض" درست ہے یعنی نہ اس طرح ہے کہ لوگ اپنے افعال میں مجبور اور بے اختیار ہیں اور نہ اس طرح ہے کہ وہ تمام معنی میں اور ہر لحاظ سے اپنی حالت میں آزاد ہیں بلکہ ارادے کی آزادی رکھتے ہوئے بھی وہ خدائی امداد کے محتاج ہیں کیونکہ ارادے کی یہ آزادی خدا دیتا ہے۔ عقل اور وجدانِ پاک اس کے انعامات اور عنایات میں سے ہے۔ انبیاء کی راہنمائی اور کُتبِ آسمانی کی ہدایت بھی اس کی جانب سے ہے۔ اس بناء پر ارادے کی آزادی کے باوجود اس نعمت و عنایت کا سرچشمہ اور اس کا ماحصل سبھی خدا کی طرف سے ہے (غور کیجیے گا)۔

۲۔ایک اشکال اور اس کی توضیح : آخری آیت کا آخری جملہ " و یجعل الرجس علی الذین لا یعقلون " ہرگز جبر کی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ "لا یعقلون" ان کے اختیار کی دلیل ہے یعنی پہلے کچھ افراد تعقل و تفکر اور غور و فکر سے منہ موڑ لیتے ہیں جس کے انجام کے طور پر اس عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں کہ رجس، شک و تردد کی ناپاکی، دل کی تاریکی اور غلط نظر ان پر غالب آجاتی ہے یہاں تک کہ قوتِ ایمان ان سے سلب ہوجاتی ہے لیکن توجہ رہے کہ اس کے مقدمات خود انھوں نے فراہم کیے ہیں۔ درحقیقت ایسے مواقع پر ایمان کے لیے اللہ کا اذن اور فرمان نہیں ہوتا۔

دوسرے لفظوں میں یہ جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا کا اذن اور فرمان بلاوجہ اور بغیر کسی حساب کتاب کے نہیں ہے جو اس کے لائق ہیں ان کے لیے ہوگا اور جو اس کے لائق نہیں وہ اس سے محروم رہیں گے۔

۱۰۱۔ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ○

۱۰۲۔ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ○

۱۰۳۔ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

ترجمہ

۱۰۱۔ کہہ دو: دیکھو! ان (خدا کی آیات اور توحید کی نشانیوں) کو جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں لیکن یہ نشانیاں اور تنبیہیں ان لوگوں کے لیے مفید نہیں ہوں گی جو ایمان نہیں لاتے (اور ہٹ دھرم ہیں)۔

۱۰۲۔ کیا یہ گزشتہ لوگوں کے سے دنوں (اور ویسی بلاؤں، مصیبتوں اور سزاؤں) کا انتظار کرتے ہیں کہہ دو: تم انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کروں گا۔

۱۰۳۔ پھر (نزولِ بلا اور سزا و عذاب کے وقت) ہم اپنے رسولوں کو اور ان پر ایمان لانے والوں کو نجات دیتے تھے اور اس طرح ہم پر حق ہے کہ (بجا پر) ایمان لانے والوں کو نجات بخشیں۔

تفسیر

تربیت اور وعظ و نصیحت

گزشتہ آیات میں اس بارے میں گفتگو تھی کہ ایمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اختیاری ہو نہ کہ اضطراری اور اجباری۔ اسی مناسبت سے زیر نظر پہلی آیت میں اختیاری ایمان کے حصول کا راستہ بتایا گیا ہے اور پیغمبر اکرمؐ سے فرمایا گیا ہے: ان سے کہہ دو: صحیح طور پر غور و فکر کریں اور آسمان و زمین میں دیکھیں کہ کیسا عجیب و غریب اور حیرت انگیز نظام ہے کہ جس کا ہر گوشہ پیدا کرنے والے کی عظمت، قدرت، علم اور حکمت کی دلیل ہے (قل انظروا ماذا فی السمٰوٰت و الارض) یہ سب درخشاں ستارے اور مختلف آسمانی کرات کہ جن میں سے ہر ایک اپنے محور اور مدار میں گردش کر رہا ہے یہ عظیم نظام ہائے شمسی اور یہ غول پیکر کہکشائیں اور ان پر

کارفرما ایک دقیق نظام، اسی طرح یہ کرہ زمین اپنے تمام عجائب واسرار کے ساتھ اور یہ سب طرح طرح کے زندہ موجودات ان سب کی ساخت پرداخت میں غور کرو اور ان کے مطالعہ سے جہانِ ہستی کے مبداء وموجد سے زیادہ آشنائی پیدا کرو اور اس سے زیادہ قریب ہوجاؤ۔

یہ جملہ وضاحت کے ساتھ جبر اور سلبِ اختیار کی نفی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ایمان جہانِ آفرینش کے مطالعے کا نتیجہ ہے یعنی یہ کام خود تمھارے ہی ہاتھ میں ہے۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: لیکن ان سب آیات اور نشانیوں کے باوجود تعجب کا مقام نہیں کہ ایک گروہ ایمان نہ لائے کیونکہ آیات، نشانیاں، خطرے کے الارم، ڈرانے کے اسباب صرف ان لوگوں کے کام آتے ہیں جو حق کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن جنھوں نے پختہ ارادہ کرلیا ہے کہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے ان پر ان امور کا کوئی اثر نہیں ہوتا (وما تغنی الاٰیات والنذر عن قوم لا یؤمنون)۔[1]

یہ جملہ ایک حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو بارہا قرآن میں آئی ہے اور وہ یہ کہ دلائل، حق باتیں، نشانیاں اور پند ونصائح تنہا کافی نہیں ہیں بلکہ مہیا اور آمادہ اسباب بھی نتیجہ حاصل کرنے کی شرط ہیں۔

اس کے بعد قرآن تہدید آمیز لہجے میں لیکن سوال کے انداز میں کہتا ہے کیا یہ ہٹ دھرم اور بے ایمان لوگ سوائے اس کے کوئی توقع رکھتے ہیں کہ جو انجام گزشتہ سرکش قوموں کا ہوا تھا اور جو دردناک خدائی عذاب میں گرفتار ہوئے تھے، اس سے دوچار ہوں۔ جیسا انجام فراعنہ، نمرود، شداد اور ان کے اعوان وانصار کا ہوا (فھل ینتظرون الا مثل ایام الذین خلوا من قبلھم)۔

آیت کے آخر میں انھیں خطرے سے خبردار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ”اے پیغمبر! ان سے کہہ دو: اب جبکہ تم اس راستے پر چل رہے ہو اور تجدید نظر کے لیے تیار نہیں ہو تو تم انتظار میں رہو اور ہم تمھارے بُرے اور دردناک انجام کے انتظار میں ہیں جیسا انجام گزشتہ مستکبر قوموں کا ہوا (قل فانتظروا انی معکم من المنتظرین)۔

توجہ رہے کہ ”فھل ینتظرون“ میں استفہام، استفہامِ انکاری ہے یعنی ان کا طرزِ عمل ہی ایسا ہے کہ گویا وہ ایک بُرے انجام کے آپہنچنے کے علاوہ کسی کا انتظار نہیں کر رہے۔

لفظ ”ایام“ اگرچہ لغت میں ”یوم“ کی جمع ہے جس کا معنی ہے دن لیکن یہاں دردناک حوادث کے معنی میں ہے، کہ جو گزشتہ اقوام کی زندگی میں واقع ہوئے۔

اس کے بعد اس بناء پر کہ یہ توہم نہ ہو کہ خدا سزا دیتے وقت خشک کے ساتھ تر کو بھی جلا دیتا ہے یہاں تک کہ ایک مومن جو کسی بُرے

---

[1] ”نذر“ ”نذیر“ کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے ڈرانے والا۔ یہ انبیاء اور خدائی رہنماؤں کے لیے کنایہ ہے یا پھر یہ انذار کی جمع ہے۔ یعنی غافلین اور مجرمین کو ڈرانا دھمکانا جو ان ہادیان الٰہی کا پروگرام ہے۔

لفظ ”ما“ کو ”ما تغنی الاٰیات“ میں بعض علماء مانافیہ سمجھتے ہیں، بعض استفہام انکاری۔ نتیجہ کے لحاظ سے دونوں ایک ہی ہیں۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ مانافیہ ہونا چاہیے۔

سرکش باغی گروہ ہیں جو اسے نظر انداز کر دیتا ہے مزید فرمایا گیا ہے : گزشتہ اقوام کے عذاب کے اسباب فراہم ہونے کے بعد ہم اپنے رسولوں اور ان لوگوں کو جو ان پر ایمان لاتے نجات دیتے تھے (ثم ننجی رسلنا و الذین امنوا)۔

آخر میں فرمایا گیا ہے کہ یہ چیز گزشتہ اقوام، رسل اور مومنین کے ساتھ مخصوص نہیں تھی بلکہ ہم اس طرح تجھے اور تجھ پر ایمان لانے والوں کو نجات دیں گے اور یہ ہم پر حق ہے ایک مسلّم اور تخلف ناپذیر حق (کذلک حقا علینا ننج المؤمنین)[1]۔

---

[1] کذلک حقا علینا ننج المؤمنین کا جملہ معنوی لحاظ سے اس طرح تھا : "کذلک ننج المؤمنین و کان ذلک حقا علینا" یعنی جملہ "حقاً علینا" ایک جملہ معترضہ ہے کہ جو "کذلک" اور "ننج المؤمنین" کے درمیان آیا ہے یہ احتمال بھی ہے کہ "کذلک" کا تعلق گزشتہ جملے سے ہو یعنی "ننجی رسلنا والذین اٰمنوا"۔

۱۰۴۔ قُلْ يَآاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚۖ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ

۱۰۵۔ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

۱۰۶۔ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

۱۰۷۔ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝

ترجمہ

۱۰۴۔ کہہ دو! اے لوگو! اگر میرے دین اور عقیدے کے بارے میں تمہیں شک ہے تو میں ان کی پرستش نہیں کرتا کہ خدا کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو، میں صرف خدا کی عبادت کرتا ہوں کہ جو تمہیں مارے گا اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مومنین میں سے ہوں۔

۱۰۵۔ اور (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ) اپنا رُخ اس دین کی طرف کر کہ جو ہر قسم کے شرک سے خالی ہے اور مشرکین میں سے نہ ہو۔

۱۰۶۔ اور سوائے خدا کے کسی چیز کو نہ پکار کہ جو نہ نفع دے سکتی ہے اور نہ نقصان۔ اگر ایسا کرو گے تو ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

۱۰۷۔ اور اگر خدا (امتحان کے لیے یا گناہ کی سزا کے طور پر) تجھے کوئی نقصان پہنچائے تو اس کے علاوہ کوئی اسے

برطرف نہیں کرسکتا اور اگر وہ تیرے لیے بھلائی کا ارادہ کرے تو کوئی بھی اس کے فضل کو نہیں روک سکتا اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اسے نوازتا ہے اور وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر

مشرکین کے بارے میں حتمی فیصلہ

یہ آیات اور بعد کی چند آیات سب کی سب توحید سے مربوط شرک کے خلاف جنگ اور حق کی طرف دعوت دینے کے بارے میں ہیں۔ یہ آیات اس سورہ کی آخری آیات میں سے ہیں اور درحقیقت یہ اس سورہ کی توحیدی مباحث کی فہرست یا خلاصہ ہیں اور بت پرستی کے خلاف جنگ کے لیے تاکید ہیں جس کا ذکر اس سورہ میں بارہا آیا ہے۔

آیات کا لب و لہجہ نشاندہی کرتا ہے کہ مشرکین بعض اوقات اس وہم میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ پیغمبر اپنے اعتقاد میں بتوں کے بارے میں نرمی سے کام لیں، کسی طرح سے انہیں قبول کرنے کے قائل ہو جائیں اور خدا کے عقیدے کے ساتھ ساتھ کسی طرح سے انہیں بھی تسلیم کر لیں۔ قرآن اس قدر حتمی اور قطعی فیصلے کے ساتھ کہ جتنا فرض کیا جا سکتا ہے اس بے بنیاد توہم کو ختم کرتا ہے اور ان کی فکر کو ہمیشہ کے لیے راحت پہنچاتا ہے کہ بتوں کے بارے میں کسی قسم کی صلح اور نرمی کا کوئی معنی نہیں ہے اور اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں ہے۔ صرف اللہ، نہ ایک لفظ کم نہ ایک لفظ زیادہ۔

پہلے پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ تمام لوگوں کو مخاطب کرکے، "کہہ دو اے لوگو! اگر تم میرے عقیدے کے بارے میں کوئی شک اور تردد رکھتے ہو تو آگاہ رہو کہ میں ان کی کبھی عبادت نہیں کروں گا جن کی خدا کے علاوہ تم عبادت کرتے ہو (قل یایہا الناس ان کنتم فی شک من دینی فلا اعبد الذین تعبدون من دون اللہ)۔

صرف ان کے معبودوں کی نفی پر قناعت نہیں کی گئی بلکہ مزید تاکید کے لیے ہر قسم کی عبادت خدا کے لیے ثابت کرتے ہوئے بات جاری ہے: لیکن میں ایسے خدا کی عبادت کرتا ہوں کہ جو تمہیں موت دیگا (ولکن اعبد اللہ الذی یتوفٰکم)۔

پھر تاکید مزید ہے، یہ صرف میری چاہت نہیں ہے بلکہ "یہ خدا کا فرمان ہے جو اس نے مجھے دیا ہے کہ میں اللہ پر ایمان لانے والوں میں سے ہوں" (وامرت ان اکون من المؤمنین)۔

یہ جو خدا کی صفات میں سے صرف قبض روح اور مارنے کا ذکر ہوا ہے تو یہ یا تو اس بناء پر ہے کہ انسان جس چیز پر چاہے شک کرے لیکن وہ موت پر شک نہیں کر سکتا اور یا اس وجہ سے ہے کہ انہیں سزا اور ہلاکت خیز عذاب کی طرف متوجہ کیا جائے کہ جس کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے اس طرح سے پھر یہ کنایۃً خدا کے غضب کی ایک دھمکی ہے۔

شرک و بت پرستی کی نفی کے بارے میں اپنا عقیدہ قطعی طور پر بیان کرنے کے بعد اب اس کے لیے دو دلیلیں پیش کی گئی ہیں ایک دلیل فطرت کے حوالے سے ہے اور دوسری عقل و خرد کے حوالے سے۔

"کہہ دو، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اپنا رخ مستقیم اور سیدھے دین کی طرف رکھو کہ جو ہر لحاظ سے خالص اور پاک ہو (و ان

(اقم وجهك للدين حنيفاً)۔

یہاں بھی صرف اثباتی پہلو پر قناعت نہیں کی گئی بلکہ تاکید کے لیے نفی کا پہلو بھی بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: «اور ہرگز مشرکین میں سے نہ ہونا» (ولا تکونن من المشرکین)۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے "حنیف" اس شخص کو کہتے ہیں جو انحراف اور ٹیڑھے پن سے راستی، استقامت اور سیدھے پن کی طرف جھکے یا دوسرے لفظوں میں انحراف اور ٹیڑھے دینوں اور طور طریقوں سے آنکھیں بند کر لے اور خدا کے سیدھے اور مستقیم دین کی طرف متوجہ ہو۔ وہی دین جو فطرت کے مطابق ہے اور فطرت سے اسی مطابقت کی وجہ سے صاف ستھرا اور مستقیم ہے اس بناء پر توحید کے فطری ہونے کی طرف ایک اشارہ اس میں پنہاں ہے کیونکہ انحراف وہ چیز ہے جو فطرت کے خلاف ہو (غور کیجیے گا)۔

فطرت کے راستے شرک کے بطلان کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ایک واضح عقلی دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا گیا ہے کہ "خدا کو چھوڑ کر ان چیزوں کی عبادت نہ کر جو نہ فائدہ پہنچا سکتی ہیں اور نہ نقصان۔ کیونکہ اگر تو نے ایسا کام کیا تو ظالموں میں سے ہو جائیگا" اپنے اوپر بھی ظلم کریگا اور اس معاشرے پر بھی جس سے تیرا تعلق ہے۔ (ولا تدع من دون الله ما لا ینفعك ولا یضرك فان فعلت فانك اذاً من الظٰلمین)۔

کون سی عقل اجازت دیتی ہے کہ انسان ایسی چیزوں اور موجودات کی عبادت کرے کہ جو کسی قسم کا فائدہ اور نقصان نہیں پہنچا سکتیں اور انسانی تقدیر میں جن کا تھوڑا سا بھی اثر نہیں ہے۔

یہاں بھی صرف نفی کے پہلو پر بس نہیں کی گئی بلکہ مثبت پہلو کے حوالے سے ارشاد ہوتا ہے: اگر تمہیں خدا کی طرف سے ناراحتی اور نقصان پہنچے (چاہے سزا کے طور پر ہو یا آزمائش کے طور پر) اس کے علاوہ کوئی بھی اسے برطرف نہیں کر سکتا (وان یمسسك الله بضر فلا کاشف له الا هو)۔ اسی طرح "اگر خدا چاہے کہ تجھے بھلائی پہنچے تو کوئی بھی اس کے فضل و رحمت کو روک نہیں سکتا" (وان یردك بخیر فلا راد لفضله)۔

"وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے (اور اہل سمجھے) خیر اور نیکی تک پہنچاتا ہے" (یصیب به من یشاء من عباده)۔ کیونکہ اس کی بخشش اور رحمت سب پر محیط ہے اور وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے (وهو الغفور الرحیم)۔

۱۰۸۔ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ ۝

۱۰۹۔ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ۝ ع

ترجمہ

۱۰۸۔ کہہ دو: اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے حق تمہاری جانب آیا ہے (اس کے زیر سایہ ہدایت یافتہ) اپنے لیے ہدایت پاتا ہے اور جو شخص گمراہ ہو جائے تو وہ اپنے نقصان میں گمراہ ہوا ہے اور میں تم پر (مجبور کرنے کیلیے) مامور نہیں ہوں۔

۱۰۹۔ اور جو کچھ تم پر وحی ہوتی ہے اس کی پیروی کرو اور صبر کر (اور استقامت دکھا) تاکہ خدا (کامیابی کا) حکم صادر کرے اور وہ بہترین حکم کرنے والا ہے۔

تفسیر

آخری بات

ان دو آیات میں سے ایک تو تمام لوگوں کے لیے پند و نصیحت ہے اور دوسری پیغمبر اکرمؐ کے لیے مخصوص ہے یہ آیات ان احکام کی تکمیل کرتی ہیں جو اس پوری سورت میں بیان ہوئے اور یہیں پر سورہ یونس اختتام کو پہنچتی ہے۔

پہلے ایک عمومی حکم کے طور پر فرمایا گیا ہے: تمام لوگوں سے کہہ دو کہ تمہارے پروردگار کی جانب سے حق تمہاری طرف آیا ہے۔ یہ تعلیمات، یہ آسمانی کتاب، یہ پروگرام اور یہ پیغمبر سب حق ہیں اور ان کے حق ہونے کی نشانیاں واضح ہیں (قل یا ایھا الناس قد جاء کم الحق من ربکم)۔ اور اس حقیقت کی طرف توجہ کرتے ہوئے "جو شخص اس حق کے زیر سایہ ہدایت حاصل کرے اس نے اپنے فائدے کی طرف ہدایت پائی ہے اور جو شخص اس کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرتے ہوئے گمراہی کا راستہ منتخب کرے اس نے اپنے نقصان میں قدم اٹھایا ہے (فمن اھتدیٰ فانما یھتدی لنفسہ ومن ضل فانما یضل علیھا)۔ اور میں تمہارا مامور، وکیل اور نگہبان نہیں ہوں (وما انا علیکم بوکیل)۔

یعنی یہ میری ذمہ داری نہیں ہے کہ تمہیں حق قبول کرنے پر مجبور کروں کیونکہ حق کو قبول کرنے کے لیے مجبور کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ ہی اگر تم نے حق قبول نہ کیا تو تمہیں خدائی عذاب سے محفوظ رکھ سکتا ہوں بلکہ میری ذمہ داری تو دعوت دینا، تبلیغ کرنا، رشد و ہدایت کرنا

اور رہبری کرنا ہے اور باقی امور خود تمہارے ذمہ ہیں کہ تم اپنے اختیار سے اپنی راہ منتخب کرو۔

یہ آیت دوبارہ مسئلہ اختیار اور ارادے کی آزادی کا ذکر کرنے کے علاوہ اس امر پر تاکید کرتی ہے کہ حق کو قبول کرنا پہلے مرحلے میں خود انسان کے اپنے فائدے میں ہے جیسا کہ اس کی مخالفت کرنا بھی خود اسی کے نقصان میں ہے۔

درحقیقت خدائی رہبروں کی تعلیمات اور آسمانی کتب انسانوں کی تربیت، تکامل اور ارتقاء کی کاوشیں ہیں نہ ان کی موافقت کرنا عظمت الٰہی میں اضافے کا باعث ہے اور نہ ہی ان کی مخالفت سے اس کے جلال میں کوئی کمی آتی ہے۔

اس کے بعد پیغمبر کی ذمہ داری کا تعین دو جملوں میں کیا گیا ہے۔

پہلا یہ کہ جو کچھ تجھ پر وحی ہوتی ہے تجھے صرف اس کی پیروی کرنا چاہیے (واتبع مایوحٰی الیک)۔ تیرا راستہ خدا نے وحی کے ذریعے معین کیا ہے اور تو اس سے معمولی سے انحراف کا بھی مجاز نہیں۔

دوسرا یہ کہ اس راستے میں تجھے طاقت فرسا مشکلات، بہت زیادہ ناراضگیاں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا لہٰذا انبوہ مشکلات میں تجھے چاہیے کہ خوف وہراس کو اپنے قریب نہ آنے دے، صبر، استقامت اور پامردی اختیار کر۔ یہاں تک کہ خدا دشمنوں پر تیری فتح و کامرانی کا حکم صادر کرے (واصبر حتّٰی یحکم اللّٰہ) کیونکہ وہ بہترین حکم کرنے والا ہے۔ اس کا فرمان حق ہے، اس کا حکم عدل ہے اور اس کے وعدے کی خلاف ورزی نہیں ہوتی (وھو خیر الحاکمین)۔

پروردگارا! تیرے بندے جو تیری راہ میں جہاد کرتے ہیں
—— وہ جہاد جس میں خلوص اور ایمان کارفرما ہے۔
—— تیرے بندے جو تیری راہ میں صبر، استقامت اور پامردی کا مظاہرہ کرتے ہیں
—— تو نے ان سے کامیابی اور فتح و نصرت کا وعدہ کیا ہے۔

خداوندا! ان لمحات میں اور حکومت اسلامی کی تشکیل کے مرحلے میں بہت زیادہ مشکلات نے ہمیں گھیر رکھا ہے اور ہم تیری توفیق و عنایت سے جہاد اور استقامت سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔

بارالہا! تو ہمیں اپنے لطف و کرم سے مشکلات کے سیاہ بادل برطرف کر دے اور ہمیں حق و عدالت کی حیات بخش شعاعوں سے نواز۔ آمین یارب العالمین

۱۸ رجب ۱۳۹۹ ھ ق
۲۲ خرداد ۱۳۵۸ ھ ش

تفسیر نمونہ ———— آٹھویں جلد

اختتام کو پہنچی

سُورَۃ ہُود

مکّہ میں نازل ہوئی
۱۲۳ آیات ہیں

مضامین اور فضیلت

مفسرین میں مشہور ہے کہ یہ تمام سورہ مکہ میں نازل ہوئی۔ "تاریخ القرآن" کے مطابق یہ پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہونے والی انچاسویں سورت ہے۔ بعض مفسرین کی تصریح کے مطابق یہ سورۃ ان آخری سالوں میں نازل ہوئی جب پیغمبر اکرمؐ مکہ میں تھے۔ یعنی حضرت ابوطالبؑ اور حضرت خدیجہؑ کی وفات کے بعد۔ لہٰذا فطرتاً پیغمبر اکرمؐ کی زندگی کا ایک سخت ترین دور تھا اس بنا پر کہ اس زمانے میں دشمن کا دباؤ اور اس کا زہریلا پروپیگنڈا ہر دور سے زیادہ محسوس ہوتا تھا۔ اس سورۃ کی ابتدا میں ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں جو پیغمبر اکرمؐ اور مومنین کی دل جوئی اور تسلی کا پہلو رکھتی ہیں۔

اس سورۃ کی آیات کا اہم اور بیشتر حصہ گزشتہ انبیاء خصوصاً حضرت نوح علیہ السلام کی سرگزشت پر مشتمل ہے، جو باوجود قلت تعداد کے بہت سے دشمنوں پر غالب و کامران ہوتے۔ ان واقعات کا ذکر جہاں پیغمبر اکرمؐ اور مومنین کے لیے تسلی اور سکون قلب کا باعث تھا وہاں ان کے طاقتور دشمنوں کے لیے درس عبرت بھی تھا۔

اس سورۃ کی آیات باقی مکی سورتوں کی طرح معارف اسلامی کے اصولوں خصوصاً شرک و بت پرستی سے مبارزہ، بعد از موت کے معاملات اور دعوت پیغمبر اسلامؐ کی صداقت کی تشریح پر مبنی ہیں۔ ان مباحث میں دشمنوں کو شدید انجام سے ڈرایا گیا ہے اور مومنین کو استقامت و پامردی کی تاکید کی گئی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے حالات اور دشمنوں سے نبرد آزمائی کی تفاصیل کے علاوہ حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت نیز شرک و کفر اور انحراف و ستم گری کے خلاف وسیع و طویل جنگ کی بابت اشارات بھی اس سورۃ میں موجود ہیں۔

اس سورۃ نے مجھے بوڑھا کر دیا

اس سورۃ کی آیات وضاحت کے ساتھ اس امر کو ثابت کرتی ہیں کہ مسلمانوں کو کبھی دشمنوں کی کثرت اور ان کے شدید حملوں کی وجہ سے میدان خالی نہیں چھوڑنا چاہیے بلکہ ہر لمحہ ان کی استقامت و پامردی میں اضافہ ہونا چاہیے۔

اسی بنا پر ایک مشہور حدیث میں مذکور ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

شیبتنی سورۃ ہود

سورۃ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا[1]

---

[1] نور الثقلین جلد دوم صـ ۳۳۴۔

یا جس وقت آپ کے صحابہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ! آپ کے چہرۂ انور پر بڑھاپے کے آثار زیادہ جلدی نمودار ہو گئے ہیں، تو فرمایا:

شیبتنی ہود والواقعہ

سورۂ ہود اور سورۂ واقعہ نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے[1]

اور بعض روایات میں سورۂ مرسلات، عم یتساءلون اور تکویر وغیرہ کا اضافہ بھی ہوا ہے[2]

ابن عباس سے اس حدیث کی تشریح میں منقول ہے:

رسول اللہؐ پر اس آیت سے زیادہ سخت اور دشوار کوئی اور آیت نازل نہیں ہوئی جس میں فرمایا گیا ہے:

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ

یعنی۔ تم اور تمہارے ساتھی اس طرح سے ثابت قدم رہیں جیسا کہ حکم دیا گیا ہے[3]

بعض مفسرین سے منقول ہے کہ ایک عالم دین نے رسول اللہؐ کو خواب میں دیکھا تو آپؐ سے سوال کیا کہ یہ جو آپؐ سے مروی ہے کہ۔ سورہ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ کیا اس کا سبب وعلت گزشتہ امتوں کی سرگزشت اور ہلاکت بیان کرنا ہے؟۔ آپؐ نے فرمایا نہیں۔ اس کا سبب "فاستقم کما امرت" والی آیت تھی[4]

بہرحال اس سورۃ میں علاوہ اس آیت کے، قیامت اور عدالت خداوندی میں باز پرس سے مربوط گزشتہ امتوں کی بلا دینے والی سزاؤں سے متعلق اور فتنہ وفساد کے خلاف جنگ کے بارے میں احکام ہیں۔ یہ سب امور احساس مسئولیت پیدا کرتے ہیں۔ تعجب کی بات نہیں کہ ان ذمہ داریوں کے بارے میں غور وفکر انسان کو بوڑھا کر دے۔

ایک نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا ضروری ہے، یہ ہے کہ اس سورۃ کی بہت سی آیات ان مطالب کی تاکید کرتی ہیں، جو گزشتہ سورۃ یونس میں آچکے ہیں۔ خصوصاً اس کا آغاز بعینہٖ اس کے آغاز جیسا ہے اور بہت سے مواقع پر اس کا مقصد اور ماحصل بھی انہی مسائل کی تاکید ہے۔

اس سورۃ کی معنوی تاثیر

اس سورۃ کی فضیلت کے بارے میں پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث مروی ہے آپؐ نے فرمایا:

---

[1] مجمع البیان اسی سورۃ کے آیہ ۱۱۸ کے ذیل میں۔

[2] روح المعانی جلد ۱۱ صفحہ ۱۲۹۔

[3] مجمع البیان اسی سورۃ کی آیہ ۱۱۲ کے ذیل میں۔

[4] روح المعانی جلد ۱۱ صفحہ ۱۲۹۔

من قرء هذه السورة اعطی من الاجر والثواب بعدد من صدق هوداً والانبیاء علیهم السلام، ومن کذب بهم، وکان یوم القیامة فی درجة الشهداء وحوسب حساباً یسیراً ۔

جو شخص اس سورہ کی تلاوت کرے اس کی جزا اور ثواب ان اشخاص جیسا ہے جو حضرت ہودؑ اور باقی انبیاء پر ان کے جھٹلانے والوں اور منکرین کے مقابلے میں ایمان لائے۔ ایسا شخص قیامت کے دن شہداء میں سے قرار پائے گا اور اس کا حساب آسان و سہل ہوگا۔[1]

واضح ہے کہ خالی اور خشک تلاوت یہ اثر نہیں رکھتی بلکہ غور و فکر کے ساتھ کی گئی تلاوت ہی عمل کی جانب گامزن کرتی ہے اور یہ بات انسان کو مومنین ما سلف کے نزدیک اور منکرین انبیاء سے دُور کر دیتی ہے۔ اسی بناء پر اسے ان میں سے ہر ایک کی تعداد کے برابر جزا ملے گی. فکر و معرفت کے ساتھ اس سورۃ کی تلاوت کرنے والا قاری چونکہ گزشتہ امتوں کے شہداء کے ساتھ ہم مقصد و یک ہدف ہوگا لہٰذا تعجب نہیں کہ وہ ان جیسا قرار پائے اور اس کا حساب کتاب (روزِ آخرت میں) آسان و سہل ہو جائے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

جو شخص یہ سورۃ اپنے پاس لکھ کر رکھے خدا اسے بے حد قوت و طاقت عطا فرمائے گا اور جس کے پاس یہ سورۃ تحریراً موجود ہو تو وہ جنگ میں دشمن پر غالب آئے گا یہاں تک کہ جو بھی اسے دیکھے گا اس سے خوف کھائے گا۔[2]

اگرچہ راحت طلب اور ظاہری مقاصد اخذ کرنے والے افراد اس قسم کی احادیث سے یہ مطلب نکالتے ہیں کہ صرف قرآن کی تحریر اور نقش کا ہمراہ ہونا ان مقاصد کے حصول کے لیے کافی ہے مگر درحقیقت ان کو اپنے پاس رکھنے سے مراد انہیں ایک دستور العمل اور زندگی کے پروگرام کے طور پر اپنے پاس رکھنا، اسے ہمیشہ پڑھتے رہنا اور مُو بمُو اس کا اجرا کرنا ہے۔ لہٰذا یہ بات مسلّم ہے کہ ایسا کرنے سے ہی نصرت و کامیابی کے آثار ظاہر ہوں گے۔ کیونکہ اس سورۃ میں استقامت و پامردی، فساد سے نفرت اور ہدف و مقصد سے ہمیشگی کا حکم اور گزشتہ اقوام کی تاریخ و تجربات کا بیشتر حصہ بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک مذکورہ واقعہ دشمن پر کامیابی و کامرانی حاصل کرنے کا درس دیتا ہے۔

---

1. تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۲۰۶
2. تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۲۰۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

(١) الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝

(٢) اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۝

(٣) وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝

(٤) اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

ترجمہ

اللہ کے نام سے شروع جو رحمان و رحیم ہے

(١) یہ کتاب ہے کہ جس کی آیات مستحکم کی گئی ہیں پھر ان کی تشریح و تفصیل بیان کی گئی ہے، حکیم و آگاہ خدا کی طرف سے (یہ نازل ہوئی ہے)۔

(٢) (میری دعوت یہ ہے کہ) خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو میں اس کی طرف سے تمہیں ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔

(٣) اور یہ کہ اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو پھر اس کی طرف پلٹو تاکہ وہ اچھے طریقے سے تمہیں مدت معین تک (اس جہان کی نعمتوں سے) بہرہ مند کرے اور ہر صاحب فضیلت

کو اس کی فضیلت کے مطابق عطا کرے اور اگر (اس فرمان سے) تم نے منہ موڑ لیا تو مجھے تمہارے لیے بہت بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے ۔

۴ (جان لو) تمہاری بازگشت اللہ کی طرف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ۔

تفسیر

دعوت انبیاء کے چار اہم اصول

یہ سورۃ بھی گزشتہ سورۃ اور قرآن کی دیگر بہت سی سورتوں کی مانند اس عظیم آسمانی کتاب کی اہمیت کے بیان سے شروع ہو رہی ہے ۔ تاکہ لوگ اس کے مضامین کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ ہوں اور اسے زیادہ باریک بینی سے دیکھیں ۔

حروف مقطعات ۔ الٓر ۔ کا ذکر خود اس عظیم آسمانی کتاب کی اہمیت کی دلیل ہے ۔ یہ کتاب باوجود اپنے اعجاز و عظمت کے معمولی حروف مقطعات جو کہ سب کے سامنے ہیں یعنی الف ۔ لام ۔ راء سے تشکیل پائی ہے (الٓر) ؎۱

حروف مقطعات کے بعد قرآن مجید کی ایک خصوصیت دو جملوں میں بیان کی گئی ہے ۔ پہلی یہ کہ یہ ایسی کتاب ہے جس کی تمام آیات مستحکم ہیں (کتاب احکمت آیاتہ) ۔ دوسری یہ کہ اس میں انسانی زندگی کی تمام انفرادی ، اجتماعی ، مادی اور معنوی ضروریات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے (ثم فصلت) ۔

یہ عظیم کتاب ان خصوصیات کے ساتھ اس خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو حکیم بھی ہے اور آگاہ بھی (من لدن حکیم خبیر) ۔

اپنے حکیم ہونے کے تقاضے کی بنا پر اس نے آیات قرآن کو محکم بیان کیا ہے اور خبیر و آگاہ ہونے کے تقاضے کے پیش نظر آیات قرآنی کو انسانی ضروریات کے مطابق مختلف حصوں میں بیان فرمایا ہے ۔ اس لیے کہ جب تک کوئی انسان کی تمام روحانی و جسمانی ضروریات کی جزئیات سے باخبر نہ ہو وہ تکامل تکوین اور ارتقائی ماہیت کے حامل احکام صادر نہیں کر سکتا ۔

درحقیقت صفات قرآن میں سے ہر ایک ، جو اس آیت میں آئی ہے ، کا سرچشمہ خدا کی کوئی ایک صفت ہے ۔ قرآن کا مستحکم ہونا خدا کی حکمت سے ہے اور اس کی تشریح و تفصیل اس کے باخبر

؎۱ اس معنی کی تفصیل اور قرآن کے حروف مقطعات کی دیگر تفاسیر سورۃ بقرہ ، آل عمران اور اعراف کی ابتداء میں مذکور ہو چکی ہیں ۔

ہونے کے باعث ہے۔

"اُحکمت" اور "فُصِّلَت" میں فرق

مفسرین قرآن نے "اُحکمت" اور "فصلت" کے فرق میں بہت سی بحثیں کی ہیں اور کئی ایک احتمالات پیش کیے ہیں۔ لیکن مذکورہ آیت کے مفہوم سے نزدیک تر جو بحث سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے لفظ میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ قرآن ایک واحد مجموعہ ہے جو آپس میں پیوست ہے اور ایک محکم و استوار عمارت کی مانند ہے اور اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ خدا واحد و یکتا کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اس بنا پر اس کی آیات میں کسی قسم کا تضاد و اختلاف نظر نہیں آتا۔

دوسرا لفظ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس کتاب میں باوجود وحدت و اکائی کے بہت سے شعبے اور شاخیں ہیں جو انسان کی تمام تر جسمانی و روحانی ضروریات کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے اسی بناء پر وحدت کے باوجود کثیر ہے اور کثرت کے باوصف واحد ہے۔

بعد والی آیت میں قرآن کا اہم ترین اور سب سے بنیادی موضوع یعنی توحید کا بیان اور شرک کا مقابلہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے "الا تعبدوا الا اللّٰہ" ۔ یعنی میری پہلی دعوت یہ ہے کہ یکتا و یگانہ خدا کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرو[1] یہ دراصل اس عظیم کتاب کے احکام کی پہلی تفسیر ہے۔

میری دعوت کا دوسرا پروگرام یہ ہے کہ: انني لكم منه نذير و بشير ۔ یعنی میں تمہارے لیے اسی خدا کی طرف سے نذیر (ڈرانے والا) اور بشیر (خوشخبری دینے والا) ہوں۔ میں تمہیں نافرمانیوں ظلم و فساد اور شرک و کفر کے بارے میں ڈراتا ہوں اور تمہارے کرتوتوں کے عکس العمل اور خدائی عذاب و سزا سے خبردار کرتا ہوں۔ اطاعت و پاکیزگی اور تقویٰ کے بدلے میں تمہیں سعادت بخش زندگی کی بشارت دیتا ہوں (انني لكم منه نذير و بشير)۔

میری تیسری دعوت یہ ہے کہ اپنے گناہوں سے استغفار کرو اور اپنے کو آلودگیوں سے پاک و صاف رکھو (و ان استغفروا ربكم)۔

میری چوتھی دعوت یہ ہے کہ اس کی طرف پلٹ آؤ" اور استغفار کے نتیجہ میں گناہوں سے پاک ہو جانے کے بعد اپنے کو خدائی صفات سے آراستہ کرو کیونکہ اسی کی جانب بازگشت اس کی صفات سے

---

[1] الا تعبدوا الا اللّٰہ کے بارے میں دو احتمال پیش کیے گئے ہیں پہلا یہ کہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے یہ زبان پیغمبر سے ہے اور اس کی ترکیب یہ ہوگی: دعوتی و امری الا تعبدوا الا اللّٰہ ۔ دوسرا یہ کہ یہ خدا کا کلام ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے: امرکم الا تعبدوا الا اللّٰہ ۔ لیکن جملہ "انني لكم منه نذير و بشير" (میں تمہیں ڈرانے اور خوشخبری سنانے والا ہوں) پہلے معنی سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

اپنے آپ کو مزین کرنے کے علاوہ کچھ نہیں (ثم توبوا الیہ)۔

درحقیقت حق کی جانب دعوت دینے کے چار مراحل ان چار جملوں کے ذریعہ بیان ہوتے ہیں کہ جن میں سے دو عقیدہ اور بنیاد سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرے دو کا تعلق بنیاد کے اوپر والے حصے اور عمل سے ہے۔ حقیقی توحید قبول کرنا، شرک سے مبارزہ اور پیغمبر اکرمؐ کی رسالت کو قبول کرنا اعتقادی اصول ہیں۔ اسی طرح اپنے آپ کو گناہوں سے پاک کرنا اور صفات الٰہی کو اپنانا یعنی عملی لحاظ سے اپنی مکمل اصلاح کر لینا قرآن کے دو عملی احکام ہیں لہٰذا اگر صحیح معنوں میں غور و فکر کریں تو قرآن کے تمام موضوعات کا خلاصہ یہی چار اقسام و امور ہیں۔ یہی اس سورۃ اور سارے قرآن کے موضوعات کی فہرست ہے۔ ان چار احکام کا "موافقت" یا "مخالفت" کی صورت میں عملی نتیجہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

جس وقت اس پروگرام کو عملی جامہ پہناؤ گے خدا تمہیں تمہاری عمر کے آخری لمحات تک اس دنیا کی سعادت بخش زندگی سے بہرہ ور کرے گا (یمتعکم متاعاً حسنا الی اجل مسمی)۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ ہر شخص کو اس کے عمل کے برابر بہرہ مند کرے گا اور ان چار اصولوں پر عمل کرنے کی کیفیت میں لوگوں کے فرق اور تفاوت کو کسی صورت نظر انداز نہیں کرے گا بلکہ ہر صاحب فضیلت کو اس کی فضیلت کے مطابق عطا کرے گا (و یؤت کل ذی فضل فضلہ)۔

لیکن اگر انسان نے راہ مخالفت اختیار کی اور عقیدہ و عمل سے متعلق ان چار احکام کی نافرمانی کے راستے پر چل نکلے تو میں تم پر اس عظیم دن (قیامت) کے عذاب سے ڈرتا ہوں، وہ دن کہ جس میں تم عدل الٰہی کی عظیم عدالت میں حاضر ہو گے (و ان تولوا فانی اخاف علیکم عذاب یوم کبیر)۔ بہر حال جان لیجئے کہ تم جو کچھ بھی ہو اور جس مقام و منزلت پر فائز ہو آخر کار تم سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے (الی اللہ مرجعکم)۔ یہ جملہ قرآن کے تفصیلی اصولوں میں سے پانچواں اصول یعنی مسئلہ معاد و قیامت کی طرف اشارہ ہے۔

لہٰذا یہ کبھی نہ سوچنا کہ تمہاری قوت خدا کی قوت و قدرت کے مقابلہ میں کوئی اہمیت رکھتی ہے یا بھاگ کر تم اس کے فرمان اور اس کی عدالت کے کٹہرے سے فرار حاصل کر سکو گے نیز یہ تصور بھی نہ کرنا کہ وہ تمہاری بوسیدہ ہڈیوں کو موت کے بعد جمع نہیں کر سکتا اور نئی حیات کا لباس نہیں پہنا سکتا، اس لیے کہ وہ تو ہر چیز پر قادر و توانا ہے (و ھو علی کل شیء قدیر)۔

دین و دنیا کا رشتہ

ابھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو گمان کرتے ہیں کہ دینداری فقط آخرت کا گھر آباد کرنے اور بعد از موت راحت و سکون حاصل کرنے کے معنی میں ہے اسی طرح اعمال نیک آخرت کا ثمر اور زادِ راہ ہیں۔ ایسے

لوگ اس جہان کی اصلی زندگی میں ایک پاکیزہ اور حقیقی مذہب کے اثر سے بے اعتنا ہیں یا اس کے لیے کم اہمیت کے قائل ہیں حالانکہ مذہب آخرت کا گھر آباد کرنے سے پہلے دنیاوی گھر آباد کرنے والا ہے اور اصولاً جب تک مذہب اس زندگی میں اثر انداز نہ ہو اُس زندگی کے لیے اس کی کوئی تاثیر نہ ہوگی۔

قرآن نے صراحت کے ساتھ بہت سی آیات میں اس موضوع کو اپنا عنوان قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض جزوی مسائل کو بھی اہمیت دی ہے۔ جیسا کہ سورۂ نوح میں ہے کہ اس عظیم پیغمبرؑ نے اپنی قوم سے یوں فرمایا:

اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۙ وَّ يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ يَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ؕ

اور اپنے گناہوں سے استغفار کرو اور توبہ کے پانی سے انہیں دھو ڈالو کہ خدا بخشنے والا ہے تاکہ وہ پے در پے تم پر آسمان کی برکتیں نازل کرے اور مال و اولاد سے تمہاری مدد کرے اور سرسبز باغات اور پانی کی جاری نہریں تمہارے قبضہ میں دے دے (نوح - ۱۰-۱۱-۱۲)

بعض لوگ دنیا کی ان مادی نعمات اور استغفار و گناہ سے پاک ہونے کے درمیان صرف ایک معنوی رشتہ سمجھتے ہیں۔ جو سمجھ میں نہیں آسکتا۔ حالانکہ کوئی ایسی دلیل نہیں ہے کہ ان امور کی ایسی تفسیر کی جائے جو سمجھ میں آنے والی نہ ہو۔ کون شخص نہیں جانتا کہ جھوٹ، دھوکا، چوری اور فتنہ و فساد اجتماعی زندگی کا شیرازہ بکھیر دیتے ہیں اور کون شخص اس حقیقت میں شک رکھتا ہے کہ حقیقی توحید کو قبول کرنے، انبیاء کی رہبری میں الٰہی معاشرے کا قیام، ماحول کو گناہوں سے پاک کرنے اور انسانی قدروں سے آراستہ کرنے ـــ یعنی وہ چار اصول جن کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ ہوا ہے ـــ ان پر عمل پیرا ہونے سے معاشرہ تکامل اور ارتقار کی جانب بڑھتا ہے اور امن و سلامتی اور صلح و صفا سے معمور ایک آباد و آزاد معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

اسی بناء پر مذکورہ بالا آیات میں ان چار اصولوں کے تذکرے کے بعد ہم پڑھتے ہیں:

"یمتعکم متاعا حسنا الی اجل مسمّٰی۔"

"اگر ان اصولوں پر کاربند ہو جاؤ تو آخری عمر تک شائستہ اور نیک طرزِ زندگی سے بہرہ مند رہو گے۔"

(۵) اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○

ترجمہ

(۵) آگاہ رہو کہ جب وہ (اپنے سروں کو ایک دوسرے کے نزدیک اور) سینوں کو ایک دوسرے کے قریب کرتے ہیں تاکہ اپنے آپ کو (اور اپنی باتوں کو) اس (پیغمبر) سے پوشیدہ رکھیں، آگاہ رہو کہ جب وہ اپنے لباس کو اپنے اوپر لپیٹ لیتے ہیں اور اپنے آپ کو اس میں چھپا لیتے ہیں (خدا) ان کے ظاہر اور باطن سے باخبر ہے کیوں کہ وہ سینوں کے اندر کے رازوں سے آگاہ ہے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے اس آیت کے لیے کئی ایک شانِ نزول ذکر کی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ آیت اخنس بن شریق منافق کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو نہایت شیریں زبان تھا اور پیغمبر اکرمؐ کے سامنے دوستی اور محبت کا اظہار کرتا تھا مگر باطن میں دشمنی اور عداوت رکھتا تھا۔

نیز جابر بن عبداللہ نے امام باقر علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ مشرکین کا ایک گروہ جب پیغمبر اکرمؐ کے سامنے سے گزرتا تو اپنے سروں کو نیچے کر لیتا یہاں تک کہ اپنے سر کو لباس سے چھپا لیتا تاکہ پیغمبرؐ انہیں دیکھ نہ لیں، یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی۔

تفسیر

یہ آیت بنیادی طور پر اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے دشمنوں کے احمقانہ فعل کی طرف اشارہ کرتی ہے جو اپنی نفاق آمیز اور حق سے گریزاں روش سے چاہتے تھے کہ اپنی ذات کو دوسروں کی نظروں سے پنہاں

رکھیں تاکہ کہیں حق کی آواز نہ سن لیں۔ لہٰذا فرمایا گیا ہے : آگاہ رہو کہ وہ پیغمبر کی دشمنی کو دلوں میں پوشیدہ رکھتے ہیں اور سروں کو نیچے کیے ہوئے سینوں کو آگے سے خم کرتے ہیں تاکہ خود کو آنحضرتؐ کی نظر سے پوشیدہ رکھیں (الا انھم یثنون صدورھم لیستخفوا منہ)۔

اس آیت کے معنی کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ لفظ "یثنون" کا مفہوم پورے طور پر واضح ہو۔ "یثنون" کا مادہ "ثنی" (بروزن سنگ) ہے، جو دراصل کسی چیز کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے کے نزدیک کرنے کے معنی میں آیا ہے مثلاً لباس تہ کرنے کے لیے۔ "ثنی ثوبہ" کہا جاتا ہے اور یہ جو دو افراد کو "اثنان" کہا جاتا ہے اس بنا پر ہے کہ ہم ان میں سے ایک کو دوسرے کے پہلو میں قرار دیتے ہیں۔ مداحی اور قصیدہ گوئی کو "ثنا خوانی" بھی اس بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ ممدوح کی صفات پرجستہ یکے بعد دیگرے شمار کی جاتی ہیں۔ نیز یہ مادہ خم ہونے اور جھکنے کے معنی میں بھی آیا ہے اس لیے کہ انسان اس کام سے اپنے بدن کے کچھ حصوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیتا ہے۔ اسی طرح کینہ و عداوت رکھنے کے معنی میں بھی بیان کیا گیا ہے کیونکہ اس طرح انسان کسی شخص یا چیز کی دشمنی کو دل کے نزدیک کر لیتا ہے۔ یہ تعبیر بھی عربی ادب میں ملتی ہے :

"اثنوف صدرہ علی البغضاء"

اس نے میرا کینہ دل میں رکھا ہے[1]

جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اس پر توجہ دینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ممکن ہے مندرجہ بالا تفسیر دشمنان پیغمبر کی ظاہری و باطنی مخالفت اور ہر قسم کی خفیہ سازشوں کی طرف اشارہ ہو اس لیے کہ ایک طرف تو دل میں بغض و کینہ اور دشمنی رکھنے کے باوجود ظاہراً شیریں زبان سے اظہار دوستی کرتے تھے اور دوسری جانب گفتگو کرتے وقت سروں کو ایک دوسرے کے قریب اور سینوں کو پیچھے کی طرف کیے ہوتے یہاں تک کہ اپنے لباسوں کو بھی سر پر لے لیتے ہیں۔ تاکہ اشارہ و کنایہ میں بدگوئیاں اور سازشیں کر سکیں اور کوئی شخص ان کے رازوں سے آگاہ نہ ہو۔ لہٰذا قرآن بلا فاصلہ آگاہ کرتا ہے کہ "آگاہ رہو جس وقت وہ اپنے آپ کو اپنے لباسوں میں چھپا لیتے ہیں (الا حین یستغشون ثیابھم یعلم ما یسرون وما یعلنون) پروردگار ان کے ظاہر و پنہاں سب کو جانتا ہے اس لیے کہ وہ ان کے سینوں (اندر) کے بھیدوں سے واقف ہے (انہ علیم بذات الصدور)۔

---

[1] تاج العروس، مجمع البیان، المنار اور مفردات راغب کی طرف رجوع کیا جائے۔

(۶) وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ۝

ترجمہ

(۶) اور زمین میں حرکت کرنے والی کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ اس کی روزی خدا کے ذمہ ہے اور وہ اس کی جائے قیام اور نقل و حرکت کے مقام کو جانتا ہے یہ سب کچھ واضح کتاب (علم خدا کی لوح محفوظ) میں ثبت شدہ ہے۔

تفسیر

سب اسی کے مہمان ہیں

گزشتہ آیت میں پروردگار کے علم کی وسعت اور ہر آشکار او پنہاں چیز پر اس کے احاطہ کی طرف اشارہ کیا گیا تھا زیر بحث آیت درحقیقت اس امر کی دلیل ہے کیونکہ اس میں تمام موجودات عالم کو خدا کی طرف سے روزی دینے کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور یہ ایسا کام ہے جو تمام موجودات عالم کے کامل احاطہ علمی کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی لیے خداوند عالم فرماتا ہے: روئے زمین پر کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کی روزی اس کے ذمہ نہ ہو وہ انسان کی جائے قرار کو جانتا ہے اور وہ اپنی قرارگاہ سے جن نقاط کی طرف منتقل ہوتا ہے اس سے بھی باخبر ہے، نیز ایک جاندار جہاں کہیں بھی ہو اس تک روزی پہنچاتا ہے (وما من دابة فی الارض الا علی اللہ رزقها ویعلم مستقرها ومستودعها)۔ یہ تمام حقائق اپنی تمام حدود و قیود کے ساتھ کتاب مبین اور علم خدا کی لوح محفوظ میں ثبت ہیں (کل فی کتاب مبین)۔

چند اہم نکات

۱۔ "دابة" لفظ "دبیب" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں آہستہ آہستہ چلنا اور چھوٹے چھوٹے

قدم اٹھانا لیکن لغوی مفہوم کے لحاظ سے ہر قسم کی حرکت اس میں شامل ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھار ان معانی کا اطلاق گھوڑے یا سواری کے دیگر جانوروں پر بھی کیا جاتا ہے۔ چنانچہ واضح ہے کہ زیر بحث آیت میں تمام زندہ موجودات کو شامل کیا گیا ہے۔

۲۔ "رزق" مسلسل عطاو بخشش کے معنی میں آیا ہے اور چونکہ موجوداتِ عالم کے لیے خدا کی دی ہوئی روزی اس کی طرف سے پائیدار اور مسلسل عطا ہے لہٰذا اسے رزق کہا جاتا ہے۔ اس نکتہ کا بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ عطاو بخشش کا مفہوم صرف مادی ضروریات پورا ہو جانے میں مقید نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی مادی و معنوی عطا اس میں شامل ہے اسی لیے تو ہم کہتے ہیں:

"اللّٰھم ارزقنی علمًا تامًا"

خدایا! مجھے کامل علم عطا فرما۔

یا کہتے ہیں:

"اللّٰھم ارزقنی الشھادة فی سبیلک"

خدایا! اپنی راہ میں مجھے شہادت نصیب فرما۔

البتہ ممکن ہے کہ زیرِ بحث آیت میں مادی رزق کو مدِ نظر رکھا گیا ہو اگرچہ اس کا عمومی مفہوم بھی زیادہ بعید نہیں ہے۔

۳۔ "مستقر" دراصل قرارگاہ کے معنی میں ہے۔ کیونکہ اس لفظ کی بنیاد مادہ "قر" (بروزن حر) ہے جس کا مطلب ہے سخت سردی جو انسان اور دیگر موجودات زندہ کو خانہ نشین بنا دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ لفظ سکون اور توقف کے معنی میں بھی آیا ہے۔

"مستودع" اور "ودیعہ" ایک ہی مادہ سے ہیں جو درحقیقت کسی کو چھوڑ دینے کے معنی میں ہے۔ وہ تمام امور جو اپنی ناپائیداری سے اصلی اور پائیدار حالت کی طرف پلٹ جاتے ہیں ان کو "مستودع" کہا جاتا ہے اور "ودیعت" بھی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ آخرکار اسے اپنے موجودہ محل و مقام کو چھوڑ کر اپنے اصلی مالک کی طرف پلٹ جانا ہے۔

حقیقت میں مندرجہ بالا آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ تصور ہرگز نہ کیا جائے کہ خدا صرف ان حرکت کرنے والوں کو روزی دیتا ہے جو اپنی اصلی جگہ پر برقرار ہیں اور اصطلاح کے مطابق ان کا حصہ ان کے گھروں میں لے آتے ہیں، بلکہ جہاں کہیں بھی ہوں اور جس کیفیت و حالت میں ہوں ان کی روزی اور رزق کا حصہ انہیں عطا کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ ان (موجودات) کی اصلی قرارگاہ کو بھی جانتا ہے اور جہاں جہاں وہ نقل مکانی کرتے ہیں ان تمام جگہوں سے بھی باخبر ہے اس نے حتیٰ کہ دریائی جانوروں سے لے کر بہت ہی باریک اور آنکھ سے نظر نہ آنے والے جانداروں کے لیے بھی ان کے مناسب رزق مقرر کر دیا ہے۔

یہ رزق اس قدر حساب شدہ اور موجودات کے مناسب حال ہے کہ "مقدار" اور "کیفیت" کے لحاظ سے کاملاً ان کی خواہشات و ضروریات کو پورا کرتا ہے یہاں تک کہ اس بچہ کی غذا جو شکم مادر میں ہے ہر ماہ بلکہ ہر دن دوسرے مہینوں اور دنوں سے مختلف ہے اگرچہ ظاہری طور پر ایک قسم کے خون سے زیادہ نہیں نیز بچہ شیر خواری کے زمانے میں باوجودیکہ ظاہراً پے در پے کئی ماہ تک اس کی ایک قسم کی غذا (دودھ) ہوتی ہے مگر اس دودھ کی ترکیب بھی ہر پہلے دن سے مختلف ہوتی ہے۔

۴۔ "کتاب مبین" کا مطلب ہے واضح و آشکار تحریر اور یہ اشارہ ہے پروردگار کے وسیع علم کے ایک مرحلہ کی جانب کہ جسے کبھی کبھی "لوح محفوظ" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ کسی شخص کو اپنی روزی حاصل کرنے کے سلسلے میں معمولی سے معمولی پریشانی بھی نہیں ہونی چاہیئے اور وہ یہ تصور نہ کرے کہ اپنی روزی کا حصہ پانے میں کبھی اس کا نام درج ہونے سے رہ جائے گا۔ اس لیے کہ تمام موجودات ارضی و سماوی کے نام اس کتاب میں درج ہیں کہ جس میں سب کو شمار اور صریحاً بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح جیسا کہ اگر ایک ادارہ میں کام کرنے والے تمام ملازمین کا نام ایک رجسٹر میں واضح طور پر درج کیا گیا ہو تو کیا ان کا قلم سے رہ جانے کا احتمال ہو سکتا ہے؟

تقسیم رزق اور زندگی کیلئے سعی وکوشش

رزق کے بارے میں بہت سی اہم بحثیں موجود ہیں جن میں سے چند ایک کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے "رزق" کے لغوی معنی استمراری اور دائمی بخشش کے ہیں قطع نظر اس کے کہ وہ مادی ہو یا روحانی و معنوی۔ بنا بریں ہر وہ منفعت جو خدا اپنے بندوں کو نصیب کرے، غذائی مواد، مکان اور لباس میں سے یا علم و عقل، فہم و ایمان اور اخلاص میں سے، ان سب کو رزق کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اس مفہوم کو صرف مادی پہلو میں محدود کرتے ہیں انہوں نے اس کے استعمال کے مواقع کی طرف دقیق توجہ نہیں کی۔ قرآن مجید راہ حق میں شہید ہونے والوں کے بارے میں کہتا ہے:

بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۔

وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار سے رزق حاصل کرتے ہیں (آل عمران - ۱۶۹)۔

واضح ہے کہ شہداء کی روزی اور وہ بھی عالم برزخ میں، مادی نعمتیں نہیں بلکہ وہی روحانی و معنوی حقائق ہیں جن کا تصور کرنا ہمارے لیے اس مادی زندگی میں مشکل ہے۔

۲۔ زندہ موجودات کی ضروریات یا دوسرے لفظوں میں ان کا رزق مہیا کرنے کا معاملہ سب سے زیادہ توجہ طلب مسائل میں سے ہے۔ اس کے اسرار سے وقت گزرنے اور سائنس پیش رفت کے ساتھ ساتھ پردہ اٹھ رہا ہے۔ سائنس اس سلسلے میں تعجب انگیز امور منکشف کر رہی ہے۔

گزشتہ زمانے میں تمام سائنسدان اس فکر میں تھے کہ اگر سمندروں اور دریاؤں کی تہوں میں زندہ موجودات موجود ہیں تو ان کی غذا کس راستے سے ان تک پہنچتی ہو گی کیونکہ غذاؤں کی اصلی بنیاد تو نباتات ہیں جنہیں سورج کی روشنی کی ضرورت ہے جبکہ دریاؤں کی گہرائیوں میں تو . . . میٹر سے آگے مطلقاً روشنی کا وجود نہیں اور اس سے آگے تو گویا ایک ابدی تاریک رات ہے۔ لیکن بہت جلد معلوم ہو گیا کہ سورج کی روشنی نباتات اور سبزے کے باریک ذرات کی سطح آب اور موجوں کے بستر پر پرورش کرتی ہے اور جب وہ اپنے تکامل و ارتقا کا مرحلہ طے کر لیتے ہیں تو پکے ہوئے پھل کی مانند دریاؤں کی گہرائیوں اور تہوں میں چلے جاتے ہیں اور وہاں زندہ موجودات کے لیے خوانِ نعمت ثابت ہوتے ہیں۔

دوسری طرف بہت سے پرندے دریائی مچھلیوں کو اپنی غذا بناتے ہیں۔ حتیٰ کہ کئی قسم کے رات کو پرواز کرنے والے پرندے موجود ہیں جو رات کی تاریکی میں ایک ماہر غوطہ خور کی طرح اپنے شکار کو، جسے مخصوص انواع ریڈار کی طرح پہچانتی ہیں اور اس کی نشاندہی کرتی ہیں، باہر لے آتے ہیں۔

بعض پرندوں کی روزی عظیم الجثہ دریائی جانوروں کے دانتوں کے اندر چھپی ہوتی ہے۔ یہ حیوانات دوسرے دریائی جانوروں کو بطور غذا کھانے کے بعد اپنے دانتوں میں "طبیعی خلال" کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے ساحل کی طرف آتے ہیں اور اپنے منہ کو جو ایک چھوٹی غار سے مشابہت رکھتا ہے کھلا چھوڑ دیتے ہیں وہ پرندے جن کی روزی خدا نے یہاں رکھی ہے بغیر کسی ڈر خوف کے اس غار نما منہ میں داخل ہو جاتے ہیں، اور اس دیو پیکر جانور کے منہ سے اپنی روزی تلاش کر لیتے ہیں۔ اس تیار غذا سے جہاں وہ پرندے شکم سیر ہوتے ہیں وہاں اس جانور کو بھی ان ضرر رساں مادوں سے نجات دلاتے ہیں۔ چنانچہ جب دونوں فریقوں کا مقصد پورا ہو جاتا ہے تو پرندے باہر کو پرواز کر جاتے ہیں اور وہ حیوان آرام و سکون کا احساس کرتے ہوئے اپنا منہ بند کر لیتا ہے اور واپس دریا کی گہرائیوں میں چلا جاتا ہے۔

مختلف موجودات کو روزی بہم پہنچانے کے لیے خداوند عالم کا طریقہ و تدبیر واقعاً حیرت انگیز ہے وہ نطفہ جو مادرِ شکم میں برقرار ہے، سے لے کر قسم قسم کے حشرات الارض تک، جو زمین کی تاریک گہرائیوں، پُرپیچ راستوں، درختوں کی چھالوں، پہاڑوں کی چوٹیوں اور دَرّوں کی پہنائیوں میں زندگی بسر کرتے ہیں اس خداوند عظیم کے علم و بینش سے ہرگز مخفی نہیں ہیں۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے کہ خداوند ان کی قرارگاہ اور حقیقی مسکن سے بھی آگاہ ہے وہ ان کے چلنے پھرنے کی جگہ کو بھی جانتا ہے اور جہاں کہیں بھی ہوں ان کی روزی ان تک پہنچاتا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ زیرِ نظر آیت میں روزی حاصل کرنے والوں کے بارے میں بحث کے دوران انہیں "دابۃ" (چلنے پھرنے والے) اور "جنبندہ" (حرکت کرنے والے) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو "توانائی" (ENERGY) اور "حرکت" (MOTION) میں رابطہ کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی حرکت وجود میں آتی ہے وہ توانائی پیدا کرنے والے مادہ کی محتاج ہوتی ہے یعنی وہ مادہ جو حرکت کا منشا ہے۔ اسی لیے قرآن بھی زیر بحث آیات میں کہتا ہے کہ خدا تمام متحرک موجودات کو روزی دیتا ہے۔

اگر حرکت کی اس کے وسیع تر معنی میں تفسیر کریں تو پھر نباتات بھی اس میں شامل ہوں گے کیونکہ وہ بھی نشوونما میں ایک دقیق و باریک حرکت رکھتے ہیں اسی بنا پر فلسفہ میں حرکت کی ایک قسم "نمو" بھی شمار کی گئی ہے۔

۲۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہر شخص کی روزی اس کی ابتداء سے لے کر آخر عمر تک مقرر و معین ہے اور چاہتے نہ چاہتے اس تک پہنچے گی؟ یا یہ کہ اس کے پیچھے نکلنا چاہیئے۔ بقول شاعر:

شرط عقل است جستن از درہا

یعنی عقل کے لیے شرط ہے کہ اسے اس کے دروازوں سے ڈھونڈا جائے۔

بعض سست اور بے حال لوگ اس آیت کی مذکورہ تعبیر یا ان روایات کا سہارا لیتے ہوئے جو روزی کی مقدار اور اس کے تعین کے بارے میں کچھ بیان کرتی ہیں، یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ انسان تلاش معاش اور روزی مہیا کرنے کے لیے زیادہ سعی و کوشش کرے یا اس کی تلاش میں نکلے کیونکہ روزی انسان کا مقدر ہے اور وہ ہر حالت میں اس تک پہنچے گی اور کوئی بھی شخص روزی سے محروم نہیں رہے گا۔

اس طرح کے نادان افراد جن کو دین و مذہب کے بارے میں بہت کم معرفت ہوتی ہے، دشمنوں کو بہانہ پیدا کرنے کا موقع دیتے ہیں کہ مذہب اقتصادی کساد کا حامل ہے، جو زندگی کی مثبت سرگرمیوں کو ختم کرنے اور خود کو محرومیوں کے سپرد کرنے کے مترادف ہے اس عذر کی بناء پر کہ اگر فلاں نعمت و بخشش مجھے نصیب نہیں ہوئی تو وہ یقیناً میری روزی میں نہیں لکھی ہوگی اور اگر وہ میرے رزق میں شامل ہوتی تو بے چون و چرا مجھے مل جاتی۔ استعمار گروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھ یہ ایک اچھا بہانہ لگا کہ جتنا ہو سکے محروم طبقوں کا خون چوسیں اور انہیں زندگی کی ابتدائی ضروریات سے بھی محروم رکھیں۔

حالانکہ قرآن اور احادیث اسلامی سے معمولی سی آشنائی بھی اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے کافی ہے کہ اسلام ہر قسم کی مادی و معنوی منفعت کے حصول کے لیے کی جانے والی کوششوں کو مثبت شمار کرتا ہے، یہاں تک کہ قرآن کہتا ہے:

لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى

انسان کے لیے کچھ نہیں ماسوا اس کے جتنی اس نے کوشش کی۔

اس فرمان میں انسان کے فائدہ و منفعت کو اس کی کوشش اور کام میں قرار دیا گیا ہے۔ ہادیانِ اسلام دوسروں کے لیے نمونہ عمل مہیا کرنے کے لیے سخت محنت سے کام کرتے تھے۔ انبیاء ماسلف بھی اس کام

سے مستثنٰی نہ تھے انہوں نے چرواہوں کا کام کیا، کپڑے سیئے نیز زرہ بنانے اور ہل چلانے تک کے طاقت آزما کام سرانجام دیئے۔ پس اگر خدا کی طرف سے رزق بہم پہنچانے کا ضامن ہونے سے مراد گھر میں بیٹھے رہنا اور روزی پہنچنے کا انتظار کرنا ہوتا تو انبیاءؑ و آئمہؑ، جو تمام انسانوں سے زیادہ عالم اور مفاہیم دین سے آشنا تھے تلاشِ رزق میں کوشش و جستجو نہ کرتے۔

بنا بریں ہم یہ تو کہتے ہیں کہ ہر شخص کی روزی مقدر اور مسلّم ہے لیکن یہ مشروط ہے اس کی تلاش و کوشش سے لہٰذا جہاں کہیں یہ شرط پوری نہیں ہوگی مشروط بھی دستیاب نہیں ہوگا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم کہیں کہ، ہر شخص کی ایک اجل ہے اور اس کی عمر کی مقدار معین ہے۔ واضح طور پر اس کا مفہوم یہ نہیں کہ اگر کوئی انسان خودکشی کرے یا ضرر رساں چیز کھالے وہ بھی اجل معین تک زندہ رہے گا بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ بدن ایک مناسب مدت تک باقی رہنے کی استعداد رکھتا ہے بشرطیکہ حفظانِ صحت کے اصولوں کا لحاظ رکھا جائے اور ضرر رساں اشیاء سے پرہیز کیا جائے نیز جو چیزیں موت کی جلدی کا سبب بنتی ہیں ان سے دور رہے۔

اہم نکتہ یہ ہے کہ وہ آیات و روایات جو روزی کے معین ہونے سے مربوط ہیں دراصل ایک "بریک" اور حد ہیں، ان حریص اور دنیا پرست لوگوں کے لیے جو زندگی گزارنے کے لیے ہر دروازہ کھٹکھٹاتے پھرتے ہیں اور ہر ظلم و بددیانتی کا ارتکاب کرتے ہیں اس گمان پر کہ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کی زندگی اچھی نہیں گزر سکتی۔ آیات قرآنی اور احادیث اسلامی ایسے افراد کو خبردار کرتی ہیں کہ بے کار ہاتھ پاؤں نہ ماریں اور روزی کمانے کے لیے غیر شرعی اور غیر معقول ذرائع استعمال نہ کریں، بلکہ شرعی طریقے سے سعی و کوشش کرتے ہوئے مطمئن رہیں کہ خدا اس راستے سے ان کی تمام حاجات پوری کردے گا۔ وہ خدا کہ جس نے انہیں ظلمت کدۂ رحم میں فراموش نہیں کیا اور وہ خدا کہ جس نے بچپن میں جب انسان اس دنیا کے مواد غذائیہ سے تغذیہ کی توانائی نہیں رکھتا تھا اس کی مہربان ماں کے پستانوں میں اس کی روزی مہیا کی۔ وہ خدا جس نے شیر خواری کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی جب کہ انسان ناتواں تھا اس کی روزی اس کے مہربان باپ کے ہاتھ میں رکھی جو صبح و شام اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بھی خوش ہو کر ہیں اپنی اولاد کو غذا مہیا کرنے کے لیے زحمت و مشقت اٹھاتا رہا۔

لہٰذا یہ کس طرح ممکن ہے کہ جب انسان بڑا ہو جائے اور ہر قسم کے کام کی توانائی اور قدرت حاصل کرلے خدا اسے بھلا دے۔ کیا عقل و ایمان اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ انسان اس گمان پر کہ ممکن ہے اس کی روزی فراہم نہ ہو گناہ، ظلم و ستم اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرے اور حریص بن کر مستضعفین اور کمزوروں کا حق غصب کرے۔

البتہ اس چیز کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض رزق ایسے ہیں کہ انسان ان کے پیچھے بھاگے یا نہ وہ اس کے پیچھے آتے ہیں مثلاً سورج کی روشنی جو ہماری تلاش و کوشش کے بغیر ہمیں میسر ہے اور ہمارے گھر روشن کرتی

ہے۔ کیا اس کا انکار ممکن ہے کہ بارش اور ہوا بغیر ہماری جد وجہد اور کوشش کے ہماری تلاش میں آتی ہے کیا اس بات کا انکار کیا جاسکتا ہے کہ وہ عقل و ہوش اور قوت و استعداد جو روزِ اوّل سے ہمارے وجود میں رکھ دی گئی تھی ہمیں اس کے لیے جستجو نہیں کرنا پڑی۔

لیکن اس طرح کی نعمتیں جو ہوا کے جھونکے کے ساتھ ہمیں مل گئیں یا یہ کہ وہ نعمتیں جو کوشش کے بغیر خدا کے لطف وکرم سے ہم تک پہنچی ہیں، اگر ہم نے ان کی مناسب نگہداشت وحفاظت نہ کی تو وہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گی یا بے اثر ہوکر رہ جائیں گی۔

حضرت علی علیہ السلام سے ایک مشہور حدیث نقل ہوئی ہے آپؑ نے فرمایا:

واعلم یا بنی! ان الرزق رزقان رزق تطلبه ورزق یطلبك۔

اے فرزند جان لو! رزق دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ کہ تو جس کی جستجو میں نکلے، اور ایک وہ کہ جو تجھے تلاش کرتے ہوئے تیرے پیچھے آتے ہیں[1]

امام علیہ السلام کا یہ فرمان بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اکثر اوقات انسان کسی نعمت یا ضرورت کی تلاش میں سرگرداں نہیں ہوتا مگر حادثات و اتفاقات کے ایک وسیع سلسلہ کے باعث کوئی نعمت اسے نصیب ہو جاتی ہے یہ حوادث اگرچہ ہماری نظر میں اچانک اور اتفاقیہ ہیں لیکن درحقیقت وہ صاحب تخلیق کے حساب کتاب کے عین مطابق ہیں۔ بلاشبہ اس قسم کی روزی کا حساب اس روزی سے جدا ہے جو سعی و کوشش کے نتیجہ میں دستیاب ہوتی ہے، ممکن ہے مندرجہ بالا فرمانِ امیرالمومنینؑ اسی قسم کی روزی کی طرف اشارہ ہو۔

بہرحال نکتہ اساسی یہ ہے کہ تمام تعلیماتِ اسلامی ہمیں متوجہ کرتی ہیں کہ بہترین زندگی گزارنے کے لیے چاہے وہ مادّی ہو یا معنوی زیادہ سے زیادہ کوشش وجستجو کرنی چاہیئے اس لیے کہ کام سے فرار کا یہ جواز غلط ہے کہ روزی تو مقسوم میں لکھی ہے اور مل کر رہے گی۔

۴۔ زیر بحث آیات میں لفظ "رزق وروزی" کی طرف اشارہ ہوا ہے حالانکہ بعد کی چند آیات میں جہاں پر توبہ کرنے والے باایمان افراد کا ذکر ہے "متاع حسن" یعنی شائستہ ومناسب منفعت اور فائدہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان دونوں کا باہم مقابل ہونا ہمیں یہ بات سمجھاتا ہے کہ تمام حرکت کرنے والوں کیلئے وہ انسان ہوں یا حیوان، حشرات الارض ہوں یا درندے اور پرندے، نیک ہوں یا بدسب کے لیے رزق کا حصہ معین ہے۔ لیکن متاع حسن اور شائستہ وگرانبہا نعمتیں صرف صاحبانِ ایمان کے ساتھ مخصوص ہیں جنہوں نے خود کو آب توبہ سے ہر قسم کے گناہ اور آلودگی سے پاک کر لیا ہے اور جو خدائی نعمتوں کو اس کے احکامات کی اطاعت کے تابع رہ کر استعمال کرتے ہیں نہ کہ ہوا وہوس اور سرکشی کی راہ میں۔

---

[1] نہج البلاغہ، امامؑ کی اپنے فرزند امام حسنؑ کے نام وصیت۔

(۷) وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

ترجمہ

(۷) وہ ایسی ذات ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دنوں (چھ ادوار) میں خلق کیے اور اس کا عرش (قدرت) پانی پر ہے (اور یہ اس لیے پیدا کیا) تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کس کا عمل بہتر ہے اور اگر تم کہو کہ تم موت کے بعد دوبارہ مبعوث ہوگے (اور قبروں سے اٹھوگے) تو یقیناً کافر کہیں گے کہ یہ کھلا جادو ہے۔

تفسیر

مقصدِ خلقت

اس آیت میں تین اساسی نکات پر بحث کی گئی ہے۔ اوّل جہانِ ہستی کی آفرینش، خصوصاً آغازِ آفرینش کہ جو پروردگار کی قدرت کی نشانی اور اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ "وہ ایسی ذات ہے جس نے آسمان اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا" (وھو الذی خلق السموٰات والارض فی ستة ایام)۔

اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ یہاں دن سے مراد چوبیس گھنٹے والا دن نہیں ہے اس لیے کہ جس زمانے کی بات ہو رہی ہے اس وقت زمین و آسمان وجود میں آئے تھے نہ کرہ ارض اور نہ ہی اسکی اپنے گرد چوبیس گھنٹوں کی گردش بلکہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس سے مراد ایک "دورانیہ" ہے اب خواہ یہ دورانیہ چھوٹا ہو یا بہت ہی طویل اور کروڑوں سالوں پر مشتمل ہو۔ سورۂ اعراف کی آیت ۵۴ کے

ذیل میں اس بات کی جامع اور مفصل تشریح بیان کی جا چکی ہے لہٰذا تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔[1]

نیز وہاں ہم نے یاد دہانی کروائی تھی کہ خدا قدرت و طاقت رکھتا تھا کہ تمام عالم کو ایک ہی لحظہ میں پیدا کرے لیکن متواتر اور پے در پے چھ ادوار میں اس لیے پیدا کیا ہے کہ یہ تدریجی خلقت جو ہر وقت رنگ نو اور چہرہ تازہ دکھاتی ہے، قدرت و عظمت خداوندی کو بیشتر اور بہتر انداز میں متعارف کرواتی ہے۔

خدا چاہتا تھا کہ اپنی قدرت کو ہزاروں رُخ میں نمایاں کرے ایک ہی رُخ میں نہیں اور اپنی حکمت کو بھی ہزاروں پیراہن میں دیکھے نہ صرف ایک لباس میں۔ تاکہ اس کی ذاتِ مقدس اور قدرت و حکمت کی پہچان آسان تر اور زیادہ واضح ہو اور اس کی معرفت کے دلائل ماہ و سال صدیوں اور زمانوں کی تعداد کے برابر ہمارے پاس موجود ہوں۔

پھر فرمایا کہ "اس (خدا) کا عرش پانی پر تھا۔" (وکان عرشہ علی الماء) اس جملہ کی تفسیر سمجھنے کے لیے ان دو الفاظ "عرش" اور "ماء" کے مفہوم سے آشنا ہونا چاہیئے۔

"عرش" دراصل "چھت" یا "چھت نما" چیز کے معنی میں آیا ہے۔ سلاطین گزشتہ کے بلند تختوں کو بھی عرش کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ان بلند دیواروں اور مقامات کو بھی عرش کہتے ہیں جن پر بیل دار پودوں کو چڑھایا جاتا ہے۔ نیز بعد میں یہ لفظ "قدرت" کے مفہوم میں بھی استعمال ہونے لگا جیسا کہ لفظ تخت فارسی زبان میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

عربی میں کہتے ہیں:

"فلان استوی علی عرشہ - او - ثُلّ عرشہ"

یعنی فلاں آدمی تخت پر بیٹھا یا اس کا تخت گر گیا۔

عربی زبان کا یہ کنایہ کہ اسے اقتدار مل گیا یا اس کا اقتدار ختم ہو گیا فارسی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص کو لوگوں نے تخت پر بٹھا دیا ہے یا فلاں کو تخت سے اتار دیا ہے۔[2]

اس نکتے کی جانب بھی توجہ رکھنا ضروری ہے کہ بعض اوقات عرش مجموعہ عالم ہستی کے معنی میں بھی آیا ہے کیونکہ قدرت خدا کا تخت اس پورے جہان پر محیط ہے۔

باقی رہا لفظ "ماء" اس کا عام معنی تو پانی ہے لیکن بعض اوقات مائع اور بہنے والی اشیاء مثلاً بہنے والی دھاتوں کو بھی "ماء" کہا جاتا ہے۔

ان دو الفاظ کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء خلقت میں جہانِ ہستی پگھلے ہوئے مادہ یا تہ بہ تہ بہنے

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۶۔

[2] البتہ بعض اوقات تخت کرسی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اس کا ایک دوسرا مفہوم ہے جسے ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۱ سورہ بقرہ میں آیۃ الکرسی کے ذیل میں ذکر کیا ہے۔

والی گیس کی شکل میں تھا جس کے بعد اس مانند آب ٹکڑے میں سخت مدّ و جزر اور شکست و ریخت پیدا ہوئی اور اس کے بعض حصّے سطح سے باہر آپڑے۔ اتصال، پیوستگی اور جدائی کا عمل شروع ہوا اور یکے بعد دیگرے سیارے، ستارے اور منظومے (SOLAR SYSTEMS) تشکیل پانے لگے۔ اس لیے جہانِ ہستی اور قدرت کا تخت سب سے پہلے پانی کی مانند (مثل آبگینہ) اس عظیم مادّہ پر قرار پایا۔

سورۃ انبیاء کی آیت ۳۰ میں بھی اسی طرف اشارہ ہوا ہے:

"اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا ؕ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ"

"کیا وہ جو خدا کا انکار کرتے ہیں علم و دانش کی آنکھ سے اس حقیقت کو نہیں دیکھتے کہ آسمان و زمین ابتداء میں ایک دوسرے سے پیوست تھے پھر ہم نے انہیں جدا کیا اور ہر زندہ موجود کو ہم نے پانی سے خلق کیا"۔

نہج البلاغہ کے خطبۂ اوّل میں بھی اسی معنی کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں۔

دوسرا مطلب جس کی طرف مندرجہ بالا آیت اشارہ کرتی ہے، وہ جہانِ ہستی اور عالمِ وجود کی خلقت کا ہدف و مقصد ہے۔ وہی ہدف کہ جس کا اہم ترین حصّہ اس جہان کا گل سرسبد یعنی انسان ہے وہ انسان کہ جسے تعلیم و تربیت کی راہ اپنانا اور تکامل و ارتقاء کی طرف بڑھنا چاہیئے تاکہ وہ ہر لحہ خدا کے قریب ہوتا جائے۔

خداوندِ عالم فرماتا ہے: یہ باعظمت خلقت اس لیے معرضِ وجود میں آئی تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور دیکھے کہ تم میں سے کون اعمالِ حسنہ انجام دیتا ہے (لیبلوکم ایکم احسن عملاً)۔

"لیبلوکم" مادہ "بلاء و ابتلاء" سے آزمائش کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں اشارہ کیا گیا ہے کہ خدا کی طرف سے آزمائش کشفِ احوال اور لوگوں کی داخلی، روحانی اور فکری وضعیت و کیفیت معلوم کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ پرورش اور تربیت کرنے کے لیے ہے (اس موضوع کی تفصیل تفسیر نمونہ جلد اوّل سورۃ بقرہ آیت ۱۵۵ کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے)۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں انسان کی قدر و قیمت کو اس کے "حسنِ عمل" سے مربوط کیا گیا ہے نہ کہ اس کے کثرتِ عمل سے۔ یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ اسلام ہر جگہ کیفیتِ عمل پر نظر رکھتا ہے کثرت و کمیت اور مقدارِ عمل پر نہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اسی سلسلہ میں ایک حدیث نقل ہوئی ہے، آپؑ نے فرمایا:

"لیس یعنی اکثر عملاً و لکن اصوبکم عملاً، و انما الاصابة خشیة الله والنیة الصادقة ثم قال الابقاء علی العمل حتی یخلص اشد من العمل"

والعمل الخالص، الذی لاترید ان یحمدك علیه احد الاالله عزوجل۔

خدا کثرتِ عمل نہیں چاہتا بلکہ عمل کی درستی چاہتا ہے، اور درستیٔ عمل خدا ترسی اور نیک نیتی سے مربوط ہے۔

اس کے بعد فرمایا:

عمل کو ریاکاری اور بدنیتی کی آلودگیوں سے پاک رکھنا خود عمل سے کہیں مشکل تر ہے اور عمل خالص یہ ہے کہ تُو نہ چاہے کہ خدا کے سوا کوئی اور تیری (اس عمل پر) ستائش کرے۔[1]

تیسرا موضوع جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے "معاد" ہے جو آفرینش جہاں کے مسئلہ اور ہدف خلقت سے نہ ٹوٹنے والا رشتہ رکھتا ہے کیونکہ خلقتِ عالم کا مقصد انسانوں کا تکامل و ارتقاء ہے اور انسانوں کا ارتقاء انہیں ایک وسیع تر اور کامل تر جہاں میں زندگی گزارنے کے لیے تیار کرتا ہے، اسی لیے فرمایا: اگر ان سے کہا جائے کہ تم مرنے کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو کافر از روئے تعجب کہتے ہیں کہ اسے باور نہیں کیا جا سکتا اور اس میں کوئی حقیقت و واقعیت نہیں ہے بلکہ یہ ایک واضح جادو ہے (ولئن قلت انکم مبعوثون من بعد الموت لیقولن الذین کفروا ان ھذا الاسحر مبین)۔

کلمہ "ھذا" پیغمبر اکرمؐ کی معاد و قیامت کے بارے میں گفتگو کی طرف اشارہ ہے یعنی کافروں کے نزدیک پیغمبرؐ کا معاد کے بارے یہ دعویٰ جادو ہے اس بناء پر لفظ "سحر" یہاں حقیقت سے عاری بے بنیاد گفتگو اور سادہ و عام تعبیر کے مطابق فریب و شعبدہ بازی کے مترادف ہے کیونکہ جادوگر عموماً حقیقت و واقعیت سے عاری چیزیں دکھاتے ہیں لہٰذا لفظ "سحر" حقیقت سے خالی چیز کے معنی میں استعمال ہو سکتا ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ بعض لوگوں کے نزدیک "ھذا" قرآن مجید کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ قرآن اپنے سننے والوں میں ایک سحر انگیز نفوذ و جذب رکھتا ہے صحیح نظر نہیں آتا کیونکہ آیت میں بحث معاد و قیامت کے بارے میں ہے نہ کہ قرآن کے متعلق اگرچہ قرآن کی غیر معمولی قوتِ جذب سے انکار نہیں۔

۸ وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۠

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۲۰۷۔

(۹) وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ○

(۱۰) وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۚ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ○

(۱۱) اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ○

ترجمہ

(۸) اور اگر عذاب کو ایک محدود وقت کے لیے ان سے ٹال دیں (تو بطور استہزا) کہتے ہیں کہ اس میں کون سی رکاوٹ ہے؟۔ آگاہ رہو جس دن انکی طرف سے عذاب آئے گا تو کوئی چیز اس کے آگے رکاوٹ نہیں بنے گی اور جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے وہی انہیں دامنگیر ہو جائے گا۔

(۹) اور اگر انسان کو ہم نعمت کا مزہ چکھانے کے بعد وہ (نعمت) اس سے واپس لے لیں تو بہت ہی ناشکرا اور ناامید ہو جاتا ہے۔

(۱۰) اور اگر شدت ناراحتی کے بعد اس تک نعمتیں پہنچائیں تو کہتا ہے کہ مشکلات مجھ سے برطرف ہو گئی ہیں جو دوبارہ نہیں آئیں گی اور خوشی، غفلت اور فخر میں مستغرق ہو جاتا ہے۔

(۱۱) مگر وہ لوگ جنہوں نے (سچے ایمان کے سائے میں) صبر و استقامت دکھائی اور عمل صالح انجام دیتے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے۔

تفسیر

مومن عالی ظرف اور بے ایمان کم ظرف ہوتے ہیں

ان آیات میں اس بحث کی مناسبت سے کہ جو بے ایمان افراد کے بارے میں گزر چکی ہے، ایسے افراد کے نفسیاتی حالات اور اخلاقی کمزوریوں کے بعض نکات کی تشریح ہوئی ہے۔ وہی کمزور گوشے جو انسان کو تاریکیوں اور فساد کی راہوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔

ایسے افراد کی پہلی صفت جو ذکر کی گئی ہے وہ حقائق کا مذاق اڑانا اور حیات ساز مسائل کے بارے میں تمسخر کرنا ہے وہ جہالت و نادانی اور غرور و تکبر کی وجہ سے جس وقت خدائی نمائندوں کو بدکاروں کی سزا کے بارے میں ڈراتے دھمکاتے سنتے ہیں جبکہ چند روز گزرنے کے باوجود خدا اپنے لطف و کرم سے ان کے عذاب اور سزا کو تاخیر میں ڈال دیتا ہے تو بڑی بے شرمی اور ڈھٹائی سے کہتے ہیں۔ کس چیز نے اس خدائی عذاب کو تاخیر میں ڈال دیا ہے؟ کیا ہوا اس سزا کا اور کہاں گیا وہ عذاب؟ (ولئن اخرنا عنهم العذاب الى امة معدودة ليقولن ما يحبسه)۔

"امت" مادہ "ام" (بروزن قم) سے ماں کے معنی میں آیا ہے۔ جس کا معنی دراصل مختلف اشیاء کا ایک دوسرے میں ضم ہو جانا ہے۔ اسی بناء پر ہر اس گروہ کو جو اپنے ہدف یا ایک ہی زمان و مکان میں جمع ہو، امت کہا جاتا ہے۔

البتہ یہ لفظ وقت اور زمانے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ کیونکہ زمانے کے اجزاء باہم پیوست ہوتے ہیں یا اس بناء پر کہ ہر جماعت یا گروہ کسی نہ کسی زمانے میں زندگی گزارتا ہے۔ سورۂ یوسف کی آیت ۴۵ میں ہے:

وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ

آزاد شدہ قیدی ایک مدت کے بعد یوسف کو یاد کرنے لگا۔

زیر بحث آیت میں بھی لفظ "امت" انہیں معنی میں آیا ہے۔ لہذا لفظ "معدودۃ" سے توصیف کیا گیا ہے یعنی اگر تھوڑی مدت کے لیے ان سے عذاب مؤخر کر دیا جائے تو کہتے ہیں کہ کون سی چیز اس سے مانع ہوئی ہے۔

پس یہ شیوہ اور طریقہ تمام مغرور اور جاہلوں کا ہے کہ جو چیز ان کے میلانات سے مطابقت نہ رکھے وہ ان کی نگاہ میں مذاق ہے۔ اسی لیے وہ مردانِ حق کی ہلا دینے اور بیدار کرنے والی دھمکیوں کو شوخی اور مذاق سمجھتے ہیں لیکن قرآن مجید ان کو صراحت کے ساتھ جواب دیتا ہے: "آگاہ رہو جس دن خدائی

عذاب آن پہنچا کوئی چیز اسے روک نہیں سکے گی اور جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے تھے وہ (عذاب) ان پر نازل ہوگا اور انہیں تباہ و برباد کر دے گا (الا یوم یأتیھم لیس مصروفا عنھم و حاق بھم ما کانوا بہ یستھزءون)۔

یہ درست ہے کہ اس وقت ان کا نالہ و فریاد آسمان تک بلند ہوگا اور اپنی شرم انگیز گفتگو سے پشیمان ہوں گے لیکن نہ وہ نالہ و فریاد کہیں پہنچے گا اور نہ وہ پشیمانی انہیں کوئی فائدہ دے گی۔

ان کی کمزوری کا ایک اور نکتہ مشکلات و ناراحتیوں اور برکات الٰہی کے منقطع ہونے پر ان کی کم ظرفی ہے۔ جیسا کہ بعد والی آیت میں آیا ہے: اور جس وقت کسی نعمت اور رحمت کا مزہ ہم انسان کو چکھائیں اور پھر وہ اس سے واپس لے لیں تو وہ مایوس اور ناامید ہو جاتا ہے اور کفران نعمت اور ناشکری پر اتر آتا ہے (ولئن اذقنا الانسان منا رحمۃ ثم نزعناھا منہ انہ لیئوس کفور)۔

اگرچہ اس آیت میں گفتگو انسان کے بارے میں بطور کلی آئی ہے، لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ لفظ "انسان" سے اس قسم کی آیات میں غیر تربیت یافتہ، خود غرض اور ناکارہ انسانوں کی طرف اشارہ ہے۔ اسی بنا پر یہ بحث گزشتہ آیات میں بے ایمان افراد کے متعلق بحث پر منطبق ہوتی ہے۔

بے ایمان افراد کی کمزوری کا تیسرا نکتہ یہ ہے کہ جس وقت وہ ناز و نعمت میں ڈوبے ہوتے ہوتے ہیں تو ان پر تکبر و غرور اور نفس پرستی اس قدر چھائی ہوتی ہے کہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: اور اگر تکالیف اور ناراحتیوں کے بعد انسان کو نعمتیں مل جائیں تو وہ مغرور ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ تمام مشکلات و تکالیف اب مجھ سے دور ہو گئی ہیں جو کبھی دوبارہ نہ آئیں گی۔ اسی بنا پر بہت زیادہ مسرت، فخر و مباہات اور بے جا غرور و تکبر اسے سر سے پاؤں تک گھیر لیتا ہے۔ اور یوں وہ پروردگار کی نعمتوں کے شکرانے سے غافل ہو جاتا ہے (ولئن اذقناہ نعماء بعد ضراء مستہ لیقولن ذھب السیئات عنی انہ لفرح فخور)۔

اس آیت کے جملہ "ذھب السیئات عنی" میں ایک دوسرا احتمال بھی پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ جب اس طرح کے لوگ شدائد و مشکلات میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور پھر خدا اپنے لطف و کرم سے شدائد و مشکلات کو نعمتوں سے بدل دیتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ گزشتہ مصائب ہمارے گناہوں کا کفارہ تھے۔ اب ہمارے گناہ ان کی وجہ سے دھل گئے ہیں اور ہم پاک و پاکیزہ ہو گئے ہیں اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ مقربان درگاہ خدا ہو چکے ہیں توبہ اور اس خدا کی بارگاہ میں بازگشت کے تصور سے عاری ہو جاتے ہیں۔

پس فرمایا: صرف صاحبان ایمان کہ جنہوں نے زندگی کے شدائد اور سخت حوادث کے مقابلے میں صبر اور استقامت کو اختیار کیا اور جو ہر حال میں اعمال صالح بجا لانے میں کوتاہی نہیں کرتے، تنگ نظری،

ناشکر گزاری اور غرور و تکبر سے کنارہ کش ہیں جو نہ تو وفور نعمت کے وقت مغرور ہوتے اور خدا کو فراموش کرتے ہیں اور نہ ہی شدت مصائب کے وقت مایوسی اور کفران نعمت کرتے ہیں بلکہ ان کی عظیم روح اور بلند فکر نعمت و بلا دونوں کو برداشت کرتی ہے۔ وہ یاد خدا اور اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہوتے، یہی لوگ خدا کے مقرب بندے ہیں اور انہی کے لیے بخشش اور بہت بڑا اجر ہے (الا الذین صبروا و عملوا الصالحات اولیٰک لھم مغفرة واجر کبیر)۔

چند توجّہ طلب نکات

۱۔ امت معدودہ اور یاران مہدی علیہ السلام : وہ متعدد روایات جو طرق اہل بیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں ان میں ۔امت معدودة۔ سے مراد بہت تھوڑے افراد اور حضرت امام مہدی علیہ السلام کے یار و انصار کی طرف اشارہ سمجھا گیا ہے۔ لہٰذا اس ترتیب سے پہلی آیت کا مطلب اس طرح ہوگا، اگر ہم ستمگروں اور بدکاروں کی سزا و عذاب حضرت مہدیؑ اور ان کے یار و انصار کے قیام تک ملتوی کر دیں تو وہ (منکرین) کہتے ہیں کہ کس چیز نے عذاب خدا کو روک رکھا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں آیت کے ظاہری معنی ہیں ۔ امت معدودة۔ محدود و معین زمانہ کے معنی میں آتا ہے اور امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام سے بھی اس آیت کی تفسیر میں جو روایت نقل ہوئی ہے اس میں ۔امت معدودة۔ کی یہی تفسیر بیان ہوئی ہے۔

بنا بریں ممکن ہے منقولہ روایت آیت کے دوسرے معنی یا بطن آیت کی طرف اشارہ ہو البتہ اس صورت میں ظالموں اور ستمگروں کے بارے میں ایک قانون کلی کا بیان ہوگا نہ کہ زمانہ پیغمبر اکرمؐ کے مشرکین اور مجرموں سے مربوط مسئلہ ہوگا۔ نیز ہم جانتے ہیں کہ قرآن کی آیات مختلف معانی رکھتی ہیں، ممکن ہے اس کا پہلا اور ظاہری مطلب کسی خاص مسئلہ یا گروہ سے متعلق ہو۔ لیکن اس کا دوسرا معنی ایک عام معنی ہو جو کسی زمانہ یا گروہ میں منحصر نہ ہو۔

۲۔ کوتاہ فکری کے چار مظاہر : مندرجہ بالا آیت نے مشرکین اور گنہگاروں کے روحانی و باطنی حالات کی تین صورتوں میں تصویر کشی کی ہے اور ان میں ان کے چار اوصاف بیان ہوتے ہیں۔

اوّلین یہ کہ وہ نعمتوں کے منقطع ہونے کی صورت میں ۔ یئوس ۔ یعنی بہت ہی ناامید ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ۔ کفور ۔ یعنی بہت ہی ناشکرے ہیں۔

اس کے برعکس جب وہ نعمت میں مستغرق ہوتے ہیں یہاں تک کہ اگر چھوٹی سی نعمت بھی ان تک پہنچتی ہے تو وہ خوشی میں اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں اور لذت و نشاط میں غرق ہو کر ہر چیز سے غافل ہو جاتے ہیں۔ بادۂ لذت و غرور کی یہ سرمستی انہیں فتنہ و فساد اور حدود اللہ سے تجاوز کی طرف کھینچ لے

جاتی ہے۔

مزید برآں ایسے لوگ "فخور" یعنی نعمت کے حصول پر بہت متکبر اور مباہات کا شکار ہو جاتے ہیں۔

بہر کیف یہ چار صفات کوتاہ فکری اور کم ظرفی کی بناء پر معرض وجود میں آتی ہیں اور یہ بے ایمان اور گناہ گار افراد کے کسی ایک گروہ سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ سلب ہونے کے لیے عمومی اوصاف کے ایک سلسلہ میں سے ہیں۔

البتہ صاحب ایمان لوگ جو بلند فکر، اعلیٰ ظرف، کشادہ دل اور عظیم روح کے حامل ہوتے ہیں انہیں نہ زمانہ کی دگرگونیاں لرزاتی ہیں نہ نعمتوں کا چھن جانا انہیں ناشکری و مایوسی کی طرف کھینچ لے جاتا ہے اور نہ ہی نعمتوں کا ان کی طرف رُخ کرنا انہیں غرور و غفلت میں مبتلا کرتا ہے۔

اسی لیے آخری آیت میں استثنائی صورت حال کے پیش نظر لفظ ایمان کی بجائے صبر و استقامت استعمال کیا گیا ہے (غور طلب نکتہ ہے)۔

۳۔ کم ظرفی کی انتہا: ایک اور نکتہ جو توجہ طلب ہے یہ ہے کہ دونوں مواقع (عطا کے بعد نعمت کے سلب ہونے اور سلب کے بعد عطا ہونے) کے لیے "اذقنا" جو مادہ "اذاقہ" سے چکھنے کے معنی میں آیا ہے، کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اس قدر کم ظرف ہیں کہ اگر تھوڑی سی نعمت انہیں دی جائے اور پھر اسے ان سے لے لیا جائے تو ان کی داد و فریاد اور ناشکری کی صدا بلند ہوتی ہے اور اگر تکلیف و ناراحتی کے بعد ذرا سی نعمت انہیں مل جائے تو فرط و انبساط میں سر کے بل دوڑتے ہیں۔

۴۔ تمام نعمات عطیہ و بخشش ہیں: یہ امر توجہ طلب ہے کہ پہلی آیت میں نعمت کو لفظ "رحمت" سے بیان کیا گیا ہے اور دوسری آیت میں لفظ "نعمت" استعمال ہوا ہے۔ ممکن ہے اس سے یہ اشارہ مقصود ہو کہ خدا کی تمام نعمتیں اس کے فضل و رحمت کے ذریعے انسان تک پہنچتی ہیں نہ کہ استحقاق کی بنیاد پر اور اگر نعمتیں استحقاق کی بنیاد پر میسر ہوتیں تو بہت ہی تھوڑے لوگوں کو میسر آتیں یا کسی شخص کو بھی میسر نہ آتیں۔

۵۔ اعمالِ نیک کے اثرات: اعمالِ نیک کے دو اثرات ذکر ہوتے ہیں۔ زیر نظر آخری آیت میں باایمان، صاحبِ استقامت اور صالح افراد سے "مغفرت" اور بخشش گناہ کا وعدہ بھی کیا گیا ہے اور "اجر کبیر" کا بھی۔ یہ اس جانب اشارہ ہے کہ نیک اعمال کے دو اثر ہیں ایک گناہوں کا دھل جانا اور دوسرا بہت بڑی جزا کا حاصل ہونا۔

(۱۲) فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوحٰىٓ اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ

إِنَّمَآ أَنْتَ نَذِيرٌ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ وَكِيلٌ ۝

(۱۳) أَمْ يَقُولُونَ افْتَرٰىهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُونِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ۝

(۱۴) فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوٓا أَنَّمَآ أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَأَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ أَنْتُمْ مُّسْلِمُونَ ۝

ترجمہ

(۱۲) شاید بعض آیات کی تبلیغ کو جن کی تجھ پر وحی ہوئی ہے تو تاخیر میں ڈال دیتا ہے اور تیرا دل اس بنا پر تنگ (اور ناراحت) ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ کیوں اس پر خزانہ نازل نہیں ہوتا یا کیوں فرشتہ اس کے ہمراہ نہیں آیا (تبلیغ کرو اور پریشان نہ ہو کیونکہ) تم صرف ڈرانے والے (اور خدائی خطرات سے آگاہ کرنے والے) ہو اور خدا ہر چیز کا نگہبان دیکھنے والا ہے (اور وہ ان کا حساب کتاب رکھتا ہے)۔

(۱۳) بلکہ وہ کہتے ہیں یہ (قرآن کی) جھوٹی نسبت (خدا کی طرف) دیتا ہے۔ ان سے کہہ دو اگر سچ کہتے ہو تو تم بھی ان جیسی جھوٹی موٹی ہی دس سورتیں لے آؤ اور (بجز خدا) اپنی حسب استطاعت (اس کام کے لیے) تمام لوگوں کو دعوت دو۔

(۱۴) اور اگر وہ تمہاری دعوت قبول نہ کریں تو جان لو کہ (یہ کلام) علم الٰہی کے ساتھ نازل ہوا ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ کیا ان حالات میں سرِ تسلیم خم کرو گے؟۔

شانِ نزول

ان آیات کے لیے دو شانِ نزول مذکور ہیں جو ممکن ہے دونوں صحیح ہوں۔
پہلا یہ کہ کفارِ مکہ کا ایک گروہ پیغمبر اکرمؐ کے پاس آیا۔ وہ کہنے لگے: اگر سچ کہتے ہو کہ تم خدا کے پیغمبرؐ ہو تو مکہ کے پہاڑ ہمارے لیے سونے کے کر دو یا فرشتے لے آؤ جو تمہاری نبوت کی تصدیق کریں۔ چنانچہ ان کے جواب میں مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔
دوسری شانِ نزول حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: میں نے خدا سے درخواست کی ہے کہ وہ میرے اور تمہارے درمیان برادری اور اخوت قائم کرے اور یہ درخواست قبول ہوگئی ہے۔ نیز میں نے یہ درخواست کی ہے کہ تمہیں میرا وصی قرار دے اور یہ درخواست بھی مستجاب ہوئی ہے۔
جس وقت یہ گفتگو بعض مخالفین کے کانوں تک پہنچی تو عداوت و دشمنی کی بناء پر کہنے لگے خدا کی قسم ایک خشک مشک میں ایک من خرما بہتر ہے اس سے جو محمدؐ نے اپنے خدا سے درخواست کی ہے۔ (اگر وہ سچ کہتا ہے تو) کیوں خدا سے درخواست نہیں کی کہ دشمنوں کے خلاف مدد کرنے کے لیے کوئی فرشتہ نازل فرمائے یا کوئی خزانہ جو اسے فقر و فاقہ سے نجات دلائے۔
لہٰذا مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں تاکہ دشمنوں کو جواب دیا جا سکے۔

تفسیر

قرآن ایک معجزۂ جاوداں

ان آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ بعض اوقات دشمنوں کی شدید مخالفت اور ہٹ دھرمی کی بناء پر بعض آیات کی تبلیغ کسی بعد کے موقع کے لیے ملتوی رکھتے تھے۔
لہٰذا زیر بحث پہلی آیت میں خداوند عالم اس بیان کے ساتھ اپنے پیغمبرؐ کو اس کام سے منع فرماتا ہے: گویا بعض آیات کی تبلیغ کہ جن کی تم پر وحی ہوتی ہے، ترک کر دیتے ہو اور اس لحاظ سے تمہارا دل تنگ اور مضطرب ہو جاتا ہے (فلعلک تارک بعض ما یوحی الیک وضائق بہ صدرک)۔
اور اس بات سے ناراحت ہو جاتے ہو کہ شاید وہ تجھ سے من پسند معجزات کی خواہش کریں، اور کہتے ہیں کیوں اس پر خزانہ نازل نہیں ہوا یا کیوں اس کے ہمراہ فرشتہ نہیں آیا: (ان یقولوا لولا انزل علیہ کنز او جاء معہ ملک)۔
البتہ جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات سے مثلاً سورۂ بنی اسرائیل کی آیۃ ۹۰ تا ۹۳ سے معلوم ہوتا ہے

کہ ان کا تقاضا اس بنا پر نہ تھا کہ وہ قبولِ حق کے لیے اور دعوت کی صداقت کے لیے معجزہ دیکھیں بلکہ وہ یہ تقاضا بہانہ جوئی، ہٹ دھرمی اور عناد کے باعث کرتے تھے لہٰذا قرآن بلافاصلہ کہتا ہے: تو صرف خوف دلانے اور ڈرانے والا ہے (انما انت نذیر) یعنی چاہے قبول کریں یا نہ کریں، تمسخر اڑائیں اور ہٹ دھرمی سے کام لیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: خدا ہر چیز کا حافظ، نگہبان اور ناظر ہے (واللّٰہ علی کل شیء وکیل) یعنی ان کے ایمان و کفر کی پرواہ نہ کرو اور یہ معاملہ تمہارے ساتھ مربوط نہیں ہے۔ تمہاری ذمہ داری ابلاغ اور پیغام پہنچانا ہے۔ خدا خود جانتا ہے کہ ان کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرے۔ اور وہی ان کے ہر کام کا حساب کتاب رکھنے والا ہے۔

یہ بہانہ جوئی اور اعتراض تراشی چونکہ اس بنا پر تھی کہ وہ اصولی طور پر وحی الٰہی کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ یہ آیات خدا کی طرف سے نہیں ہیں، بلکہ محمدؐ نے خود جھوٹ موٹ خدا پر باندھے ہیں، اسی لیے بعد والی آیت اس بات کا جواب جتنی صراحت سے ہو سکتا تھا دیتے ہوئے کہتی ہے: وہ کہتے ہیں کہ اس (پیغمبرؐ) نے یہ (آیات) خدا پر افتراء باندھی ہیں (ام یقولون افتراه)۔ ان سے کہہ دو اگر سچ کہتے ہو کہ یہ انسانی دماغ کی تخلیق ہیں تو تم بھی اس قسم کی دس جھوٹی سورتیں بنا کر لاؤ اور خدا کو چھوڑ کر جس سے ہو سکتا ہے اس ہی مدد کی دعوت دو (قل فاتوا بعشر سور مثله مفتریات وادعوا من استطعتم من دون اللّٰه ان کنتم صادقین)۔ لیکن اگر انہوں نے تم مسلمانوں کی دعوت قبول نہ کی اور کم از کم ایسی دس سورتیں بھی نہ لاسکے تو پھر جان لو کہ یہ کمزوری اور ناتوانی اس بات کی نشانی ہے کہ ان آیات کا سرچشمہ علم الٰہی ہے ورنہ اگر یہ فکر بشر کی تخلیق ہوتیں تو وہ بھی بشر ہی ہیں (فان لم یستجیبوا لکم فاعلموا انما انزل بعلم اللّٰه)۔

نیز جان لو کہ خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور ان آیات پُر اعجاز کا نزول اس حقیقت کی دلیل ہے (وان لا الٰه الا هو)۔

اے مخالفین! کیا اس حالت میں تم فرمانِ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو گے (فهل انتم مسلمون)۔ باوجودیکہ ہم نے تمہیں مقابلے کی دعوت دی ہے اور اس دعوت پر تمہارا عجز ثابت ہو گیا ہے کیا اس کے باوجود کوئی شک کی گنجائش باقی ہے کہ یہ آیات خدا کی طرف سے ہیں۔ اس واضح معجزہ کے ہوتے ہوئے کیا پھر بھی تم انکار کی راہ پر چلو گے یا سرِ تسلیم خم کرو گے۔

چند اہم نکات

۱۔ آیت میں "لعل" کا مفہوم: جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ "لعل" عام طور پر کسی چیز کے انجام کے

بارے میں توقع کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ البتہ یہاں یہ لفظ نفی کے معنی میں آیا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ایک باپ اپنے بیٹے کو کسی چیز سے روکنا چاہتا ہو تو کہے: شاید تیری دوستی اس شخص سے جو اچھے کاموں میں ارادہ پختہ نہیں ہے۔ یعنی اس سے دوستی نہ رکھ کیونکہ اس کی دوستی تجھے شکست اور بے کار بنا دے گی۔ لہٰذا ایسے مواقع پر "لعل" "اگرچہ" "شاید" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تاہم اس کا التزامی مفہوم کسی کام کے کرنے سے روکنا ہے۔

زیر بحث آیات میں بھی خدا تعالےٰ اپنے پیغمبر کو تاکید کرتا ہے کہ آیات الٰہی کی تبلیغ مخالفین کی تکذیب کے ڈر سے یا دل خواہ ہٹ دھرمی کے تقاضے کی وجہ سے تاخیر میں نہ ڈالیں۔

۲۔ آیات الٰہی کی تبلیغ میں تاخیر؟ : یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیونکر ممکن ہے کہ پیغمبر آیات الٰہی کی تبلیغ میں تاخیر کریں یا ان کی تبلیغ سے بالکل ہی رک جائیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ نبی سے کوئی گناہ یا خطا سرزد نہیں ہو سکتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جس وقت پیغمبر کسی حکم کی فوری تبلیغ پر مامور ہوں تو یقیناً بغیر کسی شک و شبہ کے وہ اس کی تبلیغ کریں گے لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تبلیغ کا وقت وسیع ہوتا ہے اور پیغمبر بعض وجوہات کے پیش نظر جو ان کی اپنی طرف سے نہیں ہوتیں بلکہ مکتب کے دفاع اور حمایت ہی کے حوالے سے ہوتی ہیں ان کی تبلیغ میں تاخیر کر دیتے ہیں۔ مسلم ہے کہ یہ گناہ نہیں جیسا کہ اس کی نظیر سورۂ مائدہ کی آیت ۶۷ میں ہے کہ خدا اپنے پیغمبر کو تاکید کرتا ہے کہ آیات الٰہی کی تبلیغ کریں اور لوگوں کی دھمکیوں سے نہ ڈریں اور خدا ان کی حفاظت کرے گا۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔

درحقیقت یہاں تبلیغ میں تاخیر حرام نہ تھی۔ تاہم قاطعیت کے اظہار کے طور پر اس میں جلدی کرنا بہتر تھا۔ اس طریقے سے خدا اپنے پیغمبر کی نفسیاتی حوالے سے تقویت چاہتا ہے اور مخالفین کے سامنے ان کی قاطعیت اور اٹل فیصلے کو استقامت دینا چاہتا ہے تاکہ وہ ان کے شور شرابے، بے بنیاد تقاضوں، بہانہ سازیوں اور تمسخر سے پریشان نہ ہوں۔

۳۔ آیت میں "ام" کا معنی : زیر نظر دوسری آیت "ام يقولون افتراه ..." کی ابتداء میں لفظ "ام" کے بارے میں مفسرین نے دو احتمالات ذکر کیے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ "او" (یا) کے معنی میں ہے اور دوسرا یہ کہ یہ "بل" (بلکہ) کے معنی میں ہے۔

پہلی صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا: "شاید تو نے ہماری آیات کو مخالفین کی بہانہ سازیوں کے خوف سے انکی نہیں سنایا یا یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ تو نے آیات پڑھی ہیں لیکن انہوں نے انہیں خدا پر افتراء سمجھا ہے۔

دوسری صورت میں آیت کا معنی اس طرح ہوگا کہ آیات الٰہی کی تبلیغ میں ان کی بہانہ سازی کی وجہ سے تاخیر نہ کرو۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ یہ لوگ تو بنیادی طور پر وحی اور نبوت کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ پیغمبر نے خدا پر افتراء باندھا ہے۔

درحقیقت اس بیان کے ذریعے خدا اپنے پیغمبر کو خبر دیتا ہے کہ من پسند کے معجزات کے بارے میں ان کے تقاضے تلاش حقیقت کی بنا پر نہیں بلکہ اس لیے ہیں کہ وہ اصولی طور پر نبوت کے منکر ہیں اور یہ سب ان کے بہانے ہیں۔

بہرحال مندرجہ بالا آیات کے مفہوم میں غور و خوض سے اور خصوصاً ادبی لحاظ سے ان کے الفاظ میں دقت نظر سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرا معنی آیات کے مفہوم سے زیادہ نزدیک ہے (غور کیجئے گا)۔

۴۔ معجزہ طلبی کا جواب: اس میں شک نہیں کہ پیغمبر کے لیے ضروری ہے کہ متلاشیان حق کے لیے اپنی حقانیت کے ثبوت کے طور پر معجزہ پیش کرے اور کوئی پیغمبر بھی صرف اپنے دعویٰ کو کافی نہیں سمجھ سکتا لیکن اس میں شک نہیں کہ جن مخالفین کا مندرجہ بالا آیات میں ذکر آیا ہے وہ حقیقت کی تلاش میں نہیں تھے۔ وہ جن معجزات کا مطالبہ کرتے تھے وہ ان کے من پسند کے معجزات تھے۔ مسلم ہے کہ ایسے لوگ بہانہ جو ہوتے ہیں نہ کہ حقیقت کے متلاشی۔ کیا حتماً ضروری ہے کہ پیغمبر کے پاس بہت بڑا خزانہ ہو جیسا کہ مشرکین مکہ کا خیال تھا یا کیا ضروری ہے کہ فرشتہ اس کے ہمراہ تبلیغ رسالت کرے۔ علاوہ ازیں کیا خود قرآن ہر معجزہ سے برتر اور بالاتر نہیں تھا۔ اگر واقعاً ان کا مقصود بہانہ تراشی نہ تھا تو پھر قرآن کی اس بات پر کان کیوں نہیں دھرتے تھے کہ اگر تمہارا خیال ہے کہ یہ آیات پیغمبر اپنی طرف سے لے آتا ہے تو جاؤ تم بھی اس کی مثل لے آؤ اور دنیا کے تمام لوگوں کی مدد بھی حاصل کر لو۔

۵۔ قرآن کا چیلنج: مندرجہ بالا آیات میں دوبارہ اعجاز قرآن کے بارے میں تاکید کی گئی ہے کہ یہ کوئی عام سی گفتگو نہیں ہے اور نہ یہ انسانی ذہن کی اختراع ہے بلکہ آسمانی وحی ہے جس کا سرچشمہ خدا کا بے پایاں اور لامتناہی علم اور قدرت ہے۔ اسی بنا پر ساری دنیا کو چیلنج کیا گیا ہے اور مقابلہ کی دعوت دی گئی ہے اور اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ رسول اللہ کے ہم عصر بلکہ وہ قومیں جو آج تک اس کام میں لگی ہوئی ہیں ایسا کرنے سے عاجز ہیں۔ یہ قومیں دیگر تمام تر مخالفت تو جاری رکھے ہوئے ہیں لیکن آیات قرآن کا مقابلہ کرنے کی طرف نہیں آتیں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایسا کلام انسان کے بس میں نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے۔ تو کیا معجزہ اس کے علاوہ کسی چیز کا نام ہے۔

قرآن میں یہ آواز آج بھی ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے، یہ معجزہ جاودانی آج بھی اسی طرح عالمین سارے کا سامنا کر کے اپنی طرف دعوت دے رہا ہے اور دنیا کے تمام علمی مراکز کو چیلنج کر رہا ہے۔ اس کا چیلنج

نہ صرف فصاحت و بلاغت یعنی عبارات کی شیرینی و جاذبیت اور مفاہیم کی رسائی کے لحاظ سے ہے بلکہ:

- اس کے مضامین کے اعتبار سے بھی،
- ان علوم کے لحاظ سے بھی جو اس زمانے کے انسانوں سے پنہاں تھے،
- قوانین و احکام کے حوالے سے بھی جو بشریت کی سعادت و نجات کے ضامن ہیں،
- بیانات کے حوالے سے بھی جو ہر قسم کے تناقض اور پراگندگی سے پاک ہیں،
- تواریخ کے اعتبار سے بھی جو خرافات سے مبرا ہیں، اور
- اسی طرح تمام حوالوں سے اس کا یہ چیلنج ہے۔

تفسیر نمونہ جلد اول سورہ بقرہ کی آیات ۲۳ اور ۲۴ کی تفسیر کے ذیل میں ہم اعجاز قرآن کے بارے میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔

۶۔ پورا قرآن، دس سورتیں یا ایک سورت: جیسا کہ ہم جانتے ہیں، قرآن مجید نے ایک جگہ مخالفین کو قرآن کی مثل لانے کی دعوت دی ہے (بنی اسرائیل ـ ۸۸)۔ دوسری جگہ قرآن جیسی دس سورتیں لانے کے لیے کہا ہے (مثلاً محل بحث آیات) اور ایک اور جگہ قرآن کی ایک سورت جیسی سورت لانے کا کہا ہے (بقرہ ـ ۲۳)۔ اس بناء پر بعض مفسرین نے یہ بحث کی ہے کہ چیلنج اور مقابلے کی اس دعوت میں اتنا فرق کیوں ہے؟

اس سوال کے جواب میں مختلف راستے اختیار کیے گئے ہیں:

(۱) بعض کا نظریہ ہے کہ یہ فرق اوپر کے مرحلہ سے نیچے کے مرحلہ کی طرف تنزل کی مانند ہے۔ جیسے ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے کہ تم بھی اگر میری طرح فن تحریر اور شعر گوئی میں مہارت رکھتے ہو تو میری کتاب جیسی کتاب لکھ کر دکھاؤ۔ پھر کہتا ہے اس کے ایک باب جیسی تحریر ہی پیش کرو حتیٰ کہ ایک صفحہ ہی لکھ کر دکھا دو۔

البتہ یہ جواب اس صورت میں صحیح ہے کہ سورہ بنی اسرائیل، سورہ ہود، سورہ یونس اور سورہ بقرہ اسی ترتیب سے نازل ہوئی ہوں اور "تاریخ القرآن" میں "فہرست ابن ندیم" سے جو ترتیب نقل ہوئی ہے یہ بات اس سے مناسبت رکھتی ہے کیونکہ اس کے مطابق رسول اللہ پر نزول کے اعتبار سے سورہ بنی اسرائیل کا نمبر ۴۸ ہے، ہود کا نمبر ۴۹، یونس کا نمبر ۵۱ ہے اور بقرہ کا نمبر ۹۹ ہے۔

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ بات مشہور ترتیب سے مناسبت نہیں رکھتی جو مندرجہ بالا سورتوں کے متعلق اسلامی تفاسیر میں بیان کی گئی ہے۔

(ب) بعض نے کہا ہے کہ اگرچہ یہ سورتیں ترتیب نزول کے اعتبار سے اوپر سے نیچے کی طرف تنزل کے معاملے پر منطبق نہیں ہوتیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایک سورت کی تمام آیتیں ایک ہی مرتبہ نازل نہیں ہو

جاتی تھیں بلکہ بہت سی آیات ایسی ہوتیں جو بعد میں نازل ہوتیں اور رسول اللہؐ کے حکم سے اپنی مناسبات کی وجہ سے قبل کی سورت میں قرار پاتیں۔ زیر بحث معاملے میں بھی ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو لہٰذا مندرجہ بالا سورتوں کی تاریخ نزول اس بات کے منافی نہیں ہے کہ یہاں اوپر سے نیچے کی طرف تنزل کا معاملہ ہو۔

(ج) اس سوال کے جواب میں ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ اصولاً "قرآن" ایک ایسا لفظ ہے جو پورے قرآن کے لیے بھی بولا جاتا ہے اور قرآن کے کچھ حصے پر بھی۔ مثلاً سورہ جن کی ابتداء میں ہے:

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا

ہم نے عجیب قرآن سنا ہے۔

واضح ہے کہ انہوں نے قرآن کا کچھ حصہ ہی سنا تھا۔

اصولی طور پر قرآن مادہ "قرائت" سے ہے اور ہم جانتے ہیں کہ قرائت و تلاوت پورے قرآن پر بھی صادق آتی ہے اور جزو قرآن پر بھی۔ لہٰذا مثل قرآن لانے کے چیلنج کا مفہوم تمام قرآن نہیں ہے بلکہ یہ دس سورتوں کے لیے بھی ٹھیک ہے اور ایک سورت کے لیے بھی درست ہے۔

دوسری طرف "سورہ" بھی "مجموعہ" اور "محدودہ" کے معنی میں ہے اور یہ لفظ آیات کے کسی بھی مجموعہ پر منطبق ہو جاتا ہے اگرچہ عام اصطلاح میں جسے مکمل سورۃ کہتے ہیں یہ اس کے بھی برابر نہ ہو۔

دوسرے لفظوں میں "سورۃ" دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک معنی آیات کا وہ مجموعہ ہے جس کا ایک معین مقصد ہو اور دوسرا معنی ایک مکمل سورۃ ہے جو بسم اللہ سے شروع ہو کر بعد والی سورت کی بسم اللہ سے پہلے ختم ہو جائے۔ اس بات کی شاہد سورہ توبہ کی آیت ۸۶ ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ ....

جس وقت کوئی سورت نازل ہوتی ہے کہ خدا پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو...

واضح ہے کہ یہاں سورہ سے مراد وہ آیات ہیں جو خدا پر ایمان اور جہاد کے مذکورہ مقصد کے بارے میں ہیں اگرچہ وہ ایک مکمل سورت کا ایک حصہ ہی ہوں۔

مفردات میں راغب نے بھی سورۃ نور کی پہلی آیت "سورة انزلناها" کی تفسیر میں کہا ہے:

ای جملة من الاحکام والحکم ....

جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں یہاں سورت کو احکام کا ایک مجموعہ قرار دیا گیا ہے۔

اس گفتگو کے پیش نظر قرآن، سورت اور دس سورتوں میں لغوی مفہوم کے لحاظ سے کوئی خاص فرق نہیں رہتا یعنی ان تمام الفاظ کا اطلاق قرآن کی چند آیتوں پر ہو سکتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا چیلنج ایک لفظ اور ایک جملے کے لیے نہیں کہ کوئی دعویٰ کرے کہ میں آیہ "والضحیٰ" اور آیہ "مدھامتان" یا

قرآن جیسی کسی سادہ جملہ کی مثل لا سکتا ہوں بلکہ یہاں تمام گفتگو ان آیات کے ایک ایسے مجموعے کے بارے میں ہے جس کا ایک خاص وحدت اور مقصد ہو (غور کیجئے گا)۔

۲۔ فان لم یستجیبوا لکم — کے مخاطب: اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ "فان لم یستجیبوا لکم" — میں مخاطب کون ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ مخاطب مسلمان ہیں۔ یعنی اگر منکرین نے تمہاری دعوت پر لبیک نہ کہا اور قرآن کی دس سورتوں کی مثل نہ لائے تو جان لو کہ یہ قرآن خدا کی طرف سے ہے اور یہی خود اعجاز قرآن کی دلیل ہے۔

بعض دوسروں نے کہا کہ مخاطب منکرین ہیں یعنی اے منکرین! اگر باقی انسان اور جو کچھ غیر از خدا ہے انہوں نے مثل قرآن لانے میں مدد کے لیے تمہاری دعوت پر لبیک نہ کہا اور وہ عاجز و ناتواں رہ گئے تو پھر جان لو کہ یہ قرآن خدا کی طرف سے ہے۔

نتیجہ کے لحاظ سے دونوں تفاسیر میں کوئی فرق نہیں ہے تاہم پہلا احتمال زیادہ نزدیک معلوم ہوتا ہے۔

(۱۵) مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝

(۱۶) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ

(۱۵) جو لوگ دنیا اور اس کی زینت کو چاہتے ہیں ہم ان کے اعمال انہیں بے کم و کاست اسی جہان میں دے دیں گے۔

(۱۶) (لیکن) آخرت میں (جہنم کی) آگ کے سوا ان کا (کچھ حصہ) نہیں ہوگا اور جو کچھ انہوں نے دنیا میں (مادی مقاصد اور غیر خدا کے لیے) انجام دیا ہے وہ برباد ہوگا اور ان کے اعمال باطل ہو جائیں گے۔

تفسیر

گزشتہ آیات نے اعجاز قرآن کے دلائل پیش کر کے مشرکین اور منکرین پر حجت تمام کر دی ہے اور چونکہ حق واضح ہو جانے کے باوجود ایک گروہ نے صرف اپنے مادی منافع کی خاطر سر تسلیم خم نہیں کیا لہٰذا محل بحث آیات میں ایسے دنیا پرست افراد کے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جس شخص کا مقصد صرف دنیاوی زندگی کی رنگینیاں اور اس کی زینت ہو وہ اسی جہان میں اپنے اعمال کا نتیجہ پائے گا بغیر اس کے کہ کوئی چیز اس میں سے کم ہو۔ (من کان یرید الحیٰوۃ الدنیا وزینتھا نوف الیھم اعمالھم فیھا وھم فیھا لا یبخسون)۔

"یبخس" لغت میں حق کے نقصان کے معنی میں آیا ہے اور "ھم فیھا لا یبخسون" اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ بغیر تھوڑے سے بھی نقصان کے پا لیں گے۔

یہ آیت خدا تعالیٰ کی ایک دائمی سنت کو بیان کر رہی ہے اور وہ یہ کہ مثبت اعمال اور مؤثر نتائج ختم نہیں ہوتے۔ فرق یہ ہے کہ اگر اعمال کا اصل مقصد اس جہان کی مادی زندگی کا حصول ہے تو نتیجہ بھی مادی ہی ہوگا لیکن اگر مقصد خدا اور اس کی رضا کا حصول ہو تو وہ اس جہان میں بھی ثمر بخش ہوں گے اور دوسرے جہان میں بھی پُر بار نتائج پیدا کریں گے۔

درحقیقت پہلی قسم کے اعمال ایسی غیر مستقل اور کم عمر عمارت کی طرح ہیں جسے صرف وقتی ضرورت کے لیے بنایا جاتا ہے اور اس سے استفادہ کیا جاتا ہے اور اس کے بعد وہ ویران ہو جاتی ہے لیکن دوسری قسم کی مثال ایسی محکم اور مضبوط بنیادوں والی عمارت کی سی ہے جو صدیوں تک برقرار رہتی ہے اور قابل استفادہ ہوتی ہے۔ اس امر کا نمونہ آج کل ہم اپنے گرد و پیش دیکھ سکتے ہیں۔ مغربی دنیا نے اپنی مسلسل اور منظم کوشش سے بہت سے علوم کے اسرار معلوم کیے ہیں نیز مغربی دنیا نے مادہ کی مختلف طاقتوں پر تصرف حاصل کر لیا ہے اور مسلسل کوشش اور مشکلات کے مقابلے میں استقامت، اتحاد اور ہم بستگی سے انہوں نے بہت سی نعمات حاصل کی ہیں۔

اس بناء پر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے اعمال اور کوشش کے نتائج حاصل کریں گے اور درخشاں اور واضح کامیابیوں سے ہمکنار ہوں گے لیکن دوسری طرف سے چونکہ ان کا مقصد صرف دنیاوی زندگی ہے لہٰذا ان اعمال کا طبعی و فطری اثر سوائے ان کے لیے مادی وسائل فراہم ہونے کے اور کوئی نہیں ہوگا یہاں تک کہ ان کے انسانی اور بڑے کام جیسا کہ ہسپتال بنانا، شفا خانے قائم کرنا، علمی مراکز قائم کرنا، غریب اقوام کی مدد کرنا اور اس قسم کے دیگر فلاحی کام، اگر ان کے استعمار و استثمار کی قیمت نہ ہو تو چونکہ بہر حال مادی ہدف کے تحت اور مادی منافع کے لیے ہوتے ہیں لہٰذا ان کا صرف مادی اثر ہوگا۔ اسی طرح

وہ لوگ جو ریاکارانہ کام کرتے ہیں ان کے وہ اعمال جو انسانی حوالوں سے ہوتے ہیں ان کے فقط مادی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اسی لیے بعد والی آیت میں صراحت سے فرمایا گیا ہے: ایسے افراد کے لیے آخرت میں (جہنم کی) آگ کے سوا کوئی فائدہ نہیں ہے (اولئک الذین لیس لھم فی الاٰخرۃ الا النار)۔" اور جو کچھ انھوں نے اس جہان میں انجام دیا ہے وہ دوسرے جہان میں محو و نابود ہو جائے گا اور اس کے بدلے میں انہیں کوئی جزا نہیں ملے گی" (وحبط ما صنعوا فیھا)۔" اور وہ تمام اعمال جو انھوں نے غیر خدا کے لیے انجام دیئے ہیں باطل اور نابود ہو جائیں گے (و باطل ما کانوا یعملون)۔

"حبط" (بر وزن "وقت") کا معنی دراصل ایسا حیوان ہے جو نامناسب گھاس پھوس میں سے اتنا زیادہ کھالے کہ اس کے پیٹ میں ہوا بھر جاتے اور اس کی اوجھڑی بیمار اور ضائع ہو جائے۔ اس عالم میں یہ جانور ظاہراً تو چاق و چوبند نظر آتا ہے حالانکہ باطناً مریض ہوتا ہے۔

یہ ایسے اعمال کے لیے نہایت مؤثر اور عمدہ تعبیر ہے جو ظاہراً مفید اور انسانی ہیں لیکن باطن میں آلودہ اور پست نیت سے انجام دیئے گئے ہیں۔

چند اہم نکات:

۱۔ ایک اشکال کی وضاحت: ہو سکتا ہے پہلی نظر میں یوں معلوم ہو کہ مندرجہ بالا دو آیتیں آپس میں تعارض رکھتی ہیں اس بناء پر کہ پہلی آیت کہتی ہے: "وہ اشخاص جن کا ہدف فقط اس دنیا کی زندگی ہے ان کے اعمال کا نتیجہ ہم انہیں بے کم و کاست دیں گے" لیکن دوسری آیت کہتی ہے: ان کے اعمال حبط اور باطل ہو جائیں گے۔

البتہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ایک آیت دنیاوی زندگی کے بارے میں ہے اور دوسری کا اشارہ دارِ آخرت کی طرف ہے۔ اس اشکال کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ اپنے اعمال کے نتائج اسی دنیا میں پورے طور پر حاصل کر لیں گے۔ لیکن اس کا کیا فائدہ کہ یہ اعمال جو اگرچہ بظاہر زیادہ تھے مگر آخرت کے لیے بے اثر ہیں کیونکہ ان کا ہدف پاک اور نیت خالص نہیں تھی۔ ان کا ہدف مادی مفادات کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ جس تک وہ پہنچ گئے۔

۲۔ دنیا کی زینتیں: حیات دنیا کے بعد لفظ "زینت" دنیا پرستی اور دنیا کی زرق برق کی مذمت کے لیے ہے نہ کہ اس کا مقصد دنیا کی نعمتوں سے مناسب اور معتدل طریقے سے فائدہ اٹھانے کی نفی کرنا ہے۔

لفظ "زینت" جو یہاں سربستہ طور پر آیا ہے دوسری آیات میں خوبصورت عورتوں، عظیم خزانوں اور قیمتی

سواریاں، زرعی زمینوں اور فراواں دولت کے معنی میں استعمال ہوا ہے، مثلاً:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ - (آل عمران - ۱۴) -

مادی چیزوں میں سے عورتیں، اولاد اور مال جو سونے اور چاندی کے ڈھیروں پر مشتمل ہے، منتخب گھوڑے، جانور اور زراعت لوگوں کی نظر میں پسندیدہ بنا دیئے گئے ہیں[1]

۳۔ "حبط" کے بعد لفظ "باطل": لفظ "حبط" کے بعد لفظ "باطل" ہو سکتا ہے اس طرف اشارہ ہو کہ ان کے اعمال کا ایک ظاہر ہے اور باطن کوئی نہیں ہے۔ اسی بنا پر ان کا نتیجہ کچھ بھی نہیں۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ ان کے اعمال اصولی طور پر ابتدا ہی سے باطل اور بے خاصیت ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بہت سی اشیاء کے حقائق چونکہ اس دنیا میں پہچانے نہیں جاتے اور دوسرے جہان میں جس میں تمام اسرار کھل جائیں گے ان کی حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اعمال شروع ہی سے کچھ نہ تھے۔

۴۔ ایک حدیث: مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں کتاب "درالمنثور" میں ایک حدیث نقل ہوئی ہے جس سے ان کا مفہوم واضح ہوتا ہے۔ حدیث یہ ہے:

قال رسول الله صلی الله علیه و آله:
اذا کان یوم القیامة صارت امتی ثلاث فرق:
فرقة یعبدون الله خالصاً
وفرقة یعبدون الله ریاءً
وفرقة یعبدون الله یصیبون به دنیا

فیقول للذی کان یعبد الله للدنیا: بعزتی وجلالی ما اردت بعبادتی؟ فیقول الدنیا، فیقول لا جرم لاینفعک ما جمعت ولا ترجع الیه انطلقوا به الی النار

ویقول للذی یعبد الله ریاء، بعزتی وجلالی ما اردت بعبادتی؟

قال: الریاء

[1] مزید وضاحت کے لیے آل عمران آیت ۱۴ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں (تفسیر نمونہ جلد دوم)۔

فیقول انما کانت عبادتک التی کنت ترائی بها لایصعد الی منها شیء ولاینفعک الیوم، انطلقوا به الی النار۔

ویقول للذی کان یعبد الله خالصاً: بعزتی وجلالی ما اردت بعبادتی؟

فیقول بعزتک وجلالک لانت اعلم منی کنت اعبدک لوجهک ولدارک

قال: صدق عبدی انطلقوا به الی الجنة ۔

رسول اللہؐ نے فرمایا:

جب قیامت کا دن ہو، میرے پیروکار تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں:

ایک وہ گروہ جو خدا کی خلوص کے ساتھ عبادت کرتا تھا،

دوسرا وہ گروہ جو دکھاوے کے لیے عبادت کرتا تھا اور

تیسرا وہ گروہ جو دنیا تک رسائی کے لیے عبادت کرتا تھا۔

اس وقت خدا اس گروہ کو جو دنیا کی خاطر اس کی عبادت کرتا تھا کہے گا: میری عزت و جلال کی قسم بتاؤ میری عبادت میں تمہارا کیا مقصد تھا وہ جواب میں کہے گا دنیا۔ خدا فرمائے گا: اس بنا پر جو کچھ تم نے جمع کیا ہے وہ تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے گا اور تم اس کی طرف پلٹ کر نہیں جاؤ گے۔ پھر فرمائے گا: اسے آتش جہنم کی طرف لے جاؤ۔

اور جو شخص ریا کے طور پر خدا کی عبادت کرتا تھا اللہ اس سے کہے گا: میری عزت و جلال کی قسم بتاؤ میری عبادت سے تمہارا کیا مقصد تھا۔ وہ جواب میں کہے گا: دکھاوا۔ تو اللہ فرمائے گا: وہ عبادت جو تم نے ریا کے طور پر انجام دی تھی اس میں سے کچھ بھی میرے پاس نہیں پہنچا تھا اور آج تمہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں دوں گا۔ پھر حکم دے گا: اسے آتش جہنم کی طرف لے جاؤ۔

اور وہ شخص جو خدا کی عبادت خلوص سے کرتا تھا، اس سے کہا جائے گا: میری عزت و جلال کی قسم، بتاؤ تم عبادت کس مقصد سے کرتے تھے۔ وہ کہے گا: تیری عزت و جلال کی قسم تو اس بات سے زیادہ باخبر ہے کہ میں نے تیری عبادت صرف تیرے لیے اور دار آخرت کے لیے کی تھی۔ خدا فرمائے گا: میرا بندہ سچ کہتا ہے اسے جنت میں لے جاؤ[1]

---

[1] تفسیر المیزان ج ۱۰ صفحہ ۱۹۱ بحوالہ تفسیر

(۱۷) أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

ترجمہ

(۱۷) کیا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہے اس کے پیچھے اس کی طرف سے شاہد ہے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب کہ جو پیشوا اور رحمت تھی (اس پر گواہی دیتی ہے، اس شخص کی طرح ہے جو ایسا نہ ہو)۔ وہ (حق طلب اور حقیقت کے متلاشی) اس پر (جو یہ خصوصیات رکھتا ہے) ایمان لاتے ہیں اور مختلف گروہوں میں سے جو شخص اس کا منکر ہو آگ اس کی وعدہ گاہ ہے۔ لہٰذا اس میں شک نہ کرو کہ وہ تیرے پروردگار کی طرف سے حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

تفسیر

زیر نظر آیت کی تفسیر کے بارے میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے۔ آیت کے الفاظ کی جزئیات، ضمائر، موصول اور اسم اشارہ کے بارے میں مختلف نظریے ہیں۔ اس تفسیر میں ان سب کا ذکر ہماری روش کے خلاف ہے۔ وہ تفاسیر جو زیادہ واضح معلوم ہوتی ہیں اہمیت ترتیبی کے اعتبار سے یہاں ذکر کی جاتی ہیں۔

(۱) آیت کی ابتداء میں فرمایا گیا ہے: کیا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہے اور اس کے پیچھے خدا کی طرف سے شاہد آیا ہے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب (توریت) پیشوا، رحمت

اور ان کی عظمت کو واضح کرنے والی کتاب کی حیثیت سے آئی ہے اس شخص کی طرح ہے جو ان صفات، نشانیوں اور واضح دلائل کا حامل نہیں ہے (افمن کان علی بینة من ربه ویتلوه شاهد منه ومن قبله کتاب موسٰی اماما ورحمة)۔

یہ شخص پیغمبر اکرمؐ ہیں، ان کی واضح دلیل قرآن مجید ہے۔ ان کی نبوت کی صداقت کے شاہد علیؑ جیسے مومن صادق ہیں اور قبل ازیں ان کی نشانیاں اور صفات توراۃ میں آچکی ہیں۔ اس طرح تین واضح طریقوں سے آپؐ کی دعوت کی حقانیت ثابت ہو گئی ہے۔

پہلا راستہ قرآن ہے۔ جو ان کے ہاتھ میں ایک واضح دلیل ہے۔

دوسرا راستہ گزشتہ آسمانی کتب ہیں۔ جن میں آنحضرتؐ کی نشانیاں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں اور رسول اللہؐ کے زمانے کے ان کتب کے پیروکار انہیں اچھی طرح سے پہچانتے ہیں اور اسی بنا پر ان کے انتظار میں تھے۔

تیسرا راستہ آپؐ کے فداکار پیروکار اور مخلص مومنین ہیں کہ جو آپؐ کی دعوت اور گفتار کی صداقت کو واضح کرتے تھے کیونکہ کسی مکتب کی حقانیت کی ایک نشانی اس مکتب کے پیروکاروں کا اخلاص، فداکاری، دانشمندی اور ایمان ہے اور ہر مکتب کو اس کے پیروکاروں سے پہچانا جاتا ہے۔

کیا ان زندہ دلائل و براہین کے باوجود انہیں دوسرے مدعیانِ نبوت پر قیاس کیا جا سکتا ہے یا ان کی دعوت کی صداقت میں شک و شبہ کیا جا سکتا ہے؟[1]

اس گفتگو کے بعد قرآن متلاشیانِ حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں ضمنی طور پر ایمان کی دعوت دیتا ہے: ایسے پیغمبر پر کہ جو ایسی روشن دلیل رکھتا ہے ایمان لائیں گے (اولٰئك یؤمنون به)۔

لفظ "اولٰئك" میں جن افراد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اگرچہ ان کا ذکر نہیں ہے لیکن گزشتہ آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس آیت میں ان کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے اور ان کی طرف اشارے کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد منکرین کی کہانی یوں بیان کی گئی ہے: مختلف گروہوں میں سے جو کوئی اس سے کفر کرے گا تو اس کی وعدہ گاہ جہنم ہے (ومن یکفر به من الاحزاب فالنار موعده)۔

آیت کے آخر میں قرآن کے دیگر بہت سے مواقع کی طرح سیرتِ قرآن کے مطابق روئے سخن پیغمبرؐ

---

[1] اس تفسیر کے مطابق "مَنْ" سے مراد پیغمبر اکرمؐ ہیں، "بینة" سے مراد قرآن ہے اور "شاهد" سے کہ جو جنس کے معنی میں ہے سے مراد سچے مومنین ہیں جن کے راس و رئیس حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ نیز "منه" کی ضمیر خدا تعالیٰ کی طرف اور "قبله" کی ضمیر قرآن یا پیغمبر اسلامؐ کی طرف لوٹتی ہے۔ پورا جملہ مبتدا، اس کی خبر محذوف ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہو گی:

"کمن لیس کذلك" یا "کمن یرید الحیاة الدنیا"

کی طرف کرتے ہوئے تمام لوگوں کے لیے ایک عمومی درس بیان کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے : اب جبکہ ایسا ہے اور تیری دعوت کی صداقت کے لیے یہ تمام شاہد موجود ہیں جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے اس کے بارے میں ہرگز کسی شک وشبہ کو راہ نہ دے (فلا تک فی مریۃ منہ) ۔ کیونکہ یہ تیرے پروردگار کی طرف سے کلام حق ہے" (انہ الحق من ربک) ۔ لیکن بہت سے لوگ جہالت، تعصب اور خود پسندی کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے (ولکن اکثر الناس لا یؤمنون) ۔

(۲) دوسری تفسیر جو آیت کے لیے ذکر ہوئی ہے یہ ہے کہ اصل مقصد سچے مومنین کی حالت بیان کرنا ہے کہ وہ ان واضح دلائل و شواہد اور گزشتہ کتب میں موجود شہادتوں کی بنیاد پر دعوت پیغمبرؐ کی صداقت پر ایمان لائے ہیں ، لہٰذا " من کان علی بینۃ من ربہ " کے جملے سے مراد وہ تمام لوگ ہیں کہ جو کھلی آنکھوں سے اور اطمینان بخش دلائل کے ذریعے اور اس کے لانے والے کی پیروی کر رہے ہیں اور اس سے مراد خود پیغمبر اکرمؐ نہیں ہیں ۔

یہ تفسیر گزشتہ تفسیر پر یہ ترجیح رکھتی ہے کہ مبتدا کی خبر آیت میں صراحت سے آئی ہے، اس میں کوئی محذوف نہیں اور " اولئک " کا مشار الیہ خود آیت میں مذکور ہے ۔ نیز آیت کا پہلا حصہ کہ جو " افمن کان علی بینۃ من ربہ " سے شروع ہوتا ہے " اولئک یؤمنون بہ " تک ایک مکمل جملہ ہے اور اس میں کوئی حذف و تقدیر نہیں ہے ۔

بلاشبہ آیت کی دوسری تعبیریں اس تفسیر سے مناسبت نہیں رکھتیں اس لیے ہم نے اس تفسیر کو دوسرے مرحلے میں قرار دیا ہے (غور کیجئے گا) ۔

بہرحال آیت اسلام اور سچے مسلمانوں کے امتیازات اور اس مکتب کے انتخاب میں محکم دلائل پر ان کے اعتماد کرنے کی طرف اشارہ ہے جبکہ دوسری طرف سے آیت متکبر منکرین کا انجام بد بیان کر رہی ہے ۔

چند اہم نکات

۱۔ آیت میں " شاھد " سے مراد : بعض مفسرین نے کہا ہے کہ زیر بحث آیت میں " شاھد " سے مراد وحی خدا کے قاصد جبرائیلؑ ہیں ۔ بعض نے اس سے مراد پیغمبر اسلامؐ لیے ہیں ۔ بعض دوسرے مفسرین نے اس کی تفسیر زبان پیغمبرؐ کی ہے (جبکہ " یتلوہ " کو " تلاوت " کے مادہ سے " قرأت " کے معنی میں لیا ہے ، نہ کہ پیچھے آنے " کے معنی میں) لیکن بہت سے بزرگ مفسرین نے اسے حضرت علی علیہ السلام سے تعبیر کیا ہے ۔ اس ضمن میں آئمہ معصومینؑ سے بھی کئی ایک روایات ہم تک پہنچی ہیں اور اہل سنت کی بعض کتب تفسیر میں اس کی تائید موجود ہے ۔ ان روایات سے اس تفسیر کی تاکید ہوتی ہے کہ " شاھد " سے مراد حضرت

امام امیرالمومنین علی علیہ السلام ہیں۔ جو پیغمبر اسلامؐ اور قرآن پر ایمان لانے والے پہلے شخص ہیں، جو تمام مراحل میں رسول اللہؐ کے ساتھ رہے اور ایک لحظہ کے لیے بھی فداکاری سے دریغ نہیں کیا اور آخری دم تک ان کی حمایت میں کوشاں رہے۔[1]

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا:

قریش کے مشہور افراد کے بارے میں ایک یا ایک سے زیادہ آیات نازل ہوئیں۔

کسی نے عرض کیا:

اے امیرالمومنینؑ! آپ کے بارے میں کونسی آیت نازل ہوئی؟

امامؑ نے فرمایا:

کیا تو نے سورۂ ہود کی یہ آیت نہیں پڑھی۔ افمن کان علی بینۃ من ربہ و یتلوہ شاھد منہ۔ رسول اللہ خدائی بیّنۃ رکھتے تھے اور شاہد میں تھا۔[2]

سورہ رعد کی آخری آیت میں بھی ایک تعبیر دکھائی دیتی ہے کہ جو اس معنی کی تائید کرتی ہے۔ وہاں فرمایا گیا ہے:

"وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ "

کفار کہتے ہیں کہ تو پیغمبر نہیں ہے۔ کہہ دو یہی کافی ہے کہ خدا میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے اور وہ کہ جس کے پاس علم کتاب (قرآن) ہے۔

سُنّی اور شیعہ طرق کی بہت سی روایات میں ہے کہ "من عندہ علم الکتاب" سے مراد حضرت علیؑ ہیں۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے پھر اس نکتے کی یاددہانی ضروری ہے کہ کسی مکتب کی حقانیت کی پہچان کا ایک بہترین طریقہ اس کے پیروکاروں، مددگاروں اور حامیوں کی کیفیت کا مطالعہ ہے۔ مشہور ضرب المثل ہے کہ امام زادے کو اس کے زائرین سے پہچاننا چاہیئے۔ جب دیکھیں کہ پاکباز، باشعور صاحب ایمان، مخلص اور باتقویٰ افراد کسی رہبر اور مکتب کے گرد جمع ہیں تو اچھی طرح پہچانا جا سکتا ہے کہ یہ مکتب اور یہ رہبر صداقت کی حد بلند پر ہے۔ لیکن اگر دیکھیں کہ موقع پرست، دھوکے باز، بے ایمان اور بے تقویٰ افراد کسی مکتب یا رہبر کے گرد جمع ہیں تو بہت کم یقین کیا جا سکتا ہے کہ یہ مکتب اور یہ رہبر حق پر ہے۔

---

[1] برہان، نورالثقلین، قرطبی، مجمع البیان اور دیگر تفاسیر کی طرف رجوع فرمائیں۔

[2] تفسیر برہان ج ۲ ص ۲۱۲۔

اس مطلب کی طرف اشارہ بھی ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ لفظ "شاھد" سے حضرت علیؑ مراد لینا اس حقیقت کے منافی نہیں کہ ابوذر، سلمان، عمار یاسر جیسے تمام افراد اس کے مفہوم میں شامل ہیں کیونکہ ایسی تفاسیر اکمل و برتر فرد کی طرف اشارہ ہوتی ہیں یعنی اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے رأس و رئیس یہ فرد اکمل ہے۔ اس امر کی شاہد وہ روایت ہے جو امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

شاہد سے مراد امیر المومنینؑ ہیں اور پھر یکے بعد دیگرے ان کے جانشین ہیں[1]

اس حدیث میں اگرچہ معصوم ہستیوں کا ذکر ہے لیکن یہ امر خود اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ روایات بھی ہیں "شاھد" کو صرف حضرت علیؑ سے تفسیر کیا گیا ہے ان سے مراد فقط آپؑ نہیں بلکہ مراد افضل و برتر کا مصداق ہے۔

۲۔ صرف تورات کی طرف اشارہ کیوں؟ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ پیغمبرؐ کی حقانیت کی ایک دلیل زیر بحث آیت میں گزشتہ کتب بیان کی گئی ہیں لیکن تذکرہ صرف حضرت موسیٰؑ کی کتاب کا ہوا ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ کے ظہور کی بشارتیں انجیل میں بھی ہیں۔

شاید یہ اس بناء پر ہو کہ نزول قرآن اور ظہور اسلام کے علاقے یعنی مکہ اور مدینہ میں زیادہ تر اہل کتاب میں سے یہودیوں کے افکار و نظریات پھیلے ہوئے تھے اور عیسائی نسبتاً دور کے علاقوں میں رہتے تھے مثلاً یمن، شامات اور نجران (جو شمالی یمن کے پہاڑی علاقوں میں صنعاء سے دس منزل کے فاصلے پر واقع تھا)۔

یا ہو سکتا ہے یہ اس بناء پر ہو کہ اوصاف پیغمبرؐ کا تذکرہ تورات میں زیادہ جامع اور زیادہ وسیع طور پر آیا تھا۔

بہرحال تورات کے بارے میں "امام" کی تعبیر ہو سکتا ہے اس بناء پر ہو کہ شریعت موسیٰؑ کے احکام پورے طور پر اس میں موجود تھے یہاں تک کہ عیسائی بھی اپنی بہت سی تعلیمات تورات سے لیتے ہیں۔

۳۔ "فلا تك فی مریة" میں مخاطب: "فلا تک فی مریة" میں مخاطب کون ہے؟ اس بارے میں دو احتمال ذکر کیے گئے ہیں۔

پہلا یہ کہ مخاطب پیغمبر اکرمؐ ہیں یعنی قرآن یا آئین اسلام کی حقانیت میں ذرہ بھر شک کو راہ نہ دیجئے۔ البتہ اس حکم کی رُو سے کہ وہ وحی کو بطور شہود دیکھتے تھے اور خدا کی طرف سے نزول قرآن ان کے لیے محسوس طور پر بلکہ حس سے بھی بالا تھا آپؐ کو اس دعوت کی حقانیت میں کسی قسم کا کوئی شک نہ تھا لیکن یہ کوئی پہلا موقع نہیں کہ قرآن میں خطاب تو پیغمبر اکرمؐ سے ہے جبکہ مراد تمام لوگ ہیں اور عربوں کی مشہور تعبیر کے مطابق ایسے خطاب "ایاك اعنی و اسمعی یا جارة" (میری مراد تو تم ہو اور پڑوسن تم بھی سن لو) کی طرح کے ہیں۔ فارسی میں کہتے ہیں:

---

[1] تفسیر برہان ج ۲ صفحہ ۲۱۳۔

در بہ تو می گویم دیوار تو گوش کن یا تو بشنو

اے دروازہ ! میں تجھے کہہ رہا ہوں ، دیوار تو سن لے

یہ فنون بلاغت میں سے ہے کہ کئی مواقع پر تاکید اور اہمیت کے لیے یا دیگر مقاصد کیلئے حقیقی مخاطب کی بجائے دوسرے شخص سے خطاب کیا جاتا ہے ۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ہر مکلف عاقل مخاطب ہے یعنی - فلا تك ایھا المکلف العاقل فی مریة ۔ یعنی - اے عاقل و مکلف انسان ! ان واضح دلائل کے ہوتے ہوئے اس قرآن کی حقانیت میں شک نہ کر - اور یہ احتمال اس بناء پر ہے کہ - من کان علی بینة من ربه " سے مراد پیغمبر نہ ہوں بلکہ تمام سچے مومنین ہوں (غور کیجئے گا) ۔

لیکن بہرحال پہلی تفسیر آیت سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے ۔

(۱۸) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ۭ اُولٰٓىِٕكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰي رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰي رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي الظّٰلِمِيْنَ ۝

(۱۹) الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝

(۲۰) اُولٰٓىِٕكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۭ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ۝

(۲۱) اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝

(۲۲) لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝

ترجمہ

(۱۸) ان لوگوں سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو خدا پر افتراء باندھتے ہیں وہ (روز قیامت) اپنے پروردگار کے سامنے پیش ہوں گے اور شاہد (انبیاء اور فرشتے) کہیں گے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹ باندھا تھا۔ خدا کی لعنت ہو ظالموں پر۔

(۱۹) وہی جو لوگوں کو راہ خدا سے روکتے تھے اور راہ حق میں کجی دکھانا چاہتے تھے اور آخرت کا کفر کرتے تھے۔

(۲۰) وہ زمین میں کبھی بھی فرار کی طاقت نہیں رکھتے اور خدا کے سوا وہ کوئی دوست اور سرپرست نہیں پائیں گے ان کے لیے کئی گنا عذاب الٰہی ہوگا (کیونکہ وہ خود بھی گمراہ تھے اور دوسروں کو بھی گمراہی کی طرف کھینچتے تھے)۔ اور کبھی بھی (حق بات) سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور (حقائق کو) نہیں دیکھتے تھے۔

(۲۱) وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنا سرمایہ ہستی گنوا بیٹھے ہیں اور تمام جھوٹے معبود ان کی نظر سے کھو گئے ہیں۔

(۲۲) (اسی بنا پر) یقیناً وہ آخرت میں سب سے زیادہ زیاں کار ہیں۔

تفسیر

سب سے زیادہ زیاں کار

گزشتہ آیت قرآن اور رسالت پیغمبرؐ کے بارے میں گفتگو کر رہی تھی۔ اس کے بعد زیر بحث آیات کی نشانیوں اور ان کے انجام کار کے متعلق تفصیلی بحث کر رہی ہیں۔ پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے کہ جو خدا پر جھوٹ باندھے (و من اظلم ممن افترٰی علی اللہ کذبا)۔

یعنی سچے پیغمبر کی دعوت کی نفی کلمات الٰہی کی نفی ہے اور اس کی طرف جھوٹ کی نسبت دینا ہے اصولی طور پر تکذیب پیغمبر تکذیب خدا ہے۔ اس شخص پر جھوٹ باندھنا کہ جو صرف خدا کی طرف سے بات کرتا ہے خدا کی ذات پاک پر جھوٹ باندھنا شمار ہوگا۔[1]

جیسا کہ ہم نے متعدد بار کہا ہے قرآن مجید کی مختلف آیات میں لوگوں کو سب سے بڑھ کر ظالم (اظلم) قرار دیا گیا ہے حالانکہ ظاہراً ان کے کام آپس میں مختلف ہیں اور ممکن نہیں ہے کہ مختلف کام کرنے والے مختلف گروہوں میں سے ہر ایک کو سب سے بڑھ کر ظالم شمار کیا جائے بلکہ چاہیے کہ ایک گروہ ستمگر یا ستمگر تر

---

1. بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ اس جملے سے مراد ان لوگوں کو جواب دینا ہے جو کہتے ہیں کہ پیغمبر اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتا ہے بہت بعید ہے کیونکہ پہلے اور بعد کی آیات اس ترتیب سے مناسبت نہیں رکھتیں بلکہ مناسب یہی ہے کہ یہ کفار کی طرف اشارہ ہے۔

ہو اور دوسرا گروہ ستمگر ترین ہو لیکن جیسا کہ اس سوال کے جواب میں ہم نے بارہا کہا ہے کہ ان تمام اعمال کی بنیاد ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے شرک اور آیات الٰہی کی تکذیب جو کہ سب سے بڑی تہمت ہے۔

مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۳ صفحہ ۳۵ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

اس کے بعد قیامت میں ان کے بُرے مستقبل کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے: اس روز وہ بارگاہ پروردگار میں اپنے تمام اعمال اور کردار کے ساتھ پیش ہوں گے اور اس کی عدالت میں حاضر ہونگے (اولئك يعرضون على ربهم)۔

اس وقت اعمال کے شاہد گواہی دیں گے اور کہیں گے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے کریم مہربان اور ولی نعمت پروردگار پر جھوٹ باندھا تھا (ويقول الاشهاد هٰؤلاء الذين كذبوا على ربهم)۔

اس کے بعد کھلے بندوں کہیں گے: ظالموں پر خدا کی لعنت ہو (الا لعنة الله على الظالمين)۔

اس بارے میں کہ شاہد خدائی فرشتے ہیں کہ یا اعمال لکھنے پر مامور ملک ہیں یا انبیاء ہیں۔ مفسرین نے مختلف احتمالات ذکر کیے ہیں لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے قرآن کی دوسری آیات میں انبیاء الٰہی کا تعارف اعمال کے شاہدین کے طور پر کروایا گیا ہے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں بھی وہی مراد ہیں یا اس سے وسیع تر مفہوم مراد ہے جس میں دیگر گواہ بھی شامل ہیں۔

سورہ نساء کی آیت ۴۱ میں ہے:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا

ان کا کیا حال ہوگا جب اس دن ہم ہر اُمت کے لیے ان کے اعمال کے گواہ بلائیں گے اور تجھے ان پر گواہ قرار دیں گے۔

حضرت مسیحؑ کے بارے میں سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۷ میں ہے:

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ

میں جب تک اپنے پیروکاروں کے درمیان تھا ان کے اعمال پر گواہ تھا۔

نیز اس سلسلے میں کہ "الا لعنة الله على الظالمين" کہنے والا خدا ہے یا گواہ ہیں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن ظاہر آیت یہ ہے کہ بات گواہوں کی گفتگو کے تسلسل میں ہے۔

بعد والی آیت میں ظالموں کی صفات تین جملوں میں بیان کی گئی ہیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: وہ ایسے افراد ہیں جو لوگوں کو مختلف ذریعوں سے راہِ خدا سے روکتے ہیں، (الذين يصدون عن سبيل الله)۔ ایسا وہ کبھی شک و شبہ پیدا کر کے کرتے ہیں کبھی دھمکی سے کام چلاتے ہیں اور کبھی لالچ دے کر مقصد حاصل کرتے ہیں اور ان سب امور کا ہدف ایک ہی ہے اور وہ ہے راہِ خدا سے روکنا۔

دوسرا یہ کہ وہ خاص طور پر کوشش کرتے ہیں کہ خدا کی راہِ مستقیم کو ٹیڑھا کرکے دکھائیں (و یبغونھا عوجًا)۔ یعنی طرح طرح کی تحریفیں کرکے، کمی بیشی کرکے، تفسیر بالرائے کرکے اور حقائق کو مخفی رکھ کر ایسا کرتے ہیں کہ یہ سیدھا راستہ اپنی اصلی صورت میں لوگوں کے سامنے نہ آئے تاکہ لوگ اس راستے پر نہ جا سکیں اور حق طلب افراد جادۂ حقیقی کو نہ پہچان سکیں [1]

نیز یہ کہ وہ قیامت اور روزِ جزا پر ایمان نہیں رکھتے (وھم بالاٰخرۃ ھم کٰفرون) اور معاد پر ان کا ایمان نہ رکھنا ان کے سب انحرافات اور تباہ کاریوں کا سرچشمہ ہے کیونکہ موت کے بعد کی اس بڑی عدالت اور وسیع عالم پر ایمان لانے سے قلب و روح کی تربیت ہوتی ہے۔

یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ یہ تمام امور "ظلم" کے مفہوم میں جمع ہیں کیونکہ اس لفظ کے وسیع مفہوم میں ہر قسم کا انحراف اور اشیاء، اعمال، صفات اور عقائد کو ان کی حقیقی جگہ سے تبدیل کر دینا شامل ہے۔

لیکن بعد والی آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ ان سب چیزوں کے باوجود۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ روئے زمین پر خدا کی سزا اور عذاب سے فرار حاصل کر سکیں گے اور اس کی قدرت کی قلمرو سے نکل سکیں گے "(اولٰئک لم یکونوا معجزین فی الارض)۔

• اسی طرح وہ خدا کے علاوہ اپنے لیے کوئی حامی اور مددگار نہیں پا سکتے "(وما کان لھم من دون اللہ من اولیاء)۔

آخر میں ان کی سنگین سزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: ان کا عذاب کئی گنا ہو جائے گا (یضاعف لھم العذاب)۔ کیونکہ وہ خود بھی گمراہ، گناہگار اور تباہ کار تھے اور دوسروں کو بھی انہی راہوں کی طرف کھینچتے تھے۔ اس بناء پر وہ اپنے گناہ کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر اٹھائیں گے اور دوسروں کے گناہوں کا بھی (جبکہ ان دوسرے گناہ کرنے والوں کی سزا میں بھی کمی نہیں ہوگی)۔

اس مفہوم پر قرآن کی دوسری آیات شاہد ہیں۔ مثلاً:

وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ

روزِ قیامت وہ اپنے گناہوں کا بوجھ اور ان کے ساتھ دوسرے بوجھ اور گناہ اپنے دوش پر اٹھائیں گے۔ (عنکبوت - ۱۳)

نیز بہت سی روایات میں ہے کہ جو شخص کسی بُری سنت کی بنیاد رکھے گا اس بُری سنت پر عمل کرنے

---

[1] "عوج" کا معنی کجی اور ٹیڑھا پن ہے۔ اس سلسلے میں جلد ۳ صفحہ ۱۱۱ (اردو ترجمہ) پر ہم تشریح کر چکے ہیں۔ ضمنی طور پر توجہ رہے کہ "یبغونھا" کی ضمیر "سبیل" کی طرف لوٹتی ہے جو مونث مجازی ہے یا یہ طریقہ اور جادہ کے معنی میں ہے جو مونث لفظی ہیں۔ سورۂ یوسف کی آیہ ۱۰۸ میں ہے:

قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ

والے تمام لوگوں کا "عذر" اور گناہ اس کے کھاتے میں لکھا جائے گا اور اسی طرح جو شخص کسی اچھی سنت کی بنیاد رکھے گا اس پر عمل کرنے والے لوگوں کی جزا کے برابر ثواب اس کے لیے لکھا جائے گا۔

آیت کے آخر میں ان کی بدبختی کی اصل بنیاد کا ذکر یوں کیا گیا ہے: ان کے پاس سننے والا کان ہے نہ دیکھنے والی آنکھ (ما کانوا یستطیعون السمع وما کانوا یبصرون)۔ درحقیقت جب یہ دونوں وسائل حقائق کو سمجھنے سے قاصر ہو جاتے ہیں تو وہ خود بھی گمراہی میں جا گرتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہی کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں کیونکہ کھلی آنکھ اور گوش شنوا کے بغیر حق و حقیقت کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہ امر توجہ طلب ہے کہ اس جملے میں ہے کہ وہ (حق بات) سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے لیے حق باتوں کا سننا اس قدر بوجھل ہے کہ گویا وہ اسے سننے کی طاقت ہی نہیں رکھتے۔ یہ تعبیر بعینہٖ ایسے ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ عاشق اپنے معشوق کی برائی نہیں سن سکتا۔

واضح ہے کہ حقائق فہمی کی اس طرح سے طاقت نہ ہونا، ان کی سخت ہٹ دھرمی اور حق دشمنی کا یہ مطلب نہیں کہ اب ان کی مسئولیت ختم ہو گئی ہے۔ اصطلاح میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے جس کے اسباب انہوں نے خود مہیا کیے ہیں جبکہ وہ طاقت رکھتے تھے کہ اس حالت کو اپنے سے دور رکھیں کیونکہ سبب پر قدرت رکھنا مسبب پر قدرت رکھنے کے مترادف ہے۔

بعد والی آیت میں ان کی غلط مساعی کو ایک ہی جملے میں بیان کیا گیا ہے: یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے وجود کا سرمایہ گنوا بیٹھے اور خسارے میں رہے (اولئك الذین خسروا انفسهم)۔ اور یہ عظیم ترین گھاٹا ہے جو انسان کو دامن گیر ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی ہستی ہی گنوا بیٹھے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: انہوں نے جھوٹے معبودوں سے دل لگا لیا ہے۔ لیکن آخرکار یہ سب بناوٹی معبود گم ہو گئے اور ان کی نظر سے محو ہو گئے۔ (وضل عنهم ما کانوا یفترون)۔

زیر بحث آخری آیت میں ان کے انجام کے بارے میں یقینی اور آخری حکم کو قطعی صورت میں اس طرح سے بیان کیا گیا ہے: ناچار وہ آخرت کے گھر میں سب سے زیادہ نقصان میں ہوں گے (لاجرم انهم فی الاٰخرة هم الاخسرون) کیونکہ وہ دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔ اپنے انسانی وجود کا تمام سرمایہ بھی گنوا بیٹھے ہیں اور اس حالت میں اپنا بار مسئولیت بھی اٹھاتے ہوتے ہیں اور دوسروں کی ذمہ داری بھی اٹھاتے ہوتے ہیں۔

"جرم" (بروزن "حرم") اصل میں درخت سے پھل چننے کے معنی میں ہے (جیسا کہ مفردات میں راغب نے ذکر کیا ہے)۔ بعد ازاں یہ لفظ ہر قسم کے اکتساب اور تحصیل امر کے لیے استعمال ہونے لگا اور نامناسب کسب کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ اسی لیے گناہ کو جرم کہا جاتا ہے لیکن جب یہ لفظ "لا" کے ساتھ کسی جملے کی ابتدا میں "لاجرم" کی صورت میں آئے تو پھر یہ معنی دیتا ہے کہ "کوئی چیز اس امر کو نہیں روک سکتی" اسی لیے "لاجرم" "ناچار"، "یقیناً" اور "مسلماً" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (غور کیجئے گا)۔

(۲۳) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَخْبَتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○

(۲۴) مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ ۚ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ○

ترجمہ

(۲۳) وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال بجالاتے اور جو خدا کے سامنے خاضع اور تسلیم تھے اصحاب جنت ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

(۲۴) ان دو گروہوں (مشرکین اور مومنین) کی حالت ۔ اندھوں اور بہروں۔ اور ۔ دیکھنے اور سننے والوں۔ کی سی ہے۔ کیا یہ دونوں گروہ ایک جیسے ہو سکتے ہیں۔ کیا تم فکر نہیں کرتے ہو۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں وحی الٰہی کے منکرین کے ایک گروہ کی حالت بیان کی گئی تھی۔ یہ دو آیات ان کے مقابل سچے مومنین کی حالت بیان کر رہی ہیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ کہ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال انجام دیئے اور خدا کے سامنے خاضع اور تسلیم رہے اور اس کے وعدوں پر مطمئن رہے وہ اصحاب جنت ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے (ان الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات واخبتوا الیٰ ربھم اولٰئک اصحٰب الجنة ھم فیھا خالدون)۔

دو قابل توجہ نکات

۱۔ تین مربوط حقائق: ایمان، عمل صالح اور دعوت حق کے سامنے سر تسلیم خم ۔ در اصل تین ایسے

حقائق ہیں جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں کیونکہ عمل صالح شجرِ ایمان کا ثمر ہے۔ وہ ایمان جس کا ثمرہ عمل صالح نہ ہو ایسا کمزور اور بے وقعت ہوتا ہے کہ جو کسی شمار میں نہیں لایا جا سکتا۔ اسی طرح سر تسلیم خم اور پروردگار کے وعدوں پر اطمینان ایسا مسئلہ ہے جو ایمان اور عمل صالح کے آثار میں سے ہے کیونکہ صحیح اعتقاد اور پاک عمل ہی انسان کی جان اور روح میں ان بلند صفات و ملکات کے پیدا ہونے کا سرچشمہ ہے۔

۲۔ "اخبتوا" کا مفہوم :۔ "اخبتوا" "اخبات" کے مادہ سے ہے اس کی اصل "خبت" (بروزن "ثبت") ہے جس کا معنی ہے صاف اور وسیع زمین جس میں انسان آرام و اطمینان سے چل پھر سکتا ہے۔ اسی بنا پر یہ مادہ اطمینان کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور خضوع و تسلیم کے معنی میں بھی آیا ہے۔ کیونکہ ایسی زمین چلنے پھرنے کے لیے بھی اطمینان بخش ہے اور خود چلنے والوں کے سامنے خاضع اور تسلیم بھی ہے۔

اسی بنا پر جملہ "اخبتوا الی ربھم" ہو سکتا ہے مندرجہ ذیل معنی میں سے کسی ایک معنی میں ہو اگرچہ تینوں معانی ہوں تو بھی کوئی منافقہ نہیں۔

(۱) سچے مومنین خدا کے سامنے خاضع ہیں۔

(۲) وہ اپنے پروردگار کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوتے ہیں۔

(۳) وہ خدا کے وعدوں پر اطمینان رکھتے ہیں۔

ہر صورت میں مومنین کی ایک عالی ترین صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جس کا اثر ان کی تمام زندگی میں منعکس ہوتا ہے۔

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ حضرت امام صادقؑ سے ایک حدیث میں ہے کہ آپ کے اصحاب میں سے ایک شخص نے عرض کیا کہ ہمارے درمیان کلیب نامی ایک شخص ہے۔ آپ سے مروی جو بھی حدیث اس تک پہنچے وہ فوراً کہتا ہے کہ میں اس کے سامنے تسلیم ہوں۔ اس لیے ہم نے اس کا نام "کلیب تسلیم" رکھ دیا ہے۔

امامؑ نے فرمایا اس پر خدا کی رحمت ہو۔ پھر مزید فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ تسلیم کسے کہتے ہیں، ہم خاموش رہے تو فرمایا خدا کی قسم یہ وہی "اخبات" ہے جو خدا کے کلام "الذین آمنوا و عملوا الصالحات و اخبتوا الی ربھم" میں آیا ہے[1]

بعد والی آیت میں خدا اس گروہ کی حالت کو ایک واضح اور زندہ مثال کے ساتھ بیان کرتے ہوتے کہتا ہے: ان دو گروہوں کی حالت، نابینا اور بہرے اور بینا اور سننے والے کی سی ہے (مثل الفریقین کالاعمیٰ والاصم والبصیر والسمیع)۔

کیا یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے مساوی ہیں (ھل یستویان مثلاً) کیا تم تذکر نہیں کرتے اور غور و فکر نہیں کرتے (افلا تذکرون)۔

---

[1] تفسیر برہان ج ۲ صفحہ ۲۱۶۔

جیسا کہ علم معانی و بیان میں کہا گیا ہے کہ ہمیشہ حقائق عقلی کو مجسم کرنے اور عمومی سطح پر ان کی وضاحت و تصریح کے لیے معقولات کو محسوسات سے تشبیہ دیتے ہیں۔ قرآن نے اس طریقہ کار کو زیادہ استعمال کیا ہے اور بہت سے حساس اور پُر اہمیت مسائل کو واضح اور خوبصورت مثالوں سے استفادہ کرتے ہوئے حقائق کو عالی ترین صورت میں بیان کیا ہے۔ مندرجہ بالا بیان بھی اسی قسم کا ہے کیونکہ مؤثر ترین وسیلہ جو حقائق کی شناخت کیلئے مادہ و طبیعت میں آنکھ اور کان ہیں۔ اسی بنا پر یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ افراد جو آنکھ اور کان سے مکمل طور پر مثلاً مادر زاد صورت میں بے بہرہ ہوں کسی چیز کا اس جہان طبیعت میں صحیح طور پر ادراک حاصل کریں۔ وہ مسلماً ایک مکمل بے خبری کے عالم میں زندگی بسر کریں گے۔ اسی طرح وہ افراد جو ہٹ دھرمی، حق دشمنی، تعصب، خود خواہی اور خود پرستی کے چنگل میں گرفتار ہونے کی وجہ سے حقیقت بیں آنکھ اور کان گنوا بیٹھے ہیں وہ ہرگز عالم غیب سے مربوط حقائق، ایمان کے اثرات، لذت عبادت خداوندی اور اس کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی عظمت کا ادراک نہیں کر سکتے۔ ایسے افراد اندھوں، بہروں کی مانند ہیں جو گھٹا ٹوپ اندھیرے اور موت کی خاموشی میں زندگی بسر کرتے ہیں جبکہ بچے مومن دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان سے ہر حرکت کو دیکھتے ہیں اور ہر صدا کو سنتے ہیں اور اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنا راستہ سعادت آفرین راہ کی طرف اختیار کر لیتے ہیں۔

(۲۵) وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُبِينٌ ۝

(۲۶) أَنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ أَلِيمٍ ۝

(۲۷) فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ ۝

(۲۸) قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَآتَانِي رَحْمَةً مِنْ عِنْدِهِ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ ۝

ترجمہ

(۲۵) ہم نے نوح کو اُن کی قوم کی طرف بھیجا (پہلی مرتبہ اس نے اُن سے کہا) میں تمہارے لیے واضح ڈرانے والا ہوں۔

(۲۶) (میری دعوت یہ ہے کہ) سوائے اللہ کے (جو واحد و یکتا خدا ہے) کسی کی عبادت نہ کرو کہ میں تم پر دردناک دن والے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

(۲۷) اس کی قوم کے کافر سرداروں نے (جواب میں) کہا: ہم تو تجھے صرف اپنے جیسا

بشر پاتے ہیں اور وہ لوگ جنہوں نے تیری پیروی کی ہے انہیں ہم سوائے سادہ لوح پست لوگوں کے نہیں پاتے اور تمہارے لیے کوئی فضیلت اپنی نسبت نہیں دیکھتے بلکہ تمہیں دروغ گو خیال کرتے ہیں۔

(۲۸) (نوح نے) کہا میں اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہوں اور اس نے اپنی طرف سے مجھے رحمت عطا کی ہے جو تم پر مخفی ہو (پھر بھی تم میری رسالت کا انکار کرو گے) کیا میں تمہیں واضح امر قبول کرنے پر مجبور کر سکتا ہوں جبکہ تم آمادہ نہیں ہو۔

تفسیر

حضرت نوحؑ کی قوم کی ہلا دینے والی سرگزشت

جیسا کہ ہم نے سورہ کی ابتداء میں بیان کیا ہے اس سورہ میں افکار کو بیدار کرنے اور زندگی کے حقائق کی طرف متوجہ کرنے اور گنہگاروں کی بری سرنوشت کی طرف توجہ دلانے اور کامیابی اور موفقیت کی راہ بیان کرنے کے لیے گزشتہ انبیاء کی تاریخ کے اہم حصے بیان ہوئے ہیں۔

سب سے پہلے اولوالعزم پیغمبر حضرت نوحؑ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور ۲۶ آیات میں ان کی تاریخ کے اساسی اور بنیادی نکات کی ہلا دینے والی شکل میں تشریح کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت نوحؑ کا قیام اور ان کے اپنے زمانے کے متکبروں کے ساتھ شدید اور مسلسل جہاد اور ان کے برے انجام کی داستان تاریخ بشر کے فراز میں ایک نہایت اہم اور بہت عبرت انگیز درس کی حامل ہے۔

مندرجہ بالا آیات پہلے مرحلے میں اس عظیم دعوت کو بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں: ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے انہیں بتایا کہ میں واضح ڈرانے والا ہوں (ولقد ارسلنا نوحاً الی قومه انی لکم نذیر مبین)۔

انبیاء کے لیے لفظ "نذیر"

انبیاء ڈرانے والے بھی تھے اور خوش خبری دینے والے بھی پھر "انذار" "ڈرانے" کے مسئلہ پر انحصار

صرف اس بنا پر کیا گیا ہے چونکہ انقلاب کی پہلی ضرب کو خطرے کے اعلان اور ڈرانے سے شروع کیا جائے کیونکہ اس کی تاثیر سوئے ہوئے اور غافل لوگوں کو بیدار کرنے میں بشارت کی نسبت زیادہ ہے۔ اصولی طور پر جب تک انسان کوئی بڑا خطرہ محسوس نہ کرے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا اور اسی بنا پر انبیاء کے انذار اور خطرے کے اعلان تازیانہ کی شکل میں گمراہوں کی بے درد روحوں پر پڑتے تھے کہ جو شخص بھی حرکت کی طاقت رکھتا وہ حرکت میں آجاتا تھا نیز اسی بنا پر قرآن کی بہت سی آیات میں (مثلاً سورہ حج ۴۹، شعراء ۱۱۵، عنکبوت ۵۰، فاطر ۴۲، ص ۷۰، احقاف ۹، ذاریات ۵۰ اور دیگر آیات میں) ہر جگہ دعوت انبیاء کو بیان کرتے وقت لفظ "نذیر" (ڈرانے والا) استعمال کیا گیا ہے۔

بعد والی آیت میں پہلی ضرب کے بعد اپنی رسالت کے مضمون کو صرف ایک جملہ میں بطور خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: میرا پیغام یہ ہے کہ "اللہ" کے علاوہ کسی دوسرے کی پرستش نہ کرو (الا تعبدوا الا اللہ) پھر بلا فاصلہ اس کے پیچھے اسی مسئلہ انذار اور اعلام خطر کا تکرار کرتے ہوئے کہتا ہے: میں تم پر دردناک دن سے ڈرتا ہوں (انی اخاف علیکم عذاب یوم الیم) [1]

اصل میں اللہ (خدائے یکتا و یگانہ) کی توحید اور عبادت ہی تمام انبیاء کی دعوت کی بنیاد ہے اور اسی بنا پر تمام انبیاء کے حالات میں جیسا کہ اس سورت کی دوسری آیت اور سورۂ یوسف کی آیت ۴۰ اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۲۳ میں بھی آیا ہے یہی تعبیر نظر آتی ہے کہ وہ اپنی دعوت کا خلاصہ توحید کو قرار دیتے تھے۔

سچ ہے اگر تمام افراد اور معاشرہ اللہ کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں اور طرح طرح کے بناتے ہوئے بتوں کے سامنے چاہے بیرونی بت ہوں یا اندرونی، خود خواہی، ہوا و ہوس، شہوت و ثروت، مقام و منزلت، جاہ و جلال، عورت و اولاد ہوں سر تسلیم خم نہ کریں تو کسی قسم کی خرابی اور فساد انسانی معاشروں میں پیدا نہ ہو۔ اگر انسان خود کاسۂ ناتوانی کو ایک بت کی صورت میں نہ لائے اور اس کے سامنے سجدہ نہ کرے اور اس کی فرمانبرداری نہ کرے تو استبداد اور استعمار وجود میں نہ آتے اور نہ ہی اس کے برے آثار۔ ذلت اور اسارت پیش آئیں اور نہ ہی وابستگی اور طفیلی ہونے کی بنیاد پڑے۔ تمام بدبختیاں جو افراد اور معاشروں کو دامن گیر ہوں اسی اللہ کی پرستش سے انحراف اور بتوں اور طاغوتوں کی پرستش کی طرف رخ کرنے کی وجہ سے ہیں۔

اب ہم دیکھیں گے کہ پہلا ردعمل اس زمانے کے طاغوتوں، خود سروں اور صاحبان زر و زور کا اس عظیم دعوت اور واضح اعلام خطر کے مقابلے میں کیا تھا۔ مسلماً سوائے کچھ بیہودہ اور جھوٹے عذر بہانوں اور بے بنیاد

---

[1] باوجودیکہ دردناک ہونا عذاب کی صفت ہے لیکن زیر نظر آیت میں یوم کی صفت قرار دی گئی ہے یہ ایک قسم کی لطیف اسناد مجازی ہے جو مختلف زبانوں کی ادبیات میں آتی ہے فارسی میں بھی ہم کہتے ہیں کہ فلاں دن بڑا دردناک تھا حالانکہ خود دن دردناک نہیں تھا، بلکہ اس کے حوادثات دردناک تھے۔

استدلالوں کے جو کہ ہر زمانے کے جابروں کا طریقہ ہے ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

انہوں نے حضرت نوحؑ کی دعوت کے تین جواب دیئے:

۱۔ قوم نوح کے سردار اور سرمایہ دار کافر تھے۔ انہوں نے کہا ہم تو تجھے صرف اپنے جیسا انسان دیکھتے ہیں (فقال الملأ الذین کفروا من قومہ ما نرٰک الا بشرا مثلنا) حالانکہ اللہ کی رسالت اور پیغام تو فرشتوں کو اپنے کندھوں پر لینا چاہیئے نہ کہ ہم جیسے انسانوں کو۔ اس گمان کے ساتھ کہ انسان کا مقام فرشتوں سے نیچے ہے یا انسان کی ضرورت کو فرشتہ انسان سے بہتر جانتا ہے۔ پھر ہم یہاں لفظ "ملاء" کا سامنا کر رہے ہیں یعنی صاحبانِ اقتدار، سرمایہ دار اور ایسے افراد جن پر لوگوں کی نظریں جمتی ہیں لیکن وہ اندر سے خالی ہوتے ہیں، یہ لوگ ہر معاشرے میں فساد اور تباہی کا اصلی سرچشمہ ہوتے ہیں اور انبیاء کے مقابلے میں مخالفت کا پرچم بلند کرتے ہیں۔

۲۔ انہوں نے کہا اے نوح! ہم تیرے گرد و پیش اور ان کے درمیان کہ جنہوں نے تیری پیروی کی ہے سوائے چند پست، نا آگاہ اور بے خبر تھوڑے سن و سال کے نوجوانوں کے کہ جنہوں نے مسائل کی دیکھ بھال نہیں کی کسی کو نہیں دیکھتے (وما نرٰک اتبعک الا الذین ھم اراذلنا بادی الرأی)۔

"اراذل" "ارذل" (بروزن اکرم) کی جمع ہے اور وہ خود "رذل" کی جمع ہے جو پست و حقیر موجود کے معنی میں ہے چاہے وہ انسان ہے یا کوئی اور چیز۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ حضرت نوحؑ کی طرف مائل ہونے والے اور ان پر ایمان لانے والے لوگ نہ اراذل تھے اور نہ ہی حقیر و پست، تاہم اس بناء پر چونکہ انبیاء ہر چیز سے پہلے مستضعفین کی حمایت اور مستکبرین سے مبارزہ اور جہاد کرتے تھے لہٰذا پہلا گروہ جو انبیاء کی دعوت پر لبیک کہتا وہی محروم، فقیر اور کم آمدنی والے لوگ ہوتے تھے، جو مستکبرین کی نگاہ میں جو کہ شخصیت کا معیار دولت اور اقتدار کو سمجھتے تھے پست اور حقیر افراد شمار ہوتے تھے اور یہ جو انہیں "بادی الرأی" (ظاہر بین بے مطالعہ اور وہ شخص جو پہلی نظر میں کسی چیز کا عاشق اور خواہاں ہوتا ہے) کا نام دیا ہے حقیقت میں اس بناء پر ہے کہ وہ ہٹ دھرمی اور غیر مناسب تعصبات جو دوسروں میں تھے وہ نہیں رکھتے تھے بلکہ زیادہ تر پاک دل نوجوان تھے جو حقیقت کی پہلی کرن کو جو ان کے دل پر پڑتی جلدی محسوس کر لیتے تھے وہ اس بیداری کے ساتھ جو کہ حق کی تلاش سے حاصل ہوتی ہے صداقت کی نشانیاں انبیاء کے اقوال و افعال کا ادراک کر لیتے تھے۔

۳۔ اُن کا آخری اعتراض یہ تھا کہ قطع نظر اس سے کہ تو انسان ہے نہ کہ فرشتہ، علاوہ ازیں تجھ پر ایمان لانے والے نشاندہی کرتے ہیں کہ تیری دعوت کے مشتملات صحیح نہیں ہیں۔ اصولی طور پر تم ہم پر کسی قسم کی برتری نہیں رکھتے کہ ہم اس بناء پر تیری پیروی کریں (وما نرٰی لکم علینا من فضل)۔ لہٰذا ہم گمان کرتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو (بل نظنکم کاذبین)۔

حضرت نوحؑ کے جوابات

بعد والی آیات میں ان بہانہ جو اور فسانہ ساز افراد کو حضرت نوحؑ کی طرف سے دیئے گئے جوابات ذکر کیے گئے ہیں۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے : اے قوم! میں اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل اور معجزہ کا حامل ہوں اور اس نے اس رسالت و پیغام کی انجام دہی کی وجہ سے اپنی رحمت میرے شامل حال کی ہے اور یہ امر اگر عدم توجہ کی وجہ سے تم سے مخفی رہ گیا ہو تو کیا پھر بھی تم میری رسالت کا انکار کر سکتے ہو اور میری پیروی سے دست بردار ہو سکتے ہو (قال یا قوم ارءیتم ان کنت علی بینۃ من ربی و اٰتانی رحمۃ من عندہ فعمیت علیکم)۔

اس بارے میں کہ یہ جواب قوم نوح کے منکرین کے تین سوالوں میں سے کس کے ساتھ مربوط ہے مفسرین کا بہت اختلاف ہے لیکن غور و خوض سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جامع جواب تینوں اعتراضات کا جواب بن سکتا ہے۔ کیونکہ ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ تم انسان ہو۔ آپؑ نے فرمایا یہ بجا ہے کہ میں تمہاری طرح کا ہی انسان ہوں لیکن اللہ تعالٰی کی رحمت میرے شامل حال ہوئی ہے اور اس نے مجھے کھلی اور واضح نشانیاں دی ہیں اس بنا پر میری انسانیت اس عظیم رسالت سے مانع نہیں ہو سکتی اور یہ ضروری نہیں کہ میں فرشتہ ہوں۔

ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ تمہارے پیروکار بے فکر اور ظاہر بین افراد ہیں۔ آپؑ نے فرمایا تم بے فکر اور بے سمجھ ہو جو اس واضح حقیقت کا انکار کرتے ہو حالانکہ میرے پاس ایسے دلائل موجود ہیں جو ہر حقیقت کے متلاشی انسان کے لیے کافی ہیں اور اسے قائل کر سکتے ہیں مگر تم جیسے افراد جو غرور، خود خواہی، تکبر اور جاہ طلبی کا پردہ اوڑھے ہوئے ہیں ان کی حقیقت بین آنکھ بیکار ہو چکی ہے۔

ان کا تیسرا اعتراض یہ تھا کہ وہ کہتے تھے: ہم کوئی برتری اور فضیلت تمہارے لیے اپنی نسبت نہیں پاتے۔ آپؑ نے فرمایا اس سے بالاتر کون سی برتری ہے کہ خدا نے اپنی رحمت میرے شامل حال کی ہے اور واضح مدارک و دلائل میرے اختیار میں دیئے ہیں۔ اس بنا پر ایسی کوئی وجہ نہیں کہ تم مجھے جھوٹا خیال کرو کیونکہ میری گفتگو کی نشانیاں ظاہر ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: کیا میں تمہیں اس ظاہر بظاہر بینہ کے قبول کرنے پر مجبور کر سکتا ہوں جبکہ تم خود اس پر آمادہ نہیں ہو اور اسے قبول کرنا بلکہ اس کے بارے میں غور و فکر کرنا بھی پسند نہیں کرتے ہو (انلزمکموھا و انتم لھا کارھون)۔

۲۹ وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّىْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ○

۳۰ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِىْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○

۳۱ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّىْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِىْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ ۚ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○

ترجمہ

۲۹ اے قوم! میں اس دعوت کے بدلے تم سے کچھ نہیں چاہتا میرا اجر صرف اللہ پر ہے اور میں ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں (تمہاری وجہ سے) دھتکارتا نہیں ہوں کیونکہ وہ اپنے پروردگار کی ملاقات کریں گے (اور قیامت کی عدالت میں میرے مقابل قرار پائیں گے)، لیکن تمہیں میں دیکھ رہا ہوں کہ تم جاہل ہو۔

۳۰ اے قوم! اگر میں انہیں دھتکار دوں تو خدا (کے عذاب) کے مقابلے میں کون میری مدد کرے گا۔ کیا تم سوچتے نہیں ہو؟

۳۱ میں تمہیں کبھی نہیں کہوں گا کہ خدائی خزانے میرے پاس ہیں، نہ میں کہتا ہوں کہ

مَیں غیب کا علم رکھتا ہوں ، نہ یہ کہتا ہوں کہ مَیں فرشتہ ہوں اور مَیں یہ بھی نہیں کہتا کہ وہ لوگ جو تمہاری نگاہ میں ذلیل و خوار نظر آتے ہیں خدا انہیں خیر نہیں دے گا۔ خدا ان کے دلوں سے زیادہ آگاہ ہے (مَیں اگر اس کے باوجود انہیں دُور کر دوں) تو اس صورت میں مَیں ظالموں میں سے ہوں گا۔

تفسیر

صاحب ایمان افراد کو دھتکارا نہیں جاسکتا

ہم نے گزشتہ آیات میں دیکھا ہے کہ خود غرض اور بہانہ جو قوم حضرت نوحؑ پر مختلف اعتراضات کرتی تھی جن کا انہوں نے نہایت عمدہ اور واضح جواب دیا۔ زیر بحث آیات میں بھی ان کی بہانہ تراشیوں کا جواب دیا گیا ہے۔

پہلی آیت میں نبوت کی ایک دلیل بیان کی گئی ہے جو حضرت نوحؑ نے تاریک دل قوم کو روشنی بخشنے کے لیے پیش کی تھی۔ ارشاد ہوتا ہے: اے قوم! مَیں اس دعوت کے بدلے تم سے مال و ثروت اور اجر و جزا کا مطالبہ نہیں کرتا (و یا قوم لا اسئلکم علیہ مالاً) میرا اجر و جزا صرف اللہ پر ہے وہ خدا کہ جس نے مجھے نبوت کے ساتھ مبعوث کیا ہے اور مخلوق کو دعوت دینے پر مامور کیا ہے (ان اجری الا علی اللہ)۔

یہ امر اچھی طرح سے نشاندہی کرتا ہے کہ اس پروگرام سے میرا کوئی مادی ہدف نہیں ہے، مَیں سوائے خدا کے معنوی و روحانی اجر کے کچھ بھی نہیں سوچتا اور دیکھتا ہوں اور کوئی جھوٹا مدعی ایسا نہیں ہو سکتا جو اس قسم کے سر درد، ناراحتی اور بے آرامی کو یوں ہی اپنے لیے خرید لے اور یہ سچے رہبروں کی پہچان کے لیے ایک میزان ہے اُن جھوٹے موقع پرستوں کے مقابلے میں جو کہ جب بھی کوئی قدم اٹھاتے ہیں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اس سے ان کا کوئی نہ کوئی مادی ہدف اور مقصد ہوتا ہے۔

اس کے بعد ان کے جواب میں جنہیں اصرار تھا کہ حضرت نوحؑ غریب و حقیر اور کم عمر افراد کو جو آپ پر ایمان لائے تھے خود سے دُور کر دیں حضرت نوحؑ حتمی طور پر (فیصلہ سناتے ہوئے) کہتے ہیں: مَیں ہرگز ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں نہیں دھتکاروں گا (وما انا بطارد الذین اٰمنوا)۔ کیونکہ وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کریں گے اور دوسرے جہان میں اس کے سامنے مجھ سے ساتھ ہوں گے

(انھم ملاقوا ربھم) [1]

آیت کے آخر میں انہیں بتایا گیا ہے : میں سمجھتا ہوں کہ تم جاہل لوگ ہو (ولکنی اراکم قوما تجھلون)۔

اس سے بڑھ کر جہالت کیا ہوگی کہ فضیلت کو پرکھنے کی میزان تم گنوا بیٹھو ہو۔ آج تمہاری نظر دولت، مالی وجاہت، ظاہری مقام و منصب اور سن وسال معیار فضیلت بن چکے ہیں اور صاحب ایمان افراد جو تہی دست اور برہنہ پا ہیں وہ تمہارے گمان میں بارگاہ خدا وندی سے دُور ہیں۔ یہ تمہاری بہت بڑی غلط فہمی ہے اور یہ تمہاری جہالت کی نشانی ہے۔

علاوہ ازیں تم اپنی جہالت و نادانی کی بنا پر سمجھتے ہو کہ پیغمبر کو فرشتہ ہونا چاہیئے حالانکہ انسانوں کا رہبر انہی کی نوع سے ہونا چاہیئے تاکہ وہ ان کی ضروریات، مشکلات اور تکالیف کو محسوس کرسکے اور سمجھ سکے۔

بعد والی آیت میں مزید وضاحت کے لیے ان سے کہا گیا ہے : اے قوم ! اگر میں ان باایمان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کے سامنے (اس عظیم عدالت میں بلکہ اس جہان میں) کون میری مدد کرے گا (ویا قوم من ینصرنی من اللہ ان طردتھم)۔

صالح اور مومن افراد کو دھتکارنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ وہ کل قیامت کے دن میرے خلاف ہوں گے اور وہاں کوئی شخص میرا دفاع نہیں کرسکے گا۔ نیز ممکن ہے عذاب الٰہی اس جہان میں بھی مجھے دامن گیر ہو۔ کیا تم کچھ سوچتے سمجھتے نہیں ہو کہ تمہیں معلوم ہو کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں عین حقیقت ہے (افلا تذکرون)۔

"تفکر" اور "تذکر" میں یہ فرق ہے کہ تفکر درحقیقت کسی چیز کی شناخت کے لیے ہوتا ہے چاہے اس کے بارے میں ہمیں پہلے سے کچھ پتہ نہ ہو لیکن "تذکر" (یاد آوری) اس موقع پر بولا جاتا ہے جب انسان اس امر کے بارے میں پہلے سے واقفیت رکھتا ہو اگرچہ وہ فطری آگاہی کے حوالے سے ہو۔ اتفاقاً اپنی قوم سے حضرت نوحؑ کے زیر بحث مسائل بھی اسی نوعیت کے تھے کہ انسان اپنی فطرت اور وجدان کی طرف توجہ کرنے سے انہیں سمجھ سکتا ہے لیکن ان کے غرور، تعصب، خود پرستی اور غفلت نے ان کے چہروں پر پردہ ڈال دیا تھا۔

اپنی قوم کے بےمحل اعتراضات کے جواب میں حضرت نوحؑ آخری بات یہ کہتے ہیں کہ اگر تم خیال کرتے ہو اور توقع رکھتے ہو کہ وحی اور اعجاز کے سوا میں تم پر کوئی امتیاز یا برتری رکھوں تو یہ غلط ہے۔ میں صراحت سے کہنا چاہتا ہوں کہ "میں نہ تم سے کہتا ہوں کہ خدائی خزانے میرے قبضے میں ہیں اور نہ ہر کام جب چاہوں انجام دے سکتا ہوں" (ولا اقول لکم عندی خزائن اللہ)۔ "نہ میں غیب سے آگاہی کا دعویٰ کرتا ہوں" (ولا

---

[1] یہ احتمال بھی اس جملہ کی تفسیر میں ہے کہ حضرت نوحؑ کی مراد یہ ہو کہ اگر مجھ پر ایمان لانے والے باطن میں مدوح گرا اور جھوٹے ہوتے تو خدا قیامت میں ان سے حساب کرے گا۔ لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

اعلم الغیب)۔ اور نہ میں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں (ولا اقول انی ملك)۔

ایسے بڑے اور جھوٹے دعوے جھوٹے مدعیوں کے ساتھ مخصوص ہیں ورنہ ایک سچا پیغمبر کبھی ایسے دعوے نہیں کرے گا کیونکہ خدائی خزانے اور علم غیب صرف خدا کی پاک ذات کے اختیار میں ہیں اور فرشتہ ہونا بھی ان بشری احساسات سے مناسبت نہیں رکھتا۔ لہٰذا جو شخص ان تین میں سے کوئی ایک دعوےٰ کرے یا یہ سب دعوے کرے تو یہ اس کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے۔

پیغمبر اسلام کے بارے میں بھی سورہ انعام کی آیت ۵۰ میں ایسی تعبیر ملتی ہے جہاں فرمایا گیا ہے:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ ۔

میں نہیں کہتا کہ خدا کے خزانے میرے پاس ہیں نہ یہ کہتا ہوں کہ میں علم غیب رکھتا ہوں اور نہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی ہوتی ہے۔

اس آیت میں امتیاز پیغمبر کو وحی میں منحصر کرنا اور مندرجہ بالا تینوں امور کی نفی کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت نوحؑ سے مربوط آیات میں بھی ایسا امتیاز مفہوم کلام میں مخفی ہے اگرچہ صراحت سے بیان نہیں ہوا۔

آیت کے آخر میں دوبارہ مستضعفین کا ذکر کرتے ہوئے تاکید کی گئی ہے: "میں ہرگز ان افراد کے بارے میں جو تمہاری نگاہ میں حقیر ہیں، نہیں کہہ سکتا کہ خدا انہیں کوئی جزائے خیر نہیں دے گا (ولا اقول للذین تزدری اعینکم لن یؤتیهم الله خیرا)۔ بلکہ اس کے برعکس اس جہان اور اُس جہان کی خیر انہی کے لیے ہے اگرچہ ان کا ہاتھ مال و دولت سے خالی ہے۔ یہ تو تم ہو جنہوں نے خام خیال کی وجہ سے خیر کو مال و مقام یا سن و سال میں منحصر سمجھ رکھا ہے اور تم حقیقت سے بالکل بے خبر ہو۔

اور بالفرض اگر تمہاری بات بھی ہو اور وہ پست اور اوباش ہوں تو خدا ان کے باطن اور نیتوں سے آگاہ ہے (الله اعلم بما فی انفسهم)۔

میں تو ان میں ایمان اور صداقت کے سوا کچھ نہیں پاتا۔ لہٰذا میری ذمہ داری ہے کہ میں انہیں قبول کر لوں۔ میں تو ظاہر پر مامور ہوں اور بندہ شناس خدا ہے۔

اور اگر میں اس کے علاوہ کچھ کروں تو یقیناً ظالموں میں سے ہو جاؤں گا (انی اذا لمن الظالمین)۔

آخری جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ آیت کے سارے مضمون سے مربوط ہو یعنی اگر میں علم غیب جاننے، فرشتہ ہونے یا خزائن الٰہی کا مالک ہونے کا دعویٰ کروں یا ایمان لانے والوں کو دھتکاروں تو خدا کی بارگاہ میں اور وجدان کی نظر میں میں ظالموں کی صف میں داخل ہوں گا۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ **علمِ غیب اور خدا کے خاص بندے:** جیسا کہ ہم نے بارہا اشارہ کیا ہے غیب سے مطلق آگاہی اور بغیر کسی قید و شرط سے واقفیت خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن وہ جس قدر مصلحت سمجھتا ہے یہ علم وآگہی انبیاء اور اولیاء کے اختیار میں دے دیتا ہے۔ جیسا کہ سورہ جن کی آیہ ۲۶ اور ۲۷ میں ہے:

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ

خدا تمام پوشیدہ امور سے آگاہ ہے اور کسی کو اپنے علمِ غیب سے آگاہ نہیں کرتا مگر اس رسول کو جسے وہ چاہے۔

اس بناء پر زیرِ بحث آیات میں جو انبیاء سے علمِ غیب کی نفی کی گئی ہے اور دیگر آیات و روایات جن میں انبیاء یا آئمہ کی طرف بعض غیوب کی نسبت دی گئی ہے کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسرارِ غیب سے بالذات گواہی خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسروں کے پاس جو کچھ ہے وہ تعلیمِ خداوندی کے ذریعے ہے۔ لہٰذا وہ ارادۂ الٰہی کے مطابق اور اسی حد تک ہے[1]

۲۔ **معیارِ فضیلت:** ان آیات میں ہم دوبارہ اس حقیقت کو دیکھ رہے ہیں کہ اہلِ اقتدار، سرمایہ دار اور دنیا پرست مادی لوگ جو تمام چیزوں کو اپنے افکار کے دریچے سے اسی مادی حوالے سے دیکھتے ہیں ان کی نظر میں کسی کا مقام و احترام دولت و منصب کے حوالے سے ہوتا ہے لہٰذا یہ بات کوئی باعثِ تعجب نہیں کہ وہ تہی دست سچے مومنین کو "اراذل" (پست) قرار دیں اور ان کی طرف حقارت سے دیکھیں۔

یہ امر قومِ نوح ہی میں منحصر نہیں کہ وہ مستضعفین مومنین خصوصاً انقلابی نوجوانوں کو جو آپ کے گرد و پیش تھے بے وقوف، کوتاہ فکر اور بے وقعت سمجھتے تھے بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ یہی منطق دوسرے انبیاء خصوصاً پیغمبرِ اسلام اور پہلے مومنین کے بارے میں بھی موجود تھی۔ آج بھی ہم یہی صورت دیکھتے ہیں۔ فرعون صفت مستکبرین اپنی شیطانی طاقت کا سہارا لیتے ہوئے سچے مومنین کو ایسے ہی متہم کرتے ہیں۔ وہ تاریخ کو دہراتے ہوئے اپنے مخالفین کو ایسے القابات ہی سے یاد کرتے ہیں۔

لیکن جب ایک برا ماحول ایک خدائی انقلاب کے ذریعے پاک ہو جائے تو شخصیت شناسی کے ایسے معیار بھی دیگر موہوم چیزوں کے ساتھ تاریخ کے کوڑا دان میں پھینک دیئے جاتے ہیں اور ان کی جگہ اصلی اور انسانی معیار لے لیتے ہیں۔ وہ معیار کہ جن پر انسانی زندگی کا متن برقرار ہے، جن پر عینی حقائق استوار ہیں اور جن سے ایک پاک،

---

[1] مزید وضاحت کیلئے تفسیر نمونہ کی تیسری جلد صفحہ ۳۵۱ (اردو ترجمہ) اور چوتھی جلد صفحہ ۲۵۷ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

آباد اور آزاد معاشرہ استفادہ کرتا ہے مثلاً ایمان، علم، آگہی، ایثار، تقویٰ، پاک دامنی، شہادت، شجاعت، تجربہ، بیداری، مدیریت اور نظم و نسق کی صلاحیت وغیرہ۔

۲۔ **ایک اشکال کی وضاحت:** صاحب المنار کی طرح بعض مفسرین اس آیت تک پہنچتے ہیں تو وہ ان لوگوں کی طرف جو غیر خدا کے لیے علم غیب کے قائل ہیں یا ان سے اپنی مشکلات کا حل چاہتے ہیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مختصراً کہتے ہیں کہ یہ دو چیزیں (علم غیب اور خزائن الٰہی) ایسی ہیں جن کی قرآن نے انبیاء سے نفی کی ہے لیکن مسلمانوں اور اہل کتاب میں سے بدعتی اولیاء اور قدیسین کے لیے ان امور کے قائل ہیں[1]

اگر موصوف کی مراد یہ ہے کہ وہ ان سے ہر قسم کے علم غیب کی نفی کرنا چاہتے ہیں وہ تعلیم الٰہی سے ہو تو یہ بات قرآن مجید کی صریح نصوص کے خلاف ہے اور اگر اس کا مقصود انبیاء اور اولیاء اللہ سے توسل کی اس معنی میں نفی ہے کہ وہ خدا سے ہماری مشکلات کے حل کے لیے دعا اور خواہش کریں تو یہ بات بھی آیات قرآن اور شیعہ سنی مسلمہ احادیث کے خلاف ہے۔

---

[1] المنار ج ۱۲ صفحہ ۹۶

(۳۲) قَالُوا يَا نُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ○

(۳۳) قَالَ إِنَّمَا يَأْتِيكُم بِهِ اللَّهُ إِن شَاءَ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ○

(۳۴) وَلَا يَنفَعُكُمْ نُصْحِي إِنْ أَرَدتُّ أَنْ أَنصَحَ لَكُمْ إِن كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَن يُغْوِيَكُمْ ۚ هُوَ رَبُّكُمْ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○

(۳۵) أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَيَّ إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تُجْرِمُونَ ○

ترجمہ

(۳۲) انہوں نے کہا: اے نوح! تُو نے ہم سے بہت بحث و تکرار کی اور بڑی باتیں کیں اب (بس کرو) اگر سچ کہتے ہو تو جس (عذاب الٰہی) کا ہم سے وعدہ کرتے ہو اسے لے آؤ۔

(۳۳) (نوح نے جواباً) کہا: اگر خدا نے ارادہ کر لیا تو لے آئے گا پھر تم میں فرار کی طاقت نہ ہو گی۔

(۳۴) (لیکن کیا فائدہ کہ) جب خدا چاہے تمہیں (تمہارے گناہوں کی وجہ سے) گمراہ کر دے اور میں تمہیں نصیحت کروں تو پھر میری نصیحت تمہیں کوئی فائدہ نہ دے گی۔ وہ تمہارا پروردگار ہے اسی کی طرف تم لوٹ کر جاؤ گے۔

(۳۵) (مشرکین) کہتے ہیں: وہ (محمدؐ) خدا کی طرف ان باتوں کی غلط نسبت دیتا ہے۔

کہہ دو : اگر میں نے انہیں اپنی طرف سے گھڑا ہے اور اس کی طرف نسبت دیتا ہوں تو اس کا گناہ میرے ذمہ ہے لیکن میں تمہارے گناہوں سے بیزار ہوں ۔

تفسیر

کہاں ہے عذاب ؟

ان آیات میں حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے درمیان ہونے والی باقی گفتگو کی طرف اشارہ ہوا ہے ۔
پہلی آیت میں قوم نوح کی زبانی نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا : اے نوح ! تم نے یہ سب بحث و تکرار اور مجادلہ کیا ہے اب بس کرو ۔ تم نے ہم سے بہت باتیں کی ہیں اب بحث مباحثے کی گنجائش نہیں رہی (قالوا یا نوح قد جادلتنا فاکثرت جدالنا) ۔

اگر سچے ہو تو خدائی عذابوں کے بارے میں جو سخت وعدے تم نے ہم سے کیے تھے انہیں پورا کر دکھاؤ اور وہ عذاب لے آؤ (فأتنا بما تعدنا ان کنت من الصادقین) ۔

یہ بعینہ اس طرح سے ہے کہ ایک شخص یا کچھ اشخاص کسی مسئلے کے بارے میں ہم سے بات کریں اور ضمناً ہمیں دھمکیاں بھی دیں اور کہیں کہ اب زیادہ باتیں بند کرو اور جو کچھ تم کر سکتے ہو کر لو اور دیر نہ کرو ــ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ ہم نہ تو تمہارے دلائل کو کچھ سمجھتے ہیں ، نہ تمہاری دھمکیوں سے ڈرتے ہیں اور نہ اس سے زیادہ ہم تمہاری بات سن سکتے ہیں ۔

انبیاء الٰہی کے لطف و محبت اور ان کی وہ گفتگو جو صاف و شفاف اور خوشگوار پانی کی طرح ہوتی ہے اس طرز عمل کا انتخاب انتہائی ہٹ دھرمی ، تعصب اور جہالت کی ترجمانی کرتا ہے ۔

قوم نوح کی اس گفتگو سے ضمناً یہ بھی اچھی طرح سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپؑ نے ان کی ہدایت کے لیے بہت طویل مدت تک کوشش کی اور انہیں ارشاد و ہدایت کے لیے آپؑ نے ہر موقع سے استفادہ کیا ۔ آپ نے اس قدر کوشش کی کہ اس گمراہ قوم نے آپؑ کی گفتار اور ارشادات پر اکتاہٹ کا اظہار کیا ۔

حضرت نوحؑ کے بارے میں قرآن حکیم میں جو دیگر آیات آئی ہیں ان سے بھی یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہوتی ہے ، سورۂ نوح آیات ۵ تا ۱۳ میں یہ مفہوم مبسوط طریقے سے بیان ہوا ہے :

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْ اِلَّا فِرَارًا وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا

پروردگارا! مَیں نے اپنی قوم کو دن رات تیری طرف بلایا لیکن میری اس دعوت پر ان میں فرار کے علاوہ کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوا۔ مَیں نے جب انہیں پکارا تاکہ تُو انہیں بخش دے تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں اور اپنے لباس اپنے اوپر لپیٹ لیے۔ انہوں نے مخالفت پر اصرار کیا اور تکبر و خود سری کا مظاہرہ کیا۔ مَیں پھر بھی انہیں دعوت دینے سے دستبردار نہ ہوا۔ مَیں نے پھر انہیں علی الاعلان اور پوشیدہ طور پر تیری "بند" دعوت دی۔ مَیں نے پیہم اصرار کیا مگر انہوں نے کسی طرح بھی میری باتوں کی طرف کان نہ دھرے۔

زیر بحث آیت میں لفظ "جادلتنا" آیا ہے جو "مجادلہ" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ یہ اصل میں طناب اور رسّی کو مضبوطی سے بٹنے اور پیچ دینے کے معنی میں ہے۔ اسی بناء پر شکاری باز کو "اجدل" کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام پرندوں سے زیادہ پیچ و خم کھانے والا ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ بحث اور گفتگو میں مدمقابل کے پیچ و خم کھانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

"جدال"، "مراء" اور "حجاج" (بروزن "لجاج") اگرچہ معنوی طور پر ایک دوسرے کے مشابہ ہیں لیکن جیسا کہ بعض محققین نے کہا ہے کہ "مراء" میں ایک طرح کی مذمت پائی جاتی ہے کیونکہ یہ لفظ ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے جب انسان کسی باطل مسئلے پر ڈٹ جائے اور استدلال کرے لیکن "جدال" اور "مجادلہ" میں یہ مفہوم لازمی طور پر نہیں ہوتا۔ باقی رہا "جدال" اور "حجاج" کا فرق — تو وہ یہ ہے کہ "جدال" مدمقابل کو اس کے عقیدے سے لوٹانے کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ "حجاج" ایک عقیدے کی دعوت دینے اور اس پر استدلال پیش کرنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

حضرت نوحؑ نے اس بے اعتنائی، ہٹ دھرمی اور بے ہودگی کا یہ مختصر جواب دیا: خدا ہی چاہے تو ان دھمکیوں اور عذاب کے وعدوں کو پورا کر سکتا ہے (قال انما یأتیکم بہ اللّٰہ ان شاء)۔ بہر حال یہ چیز میرے اختیار سے باہر ہے اور میرے قبضۂ قدرت میں نہیں ہے۔ مَیں تو اس کا فرستادہ ہوں اور اس کے حکم کے سامنے تسلیم ہوں لہٰذا سزا اور عذاب کی خواہش مجھ سے نہ کرو لیکن یہ جان لو کہ جب عذاب کا حکم آ پہنچا تو پھر تم اس کے احاطۂ قدرت سے نکل نہیں سکتے اور کسی پناہ گاہ کی طرف فرار نہیں کر سکتے" (وما انتم بمعجزین)۔

"معجز" "اعجاز" کے مادہ سے دوسرے کو عاجز و ناتواں کرنے کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ بعض اوقات ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے جب انسان دوسرے کے کام میں رکاوٹ پیدا کر دے اسے روکے اور اسے علیحدہ ناتواں کر دے اور کبھی آگے بڑھ کر مدمقابل کو شکست دے دے یا اپنے آپ کو محفوظ کرے۔ یہ تمام مدمقابل کو عاجز و ناتواں کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ مندرجہ بالا آیت میں ان تمام معانی کا احتمال ہے کیونکہ یہ معانی ایکدوسرے کے منافی نہیں ہیں — یعنی تم کسی صورت میں اس کے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: اگر خدا تمہارے گناہوں اور جسمانی و فکری آلودگیوں کی وجہ سے تمہیں

گمراہ کرنا چاہے تو میری نصیحت تمہیں ہرگز کوئی فائدہ نہیں دے گی چاہے میں تمہیں جتنی بھی نصیحت کروں (ولا ینفعکم نصحی ان اردت ان انصح لکم ان کان اللہ یرید ان یغویکم)۔ کیونکہ وہ تمہارا پروردگار ہے اور تم اس کی طرف پلٹ کر جاؤ گے۔ اور تمہاری تمام تر ہستی اور وجود اس کے قبضۂ قدرت میں ہے (ھو ربکم والیہ ترجعون)۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اس آیت کے مطالعہ سے فوراً یہ سوال سامنے آتا ہے اور بہت سے مفسرین نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کسی کے گمراہ کرنے کا ارادہ کرے۔ کیا ایسا ہو تو یہ جبر و اکراہ کی دلیل نہیں ہوگی اور کیا یہ جو بنیاد ہے کہ انسان ارادہ و اختیار میں آزاد ہے اسے قبول کر لینے کے بعد ایسی چیز قابلِ قبول ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ مندرجہ بالا مباحث میں واضح ہو چکا ہے اور ہم نے بارہا اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بعض اوقات انسان مسلسل کچھ اعمال بجا لاتا ہے جس کا نتیجہ دائمی گمراہی اور ہمیشہ کے انحراف اور حق کی طرف نہ لوٹنے کی صورت میں نکلتا ہے۔ ہمیشہ کی ہٹ دھرمی، گناہوں پر دائمی اصرار اور حق طلب سچے رہبروں کی دائمی دشمنی انسانی فکر پر ایسا ضخیم پردہ ڈال دیتی ہے کہ انسان میں آفتابِ حق و حقیقت کی شعاع دیکھنے کی تھوڑی سی صلاحیت بھی نہیں رہتی۔ چونکہ یہ حالت ایسے اعمال کا نتیجہ ہے جو انسان خود انجام دیتا ہے لہٰذا یہ کسی طرح بھی جبر و اکراہ کی دلیل نہیں ہو سکتی بلکہ یہ عین اختیار ہے۔ جو کچھ خدا سے مربوط ہے یہ ہے کہ اس نے ایسے اعمال میں ایسی تاثیر قرار دی ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت ، کے ذیل میں اور دیگر مواقع پر اشارہ کیا ہے۔

زیرِ بحث آخری آیت میں ایک بات جملۂ معترضہ کے طور پر آئی ہے۔ یہ ان مباحث کی تاکید کیلئے ہے جو حضرت نوحؑ کے واقعہ کے سلسلے میں گزشتہ اور آئندہ آیات میں موجود ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ، دشمن کہتے ہیں کہ یہ بات اس (محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے خود سے گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کر دی ہے (ام یقولون افتراہ)۔ ان کے جواب میں کہہ دو کہ اگر میں نے یہ اپنی طرف سے گھڑی ہے اور خدا کی طرف جھوٹی نسبت دی ہے تو اس کا گناہ مجھ پر ہے (قل ان افتریتہ فعلی اجرامی)۔ لیکن میں تمہارے گناہوں سے بیزار ہوں (وانا بریٓء مما تجرمون)۔

چند توجہ طلب نکات

۱۔ "اجرام" کا مفہوم: "اجرام" کا مادہ "جرم" (بروزن "جہل") ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے یہ کچے پھل توڑنے کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں ہر غیر خوش آئند کام کے لیے بولا جانے لگا۔ اسی طرح کسی

کو گناہ پر آمادہ کرنے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ چونکہ انسان ذاتی اور فطری طور پر روحانیت اور پاکیزگی سے رشتہ رکھتا ہے لہٰذا جب وہ گناہ انجام دیتا ہو تو وہ اس خدائی رشتہ سے جدا ہو جاتا ہے۔

۲۔ **آخری آیت کس کے بارے میں ہے:** زیرِ نظر آخری آیت کے بارے میں بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ پیغمبرِ اسلامؐ کے بارے میں نہیں ہے بلکہ خود حضرت نوحؑ سے مربوط ہے کیونکہ یہ سب آیات انہی سے مربوط ہیں اور بعد میں آنے والی آیات بھی انہی سے متعلق ہیں لہٰذا زیادہ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت بھی حضرت نوحؑ سے مربوط ہو اور ان کے نزدیک اس کا ایک جملۂ معترضہ ہونا خلافِ ظاہر ہے لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ:

اوّلاً تقریباً اسی طرح کی تعبیر انہی الفاظ میں سورۂ احقاف کی آیت ۸ میں پیغمبرِ اسلامؐ کے بارے میں آئی ہے۔

ثانیاً ان آیات میں جو کچھ حضرت نوحؑ کے بارے میں آیا ہے وہ سب صیغۂ غائب کی صورت میں ہے جبکہ زیرِ بحث آیت مخاطب کی صورت میں ہے (اور مسئلہ "التفات" یعنی غیبت سے خطاب کی طرف انتقال بھی خلافِ ظاہر ہے)۔ اب اگر ہم اس آیت کو حضرت نوحؑ کے بارے میں قرار دیں تو لفظ "یقولون" جو فعل مضارع کی صورت میں ہے اور اسی طرح لفظ "قل" جو فعل امر کی صورت میں ہے سب تقدیر کے محتاج ہوں گے۔

ثالثاً ایک حدیث جو تفسیر برہان میں اس آیت کے ذیل میں حضرت امام باقر علیہ السلام اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کی گئی ہے میں ہے کہ یہ آیت کفارِ مکہ کے مقابلے میں نازل ہوئی تھی۔

ان تمام دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت پیغمبرِ اسلامؐ سے مربوط ہے۔ کفار آپؐ پر ناروا تہمتیں باندھتے تھے یہ آیت آپؐ کی جانب سے ان کے لیے جواب کے طور پر نازل ہوئی ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جملۂ معترضہ کا یہ معنی نہیں کہ کوئی ایسی بات ذکر ہو جو اصل گفتگو سے کوئی ربط نہ رکھتی ہو بلکہ عام طور پر جملہ ہائے معترضہ ایسے مطالب پر مشتمل ہوتے ہیں جو مقصدِ کلام کی تاکید اور تائید کرتے ہیں۔ ان سے وقتی طور پر رشتۂ سخن منقطع ہو جاتا ہے۔ مخاطب کو ایک طرح سے موقع ملتا ہے اور گفتگو کو بھی لطافتِ روح اور تازگی میسر آتی ہے۔ یہ بات حق ہے کہ جملہ معترضہ کبھی بھی ہر لحاظ سے کلام سے بیگانہ نہیں ہو سکتا ورنہ یہ بات اصولِ فصاحت و بلاغت کے خلاف ہو جائے گی حالانکہ فصیح و بلیغ کلام میں ہمیشہ جملہ ہائے معترضہ پائے جاتے ہیں۔

۳۔ **ایک وضاحت:** زیرِ نظر آخری آیت کا مطالعہ کرتے وقت ہو سکتا ہے یہ اعتراض سامنے آئے کہ یہ بات کس طرح منطقی و عقلی ہو سکتی ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ یا حضرت نوحؑ کفار سے کہیں کہ یہ بات اگر جھوٹ ہے تو اس

کا گناہ میری گردن پر ہے۔ کیا جھوٹ بولنے کا گناہ قبول کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی گفتگو سچی ہے اور واقع کے مطابق ہے اور لوگ ذمہ دار ہیں کہ ان کی اطاعت اور پیروی کریں؟

اس کی وضاحت یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں غور و فکر کرنے سے ہمیں اس سوال کا جواب مل سکتا ہے۔ درحقیقت وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہماری یہ باتیں جو بہت سے عقلی دلائل پر مشتمل ہیں بالفرض محال ہم خدا کی طرف سے نہ بھی ہوں تو اس کا گناہ ہماری گردن پر ہے لیکن عقلی استدلال اپنی جگہ پر ثابت ہیں اور تم ان کی مخالفت سے ہمیشہ گناہ میں مبتلا رہو گے ـــ ایسا گناہ جو مسلسل اور دائمی ہے (توجہ رہے کہ "تجرمون" صیغۂ مضارع ہے جو عام طور پر استمرار اور تسلسل پر دلالت کرتا ہے)۔

(۳۶) وَ اُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ○

(۳۷) وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَ وَحْیِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ○

(۳۸) وَیَصْنَعُ الْفُلْكَ ۫ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَیْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ○

(۳۹) فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَ یَحِلُّ عَلَیْهِ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ○

ترجمہ

(۳۶) نوح کو وحی ہوئی کہ سوائے ان لوگوں کے کہ جو (اب تک) ایمان لا چکے ہیں اب تمہاری قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا لہٰذا جو کام وہ کرتے ہیں ان سے غمگین نہ ہو۔

(۳۷) اور (اب) ہمارے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ اور ان کے بارے میں شفاعت نہ کرو جنہوں نے ظلم کیا ہے کیونکہ وہ غرق ہو کر رہیں گے۔

(۳۸) وہ کشتی بنانے میں مشغول تھا اور جب اس کی قوم کے بڑوں میں سے کوئی گروہ اس کے قریب سے گزرتا تو اس کا مذاق اڑاتا (لیکن نوح نے) کہا: اگر ہمارا مذاق

اڑاتے ہو تو ہم بھی تمہارا اسی طرح مذاق اڑائیں گے ۔

(۳۹) عنقریب تم جان لو گے کہ کس کے پاس خوار کرنے والا عذاب آتا ہے اور ہمیشہ کی سزا اسے ملتی ہے ۔

تفسیر

معاشرے کو پاک کرنے کا مرحلہ

ان آیات میں حضرت نوحؑ کی سرگزشت بیان ہوئی ہے۔ اس کے درحقیقت مختلف مراحل ہیں۔ ان میں سے ہر مرحلہ مستکبرین کے خلاف حضرت نوحؑ کے قیام کے ایک دور سے مربوط ہے۔ گزشتہ آیات میں حضرت نوحؑ کی مسلسل اور پُرعزم دعوت کے مرحلے کا تذکرہ تھا، جس کے لیے انہوں نے تمام تر وسائل سے استفادہ کیا۔ یہ مرحلہ ایک طویل مدت پر مشتمل تھا۔ اس میں ایک چھوٹا سا گروہ آپؑ پر ایمان لایا۔ یہ گروہ ویسے تو مختصر سا تھا لیکن کیفیت اور استقامت کے لحاظ سے بہت عظیم تھا۔

زیرِ بحث آیات میں اس قیام کے دوسرے مرحلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ مرحلہ دورِ تبلیغ کے اختتام کا تھا جس میں خدا کی طرف سے معاشرے کو بُرے لوگوں سے پاک کرنے کی تیاری کی جانا تھی۔

پہلی آیت میں ہے: نوحؑ کو وحی ہوئی کہ جو افراد ایمان لاچکے ہیں ان کے علاوہ تیری قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا (واوحی الی نوح انه لن یؤمن من قومك الا من قد اٰمن)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ صفیں بالکل جدا ہو چکی ہیں، اب ایمان اور اصلاح کی دعوت کا کوئی فائدہ نہیں اور اب معاشرے کی پاکیزگی اور آخری انقلاب کے لیے تیار ہو جانا چاہیئے۔

آیت کے آخر میں حضرت نوحؑ کی تسلی اور دلجوئی کے لیے فرمایا گیا ہے: اب جب معاملہ یوں ہے تو جو کام تم انجام دے رہے ہو اس پر کوئی حزن و ملال نہ کرو (فلا تبتئس بما کانوا یفعلون)۔

اس آیت سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اسرارِ غیب کا کچھ حصہ جہاں ضروری ہوتا ہے اپنے پیغمبر کے اختیار میں دے دیتا ہے جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو خبر دی گئی ہے کہ آئندہ ان میں سے کوئی اور شخص ایمان نہیں لاتے گا۔

بہرحال ان گنہگار اور ہٹ دھرم لوگوں کو سزا ملنی چاہیئے، ایسی سزا جو عالم ہستی کو ان کے وجود کی گندگی سے پاک کر دے اور مومنین کو ہمیشہ کے لیے ان کے چنگل سے نجات دے دے۔ ان کے غرق ہونے کا حکم صادر ہو چکا ہے لیکن ہر چیز کے لیے کچھ وسائل و اسباب ہوتے ہیں لہذا نوحؑ کو چاہیئے کہ وہ سچے مومنین کے

بچنے کے لیے ایک مناسب کشتی بنائیں تاکہ ایک تو مومنین کشتی بننے کی اس مدت میں اپنے طریق کار میں پختہ تر ہو جائیں اور دوسروں کے لیے بھی کافی اتمام حجت ہو جائے لہٰذا۔ ہم نے نوح کو حکم دیا کہ وہ ہمارے حضور میں اور ہمارے فرمان کے مطابق کشتی بنائیں (واصنع الفلك باعيننا ووحينا)۔

لفظ "اعیننا" (ہماری آنکھوں کے سامنے) سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس سلسلے میں تمہاری سب جدوجہد، مساعی اور تمام کاوشیں ہمارے حضور میں اور ہمارے سامنے ہیں لہٰذا اطمینان اور راحتِ فکر کے ساتھ اپنا کام جاری رکھو۔ یہ فطری امر ہے کہ یہ احساس کہ خدا حاضر و ناظر ہے اور محافظ و نگران ہے ایک تو انسان کو قوت و توانائی بخشتا ہے اور دوسرا احساسِ ذمہ داری کو فروغ دیتا ہے۔

لفظ "وحینا" سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت نوحؑ کشتی بنانے کی کیفیت اور اس کی شکل و صورت کی تشکیل بھی حکمِ خدا سے سیکھ رہے تھے اور ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا کیونکہ حضرت نوحؑ آنے والے طوفان کی کیفیت و وسعت سے آگاہ نہ تھے کہ وہ کشتی اس مناسبت سے بناتے اور یہ وحیٔ الٰہی ہی تھی جو بہترین کیفیتوں کے انتخاب میں ان کی مددگار تھی۔

آیت کے آخر میں حضرت نوحؑ کو خبردار کیا گیا ہے کہ آج کے بعد "ظالم افراد کے لیے شفاعت اور معافی کا تقاضا نہ کرنا کیونکہ انہیں عذاب دینے کا فیصلہ ہو چکا ہے اور وہ حتماً غرق ہوں گے" (ولا تخاطبني في الذين ظلموا انهم مغرقون)۔

اس جملے سے اچھی طرح سے واضح ہوتا ہے کہ سب افراد کے لیے شفاعت ممکن نہیں ہے بلکہ اس کی کچھ شرائط ہیں۔ یہ شرائط جس میں موجود نہ ہوں اس کے لیے خدا کا پیغمبر بھی شفاعت اور معافی کے تقاضے کا حق نہیں رکھتا۔ اس سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد اوّل (ص۱۸۲ تا ص۲۰۰ اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

اب چند جملے قوم نوح کے بارے میں بھی سن لیں۔ وہ بجائے اس کے کہ ایک لمحہ کے لیے حضرت نوحؑ کی دعوت کو غور سے سنتے، اسے سنجیدگی سے لیتے اور کم از کم انہیں یہ احتمال ہی ہوتا کہ ہو سکتا ہے کہ حضرت نوحؑ کے بار بار کے اصرار اور تکرار دعوت کا سرچشمہ وحیٔ الٰہی ہی ہو اور ہو سکتا ہے طوفان اور عذاب کا معاملہ حتمی اور یقینی ہی ہو الٹا انہوں نے تمام مستکبر اور مغرور افراد کی عادت کا مظاہرہ کیا اور تمسخر و استہزاء کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کی قوم کا کوئی گروہ جب کبھی ان کے نزدیک سے گزرتا اور حضرت نوحؑ اور ان کے اصحاب کو لکڑیاں اور میخیں وغیرہ مہیا کرتے دیکھتا اور کشتی بنانے میں انہیں سرگرم عمل پاتا تو تمسخر اڑاتا اور پھبتیاں کستے ہوئے گزر جاتا (ويصنع الفلك وكلما مر عليه ملا من قومه سخروا منه)۔

"ملاء" ان اشراف اور بڑے لوگوں کو کہتے ہیں جو خودپسند ہوتے ہیں اور ہر مقام پر مستضعفین کا تمسخر اڑاتے ہیں اور انہیں پست و حقیر مخلوق سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے پاس سرمایہ اور اقتدار نہیں ہوتا۔ بس یہی نہیں کہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں بلکہ ان کے افکار کتنے ہی بلند ہوں، ان کا مکتب کتنا ہی پائیدار اور با اصول اور

ان کے اعمال کتنے ہی بیہودہ کیوں نہ ہوں، ان کے خیال میں وہ حقارت کے قابل ہیں، اسی بنا پر پند و نصیحت تنبیہ اور خلاصہ کی گھنٹیاں ان پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ ان کا علاج فقط دردناک عذاب الٰہی ہے۔

کہتے ہیں کہ قوم نوح کے اشراف کے مختلف گروہوں کے ہر دستے نے تمسخر اور تفریح طبع کے لیے اپنا ہی ایک انداز اختیار کر رکھا تھا۔

ایک کہتا : اے نوح ! دعوائے پیغمبری کا کاروبار نہیں چل سکا تو بڑھئی ہو گئے ہو۔

دوسرا کہتا : کشتی بنا رہے ہو ؟ بڑا اچھا ہے البتہ اس کے لیے دریا بھی بناؤ۔ کبھی کوئی عقلمند دیکھا ہے جو خشکی کے بیچ میں کشتی بنائے ؟

شاید ان میں سے کچھ کہتے تھے : اتنی بڑی کشتی کس لیے بنا رہے ہو۔ اگر کشتی بنانا ہی ہے تو ذرا چھوٹی بناؤ جسے ضرورت پڑے تو دریا کی طرف لے جانا تو ممکن ہو۔

ایسی باتیں کرتے تھے اور قہقہے لگا کر ہنستے ہوئے گزر جاتے تھے۔ یہ باتیں گھروں میں ہوتیں، کام کاج کے مراکز میں یہ گفتگو ہوتی گویا اب یہ بات بحثوں کا عنوان بن گئی۔ وہ ایک دوسرے سے حضرت نوحؑ اور ان کے پیروکاروں کی کوتاہ فکری کے بارے میں باتیں کرتے اور کہتے : اس بوڑھے کو دیکھو، آخر عمر میں کس حالت کو جا پہنچا ہے، اب ہم سمجھے کہ اگر ہم اس کی باتوں پر ایمان نہیں لائے تو ہم نے ٹھیک ہی کیا اس کی عقل تو بالکل ٹھکانے نہیں ہے۔

دوسری طرف حضرت نوحؑ بڑی استقامت اور پامردی سے اپنا کام بے پناہ عزم کے ساتھ جاری رکھے ہوئے تھے اور یہ ان کے ایمان کا نتیجہ تھا۔ وہ ان کور باطن دل کے اندھوں کی بے بنیاد باتوں سے بے نیاز اپنی پسند کے مطابق تیزی سے پیش رفت کر رہے تھے اور دن بدن کشتی کا ڈھانچہ مکمل ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی سر اٹھا کر ان سے یہ پُرمعنی بات کہتے، اگر آج تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو تو ہم بھی جلد ہی اسی طرح تمہارا مذاق اڑائیں گے (قال ان تسخروا منا فانا نسخر منکم کما تسخرون)۔ وہ دن کہ جب تم طوفان کے درمیان سرگرداں ہو گے، سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر بھاگو گے اور تمہیں کوئی پناہ گاہ نہیں ملے گی۔ موجوں میں گھرے فریاد کرو گے کہ ہمیں بچا لو — جی ہاں اس دن مومنین تمہارے انکار، غفلت، جہالت اور بے خبری پر ہنسیں گے۔ اس دن تمہیں معلوم ہو گا کہ کس کے لیے ذلیل اور رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے اور کسے دائمی سزا دامن گیر ہوتی ہے (فسوف تعلمون من یاتیہ عذاب یخزیہ ویحل علیہ عذاب مقیم)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ تمہاری مزاحمتیں ہمارے لیے دردناک عذاب ہیں مگر اولاً تو ان مشکلات کو گوارا کرتے ہوئے ہم سربلند اور پُر افتخار ہیں ثانیاً یہ مشکلات جو کچھ بھی ہیں جلد ختم ہو جائیں گی لیکن عذاب الٰہی رسوا کن بھی ہے اور ختم ہونے والا بھی نہیں اور ان دونوں کا آپس میں مقابلہ نہیں ہو سکتا۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ معاشرے کی پاکیزگی نہ کہ انتقام : مندرجہ بالا آیات سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ خدائی عذاب انتقامی پہلو نہیں رکھتا بلکہ نوعِ بشر کی پاکیزگی اور ایسے لوگوں کے خاتمے کے لیے ہے جو زندگی کے اہل نہیں، اس طرح نیک لوگ باقی رہ جاتے ہیں — اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک متکبر اور فاسد و مفسد قوم جس کے ایمان لانے کی اب کوئی امید نہیں۔ نظامِ خلقت کے لحاظ سے اب جینے کا حق نہیں رکھتی اور اسے ختم ہو جانا چاہیئے قومِ نوح ایسی ہی تھی کیونکہ مندرجہ بالا آیات کہتی ہیں کہ اب جبکہ باقی لوگوں کے ایمان لانے کی امید نہیں ہے کشتی بنانے کے لیے تیار ہو جاؤ اور ظالموں کے لیے کسی قسم کی شفاعت اور معافی کا تقاضا نہ کرو۔

یہی صورتِ حال اس عظیم پیغمبر کی بددعا اور نفرین سے بھی معلوم ہوتی ہے جو کہ سورہ نوح میں موجود ہے :

رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارًا انک ان تذرھم یضلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجرًا کفارًا

پروردگارا ! ان کفار میں سے کسی ایک کو بھی زمین پر نہ رہنے دے کیونکہ اگر وہ رہ جائیں تو تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے بھی فاسق و فاجر اور بے ایمان کافروں کے سوا کوئی وجود میں نہیں آئے گا۔ (نوح - ۲۶، ۲۷)

اصولی طور پر کارخانۂ تخلیق میں ہر موجود کسی مقصد کے تحت پیدا کیا گیا ہے، جب کوئی موجود اپنے مقصد سے بالکل منحرف ہو جائے اور اصلاح کے تمام راستے اپنے لیے بند کرلے تو اس کا باقی رہنا بلاوجہ ہے لہٰذا اسے خواہ مخواہ ختم ہو جانا چاہیئے، بقولِ شاعر :

نہ طراوت نہ برگی نہ گلی نہ میوہ دارم

متحیرم کہ دھقان بہ چکار کشت مارا

نہ مجھ میں تازگی ہے، نہ مجھ پر پتے ہیں، نہ پھول اور نہ پھل، حیران ہوں کہ کسان نے مجھے کیوں چھوڑ رکھا ہے۔

۲۔ متکبرین کی نشانیاں : خود غرض اور خود سر متکبرین ہمیشہ ان مسائل کا مذاق اڑاتے ہیں جن سے ان کی خواہشات اور ہوا و ہوس پوری نہ ہوتی ہوں۔ اسی بناء پر ان مخصوص حقائق کا تمسخر اڑانا جن کا تعلق مستضعفین کی زندگی سے ہے، ان کی زندگی کا حصّہ ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے گناہ آلود اجتماعات میں رنگ بھرنے اور انہیں رونق بخشنے کے لیے کسی تہی دست صاحبِ ایمان کی تلاش میں رہتے ہیں جسے تمسخر اور مضحکہ کا عنوان بنا سکیں اور اگر کسی اجتماع یا نشست کے لیے انہیں ایسے افراد نہ مل سکیں تو ان میں ایک یا کئی افراد کو ان کی عدم موجودگی میں موضوعِ سخن قرار دے کر مذاق اڑاتے ہیں اور ہنستے ہیں۔

وہ اپنے آپ کو عقل کل خیال کرتے ہیں۔ ان کے گمان میں ان کی بے بہا عرام دولت، ان کی لیاقت، شخصیت اور مقام کی نشانی ہے۔ اسی لیے وہ دوسروں کو نالائق، بے قدر اور بے وقعت سمجھتے ہیں۔

لیکن قرآن مجید ایسے مزدور اور متکبر افراد پر نہایت سخت حملے کرتا ہے اور خاص طور پر ان کے تمسخرات کی شدید مذمت کرتا ہے۔

مثلاً تاریخ اسلامی میں ہے:

ابوعقیل انصاری ایک صاحب ایمان شخص تھا۔ محنت مزدوری کرتا تھا، غریب آدمی تھا۔ ایک مرتبہ وہ رات بھر جاگتا رہا اور مدینے کے کنوؤں سے پانی بھر بھر کر لوگوں کو گھروں تک پہنچاتا رہا۔ اس طرح اس نے مزدوری کرکے کچھ خرمے حاصل کیے۔ وہ خرمے وہ جنگ تبوک کے لیے تیار ہونے والے لشکر اسلام کے لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے آیا۔ کچھ متکبر منافق وہاں موجود تھے۔ وہ اس پر بہت ہنسے۔ اس پر یہ قرآنی آیات نازل ہوئیں اور ان پر بجلی بن کر گریں:

اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقَاتِ وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝

جو راہ خدا میں مالی مدد کرنے پر اطاعت گزار مومنین کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کا تمسخر اڑاتے ہیں کہ جو تھوڑی سی مقدار سے زیادہ دینے پر دسترس نہیں رکھتے خدا ایسے لوگوں کا مذاق اڑائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (التوبۃ - ۷۹)

۴۔ **حضرت نوحؑ کی کشتی:** اس میں شک نہیں کہ کشتی نوح کوئی عام کشتی نہ تھی، کیونکہ اس میں سچے مومنین کے علاوہ ہر نسل کے جانور کو بھی جگہ ملی تھی اور ایک مدت کے لیے ان انسانوں اور جانوروں کو جو خوراک درکار تھی وہ بھی اس میں موجود تھی۔ ایسی لمبی چوڑی کشتی یقیناً اس زمانے میں بے نظیر تھی۔ یہ ایسی کشتی تھی جو ایسے دریا کی کوہ پیکر موجوں میں صحیح و سالم رہ سکے اور نابود نہ ہو جس کی وسعت اس دنیا جتنی ہو۔ اسی لیے مفسرین کی بعض روایات میں ہے کہ اس کشتی کا طول ایک ہزار دو سو ذراع تھا اور عرض چھ سو ذراع تھا (ایک ذراع کی لمبائی تقریباً آدھے میٹر کے برابر ہے)۔

بعض اسلامی روایات میں ہے کہ ظہور طوفان سے چالیس سال پہلے قوم نوح کی عورتوں میں ایک ایسی بیماری پیدا ہو گئی تھی کہ ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ در اصل ان کی سزا کی تمہید تھی۔

(۴۰) حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ○

(۴۱) وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّىْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

(۴۲) وَهِىَ تَجْرِىْ بِهِمْ فِىْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وَنَادٰى نُوْحُ ۨابْنَهٗ وَكَانَ فِىْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَىَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ○

(۴۳) قَالَ سَاٰوِىْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِىْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ○

ترجمہ

(۴۰) (یہ کیفیت اسی طرح جاری تھی) یہاں تک کہ ہمارا فرمان آپہنچا اور تنور جوش مارنے لگا۔ ہم نے (نوح سے) کہا: جانوروں کے ہر جفت (نر اور مادہ) میں سے ایک جوڑا اس (کشتی) میں اٹھا لو۔ اسی طرح اپنے اہل کو مگر وہ کہ جن کے ہلاک ہونے کا پہلے سے وعدہ کیا جا چکا ہے (نوح کی بیوی اور ایک بیٹا) اور اسی طرح مومنین کو لیکن مختصر سے گروہ کے سوا اس پر کوئی ایمان نہیں لایا تھا۔

(۴۱) اس نے کہا: اللہ کا نام لے کر اس میں سوار ہو جاؤ اور اس کے چلتے اور ٹھہرتے

وقت اسے یاد کرو کہ میرا پروردگار بخشنے والا اور مہربان ہے۔

(۴۲) اور وہ انہیں پہاڑ جیسی موجوں میں سے گزار رہا تھا۔ (اس وقت) نوح نے اپنے بیٹے کو جو ایک طرف کھڑا تھا پکارا: اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ نہ رہ۔

(۴۳) اس نے کہا: میں پہاڑ کا سہارا لے لوں گا تاکہ پانی سے محفوظ رہوں۔ (نوح نے) کہا: فرمانِ خدا کے سامنے آج کوئی بچانے والا نہیں مگر وہی (بچ سکتا ہے) جس پر وہ رحم کرے اس وقت ایک موج ان دونوں کے درمیان حائل ہوئی اور وہ غرق ہونے والوں میں سے قرار پایا۔

تفسیر

آغازِ طوفان

گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ کس طرح حضرت نوح علیہ السلام اور کچھ مومنین نے کشتی نجات بنانا شروع کی اور انہیں کیسی کیسی مشکلات آئیں اور بے ایمان مغرور اکثریت نے کس طرح ان کا تمسخر اڑایا۔ اس طرح تمسخر اڑانے والوں نے کس طرح اپنے آپ کو اس طوفان کے لیے تیار کیا جو سطح زمین کو بے ایمان متکبرین کے نجس وجود سے پاک کرنے والا تھا۔

زیر بحث آیات اس سرگزشت کے تیسرے مرحلے کے بارے میں ہیں۔ یہ آیات گویا اس ظالم قوم پر نزول عذاب کی بولتی ہوئی تصویر ہیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: یہ صورت حال یونہی تھی یہاں تک کہ ہمارا حکم صادر ہوا اور عذاب کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ پانی تنور کے اندر سے جوش مار نے لگا (حتیٰ اذا جاء امرنا وفار التنور)۔

تنور۔ (نون کی شد کے ساتھ) وہی معنی رکھتا ہے جو آج کل فارسی زبان میں مستعمل ہے، یعنی روٹی پکانے کی جگہ۔

اس بارے میں کہ طوفان کے نزدیک ہونے سے تنور سے پانی کا جوش مارنا کیا مناسبت رکھتا ہے مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ تنور سے پانی کا جوش مارنا خدا کی طرف سے حضرت نوحؑ کے لیے ایک نشانی تھی تاکہ وہ اصل واقعہ کی طرف متوجہ ہوں اور اس موقع پر وہ اور ان کے اصحاب ضروری اسباب و وسائل لے کر کشتی میں سوار ہو جائیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں "تنور" مجازی اور کنائی معنی میں ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ غضبِ الٰہی کے تنور میں جوش پیدا ہوا اور وہ شعلہ ور ہوا اور یہ تباہ کن خدائی عذاب کے نزدیک ہونے کے معنی میں ہے۔ ایسی تعبیر فارسی اور عربی زبان میں استعمال ہوتی ہے کہ شدتِ غضب کو آگ کے جوش مارنے اور شعلہ ور ہونے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

ان احتمالات میں سے یہ احتمال زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "تنور" اپنے حقیقی اور مشہور معنی میں آیا ہے اور ہو سکتا ہے اس سے مراد کوئی خاص تنور بھی نہ ہو بلکہ ممکن ہے کہ اس سے یہ نکتہ بیان کرنا مقصود ہو کہ تنور جو عام طور پر آگ کا مرکز ہے جب اس میں سے پانی جوش مارنے لگا تو حضرت نوحؑ اور ان کے اصحاب متوجہ ہوئے کہ حالات تیزی سے بدل رہے ہیں اور انقلاب قریب تر ہے۔ یعنی کہاں آگ اور کہاں پانی۔

بالفاظِ دیگر جب انہوں نے یہ دیکھا کہ زیرِ زمین پانی کی سطح اس قدر اوپر آگئی ہے کہ وہ تنور کے اندر سے جو عام طور پر خشک، محفوظ اور اونچی جگہ بنایا جاتا ہے، جوش مار رہا ہے تو وہ سمجھ گئے کہ کوئی اہم امر درپیش ہے اور قدرت کی طرف سے کسی نئے حادثے کا ظہور ہے۔ اور یہی امر حضرت نوحؑ اور ان کے اصحاب کے لیے خطرے کا الارم تھا کہ وہ اٹھ کھڑے ہوں اور تیار رہیں۔

شاید غافل اور جاہل قوم نے بھی اپنے گھروں کے تنور میں پانی کو جوش مارتے دیکھا ہو بہرحال وہ ہمیشہ کی طرح خطرے کے ان پُرمعنی خدائی نشانات سے آنکھ کان بند کیے گزر گئے یہاں تک کہ انہوں نے اپنے آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی غور و فکر کی زحمت نہ دی کہ شاید شرف تکوین میں کوئی حادثہ پوشیدہ ہو اور شاید حضرت نوحؑ جن خطرات کی خبر دیتے تھے ان میں سچائی ہو۔

اس وقت نوحؑ کو ہم نے حکم دیا کہ جانوروں کی ہر نوع میں سے ایک جفت (نر اور مادہ کا جوڑا) کشتی میں سوار کرو۔ تاکہ غرقاب ہو کر ان کی نسل منقطع نہ ہو جائے (قلنا احمل فیھا من کل زوجین اثنین)۔

"اور اسی طرح اپنے خاندان میں سے جن کی ہلاکت کا پہلے سے وعدہ کیا جا چکا ہے ان کے سوا باقی افراد کو سوار کر لو نیز مومنین کو کشتی میں سوار کر لو" (و اھلک الا من سبق علیہ القول و من امن)۔ لیکن تھوڑے سے افراد کے سوا لوگ ان پر ایمان نہیں لائے تھے (وما امن معہ الا قلیل)۔

یہ آیت ایک طرف حضرت نوحؑ کی بے ایمان بیوی اور ان کے بیٹے کنعان کی طرف اشارہ کرتی ہے جن کی داستان آئندہ آیات میں آئے گی کہ جنہوں نے راہِ ایمان سے انحراف کیا اور گنہگاروں کا ساتھ دینے کی وجہ

ے اردو میں بھی "تنور" کا یہی معنی مستعمل ہے۔ (مترجم)

سے حضرت نوحؑ سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ وہ اس کشتی نجات میں سوار ہونے کا حق نہیں رکھتے تھے کیونکہ اس میں سوار ہونے کی پہلی شرط ایمان تھی۔

دوسری طرف یہ آیت اس جانب اشارہ کرتی ہے کہ حضرت نوحؑ نے جو اپنے دین و آئین کی تبلیغ کیلئے سالہا سال بہت طویل اور مسلسل کوشش کی اس کا نتیجہ بہت تھوڑے سے افراد مومنین کے سوا کچھ نہ تھا۔ بعض روایات کے مطابق ان کی تعداد صرف اُسّی افراد تھی یہاں تک کہ بعض نے تو اس سے بھی کم تعداد لکھی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس عظیم پیغمبر نے کس حد تک استقامت اور پامردی کا مظاہرہ کیا ہے کہ ان میں سے ایک ایک فرد کے لیے اوسطاً کم از کم دس سال زحمت اٹھائی۔ اتنی زحمت تو عام لوگ اپنی اولاد تک کی ہدایت اور نجات کے لیے نہیں اٹھاتے۔

بہرحال حضرت نوحؑ نے جلدی سے اپنے وابستہ صاحب ایمان افراد اور اصحاب کو جمع کیا اور چونکہ طوفان اور تباہ کن خدائی عذابوں کا مرحلہ نزدیک آرہا تھا۔ انہیں حکم دیا کہ خدا کے نام سے کشتی پر سوار ہو جاؤ اور کشتی کے چلتے اور ٹھہرتے وقت خدا کا نام زبان پر جاری کرو اور اسی کی یاد میں رہو (بسم اللہ مجریها ومرساها)[1]

کیوں کہا گیا کہ ہر حالت میں اس کی یاد میں رہو اور اس کی یاد اور اس کے نام سے مدد لو" اس لیے کہ میرا پروردگار بخشنے والا اور مہربان ہے" (ان ربی لغفور رحیم)۔

اس نے اپنی رحمت کے تقاضے سے تم اہل ایمان بندوں کو یہ وسیلۂ نجات بخشا ہے اور اپنی بخشش کے تقاضے سے تمہاری لغزشوں سے درگزر کرے گا۔

بالآخر آخری مرحلہ آپہنچا اور اس سرکش قوم کے لیے عذاب اور سزا کا فرمان صادر ہوا۔ تیرہ و تار بادل جو سیاہ رات کے ٹکڑوں کی طرح تھے سارے آسمان پر چھا گئے اور اس طرح ایک دوسرے پر تہ بہ تہ ہوتے کہ جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں دیکھی گئی تھی۔ پے در پے سخت بادل گرجتے خیرہ کن بجلیاں پڑتے آسمان پر کوندتی آسمانی فضا گویا ایک بہت بڑے وحشتناک حادثے کی خبر دے رہی تھی۔

بارش شروع ہوگئی اور پھر تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ بارش کے قطرے موٹے سے موٹے ہوتے چلے گئے جیسا کہ قرآن سورہ قمر کی آیہ ۱۱ میں کہتا ہے:

> گویا آسمان کے تمام دروازے کھل گئے اور پانی کا ایک سمندر ان کے اندر سے نیچے گرنے لگا۔

دوسری طرف زیر زمین پانی کی سطح اس قدر بلند ہوگئی کہ ہر طرف سے پُرجوش چشمے اُبل پڑے۔ یوں زمین و آسمان کا پانی آپس میں مل گیا اور زمین، پہاڑ، دشت، بیابان اور درّہ غرض ہر جگہ پانی جاری ہوگیا۔ بہت جلد

---

[1] "مجرا" اور "مرسا" دونوں اسم زمان ہیں اور ان کا معنی ہے "چلتے وقت" اور "ٹھہرتے وقت"

زمین کی سطح ایک سمندر کی صورت اختیار کر گئی۔ تیز ہوائیں چلنے لگیں جن کی وجہ سے پانی کو کوہ پیکر موجیں اٹھنے لگیں اس عالم میں کشتی نوح کوہ پیکر موجوں کا سینہ چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ (وھی تجری بھم فی موج کالجبال)۔

پسر نوح ایک طرف اپنے باپ سے الگ کھڑا تھا۔ نوح نے پکارا میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور کافروں کے ساتھ نہ رہو ورنہ فنا ہو جاؤ گے (ونادیٰ نوح ابنہ وکان فی معزل یابنی ارکب معنا ولا تکن مع الکافرین)۔

پیغمبر بزرگوار حضرت نوحؑ نے نہ صرف باپ کی حیثیت سے بلکہ ایک انتھک پُر امید مربی کے طور پر آخری لمحے تک اپنی ذمہ داری سے دستبرداری نہ کی، اس امید پر کہ شاید ان کی بات سنگدل بیٹے پر اثر کر جائے۔ لیکن افسوس کہ بُرے ساتھی کی بات اس کے لیے زیادہ پُر تاثیر تھی لہٰذا دلسوز باپ کی گفتگو اپنا مطلوبہ اثر نہ کر سکی۔ وہ ہٹ دھرم اور کوتاہ فکر تھا۔ اسے گمان تھا کہ غضب خدا کا مقابلہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے۔ اس نے پکار کر کہا: ابا! میرے لیے جوش میں نہ آئیں عنقریب پہاڑ پر پناہ لے لوں گا کہ جس تک یہ سیلاب نہیں پہنچ سکتا (قال ساٰوی الی جبل یعصمنی من الماء)۔

نوح پھر بھی مایوس نہ ہوئے۔ دوبارہ نصیحت کرنے لگے کہ شاید کوتاہ فکر بیٹا غرور اور خودسری کے مرکب سے اتر آئے اور راہ حق پر چلنے لگے۔ انہوں نے کہا میرے بیٹے! آج حکم خدا کے مقابلے میں کوئی طاقت پناہ نہیں دے سکتی" (قال لا عاصم الیوم من امر اللہ)۔" نجات صرف اس شخص کے لیے ہے رحمت خدا جس کے شامل حال ہو" (الا من رحم)۔

پہاڑ تو معمولی سی چیز ہے۔ خود کرۂ ارض بھی معمولی سی چیز ہے۔ سورج اور تمام نظام شمسی اپنی عظمت کے باوجود خدا کی قدرت لایزال کے سامنے ذرۂ بے مقدار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ کیا بڑے سے بڑے پہاڑ کی زمین کے مقابلے میں چھوٹے سے ابھار سے زیادہ حیثیت رکھتے ہیں ان کی حیثیت تو ایسے ہے جیسے نارنگی کی بالائی سطح ہوتی ہے جبکہ خود زمین کی اپنی حیثیت یہ ہے کہ اسے ایک ملین اور دو ہزار گنا بڑا کیا جائے تو پھر جا کر وہ کرہ آفتاب کے برابر ہوتی ہے۔ وہ آفتاب کہ آسمان میں جس کی حیثیت ایک معمولی سے ستارے کی سی ہے جبکہ وسیع عالم خلقت میں اربوں کھربوں ستارے موجود ہیں پس کس قدر خام خیال ہے کہ پہاڑ پناہ دے سکے گا۔

اسی دوران ایک موج اٹھی اور آگے آئی، مزید آگے بڑھی اور پسر نوح کو ایک تنکے کی طرح اس کی جگہ سے اٹھایا اور اپنے اندر درہم برہم کر دیا اور باپ بیٹے کے درمیان جدائی ڈال دی اور اسے غرق ہونے والے میں شامل کر دیا (وحال بینھما الموج فکان من المغرقین)۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا طوفانِ نوح عالمگیر تھا: بہت سی آیات کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفانِ نوح کسی خاص علاقے کے لیے نہ تھا بلکہ پوری زمین پر رونما ہوا تھا کیونکہ لفظ "ارض" (زمین) مطلق طور پر آیا ہے:

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا۔

خداوندا! روئے زمین پر ان کافروں میں سے کسی کو زندہ نہ رہنے دے کہ جن کے بارے میں اصلاح کی کوئی امید نہیں ہے۔ (نوح-۲۶)

اسی طرح ہود کی آیہ ۴۴ میں یوں ہے:

وَقِيْلَ يَا اَرْضُ ابْلَعِيْ مَاءَكِ ...

اے زمین اپنا پانی نگل لے ...

بہت سی تواریخ سے بھی طوفانِ نوح کے عالمگیر ہونے کی خبر ملتی ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ موجودہ تمام نسلیں حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں حام، سام اور یافث کی اولاد میں سے ہیں جو کہ زندہ رہے تھے۔

طبیعی تاریخ میں بھی سیلابی بارشوں کے نام سے ایک دور کا پتہ چلتا ہے۔ اس دور کو اگر لازمی طور پر جانداروں کی پیدائش سے قبل سے مربوط نہ سمجھیں تو وہ بھی طوفانِ نوحؑ پر منطبق ہو سکتا ہے۔

زمین کی طبیعی تاریخ میں یہ نظریہ بھی ہے کہ کرۂ زمین کا محور تدریجی طور پر تغیر پیدا کرتا ہے یعنی قطب شمال اور قطب جنوبی خط استوا میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور خط استوا قطب شمالی اور قطب جنوبی کی جگہ لے لیتا ہے۔ واضح ہے کہ جب قطب شمال و جنوبی میں موجود بہت زیادہ برف پگھل پڑے تو دریاؤں اور سمندروں کے پانی کی سطح اس قدر اوپر آجائے گی کہ بہت سی خشکیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور پانی زمین میں جہاں جہاں اسے گنجائش ملے گی ابلتے ہوئے چشموں کی صورت میں نکلے گا۔ پانیوں کی یہی وسعت بادلوں کی تخلیق کا سبب بنتی ہے اور پھر زیادہ سے زیادہ بارشیں انہی بادلوں سے ہوتی ہیں۔

یہ امر کہ حضرت نوحؑ نے زمین کے جانوروں کے نمونے بھی اپنے ساتھ لیے تھے طوفان کے عالمگیر ہونے کا مؤید ہے۔

جیسا کہ بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کوفہ میں رہتے تھے دوسری طرف بعض روایات کے مطابق طوفان مکہ اور خانہ کعبہ تک پہنچا ہوا تھا تو یہ صورت بھی اس بات کی مؤید ہے کہ طوفان عالمگیر تھا۔

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود اس امر کی بھی بالکل نفی نہیں کی جا سکتی کہ طوفانِ نوح ایک منطقے سے مخصوص تھا کیونکہ لفظ "ارض" (زمین) کا اطلاق قرآن میں کئی مرتبہ زمین کے ایک وسیع قطعے پر بھی ہوا ہے جیسا کہ بنی اسرائیل کی سرگزشت میں ہے:

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا

ہم نے زمین کے مشارق اور مغارب بنی اسرائیل کے مستضعفین کے قبضے میں دے دیے۔

(اعراف - ۱۳۷)

کشتی میں جانوروں کو شاید اس بنا پر رکھا گیا ہو کہ زمین کے اس حصے میں جانوروں کی نسل منقطع نہ ہو خصوصاً اس زمانے میں جانوروں کا دُور دراز علاقوں سے منتقل ہونا کوئی آسان کام نہیں تھا (غور کیجئے گا)۔

اسی طرح دیگر مذکورہ قرائن اس بات پر منطبق ہو سکتے ہیں کہ طوفان نوح ایک منقطہ ارض پر آیا۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ طوفان نوح تو اس سرکش قوم کی سزا اور عذاب کے طور پر تھا اور ہمارے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں کہ جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ حضرت نوحؑ کی دعوت تمام روئے زمین پر پہنچی تھی۔

اصولی طور پر اس زمانے کے وسائل و ذرائع کے ساتھ ایک پیغمبر کی دعوت کا (اس کے اپنے زمانے میں) زمین کے تمام خطوں اور علاقوں تک پہنچنا بعید نظر آتا ہے۔

بہر حال اس عبرت خیز واقعے کو بیان کرنے سے قرآن کا مقصد یہ ہے کہ اہم تربیتی نکات بیان کیے جائیں جو اس میں پوشیدہ ہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے کہ یہ واقعہ عالمی ہو یا کسی ایک علاقے سے تعلق رکھتا ہو۔

۲۔ کیا نزولِ عذاب کے بعد توبہ ممکن ہے؟ : گزشتہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ طوفان شروع ہونے کے بعد تک اپنے بیٹے کو تبلیغ کرتے رہے یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اگر وہ ایمان لے آتا تو اس کا ایمان قابلِ قبول ہوتا۔ یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن کی دوسری آیات کی طرف توجہ کرنے سے، جن کے کچھ نمونے بیان کیے جا چکے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ عذاب نازل ہونے کے بعد توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں کیونکہ ایسے مواقع پر تو اکثر سرکش گنہگار جو اپنی آنکھوں سے عذاب دیکھ لیتے ہیں بے اختیار ہوتے ہیں اور اضطرار کی حالت میں توبہ کرتے ہیں۔ ایسی توبہ جس کی کوئی قدر و قیمت، اہمیت اور وقعت نہیں۔ ایسی توبہ جس کا کوئی مفہوم نہیں۔

اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ آیات بالا میں غور و فکر کرنے سے اس سوال کا جواب اس طرح سے مل سکتا ہے کہ آغازِ طوفان میں عذاب کی کوئی واضح نشانی موجود نہیں تھی بلکہ تیز اور غیر معمولی بارش نظر آتی تھی اسی لیے تو نوحؑ کے بیٹے نے اپنے باپ سے کہا کہ میں پہاڑ کی پناہ لے لوں گا تاکہ غرق ہونے سے بچ جاؤں۔ اسے یہ گمان تھا کہ بارش اور طوفان ایک طبیعی چیز ہے۔ ایسے مواقع پر توبہ کے دروازوں کا کھلا ہونا کوئی عجیب مسئلہ نہیں۔

دوسرا سوال جو حضرت نوحؑ کے بیٹے کے سلسلے میں کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت نوحؑ نے اس حساس موقع پر صرف اپنے بیٹے کو کیوں پکارا سب لوگوں کو دعوت کیوں نہ دی۔ ہو سکتا ہے یہ اس بنا پر ہو کہ وہ عمومی دعوت کا فریضہ سب کے لیے یہاں تک کہ بیٹے کے لیے بھی انجام دے چکے تھے لیکن بیٹے کے بارے میں ان کی

ذمہ داری زیادہ ہو کیونکہ وہ اس کے لیے نبی ہونے کے علاوہ باپ ہونے کے حوالے سے بھی مسئولیت رکھتے تھے۔ اسی بناء پر اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے آخری لمحات میں اپنے فرزند کیلئے مزید تاکید کر رہے تھے۔

بعض مفسرین کے بقول یہاں ایک احتمال اور بھی ہے اور وہ یہ کہ پسرِ نوح اس وقت نہ کفار کی صف میں تھا اور نہ مومنین کی صف میں۔ جملہ "وکان فی معزل" (وہ گوشۂ تنہائی میں کھڑا تھا) کو انہوں نے اس کی دلیل قرار دیا ہے۔ اگرچہ وہ مومنین کی صف میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے عذاب کا مستحق تھا لیکن کفار کی صف سے اس کی کنارہ کشی کا تقاضا تھا کہ طریقِ تبلیغ سے اس کے ساتھ لطف و محبت کا اظہار کیا جاتا۔ علاوہ ازیں کفار کی صف سے اس کی علیحدگی نے حضرت نوحؑ کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ شاید وہ اپنے کام سے پشیمان ہو چکا ہے۔

آئندہ کی آیات پر توجہ کرنے سے یہ احتمال بھی پیدا ہوتا ہے کہ پسرِ نوح صراحت سے اپنے باپ کی مخالفت نہیں کرتا تھا بلکہ "منافقین" کی صورت میں تھا اور بعض اوقات آپ کے سامنے اظہارِ موافقت کرتا تھا۔ اسی لیے حضرت نوحؑ نے خدا سے اس کے لیے نجات کا تقاضا کیا۔

بہرحال مندرجہ بالا آیت ان آیات کے منافی نہیں ہے جو کہتی ہیں کہ نزولِ عذاب کے وقت توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

۲۔ طوفانِ نوح میں عبرت کے درس: جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن گزشتہ لوگوں کے واقعات درسِ عبرت دینے کے لیے اور اصلاح و تربیت کے لیے بیان کرتا ہے۔ ہم نے حضرت نوحؑ کی داستان کا جتنا حصہ پڑھا ہے، اس میں بہت سے درس پوشیدہ ہیں۔ ان میں سے بعض کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کرتے ہیں۔

الف: روئے زمین کو پاک کرنا: یہ صحیح ہے کہ خدا رحیم اور مہربان ہے لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ وہ اس کے باوجود حکیم بھی ہے۔ اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ جب کوئی قوم و ملت فاسد ہو جائے اور نصیحت کرنے والوں اور تربیت کرنے والے خدائی نمائندوں کی دعوت ان پر اثر نہ کرے تو انہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ ایسے مواقع پر خدا تعالیٰ بالآخر معاشرتی یا طبیعی اور فطری انقلابات کے ذریعے ان کی زندگی کے کارخانے کو درہم برہم کر کے انہیں نابود کر دیتا ہے۔

یہ بات نہ قومِ نوح میں منحصر تھی اور نہ کسی اور زمانے یا معین وقت میں۔ یہ ہر زمانے اور ہر قوم کیلئے ایک خدائی سنت ہے یہاں تک کہ ہمارے زمانے کے لیے بھی اور ہو سکتا ہے پہلی اور دوسری عالمی جنگیں اس پاکسازی کی مختلف شکلیں ہوں۔

ب۔ طوفان کے ذریعے انقلاب کیوں؟: یہ صحیح ہے کہ ایک فاسد اور بری قوم کو نابود ہونا چاہیئے چاہے وہ کسی ذریعے سے نابود ہو اس میں فرق نہیں پڑتا لیکن آیاتِ قرآنی میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ عذاب و سزا اور قوموں کے گناہوں میں ایک قسم کی مناسبت تھی اور ہے (غور کیجئے گا)۔

فرعون نے عظیم دریائے نیل اور اس کے پُر برکت پانی کو اپنی قوت و طاقت کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ وہی پانی اس کی نابودی کا سبب بنا۔

نمرود کو اپنے عظیم لشکر پہ بھروسہ تھا اور ہم جانتے ہیں کہ حشرات الارض کے چھوٹے سے لشکر نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو شکست دے دی۔

قوم نوح زراعت پیشہ تھی ان کی کثیر دولت کا دار و مدار زراعت پر ہی تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ ایسے لوگ اپنا سب کچھ بارش کے حیات بخش قطروں کو سمجھتے ہیں لیکن آخر کار بارش ہی نے انہیں تباہ و برباد کر دیا۔

یہاں سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ خدائی فیصلوں میں کس قدر تدبیر اور تدبّر کار فرما ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے زمانے کے سرکش انسان پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں اپنے جدید ترین اسلحوں کے ذریعے نیست و نابود ہوتے ہیں تو یہ بات ہمارے لیے باعثِ تعجب نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ پسے ہوئے محروم انسانوں کے وسائل لوٹنے کے لیے ان استعماری طاقتوں نے اپنی اس ٹیکنالوجی اور مصنوعات پر ہی بھروسہ کر رکھا تھا۔

ج۔ **خدا کا نام۔ ہر حالت میں اور ہر جگہ:** مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ حضرت نوحؑ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ خدا کا نام کشتی کے چلتے اور رکتے وقت فراموش نہ کریں۔ سب کچھ اس کے نام سے، اس کی یاد کے ساتھ اور اس کی پاک ذات سے مدد طلب کرتے ہوئے ہونا چاہیئے۔ ہر حرکت، ہر سکون میں، حالتِ آرام میں اور طوفان میں سب کچھ اسی کے نام سے شروع ہونا چاہیئے کیونکہ جو کام اس کے نام کے بغیر شروع ہو گا وہ ابتر اور دم بریدہ ہو گا۔ جیسا کہ رسول اللہؐ کی مشہور حدیث میں ہے:

کل امر ذی بال لم یذکر فیہ بسم اللہ فھو ابتر۔

ہر اہم کام کہ جس میں نام خدا نہ لیا جائے بد انجام اور دم بریدہ ہو گا[1]

اہم بات یہ ہے کہ نام خدا کا ذکر تکلفات اور تشریفات کے لیے نہ ہو بلکہ مقصد کے طور پہ ہو یعنی جو کام خدائی مقصد کے تحت نہیں ہو گا اور اس کا ہدف خدا نہیں ہو گا وہ ابتر اور دم بریدہ ہو گا کیونکہ سارے مقاصد تو ختم ہو جاتے ہیں لیکن الٰہی مقاصد ختم ہونے والے نہیں ہوتے۔ مادی اہداف جب اپنے کمال کو پہنچ جائیں تو ختم ہو جاتے ہیں لیکن خدائی اہداف اس کی پاک ذات کی طرح دائمی اور جاوداں ہوتے ہیں۔

د۔ **کمزور سہارے:** عام طور پر ہر شخص اپنی زندگی کی مشکلات میں کسی چیز کا سہارا لیتا ہے اور پناہ گاہ ڈھونڈتا ہے۔ کچھ لوگ اپنی دولت و ثروت کو سہارا سمجھتے ہیں، کچھ مقام و منصب کو، کچھ اپنی جسمانی طاقت کو اور بعض اپنی قوتِ فکر کو۔ لیکن جیسا کہ مندرجہ بالا آیات کہتی ہیں اور تاریخ نشاندہی کرتی ہے حکم خدا کے سامنے ان میں سے کسی چیز کی ذرہ برابر حیثیت نہیں ہے۔ ارادۂ الٰہی کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی جیسے تار عنکبوت شدید

---

[1] سفینۃ البحار۔ ج ۱۔ ص ۶۶۳۔

آندھی میں فوراً درہم برہم ہوجاتی ہے۔

پیغمبر خدا حضرت نوح علیہ السلام کا نادان اور سرپھرا بیٹا بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ خدا کے طوفان غضب کے مقابلے میں پہاڑ اسے پناہ دے گا لیکن یہ اس کا کتنا بڑا اشتباہ تھا۔ طوفان کی ایک لہر نے اس کا کام تمام کر دیا اور اسے ملک عدم میں پہنچا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بعض دعاؤں میں پڑھتے ہیں:

ھاربٌ منک الیک [1]

مَیں تیرے غضب سے تیری طرف بھاگتا ہوں۔

یعنی اگر تیرے غضب کے مقابلے میں کوئی پناہ گاہ ہے تو وہ بھی تیری ہی ذات پاک ہے اور بازگشت تیری ہی طرف ہے نہ کہ کسی اور کی طرف۔

ر۔ کشتیٔ نجات: کشتیٔ نجات کے بغیر کسی طوفان سے نہیں بچا جاسکتا۔ ضروری نہیں کہ وہ کشتی لکڑی اور لوہے کی بنی ہو بلکہ بعض اوقات یہ کشتی ایک کارساز، حیات بخش اور مثبت مکتب و مذہب ہوتا ہے جو انحرافی افکار کی طوفانی موجوں سے مقابلہ کرتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو ساحل نجات تک پہنچا دیتا ہے۔ اسی بنا پر شیعہ اور سنی کتب میں پیغمبر اکرمؐ سے بہت روایات نقل ہوئی ہیں ان میں آپؐ کے خاندان یعنی آئمہ اہلبیتؑ اور حاملین مکتب اسلام کا کشتیٔ نجات کی حیثیت سے تعارف کروایا گیا ہے۔

منجملہ ان کے ایک یہ ہے:

مَیں ابوذر کے ساتھ ساتھ خانہ کعبہ کے پاس آیا۔ ابوذر نے بیت اللہ کے دروازے کے حلقہ میں ہاتھ ڈالا اور بلند آواز سے کہا:

مَیں ابوذر ہوں جو شخص مجھے نہیں پہچانتا پہچان لے، مَیں وہی جندب ہوں (ابوذر کا اصل نام جندب تھا)، مَیں رسول اللہ کا صحابی ہوں۔ مَیں نے اپنے کان سے آپ کو کہتے ہوئے سنا کہ آپ فرما رہے تھے:

مثل اھل بیتی مثل سفینۃ نوح من رکبھا نجی۔

یعنی۔ میرے اہل بیت کی مثال کشتیٔ نوح کی سی ہے جو اس میں سوار ہوا اس نے نجات پائی [2]

حدیث کے دوسرے طرق میں اس جملے کا اضافہ ہوا ہے:

فمن تخلف عنھا غرق

اور جو اس سے دُور رہا اور جس نے تخلف کیا وہ غرق ہوا [3]

---

[1] دعائے ابوحمزہ ثمالی۔

[2] ابن قتیبہ دینوری جو مشہور علماء اہل سنت میں سے ہیں انہوں نے یہ حدیث عیون الاخبار، ج ۱، ص ۲۱۱ پر لکھی ہے۔

[3] معجم الکبیر تالیف حافظ طبرانی ص ۱۳۰ (مخطوط)۔

بعض جگہ یہ جملہ بھی ہے :

من تخلف عنها هلک [1]

یعنی۔ جو اس سے دُور رہا وہ ہلاک ہوا۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ حدیث صراحت سے کہتی ہے کہ جس وقت فکری، عقائدی اور معاشرتی طوفان اسلامی معاشرے کا رُخ کریں تو ایسے میں واحد راہِ نجات اس مکتب میں پناہ لینا ہے۔ اس مسئلے کو ہم نے ملتِ ایران کے عظیم الشان انقلاب میں اچھی طرح سے آزمایا ہے کہ غیر اسلامی مکاتب کے پیروکاروں نے طاغوت کے مقابلے میں شکست کھائی اور صرف وہی لوگ کامیاب ہوئے جنہوں نے اپنی پناہ گاہ اسلام اور اہل بیت کے مکتب اور ان کے انقلابی پروگراموں کو بنایا۔

---

[1] یہ حدیث بہت سے علماء اہل سنت مثلاً حاکم نیشاپوری نے مستدرک میں، ابن مغازلی نے مناقب امیر المومنین میں، علامہ خوارزمی نے مقتل الحسین میں، حموینی نے فرائد السمطین میں اور دیگر بہت سے علماء نے اپنی کتب میں نقل کی ہے (مزید وضاحت کے لیے احقاق الحق جلد ۹ صفحہ ۲۷۰ طبع جدید کی طرف رجوع فرمائیں)۔

(۴۴) وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ○

ترجمہ

(۴۴) اور کہا گیا : اے زمین ! اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان رُک جا۔ اور پانی نیچے چلا گیا اور معاملہ ختم ہوگیا اور وہ (کشتی) جودی (پہاڑ کے دامن) میں ٹھہر گئی اور (اس وقت) کہا گیا : دُور ہو ظالم قوم۔

تفسیر

ایک داستان کا اختتام

جیسا کہ گزشتہ آیات میں ہم نے اجمالاً سربستہ طور پر پڑھا ہے کہ آخرکار پانی کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی لہروں نے تمام جگہوں کو گھیر لیا۔ پانی کی سطح بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی۔ جاہل گنہ گاروں نے یہ گمان کیا کہ یہ ایک معمول کا طوفان ہے۔ وہ اونچی جگہوں اور پہاڑوں پر پناہ گزین ہو گئے لیکن پانی ان کے اوپر سے بھی گزر گیا اور تمام جگہیں پانی کے نیچے چھپ گئیں۔ ان طغیان گروں کے جسم، ان کے بچے کھچے گھر اور زندگی کا ساز و سامان پانی کی جھاگ میں نظر آرہا تھا۔

حضرت نوحؑ نے زمامِ کشتی خدا کے ہاتھ میں دی۔ موجیں کشتی کو ادھر سے اُدھر لے جاتی تھیں۔ روایات میں آیا ہے کہ کشتی پورے چھ ماہ سرگرداں رہی۔ یہ مدت ابتدائے ماہِ رجب سے لے کر ذوالحجہ کے اختتام تک تھی۔ ایک اور روایت کے مطابق دس رجب سے لے کر روزِ عاشورہ تک کشتی پانی کی موجوں میں سرگرداں رہی۔[1]

اس دوران میں کشتی نے مختلف علاقوں کی سیر کی۔ یہاں تک کہ بعض روایات کے مطابق سرزمینِ مکہ اور خانۂ کعبہ کے اطراف کی بھی سیر کی۔

---

[1] تفسیر قرطبی ج ۵ صفحہ ۳۲۹۹، تفسیر ابوالفتوح رازی ج ۶ صفحہ ۲۷۸، تفسیر مجمع البیان ج ۵ صفحہ ۱۶۴ اور طبری ج ۱۲ صفحہ ۲۹۔

آخر کار عذاب کے خاتمے کا اور زمین کے معمول کی حالت میں لوٹ آنے کا حکم صادر ہوا۔ مندرجہ بالا آیت میں اسی فرمان کی کیفیت، جزئیات اور نتیجہ بہت مختصر مگر انتہائی عمدہ اور جاذب و خوبصورت عبارت میں چھ جملوں میں بیان کیا گیا ہے۔

پہلا ارشاد ہوتا ہے، حکم دیا گیا کہ اے زمین! اپنا پانی نگل جاؤ (وقیل یا ارض ابلعی ماءک)۔

اور آسمان کو حکم ہوا۔ اے آسمان ہاتھ روک لے" (ویاسماء اقلعی)۔

"پانی نیچے بیٹھ گیا" (وغیض الماء)۔

"اور کام ختم ہوگیا" (وقضی الامر)۔

"اور کشتی کوہِ جودی کے دامن سے جا لگی" (واستوت علی الجودی)۔

"اس وقت کہا گیا: "دور ہو ظالم قوم" (وقیل بعدًا للقوم الظالمین)۔

مندرجہ بالا آیت کی تعبیرات مختصر ہوتے ہوئے بھی نہایت موثر اور دلنشین ہیں۔ یہ بولتی ہوئی زندہ تعبیرات ہیں اور تمام تر زیبائی کے باوجود ہلا دینے والی ہیں۔ بعض علماء عرب کے بقول یہ آیات قرآن میں سے فصیح ترین اور بلیغ ترین آیت ہے۔ روایات اور تواریخ اسلام میں اس کی شہادت موجود ہے۔ لکھا ہے:

> کچھ کفارِ قریش قرآن سے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ قرآنی آیات جیسی کچھ آیات گھڑیں۔ ان سے تعلق رکھنے والوں نے انہیں چالیس دن تک بہترین غذائیں مہیا کیں، مشروبات فراہم کیے اور ان کی ہر فرمائش پوری کی۔ خالص گندم کا میدہ، بکرے کا گوشت، ایرانی شراب غرض سب کچھ انہیں لا کر دیا تاکہ وہ آرام و راحت کے ساتھ قرآنی آیات جیسے جملوں کی ترکیب بندی کریں۔
>
> لیکن جب وہ مذکورہ آیت تک پہنچے تو اس نے انہیں اس طرح سے ہلا کر رکھ دیا کہ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کہا کہ یہ ایسی گفتگو ہے کہ کوئی کلام اس سے مشابہت نہیں رکھتا۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور مایوس ہو کر ادھر ادھر چلے گئے[1]

کوہ جودی کہاں ہے؟

بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ کوہِ جودی جس کے کنارے کشتی نوح آکر لگی تھی اور جس کا ذکر زیر بحث آیات میں آیا ہے وہی مشہور پہاڑ ہے جو موصل کے قریب ہے[2]

---

[1] مجمع البیان ج ۵ صفحہ ۱۶۵، روح المعانی ج ۱۲ صفحہ ۵۵۔

[2] مجمع البیان، روح المعانی اور قرطبی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

بعض دوسرے مفسرین نے اسے حدود شام میں یا "آمد" کے نزدیک یا عراق کے شمالی پہاڑ سمجھا ہے۔

کتاب مفردات میں راغب نے کہا ہے کہ یہ وہ پہاڑ ہے جو موصل اور الجزیرہ کے درمیان ہے (الجزیرہ شمالی عراق میں ایک جگہ ہے اور یہ الجزائر یا الجزیرہ نہیں جو آج کل مشہور ہے)۔

بعید نہیں کہ ان سب کی بازگشت ایک ہی طرف ہو کیونکہ موصل، آمد اور الجزیرہ سب عراق کے شمالی علاقوں میں ہیں اور شام کے نزدیک ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ جودی سے مراد ہر مضبوط پہاڑ اور محکم زمین ہے یعنی کشتی نوح ایک محکم زمین پر لنگر انداز ہوئی جو اس کی سواریوں کے اترنے کے لیے مناسب تھی۔ لیکن مشہور و معروف وہی پہلا معنی ہے۔

کتاب "اعلام قرآن" میں کوہ جودی کے بارے میں تحقیق کی گئی ہے۔ یہ تحقیق ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:

جودی ایک پہاڑ کا نام ہے جس پر کشتی نوح آکر ٹھہر گئی تھی۔ اس کا نام سورہ ہود کی آیہ ۴۴ میں آیا ہے کہ جس کا مضمون تورات کے مندرجات کے قریب ہے۔ کوہ جودی کے محل و مقام کے بارے میں تین قول ہیں:

۱۔ اصفہانی کے بقول کوہ جودی عربستان[1] میں ہے اور ان دو پہاڑوں میں سے ایک ہے جو قبیلہ "طی" کی حکومت میں تھے۔

۲۔ کوہ جودی کاردین کا سلسلہ ہے جو جزیرہ ابن عمر کے شمال مشرق اور دجلہ کے مشرق میں موصل کے نزدیک واقع ہے۔ اکراد اسے اپنے لب و لہجہ میں کاردو اور یونانی جوردی اور اعراب جودی کہتے ہیں۔

ترگوم یعنی تورات کے کلدانی ترجمے میں اور اسی طرح تورات کے سریانی ترجمے میں کشتی نوح کے رکنے کی جگہ کوہ اکراد کا قلعہ کاردین معین ہوا ہے۔ عرب کے جغرافیہ دانوں نے بھی قرآن میں مذکورہ کوہ جودی کو یہی پہاڑ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ کشتی نوح کے تختے کے کچھ ٹکڑے بنی عباس کے زمانے تک اس پہاڑ کی چوٹی پر باقی تھے اور مشرکین ان کی زیارت کیا کرتے تھے۔

بابل کی داستانوں میں طوفان نوح کی داستانوں سے مشابہ ایک داستان موجود ہے۔

علاوہ ازیں یہ احتمال بھی ہے کہ دجلہ میں طوفان آیا ہو اور اس علاقے کے لوگوں کو طوفان کا سامنا کرنا پڑا ہو۔

کوہ جودی پر آشوری کتیبے موجود ہیں۔ انہیں کتیبہ ہائے میر کہتے ہیں۔ ان کتیبوں میں "ارارتو" کا نام نظر آتا ہے۔

۳۔ موجودہ تورات کے ترجمے میں کشتی نوح کے رکنے کی جگہ آرارات کے پہاڑ قرار دی گئی ہے اور وہ کوہ ماسیس ہے جو ارمنستان میں واقع ہے۔

---

[1] جس کا نام آج کل موجودہ حکمرانوں نے اپنے خاندان کے نام پر "سعودی عرب" رکھا ہوا ہے۔ (مترجم)

قاموس کتاب مقدس کے مؤلف نے پہلے معنی کو "ملعون" قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ روایات کے مطابق کشتی نوح اس پہاڑ کے اوپر رکی اور اسے عرب جودی کہتے ہیں، ایرانی کوہ نوح کہتے ہیں اور ترک "کوداغ" کہتے ہیں جو کہ ڈھلوان کے معنی میں ہے اور وہ ارس کے قریب واقع ہے۔

پانچویں صدی تک ارمنستانی ارمنستان میں جودی پہاڑ کو نہیں جانتے تھے۔ اسی صدی سے شاید تورات کے ترجمہ نگاروں کو اشتباہ ہوا ہے اور انہوں نے کوہ اکراد کا ترجمہ کوہ آرارات کر دیا ہے جس کی وجہ سے ارمنی علماء کو یہ خیال پیدا ہو گیا ہے۔

شاید یہ خیال اس وجہ سے پیدا ہوا ہو کہ آشوری لوگ "وان" جھیل کے شمال اور جنوب کے پہاڑوں کو "آرارات" یا "آرارتو" کہتے تھے۔

کہتے ہیں کہ طوفان ختم ہونے کے بعد حضرت نوحؑ نے کوہ جودی کی چوٹی پر ایک مسجد بنائی تھی۔

ارامنی بھی کہتے ہیں کہ کوہ جادی کے نیچے قریہ "ثمانین" یا "ثمان" وہ پہلی جگہ ہے جہاں حضرت نوحؑ کے ہمراہی آکر اترے تھے۔[1]

---

1. اعلام القرآن خزائلی صفحہ ۲۸۱۔

۴۵ وَنَادٰى نُوحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ○

۴۶ قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ○

۴۷ قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَتَرْحَمْنِیْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ○

ترجمہ

۴۵ نوح نے اپنے پروردگار سے عرض کیا: پروردگارا! میرا بیٹا میرے خاندان میں سے ہے اور تیرا وعدہ (میرے خاندان کی نجات کے بارے میں) حق ہے اور تو تمام حکم کرنے والوں سے برتر ہے۔

۴۶ فرمایا: اے نوح! تیرے اہل سے نہیں ہے، وہ غیر صالح عمل ہے۔ لہٰذا جس سے تو آگاہ نہیں وہ سوال مجھ سے نہ کر۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں تاکہ تو جاہلوں میں سے نہ ہو۔

۴۷ عرض کیا: پروردگارا! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ تجھ سے ایسی چیز کا سوال کروں کہ جس سے میں آگاہ ہی نہیں رکھتا اور اگر تو مجھے نہ بخشے اور مجھ پر رحم نہ کرے تو میں زیاں کاروں میں سے ہو جاؤں گا۔

تفسیر

پسرِ نوح کا دردناک انجام

ہم پڑھ چکے ہیں کہ نوح کے بیٹے نے باپ کی نصیحت، دشمنی اور آخری سانس تک اس نے ہٹ دھرمی اور بے ہودگی کو نہ چھوڑا اور آخر کار طوفان کی موجوں میں گرفتار ہو کر غرق ہوگیا۔

زیرِ بحث آیات میں اس داستان کا ایک اور حصہ بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ جب حضرت نوح نے اپنے بیٹے کو موجوں کے درمیان دیکھا تو شفقتِ پدری نے جوش مارا، انہیں اپنے بیٹے کی نجات کے بارے میں وعدہ الٰہی یاد آیا۔ انہوں نے درگاہِ الٰہی کا رخ کیا اور کہا: پروردگارا! میرا بیٹا میرے اہل اور میرے خاندان میں سے ہے اور تو نے وعدہ فرمایا تھا کہ میرے خاندان کو طوفان اور ہلاکت سے نجات دے گا اور تو تمام حکم کرنے والوں سے برتر ہے اور تو ایفائے عہد کرنے میں محکم تر ہے (ونادیٰ نوح ربہ فقال رب ان ابنی من اھلی وان وعدک الحق وانت احکم الحاکمین)۔

یہ وعدہ اسی چیز کی طرف اشارہ ہے جو اسی سورہ کی آیت ۴۰ میں موجود ہے جہاں فرمایا گیا ہے:

قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ۔

ہم نے نوح کو حکم دیا کہ جانوروں کی ہر نوع میں سے ایک جوڑا کشتی میں سوار کر لو اور اسی طرح اپنے خاندان کو سوائے اس شخص کے جس کی نابودی کے پہلے فرمانِ خدا جاری ہو چکا ہے۔

حضرت نوح نے خیال کیا کہ "الا من سبق علیہ القول" سے مراد صرف ان کی بے ایمان اور مشرک بیوی ہے اور ان کا بیٹا کنعان اس میں شامل نہیں ہے لہٰذا انہوں نے بارگاہِ خداوندی میں ایسا تقاضا کیا۔

لیکن فوراً جواب ملا ۔ ہلا دینے والا جواب اور ایک عظیم حقیقت واضح کرنے والا جواب ـــــ وہ حقیقت کہ جو رشتۂ مکتب کو نسب اور خاندان کے رشتہ سے مافوق قرار دیتی ہے۔ فرمایا: اے نوح وہ تیرے اہل اور خاندان میں سے نہیں ہے" (قال یا نوح انہ لیس من اھلک) "بلکہ وہ غیر صالح عمل ہے (انہ عمل غیر صالح)۔ وہ نالائق شخص ہے اور تجھ سے منقطع اور مذہبی رشتہ ٹوٹنے کی وجہ سے خاندانی رشتے کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔

"اب جبکہ ایسا ہے تو مجھ سے ایسی چیز کا تقاضا نہ کر جس کے بارے میں تجھے علم نہیں" (فلا تسئلن ما لیس لک بہ علم)۔ "میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ جاہلوں میں سے نہ ہو جا" (انی اعظک ان تکون من الجاھلین)۔

حضرت نوحؑ سمجھ گئے کہ یہ تقاضا بارگاہ الٰہی میں صحیح نہ تھا اور ایسے بیٹے کی نجات کو خاندان کی نجات کے بارے میں خدا کے وعدے میں شامل نہیں سمجھنا چاہیئے تھا، لہٰذا آپ نے درگاہ پروردگار کا رُخ کیا اور کہا: پروردگارا! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں اس امر سے کہ تجھ سے کسی ایسی چیز کی خواہش کروں جس کا علم مجھے نہیں" (قال انی اعوذ بک ان اسئلک مالیس لی بہ علم)۔

اور اگر تُو نے مجھے نہ بخشا اور اپنی رحمت میرے شامل حال نہ کی تو میں زیاں کاروں میں سے ہو جاؤں گا (و الا تغفرلی و ترحمنی اکن من الخاسرین)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ حضرت نوحؑ کا بیٹا کیوں "عمل غیر صالح" تھا؟: بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس آیت میں ایک لفظ مقدر ہے اور اصل میں اس کا مفہوم اس طرح ہے: انہ ذو عمل غیر صالح — یعنی تیرا بیٹا غیر صالح عمل والا ہے۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوتے کہ بعض اوقات انسان کسی کام میں اس قدر آگے بڑھ جاتا ہے کہ گویا عین عمل ہو جاتا ہے۔ مختلف زبانوں کے ادب میں یہ چیز بہت نظر آتی ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے: فلاں شخص سراپا عدل و سخاوت ہے یا فلاں شخص سراپا فساد ہے۔ گویا وہ اس عمل میں اس قدر غوطہ زن ہے کہ اس کی ذات عین وہی عمل ہو چکی ہے۔ یہ پسر نبی بھی بُروں کی صحبت میں اس قدر بیٹھا اور بُرے اعمال اور ان کے غلط افکار میں اس طرح غوطہ زن ہوا کہ گویا اس کا وجود ایک غیر صالح عمل میں بدل گیا۔

لہٰذا مندرجہ بالا تعبیر اگرچہ بہت ہی مختصر ہے لیکن ایک اہم حقیقت کی عکاس ہے۔ یعنی اے نوح! اگر برائی، ظلم اور فساد اس بیٹے کے وجود میں سطحی طور پر ہوتا تو اس کے بارے میں امکان شفاعت تھا لیکن اب جبکہ یہ سراپا غرق فساد و تباہی ہے تو اہل شفاعت نہیں رہا، اس کی بات ہرگز نہ کرو۔

یہ جو بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ حقیقتاً یہ آپ کا بیٹا نہیں تھا (یا غیر شرعی بیٹا تھا یا آپ کی بیوی کا دوسرے شوہر سے غیر شرعی بیٹا تھا)۔ یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ "انہ عمل غیر صالح" کا جملہ درحقیقت "انہ لیس من اھلک" کے لیے علت و سبب کی طرح ہے۔ یعنی یہ جو ہم کہتے ہیں کہ "تیرے اہل میں سے نہیں ہے" اس لحاظ پر ہے کہ کردار کے لحاظ سے تجھ سے جدا ہے گرچہ اس کا نسب تجھ سے متصل ہے۔

۲۔ حضرت نوحؑ اپنے بیٹے کے بارے میں کیونکر متوجہ نہ تھے؟: مندرجہ بالا آیات میں حضرت نوحؑ کی گفتگو اور خدا کی طرف سے انہیں دیئے گئے جواب کی طرف توجہ کرنے سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ حضرت نوحؑ اس مسئلے کی طرف کیونکر متوجہ نہ تھے کہ وعدۂ الٰہی میں ان کا بیٹا شامل نہیں ہے۔

اس سوال کا جواب یوں دیا جا سکتا ہے کہ اس بیٹے کی کیفیت پوری طرح سے واضح نہ تھی کبھی وہ مومنین کے ساتھ ہوتا اور کبھی کفار کے ساتھ۔ اس کی منافقانہ چال ہر شخص کو ظاہراً اشتباہ میں ڈال دیتی تھی۔

علاوہ ازیں اپنے بیٹے سے متعلق حضرت نوحؑ کو شدید احساس مسئولیت تھا۔ پھر فطری اور طبعی لگاؤ بھی تھا جو ہر باپ کو اپنے بیٹے سے ہوتا ہے اور انبیاء بھی اس قانون سے مستثنےٰ نہیں ہیں یہی سبب ہے کہ آپ نے اس قسم کی درخواست کی لیکن جب آپ حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوئے تو فوراً درگاہِ خداوندی میں عذرخواہی اور طلب عفو کی اگرچہ آپ سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا تھا لیکن نبوت کے مقام اور حیثیت کا تقاضا تھا کہ آپ اپنی گفتار و رفتار میں اس سے زیادہ متوجہ ہوتے۔ اتنی عظیم شخصیت ہونے کے باعث یہ آپ کا ترک اولیٰ تھا۔ اسی وجہ سے آپ نے بارگاہِ خداوندی میں بخشش کا تقاضا کیا۔

یہیں سے ایک اور سوال کا جواب بھی واضح ہوگیا اور وہ یہ کہ کیا انبیاء گناہ کرتے ہیں جبکہ وہ بخشش کی دعا کرتے ہیں۔

۳۔ **جہاں رشتہ ٹوٹ جاتا ہے:** مندرجہ بالا آیات سے حضرت نوحؑ کی سرگزشت میں سے انسانی تربیت کے حوالے سے ایک اور بلند سبق ہاتھ آتا ہے۔ ایسا سبق جو مادی مکتبوں میں بالکل کوئی مفہوم نہیں رکھتا لیکن ایک خدائی اور معنوی مکتب میں یہ ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

مادی رشتے یعنی نسب، رشتہ داری، دوستی اور رفاقت آسمانی مکاتب میں ہمیشہ روحانی رشتوں کے تحت ہوتے ہیں اس مکتب میں نسبی و خاندانی رشتوں کا مکتبی و روحانی رشتوں کے مقابلے میں کوئی مفہوم نہیں۔

جہاں مکتبی رابطہ موجود ہے وہاں دُور افتادہ سلمان فارسی جو نہ خاندانِ پیغمبرؐ سے ہے نہ قریشی ہے کی بھی نہیں اور اصلاً عرب بھی نہیں۔ وہ خاندانِ رسالتؐ کا حصہ شمار ہوتا ہے جیسا کہ مشہور حدیث ہے:

سلمان منا اھل البیت

یعنی۔ سلمان ہم اہل بیت میں سے ہے۔

دوسری طرف نوحؑ جیسے پیغمبر کا بلا فصل حقیقی بیٹا باپ سے مکتبی رشتہ توڑنے کی وجہ سے اس طرح دھتکار دیا جاتا ہے:

انہ لیس من اھلک

یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔

ہو سکتا ہے مادی فکر رکھنے والوں کو یہ بات بہت گراں محسوس ہو لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو تمام ادیانِ آسمانی میں نظر آتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ احادیثِ اہل بیتؑ میں ان شیعوں کے بارے میں صریح اور ہلا دینے والی باتیں ہیں جو صرف نام کے شیعہ ہیں لیکن اہلِ بیتؑ کی تعلیمات اور ان کے عملی پروگراموں کا ان کی زندگی میں کوئی اثر دکھائی

نہیں دیتا۔ یہ امر بھی درحقیقت اسی روش کو واضح کرتا ہے جو قرآن نے زیر نظر آیات میں سامنے رکھی ہے۔

امام علی ابن موسیٰ رضا علیہما السلام سے منقول ہے کہ آپ نے ایک دن اپنے دوستوں اور موالیوں سے یہ پوچھا کہ:

لوگ اس آیت کی کس طرح تفسیر کرتے ہیں: "انه عمل غیر صالح" (یہ غیر صالح عمل ہے)۔

حاضرین میں سے ایک نے عرض کیا:

بعض کا نظریہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ نوح کا بیٹا کنعان ان کا حقیقی بیٹا نہیں تھا۔

امام نے فرمایا:

کلا لقد کان ابنه ولکن لما عصی الله نفاه عن ابیه کذا من کان منا لم یطع الله فلیس منا

یعنی۔ ایسا نہیں ہے یقیناً وہ نوح کا بیٹا تھا لیکن جب اس نے نافرمانی کی اور حکم خدا کے راستے سے منحرف ہوگیا تو خدا نے اس کے فرزند ہونے کی نفی کی۔ اسی طرح جو لوگ ہم میں سے ہوں لیکن خدا کی اطاعت نہ کرتے ہوں وہ ہم میں سے نہیں ہیں[1]

۴۔ دھتکارے ہوئے مسلمان: نامناسب نہ ہوگا اگر ہم مندرجہ بالا آیت سے استفادہ کرتے ہوئے کچھ اسلامی احادیث کی طرف اشارہ کریں جن میں بہت سے لوگوں کو جو ظاہراً مسلمانوں کے زمرے میں ہیں یا ظاہراً مکتب اہلبیتؑ کے پیروکار ہیں، دھتکار دیا گیا ہے اور انہیں مومنین اور شیعوں کی صف سے نکال دیا گیا ہے۔

(i) پیغمبر اسلامؐ فرماتے ہیں:

من غش مسلماً فلیس منا

جو مسلمان بھائیوں سے دھوکا بازی اور خیانت کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے[2]

(ii) امام صادق فرماتے ہیں:

لیس بولی لی من اکل مال مؤمن حراماً

جو مومن کا مال ناجائز طور پر کھاتے وہ میرا دوست اور موالی نہیں ہے[3]

(iii) رسول اللہؐ فرماتے ہیں:

الا و من اکرمه الناس اتقاء شره فلیس منی

---

[1] تفسیر صافی مذکورہ آیات کے ذیل میں۔

[2] سفینۃ البحار، ج ۲ ص ۳۱۸

[3] وسائل، ج ۱۲ ص ۵۳

جان لو کہ جس کے شر سے بچنے کے لیے لوگ اس کا احترام کریں وہ مجھ سے نہیں ہے۔

(۷) امام نے فرمایا:

لیس من شیعتنا من یظلم الناس

جو لوگوں پر ظلم کرے وہ ہمارا شیعہ نہیں ہے۔

(۷) امام کاظمؑ فرماتے ہیں:

لیس منا من لم یحاسب نفسہ فی کل یوم

جو شخص ہر روز اپنا محاسبہ نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے[1]

(۷) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

من سمع رجلا ینادی یا للمسلمین فلم یجبہ فلیس بمسلم

جو شخص کسی انسان کی آواز سنے جو پکار رہا ہو اے مسلمانو! میری مدد کو پہنچو، میری اعانت کرو اور اس پر لبیک نہ کہے وہ مسلمان نہیں ہے[2]

(۷) امام باقرؑ کے اصحاب میں سے ایک شخص جابر تھا۔ آپؑ نے اس سے فرمایا:

واعلم یا جابر بانک لا تکون لنا ولیاً حتی لو اجتمع علیک اھل مصرک و قالوا انت رجل سوء لم یحزنک ذلک ولو قالوا انک رجل صالح لم یسرک ذالک ولکن اعرض نفسک علی کتاب اللہ۔

اے جابرؓ جان لو کہ تم اس وقت تک ہمارے دوست نہیں ہو سکتے جب تک کہ تمہارے سارے اہلِ شہر جمع ہو کر تم سے کہیں کہ تُو بُرا شخص ہے اور تُو اس پر غمگین نہ ہو اور سب مل کر کہیں کہ تُو اچھا آدمی ہے اور تُو خوش نہ ہو بلکہ اپنے آپ کو کتاب خدا قرآن کے سامنے پیش کرو اور اچھائی اور برائی کے بارے میں قوانین و ضوابط اس سے لو اور پھر دیکھو کہ تم کس گروہ میں سے ہو[3]

یہ احادیث ان لوگوں کے نظریات پر خط بطلان کھینچتی ہیں جو صرف نام پر گزارہ کرتے ہیں مگر عمل اور مکتبی ارتباط کی ان میں کوئی خبر نہیں۔ یہ احادیث وضاحت سے ثابت کرتی ہیں کہ خدائی پیشواؤں کے مکتب کی بنیاد مکتب پر ایمان اور اس کے پروگراموں کے مطابق عمل کرنا ہے اور تمام چیزوں کو اسی معیار پر پرکھا جانا چاہیئے۔

---

[1] بحار، ج ۱۵ حصہ اخلاق (طبع قدیم)۔

[2] اصول کافی، ج ۲ صفحہ ۱۶۴

[3] سفینۃ البحار ج ۲ صفحہ ۶۹۱

(۴۸) قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

(۴۹) تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛؕ فَاصْبِرْ ۛؕ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ○

ترجمہ

(۴۸) (نوح سے) کہا گیا: اے نوح! سلامتی اور برکت کے ساتھ جو تجھ پر اور تیرے ساتھ موجود تمام امتوں پر ہے اتر آؤ کچھ ایسی امتیں ہیں جنہیں ہم اپنی نعمتوں سے سرفراز کریں گے اس کے بعد انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔

(۴۹) یہ غیب کی خبریں ہیں جن کی (اے پیغمبر) ہم تجھ پر وحی کرتے ہیں اور انہیں اس سے پہلے نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم لہٰذا صبر و استقامت سے کام لو کیونکہ عاقبت پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

تفسیر

حضرت نوحؑ باسلامت اُتر آئے

حضرت نوحؑ اور ان کی سبق آموز سرگزشت کے بارے میں اس سورت میں آنے والی یہ آخری آیات ہیں ان میں حضرت نوحؑ کے کشتی سے اترنے اور نئے سرے سے روئے زمین پر معمول کی زندگی گزارنے کی

طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: نوح سے کہا گیا کہ سلامتی اور برکت کے ساتھ جو ہماری طرف سے تم پر اور ان پر ہے جو تیرے ساتھ ہیں اتر آؤ (قیل یا نوح اهبط بسلام منا و برکات علیک و علیٰ امم ممن معک)۔

اس میں شک نہیں کہ "طوفان" نے زندگی کے تمام آثار کو درہم برہم کر دیا تھا۔ فطری طور پر آباد زمینیں، سرسبز چراگاہیں اور سرسبز باغ سب کے سب ویران ہو چکے تھے۔ اس موقع پر شدید خطرہ تھا کہ حضرت نوحؑ اور ان کے اصحاب اور ساتھی زندگی گزارنے اور غذا کے سلسلے میں بہت تنگی کا شکار ہوں گے لیکن خدا نے ان مومنین کو اطمینان دلایا کہ برکات الٰہی کے دروازے تم پر کھل جائیں گے اور زندگی اور معاش کے حوالے سے تمہیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہونا چاہیئے۔

علاوہ ازیں ممکن تھا کہ حضرت نوحؑ اور ان کے پیروکاروں کو اپنی سلامتی کے حوالے سے یہ پریشانی ہوتی کہ طوفان کے بعد باقی ماندہ ان گندے پانیوں، جوہڑوں اور دلدلوں کے ہوتے ہوئے زندگی خطرے سے دوچار ہوگی لہٰذا خدا تعالیٰ اس سلسلے میں بھی انہیں اطمینان دلاتا ہے کہ تمہیں کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا اور وہ ذات جس نے ظالموں کی تباہی کے لیے طوفان بھیجا ہے وہ اہل ایمان کی سلامتی اور برکت کے لیے بھی ماحول فراہم کر سکتی ہے۔

یہ مختصر سا جملہ ہمیں سمجھاتا ہے کہ قرآن کیسے چھوٹے چھوٹے مسائل کو بھی اہمیت دیتا ہے اور انہیں پچی تلی اور خوبصورت عبارتوں کے ذریعے پیش کرتا ہے۔

لفظ "امم" "امت" کی جمع ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کے ساتھ کئی امتیں تھیں۔ یہ لفظ شاید اس بناء پر کہ جو افراد حضرت نوحؑ کے ساتھ تھے ان میں سے ہر ایک ایک قبیلے اور امت کی پیدائش کا سرچشمہ تھا۔ یا یہ کہ جو لوگ حضرت نوحؑ کے ساتھ تھے ہر گروہ الگ الگ قوم و قبیلہ سے تھا جس سے مجموعاً کئی امتیں بنتی تھیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ لفظ "امم" ان مختلف اصناف حیوانات کے بارے میں ہو جو حضرت نوحؑ کے ساتھ تھے کیونکہ قرآن مجید میں ان کے بارے میں لفظ امت آیا ہے۔ جیسا کہ سورہ انعام کی آیہ ۳۸ میں ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ

کوئی روئے زمین پر چلنے والا اور کوئی پرندہ جو اپنے دو پروں کے ساتھ پرواز کرتا ہے ایسا نہیں جو تمہاری طرح کی امت نہ ہو۔

اس بناء پر جس طرح حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھی پروردگار کے لامتناہی لطف و کرم کے سائے میں طوفان کے بعد ان تمام مشکلات کے باوجود سلامتی و برکت کے ساتھ جیتے رہے اسی طرح مختلف قسم کے جانور

جو حضرت نوحؑ کے ساتھ کشتی سے اترے تھے خدا کی طرف سے سلامتی و حفاظت کے ساتھ اور اس کے لطف کے سائے میں زندگی بسر کرتے رہے۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: اس تمام تر صورت حال کے باوجود آئندہ پھر انہی مومنین کی نسل سے کئی امتیں وجود میں آئیں گی جنہیں ہم انواع و اقسام کی نعمتیں بخشیں گے لیکن وہ غرور و غفلت میں ڈوب جائیں گی۔ اس کے بعد ہمارا دردناک عذاب انہیں پہنچے گا (وامم سنمتعھم ثم یمسھم منا عذاب الیم)۔

لہٰذا ایسا نہیں کہ صالح لوگوں کا یہ انتخاب اور طوفان کے ذریعے نوع انسانی کی اصلاح کوئی آخری اصلاح ہے بلکہ رشد و تکامل کے آخری مرحلہ کو پہنچنے تک انسان اپنے ارادے کی آزادی سے سوء استفادہ کی بنا پر کبھی کبھی شر و فساد کی راہ پر قدم رکھے گا اور پھر سزا اور عذاب کا وہی پروگرام اس جہان میں اور دوسرے جہان میں اسے دامنگیر ہوگا۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ مذکورہ جملے میں لفظ "سنمتعھم" (عنقریب انہیں انواع و اقسام کی نعمتوں سے بہرہ ور کریں گے) آیا ہے اور پھر بلا فاصلہ ان کے لیے عذاب و سزا کی بات کی گئی ہے۔ یہ اس طرح اشارہ ہے کہ کم ظرف اور ضعیف الایمان لوگوں کو نعمت فراواں میسر آجائے تو ان میں شکر گزاری اور اطاعت کا جذبہ بیدار ہونے کی بجائے اکثر طغیان و غرور کے جذبات ابھر آتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ بندگی خدا کے رشتوں کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔

مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں ایک قول نقل کیا ہے جو بہت جاذب ہے، وہ کہتا ہے:

هلك المستمتعون في الدنيا لان الجهل يغلب عليهم والغفلة، فلا يتفكرون الا في الدنيا وعمارتها وملاذها۔

صاحبان نعمت دنیا میں ہلاک اور گمراہ ہوتے ہیں کیونکہ جہالت اور غفلت نے ان پر غلبہ کیا ہے اور دنیا اور اس کی لذت کے علاوہ انہیں کوئی فکر نہیں۔

یہ حقیقت دنیا کے سرمایہ دار اور دولت مند ممالک کی زندگی میں اچھی طرح دیکھی جا سکتی ہے کہ وہ زیادہ تر برائی میں ہی غوطہ زن ہیں، نہ صرف یہ کہ وہ دنیا کے مستضعف اور محروم انسانوں کے بارے میں سوچتے نہیں بلکہ ہر روز ان کا خون چوسنے کیلئے نئی نئی سازشیں کرتے رہتے ہیں لہٰذا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خدا انہیں جنگوں اور دیگر المناک حوادث سے دوچار کرتا ہے جو وقتی طور پر ان سے یہ نعمتیں سلب کر لیتے ہیں یہ اس لیے ہوتا ہے کہ شاید وہ بیدار ہوں۔

آخری زیر بحث آیت جس میں اس سورہ میں جاری حضرت نوحؑ کا واقعہ ختم ہوتا ہے تمام مذکورہ واقعات کی طرف عمومی اشارہ ہوتا ہے: یہ سب غیب کی خبریں ہیں کہ جو (اے پیغمبر) ہم تجھ پر وحی کرتے ہیں (تلك من انباء الغيب نوحيها اليك)۔ قبل ازیں تم اور تمہاری قوم اس سے ہرگز آگاہ نہ تھے (ماكنت تعلمها انت ولا قومك من قبل هذا)۔

جو کچھ تم نے سنا اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اور اپنی دعوت کے دوران نوحؑ کو پیش آمدہ تمام مشکلات

اور اس کی استقامت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے تم بھی صبر و استقامت دکھاؤ کیونکہ آخرکار کامیابی پرہیزگاروں ہی کیلئے ہے (فاصبر ان العاقبة للمتقین)۔

چند اہم نکات

۱۔ **انبیاء کے سچے واقعات :** قرآن حکیم نے انبیاء کے سچے واقعات پیش فرماتے ہیں۔ زیر نظر آخری آیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ان واقعات کو ہر قسم کی تحریف اور انحراف سے پاک بیان کرنا صرف وحیؑ آسمانی کے ذریعے ممکن ہے ورنہ گزشتہ لوگوں کی کتب تاریخ میں اس قدر افسانے اور خرافات شامل ہیں کہ حق و باطل میں تمیز ممکن نہیں اور جتنی تاریخ قدیم ہوتی جاتی ہے اتنا ہی غلط ملط زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ لہٰذا انبیاء اور گزشتہ اقوام کی ہر قسم کی انحراف سے پاک سرگزشت بیان کرنا خود حقانیتِ قرآن اور پیغمبر اسلامؐ کی صداقت کی نشانی ہے[1]

۲۔ **انبیاءؑ اور علمِ غیب :** بعض لوگوں کے خیال کے برخلاف آخری زیر بحث آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علم غیب رکھتے تھے البتہ یہ آگاہی وحی الٰہی کے ذریعہ ہوتی تھی اور اتنی ہی جتنی خدا چاہتا تھا یہ نہیں کہ وہ اپنی طرف سے کچھ جانتے تھے اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض آیات میں علم غیب کی نفی ہوئی ہے تو وہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا علم ذاتی نہیں ہے بلکہ صرف خدا کی طرف سے ہے۔

۳۔ **درس کی ہمہ گیری :** زیر بحث آخری آیت ایک اور حقیقت بھی واضح کرتی ہے کہ انبیاء اور گزشتہ اقوام کے واقعات قرآن میں صرف امت اسلامی کو درس دینے کے لیے بیان نہیں کیے گئے بلکہ ایک طرح سے یہ پیغمبر اکرمؐ کی دلجوئی اور تسلی کے لیے بھی ہیں اور اس سے آپ کے ارادے اور دل کو تقویت بھی مقصود ہے کیونکہ آپ بھی نوعِ انسانی میں سے ہیں اور آپ کو بھی خدا کے مدرسے سے اسی طرح درس لینا چاہیے، اپنے زمانے کے طاغوتوں کے خلاف قیام کے لیے زیادہ تیار ہونا چاہیے اور راستے میں موجود کثیر مشکلات سے نہیں ڈرنا چاہیے یعنی جیسے ان تمام ابتلاؤں اور مشکلوں کے باوجود حضرت نوحؑ استقامت کا مظاہرہ کرتے تھے اور ان کی مشہور طویل ترین عمر میں بہت ہی کم لوگ ایمان لاتے پھر بھی وہ خوشدل تھے اسی طرح آپ بھی کسی حالت میں صبر و استقامت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

یہاں حضرت نوحؑ کی تعجب خیز اور عبرت انگیز داستان کو چھوڑتے ہوئے ہم ایک اور عظیم پیغمبر یعنی حضرت ہودؑ کہ جن کے نام سے یہ سورہ موسوم ہے کی طرف آتے ہیں :

---

[1] اس سلسلے میں تفصیل کے لیے کتاب "قرآن و آخرین پیغمبر" ملاحظہ فرمایئے۔

(۵۰) وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ○

(۵۱) يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۚ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

(۵۲) وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ○

ترجمہ

(۵۰) ہم نے قوم) عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ (اس نے ان سے) کہا: اے میری قوم! اللہ کی پرستش کرو کیونکہ اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں تم صرف تہمت لگاتے ہو۔

(۵۱) اے میری قوم! مَیں تم سے کوئی اُجرت نہیں چاہتا میری اجرت اس کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ کیا سمجھتے نہیں ہو؟

(۵۲) اور اے میری قوم! اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ تاکہ وہ آسمان سے (بارش) پیہم تمہاری طرف بھیجے اور تمہاری قوت میں مزید قوت کا اضافہ کرے اور (حق سے) منہ نہ پھیرو اور گناہ نہ کرو۔

تفسیر

بہادر بُت شکن

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس سورۃ میں پانچ عظیم انبیاء کی دعوت، اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات اور دعوت کے نتائج کا تذکرہ ہے۔ گزشتہ آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں گفتگو تھی اور اب حضرت ہود علیہ السلام کی باری ہے۔

یہ تمام انبیاء ایک ہی منطق اور ایک ہی ہدف کے حامل تھے۔ انہوں نے نوع بشر کو ہر طرح کی قید و بند سے نجات دلانے اور توحید کی طرف، اس کی تمام شرائط کے ساتھ، دعوت دینے کے لیے قیام کیا۔ ایمان، خلوص، جدوجہد اور راہِ خدا میں استقامت ان سب کا شعار تھا۔ ان سب کے خلاف مختلف اقوام کا رویہ بہت تند اور سخت تھا انہوں نے انبیاء کو طرح طرح سے ستایا اور ان پر جبر و استبداد روا رکھا۔

زیرِ نظر پہلی آیت میں اس سلسلے میں فرمایا گیا ہے: ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا (و الیٰ عاد اخاھم ھودًا)۔

یہاں حضرت ہودؑ کو بھائی کہا گیا تھا۔ یہ تعبیر یا تو اس بنا پر ہے کہ عرب اپنے تمام اہلِ قبیلہ کو بھائی کہتے ہیں کیونکہ نسب کی اصل میں سب شریک ہوتے ہیں۔ مثلاً بنی اسد کے شخص کو "اخو اسدی" کہتے ہیں اور مذحج قبیلہ کے شخص کو "اخو مذحج" کہتے ہیں۔ یا ہو سکتا ہے کہ یہ اس طرف اشارہ ہو کہ حضرت ہودؑ کا سلوک اپنی قوم سے دیگر انبیاء کی طرح بالکل برادرانہ تھا نہ کہ ایک حاکم کا سا بلکہ ایسا بھی نہیں جو باپ اپنی اولاد سے کرتا ہے بلکہ آپ کا سلوک ایسا تھا جو ایک بھائی دوسرے بھائیوں سے کرتا ہے کہ جس میں کوئی امتیاز اور برتری کا اظہار نہ ہو۔

حضرت ہودؑ نے بھی اپنی دعوت کا آغاز دیگر انبیاء کی طرح کیا۔ آپ کی پہلی دعوت توحید اور ہر قسم کے شرک کی نفی کی دعوت تھی۔ ہودؑ نے ان سے کہا: "اے میری قوم! خدا کی عبادت کرو" (قال یا قوم اعبدوا اللّٰہ)۔ کیونکہ اس کے علاوہ کوئی اللہ اور معبود لائقِ پرستش نہیں" (ما لکم من الٰہ غیرہ)۔ "بتوں کے بارے میں تمہارا اعتقاد غلطی اور اشتباہ پر مبنی ہے اور اس میں تم خدا پر افتراء باندھتے ہو" (ان انتم الا مفترون)۔

یہ بُت خدا کے شریک ہیں نہ خیر و شر کے منشاء و مبداء۔ اور ان سے کوئی کام بھی نہیں ہو سکتا۔ اس سے بڑھ کر کیا افتراء اور تہمت ہوگی کہ اس قدر بے وقعت موجودات کیلئے تم اتنے بڑے مقام و منزلت کا اعتقاد رکھو۔

اس کے بعد حضرت ہودؑ نے مزید کہا: اے میری قوم! میں اپنی دعوت کے سلسلے میں تم سے کوئی توقع نہیں رکھتا تم سے کسی قسم کی اُجرت نہیں چاہتا کہ تم یہ گمان کرو کہ میری یہ داد و فریاد اور جوش و خروش مال و مقام کے حصول کیلئے ہے یا تم خیال کرو کہ تمہیں مجھے کوئی بھاری معاوضہ دینا پڑے گا کہ جس کی وجہ سے تم تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوتے ہو (یا قوم لا اسئلکم علیہ اجراً)۔ میری اجرت صرف اس ذات پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے، جس نے مجھے روح و جسم

بخشنے ہیں اور تمام چیزیں جس نے مجھے عطا کی ہیں وہی جو میرا خالق و رازق ہے (ان اجری الا علی الذی
فطرنی)۔ پس اگر تمہاری ہدایت و سعادت کے لیے کوئی قدم اٹھاتا ہوں تو وہ اصولاً اس کے حکم کی اطاعت میں
ہوتا ہے لہٰذا اجر و جزا بھی میں اسی سے چاہتا ہوں نہ کہ تم سے۔ علاوہ ازیں کیا تمہارے پاس اپنی طرف سے کچھ ہے
جو تم مجھے دو۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے اس کی طرف سے ہے۔ کیا سمجھتے نہیں ہو (افلا تعقلون)۔

آخر میں انہیں شوق دلانے کے لیے اور اس گمراہ قوم میں حق طلبی کا جذبہ بیدار کرنے کے لیے تمام ممکن وسائل
سے استفادہ کرتے ہوئے مشروط طور پر مادی جزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے کہ جو اس جہان میں خدا مومنین کو عطا فرماتا ہے
ارشاد ہوتا ہے: اے میری قوم! اپنے گناہوں پر خدا سے بخشش طلب کرو (و یاقوم استغفروا ربکم)۔ پھر توبہ
کرو اور اس کی طرف لوٹ آؤ (ثم توبوا الیہ)۔ اگر تم ایسا کرو تو وہ آسمان کو حکم دے گا کہ وہ بارش کے حیات بخش
قطرے پیہم تمہاری طرف بھیجے (یرسل السماء علیکم مدرارا)[1] تاکہ تمہارے کھیت اور باغات کم آبی یا
بے آبی کا شکار نہ ہوں اور ہمیشہ سرسبز و شاداب رہیں۔ علاوہ ازیں تمہارے ایمان، تقویٰ، گناہ سے پرہیز اور خدا
کی طرف رجوع اور توبہ کی وجہ سے تمہاری قوت میں مزید قوت کا اضافہ کرے گا (و یزدکم قوۃ الی قوتکم)۔

یہ کبھی گمان نہ کرو کہ ایمان و تقویٰ سے تمہاری قوت میں کمی واقع ہوگی۔ ایسا ہرگز نہیں بلکہ تمہاری جسمانی و
روحانی قوت میں اضافہ ہوگا۔ اس کمک سے تمہارا معاشرہ آباد تر ہوگا، جمعیت کثیر ہوگی، اقتصادی حالات بہتر
ہوں گے اور تم طاقتور، آزاد اور خود مختار ملت بن جاؤ گے۔ لہٰذا راہ حق سے روگردانی نہ کرو اور شاہراہ گناہ پر قدم نہ
رکھو (ولا تتولوا مجرمین)۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ تمام انبیاء کی دعوت کا خمیر توحید ہے: تاریخ انبیاء نشاندہی کرتی ہے کہ ان سب نے اپنی دعوت
کا آغاز توحید سے اور ہر قسم کے شرک اور بت پرستی کی نفی سے کیا۔ درحقیقت انسانی معاشرے کی کسی قسم کی اصلاح
اس دعوت کے بغیر ممکن نہیں ہے کیونکہ معاشرے کی وحدت، ہمکاری، تعاون، ایثار اور فداکاری سب ایسے امور
ہیں جو توحید معبود کے سرچشمے سے سیراب ہوتے ہیں۔ رہی بات شرک کی تو وہ ہر قسم کی پراگندگی، انتشار، تضاد، اختلاف،
خود غرضی، خود پرستی اور انحصار طلبی کا سرچشمہ ہے اور ان مفاہیم کا شرک و بت پرستی کے وسیع مفہوم سے تعلق کوئی ایسا
پوشیدہ نہیں ہے۔

جو شخص خود محور اور خود غرض ہو وہ صرف اپنے آپ کو دیکھتا ہے اور اسی بناء پر وہ مشرک ہے۔ توحید ایک

۱۔ مدرار جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے "در" کے مادہ سے پستان سے دودھ گرنے کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں بارش برسنے کے معنی میں بھی بولا جانے لگا۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ زیر بحث آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ آسمان سے تم پر بارش برسائے گا بلکہ فرمایا گیا ہے کہ آسمان کو تم پر برسائے گا یعنی اس قدر بارش برسے گی کہ گویا سارا آسمان برس رہا ہے نیز اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "مدرار" مبالغہ کا صیغہ ہے اس سے انتہائی تاکید ظاہر ہوتی ہے۔

شخص کے قطرۂ وجود کو معاشرے کے وسیع سمندر میں شامل کر دیتی ہے۔ موحد ایک عظیم وحدت کے سوا کچھ نہیں دیکھتا یعنی وہ سارے انسانوں اور بندگانِ خدا کو ایک معاشرے کی صورت میں دیکھتا ہے۔

جو برتری کے خواہشمند ہیں وہ شرک کی ایک اور قسم سے وابستہ ہیں۔ اسی طرح جو ہمیشہ اپنے ہم نوع افراد سے جنگ کرتے رہتے ہیں اور اپنے مفادات کو دوسروں کے فائدے سے جدا سمجھتے ہیں تو یہ دوگانگی یا چند گانگی سوائے شرک کے مختلف چہروں کے اور کچھ نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اپنے وسیع اصلاحی پروگراموں کو سب انبیاء نے یہیں سے شروع کیا۔ ان کی پہلی دعوت —— دعوتِ توحید تھی۔ توحید یعنی توحیدِ معبود پھر توحیدِ کلمہ، توحیدِ عمل اور توحیدِ معاشرہ۔

۲۔ **سچے رہبر اپنے پیروکاروں سے جزا نہیں چاہتے:** ایک حقیقی پیشوا اور رہبر اس صورت میں ہر قسم کے اتہام سے بچ کر انتہائی آزادی سے اپنے مسلک پر کاربند رہ سکتا ہے، اپنا سفر جاری رکھ سکتا ہے اور اپنے پیروکاروں کی ہر قسم کی کجروی کی اصلاح کر سکتا ہے جب وہ ان سے کوئی مادی وابستگی اور احتیاج نہ رکھتا ہو ورنہ وہی احتیاج ان کے دست و پا کی زنجیر بن جائے گی اور اس کی زبان و فکر کی بندش کا سامان ہو جائے گی۔ منحرف اور کج رو لوگ اسی طریقے سے اس پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں گے، مادی امداد منقطع کرنے کی دھمکی دیں گے یا امداد بڑھانے کی پیشکش کریں گے۔ کوئی رہبر کتنا ہی صاف دل اور مخلص کیوں نہ ہو پھر بھی انسان ہوتا ہے، اور ہو سکتا ہے اس مرحلہ پر اس کے قدم ڈگمگا جائیں۔

اسی بنا پر مندرجہ بالا آیات اور قرآن کی دیگر آیات میں ہے کہ انبیاء اپنی دعوت کی ابتداء میں صراحت سے اعلان کرتے اور بتاتے تھے کہ وہ مادی احتیاج اور اجر کی توقع اپنے پیروکاروں سے نہیں رکھتے۔ انبیاء کا یہ کردار تمام رہبروں کے لیے نمونہ اور ماڈل ہے خصوصاً روحانی اور مذہبی رہبروں اور رہنماؤں کے لیے۔

البتہ چونکہ وہ اپنا تمام وقت اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں صرف کرتے ہیں لہٰذا ان کی ضروریات صحیح طریقے پر پوری ہونا چاہئیں۔ امدادی وسائل اور اسلامی بیت المال ایسے ہی افراد کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مہیا کیا گیا ہے اور بیت المال کی تشکیل کا ایک فلسفہ اور وجہ یہی ہے۔

۳۔ **گناہ۔ معاشرے کی تباہی:** مندرجہ بالا آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں روحانی اور مادی مسائل میں ایک واضح تعلق موجود ہے۔ یہاں گناہ سے استغفار، خدا کی طرف رجوع اور توبہ کو آبادی، خوشی، شادابی اور قوت میں اضافے کے ذریعے کے طور پر متعارف کروایا گیا ہے۔

یہ حقیقت قرآن کی بہت سی آیات میں بھی نظر آتی ہے۔ منجملہ ان کے سورہ نوح میں اس عظیم پیغمبر کی زبانی فرمایا گیا ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝

ان سے میں نے کہا اپنے گناہوں سے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں استغفار کرو کہ وہ بخشنے والا ہے تاکہ وہ پے در پے تم پر آسمان سے بارش برسائے اور مال و اولاد کے ذریعے تمہاری مدد کرے اور تمہارے لیے باغات اور نہریں مہیا کرے۔ (نوح ۱۰ - ۱۲)

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ اسلامی روایات میں ہے کہ:

ربیع بن صبیح کہتا ہے کہ میں حسن کے پاس تھا۔ ایک شخص دروازے سے داخل ہوا۔ اس نے اپنی آبادی کی خشک سالی کی شکایت کی۔ حسن نے اس سے کہا: استغفار کرو۔ دوسرا آیا اس نے فقر و فاقہ کی شکایت کی۔ اس سے بھی کہا: استغفار کرو۔ تیسرا آیا۔ اس نے کہا: دعا کریں خدا مجھے بیٹا عطا کرے۔ اس سے بھی کہا: استغفار کرو۔ ربیع کہتا ہے کہ میں نے تعجب کیا (اور) اس سے کہا: جو شخص تیرے پاس آتا ہے اور وہ کوئی مشکل پیش کرتا ہے اور نعمت کا تقاضا کرتا ہے اسے یہی حکم دیئے جا رہے ہو اور سب سے کہتے ہو کہ استغفار کرو اور خدا سے بخشش طلب کرو۔ اس نے میرے جواب میں کہا: جو کچھ میں نے کہا ہے اپنی طرف سے نہیں کہا، میں نے یہ مطلب کلام خدا سے لیا ہے اور یہ وہی بات ہے جو وہ اپنے پیغمبر نوح سے کہتا ہے۔ اس کے بعد اس نے سورہ نوح کی ان (مذکورہ) آیات کی تلاوت کی۔[1]

جن لوگوں کی عادت ہے وہ ایسے مسائل کو معمولی سمجھتے ہوئے گزر جاتے ہیں وہ ان امور میں موجود ایک روحانی تعلق جانے بغیر ان کے قائل ہو جاتے ہیں اور مزید کوئی تجزیہ و تحلیل نہیں کرتے لیکن اگر زیادہ غور و فکر سے کام لیا جائے تو ہمیں ان امور کے درمیان ترتیبی رشتے نظر آئیں گے جن کی طرف توجہ کرنے سے مادی اور روحانی مسائل کو آپس میں اس طرح ملایا جا سکتا ہے جیسے ایک کپڑے کے ریشے آپس میں ملے ہوتے ہیں یا جیسے کسی درخت کی جڑ تنا اور پھل پھول آپس میں مربوط ہوتے ہیں۔

کونسا ایسا معاشرہ ہے جو گناہ، خیانت، نفاق، چوری، ظلم اور تن پروری سے آلودہ ہو اور پھر بھی وہ آباد اور پُر برکت رہے۔

کونسا معاشرہ ہے جو تعاون و ہمکاری کی روح گنوا بیٹھے جنگ، نزاع اور خونریزی اس کی جگہ لے لے اور پھر بھی اس کی زمینیں سرسبز و شاداب ہوں اور وہ اقتصادی طور پر خوشحال ہو۔

کونسا معاشرہ ہے جس کے لوگ طرح طرح کی ہوا و ہوس میں آلودہ ہوں پھر بھی وہ طاقتور ہو اور دشمن کے مقابلے میں پامردی سے کھڑا ہو سکے۔

صراحت سے کہنا چاہیئے کہ کوئی ایسا اخلاقی مسئلہ نہیں مگر یہ کہ وہ لوگوں کی مادی زندگی پر مفید اور اصلاحی اثر کرے، اسی طرح کوئی صحیح اعتقاد اور ایمان ایسا نہیں کہ جو معاشرے کو آباد، آزاد، با استقلال اور طاقت ور بنانے

---

[1] مجمع البیان، ج ۱۰ صفحہ ۳۶۱۔

میں مؤثر نہ ہو۔

جو لوگ اخلاقی مسائل، مذہبی عقیدہ اور توحید پر ایمان کو مادی مسائل سے جدا کر کے دیکھتے ہیں انہوں نے نہ معنوی اور روحانی مسائل کو اچھی طرح سے پہچانا ہے اور نہ مادی مسائل کو۔ اگر دینی لوگوں میں تکلفات اور تشریفات، ظاہری آداب اور مفہوم و معنی سے خالی شکل میں ہو تو واضح ہے کہ معاشرے کے مادی نظام میں اس کی کوئی تاثیر نہیں ہوگی۔ لیکن اگر روحانی اعتقادات روح انسانی کی عمیق گہرائیوں میں اس طرح سے اتر جائیں کہ ان کے اثرات ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، زبان اور جسم کے تمام ذرات میں ظاہر ہوں تو ان اعتقادات کے معاشرے پر اصلاحی آثار کسی سے مخفی نہیں رہیں گے۔

ہو سکتا ہے مادی برکات کے نزول سے استغفار کے تعلق کو بعض مراحل میں ہم صحیح طور پر نہ سمجھ سکیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کے بہت سے حصے ہمارے لیے قابل فہم ہیں۔

دورِ حاضر میں ہمارے اسلامی ملک ایران کے اسلامی انقلاب میں ہم نے اچھی طرح مشاہدہ کیا ہے کہ اسلامی اعتقادات اور اخلاقی و روحانی قوت کس طرح دورِ حاضر کے طاقتور ترین اسلحہ، طاقتور افواج اور استعماری سپر طاقتوں پر کامیاب ہو گئی۔ یہ چیز نشاندہی کرتی ہے کہ دینی عقائد اور مثبت روحانی اخلاق کس حد تک اجتماعی اور سیاسی مسائل میں کارگر ہیں۔

۴۔ "یزدکم قوۃ الی قوتکم" سے کیا مراد ہے؟: اس جملے کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ خداوند عالم توبہ اور استغفار کے نتیجے میں تمہاری قوت میں قوت کا اضافہ کرے گا۔

بعض نے اس جملے کو انسانی قوت میں اضافے کی طرف اشارہ سمجھا ہے (جیسا کہ سورہ نوح کی آیات میں بھی اس طرف اشارہ ہوا ہے)۔

بعض نے معنوی طاقت میں مادی طاقت کے اضافے کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

لیکن آیت کی تعبیر مطلق ہے اور ہر قسم کی مادی اور معنوی طاقت میں اضافے کا مفہوم اس میں شامل ہے اور اس میں ان تمام تفاسیر کا مفہوم موجود ہے۔

(۵۳) قَالُوْا یٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِیْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ ○

(۵۴) اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ○

(۵۵) مِنْ دُوْنِهٖ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ○

(۵۶) اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ○

(۵۷) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَیْكُمْ ؕ وَیَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَیْئًا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ ○

ترجمہ

(۵۳) انہوں نے کہا: اے ہود! تو ہمارے لیے کوئی دلیل نہیں لایا۔ ہم اپنے خداؤں کو تیری بات پر نہیں چھوڑتے اور ہم (بالکل) تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے۔

(۵۴) ہم (تیرے بارے میں) صرف یہ کہتے ہیں کہ ہمارے بعض خداؤں نے تجھے نقصان پہنچایا ہے (اور تیری عقل چھین لی ہے)۔ (ہود نے) کہا: میں خدا کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ جنہیں تم (خدا کا) شریک قرار دیتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔

(۵۵) وہ جو اس (خدا) کے علاوہ ہیں (کہ جنہیں تم پوجتے ہو) اب جبکہ ایسا ہے تو تم سب

مل کر میرے خلاف سازش کرو اور لمحہ بھر کی بھی مجھے مہلت نہ دو (لیکن جان لو کہ تم سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا)

(۵۶) (کیونکہ) میں نے اللہ پر توکل کیا ہے جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے کوئی چلنے پھرنے والا ایسا نہیں جس پر وہ تسلط نہیں رکھتا (لیکن ایسا تسلط جو عدالت پر مبنی ہے کیونکہ) میرا پروردگار صراطِ مستقیم پر ہے۔

(۵۷) اور اگر تم منہ موڑ لو تو جو پیغام میرے ذمہ تھا وہ میں نے تم تک پہنچا دیا ہے اور خدا دوسرے گروہ کو تمہارا جانشین کر دے گا اور تم اسے ذرہ بھر نقصان بھی نہیں پہنچا سکتے میرا پروردگار ہر چیز کا محافظ اور نگہبان ہے۔

تفسیر

حضرت ہودؑ کی قوی منطق

اب دیکھتے ہیں کہ اس سرکش اور مغرور قوم نے ۔ یعنی قوم عاد نے اپنے بھائی ہود، ان کے پند و نصائح اور ہدایت و رہنمائی کے مقابلے میں کیا ردِ عمل ظاہر کیا۔

"انہوں نے کہا: اے ہود! تو ہمارے لیے کوئی واضح دلیل نہیں لایا" (قالوا یا ھود ما جئتنا ببینۃ)۔

ہرگز تیری باتوں پر اپنے بتوں اور خداؤں کا دامن نہیں چھوڑیں گے" (وما نحن بتارکی الھتنا عن قولک)۔

اور ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے (وما نحن لک بمؤمنین)۔

ان تین غیر منطقی جملوں کے بعد انہوں نے مزید کہا: "ہمارا خیال ہے کہ تو دیوانہ ہو گیا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ تو ہمارے خداؤں کے غضب کا شکار ہوا ہے اور انہوں نے تیری عقل کو آسیب پہنچایا ہے" (ان نقول الا اعتراک بعض الھتنا بسوء)۔

اس میں شک نہیں کہ جیسے تمام انبیاء کا طریقہ کار ہوتا ہے اور ان کی ذمہ داری ہے حضرت ہود علیہ السلام نے انہیں اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لیے کئی ایک معجزے دکھائے ہوں گے۔ لیکن انہوں نے اپنے کبر و غرور کی وجہ سے دیگر ہٹ دھرم قوموں کی طرح معجزات کا انکار کیا اور انہیں جادو قرار دیا اور انہیں اتفاقی حوادث گردانا کہ جنہیں کسی معاملے میں دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ان باتوں سے قطع نظر بت پرستی کی نفی کے لیے تو کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور جو شخص بھی تھوڑی

سی عقل و شعور رکھتا ہو اور اپنے آپ کو تعصب سے دُور کرے تو وہ اچھی طرح سے اس کا بطلان سمجھ سکتا ہے۔
فرض کریں کہ اس کے لیے دلیل کی ضرورت ہے تو کیا یہ مسئلہ منطقی و عقلی دلائل کے علاوہ کسی معجزہ کا بھی محتاج ہے۔

دوسرے لفظوں میں جو کچھ حضرت ہودؑ کی دعوت کے سلسلے میں گزشتہ آیات میں آیا ہے وہ خدائے یگانہ کی طرف دعوت، اس کی طرف بازگشت، گناہوں سے استغفار اور ہر قسم کے شرک اور بت پرستی کی نفی ہے۔ یہ سب ایسے مسائل ہیں جنہیں عقلی دلیل سے بالکل ثابت کیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا اگر "بینۃ" سے نفی سے ان کی مراد عقلی دلیل کی نفی تھی تو مسلماً یہ بات غلط ہے اور اگر "معجزہ" کی نفی مراد تھی تو اس دعویٰ کے لیے معجزہ کی ضرورت نہ تھی۔ بہرحال انہوں نے یہ جو کہا تھا کہ ہم ہرگز تیری باتوں کی وجہ سے اپنے بتوں کو فراموش نہیں کریں گے اُن کی ہٹ دھرمی کی بہترین دلیل ہے کیونکہ عقلمند اور حق جو انسان حق بات کسی کی طرف سے ہو اُسے قبول کر لیتا ہے۔ خصوصاً یہ جملہ کہ انہوں نے حضرت ہودؑ کی "جنون" کی تہمت لگائی۔ اور "جنون" بھی وہ جو ان کے زعم میں ان کے خداؤں کے غضب کا نتیجہ تھا، ان کے بیہودہ پن اور خرافات پرستی کی خود ایک بہترین دلیل ہے۔

بے جان اور بے شعور پتھر اور لکڑیاں جو خود اپنے "بندوں" کی مدد کی محتاج ہیں وہ ایک عقلمند انسان سے کس طرح اس کا عقل و شعور چھین سکتی ہیں۔

علاوہ ازیں ان کے پاس ہودؑ کے دیوانہ ہونے کی کونسی دلیل تھی، سوائے اس کے کہ انہوں نے ان کی سنت شکنی کی اور ان کے ماحول کے بیہودہ رسم و رواج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اگر یہ دیوانگی کی دلیل ہے تو پھر تمام مصلحین جہان اور انقلابی لوگ جو غلط روش اور طریقوں کے خلاف قیام کرتے ہیں سب دیوانے ہونے چاہئیں۔

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ گزشتہ دور اور آج کی تاریخ نیک اندیش اور بدعت شکن مردوں اور عورتوں کو جنون کی نسبت دیئے جانے سے بھری پڑی ہے۔ کیونکہ وہ خرافات اور استعمار اور اس کے ہتھکنڈوں اور شکنجوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے۔

بہرحال حضرت ہودؑ کی ذمہ داری تھی کہ اس گمراہ اور ہٹ دھرم قوم کو دندان شکن جواب دیتے ـــــ ایسا جواب کہ منطق کی بنیاد پر بھی ہوتا اور طاقت سے بھی ادا ہوتا۔ قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے ان کے جواب میں چند جملے کہے: "میں خدا کو گواہی کے لیے بلاتا ہوں اور تم سب بھی گواہ رہو کہ میں ان بتوں اور تمہارے خداؤں سے بیزار ہوں" (قال انی اشھد اللّٰہ واشھدوا انی بریٓء مما تشرکون ـــ من دونہ)۔ یہ اس طرف اشارہ تھا کہ اگر یہ بت طاقت رکھتے ہیں تو ان سے کہو کہ مجھے ختم کر دیں۔ میں جو علی الاعلان ان کے خلاف جنگ کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہوں اور اعلانیہ ان سے بیزاری اور تنفر کا اعلان کر رہا ہوں تو وہ کیوں خاموش اور معطل ہیں، کس چیز کے منتظر

ہیں اور کیوں مجھے نابود اور ختم نہیں کر دیتے۔

اس کے بعد مزید فرمایا کہ نہ فقط یہ کہ ان سے کچھ نہیں ہو سکتا بلکہ تم بھی اتنی کثرت کے باوجود کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے۔ اگر سچ کہتے ہو تو تم سب ہاتھوں میں ہاتھ دے کر میرے خلاف جو سازش کر سکتے ہو کر گزرو اور مجھے ذرہ بھر کی بھی مہلت نہ دو (فکیدونی جمیعا ثم لا تنظرون)۔

یعنی تمہاری اتنی کثیر تعداد کو کیوں کچھ نہیں سمجھتا اور کیوں تمہاری طاقت کی کوئی پرواہ نہیں کرتا، تم کہ جو میرے خون کے پیاسے ہو اور ہر قسم کی طاقت رکھتے ہو — اس لیے کہ میرا رکھوالا اللہ ہے وہ کہ جس کی قدرت سب طاقتوں سے بالاتر ہے۔ میں نے خدا پر توکل کیا ہے جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے" (انی توکلت علی اللہ ربی و ربکم)۔

یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ یہ اس امر کی نشانی ہے کہ میں نے دل کسی اور جگہ نہیں باندھ رکھا۔ اگر صحیح طور پر سوچو تو یہ خود ایک قسم کا معجزہ ہے کہ ایک انسان تن تنہا بہت سے لوگوں کے بیہودہ عقائد کے خلاف اٹھ کھڑا ہو جبکہ وہ طاقتور اور متعصب بھی ہوں یہاں تک کہ انہیں اپنے خلاف قیام کی تحریک کرے اس کے باوجود اس میں خوف و خطر کے کوئی آثار نظر نہ آئیں اور پھر نہ اس کے دشمن اس کے خلاف کچھ کر سکتے ہوں۔

پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ نہ صرف تم بلکہ ، عالم وجود میں کوئی چلنے پھرنے والا نہیں کہ جو خدا کے قبضۂ قدرت اور فرمان کے ماتحت نہ ہو" اور جب تک وہ نہ چاہے ان سے کچھ نہیں ہو سکتا (ما من دابة الا ھو اخذ بناصیتھا)۔

لیکن یہ بھی جان لو کہ میرے خدا کی قدرت کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خود سری اور خود خواہی کی بنیاد پر عمل میں آئے اور وہ اسے غیر حق صرف کرے بلکہ میرا پروردگار ہمیشہ صراط مستقیم اور جادۂ عدل پر ہے" اور وہ کوئی کام حکمت کے برخلاف انجام نہیں دیتا (ان ربی علی صراط مستقیم)۔

دو اہم نکات

۱۔ ناصیہ کا مفہوم: ، ناصیة ، اصل میں سر کے اگلے حصے کے بالوں کے معنی میں ہے اور ، نصا ، (بروزن "نصر") کے مادہ سے اتصال اور پیوستگی کے مفہوم میں آیا ہے۔ ، اخذ ناصیة ، (سر کے اگلے حصے کے بال پکڑنا) کسی چیز پر تسلط اور قہر و غلبہ کے لیے کنایہ ہے۔ یہ جو مذکورہ آیت میں خدا فرماتا ہے کہ ، کوئی چلنے پھرنے والا نہیں مگر یہ کہ ہم اس کی ، ناصیة ، پکڑے ہوئے ہیں" ہر چیز پر اس کی قدرت قاہرہ کا اشارہ ہے یعنی کوئی موجود اس کے ارادے کے سامنے ٹھہرنے کی تاب نہیں رکھتا کیونکہ عام طور پر جب کسی انسان یا حیوان کے سر کے اگلے بالوں کو پکڑ لیا جائے تو اس میں مقابلہ کی طاقت نہیں رہتی۔

یہ تعبیر اس لیے ہے کہ مغرور متکبرین، خود پسند بت پرست اور ظالم حکومت کے خواہاں یہ نہ سوچیں کہ اگر چند دن کے لیے انہیں موقع مل گیا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ پروردگار کے خلاف کچھ قیام کرنے لگیں۔ انہیں اس حقیقت

کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے اور مرکب غرور سے نیچے اترنا چاہیئے۔

۲۔ "ان ربی علی صراط مستقیم" کا مطلب و یہ جملہ نہایت خوبصورت ہے اور خدا کی ایسی قدرت جو عدالت آمیز ہے اس کے بارے میں یہ زیبا ترین تعبیرات میں سے ہے کیونکہ عموماً طاقتور مجھوٹے اور ظالم ہوتے ہیں لیکن اللہ اپنی بے انتہا قدرت کے باوجود ہمیشہ عدالت کی صراط مستقیم پر ہے۔ اس کا راستہ ہمیشہ حکمت، نظم اور حساب و کتاب کا صاف و شفاف راستہ رہا ہے۔

اس نکتہ کو بھی نگاہ سے دور نہیں رہنا چاہیئے کہ حضرت ہودؑ کی باتیں مشرکین کے سامنے یہ حقیقت بیان کر رہی تھیں کہ ہٹ دھرم دشمن جس قدر اپنی ہٹ دھرمی میں اضافہ کریں ایک حقیقی رہبر کو چاہیئے کہ وہ اپنی استقامت و پامردی میں اتنا ہی اضافہ کرے۔ قوم نے حضرت ہودؑ کو بتوں سے بہت زیادہ خائف کرنے کی کوشش کی تھی لہذا انہوں نے بھی اس کے مقابلے میں انہیں شدید ترین طریقے سے خدا کی قدرت قاہرہ سے ڈرایا۔

آخر کار حضرت ہودؑ ان سے کہتے ہیں: اگر تم راہ حق سے روگردانی کرو گے تو اس میں مجھے کوئی نقصان نہیں ہوگا کیونکہ میں نے اپنا پیغام تم تک پہنچا دیا ہے (فان تولوا فقد ابلغتکم ما ارسلت بہ الیکم)۔ یہ جو اس طرف اشارہ ہے کہ یہ گمان نہ کرو کہ اگر میری دعوت قبول نہ کی جائے تو میرے لیے کوئی شکست ہے۔ میں نے اپنا فریضہ انجام دے دیا ہے اور فریضہ کی انجام دہی کامیابی ہے اگرچہ میری دعوت قبول نہ کی جائے۔

دراصل یہ سچے رہبروں اور راہ حق کے پیشواؤں کے لیے ایک درس ہے کہ انہیں اپنے کام پر کبھی بھی خستگی و پریشانی کا احساس نہیں ہونا چاہیئے چاہے لوگ ان کی دعوت قبول نہ کریں۔

جیسا کہ بت پرستوں نے آپ کو دھمکی دی تھی اس کے بعد آپ انہیں شدید طریقہ پر عذاب الٰہی کی دھمکی دیتے ہوئے کہتے ہیں: اگر تم نے دعوت حق قبول نہ کی تو خدا عنقریب تمہیں نابود کر دے گا اور کسی دوسرے گروہ کو تمہارا جانشین بنا دے گا اور تم اسے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتے (ویستخلف ربی قوما غیرکم ولا تضرونہ شیئا)۔

یہ قانون خلقت ہے کہ جس وقت لوگ نعمت ہدایت یا خدا کی دوسری نعمتیں قبول کرنے کے اہل نہ ہوں تو وہ انہیں اٹھا لیتا ہے اور ان کی جگہ کسی دوسرے اہل گروہ کو لے آتا ہے۔

اور یہ بھی جان لو کہ میرا پروردگار ہر چیز کا محافظ ہے اور ہر حساب و کتاب کی نگہداری کرتا ہے (ان ربی علی کل شیء حفیظ)۔ نہ کوئی چیز اس کے ہاتھ سے جاتی ہے اور نہ وہ موقع کی مناسبت کو فراموش کرتا ہے۔ نہ وہ اپنے انبیاء اور دوستوں کو طاق نسیاں کرتا ہے اور نہ کسی شخص کا حساب و کتاب اس کے علم سے اوجھل ہوتا ہے بلکہ وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز پر مسلط ہے۔

(۵۸) وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ○

(۵۹) وَتِلْكَ عَادٌ ۟ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ○

(۶۰) وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۗ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ○

ترجمہ

(۵۸) اور جس وقت ہمارا فرمان آپہنچا تو ہود اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے انہیں اپنی رحمت سے ہم نے نجات دی اور عذاب شدید سے انہیں بچا لیا۔

(۵۹) اور یہ قوم عاد ہی تھی کہ جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیات کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر ستمگر، حق کے دشمن کے حکم کی پیروی کی۔

(۶۰) اس جہان میں ان کے پیچھے لعنت (اور رسوائی رہی) اور قیامت میں (کہا جائے گا کہ) جان لو کہ عاد نے اپنے پروردگار سے کفر و انکار کیا، دُور ہو عاد قوم ہود (خدا کی رحمت اور خیر و سعادت سے)۔

تفسیر

اس ظالم قوم پر۔ ابدی لعنت

قوم عاد اور ان کے پیغمبر حضرت ہودؑ کی سرگزشت سے مربوط آیات کے آخری حصے میں ان سرکشوں کی، دردناک سزا اور عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن پہلے کہتا ہے: جب ان کے عذاب کے بارے میں ہمارا

حکم آپہنچا تو ہود اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لا چکے تھے ہماری ان پر رحمت اور لطف خاص نے انہیں نجات بخشی (ولما جاء امرنا نجینا ھوداً والذین اٰمنوا معہ برحمۃ منا)۔ پھر مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے:
اور ہم نے ان صاحب ایمان لوگوں کو شدید اور غلیظ عذاب سے رہائی بخشی (ونجیناھم من عذاب غلیظ)۔

یہ امر جاذب نظر ہے کہ بے ایمان، سرکش اور ظالم افراد کے لیے عذاب و سزا بیان کرنے سے پہلے صاحب ایمان قوم کی نجات کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ یہ خیال پیدا نہ ہو جیسا کہ مشہور ضرب المثل ہے کہ عذاب الٰہی کے موقع پر خشک و تر سب جل جاتے ہیں کیونکہ وہ حکیم اور عادل ہے اور محال ہے کہ وہ ایک بھی صاحب ایمان شخص کو بے ایمان اور گنہگار لوگوں کے درمیان عذاب کرے۔ بلکہ رحمت الٰہی ایسے افراد کو عذاب و سزا کے نفاذ سے پہلے ہی امن و امان کی جگہ پر منتقل کر دیتی ہے جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ اس سے پہلے کہ طوفان آئے حضرت نوحؑ کی کشتی نجات تیار تھی اور اس سے پہلے کہ حضرت لوطؑ کے شہر تباہ و برباد ہوں حضرت لوطؑ اور آپؑ کے انصار راتوں رات حکم الٰہی سے وہاں سے نکل آئے۔

اس سلسلے میں کہ لفظ "نجینا" کا اس جملے سے کیوں تکرار کیا گیا مختلف تفسیریں ہیں۔

بعض کا نظریہ ہے کہ پہلے مرحلے میں "نجینا" دنیاوی عذاب سے نجات پانے کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے مرحلے میں آخرت کے عذاب سے نجات کی طرف کہ جو "غلیظ" ہونے کی صفت سے بھی پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے ایک لطیف نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ یہ کہ چونکہ رحمت الٰہی کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی اگر فوراً لفظ عذاب کا تکرار ہوتا تو مناسب نہ تھا۔ رحمت کہاں اور عذاب غلیظ کہاں۔ لہٰذا "نجینا" کا تکرار ہوا تاکہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ ہو جائے اور عذاب کی شدت اور تاکید میں بھی کسی قسم کی کمی نہ آسکے۔

اس نکتے پر بھی توجہ رہنا چاہیئے کہ آیات قرآن میں چار مواقع پر عذاب کے لیے "غلیظ" کی صفت استعمال کی گئی ہے[1] ان آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب غلیظ کا ربط جہان آخرت کے ساتھ ہے۔ خصوصاً سورۂ ابراہیم کی آیات جن میں عذاب غلیظ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے صراحت سے دوزخیوں کی حالت بیان کرتی ہیں اور ایسا ہی ہونا چاہیئے کیونکہ دنیاوی عذاب کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو پھر بھی عذاب آخرت کے مقابلے میں خفیف سے کم اہمیت کا حامل ہے۔

یہ مناسبت بھی قابل ملاحظہ ہے کہ جیسا کہ انشاء اللہ سورۂ قمر اور سورۂ حاقہ میں آئے گا قوم عاد کے لوگ سخت اور بلند قامت تھے۔ ان کے قد کو کھجور کے درختوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اسی مناسبت سے ان کی عمارتیں مضبوط، بڑی اور اونچی تھیں یہاں تک کہ قبل اسلام کی تاریخ میں ہے کہ عرب بلند اور مضبوط عمارتوں کی نسبت قوم عاد

---

[1] سورۂ ابراہیم ۔ ۱۷، لقمان ۔ ۲۴، اور فصلت ۔ ۵۰۔

ہی کی طرف دیتے ہوئے انہیں "ھادی" کہتے تھے۔ اس سے ان پر آنے والا عذاب بھی انہی کی طرح غلیظ اور سخت تھا، جیسا کہ مذکورہ سورتوں کی تفسیر میں آئے گا۔

اس کے بعد قوم عاد کے گناہوں کا خلاصہ تین امور میں بیان کیا گیا ہے:

پہلا یہ کہ انہوں نے اپنے پروردگار کی آیات کا انکار کیا اور ہٹ دھرمی کے ساتھ اپنے پیغمبر کی دعوت کی صداقت کے منکر ہو گئے جو کہ واضح دلیل اور مدرک تھا (وتلک عاد جحدوا بآیات ربھم)۔

دوسرا یہ کہ وہ عمل لحاظ سے بھی انبیاء کے خلاف عصیان و سرکشی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے (وعصوا رسلہ)۔ یہاں "رسل" جمع کی صورت میں بیان ہوا ہے۔ ایسا یا تو اس بناء پر ہے کہ تمام انبیاء کی دعوت ایک ہی حقیقت کی طرف تھی۔ یعنی توحید اور اس کی شاخیں۔ لہٰذا ایک پیغمبر کا انکار تمام پیغمبروں کے انکار کے مترادف ہے۔ یا اس بنا پر ہے کہ حضرت ہودؑ انہیں گزشتہ انبیاء پر ایمان لانے کی دعوت دیتے تھے اور وہ انکار کرتے تھے۔

تیسرا گناہ ان کا یہ تھا کہ وہ حکم خدا کو چھوڑ کر حق دشمن ظالموں کی اطاعت کرتے تھے (واتبعوا امر کل جبار عنید)۔

ترک ایمان، انبیاء کی مخالفت اور حق دشمن ظالموں کی پیروی سے بڑھ کر کونسا گناہ تھا۔

"جبار" اس شخص کو کہتے ہیں جو غضب سے مارتا، قتل کرتا اور نابود کرتا ہے اور حکم عقل کا پیرو نہیں ہوتا دوسرے لفظوں میں "جبار" اسے کہتے ہیں جو دوسروں کو اپنی پیروی پر مجبور کرے یا جو اپنی بڑائی اور تکبر کے ذریعے اپنا عیب چھپانا چاہے۔ اور "عنید" وہ ہے جو حق و حقیقت کی بہت زیادہ مخالفت کرے اور کسی صورت میں حق کو قبول نہ کرے۔

یہ دو صفات ہر زمانے کے طاغوتوں اور مستکبرین کی واضح صفات میں سے ہیں۔ کبھی بھی ان کے کان حق بات سننے کو تیار نہیں ہوتے اور اپنے مخالف سے قساوت، بے رحمی اور سختی سے پیش آتے ہیں اور اسے ختم کر دیتے ہیں۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ اگر جبار کا یہی معنی ہے تو پھر قرآن کی سورہ حشر آیہ ۲۳ میں اور دیگر مصادر اسلامی میں خدا کی ایک صفت "جبار" کیوں ذکر ہوئی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اصل لغت میں جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں "جبار" یا مادہ "جبر" سے قہر و غلبہ اور قدرت کے معنی میں ہے اور یا "جبران" کے مادہ سے کسی نقص کے برطرف کرنے کے معنی میں ہے۔

لیکن "جبار" چاہے پہلے معنی میں ہو یا دوسرے میں، دو صورتوں میں استعمال ہوتا ہے کبھی مذمت کی صورت میں اور وہ اس موقع پر جب کوئی انسان اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرکے، تکبر کے ذریعے اور غلط دعویٰ کرکے اپنی کمی اور نقائص کی تلافی کرنا چاہے یا اپنی خواہش سے دوسرے کو مقہور اور ذلیل کرنا چاہے۔ یہ معنی قرآن کی بہت سی آیات میں آیا ہے کبھی اسے دیگر قابلِ مذمت صفات کے ہمراہ بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً مندرجہ بالا آیت میں "عنید" کے ساتھ مل کر آیا ہے

سورہ مریم آیہ ۳۲ میں پیغمبر خدا حضرت عیسیٰ کی زبانی آیا ہے کہ:

ولم یجعلنی جبارا شقیا

اور خدا نے مجھے جبار وشقی قرار نہیں دیا۔

یا بنی اسرائیل کے حالات میں بیت المقدس کے ظالم ساکنین کے بارے میں ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا:

ان فیھا قوما جبارین

اس سرزمین پر ظالم اور ستم پیشہ قوم رہتی ہے (مائدہ-۲۲)۔

کبھی یہی لفظ "جبار" انہی دونوں مادوں سے مدح کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس حوالے سے "جبار" اسے کہا جاتا ہے جو لوگوں کی حاجات اور نقائص کی تلافی کرتا ہو۔ اسی طرح اسے جو ٹوٹوں کو جوڑتا ہو یا یہ کہ اتنی بے پناہ قدرت کا مالک ہو کہ اس کا غیر اس کے سامنے خاضع اور ذلیل ہو لیکن وہ کسی پر ظلم نہ کرنا چاہے یا اپنی قدرت سے سوء استفادہ نہ کرنا چاہے۔ اسی بناء پر جب "جبار" اس معنی میں ہو تو دوسری صفات مدح ساتھ ہوتی ہیں جیسا کہ سورہ حشر کی آیہ ۲۳ میں ہے:

الملک القدوس السلام المؤمن المھیمن العزیز الجبار المتکبر

وہ پاک ومنزہ فرمانروا ہے کہ جس سے اس کے بندے کبھی ظلم نہیں دیکھتے اور نگہبان و حافظ ہے، ناقابل شکست ہے، قدرتمند ہے اور برتر ہے۔

واضح ہے کہ قدوس، سلام اور مومن جیسی صفات کبھی صورت "جبار" بمعنی "ظالم" اور "متکبر" بمعنی "اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والا" سے مناسبت نہیں رکھتیں۔ یہ عبارت اچھی طرح سے نشاندہی کرتی ہے کہ یہاں "جبار" دوسرے معنی میں ہے۔

بعض حضرات نے چونکہ "جبار" کے صرف کچھ مواقع استعمال نگاہ میں رکھے ہیں اور اس کے لغوی اور متعدد معانی پر غور نہیں کیا لہٰذا ان کا خیال یہ ہے کہ اس لفظ کا خدا کے لیے استعمال صحیح نہیں ہے۔ یہی صورت ان کے نزدیک لفظ "متکبر" کی ہے، لیکن اس کے اصل لغوی مفہوم کو نظر میں رکھنے سے اعتراض برطرف ہو جاتا ہے۔[1]

زیر بحث آخری آیت جہاں حضرت ہودؑ اور قوم عاد کی داستان ختم ہو رہی ہے ان کے برے اور نادرست اعمال کا نتیجہ یوں بیان کیا گیا ہے: وہ ان کے اعمال کی وجہ سے اس دنیا میں ان پر لعنت و نفرین ہوئی اور ان کے مرنے کے بعد ان کے برے کام اور رسوا کن تاریخ کے سوا ان کی کوئی چیز باقی نہ رہی (واتبعوا فی ھذہ الدنیا لعنۃ) اور قیامت کے دن کہا جائے گا کہ جان لو! قوم عاد نے اپنے پروردگار کا انکار کیا تھا (ویوم القیامۃ

[1] کتاب تاج العروس از زبیدی اور مفردات از راغب، اور تفسیر مجمع البیان اور تفسیر المنار کا زیر بحث آیات اور سورہ حشر کی آخری آیات کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

الا ان عادًا کفروا ربهم) ۔ دُور ہو جا عاد قوم ہود رحمت پروردگار سے (الا بعدًا لعاد قوم هود)۔

باوجودیکہ لفظ ۔ عاد ۔ اس قوم کے تعارف کے لیے کافی ہے لیکن مندرجہ بالا آیت میں عاد کے ذکر کے بعد ۔ قوم ہود ۔ کے الفاظ بھی آئے ہیں جن سے تاکید بھی ظاہر ہوتی ہے اور اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے دلسوز پیغمبر ہودؑ کو یہ سب تکلیفیں پہنچائیں، انہیں تہمتیں دیں اور اسی بناء پر رحمت الٰہی سے دُور ہیں۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ قوم عاد تاریخ کی نگاہ میں: بعض مغربی مؤرخین جن میں اسپرینگل بھی شامل ہے نے کوشش کی ہے کہ قوم عاد کا تاریخی طور پر انکار ہی کر دیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ آثار اسلامی کے علاوہ اس کا کہیں ذکر نہیں اور انہیں کتب عہدِ قدیم (تورات وغیرہ) میں اس کا نام و نشان نہیں ملا۔ لیکن ایسے ماخذ موجود ہیں جو نشاندہی کرتے ہیں کہ قصۂ عاد عرب کے زمانۂ جاہلیت میں مشہور تھا اور قبل اسلام کے شعراء نے قوم ہود کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ یہاں تک کہ زمانۂ جاہلیت میں بلند اور مضبوط عمارتوں کی نسبت ۔ عاد ۔ کی طرف دیتے ہوئے انہیں ۔ عادی ۔ کہتے تھے۔

بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ لفظ ۔ عاد ۔ کا اطلاق دو قبیلوں پر ہوتا ہے۔ ایک قبیلہ کا تعلق تاریخ سے ہے۔ یہ جزیرہ عربستان میں زندگی گزارتا تھا۔ یہ قبیلہ ختم ہو گیا اور اس کے آثار بھی مٹ گئے۔ تاریخ بشر میں ان کی زندگی کے چند ناقابلِ اطمینان افسانوں کے اور کوئی چیز محفوظ نہیں۔ ان مؤرخین نے قرآن میں سورہ نجم آیہ ۵۰ کی تعبیر ۔ عادًا الاولیٰ ۔ کو اسی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

رہے وہ لوگ جن کا تعلق تاریخ انسانی کے دَور سے ہے تو احتمال یہ ہے کہ وہ میلادِ مسیح سے کوئی ۷۰۰ سال قبل یا اس سے بھی پہلے تھے۔ اس قوم کو بھی عاد کہتے تھے۔ یہ قوم سرزمین احقاف یا یمن میں رہتی تھی۔ یہ طویل القامت، قوی جسم اور طاقتور لوگ تھے۔ اس وجہ سے وہ بڑے جنگجو سمجھے جاتے تھے۔

علاوہ ازیں ان لوگوں نے تمدن و ثقافت میں بہت ترقی کی۔ یہ لوگ آباد شہروں، سرسبز زمینوں اور شاداب باغات کے مالک تھے۔ جیسا کہ قرآن ان کی توصیف میں کہتا ہے:

التی لم یخلق مثلها فی البلاد۔

ان کی نظیر دنیا کے دیگر شہروں میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ (فجر - ۸)

اسی بناء پر بعض مستشرقین نے کہا ہے کہ قوم عاد برہوت کے علاقہ میں زندگی بسر کرتی تھی (یہ علاقہ حضرموت یمن کے نواح میں ہے) اور آتش فشانیوں کی وجہ سے ان میں سے بہت سے لوگ ختم ہو گئے اور باقی اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔

بہرحال یہ قوم ایک عرصہ تک ناز و نعمت میں زندگی بسر کرتی رہی لیکن جیسا کہ زیادہ تر ناز و نعمت میں پلنے والے لوگوں کا شیوہ ہے، وہ غرور و غفلت میں مست ہو گئے اور دوسروں پر ظلم و ستم ڈھا کر اور استعماری ہتھکنڈے اختیار کر کے انہوں نے اپنی طاقت سے غلط فائدہ اٹھایا، متکبرین اور جبارین عنید کو انہوں نے اپنا پیشوا بنایا، دین بت پرستی کو رائج کیا اور اپنے پیغمبر حضرت ہودؑ کی پند و نصیحت اور ان کے تفکرات و افکار واضح کرنے اور ان کے لیے کی گئی اتمام حجت کی سعی و کاوش کو انہوں نے نہ صرف ذرہ بھر کوئی حیثیت نہ دی بلکہ اس عظیم مردِ حق طلب کی آواز خاموش کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

کبھی انہیں دیوانگی اور حماقت سے نسبت دی اور کبھی اپنے خداؤں کے غضب سے انہیں ڈرایا لیکن آپ پہاڑ کی طرح اس مغرور اور طاقتور قوم کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔ آخرکار تقریباً چار ہزار افراد کو آپ نے پاکباز بنایا اور انہیں اپنے دینِ حق کی طرف لے آئے لیکن دوسرے لوگ اپنی ہٹ دھرمی اور عناد پر باقی رہے۔

جیسا کہ سورہ ذاریات، حاقہ اور قمر میں آئے گا، آخرکار بہت شدید اور تباہ کن طوفان سات راتیں اور چھ دن ان پر مسلط رہا۔ اس طوفان نے ان کے محلات برباد کر دیئے اور ان کی لاشیں خزاں کے پتوں کی طرح ہوا کی تیز لہروں نے اِدھر اُدھر بکھیر دیں۔ سچے مومنین کو پہلے ہی وہاں سے نکال لیا گیا تھا۔ خدا تعالیٰ نے انہیں نجات دی اور ان کی زندگی تمام جابروں اور خود سروں کے لیے ایک عظیم درسِ عبرت قرار پائی۔[1]

۲۔ **قوم عاد پر ابدی لعنت:** یہ تعبیر اور ایسی دیگر تعبیرات مختلف اقوام کے لیے قرآن کی کئی ایک آیات میں آئی ہیں۔ ان اقوام کے کچھ حالات بیان فرما کر اس طرح سے فرمایا گیا ہے، مثلاً:

أَلَا بُعْدًا لِّثَمُودَ (ہود - ۶۸)

أَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُودُ (ہود - ۹۵)

فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (مومنون - ۴۱)

فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ (مومنون - ۴۴)

اور اسی طرح حضرت نوحؑ کی داستان میں ان کی قوم کے بارے میں ہم پڑھ چکے ہیں:

وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (ہود - ۴۴)

ان تمام آیات میں نفرین ایک طرح سے رحمتِ خدا سے دُوری کی علامت ہے، ان لوگوں کیلئے جنہوں نے بہت بڑے بڑے گناہ انجام دیئے ہیں۔

آج بھی بالکل اسی طرح سرکش، استعمارگر، ستم پیشہ افراد اور گروہوں کے خلاف نعرے لگائے جاتے ہیں البتہ یہ قرآنی شعار اس قدر مؤثر اور جامع ہیں کہ جو صرف ایک پہلو کے حامل نہیں ہیں کیونکہ جب ہم کہتے ہیں کہ

---

[1] تفسیر المیزان، تفسیر مجمع البیان اور کتاب اعلام القرآن۔

۔ فلاں گروہ دُور ہو ۔ تو اس میں رحمتِ الٰہی سے دُوری بھی شامل ہے، سعادت سے دُوری بھی، ہر قسم کی خیر و برکت اور نعمت سے دُوری بھی اور بندگانِ خدا سے دُوری بھی ۔ البتہ ان کا خیر و سعادت سے دُور ہونا ردِ عمل ہے ان کے خدا اور خلقِ خدا سے روحانی، فکری اور عملی طور پر اندرونی اعتبار سے دُور ہونے کا، کیونکہ ہر قسم کا نظریہ اور عمل موت کے بعد دوسرے گھر میں اور دوسرے جہان میں اپنا عکس رکھتا ہے جو بالکل اس کے مشابہ ہے ۔ اس بنا پر اس جہان کی دُوریاں آخرت میں خدا کی رحمت، عفو، بخشش اور نعمات سے دُوری کا سرچشمہ ہیں [1]

---

[1] مندرجہ بالا آیت میں لفظ "بعدا" ترکیب نحوی کے اعتبار سے جملہ "ابعدھم اللہ" کا مفعول مطلق ہے اور یہ جملہ مقدر ہے ۔ البتہ قاعدتاً "بعدا" کی بجائے "ابعادا" ہونا چاہیئے کیونکہ "اَبْعَدَ" کا مصدر "ابعاد" ہے لیکن بعض اوقات مفعول مطلق ذکر کرتے وقت باب افعال کے مصدر کی بجائے ثلاثی مجرد کا مصدر لے آتے ہیں مثلاً،

والله انبتكم من الارض نباتاً (غور کیجئے گا)

(۶۱) وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ○

ترجمہ

(۶۱) (قوم) ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی پرستش کرو کہ جس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں۔ وہی ہے جس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور اس کی آبادکاری تمہارے سپرد کی۔ اس سے بخشش طلب کرو، پھر اس کی طرف توبہ کرو اور رجوع کرو کہ میرا پروردگار (اپنے بندوں کے) نزدیک اور (ان کے تقاضوں کو) قبول کرنے والا ہے۔

تفسیر

قوم ثمود کی داستان شروع ہوتی ہے

قوم عاد کے حالات اپنے تمام تر عبرت انگیز درس کے ساتھ بطور اختصار تمام ہوئے۔ اب قوم ثمود کی باری ہے۔ تواریخ کے مطابق یہ قوم مدینہ اور شام کے درمیان وادی القریٰ میں رہتی تھی۔ یہاں ہم پھر دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید جب ان کے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تو انہیں «بھائی» کے طور پر یاد کرتا ہے۔ یہ کتنی عمدہ، مؤثر اور خوبصورت تعبیر ہے۔ اس کے بعض مطالب کی طرف ہم نے گزشتہ آیات کے ذیل میں اشارہ کیا ہے۔ دردِ دل رکھنے والا مہربان بھائی کہ جو خیرخواہی کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔ ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ (و الی ثمود اخاھم صالحا)۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت صالح کا اصول لائحہ عمل بھی دیگر انبیاء جیسا ہے۔ وہ لائحہ عمل جس کا آغاز توحید سے اور ہر قسم کے شرک اور بت پرستی کی نفی سے ہوتا ہے۔ وہ شرک اور بت پرستی جو انسان کی تمام

مشکلات کا نتیجہ ہے۔

• اس نے کہا: اے میری قوم! خدا کی پرستش کرو کہ جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے (قال یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہ)۔

اس کے بعد ان میں حق شناسی کی تحریک پیدا کرنے کے لیے انہیں پروردگار کی اہم نعمتیں کہ جو ان کے بارے وجود پر محیط ہیں کا ایک حصہ یاد دلایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ ایسی ذات ہے جس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا ہے (ھو انشأکم من الارض)۔

بے قدر و قیمت خاک کہاں اور یہ وجود عالی اور بدیع وعمدہ خلقت کہاں۔ کیا کوئی عقل اجازت دیتی ہے کہ انسان ایسے خالق و پروردگار کو جو یہ قدرت رکھتا ہے اور جس نے یہ نعمت بخشی ہے اسے چھوڑ کر ان تمسخر آمیز بتوں کے پیچھے جاتے۔

نعمت خلقت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد زمین میں موجود دوسری نعمتیں سرکش انسان کو یاد دلائی گئی ہیں وہ ایسی ذات ہے جس نے زمین کی تعمیر اور آبادکاری تمہارے سپرد کی ہے اور اس کے وسائل اور ذرائع تمہیں بخشے ہیں (واستعمرکم فیھا)۔

لفظ "استعمار" اور "اعمار" لغت عرب میں دراصل زمین کی آبادکاری کسی کو سپرد کر دینے کے معنی میں ہے اور یہ بات طبیعی و فطری ہے کہ اس کا لازمہ ہے کہ ضروری وسائل بھی اسے مہیا کیے جائیں۔ یہ وہ چیز ہے کہ جو ارباب لغت مثلاً راغب نے مفردات اور دوسرے بہت سے مفسرین نے مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں کہی ہے۔

آیت کے معنی میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ خدا نے تمہیں طولانی عمر دی ہے۔ البتہ متون لغت کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلا معنی زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

بہرحال یہ امر دونوں معانی کے لحاظ سے قوم ثمود کے بارے میں صادق آتا ہے کیونکہ ان کی آباد اور سرسبز و شاداب زمین اور پُرنعمت باغات بھی تھے۔ یہ لوگ زراعت میں نئی نئی ایجادات کرتے تھے اور بہت محنت صرف کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ان کی عمریں لمبی اور قوی جسم تھے۔ مضبوط عمارتیں بنانے میں بھی انہوں نے بہت ترقی کی تھی۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ

پہاڑوں کے وسط میں پُرامن گھر بناتے تھے۔ (حجر - ۸۲)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ خدا یہ نہیں کہتا کہ خدا نے زمین کو آباد کیا اور تمہارے اختیار میں دے دیا بلکہ کہتا ہے کہ زمین کی آبادی اور تعمیر تمہارے سپرد کر دی۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وسائل و ذرائع ہر لحاظ سے مہیا ہیں لیکن تمہیں کام اور کوشش کر کے زمین کو آباد کرنا ہے اور اس کے منابع اور ذرائع اپنے ہاتھ میں کرنا ہیں اور

کوشش کے بغیر تمہیں اپنا حصہ نہیں مل سکتا۔

اس حقیقت کے ضمن میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک قوم اور ملت کو آباد کاری کا موقع ملنا چاہیئے۔ کام اس کے سپرد کیا جانا چاہیئے اور ضروری وسائل اور ساز و سامان اس کے اختیار میں دیا جانا چاہیئے۔

۔ اب جب ایسا ہے تو اپنے گناہوں سے توبہ کرو اور خدا کی طرف رجوع کرو اور پلٹ آؤ کیونکہ پروردگار اپنے بندوں کے قریب ہے اور ان کی درخواست قبول کرتا ہے (فاستغفروہ ثم توبوا الیہ ان ربی قریب مجیب)۔

قرآن اور ہمارے زمانے کا استعمار

جیسا کہ ہم نے مندرجہ بالا آیات میں دیکھا ہے کہ خدا کے پیغمبر حضرت صالحؑ نے اپنی گمراہ قوم کی تربیت مکمل کرنے کے لیے ان سے خاک سے انسان کی عظیم خلقت اور زمین کی آباد کاری کے لیے اس کے وسائل و ذخائر اسے سپرد کیے جانے کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ یہ لفظ استعمار اگرچہ مفہوم کے اعتبار سے ایک خاص زیبائی اور کشش رکھتا ہے، اس میں تعمیر و آباد کاری کا مفہوم بھی مضمر ہے، تفویض اختیارات کا بھی اور وسائل و ذرائع مہیا ہونے کا بھی لیکن ہمارے زمانے میں اس لفظ کا مفہوم اس طرح سے مسخ ہو گیا ہے اور قرآنی مفہوم کے بالکل الٹ ہو گیا ہے۔

لفظ "استعمار" ہی نہیں جو اس منحوس انجام کو پہنچا ہے بہت سے کلمات چاہے وہ فارسی کے ہوں یا عربی کے یا دوسری زبانوں کے ہم دیکھتے ہیں کہ اسی طرح مسخ، تحریف اور تضاد کا شکار ہو گئے ہیں۔ عربی زبان کے الفاظ "حضارت"، "ثقافت" اور "حریت" اور فارسی زبان میں "تمدن"، "روشن فکری"، "آزادی"، "آزادگی"، "ہنر" اور "ہنرمندی" اسی قسم کی مثالیں ہیں۔ ان تحریفوں کے نتیجے میں خود فراموشی، مادہ پرستی، فکری و فنی انکارِ حقیقت اور ہر قسم کے گناہ کا پھیلاؤ، جہالت پسندی اور بے ترتیبی جنم لیتی ہے۔

بہر حال ہمارے زمانے میں استعمار کا حقیقی مفہوم بڑی سیاسی و صنعتی طاقتوں اور سوپر طاقتوں کا مستضعف اور کمزور قوموں پر غلبہ ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ استعماری طاقتیں مستضعف اور کمزور قوموں کے مال لوٹ مار کرتی ہیں، انہیں غارت کرتی ہیں، ان کا خون چوستی ہیں اور ان کی زندگی کے وسائل غصب کرتی ہیں۔

استعمار کے کئی روپ ہیں۔ کبھی یہ ثقافت و تہذیب کا روپ دھار لیتا ہے۔ کبھی فکری و نظری حوالے سے استعمال کرتا ہے، کبھی اقتصادی، کبھی سیاسی اور کبھی فوجی حوالے سے سامنے آتا ہے۔ یہ استعمار ہی ہے جس نے ہماری آج کی دنیا کا چہرہ تاریک کر رکھا ہے۔ آج کی دنیا میں ہر چیز پر اقلیت کا قبضہ ہے اور بہت بڑی اکثریت تمام چیزوں سے محروم ہے۔ یہ استعمار ہی جنگوں، دہشتوں، تباہ کاریوں اور اسلحہ کی کمر شکن دوڑ کا سرچشمہ ہے۔

جو لفظ قرآن نے اس مفہوم کے لیے استعمال کیا ہے وہ "استضعاف" ہے کہ جو ٹھیک اس معنی کا سانچہ ہے یعنی ضعیف کرنا۔ اس لفظ کے وسیع مفہوم میں فکری، سیاسی، اقتصادی اور دیگر حوالوں سے کمزور اور ضعیف کرنا شامل ہے۔

ہمارے زمانے میں استعمار کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ خود لفظ استعمار بھی استعماری ہو گیا ہے کیونکہ اس کا لغوی مفہوم بالکل الٹ گیا ہے۔

بہرحال استعمار کے حوالے سے ایک غم انگیز طویل داستان وجود میں آئی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس داستان میں پوری انسانی تاریخ سمائی ہوئی ہے۔ اگرچہ استعمار ہمیشہ چہرہ بدلتا رہتا ہے لیکن صحیح طور پر معلوم نہیں کہ انسانی معاشرے میں سے کب اس کی ریشہ کنی ہوگی اور کب انسانی زندگی باہمی تعاون و احترام اور اصول امداد باہمی کی بنیاد پر استوار ہوگی تاکہ تمام میدانوں میں انسانی پیش رفت کا عمل شروع ہو سکے۔

(۶۲) قَالُوا يَا صَالِحُ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَٰذَا أَتَنْهَانَا أَنْ نَعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِنَّنَا لَفِي شَكٍّ مِمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ○

(۶۳) قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَآتَانِي مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ عَصَيْتُهُ فَمَا تَزِيدُونَنِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ ○

(۶۴) وَيَا قَوْمِ هَٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيبٌ ○

(۶۵) فَعَقَرُوهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ذَٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوبٍ ○

ترجمہ

(۶۲) انہوں نے کہا: اے صالح! اس سے پہلے تو ہماری امید کا سرمایہ تھا۔ کیا تو ہمیں ان کی پرستش سے روکتا ہے جن کی ہمارے آباؤ اجداد پرستش کرتے تھے اور ہمیں اس چیز کے بارے میں شک ہے جس کی طرف تو دعوت دیتا ہے۔

(۶۳) اس نے کہا: اے میری قوم! کیا میں اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہوں اور اس کی رحمت بھی میرے شامل حال ہو (تو میں اس کی پیغام رسانی سے روگردانی کر سکتا ہوں)؟ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو اس کے مقابلہ میں کون میری مدد کر سکتا

ہے۔ لہٰذا تمہاری باتیں سوائے تمہارے زیاں کار ہونے کے بارے میں میرے اطمینان کے میرے لیے اور کوئی اضافہ نہیں کرتیں۔

(۶۴) اے میری قوم! یہ ناقۂ خدا ہے جو تمہارے لیے دلیل اور نشانی ہے۔ اسے چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں چرنے میں مشغول رہے اور اسے کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ ورنہ تمہیں بہت جلد خدا کا عذاب گھیر لے گا۔

(۶۵) (لیکن) انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں اور اس نے ان سے کہا (تمہاری مہلت کا وقت ختم ہو گیا ہے) تین دن تک اپنے گھروں میں فائدہ اٹھا لو (اس کے بعد خدائی عذاب آجائے گا) یہ ایسا وعدہ ہے کہ جس میں جھوٹ نہیں ہوگا۔

تفسیر

اب ہم دیکھیں گے کہ حضرت صالحؑ کے مخالفین ان کی زندہ اور حقیقت پسندانہ منطق کا کیسا جواب دیتے ہیں۔

انہوں نے حضرت صالحؑ کو غیر مؤثر بنانے کے لیے یا کم از کم ان کی باتوں کو بے تاثیر کرنے کے لیے ایک نفسیاتی حربہ استعمال کیا۔ وہ آپ کو دھوکا دینا چاہتے تھے وہ کہنے لگے، اے صالح! اس سے پہلے تو ہماری امیدوں کا سرمایہ تھا۔ مشکلات میں ہم تیری پناہ چاہتے تھے، تجھ سے مشورہ کرتے تھے، تیرے عقل و شعور پر ایمان رکھتے تھے، اور تیری خیر خواہی اور ہمدردی میں ہمیں ہرگز کوئی شک نہ تھا (قالوا یا صالح قد کنت فینا مرجوا قبل ھذا)۔

لیکن افسوس کہ تم نے ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ دین بت پرستی کی اور ہمارے خداؤں کی مخالفت کر کے کہ جو ہمارے بزرگوں کا رسم و رواج تھا اور ہماری قوم کے افتخارات میں سے تھا تو نے ظاہر کر دیا کہ تو بزرگوں کے احترام کا قائل ہے نہ ہماری عقل پر تمہیں کوئی اعتماد ہے اور نہ ہی تو ہمارے طور طریقوں کا حامی ہے۔ کیا سچ مچ تو ہمیں ان کی پرستش سے روک دینا چاہتا ہے جن کی عبادت ہمارے آباؤ اجداد کرتے تھے۔ (اتنھانا ان نعبد ما یعبد آباؤنا)۔

حقیقت یہ ہے کہ جس یکتا پرستی کے دین کی طرف تو دعوت دیتا ہے ہم اس کے بارے میں شک و تردد

میں ہیں، نہ صرف ہمیں شک ہے بلکہ اس کے بارے میں ہم بدگمان بھی ہیں (وانّنا لفی شکّ ممّا تدعونا الیہ مریب)۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ گمراہ قوم اپنے غلط اور نادرست افکار و اعمال کی توجیہ کے لیے اپنے بڑوں کا سہارا لیتی ہے ان کے تقدس کے ہالہ میں چھپنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ وہی پرانی منطق ہے جو تمام منحرف قوموں نے قدیم زمانے سے اپنے خرافات کی توجیہ کے لیے اختیار کی۔ یہی منطق آج بھی ایٹم اور خلاء کے دور میں پوری قوت سے باقی ہے۔

لیکن خدا کے یہ عظیم پیغمبر ان کی ہدایت سے مایوس نہ ہوتے اور اُن کی پُرفریب باتوں کا ان کی عظیم روح پہ ذرہ برابر اثر نہ ہوا۔ انہوں نے اپنی مخصوص قناعت کے ساتھ انہیں جواب دیا۔ کہا: اے میری قوم! دیکھو اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہوں اور اس کی رحمت میرے شامل حال ہو، اور اس نے میرے دل کو روشن اور فکر کو بیدار کیا ہو اور میں ایسے حقائق سے آشنا ہوا ہوں جن سے پہلے آشنا نہ تھا تو کیا پھر بھی میں سکوت اختیار کر سکتا ہوں اور کیا اس صورت میں میں پیغام الٰہی نہ پہنچاؤں اور انحراف اور برائیوں کے خلاف جنگ نہ کروں (قال یا قوم أرئیتم ان کنت علی بیّنۃ من ربّی واٰتانی منہ رحمۃ ...)۔ اس عالم میں اگر میں فرمانِ خدا کی مخالفت کروں تو کون شخص ہے جو اس کے عذاب و سزا کے مقابلے میں میری مدد کر سکتا ہے (فمن ینصرنی من اللّٰہ ان عصیتہ)۔ لیکن جان لو کہ تمہاری اس قسم کی باتیں اور بڑوں کی روش سے استدلال وغیرہ کا مجھ پر اس کے سوا اور کوئی اثر نہیں ہوگا کہ تمہارے زیاں کار ہونے کے بارے میں میرا ایمان بڑھے گا (فما تزیدوننی غیر تخسیر)۔

اس کے بعد آپ نے اپنی دعوت کی حقانیت کے لیے معجزے اور نشانی کے لیے نشاندہی کی۔ ایسی نشانی جو انسانی قدرت سے ماوراء ہے اور صرف قدرت الٰہی کے سہارے پیش کی گئی ہے۔ ان سے کہا: "اے میری قوم! یہ ناقۃ الٰہی تمہارے لیے آیت اور نشانی ہے" (ویا قوم ھذہ ناقۃ اللّٰہ لکم اٰیۃ)۔ "اسے چھوڑ دو کہ یہ بیابانوں چراگاہوں میں گھاس پھوس کھائے" (فذروھا تأکل فی ارض اللّٰہ)۔ "اور اسے ہرگز کوئی تکلیف نہ پہنچانا۔ اگر ایسا کرو گے تو فوراً تمہیں دردناک عذاب الٰہی گھیر لے گا" (ولا تمسوھا بسوء فیأخذکم عذاب قریب)۔

ناقۂ صالح

لغت میں "ناقۃ" اونٹنی کے معنی میں ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں اور قرآن کی بعض دیگر آیات میں اس کی اضافت خدا کی طرف سے کی گئی ہے[1] یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ یہ اونٹنی کچھ خصوصیات رکھتی تھی۔ اس طرف

---

[1] ادبی اصطلاح میں یہ ایک تشریفی اضافت ہے جو کسی چیز کے شرف اور اہمیت کی دلیل ہے۔ مندرجہ بالا کلمہ میں اس کے دو نمونے نظر آتے ہیں "ناقۃ اللّٰہ" اور "ارض اللّٰہ" دیگر مواقع پر "شہر اللّٰہ" اور "بیت اللّٰہ" وغیرہ آئے ہیں۔

توجہ کرتے ہوئے کہ مندرجہ بالا آیت میں اس کا ذکر آیت الٰہی اور دلیل حقانیت کے طور پر آیا ہے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اونٹنی ایک عام اونٹنی نہ تھی اور ایک حوالے سے یا کئی حوالوں سے معجزہ کے طور پر تھی۔ لیکن آیات میں یہ مسئلہ تفصیل کے ساتھ نہیں آیا کہ اس ناقہ کی خصوصیات کیا تھیں۔ اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی عام اونٹنی نہ تھی۔

بس یہی ایک چیز قرآن میں دو مواقع پر موجود ہے کہ حضرت صالحؑ نے اس ناقہ کے بارے میں اپنی قوم کو بتایا کہ اس علاقے میں پانی کی تقسیم ہونا چاہیئے۔ ایک دن پانی ناقہ کا حصّہ ہے اور ایک دن لوگوں کا۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں:

هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (شعراء - ۱۵۵)

نیز سورہ قمر کی آیہ ۲۸ میں:

وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ

سورہ شمس میں بھی اس امر کی طرف اشارہ موجود ہے:

فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيَاهَا (شمس - ۱۳)

لیکن یہ بات پوری طرح مشخص نہیں ہو سکی کہ پانی کی یہ تقسیم کس طرح خارق عادت تھی۔ ایک احتمال یہ ہے کہ وہ اونٹنی بہت زیادہ پانی پیتی تھی اس طرح سے کہ چشمے کا تمام پانی اس کے لیے مخصوص ہو جاتا۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ جس وقت وہ پانی پینے کے لیے آتی تو دوسرے جانور پانی پینے کی جگہ پر آنے کی جرأت نہ کرتے۔

ایک سوال یہ ہے کہ یہ جانور تمام پانی سے کس طرح استفادہ کرتا تھا۔ اس سلسلے میں یہ احتمال ہے کہ اس بستی کا پانی کم مقدار میں ہو جیسے بعض بستیوں میں ایک ہی چھوٹا سا چشمہ ہوتا ہے اور بستی والے مجبور ہوتے ہیں کہ دن بھر کا پانی ایک گڑھے میں اکٹھا کریں تاکہ کچھ مقدار جمع ہو جائے اور اسے استعمال کیا جا سکے۔

لیکن دوسری طرف سورہ شعراء کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود مختصر سے پانی والے علاقے میں زندگی بسر نہیں کرتی تھی۔ بلکہ وہ لوگ تو باغوں، چشموں، کھیتوں اور نخلستان کے مالک تھے۔ قرآن کہتا ہے:

اتتركون في ما ههنا امنين ٭ في جنات وعيون ٭ وزروع
ونخل طلعها هضيم ٭ (شعراء - ۱۴۶ تا ۱۴۸)

بہرحال جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ ناقہ صالح کے بارے میں اس مسئلے پر قرآن نے اجمالاً ذکر کیا ہے لیکن بعض روایات جو شیعہ اور سنی دونوں طرق سے نقل ہوئی ہیں میں ہے کہ اس ناقہ کے عجائب خلقت میں سے تھا کہ وہ پہاڑ کے اندر سے باہر نکلی۔ اس کے بارے میں کچھ اور خصوصیات بھی منقول ہیں جن کی توضیح کا یہ موقع نہیں ہے۔

ہر کیف حضرت صالحؑ جیسے عظیم نبی نے اس ناقہ کے بارے میں بہت سمجھایا بجھایا مگر انہوں نے آخرکار

ناقہ کو ختم کر دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ کیونکہ اس کی خارقِ عادت اور غیر معمولی خصوصیات کی وجہ سے لوگوں میں بیداری پیدا ہو رہی تھی اور وہ حضرت صالحؑ کی طرف مائل ہو رہے تھے لہٰذا قوم ثمود کے کچھ سرکشوں نے جو حضرت صالحؑ کی دعوت کے اثرات کو اپنے مفادات کے خلاف سمجھتے تھے اور وہ ہرگز لوگوں کی بیداری نہیں چاہتے تھے کیونکہ خلقِ خدا کی بیداری سے ان کے استعماری اور استثماری مفادات کو نقصان پہنچتا تھا، ناقہ کو ختم کرنے کی سازش تیار کی۔ کچھ افراد کو اس کام پر مامور کیا گیا۔ آخرکار ان میں سے ایک نے ناقہ پر حملہ کیا اور اس پر ایک یا کئی وار کیے اور اسے مار ڈالا (فعقروھا)۔

"عقروھا" "عقر" (بروزن ظلم) کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے کسی چیز کی اساس اور جڑ۔ "عقرۃ البعیر" کا معنی ہے "میں نے اونٹ کا سر قلم کر دیا اور اسے نحر کر دیا" اونٹ کو قتل کرنا چونکہ اس کے اصل وجود کو ختم کر دینے کا سبب بنتا ہے لہٰذا یہ مادہ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کبھی نحر کرنے کی بجائے اونٹ کی کونچیں کاٹنے یا اس کے ہاتھ پاؤں قطع کرنے کے معنی میں بھی لیا گیا ہے، دراصل ان تمام معانی کی بازگشت ایک ہی چیز کی طرف ہے اور ان سب کا ایک ہی نتیجہ ہے (غور کیجئے گا)۔

مکتب کا رشتہ

یہ امر توجہ طلب ہے کہ اسلامی روایات میں ہے جس نے ناقہ کو مارا تھا وہ صرف ایک شخص تھا لیکن اس کے باوجود قرآن اس کام کی نسبت حضرت صالحؑ کے تمام مخالفین کی طرف دیتا ہے اور جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے کہتا ہے: "فعقروھا"۔

یہ اس بناء پر ہے کہ قرآن کسی امر پر باطنی طور پر راضی ہونے اور اس کے مکتبی رشتے کو اس میں شرکت سمجھتا ہے۔ درحقیقت اس کام کی سازش انفرادی نہ تھی۔ یہاں تک کہ جس نے اس پر عمل کیا تھا اس نے فقط اپنی قوت کے سہارے ایسا نہیں کیا تھا بلکہ اس کے پیچھے جمعیت کی طاقت تھی اور وہی اسے حوصلہ دے رہی تھی۔ یقیناً ایسے کام کو انفرادی قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ یہ ایک گروہی اور جماعتی کام شمار ہوگا۔

امیرالمومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

وانما عقر ناقة ثمود رجل واحد فعمهم الله بالعذاب لما عموه بالرضا

ناقہ صالح کو ایک شخص نے قتل کیا تھا۔ خدا نے تمام سرکش قوم کو عذاب کیا کیونکہ وہ سب اس پر راضی تھے۔[1]

---

[1] نہج البلاغہ۔ کلام ۲۰۱۔

اسی مضمون کی یا اس کی مانند متعدد دیگر روایات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہلبیت علیہم السلام سے منقول ہیں۔ ان سے اسلام کے نزدیک مکتبی رشتے اور فکری ہم آہنگی کی بنیاد پر چلنے والے پروگراموں کی بہت زیادہ اہمیت واضح ہوتی ہے۔ نمونہ کے طور پر ان روایات کا کچھ حصہ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:

قال رسول اللہ (ص)

من شهد امراً فكرهه كان كمن غاب عنه، ومن غاب عن امر فرضيه كان كمن شهده۔

جو شخص کسی کام کو دیکھے لیکن اس سے متنفر ہو تو وہ اس شخص کی طرح ہے جو اس سے غائب ہو اور جو کسی کام سے غائب ہو لیکن دلی طور پر اس پر راضی ہو تو وہ اس شخص کی طرح ہے جو اس وقت حاضر تھا اور اس میں شریک تھا۔[1]

امام علی ابن موسیٰ رضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

لو ان رجلا قتل فی المشرق فرضی بقتله رجل بالمغرب لكان الراضی عند الله عزوجل شريك القاتل۔

جب کوئی شخص مشرق میں قتل ہو اور ایک شخص مغرب میں رہتے ہوئے اس کے قتل پر راضی ہو تو خدا کے ہاں وہ قاتل کا شریک ہے۔[2]

حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

الراضی بفعل قوم كالداخل معهم فيه وعلى كل داخل فی باطل اثمان اثم العمل به واثم الرضا به۔

جو شخص کسی گروہ کے فعل پر راضی ہو وہ اس شخص کی طرح ہے جو اس کام میں ان کا شریک ہو لیکن جس نے عملاً شرکت کی ہے اس کے دو گناہ ہیں۔ ایک عمل کا گناہ اور دوسرا اس عمل پر راضی ہونے کا گناہ۔[3]

مکتبی اور فکری رشتے کی گہرائی کو جاننے کے لیے اور یہ سمجھنے کے لیے کہ اس میں زمان و مکان کی کوئی قید نہیں۔ نہج البلاغہ میں موجود حضرت علیؑ کے اس پُر معنی اور ہلا دینے والے کلام کی طرف توجہ کرنا کافی ہے:

جب حضرت امیر المؤمنینؑ نے میدان جمل میں جنگ کی آگ بھڑکانے والے باغیوں پر فتح پائی اور آپ

---

[1] وسائل الشیعہ۔ ج ۱۱ صفحہ ۴۰۹

[2] وسائل الشیعہ۔ ج ۱۱ صفحہ ۴۱۰

[3] وسائل الشیعہ۔ ج ۱۱ صفحہ ۴۱۱

کے اصحاب و انصار شرک و جاہلیت کے خلاف اسلام کی اس کامیابی پر خوش ہوئے تو ان میں سے ایک شخص عرض کرنے لگا:

میری کتنی خواہش تھی کہ میرا بھائی اس میدان میں موجود ہوتا اور وہ بھی دشمن پر آپ کی کامیابی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا۔

امام نے اس کی طرف رُخ کیا اور فرمایا:

اھوی اخیک معنا ؟

یہ بتاؤ کہ کیا تمہارے بھائی کا دل اور آرزو ہمارے ساتھ تھی ؟

فقال نعم

اُس نے عرض کیا: جی ہاں

تو امامؑ نے فرمایا:

فقد شھدنا

(فکر نہ کرو) وہ بھی اس میدان میں شریک تھا۔

اس کے بعد آپؑ نے مزید فرمایا:

ولقد شھدنا فی عسکرنا ھٰذا اقوام فی اصلاب الرجال وارحام النساء سیرعف بھم الزمان و یقوی بھم الایمان۔

تجھے اس سے بھی بڑھ کر بتاؤں۔ آج ہمارے لشکر میں ان گروہوں نے بھی شرکت کی ہے جو ابھی اپنے باپوں کی صلب اور ماؤں کے رحم میں ہیں (اور ابھی انہوں نے اس دنیا میں قدم نہیں رکھا) لیکن وقت گزرنے کے ساتھ عنقریب وہ دنیا میں آئیں گے اور ان کی قوت و طاقت سے قوتِ ایمان میں اضافہ ہوگا۔[1]

اس میں شک نہیں کہ جو لوگ کسی کام میں شریک ہوتے ہیں اور اس کی تمام مشکلات و زحمات کو برداشت کرتے ہیں وہ ایک خاص امتیاز کے حامل ہیں لیکن اس کا معنی یہ نہیں کہ دوسرے بالکل اس میں شریک نہیں ہوتے بلکہ کیا اس زمانے میں اور کیا آئندہ زمانوں میں جو اشخاص بھی فکر و نظر اور مکتب و مذہب کے اعتبار سے اس کام سے منسلک ہیں وہ ایک لحاظ سے اس میں شریک ہیں۔

یہ مسئلہ شاید کسی عالمی مکتب میں اپنی نظیر و مثیل نہ رکھتا ہو۔ جو کہ ایک اہم اجتماعی حقیقت کی بنیاد پر استوار ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ طرزِ فکر میں دوسروں سے مشابہت رکھتے ہیں اگرچہ ان کے انجام دیئے ہوئے کسی معین

1۔ نہج البلاغہ۔ کلام ۱۲۔

کام میں شریک نہ ہوں تاہم یقینی طور اپنے ماحول اور زمانے میں اس سے ملتے جلتے کام انجام دیں گے کیونکہ انسان کے اعمال ہمیشہ اس کے افکار کا پرتو ہوتے ہیں۔ ممکن نہیں کہ انسان کسی مکتب کا پابند ہو اور وہ اس کے عمل میں واضح نہ ہو۔

اسلام پہلے قدم پر ہی روح انسانی میں اصلاحات جاری کرتا ہے تاکہ مرحلۂ عمل کی خود بخود اصلاح ہو جائے۔ جو دستور ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے اس کے مطابق جب ایک مسلمان کو پتہ چلتا ہے کہ فلاں نیک یا بد کام انجام پا رہا ہے تو اس کے بارے میں فوراً ایک صحیح موقف اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ اپنے قلب و روح کو نیکیوں کا ہم نوا بناتا ہے اور برائی سے نفرت کرتا ہے، یہ اندرونی کاوش یقیناً اس کے اعمال پر اثرانداز ہوگی اور اس کا فکری تعلق ایک عملی رشتے کی صورت میں نمودار ہو جائے گا۔

آیت کے آخر میں ہے کہ حضرت صالحؑ نے قوم کی سرکشی، نافرمانی اور اس کے ناقہ کے قتل کے بعد اسے خطرے سے آگاہ کیا اور ـ کہا کہ پورے تین دن تک اپنے گھروں میں جس نعمت سے چاہو استفادہ کرو اور جان لو کہ ان تین دنوں کے بعد عذاب الٰہی آکے رہے گا" (فقال تمتعوا فی دارکم ثلثة ایام)۔
• اس بات کو حتمی سمجھو، میں جھوٹ نہیں کہہ رہا یہ ایک سچا اور حقیقی وعدہ ہے" (ذالک وعد غیر مکذوب)۔

(۶۶) فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّيۡنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَمِنۡ خِزۡىِ يَوۡمِئِذٍ‌ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الۡقَوِىُّ الۡعَزِيۡزُ ○

(۶۷) وَاَخَذَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوا الصَّيۡحَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دِيَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ ○

(۶۸) كَاَنۡ لَّمۡ يَغۡنَوۡا فِيۡهَا‌ ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوۡدَا۟ كَفَرُوۡا رَبَّهُمۡ‌ ؕ اَلَا بُعۡدًا لِّثَمُوۡدَ ○

ترجمہ

(۶۶) جب (اس قوم کی سزا کے بارے میں) ہمارا حکم آپہنچا تو صالح اور اس پر ایمان لانے والوں کو ہم نے اپنی رحمت کے ذریعے (اس دن کی رسوائی سے نجات بخشی) کیونکہ تیرا پروردگار قوی اور ناقابلِ شکست ہے۔

(۶۷) اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انہیں (آسمانی) صیحہ نے آلیا اور وہ اپنے ہی گھروں میں منہ کے بل گر کر مر گئے۔

(۶۸) اس طرح سے کہ گویا وہ ان گھروں کے باسی ہی نہ تھے۔ جان لو کہ قوم ثمود نے اپنے پروردگار کا انکار کیا تھا۔ دُور ہو قوم ثمود (رحمتِ پروردگار سے)۔

تفسیر

قوم ثمود کا انجام

ان آیات میں اس سرکش قوم (قوم ثمود) پر تین دن کی مدت ختم ہونے پر نزولِ عذاب کی کیفیت بیان کی گئی ہے: اس گروہ پر عذاب کے بارے میں جب ہمارا حکم آپہنچا تو صالح اور اس پر ایمان لانے والوں کو ہم نے

اپنی رحمت کے زیر سایہ نجات بخشی (فلما جاء امرنا نجینا صالحاً والذین اٰمنوا معہ برحمۃ منا)۔

انہیں نہ صرف جسمانی و مادی عذاب سے نجات بخشی بلکہ ۔ رسوائی، خواری اور بے آبروئی سے بھی انہیں نجات عطا کی کہ جو اس روز اس سرکش قوم کو دامنگیر تھی (ومن خزی یومئذ)[1]

کیونکہ تیرا پروردگار ہر چیز پر قادر اور ہر کام پر تسلط رکھتا ہے ۔ اس کے لیے کچھ محال نہیں ہے اور اس کے ارادے کے سامنے کوئی طاقت کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی (ان ربک ھو القوی العزیز)۔ لہٰذا کثیر جمعیت کے عذاب الٰہی میں مبتلا ہونے سے صاحب ایمان گروہ کو کسی قسم کی کوئی مشکل اور زحمت پیش نہیں ہوگی۔ یہ رحمت الٰہی ہے جس کا تقاضا ہے کہ بے گناہ گنہگاروں کی آگ میں نہ جلیں اور بے ایمان افراد کی وجہ سے مومنین گرفتار بلا نہ ہوں ۔

لیکن ظالموں کو صیحۂ آسمانی نے گھیر لیا ۔ اس طرح سے کہ یہ چیخ نہایت سخت اور وحشت ناک تھی ۔ اس کے اثر سے وہ سب کے سب گھروں ہی میں زمین پر گر کر مر گئے (واخذ الذین ظلموا الصیحۃ فاصبحوا فی دیارھم جاثمین)۔

وہ اس طرح مرے اور نابود ہوئے اور ان کے آثار مٹے کہ گویا وہ اس سرزمین میں کبھی رہتے ہی نہ تھے (کأن لم یغنوا فیھا)۔

جان لو کہ قوم ثمود نے اپنے پروردگار سے کفر کیا تھا اور انہوں نے احکام الٰہی کو پس پشت ڈال دیا تھا (الا ان ثمود کفروا ربھم)۔

دُور ہو قوم ثمود اللہ کے لطف و رحمت سے اور ان پر لعنت ہو (الا بعداً لثمود)۔

چند اہم نکات

۱۔ **مومنین کے لیے رحمتِ الٰہی:** ان آیات میں ہم پھر دیکھتے ہیں کہ رحمت الٰہی مومنین پر اس قدر مہربان ہے کہ نزول عذاب سے پہلے خدا تعالیٰ انہیں امن و امان کی جگہ منتقل کر دیتا ہے اور ہر خشک و تر کو عذاب اور سزا میں مبتلا نہیں کرتا ۔

البتہ ممکن ہے کہ حوادث ناگوار مثلاً سیلاب ، وبائی بیماریاں اور زلزلے وغیرہ ایسا رُخ اختیار کر لیں کہ ہر چھوٹے بڑے کو اپنی لپیٹ میں لے لیں لیکن یہ حوادث یقینی طور پر عذاب الٰہی کے حوالے سے نہیں ہوتے ورنہ عدالت الٰہی کی منطق میں محال ہے کہ ایک بھی بے گناہ شخص لاکھوں گناہ گاروں کے ساتھ جرم میں گرفتار ہو ۔

یہ بات البتہ پورے طور پر ممکن ہے کہ کچھ افراد ایک گنہگار جماعت میں رہتے ہوئے خاموش رہیں اور

---

[1] ۔ خزی ۔ لغت میں شکست کے معنی میں ہے کہ جو انسان پر آتی ہے ۔ چاہے خود اس کے اپنے ذریعہ ہو یا کسی دوسرے کی وجہ سے نیز ہر قسم کی رسوائی اور بہت زیادہ ذلت بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے ۔

وہ بُرائی کے خلاف مقابلے کے بارے میں اپنی ذمہ داری پوری نہ کریں اور وہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں لیکن اگر وہ اپنی ذمہ داری پر عمل کریں تو پھر محال ہے کہ وہ حادثہ جو عذاب کے طور پر نازل ہو انہیں دامنگیر ہو۔ (خداشناسی سے مربوط مباحث میں نزولِ بلا اور حوادث کے مابین رابطے کے حوالے سے ہم نے اس موضوع سے متعلق کتب میں تفصیلی بحث کی ہے)[1]

۲۔ "صیحۃ" سے کیا مراد ہے: "صیحۃ" لغت میں "بہت بلند آواز" کو کہتے ہیں جو عام طور پر کسی انسان یا جانور کے منہ سے نکلتی ہے لیکن اس کا مفہوم اسی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی نہایت بلند آواز اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

آیاتِ قرآنی کے مطابق چند ایک گنہگار قوموں کو صیحۂ آسمانی کے ذریعے سزا ہوئی۔ ان میں سے ایک یہی قوم ثمود تھی، دوسری قوم لوط (حجر - ۷۳) اور تیسری قوم شعیب (ہود - ۹۴)۔

قرآن کی دوسری آیات سے قوم ثمود کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ اسے صاعقہ کے ذریعے سزا ہوئی۔ ارشادِ الٰہی ہے:

فان اعرضوا فقل انذرتکم صاعقة مثل صاعقة عاد و ثمود (فصلت - ۱۳)۔

یہ چیز نشاندہی کرتی ہے کہ "صیحۃ" سے مراد "صاعقہ" کی دہشتناک آواز ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا صاعقہ کی دہشت ناک آواز کسی جمعیت کو نابود کر سکتی ہے؟ اس کا جواب مسلماً مثبت ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ آواز کی لہریں جب ایک معین حد سے گزر جائیں تو وہ شیشے کو توڑ دیتی ہیں، یہاں تک کہ بعض عمارتوں کو تباہ کر دیتی ہیں اور انسانی بدن کے اندر کے آرگانزم کو بیکار کر دیتی ہیں۔

ہم نے سنا ہے کہ جب ہوائی جہاز صوتی دیوار توڑ دیتے ہیں (اور آواز کی لہروں سے تیز رفتار سے چلتے ہیں) تو کچھ لوگ بے ہوش ہو کر گر جاتے ہیں یا عورتوں کے حمل ساقط ہو جاتے ہیں یا ان علاقوں میں موجود عمارتوں کے تمام شیشے ٹوٹ جاتے ہیں۔

فطری اور طبیعی ہے کہ اگر آواز کی لہروں کی شدت اس سے بھی زیادہ ہو جائے تو آسانی سے ممکن ہے کہ اعصاب میں، دماغ کی رگوں میں اور دل کی دھڑکن میں تباہ کن اختلال پیدا ہو جائے جو انسانوں کی موت کا سبب بن جائے۔

آیاتِ قرآنی کے مطابق اس دنیا کا اختتام بھی ایک عمومی صیحہ کے ذریعے ہوگا۔ ارشادِ الٰہی ہے:

مَا يَنْظُرُونَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ (یٰس - ۴۹)۔

جیسا کہ قیامت بھی ایک بیدار کرنے والی صیحہ سے شروع ہوگی۔ قرآن کہتا ہے:

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ (یٰس - ۵۳)

---

[1] تفسیر نمونہ ج ۲ ص ۱۱۲ (اردو ترجمہ) پر بھی کچھ توضیحات آئی ہیں جو ایسی آیات سے فہم مقصود کے لیے مؤثر ہیں۔ قارئین کرام! اس سلسلے میں کتاب "آفریدگار جہان" اور "در جستجوی خدا" کی طرف رجوع فرمائیں۔

۳۔ سزا صرف مادی پہلو سے نہیں : زیر بحث آیات سے اچھی طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکشوں اور طغیان گروں کی سزا صرف مادی پہلو نہیں رکھتی بلکہ معنوی پہلو کی یہی حال ہے کیونکہ ان کا رسوا کن انجام اور درگبار سرنوشت کا تذکرہ تاریخ کا رسوا کر دینے والا باب بن جائے گا جبکہ اہل ایمان کا ذکر تاریخ میں سنہری حروف میں رقم ہوگا۔

۴۔ "جاثمین" کا مفہوم : "جاثم" مادہ "جثم" (بروزن "خشم") سے گھٹنوں کے بل بیٹھنے کے معنی میں ہے۔ اسی طرح منہ کے بل گرنے کے معنی میں بھی آیا ہے[1]

"جاثمین" کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ صیحۂ آسمانی ان کی موت کا سبب بنی لیکن ان کے بے جان جسم زمین پر گرے پڑے رہے۔ البتہ چند ایک روایات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صاعقہ کی آگ نے انہیں جلا کر خاکستر کر دیا لیکن یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں کیونکہ صدائے صاعقہ کا وحشتناک اثر فوراً ظاہر ہو جاتا ہے جبکہ اس کے جلانے کے آثار خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو عمارتوں کے اندر ہوں، بعد میں ظاہر ہوتے ہیں۔

۵۔ "یغنوا" کا مطلب : "یغنوا" "غنی" کے مادہ سے کسی مکان میں اقامت کے معنی میں ہے اور بعید نہیں کہ "غنا" کا اصل مفہوم بے نیازی کے معنی سے لیا گیا ہو کیونکہ بے نیاز شخص مستقل گھر رکھتا ہے اور وہ مجبور نہیں ہوتا کہ ایک گھر سے دوسرے میں منتقل ہوتا رہے۔

جملہ "کأن لم یغنوا فیہا" قوم ثمود اور اسی طرح قوم شعیب کے لیے آیا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی زندگی کا دفتر اس طرح سے لپیٹ دیا گیا کہ گویا وہ اس سرزمین میں رہتے ہی نہ تھے۔

---

[1] اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ ج ۲ ص ۱۶۳ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

(۶۹) وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ○

(۷۰) فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ○

(۷۱) وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ○

(۷۲) قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ○

(۷۳) قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ○

ترجمہ

(۶۹) ہمارے بھیجے ہوئے بشارت لے کر ابراہیم کے پاس آئے۔ کہا: سلام۔ (اس نے بھی کہا: سلام اور زیادہ دیر نہ لگی کہ (ان کے لیے) بھنا ہوا گوسالہ لے آیا۔

(۷۰) (لیکن) جب اس نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھتے (اور وہ اسے نہیں کھاتے) تو انہیں ناپسند کیا اور دل میں احساس خوف کیا (مگر) انہوں نے اس سے (جلد ہی) کہا: ڈریئے نہیں ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔

(۷۱) اور اس کی بیوی کھڑی تھی وہ ہنسی تو ہم نے اسے اسحاق کی اور اس کے بعد یعقوب

کی بشارت دی ۔

(۷۲) اس نے کہا: وائے ہو مجھ پر، کیا میں بچہ جنوں گی جبکہ میں بوڑھی عورت ہوں اور میرا یہ شوہر بھی بوڑھا ہے، یہ تو واقعاً عجیب بات ہے ۔

(۷۳) انہوں نے کہا کیا حکم خدا پر تعجب کرتی ہو، یہ خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں تم اہل بیت پر کیونکہ خدا حمید اور مجید ہے ۔

تفسیر

ابراہیم بت شکن کی زندگی کے کچھ حالات

اب ابراہیم جیسے بہادر بت شکن کی زندگی کے کچھ حالات کی باری ہے ۔

البتہ اس عظیم پیغمبر کی بھرپور زندگی کے بارے میں زیادہ تفصیل قرآن کی دوسری سورتوں میں آئی ہے ۔ مثلاً سورہ بقرہ، آل عمران، نساء، انعام اور انبیاء وغیرہ ۔ یہاں ان کی زندگی کا صرف ایک حصہ ذکر ہوا ہے جو قوم لوط کے واقعہ سے اور اس سرکش گناہ آلود گروہ کو عذاب دیئے جانے سے مربوط ہے ۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس ایک بشارت لے کر آئے" (ولقد جاءت رسلنا ابراھیم بالبشرٰی) ۔

جیسا کہ بعد کی آیات سے معلوم ہوگا کہ یہ خدا کے بھیجے ہوئے وہی فرشتے تھے جو قوم لوط کو تباہ و برباد کرنے پر مامور تھے لیکن پہلے وہ حضرت ابراہیمؑ کے پاس ایک پیغام دینے آئے تھے ۔

اس بارے میں کہ وہ کون سی بشارت لے کر آئے تھے، دو احتمالات ہیں اور ان دونوں کو جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے ۔

پہلا احتمال یہ ہے کہ وہ حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کی بشارت تھی کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کی ایک طویل عمر گزر چکی تھی ۔ ابھی تک ان کی کوئی اولاد نہ تھی ۔ ان کی آرزو تھی کہ ان کا ایک یا کئی بیٹے ہوں جو صاحب نبوت ہوں ۔ اس لیے حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش کی خبر ان کیلئے ایک عظیم بشارت تھی ۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ قوم لوط کے فساد اور سرکشی سے بہت ناراحت تھے جب انہیں معلوم ہوا کہ فرشتے ان کے بارے میں یہ حکم لئے ہیں تو انہیں راحت ہوئی ۔

بہرحال جب بھیجے ہوئے (رسولان) ان کے پاس آئے تو انہوں نے سلام کہا (قالوا سلاماً) اس نے

بھی ان کے جواب میں سلام کہا (قال سلام)۔

زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ان کے لیے بھنا ہوا بچھڑا لے آئے (فما لبث ان جاء بعجل حنیذ)۔

"عجل" کا معنی ہے "بچھڑا" اور "گوسالہ" اور "حنیذ" کا معنی ہے "بھنا ہوا"۔ بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ "حنیذ" ہر قسم کے بھنے ہوئے کو نہیں کہتے بلکہ صرف اسی گوشت کو کہتے ہیں جو پتھروں کے اوپر رکھا جائے اور اس کے اطراف میں آگ روشن کی جائے لیکن آگ اس تک نہ پہنچے اور وہ خستہ اور بھنا ہوا ہو جائے۔

اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہمان نوازی کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ جتنا جلدی ہو سکے مہمان کیلئے کھانا تیار کیا جائے کیونکہ مہمان جب کہیں سے آتا ہے خصوصاً اگر مسافر ہو تو عموماً تھکا ماندا اور بھوکا ہوتا ہے۔ اسے کھانے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور آرام کی بھی لہٰذا جلدی سے اس کے لیے کھانا تیار کیا جانا چاہیئے تاکہ وہ پھر آرام کر سکے۔

ہو سکتا ہے بعض تنقید کریں کہ چند مہمانوں کے لیے ایک بچھڑا زیادہ ہے لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اوّل تو مہمانوں کی تعداد قرآن نے صراحت سے بیان نہیں کی اور ان کی تعداد میں اختلاف ہے بعض نے تین، بعض نے چار، بعض نے نو اور بعض نے گیارہ افراد لکھے ہیں اور اس سے زیادہ کا بھی احتمال ہے۔ دوسرا یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کے پیروکار اور دوست احباب بھی تھے اور کارکن اور جان پہچان والے بھی اور یہ معمول ہے کہ بعض اوقات مہمان کے آنے پر مہمان کی ضرورت سے کئی گنا زیادہ کھانا تیار کیا جاتا ہے اور سب اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

لیکن اس موقع پر ایک عجیب واقعہ پیش آیا اور وہ یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے دیکھا کہ نو وارد کھانے کی طرف ہاتھ ہی نہیں بڑھاتے۔ یہ صورت ان کے لیے بالکل نئی تھی۔ اس بناء پر آپ کو ان سے اجنبیت کا احساس ہوا اور یہ معاملہ ان کی وحشت و پریشانی کا باعث بنا (فلما راٰ ایدیھم لا تصل الیہ نکرھم و اوجس منھم خیفۃ)۔

اس امر کا سرچشمہ ایک دیرینہ روایت ہے جو آج تک ان قوموں میں پائی جاتی ہے جو گزشتہ اچھی روایات کی پابند رہتی ہیں اور وہ یہ کہ اگر کوئی شخص دوسرے کا کھانا کھالے یعنی اس کا نان و نمک کھائے تو اس کے بارے میں کوئی بُرا ارادہ نہیں کرتا۔ لہٰذا اگر کوئی واقعاً کسی کے بارے میں بُرا ارادہ رکھتا ہو تو کوشش کرتا ہے کہ اس کا نان و نمک نہ کھائے۔ اس لیے حضرت ابراہیمؑ کو ان مہمانوں کے بارے میں شک ہوا اور سوچا کہ ہو سکتا ہے یہ کوئی بُرا ارادہ رکھتے ہوں۔

ان "رسولوں" کو یہ مسئلہ معلوم ہو گیا تو انہوں نے جلدی سے حضرت ابراہیمؑ کا شک دور کر دیا اور "اس سے کہا: مت ڈریں ہم خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں" اور ایک ظالم قوم کو عذاب کرنے پر مامور ہیں اور فرشتے غذا نہیں کھاتے (قالوا لا تخف انا ارسلنا الیٰ قوم لوط)۔

اس موقع پر ابراہیم کی بیوی (سارہ) جو وہاں کھڑی تھی ہنسی (وامرأته قائمة فضحكت)۔

شاید وہ اس لیے ہنسی ہوں کہ وہ بھی قوم لوط کے کرتوتوں سے سخت ناراحت اور پریشان تھیں اور ان کی سزا نزدیک ہونے کا سن کر خوش ہوئیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ وہ تعجب بلکہ وحشت کے باعث ہنسی ہوں کیونکہ ہنسی صرف مسرت کے لمحات کیلئے مخصوص نہیں بلکہ کا ہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان شدت وحشت و تکلیف پر ہنستا ہے۔ عربوں کی مشہور ضرب المثل ہے:

شر الشدائد ما یضحك

بدترین مشکلات وہ ہیں جو انسان کو ہنسا دیں۔

یا ہو سکتا ہے وہ اس بنا پر ہنسی ہوں کہ کھانا موجود ہے لیکن نووارد مہمان ہاتھ کیوں نہیں بڑھاتے۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ وہ بیٹے کی خوشخبری پر ہنسی تھیں اگرچہ ظاہر آیت اس تفسیر کی نفی کرتی ہے کیونکہ اسحاق کی بشارت انہیں اس ہنسنے کے بعد دی گئی ہے ہاں البتہ اگر یہ کہا جائے کہ پہلے انہوں نے ابراہیمؑ کو بشارت دی ہو۔ سارا نے یہ بات سن لی ہو اور وہ اس احتمال پر خوش ہوئی ہوں کہ ان سے ابراہیمؑ کا فرزند ہوگا۔

لیکن انہوں نے تعجب کیا کہ کیا اس سن و سال میں ممکن ہے کہ ایک بوڑھی عورت اپنے بوڑھے شوہر کے بچے کو جنم دے۔ لہٰذا انہوں نے تعجب سے ان سے سوال کیا اور انہوں نے صراحت سے کہا: جی ہاں! یہ بچہ تجھی سے ہوگا۔ سورہ ذاریات کی آیات میں غور کرنے سے اس معنی کی تائید ہوتی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بعض مفسرین کا اصرار ہے کہ یہاں پر "ضحکت" "ضحك" (بروزن "درک") کے مادہ سے عورتوں کے ماہواری کے معنی میں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسی وقت سارہ کو دوبارہ ماہواری شروع ہو گئی جبکہ پہلے ختم ہو چکی تھی اور وہ حدِ یاس کو پہنچ چکی تھیں اور یہ ماہواری بچے کی پیدائش کے امکان کی نشانی ہے۔ لہٰذا انہوں نے سارہ کو اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت دی تو پھر انہوں نے مسئلے کو پوری طرح باور کیا۔ ان مفسرین نے اس بات سے استدلال کیا ہے کہ لغت عرب میں کہا جاتا ہے:

ضحکت الارانب

یعنی۔ خرگوشوں کی ماہواری شروع ہو گئی ہے۔

لیکن مختلف پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ احتمال بعید معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ:

اولاً یہ نہیں سنا گیا کہ یہ مادہ لغت عرب میں انسان کے بارے میں استعمال ہوا ہو۔ اسی لیے راغب نے مفردات میں جب یہ معنی ذکر کیا ہے تو صراحت سے کہا ہے کہ یہ لفظ "فضحکت" کی تفسیر نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال کیا ہے بلکہ اس لفظ کا معنی ہنسنا ہی ہے لیکن ہنستے ہوئے اسے ماہواری بھی شروع ہو گئی اور یہ دونوں چیزیں آپس میں خلط ملط ہو گئیں۔

ثانیاً اگر یہ لفظ ایام ماہواری شروع ہونے کے بارے میں ہو تو پھر سارہ کو اس کے بعد اسحاق کی بشارت پر

تعجب نہیں کرنا چاہیئے تھا کیونکہ اس حالت میں بچہ جننا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ حالانکہ اسی آیت کے بعد والے جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف تعجب کیا بلکہ پکار کر کہا کہ وائے ہو مجھ پر کیا ممکن ہے کوئی بوڑھی عورت بچہ جنے؟

بہر حال یہ احتمال آیت کی تفسیر سے بہت بعید نظر آتا ہے۔

قرآن مزید کہتا ہے: اس کے بعد ہم نے اسے بشارت دی کہ اس سے اسحاق پیدا ہوگا اور اسحاق کے بعد اسحاق سے یعقوب ہوگا (فبشرناها باسحٰق و من وراء اسحٰق یعقوب)۔

درحقیقت انہیں بیٹے کی بشارت بھی دی گئی اور پوتے کی بھی، ایک اسحاق اور دوسرا یعقوب' جو دونوں انبیاء خدا میں سے تھے۔

ابراہیمؑ کی بیوی سارہ جو اپنی اور اپنے شوہر کی زیادہ عمر کی وجہ سے بچے کی پیدائش سے بہت مایوس اور ناامید ہو چکی تھی۔ بڑے تعجب آمیز لہجے میں پکاری: اے وائے ہو مجھ پر کیا میں بچہ جنوں گی جبکہ میں بوڑھی ہوں اور میرا شوہر بھی بوڑھا ہے، یہ بہت ہی عجیب معاملہ ہے (قالت یا ویلتیٰ ءألد و انا عجوز و هذا بعلی شیخًا ان هذا لشیء عجیب)۔

وہ حق بجانب تھی کہ تعجب کرتی کیونکہ اول تو سورہ ذاریات کی آیہ ۲۹ کے مطابق وہ جوانی میں ہی بانجھ تھی اور ثانیاً جس روز اسے یہ خوشخبری دی گئی مفسرین کے بقول اور تورات کے سفر تکوین کے مطابق وہ نوے سال یا اس سے بھی زیادہ عمر کی تھی اور اس کے شوہر ابراہیمؑ اس وقت تقریباً سو سال یا اس سے بھی زیادہ عمر کے تھے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ سارہ نے اپنے بڑھاپے سے بھی استدلال کیا اور اپنے شوہر کے بڑھاپے سے بھی حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ عورتوں کو عام طور پر پچاس سال کی عمر سے خون حیض بند ہو جاتا ہے جو کہ بچہ جننے کے قابل ہونے کی نشانی ہے۔ یہ عادت منقطع ہو جاتی ہے تو پھر اس کے بعد ان سے بچہ پیدا ہونے کا احتمال بہت کم رہ جاتا ہے لیکن طبی تجربات نشاندہی کرتے ہیں کہ مردوں میں باپ ہونے کے لیے نطفے کی صلاحیت زیادہ عمر میں بھی باقی رہتی ہے لیکن اس سوال کا جواب واضح ہے کہ اگرچہ مردوں میں اس کا امکان باقی رہتا ہے لیکن بہر صورت ان کے بارے میں بھی بہت زیادہ سن میں یہ احتمال کمزور پڑ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ حجر کی آیہ ۵۴ کے مطابق اس بشارت پر خود حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بڑھاپے کی وجہ سے تعجب کیا۔

علاوہ ازیں نفسیاتی طور پر بھی شاید سارہ نہیں چاہتی تھی کہ جرم ضعیفی فقط اپنی گردن پر لے لے۔

بہرحال خدا کے بھیجے ہوؤں نے فوراً اسے اس تعجب سے نکالا اور اس خاندان پر خدا تعالیٰ کی جو پہلے سے بہت زیادہ نعمتیں رہی ہیں اور جس طرح سے خدا انہیں حوادث کے چنگل سے معجزانہ طور پر نجات دلاتا رہا ہے اسے یاد دلایا اور اس سے کہا: کیا فرمان خدا پر تعجب کرتی ہو (قالوا اتعجبین من امر الله)۔ حالانکہ خدا کی رحمت اور اس کی برکات تم اہل بیت پر تھیں اور ہیں (رحمة الله و برکاته علیکم اهل البیت)۔ وہی خدا جس نے ابراہیمؑ کو نمرود

جیسے ظالم کے چنگل سے نجات بخشی اور آگ میں اسے صحیح و سالم رکھا۔ وہ خدا جس نے بہادر بت شکن ابراہیم کو جبکہ اس نے تن تنہا طاغوتوں پر حملہ کیا ہمت، طاقت، استقامت اور عقل و دانائی عطا کی یہ رحمت و فیضان الٰہی صرف اس روز اور اس دور کے لیے نہ تھا بلکہ اس خاندان پر اسی طرح جاری و ساری تھا اور ہے۔ پیغمبر اسلام اور آئمہ اہلبیت سے بڑھ کر خدا کی کیا برکت ہوگی جو کہ اسی خاندان میں ظہور پذیر ہوئے۔

یہاں مفسرین نے استدلال کیا ہے کہ انسان کی بیوی بھی "اہل بیت" کے مفہوم میں داخل ہے، اور یہ لفظ اولاد اور ماں باپ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ یہ استدلال صحیح ہے بلکہ اگر یہ آیت نہ بھی ہوتی تو لفظ "اہل" کے مفہوم کے لحاظ سے یہ معنی درست ہے لیکن کوئی مانع نہیں کہ کچھ لوگ اہل بیت پیغمبر کا حصہ ہوں لیکن الگ مکتب و مذہب پر کاربند ہونے کی وجہ سے روحانی اعتبار سے اور معنوی لحاظ سے اہل بیت سے خارج ہو جائیں۔

(اس کی مزید تشریح انشاء اللہ سورہ احزاب کی آیہ ۳۳ کے ذیل میں آئے گی)۔

آیت کے آخر میں۔ فرشتوں نے زیادہ تاکید کیلئے کہا: "وہ ایسا خدا ہے جو حمید اور مجید ہے" (انہ حمید مجید)۔

دراصل پروردگار کی ان دو صفات کا ذکر گزشتہ جملے کی دلیل ہے کیونکہ "حمید" اسے کہتے ہیں جس کے اعمال قابل تعریف ہوں۔ خدا کا یہ نام اس کی فراواں نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو وہ اپنے بندوں پر روا رکھتا ہے کہ جن کے جواب میں وہ اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔ نیز "مجید" اسے کہتے ہیں جو استحقاق سے پہلے ہی نعمت بخشتا ہے۔ کیا وہ خدا جو ان صفات کا حامل ہے اس سے عجیب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے خاندان کو ایسی نعمت (یعنی آبرومند اولاد) عطا فرما دے۔

ۓ ممکن ہے "ورحمۃ اللہ و برکاتہ علیکم" جملۂ خبریہ ہو اور اس مقام پر یہ بھی امکان ہے کہ یہ دعائیہ پہلو رکھتا ہو لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۷۴ فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرٰهِيمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ ۝

۷۵ إِنَّ إِبْرٰهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ ۝

۷۶ يٰٓإِبْرٰهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۖ إِنَّهُ قَدْ جَآءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ وَإِنَّهُمْ آتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ ۝

ترجمہ

۷۴ جب ابراہیم کا خوف جاتا رہا اور اسے بشارت مل گئی تو ہمارے ساتھ قوم لوط کے بارے میں جھگڑنے لگا۔

۷۵ کیونکہ ابراہیم بردبار، ہمدرد اور (خدا کی طرف) بازگشت کرنے والا تھا۔

۷۶ اے ابراہیم! اس سے صرف نظر کرلے کہ تیرے پروردگار کا فرمان آپہنچا اور (خدا کا) عذاب قطعی طور پر ان پر آئے گا اور وہ پلٹ نہیں سکتا۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابراہیم بہت جلد نووارد مہمانوں کے بارے میں جان گئے کہ وہ خطرناک دشمن نہیں بلکہ پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں اور خود انہی کے بقول ایک ذمہ داری کی انجام دہی کیلئے قوم لوط کی طرف جارہے ہیں۔

ان کی طرف سے جب ابراہیم کی پریشانی ختم ہو گئی اور ساتھ ہی انہیں صاحب شرف فرزند اور جانشین کی بشارت مل گئی تو فوراً وہ قوم لوط کی فکر میں پڑ گئے جن کی تباہی پر وہ فرشتگان مامور تھے وہ اس سلسلے میں ان سے جھگڑنے لگے اور بات چیت کرنے لگے (فلما ذهب عن ابراهيم الروع وجاءته البشرى يجادلنا فى قوم لوط)۔[1]

---

[1] "روع" (بروزن "نوع") خوف و وحشت کے معنی میں ہے اور "روع" (بروزن "قرع") روح یا جان کے اس حصے کے معنی میں ہے جو خوف و وحشت کے نزول کا مرکز ہے (قاموس اللغت کی طرف رجوع کریں)۔

ممکن ہے یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ حضرت ابراہیمؑ ایک آلودہ گناہ قوم کے بارے میں کیوں گفتگو کے لیے کھڑے ہوگئے اور پروردگار کے ان رسولوں کے ساتھ کہ جو فرمانِ خدا سے مامور تھے، جھگڑنے لگے (یہی وجہ ہے کہ "یجادلنا" کی تعبیر استعمال ہوئی یعنی ہم سے مجادلہ کرتے رہے) حالانکہ ایسا ایک پیغمبر کی شان سے اور وہ بھی ابراہیمؑ جیسے باعظمت پیغمبر سے بعید ہے۔

اسی لیے قرآن فوراً بعد والی آیت میں کہتا ہے: ابراہیمؑ بردبار، بہت مہربان، خدا پر توکل کرنے والا اور اس کی طرف بازگشت کرنے والا ہے (ان ابراھیم لحلیم اواہ منیب)[1]

دراصل ان تین لفظوں میں مذکورہ سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ابراہیمؑ کے لیے ان صفات کا ذکر نشاندہی کرتا ہے کہ ان کا مجادلہ اور جھگڑنا ممدوح اور قابلِ تعریف ہے۔ یہ اس لیے کہ ابراہیمؑ پر یہ واضح نہیں تھا کہ خدا کی طرف سے عذاب کا قطعی فرمان صادر ہو چکا ہے۔ انہیں احتمال تھا کہ اس قوم کی نجات کے لیے ابھی امید کی کرن باقی ہے اور ابھی احتمال ہے کہ وہ بیدار ہو جائے لہٰذا ابھی شفاعت کا موقع باقی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ سزا اور عذاب میں تاخیر کے خواستگار ہوئے کیونکہ وہ حلیم اور بردبار تھے، وہ بہت مہربان بھی تھے اور ہر موقع پر خدا کی طرف رجوع کرنے والے بھی تھے۔

لہٰذا یہ جو بعض نے کہا کہ اگر ابراہیمؑ کا مجادلہ خدا کے ساتھ تھا تو اس کا کوئی معنی نہیں ہے اور اگر اس کے بھیجے ہوئے فرشتوں کے ساتھ تھا تو وہ بھی اپنی طرف سے کوئی کام انجام نہیں دے سکتے تھے اس لیے یہ مجادلہ کسی صورت میں صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک قطعی حکم کے مقابلے میں تو بات نہیں ہو سکتی لیکن غیر قطعی فرامین، شرائط و کوائف میں تبدیلی کی صورت میں بدلے جا سکتے ہیں کیونکہ ان میں بازگشت اور رجوع کی راہ بند نہیں ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں ایسے فرامین مشروط ہوتے ہیں نہ کہ مطلق۔

باقی رہا یہ احتمال کہ یہاں مجادلہ مومنین کی نجات کے لیے تھا تو یہاں سورہ عنکبوت کی آیہ ۳۱ اور ۳۲ سے اشتباہ ہوا ہے جہاں فرمایا گیا ہے:

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۚ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۭ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۔

جب ہمارے رسول بشارت لے کر ابراہیم کے پاس آئے تو کہا: ہم اس بستی (قوم لوط کا شہر) والوں کو ہلاک کر دیں گے کیونکہ اس کے باسی ظالم ہیں۔ ابراہیم نے کہا: وہاں تو لوط رہتا ہے۔ انہوں نے کہا: ہم وہاں رہنے والوں سے بہت آگاہ ہیں۔ اسے اور اس کے خاندان کو ہم نجات دیں گے سوائے اس کی بیوی کے کہ جو قوم میں ہی رہے گی۔

---

[1] "حلیم" "حلم" سے ہے۔ اس کا معنی ہے ایک مقدس ہدف تک پہنچنے کے لیے بردباری اختیار کرنا اور "اواہ" اصل میں اس شخص کے معنی میں ہے جو بہت آہیں بھرتا ہو چاہے اپنی ذمہ داریوں کے خوف سے یا لوگوں کو گھیرے ہوئے مشکلات و مصائب کی وجہ سے اور "منیب" "انابہ" کے مادہ سے رجوع اور بازگشت کرنے کے معنی میں ہے۔

یہ احتمال صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ بعد والی آیت سے کسی طرح مناسبت نہیں رکھتا، جس کے بارے میں ابھی ہم بحث کریں گے۔

بعد والی آیت میں ہے: رسولوں نے فوراً ابراہیم سے کہا: اے ابراہیم! اس تجویز سے صرف نظر کرو اور شفاعت رہنے دو کیونکہ یہ اس کا موقع نہیں (یا ابراهیم اعرض عن هٰذا) کیونکہ تیرے پروردگار کا حتمی اور یقینی فرمان آپہنچا ہے (انه قد جاء امر ربك) اور خدا کا عذاب بلا کلام ان پر آکر رہے گا (و انهم اٰتیهم عذاب غیر مردود)۔

• ربك (تیرا رب) — یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ یہ عذاب نہ صرف یہ کہ انتقامی حوالے سے نہیں تھا بلکہ اس کا سرچشمہ پروردگار کی صفت ربوبیت ہے جو بندوں کی تربیت و پرورش اور اجتماع انسانی کی اصلاح کی نشانی ہے۔

یہ جو بعض روایات میں ہے کہ ابراہیمؑ نے خدا کے رسولوں سے کہا: اگر قوم میں سو مومن افراد ہوئے تو پھر بھی ہلاک نہیں کرو گے؟ اس پر انہوں نے کہا: نہیں۔ ابراہیمؑ نے پوچھا: اگر پچاس افراد ہوئے؟ تو وہ کہنے لگے: نہیں۔ پوچھا: اگر تیس ہوئے؟ وہ بولے: نہیں۔ کہا اگر دس ہوئے؟۔ وہ کہنے لگے: نہیں۔ پوچھا: اگر پانچ ہوتے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ یہاں تک پوچھا کہ اگر ایک شخص بھی ان میں صاحب ایمان ہوا؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے کہا: یقیناً لوطؑ ان کے درمیان ہیں۔ انہوں نے جواب دیا: ہم خوب جانتے ہیں اُسے اس کی بیوی کے سوا اس کے خاندان کو ہم نجات دیں گے۔[1]

یہ روایت کسی طرح اس بات کی دلیل نہیں کہ مجادلہ سے مراد یہ گفتگو تھی بلکہ یہ گفتگو تو مومنین کے بارے میں تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے جو گفتگو کفار کے بارے میں کی وہ اس سے جدا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ سورہ عنکبوت کی مذکورہ آیات بھی اس تفسیر کے منافی نہیں ہیں (غور کیجئے گا)۔

---

[1] تفسیر برہان، ج ۲، ص ۲۲۶۔

(۷۷) وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّ قَالَ هٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ ○

(۷۸) وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ یُهْرَعُوْنَ اِلَیْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ قَالَ یٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ ؕ اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ ○

(۷۹) قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ ○

(۸۰) قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ ○

ترجمہ

(۷۷) جب ہمارے رسول لوط کے پاس آئے تو وہ ان کے آنے سے ناراحت ہوا اور اس کا دل پریشان ہوا اور کہا کہ آج کا دن سخت ہے۔

(۷۸) اور اس کی قوم جلدی سے اس کے پاس آئی اور وہ پہلے سے بُرے کام انجام دیتی تھی۔ اس نے کہا: اے میری قوم! یہ میری بیٹیاں ہیں جو تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں (ان سے ازدواج کرو اور بُرے اعمال چھوڑ دو)، خدا سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کے بارے میں رُسوا نہ کرو۔ کیا تمہارے درمیان کوئی مرد رشید نہیں ہے؟

(۷۹) وہ کہنے لگے: تُو جانتا ہے کہ ہم تیری بیٹیوں کے لیے حق (اور میلان) نہیں رکھتے اور

تو اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔

(۸۰) کہا (افسوس) اے کاش! میں تمہارے مقابلے میں طاقت رکھتا یا کوئی محکم سہارا اور مددگار مجھے میسّر ہوتا (تو اس وقت میں دیکھتا کہ تم جیسے بُرے لوگوں سے کیا سلوک کروں)۔

تفسیر

قومِ لُوط کی شرمناک زندگی

سورہ اعراف کی آیات میں قوم لوط کی سرگزشت کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس کی تفسیر ہم وہاں پیش کر چکے ہیں۔ یہاں انبیاء اور ان کی قوموں کی داستانوں کا سلسلہ جاری ہے۔ اسی مناسبت سے گزشتہ کچھ آیات حضرت لوطؑ اور ان کی قوم کی سرگزشت سے تعلق رکھتی تھیں۔ زیر نظر آیات میں اس گمراہ اور منحرف قوم کی زندگی کے ایک اور حصے سے پردہ اٹھایا گیا ہے تاکہ سارے انسانی معاشرے کی نجات و سعادت کے اصلی مقصد کو ایک اور زاویے سے پیش کیا جائے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے، جب ہمارے رسول لوط کے پاس آئے تو وہ ان کے آنے پر بہت ہی ناراحت اور پریشان ہوئے، ان کی فکر اور روح مضطرب ہوئی اور غم و اندوہ نے انہیں گھیر لیا (ولما جاءت رسلنا لوطا سیئ بھم وضاق بھم ذرعًا)۔

اسلامی روایات اور تفاسیر میں آیا ہے کہ حضرت لوطؑ اُس وقت اپنے کھیت میں کام کر رہے تھے اچانک انہوں نے خوبصورت نوجوانوں کو دیکھا جو اُن کی طرف آ رہے تھے۔ وہ ان کے ہاں مہمان ہونا چاہتے تھے۔ اب حضرت لوطؑ مہمانوں کی پذیرائی بھی چاہتے تھے لیکن اس حقیقت کی طرف بھی ان کی توجہ تھی کہ ایسے شہر میں جو انحراف جنسی کی آلودگی میں غرق ہے ان خوبصورت نوجوانوں کا آنا طرح طرح کے مسائل کا موجب ہے اور ان کی آبرو ریزی کا بھی احتمال ہے۔ اس وجہ سے حضرت لوطؑ سخت مشکل سے دوچار ہو گئے۔ یہ مسائل روح فرسا افکار کی صورت میں ان کے دماغ میں ابھرے اور انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے آپ سے کہنا شروع کیا، آج بہت سخت اور وحشتناک دن ہے (وقال ھٰذا یوم عصیب)۔

"سیئ" مادہ "ساء" سے ناراحت و پریشان ہونے کے معنی میں ہے۔

"ذرع" کو بعض نے دل اور بعض نے خُلق کے معنی میں لیا ہے۔ اس بناء پر "ضاق بھم ذرعًا" کا مفہوم ہے: ان کا دل یا خُلق ان بن بلائے مہمانوں کے باعث ان سخت حالات میں بہت پریشان ہوا۔

لیکن فخر رازی نے اپنی تفسیر میں ازہری سے نقل کیا ہے کہ ایسے مواقع پر "ذرع" "طاقت" کے معنی میں

ہے ۔ اور اصل میں اس کا مطلب ہے ۔ چلتے وقت اونٹ کے اگلے قدموں کے درمیان کا فاصلہ ؛

فطری اور طبیعی امر ہے کہ جب اونٹ کی پشت پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ لاد دیں تو وہ مجبوراً اپنے اگلے پاؤں کو زیادہ نزدیک کر کے رکھے گا اور چلتے وقت ان کے درمیان فاصلہ کم ہوگا ۔ اسی مناسبت سے یہ تعبیر تدریجاً کسی حادثے کی سنگینی کی وجہ سے ہونے والی ناراحتی اور پریشانی کے معنی میں استعمال ہونے لگی ۔

بعض کتب لغت مثلاً ۔ قاموس ۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعبیر ایسے مواقع پر استعمال ہوتی ہے جہاں حادثے کی شدت اتنی ہو کہ انسان کو کوئی چارہ کار سجھائی نہ دے ۔

عصیب ۔ ۔ عصب ۔ (بروزن ۔ اسپ) کے مادہ سے ہے ۔ اس کا معنی ہے کسی چیز کو ایک دوسرے سے باندھنا ۔ سخت ناراحت کرنے والے حوادث چونکہ انسان کو ایک طرح سے لپیٹ دیتے ہیں اور گویا ناراحتی سے باندھ دیتے ہیں لہٰذا اس صورت حال پر ۔ عصیب ۔ کا اطلاق ہوتا ہے ۔ نیز عرب گرم اور جلانے والے دن کو بھی ۔ یوم العصیب ۔ کہتے ہیں ۔

بہر حال حضرت لوطؑ کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اپنے نو وارد مہمانوں کو اپنے گھر لے جاتے لیکن اس بنا پر کہ وہ غفلت میں نہ رہیں راستے میں چند مرتبہ ان کے گوش گزار کر دیا کہ اس شہر میں شریر اور منحرف لوگ رہتے ہیں تاکہ اگر مہمان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو صورت حال کا اندازہ کر لیں ۔

ایک روایت میں ہے کہ خدا تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ جب تک یہ پیغمبر تین مرتبہ اس قوم کی برائی اور انحراف کی گواہی نہ دے انہیں عذاب نہ دیا جائے (یعنی ۔ یہاں تک کہ ایک گنہگار قوم سے متعلق بھی حکم خدا عدالت کے ایک عادلانہ فیصلے کی روشنی میں انجام پائے) اور ان رسولوں نے راستے میں تین مرتبہ لوطؑ کی گواہی سن لی[1]

کئی ایک روایات میں آیا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام نے مہمانوں کو اتنی دیر تک (کھیت میں) ٹھہرائے رکھا کہ رات ہو گئی تاکہ شاید اس طرح اس شریر اور آلودہ قوم کی آنکھ سے بچ کر حفظ آبرو کے ساتھ ان کی پذیرائی کر سکیں لیکن جب انسان کا دشمن خود اس کے گھر کے اندر موجود ہو تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے ۔ لوطؑ کی بیوی کہ جو ایک بے ایمان عورت تھی اور اس گنہگار قوم کی مدد کرتی تھی جب اسے ان نوجوانوں اور خوبصورت مہمانوں کے آنے کی خبر ہوئی تو چھت پر چڑھ گئی ۔ پہلے اس نے تالی بجائی پھر آگ روشن کر کے اس کے دھوئیں کے ذریعے اس نے منحرف قوم کے بعض لوگوں کو آگاہ کیا کہ لقمہ تر جال میں پھنس چکا ہے[2]

یہاں قرآن کہتا ہے کہ وہ قوم حرص اور شوق کے عالم میں اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے بڑی تیزی سے

---

[1] مجمع البیان ، مذکورہ آیت کے ذیل میں ۔

[2] المیزان ۔ ج ۱۰ ص ۳۴۲ ۔

لوطؑ کی طرف آئی (وجاءہ قومہ یھرعون الیہ)۔[1]

وہی قوم کہ جس کی زندگی کے صفحات سیاہ اور ننگ و عار سے آلودہ تھے۔ اور جو پہلے ہی سے برے اور قبیح اعمال انجام دے رہی تھی۔ (ومن قبل کانوا یعملون السیئات)۔

حضرت لوطؑ اس وقت حق رکھتے تھے کہ لرزنے لگیں اور ناراحتی و پریشانی کی شدت سے چیخ و پکار کریں، انہوں نے کہا: "میں یہاں تک تیار ہوں کہ اپنی بیٹیاں تمہارے نکاح میں دے دوں، یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں" (قال یٰقوم ھٰؤلاء بناتی ھن اطھر لکم)۔

"آؤ، اور خدا سے ڈرو، میری عزت و آبرو خاک میں نہ ملاؤ اور میرے مہمانوں کے بارے میں برا ارادہ کرکے مجھے رسوا نہ کرو" (فاتقوا اللّٰہ ولا تخزون فی ضیفی)۔

اے وائے: "کیا تم میں کوئی رشید، عقلمند اور شائستہ انسان موجود نہیں ہے" کہ جو تمہیں اس سنگین اور شرمناک عمل سے روکے (ألیس منکم رجل رشید)۔

مگر اس تباہ کار قوم نے نبی خدا حضرت لوطؑ کو بڑی بے شرمی سے جواب دیا: "تو خود اچھی طرح سے جانتا ہے کہ ہمارا تیری بیٹیوں میں کوئی حق نہیں" (قالوا لقد علمت ما لنا فی بناتک من حق)۔ "اور یقیناً تو جانتا ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں" (وانک لتعلم ما نرید)۔

یہ وہ مقام تھا کہ اس بزرگوار پیغمبر نے اپنے آپ کو ایک محاصرے میں گھرا ہوا پایا اور انہوں نے ناراحتی و پریشانی کے عالم میں فریاد کی: اے کاش! مجھ میں اتنی طاقت ہوتی کہ میں اپنے مہمانوں کا دفاع کر سکتا اور تم جیسے سرپھروں کی سرکوبی کر سکتا (قال لو ان لی بکم قوۃ)۔ یا کوئی مستحکم سہارا ہوتا، کوئی قوم و قبیلہ میرے پیروکاروں میں سے ہوتا اور میرے کوئی طاقتور ہم پیمان ہوتے کہ جن کی مدد سے تم منحرف لوگوں کا مقابلہ کرتا (او اٰوی الی رکن شدید)۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ **حضرت لوطؑ کی بیٹیاں:** جس وقت قوم لوط نے حضرت لوطؑ کے گھر پر ہجوم کیا اور وہ ان کے مہمانوں پر تجاوز کرنا چاہتے تھے اس وقت آپ نے کہا: میری بیٹیاں تمہارے لیے پاک اور حلال ہیں، ان سے استفادہ کرو اور گناہ کے گرد چکر نہ لگاؤ۔

اس جملے نے مفسرین کے درمیان بہت سے سوالات اٹھا دیئے ہیں۔

پہلا یہ کہ بیٹیوں سے مراد کیا لوطؑ کی نسبی اور حقیقی بیٹیاں تھیں۔ جبکہ تاریخ کے مطابق ان کی دو یا تین

---

[1] "یھرعون" "اھراع" کے مادہ سے شدت سے دھکیلنے کے معنی میں ہے گویا سرکش جنسی خواہش اس گمراہ قوم کو بڑی شدت سے حضرت لوطؑ کے مہمانوں کی طرف دھکیل رہی تھی۔

سے زیادہ بیٹیاں نہیں تھیں، لہٰذا انہوں نے اتنی کثیر جمعیت کے سامنے یہ تجویز کس طرح سے پیش کی۔ یا یہ کہ مراد تمام قوم اور شہر کی بیٹیاں تھیں کیونکہ معمول یہ ہے کہ قبیلے کا بزرگ قبیلے کی بیٹیوں کو اپنی بیٹیاں ہی قرار دیتا ہے۔

دوسرا احتمال ضعیف نظر آتا ہے کیونکہ خلاف ظاہر ہے اور صحیح وہی پہلا احتمال ہے اور حضرت لوطؑ یہ تجویز اس بنا پر تھی کہ ہجوم کرنے والے بستی کے چند افراد تھے نہ کہ سب کے سب۔ علاوہ ازیں وہ یہاں انتہائی قربانی کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے کہ میں یہاں تک تیار ہوں کہ گناہ کو روکنے اور اپنے مہمانوں کی عزت اور مرتبے کی حفاظت کے لیے اپنی بیٹیاں تمہارے نکاح میں دے دوں کہ شاید اس بے نظیر قربانی پر ان کے سوئے ہوئے ضمیر بیدار ہو جائیں اور وہ راہ حق کی طرف پلٹ آئیں۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت لوطؑ کی بیٹیوں جیسی با ایمان لڑکیوں کی شادی بے ایمان کفار سے جائز تھی کہ آپ نے یہ تجویز پیش کی۔

اس سوال کا جواب دو طرح سے دیا گیا ہے:

ایک یہ کہ اسلام کی طرح حضرت لوطؑ کے دین میں بھی آغاز میں اس قسم کا ازدواج حرام نہیں تھا۔

دوسرا یہ کہ حضرت لوطؑ کی مراد مشروط ازدواج تھی (یعنی۔ مشروط با ایمان) یعنی یہ میری بیٹیاں ہیں، آؤ ایمان لے آؤ تاکہ میں انہیں تمہارے نکاح میں دے دوں۔

یہاں پر معلوم ہوتا ہے نبی خدا حضرت لوطؑ پر یہ اعتراض کہ انہوں نے اپنی پاکیزہ بیٹیوں کے نکاح کی اوباش لوگوں سے تجویز کیوں کر کی، درست نہیں ہے کیونکہ ان کی پیشکش مشروط تھی اور اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انہیں ان کی ہدایت سے کس قدر لگاؤ تھا۔

۲۔ **اطہر کا مفہوم**: توجہ رہے کہ لفظ "اطہر" (پاکیزہ تر) کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ ان کا وہ بُرا اور شرمناک عمل پاک تھا اور ازدواج کرنا اس سے زیادہ پاک تھا بلکہ عربی زبان میں اور دیگر زبانوں میں ایسی تعبیر موازنے کے وقت استعمال کی جاتی ہے مثلاً اگر کوئی شخص تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا ہو تو اسے کہتے ہیں: دیر سے پہنچنا بہتر ہے بالکل نہ پہنچنے سے۔ یا مشکوک غذا نہ کھانا بہتر ہے اس سے کہ انسان اپنی جان خطرے میں ڈال دے۔

ایک روایت میں بھی ہے کہ امام علیہ السلام نے خلفاء بنی عباس کی طرف سے احساس خطر اور شدت تقیہ کے موقع پر فرمایا:

واللّٰہ افطر یوما من شھر رمضان احب الی من ان یضرب عنقی۔

ماہ رمضان کا ایک دن کہ جب خلیفہ وقت نے عید کا اعلان کیا ہوا تھا حالانکہ اس روز عید نہیں، اس دن افطار کروں (اور پھر اس دن کی قضا کروں) اس سے بہتر ہے کہ مارا جاؤں[1]

حالانکہ نہ مارا جانا اچھا ہے اور نہ مقصد تک بالکل نہ پہنچنا۔ لیکن ایسے مقامات پر اس طرح کی تعبیر استعمال کی جاتی ہے۔

---

[1] وسائل ج ۷، ص ۹۵۔

۳- ایک مرد رشید- کی نصیحت : حضرت لوطؑ کا آخر کلام میں یہ کہنا کہ "کیا تمہارے درمیان کوئی مرد رشید نہیں ہے" - سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ایک رشید انسان کا کسی قوم یا قبیلے میں ہونا بھی اس کے شرمناک اعمال سے اسے روکنے کے لیے کافی ہوتا ہے - یعنی ایک شخص بھی اگر عاقل اور رشید فکر رکھنے والا تمہارے درمیان ہوتا تو تم میرے گھر کی طرف میرے مہمانوں پر تجاوز کرنے کے ارادے سے اور بدنیتی سے ہرگز نہ آتے -

اس سے انسانی معاشروں کی رہبری کے لیے "رجل رشید" کا اثر واضح ہوتا ہے - یہ وہ حقیقت ہے جس کے بہت سے نمونے ہم نے پوری تاریخ بشر میں دیکھے ہیں -

۴- انحراف کی انتہا : تعجب کی بات یہ ہے کہ اس گمراہ قوم نے حضرت لوطؑ سے کہا : ہم تیری بیٹیوں پر حق نہیں رکھتے - یہ امر اس گروہ کے انتہائی انحراف کو ظاہر کرتا ہے یعنی گناہ میں ڈوبا ہوا ایک معاشرہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھنے لگتا ہے - انہوں نے پاک و پاکیزہ صاحب ایمان لڑکیوں سے ازدواج کو بالکل قطرو حق میں شمار نہیں کیا لیکن اس کے برعکس جنسی انحراف کو اپنا حق شمار کیا -

گناہ کی عادت اور خُو ہو جائے تو یہ مرحلہ اس قدر خطرناک مراحل میں سے ہے کہ یہاں پہنچ کر افراد شرمناک ترین اور قبیح ترین اعمال کو اپنا حق شمار کرتے ہیں اور پاکیزہ ترین طریقے سے جنسی تقاضوں کی تسکین کو ناحق سمجھتے ہیں -

۵- "قوۃ" اور "رکن شدید" کا مفہوم : ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں فرمایا :

"قوۃ" سے مراد وہی "قائم" ہیں اور "رکن شدید" ان کے ۳۱۳ یار و انصار ہیں [1]

ہو سکتا ہے یہ روایت عجیب معلوم ہو کہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں حضرت لوطؑ ایسی شخصیت کی ایسے یار و انصار کے ساتھ ظہور کی آرزو کریں - لیکن جو روایات آیات قرآن کی تفسیر کے ذیل میں اب تک آئی ہیں انہوں نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ عام طور پر ایک کلی قانون کو اس کے واضح مصداق کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے - دراصل حضرت لوطؑ یہ آرزو کرتے ہیں کہ اے کاش ! مستحکم ارادوں والے ، جسمانی اور روحانی طور پر طاقتور کافی تعداد میں مرد ہوتے ان مردوں کی طرح جو قیام مہدیؑ کے زمانے میں عالمی حکومت تشکیل دیں گے تو میں بھی حکومت الٰہی کی تشکیل کے لیے کام کرتا اور ان کی مدد سے فساد و انحراف کے خلاف جہاد کرتا اور اس قسم کے سرپھرے اور بے شرم افراد کی سرکوبی کرتا -

---

[1] تفسیر برہان ، جلد ۲ صفحہ ۲۲۳ -

(۸۱) قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ یَّصِلُوْٓا اِلَیْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ وَلَا یَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِیْبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ ○

(۸۲) فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ ۙ۬ مَّنْضُوْدٍ ○

(۸۳) مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ ○

ترجمہ

(۸۱) انہوں نے کہا : اے لوط ! ہم تیرے پروردگار کے رسول ہیں ، وہ ہرگز تجھ پر دسترس حاصل نہیں کر سکیں گے ۔ وسطِ شب اپنے خاندان کے ساتھ (اس شہر سے) چلا جا اور تم میں سے کوئی بھی اپنی پشت کی طرف نگاہ نہ کرے ۔ مگر تیری بیوی کہ وہ اسی بلاء میں گرفتار ہوگی کہ جس میں یہ لوگ گرفتار ہوں گے ۔ ان کی وعدہ گاہ صبح ہے کیا صبح نزدیک نہیں ہے ۔

(۸۲) جب ہمارا فرمان آپہنچا تو اس (شہر اور علاقے) کو ہم نے تہ و بالا کر دیا اور ان پر ہم نے تہ بہ تہ پتھروں کی بارش کی ۔

(۸۳) (وہ پتھر کہ) جو تیرے پروردگار کے ہاں مخصوص تھے اور ایسا ہونا ستمگروں کیلئے بعید نہیں ہے ۔

تفسیر

ظالموں کی زندگی کا اختتام

آخرکار پروردگار کے رسولوں نے حضرت لوطؑ کی شدید پریشانی دیکھی اور دیکھا کہ وہ روحانی طور پر کس اضطراب کا شکار ہیں تو انھوں نے اپنے اسرار کار سے پردہ اٹھایا اور ان سے کہا: اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں، پریشان نہ ہو مطمئن رہو کہ وہ ہرگز تجھ پر دسترس حاصل نہیں کر سکیں گے" (قالوا یالوط انا رسل ربک لن یصلوا الیک)۔

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ خدا کے فرشتے یہ نہیں کہتے کہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ کہتے ہیں کہ اے لوط! یہ تجھ پر دسترس حاصل نہیں کر سکیں گے کہ تجھے کوئی نقصان پہنچے۔

یہ تعبیر یا تو اس بنا پر ہے کہ اپنے آپ کو لوطؑ سے جدا نہیں سمجھتے تھے کیونکہ بہرحال وہ انھی کے مہمان تھے اور ان کی ہتک حرمت حضرت لوطؑ کی ہتک حرمت تھی یا یہ اس بنا پر کہ وہ حضرت لوطؑ پر یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ ہم خدا کے فرستادہ ہیں اور ہم تک ان کی دسترس نہ ہونا تو مسلّم ہے یہاں تک کہ تو جو ان کا ہم نوع ہے تجھ تک بھی یہ نہیں پہنچ سکیں گے۔

سورہ قمر کی آیہ ۳۷ میں ہے:

وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ ۔

وہ لوطؑ کے مہمانوں کے بارے میں تجاوز کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ہم نے ان کی آنکھیں اندھی کر دیں۔

یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ اس وقت حملہ آور قوم پروردگار کے ارادے سے اپنی بینائی کھو بیٹھی تھی اور حملے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ بعض روایات میں بھی ہے کہ ایک فرشتے نے مٹھی بھر مٹی ان کے چہروں پر پھینکی جس سے وہ نابینا ہو گئے۔

بہرحال جب لوطؑ اپنے مہمانوں کے بارے میں ان کی ماموریت کے بارے میں آگاہ ہوئے تو یہ بات اس عظیم پیغمبر کے جلتے ہوئے دل کے لیے ٹھنڈک کی مانند تھی۔ ایک دم انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے دل سے غم کا بارِ گراں ختم ہو گیا ہے اور ان کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ ایسا ہوا جیسے ایک شدید بیمار کی نظر مسیحا پر جا پڑے۔ انھوں نے سُکھ کا سانس لیا اور سمجھ گئے کہ غم واندوہ کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اور اس بے شرم حیوان صفت قوم کے چنگل سے نجات پانے کا اور خوشی کا وقت آپہنچا ہے۔

مہمانوں نے فوراً لوطؑ کو حکم دیا، تم اسی رات تاریکیٔ شب میں اپنے خاندان کو اپنے ساتھ لے لو اور اس سرزمین

سے نکل جاؤ (فاسر باھلک بقطع من اللیل)۔[1]

لیکن یہ پابندی ہے کہ "تم میں سے کوئی شخص پس پشت نہ دیکھے" (ولا یلتفت منکم احد)۔ اس حکم کی خلاف ورزی فقط تمہاری بیوی کرے گی کہ جو تمہاری گنہگار قوم کو پہنچنے والی مصیبت میں گرفتار ہوگی (الا امراتک انہ مصیبھا ما اصابھم)۔

"لا یلتفت منکم احد" کی تفسیر میں مفسرین نے چند احتمال ذکر کیے ہیں:

پہلا یہ کہ کوئی شخص اپنی پس پشت نہ دیکھے۔

دوسرا یہ کہ شہر میں سے مال اور وسائل لے جانے کی فکر نہ کرے بلکہ صرف اپنے آپ کو اس ہلاکت سے نکال لے جائے۔

تیسرا یہ کہ اس خاندان کے اس چھوٹے سے قافلے میں سے کوئی شخص پیچھے نہ رہ جائے۔

چوتھا یہ کہ تمہارے نکلنے کے وقت زمین ہلنے لگے گی اور عذاب کے آثار نمایاں ہو جائیں گے لہٰذا اپنے پس پشت نگاہ نہ کرنا اور جلدی سے دُور نکل جانا۔

البتہ کوئی مانع نہیں کہ یہ سب احتمالات اس آیت کے مفہوم میں جمع ہوں۔[2]

بالآخر انہوں نے لوطؑ سے آخری بات کی: نزول عذاب کا لمحہ اور وعدہ کی تکمیل کا موقع صبح ہے اور صبح کی پہلی شعاع کے ساتھ ہی اس قوم کی زندگی غروب ہو جائے گی (ان موعدھم الصبح)۔

ابھی اٹھ کھڑے ہو اور جتنا جلدی ممکن ہو شہر سے نکل جاؤ "کیا صبح نزدیک نہیں ہے" (الیس الصبح بقریب)۔

بعض روایات میں ہے کہ جب ملائکہ نے کہا کہ عذاب کے وعدہ پر عملدرآمد صبح کے وقت ہوگا تو حضرت لوطؑ کہ جو اس آلودہ قوم سے سخت ناراحت اور پریشان تھے، وہی قوم کہ جس نے اپنے شرمناک اعمال سے ان کا دل

---

[1] "اسر" "اسراء" کے مادہ سے رات کو چلنے کے معنی میں ہے (لہٰذا "لیل" کی صراحت) اس آیت میں زیادہ تاکید کے لیے ہے اور "قطع" رات کی تاریکی کے معنی میں ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ رات کے سیاہ پردوں نے تمام جگہوں کو گھیر رکھا ہے اور یہ غافل قوم خوابیدہ یا مست شراب و ہوس بازی ہے، چپکے سے ان میں سے نکل جاؤ۔

[2] اس بارے میں کہ "الا امراتک" میں استثناء کس جملے سے ہے، مفسرین نے دو احتمال ذکر کیے ہیں:

پہلا یہ کہ "لا یلتفت منکم احد" سے استثناء ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت لوطؑ کا خاندان یہاں تک کہ ان کی بیوی بھی سب شہر سے باہر کی طرف نکلے اور کسی نے بھی دوسروں کے فرمان کے خلاف پس پشت نگاہ نہ کی سوائے حضرت لوطؑ کی بیوی کے کیونکہ اسے اپنی قوم سے بڑا لگاؤ اور دلبستگی تھی اور وہ ان کے انجام سے پریشان تھی۔ وہ لمحہ بھر کو رکی اور پس پشت دیکھا۔ ایک روایت کے مطابق اسی وقت شہر پر برسنے والے پتھروں میں سے ایک پتھر اسے لگا اور اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ "فاسر باھلک" سے استثناء ہے یعنی اپنی بیوی کے سوا تمام خاندان کو ساتھ لے جاؤ۔ اس صورت میں لوطؑ کی بیوی شہر ہی میں رہ گئی تھی۔

البتہ پہلا احتمال زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مجروح کر رکھا تھا اور ان کی روح کو غم و اندوہ سے بھر دیا تھا، فرشتوں سے خواہش کی کہ اب جبکہ انہوں نے نابود ہی ہونا ہے تو کیا ہی اچھا ہو کہ جلدی ایسا ہو لیکن انہوں نے حضرت لوطؑ کی دلجوئی اور تسلی کے لیے کہا: کیا صبح نزدیک نہیں ہے؟

آخرکار عذاب کا لمحہ آن پہنچا اور لوط پیغمبرؑ کا انتظار ختم ہوا جیسا کہ قرآن کہتا ہے: جس وقت ہمارا فرمان آن پہنچا تو ہم نے اس زمین کو زیر و زبر کر دیا اور ان کے سروں پر سنگیلے پتھروں کی پیہم بارش برسائی (فلما جاء امرنا جعلنا عالیها سافلها وامطرنا علیها حجارة من سجیل منضود)۔

"سجیل" اصل میں فارسی لفظ ہے کہ جو "سنگ و گل" (پتھر اور مٹی) سے لیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کا مطلب ہے ایسی چیز جو نہ پتھر کی طرح بالکل سخت ہو اور نہ ہی ڈھیلی مٹی کی طرح بلکہ ان دونوں کے درمیان ہو۔

"منضود" کا مادہ "نضد" ہے اس کا معنی ہے یکے بعد دیگرے اور پے در پے آنا۔ یعنی پتھروں کی یہ بارش اس قدر تیز اور پے در پے تھی کہ گویا پتھر ایک دوسرے پر سوار تھے۔

لیکن یہ معمولی پتھر نہ تھے بلکہ تیرے پروردگار کے ہاں معین اور مخصوص تھے (مسومة عند ربك)۔ البتہ یہ تصور نہ کریں کہ یہ پتھر قوم لوط کے ساتھ ہی مخصوص تھے بلکہ "یہ کسی ظالم قوم اور جمعیت سے دور نہیں ہیں" (وما هی من الظالمین ببعید)۔

اس بے راہ رو اور منحرف قوم نے اپنے اوپر بھی ظلم کیا اور اپنے معاشرے پر بھی۔ وہ اپنی قوم کی تقدیر سے بھی کھیلے اور انسانی ایمان و اخلاق کا بھی مذاق اڑایا۔ جب ان کے ہمدرد رہبر نے داد و فریاد کی تو انہوں نے کان نہ دھرے اور تمسخر اڑایا۔ اتنی ڈھٹائی، بے شرمی اور بے حیائی یہاں تک آپہنچی کہ وہ اپنے رہبر کے مہمانوں کی حرمت و عزت پر تجاوز کے لیے بھی اٹھ کھڑے ہوتے۔

یہ وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے ہر چیز کو الٹ کر رکھ دیا۔ ان کے شہروں کو بھی الٹ جانا چاہیے تھا۔ فقط یہی نہیں کہ ان کے شہر تہ و بالا ہو جاتے بلکہ ان پر پتھروں کی بارش بھی ہونا چاہیے تھی تاکہ ان کے آخری آثار حیات بھی درہم برہم ہو جائیں۔ اور وہ ان پتھروں میں دفن ہو جائیں اس طرح سے کہ ان کا نام و نشان اس سرزمین میں نظر نہ آئے صرف وحشت ناک، تباہ و برباد بیابان، خاموش قبرستان اور پتھروں میں دبے ہوئے مردوں کے علاوہ ان میں کچھ باقی نہ رہے۔

کیا صرف قوم لوط کو یہ سزا ملنی چاہیئے — نہیں، یقیناً ہرگز نہیں بلکہ ہر منحرف گروہ اور ستم پیشہ قوم کے لیے ایسا ہی انجام انتظار میں ہے۔ کبھی سنگریزوں کی بارش کے نیچے، کبھی آگ اگلتے بموں کے نیچے اور کبھی معاشرے کے لیے تباہ کن اختلافات کے تحت — خلاصہ یہ کہ ہر ستمگر کو کسی نہ کسی صورت میں ایسے عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ صبح کے وقت نزولِ عذاب کیوں؟ : مندرجہ بالا آیات میں غور کرنے سے قاری کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نزولِ عذاب کے لیے صبح کا وقت کیوں منتخب کیا گیا۔ رات کے وقت ہی عذاب کیوں نازل نہیں ہوا؟۔

ایسا اس لیے تھا کہ جب حضرت لوطؑ کے گھر پر چڑھ آنے والے افراد اندھے ہو گئے اور قوم کے پاس لوٹ گئے اور واقعہ بیان کیا تو وہ کچھ غور و فکر کرنے لگے کہ معاملہ کیا ہے۔ خدا نے صبح تک انہیں مہلت دی کہ شاید بیدار ہو جائیں اور اس کی بارگاہ کی طرف رجوع کریں اور توبہ کریں یا یہ کہ خدا نہیں چاہتا تھا کہ رات کی تاریکی میں ان پر شب خون مارا جائے اسی بناء پر حکم دیا کہ صبح تک مامور عذاب سے ہاتھ روکے رکھیں۔

تفاسیر میں اس کے بارے میں تقریباً کچھ نہیں لکھا گیا لیکن جو کچھ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے وہ اس سلسلے میں چند قابلِ مطالعہ احتمالات ہیں۔

۲۔ زیر و زبر کیوں کیا گیا؟ ہم کہہ چکے ہیں کہ عذاب کی گناہ سے کچھ نہ کچھ مناسبت ہونا چاہیئے۔ اس قوم نے انحرافِ جنسی کے ذریعے چونکہ ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیا تھا لہٰذا خدا نے بھی ان شہروں کو زیر و زبر کر دیا۔ اور چونکہ روایات کے مطابق ان کے منہ سے ہمیشہ رکیک اور گندی گندگی کی بارش ہوتی رہتی تھی لہٰذا خدا نے بھی ان پر پتھروں کی بارش برسائی۔

۳۔ پتھروں کی بارش کیوں؟ کیا پتھروں کی بارش ان کے شہر زیر و زبر ہونے سے پہلے تھی یا اس کے ساتھ ساتھ یا اس کے بعد — اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے اور آیاتِ الٰہی میں بھی اس سلسلے میں صراحت نہیں ہے چونکہ یہ جملہ واؤ کے ساتھ عطف ہوا ہے کہ جس سے ترتیب معلوم نہیں ہوتی۔

لیکن بعض مفسرین مثلاً المنار کا مؤلف معتقد ہے کہ پتھروں کی یہ بارش یا زیر و زبر ہونے سے پہلے تھی یا ساتھ ساتھ اور اس کا فلسفہ یہ تھا کہ وہ افراد جو ادھر اُدھر گوشہ و کنار میں تھے اور ملبے میں دفن نہیں ہوئے تھے وہ صحیح و سالم نہ رہیں اور وہ بھی اپنے بُرے اعمال کی سزا تک پہنچ جائیں۔

وہ روایت کہ جس میں ہے کہ لوطؑ کی بیوی نے آواز سنی تو سر پیچھے کی طرف پھیرا اور اسی عالم میں اسے پتھر لگا اور اسے مار ڈالا، نشاندہی کرتی ہے کہ یہ دونوں امور (زیر و زبر ہونا اور پتھروں کی بارش) اکٹھے صورت پذیر ہوئے۔

اگر ان چیزوں سے صرف نظر کر لیں تو کوئی مانع نہیں کہ تشدیدِ عذاب اور ان کے آثار محو کرنے کے لیے سنگریزے ان کے زیر و زبر ہونے کے بعد ہی ان پر نازل ہوئے ہوں اس طرح سے کہ ان کا علاقہ ان کے نیچے چھپ جائے اور اس کے آثار مٹ جائیں۔

۴۔ پتھر نشاندار کیوں تھے؟ ہم نے کہا ہے کہ "مسومة عند ربك" کے جملے سے بات واضح ہوتی ہے کہ یہ پتھر خدا کے نزدیک مخصوص اور نشاندار تھے لیکن یہ کس طرح نشاندار تھے، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ان پتھروں میں کچھ ایسی علامتیں تھیں جو نشاندہی کرتی تھیں کہ یہ عام پتھر نہیں ہیں بلکہ خصوصیت سے عذاب الٰہی کے لیے نازل ہوئے ہیں تاکہ دوسرے پتھر گرنے سے اشتباہ نہ ہو۔ اسی لیے بعض دوسروں نے کہا ہے کہ پتھر زمینی پتھروں جیسے نہیں تھے بلکہ وہ ایک طرح کے آسمانی پتھر تھے جو کرۂ زمین کے باہر سے زمین کی طرف بھیجے گئے تھے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ علم پروردگار میں ان کی کچھ علامتیں تھیں کہ ان میں سے ہر ایک ٹھیک معین شخص اور معین مقام پر جا کر لگتا تھا۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدائی سزا اور عذاب اس قدر حساب شدہ ہے کہ یہ تک معین ہے کہ کس شخص کو کون سے پتھر کے ساتھ سزا دی جائے گی اور اس کا کوئی کام حساب اور ضابطے کے بغیر انجام نہیں پاتا۔

۵۔ ہم جنس کی طرف میلان کی حرمت: ہم جنس سے آمیزش، چاہے مردوں میں ہو یا عورتوں میں، اسلام میں بہت بڑے گناہوں میں سے شمار کی گئی ہے اور دونوں کے لیے حد شرعی معین ہے۔

مردوں میں ہم جنسی کا گناہ ہو تو فاعل ہو یا مفعول اسلام میں اس کی سزا قتل ہے اور فقہ میں اس اقدام اور قتل کے کئی طریقے بیان ہوئے ہیں۔ البتہ اس سزا کے لیے ضروری ہے کہ یہ گناہ معتبر اور قطعی ذرائع سے ثابت ہو کر جو فقہ اسلامی میں اور معصومین کی روایات میں ذکر ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ صرف تین مرتبہ اقرار کرنا بھی کافی نہیں ہے کم از کم چار مرتبہ اس عمل کا اقرار ضروری ہے۔

باقی رہا عورتوں میں ہم جنسی کے گناہ کی سزا تو اس کے لیے چار مرتبہ اقرار کرنے یا چار عادل گواہوں کی گواہی سے ثابت ہونے کے بعد (فقہ میں مذکورہ شرائط کی روشنی میں) سو تازیانے ہے۔ بعض فقہا نے کہا ہے کہ شوہردار عورت یہ گناہ کرے تو اس کی حد قتل ہے۔

ان حدود کے اجرا کے لیے دقیق اور پیچیدہ شرائط ہیں کہ جو فقہ اسلامی کی کتب میں موجود ہیں۔ وہ روایات کہ جو ہم جنسی کے گناہ کی مذمت میں پیشوایان اسلام کی طرف سے منقول ہیں اس قدر زیادہ اور ہلا دینے والی ہیں کہ ان کے مطالعے سے ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ اس گناہ کی قباحت اور برائی اس قدر ہے کہ بہت کم گناہ اس کے برابر شمار کیے گئے ہیں۔

ان میں سے پیغمبر اسلامؐ سے ایک روایت میں منقول ہے کہ:

لما عمل قوم لوط ما عملوا بكت الارض الى ربها حتى بلغ دموعها الى السماء، بكت السماء حتى بلغ دموعها العرش، فاوحى الله الى السماء ان حصبيهم،

واوحی الی الارض ان اخسفی بھم۔

جب قوم لوط نے یہ قبیح عمل انجام دیا تو زمین نے اس قدر گریہ و بکا کیا کہ اس کے آنسو آسمان تک پہنچے اور آسمان نے اس قدر گریہ و بکا کیا کہ اس کے آنسو عرش تک پہنچے۔ اس وقت اللہ نے آسمان کو وحی کی کہ ان پر پتھر برسا اور زمین پر وحی کی کہ انہیں نیچے کی طرف لے جا۔[1]

ظاہر ہے کہ یہاں آنسو بہانا تشبیہ اور کنایہ کے طور پر ہے۔

ایک اور حدیث امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

من جامع غلامًا جاء یوم القیامة جنبًا لا ینقیه ماء الدنیا وغضب الله علیه ولعنه واعد له جهنم وساءت مصیرًا.. ثم قال ان الذکر یرکب الذکر فیهتز العرش لذلک.

جو شخص کسی لڑکے کے ساتھ جنسی ملاپ کرے گا قیامت کے دن ناپاک اور جنب حرمۂ محشر میں پیش ہوگا یہاں تک کہ عالم دنیا کے تمام پانی اسے پاک نہیں کر سکیں گے اور خدا اس پر غضبناک ہوگا اور اسے اپنی رحمت سے دور کرے گا اور اس پر لعنت کرے گا اور جہنم اس کیلئے تیار رکھی گئی ہے اور جہنم کس قدر بُری جگہ ہے..... اس کے بعد فرمایا: جب مذکر مذکر سے جنسی ملاپ کرے تو عرش خدا ہلنے لگتا ہے۔[2]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

جو لوگ یہ کام کرتے کرواتے ہیں وہ سدوم (قوم لوط) کے باقی ماندہ لوگ ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا:

میں یہ نہیں کہتا کہ ان کی اولاد میں سے ہیں لیکن ان کی طینت میں سے ہیں۔

سوال ہوا:

وہی شہر سدوم جو زیر و زبر ہوا۔

فرمایا:

ہاں، وہ چار شہر تھے سدوم، صریم، لادنا اور عمیرا (عمورا)۔[3]

ایک اور روایت میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے فرمایا:

میں نے پیغمبرؐ سے سنا ہے کہ آپؐ کہہ رہے تھے:

لعن الله المتشبهین من الرجال بالنساء والمتشبهات من النساء بالرجال۔

---

[1] تفسیر برہان ج ۲۔ ص ۲۲۸

[2] وسائل الشیعہ ج ۱۴ ص ۲۴۹

[3] وسائل الشیعہ ج ۱۴ ص ۲۵۳

خدا کی لعنت ہو ان مردوں پر جو اپنے آپ کو عورتوں کے مشابہ کرتے ہیں (مردوں سے جنسی ملاپ کرواتے ہیں) اور خدا کی لعنت ہو ان عورتوں پر کہ جو اپنے آپ کو مردوں کی شبیہ بناتی ہیں[1]

ہم جنس پرستی کی حرمت کا فلسفہ

اگرچہ مغربی دنیا میں جہاں جنسی بے راہ روی بہت زیادہ ہے ایسی برائیوں سے نفرت نہیں کی جاتی یہاں تک کہ سننے میں آیا ہے کہ بعض ممالک مثلاً برطانیہ میں پارلیمنٹ نے اس کام کو انتہائی بے شرمی سے قانونی جواز دے دیا ہے لیکن ان برائیوں کے عام ہونے سے ان کی برائی اور قباحت میں ہرگز کوئی کمی نہیں آتی اور اس کے اخلاقی، نفسیاتی اور اجتماعی مفاسد اپنی جگہ پر موجود ہیں۔

بعض اوقات مادی مکتب کے بعض پیروکار جو اس قسم کی آلودگیوں میں مبتلا ہیں اپنے عمل کی توجیہ کے لیے کہتے ہیں کہ اس میں طبی نکتہ نظر سے کوئی خرابی نہیں ہے لیکن وہ یہ بات بھول چکے ہیں کہ اصولی طور پر ہر قسم کا جنسی انحراف انسانی وجود کے تمام ڈھانچے پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کا اعتدال درہم برہم کر دیتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ انسان فطری اور طبعی طور پر اپنی صنف مخالف کی طرف میلان رکھتا ہے اور یہ میلان انسانی فطرت میں بہت مضبوط جڑیں رکھتا ہے اور انسانی نسل کی بقا کا ضامن ہے۔ ہر وہ کام جو طبعی میلان سے انحراف کی راہ پر ہو انسان میں ایک قسم کی بیماری اور نفسیاتی انحراف پیدا کرتا ہے۔

وہ مرد جو جنس موافق کی طرف میلان رکھتا ہے اور وہ مرد کہ جو اپنے آپ کو اس کام کے لیے پیش کرتا ہے ہرگز ایک کامل مرد نہیں ہے۔ امور کی کتب میں ہم جنس پرستی (HOMOSEXUALISM) کو ایک اہم ترین انحراف قرار دیا ہے۔

اگر یہ کام جاری رہے تو جنس مخالف کے لیے انسان میں میلان آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے اور جو یہ کام کرتا ہے اس میں رفتہ رفتہ زنانہ احساسات پیدا ہونے لگتے ہیں اور دونوں بہت زیادہ جنسی ضعف اور اصطلاح کے مطابق سرد مزاجی میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح سے کہ ایک مدت کے بعد وہ طبعی اور فطری ملاپ (جنس مخالف سے ملاپ) پر قادر نہیں رہتے۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ مرد اور عورت کے جنسی احساسات جہاں ان کے بدن کے آرگنزم میں مؤثر ہیں وہاں ان کے روحانی اور مخصوص اخلاقی پہلوؤں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۴ ص ۲۵۵

طبیعی اور فطری احساسات سے محروم ہو کر انسان کے جسم اور روح پر کس قدر ضرب پڑتی ہے۔ یہاں تک کہ ممکن ہے کہ اس طرح کے انحراف میں مبتلا افراد اس قدر ضعف جنسی کا شکار ہوں کہ پھر اولاد پیدا کرنے کی طاقت سے بھی محروم ہو جائیں۔

اس قسم کے افراد عموماً نفسیاتی طور پر صحیح و سالم نہیں ہوتے اور اپنی ذات میں اپنے آپ سے ایک طرح کی بیگانگی محسوس کرتے ہیں اور جس معاشرے میں رہتے سہتے ہیں اس سے خود کو لاتعلق سا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایسے افراد قوت ارادی کہ جو ہر قسم کی کامیابی کی شرط ہے آہستہ آہستہ کھو بیٹھتے ہیں اور ایک قسم کی سرگردانی اور پریشانی ان کی روح میں آشیانہ بنا لیتی ہے۔

ایسے افراد اگر جلد اپنی اصلاح کا ارادہ نہ کریں بلکہ لازمی طور پر جسمانی اور روحانی طبیب سے مدد نہ لیں اور یہ عمل ان کی عادت کی شکل اختیار کرلے تو اس کا ترک کرنا مشکل ہو جائے گا۔

بہرحال اگر مصمم ارادہ کر لیا جائے تو کسی حالت میں بھی یہ عادت ترک کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ ارادہ ہر صورت قوی ہونا ضروری ہے۔

ہر کیف نفسیاتی سرگردانی انہیں تدریجاً منشیات اور شراب کی طرف لے جاتی ہے اور وہ مزید اخلاق انحرافات کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ ایک اور بڑی بدبختی ہے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ اسلامی روایات میں مختصر اور پُرمعنی عبارات کے ذریعے ان مفاسد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک روایت امام صادقؑ سے منقول ہے۔ کسی نے آپ سے سوال کیا:

لم حرم الله اللواط

خدا نے لواطت کو کیوں حرام کیا ہے؟

آپ نے فرمایا:

من اجل انه لو كان اتيان الغلام حلالا لاستغنى الرجال عن النساء وكان فيه قطع النسل وتعطيل الفروج وكان في اجازة ذلك فساد كثير۔

اگر لڑکوں سے ملاپ حلال ہوتا تو مرد عورتوں سے بے نیاز ہو جاتے (اور ان کی طرف مائل نہ رہتے) اور یہ چیز نسل انسانی کے منقطع ہونے کا باعث بنتی اور جنس مخالف سے فطری ملاپ کے ختم ہونے کا باعث بنتی اور یہ کام بہت سی اخلاقی اور اجتماعی خرابیوں کا سبب بنتا۔[1]

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۴ صفحہ ۲۵۲۔

اس نکتے کا ذکر بھی قابل توجہ ہے کہ اسلام ایسے افراد کے لیے جن سزاؤں کا قائل ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ فاعل پر مفعول کی بہن، ماں اور بیٹی سے نکاح حرام ہے یعنی اگر یہ کام ازدواج سے پہلے صورت پذیر ہو تو یہ عورتیں اس کے لیے ابدی طور پر حرام ہیں۔

جس نکتے کا ہم آخر میں ذکر ضروری سمجھتے ہیں یہ ہے کہ جنسی انحراف کی طرف افراد کے میلان کے بہت سے علل و اسباب ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ماں باپ کا اپنی اولاد سے سلوک یا ہم جنس اولاد کی نگرانی نہ کرنا، ان کے طرزِ معاشرت اور ایک ہی جگہ پر سونا وغیرہ بھی ہو سکتا ہے اس آلودگی کا ایک عامل بن جائے۔

بعض اوقات ممکن ہے کہ اس انحراف سے ایک اور اخلاقی انحراف جنم لے لے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ قوم لوط کے حالات میں ہے کہ ان کے اس گناہ میں آلودہ ہونے کا ایک سبب یہ تھا کہ وہ بخیل اور کنجوس لوگ تھے اور چونکہ ان کے شہر شام جانے والے قافلوں کے راستے میں پڑتے تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ مہمانوں اور مسافروں کی پذیرائی کریں لہٰذا ابتداء میں وہ اس طرح ظاہر کرتے تھے کہ وہ ان پر جنسی تجاوز کا ارادہ رکھتے ہیں تاکہ وہ مہمانوں اور مسافروں کو اپنے سے دُور بھگائیں لیکن تدریجاً یہ عمل ان کی عادت بن گیا اور انحراف جنسی کے میلانات آہستہ آہستہ ان کے وجود میں بیدار ہو گئے اور معاملہ یہاں تک جا پہنچا کہ وہ سر سے لے کر پاؤں تک اس میں آلودہ ہو گئے۔[1]

یہاں تک کہ فضول قسم کا مذاق جو کبھی کبھی لڑکوں یا لڑکیوں کے درمیان اپنے ہم جنسوں کے بارے میں ہوتا ہے بعض اوقات ان انحرافات کی طرف کھینچ لے جانے کا سبب بن جاتا ہے۔

بہرحال پوری توجہ سے ان امور کا خیال رکھنا چاہیئے اور جو اس گناہ میں آلودہ ہوں انہیں جلدی نجات حاصل کرنا چاہیئے اور اس بارے میں خدا سے توفیق طلب کرنا چاہیئے۔

قوم لوط کا اخلاق

اسلامی روایات و تواریخ میں جنسی انحراف کے ساتھ ساتھ قوم لوط کے بُرے اور شرمناک اعمال اور گھٹیا کردار بھی بیان ہُوا ہے۔ اس سلسلے میں سفینۃ البحار میں ہے:

قیل کانت مجالسهم تشتمل علی انواع المناکیر مثل الشتم والسخف والصفع والقمار وضرب المخراق وخذف الاحجار علی من مر بهم وضرب المعازف والمزامیر و

---

[1] بحار ج ۱۲ ص ۱۵۲۔

کشف العورات۔

کہا گیا ہے کہ ان کی مجالس اور محفلیں طرح طرح کے منکرات اور بُرے اعمال سے آلودہ تھیں۔ وہ آپس میں رکیک جملوں، فحش کلامی اور پھبتیوں کا تبادلہ کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی پشت پر مُکّے مارتے تھے۔ قمار بازی کرتے تھے۔ بچوں والے کھیل کھیلتے تھے۔ گزرنے والوں کو کنکریاں مارتے تھے۔ طرح طرح کے آلات موسیقی استعمال کرتے تھے اور لوگوں کے سامنے اپنی شرمگاہوں کو ننگا کرتے تھے۔[1]

واضح ہے کہ اس قسم کے گندے ماحول میں ہر روز انحراف اور بدی نئی شکل میں رونما ہوتی ہے اور وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایسے ماحول میں اصولی طور پر بُرائی کا تصور ختم ہو جاتا ہے اور لوگ اس طرح سے اس راہ پر چلتے ہیں کہ کوئی کام ان کی نظر میں بُرا اور قبیح نہیں رہتا۔ ان سے زیادہ بدبخت وہ قومیں ہیں جو علم کی پیش رفت کے زمانے میں انہی راہوں پر گامزن ہیں۔ بعض اوقات تو ان کے اعمال اس قدر شرمناک اور رسوا کن ہوتے ہیں کہ قوم لوط کے اعمال بھول جاتے ہیں۔

---

[1] سفینۃ البحار [illegible]۔

(۸۴) وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۚ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ○

(۸۵) وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○

(۸۶) بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ○

ترجمہ

(۸۴) اور ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے اور پیمانہ اور وزن کم نہ کرو (کم فروشی نہ کرو) میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور میں تمہارے لیے محیط ہو جانے والے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

(۸۵) اے میری قوم! پیمانہ اور وزن عدالت سے پورا کرو اور لوگوں کی اشیا (اجناس)

پر عیب نہ رکھو اور ان کے حق میں کمی نہ کرو اور زمین میں فساد نہ کرو۔

(۸۶) خدا نے تمہارے لیے جو حلال سرمایہ باقی رکھا ہے وہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو اور میں تمہارا پاسدار (اور تمہیں ایمان پر مجبور کرنے والا) نہیں ہوں۔

تفسیر

حضرت شعیبؑ کی سرزمین - مدین

قوم لوط کی عبرت انگیز داستان ختم ہونے پر قوم شعیب اور اہلِ مدین کی نوبت آئی ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے توحید کا راستہ چھوڑ دیا تھا اور شرک و بت پرستی کی سنگلاخ زمین میں سرگرداں ہو گئے تھے۔ یہ لوگ نہ صرف بتوں کو پوجتے تھے بلکہ درہم و دینار اور اپنے مال و ثروت کی بھی پرستش کرتے تھے اور اسی لیے وہ اپنے کاروبار اور بارونق تجارت کو نادرستی، کم فروشی اور غلط طریقوں سے آلودہ کرتے تھے۔

ابتداء میں فرمایا گیا ہے: مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا (والی مدین اخاھم شعیبا)۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں لفظ "اخاھم" (ان کا بھائی) اس بنا پر ہے کہ اپنی قوم سے پیغمبروں کی انتہائی محبت کو بیان کیا جائے۔ نہ صرف اس بنا پر کہ وہ افراد ان کے گروہ اور قبیلے سے تھے بلکہ اس لیے کہ وہ ان کے خیرخواہ اور ہمدرد بھائی کی طرح تھے۔

مدین (بروزن "مریم") حضرت شعیبؑ اور ان کے قبیلے کی آبادی کا نام ہے۔ یہ شہر خلیج عقبہ کے مشرق میں واقع ہے۔ اس کے لوگ اولادِ اسماعیل میں سے تھے۔ مصر، لبنان اور فلسطین سے تجارت کرتے تھے۔

آج کل شہر مدین کا نام "معان" ہے۔ بعض جغرافیہ دانوں نے خلیج عقبہ کے درمیان سے کوہ سینا تک زندگی بسر کرنے والوں پر مدین کے نام کا اطلاق کیا ہے۔

توراۃ میں بھی لفظ "مدیان" آیا ہے لیکن بعض قبائل کے لیے (البتہ ایک ہی لفظ شہر اور اہلِ شہر پر عام طور پر استعمال ہو جاتا ہے)[1]۔

اس پیغمبر اور ہمدرد و مہربان بھائی نے جیسا کہ تمام انبیاء کا آغازِ دعوت میں طریقہ ہے پہلے انہیں مذہب کے اساسی ترین رکن "توحید" کی طرف دعوت دی اور کہا: اے قوم! یکتا و یگانہ خدا کی پرستش کرو کہ جس نے

---

[1] اعلام قرآن ص ۵۶۲۔

علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے (قال یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ)۔ کیونکہ دعوتِ توحید تمام طاغوتوں اور جاہلیت کی تمام سنتوں کو توڑنے کی دعوت ہے اور اس کے بغیر کسی قسم کی اجتماعی اور اخلاقی اصلاح ممکن نہیں ہے۔

اس وقت اہلِ مدین میں ایک اقتصادی خرابی شدید طور پر رائج تھی جس کا سرچشمہ شرک اور بت پرستی کی روح ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خرید و فروخت کرتے وقت چیزوں کا پیمانہ اور وزن کم نہ کرو (ولا تنقصوا المکیال والمیزان)۔

"مکیال" اور "میزان" پیمانہ اور ترازو کے معنی میں ہیں اور انہیں کم کرنا کم فروشی اور لوگوں کے حقوق ادا نہ کرنے کے معنی میں ہے۔

ان دونوں کاموں کا ان کے درمیان رواج نشاندہی کرتا ہے کہ ان کے کاموں میں نظم و نسق، حساب و کتاب اور میزان و ترازو نہیں تھا اور ان کے سرمایہ دار معاشرے میں غارت گری، استثمار اور ظلم و ستم کا نمونہ تھے۔

یہ عظیم پیغمبر اس حکم کے بعد فوراً اس کے وہ علل و اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

پہلے کہتے ہیں: اس نصیحت کو قبول کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اچھائیوں کے دروازے تمہارے لیے کھل جائیں گے، تجارت کو فروغ حاصل ہوگا، چیزوں کی قیمتیں گر جائیں گی، معاشرے کو سکون و چین نصیب ہوگا خلاصہ یہ کہ "میں تمہارا خیر خواہ ہوں" اور مجھے اعتماد ہے کہ یہ نصیحت تمہارے معاشرے کے لیے خیر و برکت کا سرچشمہ بنے گی (انی اراکم بخیر)۔

اس جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ حضرت شعیبؑ کا مقصود یہ تھا کہ "میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نعمت فراواں اور خیرِ کثیر کے حامل ہو" اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ تم پستی کی طرف مائل ہو کر لوگوں کے حقوق ضائع کرو اور شکرِ نعمت کی بجائے کفرانِ نعمت کرو۔

دوسرا یہ کہ اس سے ڈرتا ہوں کہ شرک، کفرانِ نعمت اور کم فروشی پر اصرار کے نتیجہ میں تمہیں محیط ہو جانے والے دن کا عذاب نہ آلے (وانی اخاف علیکم عذاب یوم محیط)۔

یہاں "محیط" "یوم" کی صفت ہے یعنی ایک گھیر لینے والا دن، البتہ گھیر لینے والے دن سے مراد اس دن کا گھیر لینے والا عذاب ہے۔ ہو سکتا ہے یہ عذاب آخرت کی طرف اشارہ ہو اور اسی طرح دنیا کے گھیر لینے والی عذاب اور سزا کی بھی نشاندہی ہو۔

لہٰذا تمہیں بھی ایسے کاموں کی ضرورت نہیں اور ان کاموں کے باعث عذابِ خدا بھی تمہاری گھات میں ہے اس لیے جس قدر جلد ممکن ہو اپنی حالت ٹھیک کر لو۔

بعد والی آیت پھر ان کے اقتصادی نظام کے بارے میں تاکید کر رہی ہے۔ اگر پہلے شعیب اپنی قوم کو

کم فروشی سے منع کر چکے تھے تو آیت کے اس حصے میں لوگوں کے حقوق ادا کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔
فرمایا: اے قوم! پیمانے اور میزان کو عدل سے پورا کرو (و یا قوم اوفوا المکیال و المیزان بالقسط)۔
قسط و عدل کا یہ قانون اور ہر شخص کو اس کے حق کی ادائیگی کا یہ ضابطہ تمہارے پورے معاشرے پر حکمران ہونا چاہیئے۔

پھر اس سے آگے بڑھ کر فرمایا: لوگوں کی چیزوں اور اجناس پر عیب نہ رکھو اور ان میں سے کسی چیز کو کم نہ کرو (ولا تبخسوا الناس اشیاءھم)۔

"بخس" (بروزن "نحس") اصل میں ظلم کرتے ہوئے کم کرنے کے معنی میں ہے اور یہ جو ان زمینوں کو "بخس" کہا جاتا ہے کہ جو آبیاری کے بغیر کاشت ہوتی ہیں اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ ان کا پانی کم ہے اور وہ صرف بارش سے استفادہ کرتی ہیں) یا اس لیے کہ ان کی پیداوار پانی والی زمینوں سے کم ہے۔

اس جملے کے مفہوم کی وسعت پر نگاہ ڈالیں تو یہ سب اقوام و ملل کے لیے تمام انفرادی و اجتماعی حقوق کے احترام کی دعوت ہے۔ "بخس حق" ہر ماحول اور ہر زمانے میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات بلا معاوضہ مدد یا کسی اور صورت میں تعاون اور قرض کے نام پر بھی حقوق غصب کیے جاتے ہیں (جیسا کہ آج کل کی استعماری اور سامراجی طاقتوں کا طرز عمل ہے)۔

آیت کے آخر میں اس سے بھی آگے بڑھ کر فرمایا گیا ہے: روئے زمین پر فساد نہ کرو (ولا تعثوا فی الارض مفسدین)۔

کم فروشی کے ذریعے فساد اور برائی، لوگوں کے حقوق غصب کرنے کا فساد اور حقوق پر تجاوز کا فساد، معاشرتی میزان اور اعتدال کو درہم برہم کرنے کا فساد، اموال اور اشخاص پر عیب لگانے کا فساد۔ خلاصہ یہ کہ لوگوں کی حیثیت، آبرو، ناموس اور جان کے حریم پر تجاوز کرنے کا فساد۔

"لا تعثوا" "فساد نہ کرو" کے معنی میں ہے۔ اس بناء پر اس کے بعد "مفسدین" کا ذکر زیادہ سے زیادہ تاکید کی خاطر ہے۔

مندرجہ بالا دو آیات سے یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہوتی ہے کہ توحید کا اعتقاد اور آئیڈیالوجی کا معاملہ ایک صحیح و سالم اقتصاد کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ نیز یہ آیات اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اقتصادی نظام کا درہم برہم ہونا معاشرے کی وسیع تباہی اور فساد کا سرچشمہ ہے۔

آخر میں انہیں یہ گوش گزار کیا گیا ہے کہ ظلم و ستم کے ذریعے اور استعماری ہتھکنڈوں سے بڑھنے والی دولت تمہاری بے نیازی اور استغناء کا سبب نہیں بن سکتی بلکہ حلال طریقے سے حاصل کیا ہوا جو سرمایہ تمہارے پاس باقی رہ جائے چاہے وہ تھوڑا ہی ہو اگر خدا اور اس کے رسول پر ایمان کے ساتھ ہو تو بہتر ہے (بقیۃ اللہ خیر لکم ان کنتم مؤمنین)۔

"بقیۃ اللہ" کی تعبیر یا اس بنا پر ہے کہ تھوڑا حلال چونکہ خدا کے فرمان کے مطابق ہے لہٰذا بقیۃ اللہ ہے اور یا اس لیے ہے کہ حلال کی کمائی نعمت الٰہی کے دوام اور برکات کی بقاء کا باعث ہے یا پھر یہ معنوی جزاء اور ثواب کی طرف اشارہ ہے کہ جو ابد تک باقی رہتا ہے اگرچہ دنیا اور جو کچھ اس میں ہے فنا ہو جائے گا۔ سورہ کہف کی آیہ ۴۶ میں ہے:

وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا

اور باقی رہنے والی نیکیاں تمہارے رب کے نزدیک انجام کی حیثیت سے بھی بہتر ہیں اور امید و آرزو کے لحاظ سے بھی۔

یہ بھی اسی طرف اشارہ ہے۔

"ان کنتم مؤمنین" (اگر تم ایمان رکھتے ہو) — یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ یہ حقیقت صرف وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جو خدا، اس کی حکمت اور اس کے فرامین کے فلسفہ پر ایمان رکھتے ہیں۔

متعدد روایات میں ہے کہ "بقیۃ اللہ" حضرت مہدی علیہ السلام یا بعض دوسرے آئمہ کے وجود کی طرف اشارہ ہے۔ ان روایات میں سے ایک کتاب "اکمال الدین" میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا:

اول ما ينطق به القائم عليه السلام حين خرج هٰذه الاية "بقية الله خير لكم ان كنتم مؤمنين"

ثم يقول:

انا بقية الله وحجته وخليفته عليكم فلا يسلم عليه مسلم الا قال السلام عليك يا بقية الله فى ارضه۔

پہلی بات جو حضرت مہدی علیہ السلام اپنے قیام کے بعد کریں گے وہ یہ آیت ہوگی "بقیۃ اللہ خیر لکم ان کنتم مؤمنین"۔

اس کے بعد کہیں گے:

میں بقیۃ اللہ ہوں اور تم میں اس کی حجت اور خلیفہ ہوں۔ لہٰذا اس کے بعد کوئی شخص ایسا نہ ہوگا کہ جو اس طرح سے آپ پر سلام نہ کرے گا:

السلام عليك يا بقية الله فى ارضه

یعنی — اے خدا کی زمین میں بقیۃ اللہ! آپ پر سلام ہو۔[1]

ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ آیات قرآن اگرچہ خاص مواقع کے بارے میں نازل ہوئی ہیں لیکن ان کا مفہوم جامع

---

[1] تفسیر صافی میں مذکورہ آیت کے ذیل میں یہ روایت نقل ہے۔

ہے اور یہ ممکن ہے کہ بعد کے زمانوں میں وہ زیادہ اور وسیع مصداق پر منطبق ہوں۔

یہ صحیح ہے کہ زیر بحث آیت میں قوم شعیب مخاطب ہے اور "بقیۃ اللہ" سے مراد حلال سرمایہ و منافع اور جزائے الٰہی ہے لیکن ہر نفع بخش موجود کہ جو خدا تعالٰے کی طرف سے بشر کے لیے باقی ہے اور خیر و سعادت کا باعث ہے اسے "بقیۃ اللہ" شمار کیا جاسکتا ہے۔

تمام انبیائے الٰہی اور بزرگ ہادی "بقیۃ اللہ" ہیں۔ تمام سچے رہبر کہ جو ایک سخت ترین دشمن سے مقابلے کے بعد ایک قوم و ملت کے لیے باقی رہ جاتے ہیں اس لحاظ سے "بقیۃ اللہ" ہیں۔ اسی طرح جو مجاہد سپاہی کامیابی کے بعد میدانِ جنگ سے پلٹ آتے ہیں وہ بھی "بقیۃ اللہ" ہیں۔

حضرت مہدی موعود علیہ السلام چونکہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آخری پیشوا اور عظیم ترین انقلابی قائد ہیں "بقیۃ اللہ" کے مصادیق میں سے ایک روشن ترین مصداق ہیں اور ہر کسی سے بڑھ کر اس لقب کے اہل ہیں خصوصاً جبکہ آپؑ انبیاء اور آئمہ کے واحد باقی ماندہ ہیں۔

زیر بحث آیت کے آخر میں حضرت شعیبؑ کی زبانی بیان کیا گیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: میری ذمہ داری تو فقط ابلاغ، انذار اور خبردار کرنا ہے۔ اور میں تمہارے اعمال کا جواب دہ نہیں اور نہ میری یہ ذمہ داری ہے کہ تمہیں یہ راہ اختیار کرنے پر مجبور کروں "تم ہو، یہ تمہاری راہ ہے اور یہ چاہ ہے (وما انا علیکم بحفیظ)۔

(۸۷) قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ○

(۸۸) قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ○

(۸۹) وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ○

(۹۰) وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ○

ترجمہ

(۸۷) انہوں نے کہا: اے شعیب! کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم انہیں چھوڑ دیں کہ جن کی ہمارے آباؤ اجداد پرستش کرتے تھے اور جو کچھ ہم اپنے اموال کے لیے چاہتے ہیں اسے انجام نہ دیں، تو بردبار اور رشید مرد ہے۔

(۸۸) اس نے کہا: اے میری قوم! اگر میرے پاس پروردگار کی طرف سے واضح دلیل ہو

اور اس نے مجھے اچھا رزق دیا ہو (تو کیا مَیں اس کے فرمان کے خلاف عمل کر سکتا ہوں؟)، مَیں ہرگز نہیں چاہتا کہ جس چیز سے تمہیں روکتا ہوں اس کا خود ارتکاب کروں مَیں سوائے اصلاح کے جتنی کہ مجھ میں توانائی ہے، اور کچھ نہیں چاہتا اور مجھے اللہ کے علاوہ توفیق نہیں ہے مَیں نے اسی پر توکل کیا ہے اور میری اسی کی طرف بازگشت ہے۔

(۸۹) اور اے میری قوم مبادا میری دشمنی اور مخالفت کے نتیجے میں تم اس انجام میں گرفتار ہو جاؤ کہ جس میں قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح گرفتار ہوئی ہے اور قوم لوط تم سے زیادہ دُور نہیں ہے۔

(۹۰) اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو اور اس کی طرف رجوع اور توبہ کرو اور میرا پروردگار مہربان ہے اور (توبہ کرنے والے بندوں کو) دوست رکھتا ہے۔

تفسیر

ہٹ دھرموں کی بے بنیاد منطق

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس ہٹ دھرم قوم نے اس آسمانی مصلح کی دعوت کے جواب میں کیسا ردِّعمل ظاہر کیا۔

وہ جو بتوں کو اپنے بزرگوں کے آثار اور اپنے اصلی تمدن کی نشانی خیال کرتے تھے اور کم فروشی اور دھوکا بازی سے معاملات میں بڑے بڑے فائدے اور مفادات اٹھاتے تھے حضرت شعیبؑ کے جواب میں کہا: اے شعیب! کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم انہیں چھوڑ دیں کہ جن کی ہمارے آباؤ اجداد پرستش کرتے تھے (قالوا یا شعیب اصلوتک تأمرک ان نترک ما یعبد اٰباؤنا)۔ اور یا اپنے اموال کے بارے میں اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھیں (او ان نفعل فی اموالنا ما نشاء)۔ تُو تو ایک بُرد بار، حوصلہ مند سمجھدار آدمی ہے۔ تجھ سے یہ باتیں بعید ہیں (انک لانت الحلیم الرشید)۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انہوں نے حضرت شعیبؑ کی نماز کا ذکر کیوں کیا؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ اس بناء پر تھا کہ حضرت شعیبؑ زیادہ نماز پڑھتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ نماز انسان کو بُرے اور قبیح اعمال سے روکتی ہے لیکن وہ نادان لوگ کہ جو نماز اور ترکِ منکرات کے رابطے کو دیکھ سکے انہوں نے اس بات کا تمسخر اڑایا اور کہا کہ کیا یہ ذکر و اذکار اور حرکات تجھے حکم دیتی ہیں کہ ہم اپنے بزرگوں کے طور طریقے اور مذہبی ثقافت کو پاؤں تلے روند دیں یا اپنے اموال کے بارے میں اپنا اختیار گنوا بیٹھیں۔

بعض نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ "صلوٰۃ" دین و مذہب کی طرف اشارہ ہے کیونکہ دین کا واضح ترین سمبل نماز ہے۔

بہرحال اگر وہ صحیح طور پر غور و فکر کرتے تو یہ حقیقت پا لیتے کہ نماز انسان میں احساسِ مسئولیت، تقویٰ، پرہیزگاری، خدا ترسی اور حق شناسی زندہ کرتی ہے۔ اسے خدا کی اور اس کی عدالت، عدل کی یاد دلاتی ہے۔ خودپسندی اور خود پرستی کا غبار اس کے صفحۂ دل سے صاف کر دیتی ہے۔ اسے جہانِ محدود و آلودہ سے دنیائے ماوراء طبیعت، پاکیزیوں اور نیکیوں کی طرف متوجہ کرتی ہے اور اسی بناء پر اسے شرک، بت پرستی، بڑوں کی اندھی تقلید، کم فروشی اور طرح طرح کی دھوکا بازی سے باز رکھتی ہے۔

دوسرا سوال جو یہاں سامنے آتا ہے یہ ہے کہ کیا انہوں نے جملہ "انک لانت الحلیم الرشید" (تو عاقل، فہمیدہ اور بردبار شخص ہے) اعترافِ حقیقت و ایمان کے طور پر کہا یا تمسخر و استہزاء کے طور پر؟

مفسرین نے دونوں احتمالات ذکر کیے ہیں لیکن اگر پہلے آنے والے تمسخر آمیز جملے "اصلوتک تامرک" کی طرف توجہ دیں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ جملہ بھی استہزاء کے طور پر کہا۔ ان کا اشارہ اس طرف تھا کہ ایک حلیم و بردبار شخص وہ ہے جو کسی چیز کا جب تک کافی مطالعہ نہ کرلے اور اس کے صحیح ہونے کا اسے اطمینان نہ ہو جائے اس پر اظہارِ رائے نہیں کرتا اور ایک رشید و عاقل شخص وہ ہے کہ جو ایک قوم کے رسم و رواج کو پامال نہ کرے اور سرمایہ داروں سے عمل کی آزادی سلب نہ کرے۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ نہ تمہارا کافی مطالعہ ہے، نہ تمہاری عقل و فہم درست ہے اور نہ تمہاری سوچ گہری ہے، کیونکہ درست عقل اور گہری سوچ تقاضا کرتی ہے انسان اپنے بڑوں کی سنت سے دستبردار نہ ہو اور کسی کی آزادیٔ عمل سلب نہ کرے۔

لیکن جنہوں نے ان کی باتوں کو حماقت پر محمول کیا تھا اور ان کی بے عقلی کی دلیل قرار دیا تھا انہیں حضرت شعیبؑ نے کہا: اے میری قوم! (اے وہ لوگو! کہ تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں اور جو کچھ میں اپنے لیے پسند کرتا ہوں وہی تمہارے لیے بھی پسند کرتا ہوں) اگر خدا نے مجھے واضح دلیل وحی اور نبوت دی

ہو اور اس کے علاوہ مجھے پاکیزہ روزی اور حسب ضرورت مال دیا ہو تو کیا اس صورت میں صحیح ہے کہ میں اس کے فرمان کی مخالفت کروں یا تمہارے بارے میں کوئی غرض رکھوں اور تمہارا خیر خواہ نہ ہوں (قال یا قوم ارء یتم ان کنت علی بینۃ من ربی و رزقنی منہ رزقاً حسناً)[1]

اس جملے سے حضرت شعیبؑ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس کام میں میرا مقصد صرف روحانی، انسانی اور تربیتی ہے۔ میں ایسے حقائق کو جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے اور انسان ہمیشہ اس چیز کا دشمن ہوتا ہے جسے نہیں جانتا۔

یہ بات جاذب توجہ ہے کہ ان آیات میں "یا قوم" (اے میری قوم) کا تکرار ہوا ہے تاکہ قبول حق کیلئے ان کے جذبات اور میلانات کو نرم کیا جا سکے۔ حضرت شعیبؑ اس طرح سے انہیں سمجھانا چاہتے تھے کہ تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں (جیسا ہے یہاں "قوم" قبیلہ کے معنی میں ہو۔ طائفہ اور خاندان کے معنی میں ہو یا اس گروہ کے معنی میں ہو جس کے درمیان وہ زندگی گزارتے تھے اور انہی کا حصہ شمار ہوتے تھے)۔

اس کے بعد یہ عظیم پیغمبر مزید کہتے ہیں: یہ گمان نہ کرنا کہ میں تمہیں کسی چیز سے منع کروں اور پھر خود اسی کی جستجو میں لگ جاؤں (وما ارید ان اخالفکم الی ما انھاکم عنہ)۔

تمہیں کہوں کم فروشی نہ کرو اور دھوکا بازی اور ملاوٹ نہ کرو لیکن میں خود یہ اعمال انجام دوں کہ دولت و ثروت اکٹھی کرنے لگوں یا تمہیں تو بتوں کی پرستش سے منع کروں مگر خود ان کے سامنے سر تعظیم خم کروں۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔

اس جملے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت شعیبؑ پر الزام لگاتے تھے کہ خود یہ فائدہ اٹھانے کا ارادہ رکھتا ہے لہٰذا وہ صراحت سے اس امر کی نفی کرتے ہیں۔

آخر میں ان سے کہتے ہیں: میرا صرف ایک ہدف اور مقصد ہے اور وہ ہے اپنی قدرت و استطاعت کے مطابق تمہاری اور تمہارے معاشرے کی اصلاح (ان ارید الا الاصلاح ما استطعت)۔

یہ وہی ہدف ہے جو تمام پیغمبروں کے پیش نظر رہا ہے — یعنی عقیدے کی اصلاح، اخلاق کی اصلاح، عمل کی اصلاح، روابط اور اجتماعی نظاموں کی اصلاح۔

اور اس ہدف تک پہنچنے کے لیے صرف خدا سے توفیق طلب کرتا ہوں (وما توفیقی الا باللہ)۔

اسی بنا پر اپنی ذمہ داری کی انجام دہی اور پیغام پہنچانے اور اس عظیم ہدف تک پہنچنے کے لیے صرف اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور تمام چیزوں میں میری بازگشت اسی کی طرف ہے" (علیہ توکلت

---

[1] توجہ رکھیے کہ مندرجہ بالا آیت میں جملۂ شرطیہ کی جزا محذوف ہے اور اس کی جزا یہ ہے:

افاعدل مع ذالک عما انا علیہ من عبادتہ و تبلیغ دینہ

والیہ انیب)۔ مشکلات کے حل کے لیے اسی کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے کوشش کرتا ہوں اور اس راہ میں سختیاں گوارا کرنے کے لیے اس کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

اس کے بعد انہیں ایک اخلاقی نکتے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی سے بغض و عداوت کی بنا پر یا تعصب اور ہٹ دھرمی سے اپنے تمام مصالح نظرانداز کر دیتا ہے اور انجام کو فراموش کر دیتا ہے۔ حضرت شعیبؑ نے ان سے فرمایا: اے میری قوم! ایسا نہ ہو کہ میری دشمنی اور عداوت تمہیں گناہ، عصیاں اور سرکشی پر ابھارے (و یا قوم لا یجرمنکم شقاقی)۔ اور کہیں ایسا نہ ہو کہ وہی بلائیں، مصیبتیں، تکلیفیں، عذاب اور سزائیں جو قوم نوح، قوم ہود یا قوم صالح کو پہنچیں وہ تمہیں بھی آلیں (ان یصیبکم مثل ما اصاب قوم نوح او قوم هود او قوم صالح)۔ یہاں تک کہ قوم لوط کے شہروں کا زیر و زبر ہونا اور ان پر سنگباری کا واقعہ تم سے کوئی دور نہیں ہے (وما قوم لوط منکم ببعید)۔ نہ ان کا زمانہ تم سے کوئی دور ہے اور نہ ان کے علاقے تم سے دور ہیں اور نہ ہی تمہارے اعمال اور گناہ ان سے کچھ کم ہیں۔

۔ مدین، کہ جو قوم شعیب کا مرکز تھا وہ قوم لوط کے علاقے سے کوئی زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ کیونکہ دونوں شامات کے علاقوں میں سے تھے۔ زمانے کے لحاظ سے اگرچہ کچھ فاصلہ تھا تاہم اتنا نہیں کہ ان کی تاریخ فراموش ہو چکی ہوتی۔ باقی رہا عمل کے لحاظ سے تو اگرچہ قوم لوط کے جنسی انحرافات نمایاں تھے اور قوم شعیب کے اقتصادی انحرافات زیادہ تھے اور ظاہراً بہت مختلف تھے لیکن دونوں معاشرے میں فساد پیدا کرنے، اجتماعی نظام خراب کرنے، اخلاقی فضائل کو نابود کرنے اور برائی پھیلانے میں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی ہم روایات میں دیکھتے ہیں کہ ایک درہم سود کہ جس کا تعلق اقتصادی مسائل سے ہے کو زنا کہ جو ایک جنسی آلودگی ہے کے برابر قرار دیا گیا ہے[1]

آخر میں حضرت شعیبؑ انہیں دو حکم اور دیتے ہیں کہ جو دراصل ان تمام تبلیغات کا نتیجہ ہیں کہ جو اس گمراہ قوم میں وہ انجام دے چکے تھے۔

پہلا یہ کہ۔ خدا سے مغفرت طلب کرو تاکہ گناہ سے پاک ہو جاؤ اور شرک و بت پرستی اور معاملات میں خیانت

---

[1] اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ "لا یجرمنکم" دو معنی میں آیا ہے۔ ایک - لا یحملنکم" (یعنی تمہیں نہ ابھارے)، اس صورت میں آیت ترکیب کے لحاظ سے اس طرح ہوگی: "لا یجرمن" فعل، "شقاق" فاعل، "کم" مفعول اول، "ان یصیبکم" مصدری معنی رکھتا ہے دوسرا مفعول۔ نیز اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اے میری قوم: میری مخالفت تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تمہارا انجام قوم نوح وغیرہ کی طرح ہو۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ "تمہیں گناہ کی طرف نہ کھینچ کر لے جائے"۔ اس صورت میں "یجرمن" فعل، "شقاق" فاعل اور "کم" مفعول ہے اور "ان یصیبکم" اس کا نتیجہ ہے اور آیت کا معنی وہی ہوگا جو ہم متن میں بیان کر چکے ہیں۔

سے کنارہ کش ہو جاؤ (واستغفروا ربکم)۔

دوسرا یہ کہ گناہ سے پاک ہونے کے بعد اس کی طرف پلٹ آؤ کیونکہ وہ پاک ہے اور تم بھی پاک ہو کر اس کی خدمت میں آؤ (ثم توبوا الیہ)۔

در اصل استغفار، راہِ گناہ سے کنارہ کشی، خود کو پاک کرنا اور توبہ اس ذات کی طرف بازگشت ہے کہ جو لامتناہی وجود ہے۔

اور جان لو کہ تمہارا گناہ کتنا ہی عظیم اور سنگین کیوں نہ ہو بازگشت کی راہ تمہارے سامنے کھلی ہوئی ہے کیونکہ میرا پروردگار رحیم بھی ہے اور بندوں کو دوست بھی رکھتا ہے (ان ربی رحیم ودود)۔

"ودود" "ود" کا صیغہ مبالغہ ہے جس کا معنی ہے "محبت"۔ لفظ "رحیم" کے بعد اس لفظ کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ نہ فقط اپنی رحیمیت کی بناء پر توبہ کرنے والے گنہ گار بندوں پر توجہ رکھتا ہے بلکہ اس سے قطع نظر انہیں بہت دوست رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں (یعنی۔ رحم اور محبت) خود بندوں کی استغفار اور توبہ قبول کرنے کا باعث ہیں۔

۹۱ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۖ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ○

۹۲ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْۤ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ○

۹۳ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ○

ترجمہ

۹۱ انہوں نے کہا: اے شعیب! بہت سی وہ باتیں جو تُو کہتا ہے ہم نہیں سمجھ پاتے اور ہم تجھے اپنے مابین کمزور پاتے ہیں اور اگر تیرے چھوٹے سے قبیلے کا احترام پیشِ نظر نہ ہوتا تو ہم تجھے سنگسار کرتے اور تُو ہمارے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتا۔

۹۲ اس نے کہا: اے قوم! کیا میرا چھوٹا سا قبیلہ تمہارے نزدیک خدا سے زیادہ عزت دار ہے جبکہ تم نے اس کے فرمان کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ جو کچھ تم انجام دیتے ہو میرا پروردگار اس پر محیط ہے (اور اس سے آگاہ ہے)۔

۹۳ اے قوم! جو کچھ تم سے ہو سکے کر گزرو اور میں بھی اپنا کام کروں گا اور عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ خوار و رسوا کرنے والا عذاب کس کے پیچھے آتا ہے اور کون جھوٹا ہے۔

تم انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں ۔

تفسیر

ایک دوسرے کو دھمکیاں

یہ عظیم پیغمبر۔ حضرت شعیبؑ کہ انتہائی بچے تُلے، بلیغ اور دلنشین کلام کی وجہ سے جن کا لقب "خطیب الانبیاء" ہے، ان کا کلام ان لوگوں کی روحانی و مادی زندگی کی راہیں کھولنے والا تھا۔ انہوں نے بڑے صبر حوصلے، متانت اور دلسوزی کے ساتھ ان سے تمام باتیں کیں لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس گمراہ قوم نے انہیں کس طرح سے جواب دیا۔

انہوں نے چار جملوں میں کہ جو ڈھٹائی، جہالت اور بے خبری کا مظہر تھے آپ کو جواب دیا۔

پہلے وہ کہنے لگے : اے شعیب ! تمہاری زیادہ تر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں (قالوا یاشعیب ما نفقه کثیرًا مما تقول)۔ بنیادی طور پر تیری باتوں کا کوئی سر پیر ہی نہیں ۔ ان میں کوئی خاص بات اور منطق ہی نہیں کہ ہم ان پر کوئی غور و فکر کریں ۔ لہٰذا ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جس پر ہم عمل کریں اس لیے تم اپنے آپ کو زیادہ نہ تھکاؤ اور دوسرے لوگوں کے پیچھے جاؤ۔

دوسرا یہ کہ ہم تجھے اپنے مابین کمزور پاتے ہیں (وانا لنرٰك فینا ضعیفًا)۔ لہٰذا اگر تم یہ سوچتے ہو کہ تم اپنی بے منطق باتیں طاقت کے بل پر منوا لوگے تو یہ بھی تمہاری غلط فہمی ہے ۔

یہ گمان نہ کرو کہ اگر ہم تم سے بہت کچھ نہیں کرتے تو یہ تمہاری طاقت کے خوف سے ہے ۔ اگر تیری قوم و قبیلہ کا احترام پیش نظر نہ ہوتا تو ہم تجھے بدترین طریقے سے قتل کر دیتے اور تجھے سنگسار کرتے (ولولا رھطك لرجمناك)۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ انہوں نے حضرت شعیبؑ کے قبیلے کو "رھط" کے لفظ سے یاد کیا کہ جس کا لغت عرب میں تین سے کم تعداد سے لے کر سات یا دس یا بعض کے بقول زیادہ سے زیادہ چالیس افراد پر اطلاق ہوتا ہے ۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تیرے قبیلے کی بھی ہماری نظر میں کوئی طاقت نہیں بلکہ دوسرے لحاظ ہیں جو ہمیں اس کام سے روکتے ہیں۔ یہ بالکل اس طرح ہے جیسے ہم کسی سے کہتے ہیں کہ اگر تیری قوم اور خاندان کے ان چار افراد کا لحاظ نہ ہو تو ہم تیرا حق تیرے ہاتھ پر رکھ دیتے جبکہ در اصل اس کی قوم اور خاندان کے وہی چار افراد نہیں ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ طاقت کے لحاظ سے اہمیت نہیں رکھتے ۔

---

۱ سفینۃ البحار مادہ "شعیب"۔

آخر میں انہوں نے کہا : تو ہمارے لیے کوئی طاقتور اور ناقابلِ شکست شخص نہیں ہے (وما انت علینا بعزیز)۔ اگرچہ تو اپنے قبیلے کے بزرگوں میں شمار ہوتا ہے لیکن جو پروگرام تیرے پیشِ نظر ہے اس کی وجہ سے ہماری نگاہ میں تیری کوئی وقعت اور منزلت نہیں ہے۔

حضرت شعیبؑ ان باتوں کے نشتروں اور توہین آمیز رویے سے (کبیح پا ہوکر) اٹھ کر نہ چلے گئے بلکہ آپ نے اسی طرح انہیں پُر منطق اور بلیغ پیرائے میں جواب دیا : اے قوم ! کیا میرے قبیلے کے یہ چند افراد تمہارے نزدیک خدا سے زیادہ عزیز ہیں (قال یا قوم ارھطی اعز علیکم من اللہ)۔ تم میرے خاندان کی خاطر کہ جو تمہارے بقول چند نفر سے زیادہ نہیں ہے مجھے آزار نہیں پہنچاتے ہو، توکیوں خدا کے لیے تم میری باتوں کو قبول نہیں کرتے ہو۔ کیا عظمت خدا کے سامنے چند افراد کی کوئی حیثیت ہے ؟

کیا تم خدا کے کسی احترام کے قائل ہو۔ جبکہ اسے اور اس کے فرمان کو تم نے پس پشت ڈال دیا ہے (واتخذتموہ وراءکم ظھریا)[1]

آخر میں حضرت شعیبؑ کہتے ہیں : یہ خیال نہ کرو کہ خدا تمہارے اعمال کو نہیں دیکھتا اور تمہاری باتیں نہیں سنتا۔ یقین جانو کہ میرا پروردگار ان تمام اعمال پر محیط ہے جو تم انجام دیتے (ان ربی بما تعملون محیط)۔

بلیغ سخن وہ ہے کہ جو اپنی باتوں میں مدِمقابل کی تمام تنقیدوں کا جواب دے۔ قوم شعیبؑ کے مشرکین نے چونکہ اپنی باتوں کے آخر میں ضمناً انہیں سنگسار کرنے کی دھمکی دی تھی اور ان کے سامنے اپنی طاقت کا اظہار کیا تھا لہٰذا ان کی دھمکی کے جواب میں حضرت شعیبؑ نے اپنا موقف اس طرح سے بیان کیا : اے میری قوم ! جو کچھ تمہارے بس میں ہے کر گزرو اور اس میں کوتاہی نہ کرو اور جو کچھ تم سے ہو سکتا ہے اس میں رُو رعایت نہ کرو (و یا قوم اعملوا علی مکانتکم)[2] میں بھی اپنا کام کروں گا (انی عامل)۔ لیکن تم جلد سمجھ جاؤ گے کہ کون رسواکن عذاب میں

---

[1] عربی زبان میں جب کسی چیز کے بارے میں اپنی بے اعتنائی کا اظہار کرتے ہیں تو کہتے ہیں "جعلتہ تحت قدمی" یا "جعلتہ دبر اذنی" یا "جعلتہ وراء ظھری" یا "جعلتہ ظھریا" (یعنی وہ میرے زیرِ پا ہے یا اسے میں نے پس پشت ڈال رکھا ہے وغیرہ)۔ اور "ظھریا" کا مادہ "ظھر" (بروزن "قہر") ہے اور "ی" یہاں یائے نسبت ہے اور "ظ" کے نیچے زیر ان تبدیلیوں کی بنا پر ہے جو کبھی اسم منسوب میں کی جاتی ہیں۔

[2] "مکانۃ" مصدر یا اسم مصدر ہے اور یہ کسی چیز پر قدرت رکھنے کے معنی میں ہے۔

گرفتار ہوتا ہے اور کون جھوٹا ہے مَیں یا تم (سوف تعلمون من یأتیہ عذاب یخزیہ ومن ہو کاذب)۔

اور اب جبکہ معاملہ اس طرح ہے تو تم بھی انتظار کرو اور مَیں بھی انتظار کرتا ہوں (وارتقبوا انی معکم رقیب)[1]

تم اپنی طاقت، تعداد، سرمائے اور اثر و رسوخ سے مجھ پر کامیابی کے انتظار میں رہو اور مَیں بھی اس انتظار میں ہوں کہ عنقریب دردناک عذابِ الٰہی تم جیسی گمراہ قوم کے دامن گیر ہو اور تمہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔

---

[1] "رقیب" کا معنی ہے محافظ، نگران اور نگہبان۔ یہ دراصل "رقبہ" سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے "گردن"۔ یہ معنی یا اس کے لیے کہ گردن کا محافظ اور نگران اس کی حفاظت کرتا ہے کہ جو اس کی محافظت میں ہو (یہ اس سے کنایہ ہے کہ اس کی جان کی حفاظت کرتا ہے) یا اس بنا پر کہ وہ گردن اونچی رکھتا ہے تاکہ پاسداری اور حفاظت کا کام انجام دے سکے۔

(۹۴) وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝

(۹۵) كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ۝

ترجمہ

(۹۴) اور جب ہمارا فرمان آپہنچا تو ہم نے شعیب کو اور ان پر ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت کے ذریعے نجات دی اور جنہوں نے ظلم کیا تھا انہیں (آسمانی) صیحہ نے آلیا اور وہ اپنے گھروں میں منہ کے بل گرے (اور مر گئے)۔

(۹۵) اس طرح کہ گویا وہ ان گھروں میں رہتے ہی نہ تھے۔ دُور ہو مدین (رحمت خدا سے) جیسے کہ قوم ثمود دور ہوئی۔

تفسیر

مدین کے تباہ کاروں کا انجام

گزشتہ اقوام کی سرگزشت کے بارے میں قرآن مجید میں ہم نے بارہا پڑھا ہے کہ پہلے مرحلے میں انبیاء انہیں خدا کی طرف دعوت دینے کے لیے قیام کرتے تھے اور ہر طرح سے تعلیم و تربیت اور پند و نصیحت میں کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے تھے۔ دوسرے مرحلے میں جب ایک گروہ پر پند و نصائح کا کوئی اثر نہ ہوتا تو انہیں عذاب الٰہی سے ڈراتے تاکہ وہ آخری افراد تسلیم حق ہو جائیں جو قبولیت کی اہلیت رکھتے ہیں اور وہ راہِ خدا کی طرف پلٹ آئیں نیز اتمام حجت ہو جائے۔

تیسرے مرحلے میں جب ان میں سے کوئی چیز مؤثر نہ ہوتی تو روئے زمین کی ستھرائی اور پاکبازی کے لیے سنتِ الٰہی کے مطابق عذاب آجاتا اور راستے کے ان کانٹوں کو دُور کر دیتا۔

قوم شعیب یعنی اہل مدین کا بھی آخرکار مرحلۂ انجام آپہنچا چنانچہ قرآن کہتا ہے: جب (اس گمراہ، ظالم اور ہٹ دھرم قوم کو عذاب دیئے جانے کے بارے میں) ہمارا فرمان آپہنچا تو ہم نے شعیب اور اس پر ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت کی برکت سے نجات دی (ولما جاء امرنا نجینا شعیبا والذین اٰمنوا معه برحمة منا)۔ پھر آسمانی پکار اور مرگ آفریں عظیم صیحہ نے ظالموں اور ستمگروں کو اپنی گرفت میں لے لیا (واخذت الذین ظلموا الصیحة)۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں "صیحہ" ہر قسم کی عظیم آواز اور پکار کے معنی میں ہے۔ قرآن نے بعض قوموں کی نابودی صیحۂ آسمانی کے ذریعے بتائی ہے۔ یہ صیحہ احتمالاً صاعقہ کے ذریعے اور اس کی مانند ہوتی ہے اور جیسا کہ ہم نے قوم ثمود کی داستان میں بیان کیا ہے کہ صوتی امواج بعض اوقات اس قدر قوی ہو سکتی ہیں کہ ایک گروہ کی موت کا سبب بن جائیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اس آسمانی صیحہ کے اثر سے قوم شعیب کے لوگ اپنے گھروں میں منہ کے بل جاگرے اور مر گئے اور ان کے بے جان جسم درس عبرت بنے ہوئے ایک مدت تک وہیں پڑے رہے (فاصبحوا فی دیارھم جاثمین)۔ ان کی زندگی کی کتاب اس طرح بند کر دی گئی کہ "گویا کبھی وہ اس سرزمین کے ساکن ہی نہ تھے" (کان لم یغنوا فیھا)۔

وہ تمام دولت و ثروت کہ جس کی خاطر انہوں نے گناہ اور ظلم و ستم کیے نابود ہو گئی۔ ان کی زمینیں اور زرق برق زندگی ختم ہو گئی اور ان کا شور و غوغا خاموش ہو گیا اور آخرکار جیسا کہ قوم عاد و ثمود کی داستان کے آخر میں بیان ہوا ہے فرمایا گیا ہے: دُور ہو سرزمین مدین لطف و رحمت پروردگار سے جیسے کہ قوم ثمود دور ہوئی (الا بعدا لمدین کما بعدت ثمود)۔

واضح ہے کہ یہاں "مدین" سے مراد اہل مدین ہیں جو رحمت خدا سے دُور ہوئے۔

شعیبؑ کی داستان میں تربیتی درس

انبیاء کے حالات اور گزشتہ اقوام کی داستانیں ہمیشہ بعد کی اقوام کے لیے الہام بخش اور سبق آموز ہوتی ہیں کیونکہ ان کی زندگی کی آزمائشیں کہ جو بعض اوقات دسیوں سال یا سینکڑوں سال تک جاری رہیں تاریخ کے چند صفحات میں سمٹ کر سب کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں اور ہر کوئی اپنی زندگی میں ان سے سبق حاصل کر سکتا ہے۔ اس عظیم پیغمبر حضرت شعیبؑ کی زندگی بھی ہمیں بہت سے درس دیتی ہے، مثلاً:

۱۔ **اقتصادی مسائل کی اہمیت:** اس سرگزشت میں ہم نے پڑھا ہے کہ حضرت شعیبؑ نے انہیں دعوت توحید کے بعد مالی اور تجارتی امور میں حق و عدالت کی دعوت دی۔ یہ چیز نشاندہی کرتی ہے کہ ایک معاشرے کے اقتصادی مسائل کو معمولی اور غیر اہم شمار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ انبیاء صرف اخلاقی مسائل

کے لیے مامور نہ تھے بلکہ اجتماعی اور اقتصادی کیفیت کی خرابی کی اصلاح بھی ان کی دعوت کا ایک اہم حصّہ تھی، اس حد تک اہم کہ وہ اسے دعوتِ توحید کے ساتھ قرار دیتے تھے۔

۲۔ **نماز۔ توحید اور پاکیزگی کی طرف دعوت دیتی ہے:** حضرت شعیبؑ کی گمراہ قوم نے بڑے تعجب سے ان سے پوچھا کہ کیا تیری یہ نماز بتوں کی پرستش نہ کرنے اور کم فروشی اور دھوکا بازی نہ کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ ان حرکات اور اذکار کا ان امور میں کیا دخل ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان قوی ترین رابطہ ہے۔ اگر نماز اپنے حقیقی مفہوم کے ساتھ ادا ہو یعنی انسان اپنے تمام وجود کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں کھڑا ہو تو یہ حضور تکامل و ارتقاء کا زینہ، تربیتِ روح کا وسیلہ اور دل سے گناہ کا زنگ صاف کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہ حضور انسان کے ارادہ کو قوی اور اس کے عزم کو راسخ کرتا ہے اور غرور و تکبّر کو اس سے دُور کرتا ہے۔

۳۔ **خود بینی جمود کا باعث ہے:** جیسا کہ مندرجہ بالا آیات سے ہمیں معلوم ہوا ہے قومِ شعیب کے افراد خود خواہ اور خود بین تھے۔ وہ اپنے آپ کو فہمیدہ اور سمجھدار خیال کرتے تھے۔ حضرت شعیبؑ کو نادان سمجھتے تھے ان کا مذاق اڑاتے تھے، ان کی باتوں کو بے معنی اور ان کی شخصیت کو کمزور جانتے تھے۔ اس خود پرستی اور خود بینی نے ان کی زندگی کو تاریک کر دیا تھا اور انہیں خاکِ سیاہ پر لا بٹھایا تھا۔

نہ فقط انسان بلکہ اگر جانور بھی خود بین ہو تو وہ راستے میں اٹک کر رہ جاتا ہے۔ کہتے ہیں گھوڑا سوار ایک شخص ایک نہر کے پاس پہنچا لیکن اس نے حیرت سے دیکھا کہ گھوڑا ایک چھوٹی سی اور کم گہری نہر سے گزرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ ایک دانا شخص کا وہاں سے گزر ہوا۔ اس نے کہا: نہر کے پانی کو ہلاؤ تاکہ وہ مٹی سے آلودہ ہو جائے، مشکل حل ہو جائے گی۔ اس نے یہ کام کیا۔ گھوڑے نے آرام سے اسے عبور کر لیا۔ اس پر لوگ بہت حیران ہوئے۔ انہوں نے اس دانا شخص سے اس کی وجہ دریافت کی۔

اس مردِ حکیم نے کہا: جب پانی صاف تھا تو گھوڑے نے اپنا عکس پانی میں دیکھا۔ اس نے سمجھا کہ یہ وہ خود ہے۔ وہ تیار نہ ہوا کہ اپنا ہی پاؤں اپنے آپ پر رکھے لیکن جب پانی مٹی سے آلودہ ہو گیا تو اس کا عکس غائب ہو گیا اور وہ آسانی سے وہاں سے گزر گیا۔

۴۔ **اصولوں کو تعصّب پر قربان نہیں کرنا چاہیئے:** اس سرگزشت میں ہم نے پڑھا ہے کہ اس گمراہ قوم کی بدبختی کے عوامل میں سے ایک یہ تھا کہ وہ ذاتی کینہ پرستی اور عداوتوں کی وجہ سے حقائق کو بھلا دیتے تھے حالانکہ عقلمند اور حقیقت شناس وہ انسان ہے کہ ہر شخص سے حق بات سنے اور اسے قبول کرے چاہے کہنے والا اس کا اوّل درجے کا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

۵۔ **ایمان اور عمل ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہیں:** ابھی بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ جن کا

خیال ہے کہ صرف عقیدہ رکھ کر ہی مسلمان ہوا جا سکتا ہے، اگرچہ وہ عمل نہ بھی کریں۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ جو چاہتے ہیں کہ دین ان کی سرکش ہوا و ہوس کے راستے میں رکاوٹ نہ بنے۔ اور انہیں ہر لحاظ سے آزاد رکھے۔

داستانِ شعیبؑ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قوم بھی ایسے ہی دین کی خواہاں تھی۔ لہٰذا وہ حضرت شعیبؑ سے کہتے تھے کہ ہم نہ اس کے لیے تیار ہیں کہ اپنے بڑوں کے بتوں کو فراموش کریں اور نہ ہم اپنے سرمائے اور اموال کے بارے میں اپنی آزادی ہاتھ سے دیں گے۔ وہ یہ بات بھولے ہوتے تھے کہ اصولی طور پر شجرِ ایمان کا ثمر عمل ہے اور انبیاء کا دین و آئین اسی لیے تھا کہ انسان کی ذاتی خرابیوں، عملی کمزوریوں اور انحرافات کی اصلاح کرے ورنہ جس درخت کی نہ کوئی شاخ ہو نہ پتے اور نہ پھل وہ جلانے کے ہی کام آئے گا۔

انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے ایک طبقے میں یہ فکر بڑی راسخ ہو چکی ہے۔ وہ اسلام کو بس خشک عقائد کا ایک ایسا مجموعہ سمجھتے ہیں کہ جو فقط مسجد کے اندر ان کے ساتھ ہے اور جونہی وہ مسجد کے دروازے سے باہر نکلتے ہیں تو اسے خدا حافظ کہہ دیتے ہیں۔ ان کے دفتروں میں، بازاروں میں اور کاروبار میں اسلام کا کوئی عمل دخل اور نام و نشان نہیں ہے۔

بہت سے اسلامی ممالک کو ہم نے دیکھا ہے یہاں تک کہ وہ ممالک جو ظہورِ اسلام کا مرکز رہے وہاں یہ تلخ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ اسلام چند عقائد اور چند کم روح عبادات میں منحصر ہو گیا ہے، علم و آگہی، عدالتِ اجتماعی، رشدِ ثقافتی، بینشِ فرہنگی اور اخلاقِ اسلامی میں سے کسی چیز کا نام و نشان اور خبر نہیں ہے۔ اگرچہ خوش بختی سے چند ایک اسلامی تحریکوں کی وجہ سے خصوصاً نوجوان طبقے میں سچے اسلام اور ایمان و عمل کی یکجائی کی ایک تحریک پیدا ہوئی ہے۔ لہٰذا اب یہ جملہ کہ اسلام کو ہمارے عمل سے کیا کام یا اسلام کا تعلق دل سے ہے نہ کہ زندگی سے، کم سنا جاتا ہے۔

نیز یہ جو التقاطی لوگوں (کہ جو کسی ایک مکتب کے پیروکار نہیں ہوتے) کا نظریہ ہے کہ ہم عقیدہ اسلام سے اور اقتصادیات مارکس سے لیتے ہیں بھی قومِ شعیب کے گمراہوں کی سی طرزِ تفکر رکھتے ہیں۔ یہ نظریہ بھی قابلِ مذمت ہے۔ لیکن بہرحال یہ تفرقہ بھی قدیم زمانے سے ہے اور آج بھی موجود ہے۔ ہمیں اس کے خلاف جہاد کرنا چاہیئے۔

۶۔ بلا شرط اور لامحدود ملکیت فساد کا سرچشمہ ہے: قومِ شعیب اس اشتباہ میں گرفتار تھی کہ کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی شخص کے لیے اس کے اموال میں تصرف کے بارے میں تھوڑی سی بھی حد بندی کی بات کرے۔ یہاں تک کہ وہ حضرت شعیبؑ سے تعجب کرتے اور کہتے تھے کہ تجھ سا دانا شخص کیونکر ہمارے اموال کے بارے میں ہماری آزادیٔ عمل میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ انہوں نے یہ بات تمسخر کے طور پر کہی ہو یا حقیقت کے طور پر نشاندہی کرتی ہے کہ وہ مالی تصرفات میں کسی حد بندی کو خلافِ عقل سمجھتے تھے۔ حالانکہ یہی ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اگر لوگ اپنے اموال میں تصرف کرنے کے بارے میں آزاد ہوں تو پورا معاشرہ بدبختی اور خرابی کی لپیٹ میں آجائے گا۔ مالی امور کو صحیح اور نپے تلے ضوابط کے تابع ہونا چاہیئے۔ جیسے انبیاء الٰہی لوگوں کے سامنے

پیش کرتے تھے ورنہ معاشرہ تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔

۷۔ انبیاء کا ہدف فقط اصلاح تھا: یہ جو حضرت شعیبؑ نے فرمایا: "ان ارید الا الاصلاح ما استطعت" (میں تو فقط حتی المقدور اصلاح چاہتا ہوں)۔ یہ فقط ان کا شعار نہ تھا بلکہ تمام انبیاء اور تمام حقیقی راہبروں کا شعار تھا۔ ان کا گفتار و کردار ان کے اس ہدف کا شاہد ہے۔ وہ نہ لوگوں کی مشغولیت کے لیے آئے تھے، نہ ان کے گناہ بخشنے کے لیے، نہ انہیں جنت بیچنے کے لیے، نہ طاقتوروں کی حمایت کے لیے اور نہ عوام کے ذہنوں کو ماؤف کرنے کے لیے بلکہ ان کا ہدف اور مقصد ایک مکمل اور حقیقی اصلاح تھا۔ اصلاح سے ان کی مراد وسیع تر اصلاح تھی۔ فکر و نظر کی اصلاح، اخلاق کی اصلاح، معاشرے کے ثقافتی نظام کی اصلاح، اقتصادی اصلاح اور سیاسی اصلاح۔

خلاصہ یہ کہ معاشرے کے تمام پہلوؤں کی اصلاح ان کے مدِ نظر تھی۔

اور اس مقصد کے حصول کے لیے ان کا سہارا فقط خدا تھا۔ وہ کسی سازش اور دھمکی سے نہیں ڈرتے تھے جیسا کہ حضرت شعیبؑ نے کہا:

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب ۰

(۹۶) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝

(۹۷) اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِہٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ۝

(۹۸) یَقْدُمُ قَوْمَہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَاَوْرَدَھُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ۝

(۹۹) وَاُتْبِعُوْا فِیْ ھٰذِہٖ لَعْنَۃً وَّیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ۝

ترجمہ

(۹۶) ہم نے موسٰی کو اپنی آیات اور واضح دلیل کے ساتھ بھیجا۔

(۹۷) فرعون اور اس کے حواریوں کی طرف لیکن انہوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی جبکہ فرعون کا حکم رشد ونجات کا باعث نہیں تھا۔

(۹۸) وہ روزِ قیامت اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور وہ انہیں (جنت کے خوشگوار چشموں کی طرف لے جانے کی بجائے) آتشِ جہنم میں پہنچا دے گا اور کتنا بُرا ہے کہ آگ انسان کے لیے پانی کا گھاٹ قرار پائے۔

(۹۹) وہ اس جہان میں اور روزِ قیامت رحمتِ خدا سے دُور ہوں گے اور انہیں کیا بُرا تحفہ دیا جائے گا۔

تفسیر

فرعون کے ساتھ زبردست مقابلہ

حضرت شعیبؑ اور اہل مدین کی داستان ختم ہونے کے بعد اب ایک اشارہ حضرت موسیٰ بن عمران کی سرگزشت کے ایک پہلو کی طرف کیا گیا ہے۔ یہاں فرعون کے ساتھ ان کے مقابلوں کا ذکر ہے اور اس سورت میں یہ انبیاء الٰہی سے متعلق ساتویں داستان ہے۔

تمام پیغمبروں کی نسبت قرآن میں حضرت موسیٰؑ کا واقعہ زیادہ آیا ہے۔ تیس سے زیادہ سورتوں میں موسیٰ و فرعون اور بنی اسرائیل کے واقعہ کی طرف سو سے زیادہ مرتبہ اشارہ ہوا ہے۔

حضرت صالحؑ، شعیبؑ، ہودؑ اور لوطؑ جیسے انبیاء کہ جن کے واقعات ہم پڑھ چکے ہیں کی نسبت حضرت موسیٰؑ کے واقعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ ان انبیاء نے گمراہ قوموں کے خلاف قیام کیا تھا لیکن حضرت موسیٰؑ نے علاوہ ازیں ایک خودسر حکومت اور فرعون جیسے جابر حکمران کے خلاف قیام کیا تھا۔

اصولی طور پر صاف پانی کے لیے سرچشمے کو صاف کرنا چاہیئے۔ جب تک فاسد حکومتیں برسراقتدار ہیں کوئی معاشرہ سعادت اور نیک بختی کا منہ نہیں دیکھے گا۔ خدائی رہبروں کو ایسے معاشروں میں سب سے پہلے فساد کے ان مراکز کو درہم برہم کرنا چاہیئے۔

توجہ رہے کہ یہاں ہم حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کے ایک مختصر سے گوشے کا مطالعہ کریں گے کہ جو مختصر ہونے کے باوجود تمام انسانوں کو ایک عظیم پیغام دے رہا ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہو رہا ہے: ہم نے موسیٰ کو اپنے عطا کردہ معجزات اور قوی دلیل و منطق کے ساتھ بھیجا (ولقد ارسلنا موسٰی بأیاتنا وسلطان مبین)۔

"سلطان" کا معنی ہے "تسلط"۔ یہ کبھی ظاہری تسلط کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی منطقی تسلط کے معنی میں، یعنی ایسا تسلط کہ جو مخالف کے سامنے ایسی دیوار بن جائے کہ اسے فرار کا کوئی راستہ نہ ملے۔

مندرجہ بالا آیت میں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "سلطان" دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے اور لفظ "آیات" حضرت موسیٰؑ کے واضح معجزات کی طرف اشارہ ہے۔ مفسرین نے ان دو لفظوں کے بارے میں دیگر احتمالات بھی ذکر کیے ہیں۔

بہرحال موسیٰؑ کو سرکوبی کرنے والے ان معجزات اور قوی منطق کے ساتھ "ہم نے فرعون اور اس کے اطرافیوں کی طرف بھیجا" (الٰی فرعون وملائہ)۔

جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے "ملاء" ایسے لوگوں کو کہا جاتا ہے کہ جن کا ظاہر آنکھوں کو پُر کر دیتا ہے اگرچہ وہ اندر سے خالی ہوتے ہیں۔ منطق قرآن میں اس کا اطلاق زیادہ تر اعیان واشراف اور پُر فریب اشخاص پر ہوتا ہے جو

ظالم طاقتوں کے گرد رہتے ہیں۔

فرعون کے اطرافی جو دیکھ رہے تھے کہ حضرت موسیٰ کے قیام سے ان کے ناجائز مفادات خطرے میں ہیں حضرت موسیٰ کے معجزات اور منطق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر تیار نہ ہوئے لہٰذا انہوں نے حکم فرعون کی پیروی کی (فاتبعوا امر فرعون)۔ مگر فرعون کا حکم ہرگز ان کی سعادت کا ضامن اور سرمایۂ رشد و نجات نہیں ہو سکتا تھا (وما امر فرعون برشید)۔

البتہ فرعون کو یہ مقام آسانی سے نہیں مل گیا تھا بلکہ اس نے اپنے مقاصد کے لیے ہر طرح کے سازشی حربے استعمال کیے، طاقت استعمال کی اور حضرت موسیٰ کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا۔ یہاں تک کہ وہ اس کے لیے کوئی نفسیاتی ہتھکنڈہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

کبھی وہ کہتا تھا کہ موسیٰ چاہتا ہے کہ تم سے ساری زمینیں ہتھیا لے اور تمہیں کہ جو ان کے اصل مالک ہو نکال باہر کرے۔ قرآن نے اس کی بات کو یوں نقل کیا ہے:

يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ (اعراف - ۱۱۰)

کبھی وہ اپنی قوم کے مذہبی احساس کو تحریک دیتا اور کہتا:

إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُبَدِّلَ دِينَكُمْ

میں اس سے ڈرتا ہوں کہ یہ کہیں تمہارے دین ہی کو نہ بدل ڈالے۔ (المؤمن - ۲۶)

کبھی کہتا:

أَوْ أَنْ يُظْهِرَ فِي الْأَرْضِ الْفَسَادَ

مجھے ڈر ہے کہ یہ تمہاری زمین پر فتنہ و فساد برپا نہ کر دے۔ (المؤمن - ۲۶)

کبھی حضرت موسیٰ پر تہمت لگاتا، کبھی انہیں دھمکی دیتا، کبھی اہل مصر کے سامنے اپنی قدرت و شوکت کا مظاہرہ کرتا اور کبھی بڑی مکاری سے اپنے آپ کو ایک ایسے رہبر کی حیثیت سے پیش کرتا کہ جو ان کی خیر اور اصلاح کا ضامن ہے اور چونکہ روزِ قیامت ہر قوم وقت اور ہر گروہ اپنے رہبر کے ساتھ محشور ہوگا اور اس جہان کے رہبر وہاں بھی رہبر شمار ہوں گے لہٰذا فرعون بھی کہ جو اپنے زمانے کے گمراہوں کا رہبر تھا میدانِ حشر میں ان کے آگے آگے ہوگا (یقدم قومہ یوم القیامۃ)۔ لیکن یہ پیشوا اپنے پیروکاروں کو اس جلا دینے والی گرمی میں کسی ٹھنڈے میٹھے پانی کے خوشگوار چشمے کے کنارے لے جانے کی بجائے انہیں آتش جہنم میں لے کر داخل ہوگا (فاوردھم النار)۔ اور کیسی بُری چیز ہے کہ آگ انسان کے لیے پانی کا گھاٹ قرار پائے کہ جس میں وہ داخل ہو (وبئس الورد المورود)۔ وہ چیز کہ جو تشنگی دور کرنے کی بجائے انسان کے سارے وجود کو جلا دے اور سیراب کرنے کی بجائے اس کی پیاس اور بھڑکا دے۔

توجہ رہے کہ "ورود" دراصل پانی کی طرف چلنے اور اس کے قریب ہونے کے معنی میں ہے لیکن بعد ازاں

ہر قسم کی چیز کے کسی چیز پر داخل ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

"ورود" (بروزن "ذکر") اس پانی کے معنی میں ہے جس پر انسان وارد ہو اور پانی پر وارد ہونے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

اور "مورود" اس پانی کو کہتے ہیں جس پر وارد ہوا جائے (یہ اسم مفعول ہے)۔

اس بناء پر "بئس الورد المورود" کا معنی یہ ہوگا: آگ پانی پینے کی بُری جگہ ہے کہ جس پر وہ وارد ہوں گے[1]

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد والا جہان جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، ایک ایسا عالم ہے کہ جہاں اس دنیا کے ہمارے اعمال و افعال ایک وسیع صورت (ENLARGED FORM) میں مجسم ہوں گے۔ اُس جہان کی خوش بختیاں اور بدبختیاں ہمارے اس جہان کے کاموں کا پَرتو ہیں۔ جو اشخاص یہاں اہل بہشت کے رہبر و رہنما ہیں وہاں بھی وہ مختلف گروہوں کو جنت اور سعادت کی طرف لے جائیں گے اور جو لوگ یہاں ستمگروں، گمراہوں اور دوزخیوں کے رہبر ہیں وہاں بھی اپنے پیروکاروں کو جہنم کی طرف لے جائیں گے اور خود ان کے آگے آگے ہوں گے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: اس جہان میں وہ لعنتِ خدا سے ملحق ہوگئے، سخت عذاب اور سزا میں گرفتار ہوگئے اور ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں میں غرق ہوگئے اور روزِ قیامت بھی رحمتِ الٰہی سے دور ہوں گے (واتبعوا فی ھذہ لعنۃ و یوم القیامۃ)۔

ان کا ننگین نام صفحاتِ تاریخ میں ہمیشہ کے لیے ایک گمراہ اور جابر قوم کے عنوان سے ثبت ہوگا۔ لہٰذا انہیں اس دنیا میں بھی نقصان اٹھانا پڑا اور دوسرے جہان میں بھی، اور جہنم کی آگ انہیں دیا جانے والا کیسا بُرا عطیہ ہے (بئس الرفد المرفود)۔

"رفد" دراصل کوئی کام انجام دینے میں مدد کرنے کے معنی میں ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی چیز کو دوسری چیز کا سہارا قرار دیا جائے تو اسے بھی "رفد" سے تعبیر کرتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ یہ لفظ عطا اور بخشش کے معنی میں استعمال ہونے لگا کیونکہ یہ عطا کرنے والے کی طرف سے اس کی مدد ہوتی ہے جسے عطا کی جارہی ہو[2]

---

[1] ترکیب نحوی کے لحاظ سے یہ جملہ اس طرح ہے:

"بئس" فعل ذم ہے۔ اس کا فاعل "الورد" ہے۔ "المورود" صفت ہے اور مخصوص بالذم لفظ "النار" ہے، جو محذوف ہے۔

بعض علماء نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ "المورود" مخصوص بالذم ہے اور آیت میں کوئی چیز محذوف نہیں ہے لیکن پہلا احتمال زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔

[2] ترکیب نحوی کے لحاظ سے یہ جملہ اس طرح ہے جس طرح ہم نے "بئس الورد المورود" بیان کیا ہے۔

(۱۰۰) ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ○

(۱۰۱) وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَمَاۤ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ○

(۱۰۲) وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ○

(۱۰۳) اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ○

(۱۰۴) وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ○

ترجمہ

(۱۰۰) یہ شہروں اور آبادیوں کی خبریں ہیں کہ جو ہم تجھ سے بیان کرتے ہیں کہ جن میں سے بعض ابھی تک قائم ہیں اور بعض کٹ چکی ہیں (اور ختم ہو چکی ہیں)۔

(۱۰۱) ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا ہے اور جب عذاب الٰہی کا حکم آپہنچا تو وہ خدا کہ جنہیں وہ ۔ اللہ ۔ کے سوا پکارتے تھے انہوں نے ان کی مدد نہ کی اور ان کے لیے ہلاکت کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کیا۔

(۱۰۲) اور تیرے پروردگار کا عذاب ایسا ہی ہوتا ہے جب وہ ظالم شہروں اور آبادیوں

کو سزا دیتا ہے۔ (جی ہاں) اس کی سزا اور عذاب دردناک اور شدید ہوتا ہے۔

(۱۰۳) اس میں اس شخص کے لیے نشانی ہے کہ جو عذاب آخرت سے ڈرتا ہے۔ وہی دن کہ جب لوگ جمع ہوں گے اور وہ دن کہ جس کا مشاہدہ سب کریں گے۔

(۱۰۴) اور ہم اس میں محدود مدت کے سوا تاخیر نہیں کریں گے۔

تفسیر

اس سورہ کی آیات میں گزشتہ اقوام میں سے سات کی سرگزشت بیان کی گئی ہے اور کچھ حصہ ان کے انبیاء کی تاریخ کا بھی بیان ہوا ہے۔ ان میں سے ہر سرگزشت بھرپور انسانی زندگی کے مختلف زاویوں کا اہم حصہ واضح کرتی ہے اور ہر ایک میں عبرت کے بہت سے درس ہیں۔ یہاں ان تمام واقعات کی طرف مجموعی طور پر اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ شہروں اور آبادیوں کے واقعات کا ایک حصّہ ہے کہ جو ہم تجھ سے بیان کر رہے ہیں (ذالك من انباء القرٰی نقصه علیك)۔ وہی شہر اور آبادیاں جن کے کچھ حصے ابھی قائم ہیں اور کچھ حصے کشت زار کی طرح کٹ چکے ہیں اور تباہ ہو چکے ہیں (منها قائم وحصید)۔

۔ قائم۔ گزشتہ اقوام کے ان شہروں اور آبادیوں کی طرف اشارہ ہے جو ابھی باقی ہیں، مثلاً سرزمین مصر کہ جہاں فرعونی رہا کرتے تھے اور یہ علاقہ اس ظالم قوم کے غرق ہو جانے کے بعد بھی اسی طرح باقی ہے۔ اس کے باغات، کھیت اور بہت سی خیرہ کن عمارتیں ابھی تک باقی ہیں۔

"حصید" کا معنی ہے "کٹ جانے والی" یہ ایسی سرزمینوں اور بستیوں کی طرف اشارہ ہے جو قوم نوح اور قوم لوط کے علاقوں کی طرح ہیں کہ جن میں سے ایک بستی پانی میں غرق ہو گئی اور دوسری زیر و زبر ہو گئی اور ان پر سنگباری ہوئی۔

لیکن یہ گمان نہ کرنا کہ ہم نے ان پر ظلم کیا ہے بلکہ انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے (وما ظلمناهم ولکن ظلموا انفسهم)۔

انہوں نے بتوں اور جھوٹے خداؤں کی پناہ لی لیکن وہ جن خداؤں کو پروردگار کے مقابلے میں پکارتے تھے انہوں نے ان کی کوئی مشکل حل نہ کی (فما اغنت عنهم اٰلهتهم التی یدعون من دون الله من شیء لما جاء امر ربك)۔

جی ہاں! ان مکار اور دھوکا باز خداؤں نے ان کے لیے ضرر، نقصان، ہلاکت اور بدبختی کے سوا کسی

چیز کا کوئی اضافہ نہ کیا (وما زادوھم غیر تتبیب)[1]

جی ہاں! تیرے پروردگار کی سزا ان شہروں اور آبادیوں کے لیے اسی طرح تھی جنہوں نے ظلم کیا کہ جب اللہ نے انہیں سپرد ہلاکت کیا (وکذالک اخذ ربک اذا اخذ القریٰ وھی ظالمۃ)۔ یقیناً اللہ کی سزا اور عذاب دردناک اور شدید ہے (ان اخذہ الیم شدید)۔

یہ خدا کا ایک عمومی قانون ہے۔ یہ ایک ہمیشگی مناسبت اور دائمی طریقہ ہے کہ جو قوم و ملت اپنے ہاتھ آلودۂ ظلم کرے، خدائی قوانین کی سرحد سے تجاوز کرے اور انبیاء الٰہی کی رہبری، رہنمائی اور پند و نصائح کی پرواہ نہ کرے تو خدا آخرکار انہیں سختی سے جکڑ لیتا ہے اور پنجۂ عذاب میں پکڑ لیتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مندرجہ بالا طریقہ کار ایک عمومی طرزِ عمل ہے اور دائمی سنت ہے۔ یہ سنت دیگر قرآنی آیات سے بھی اچھی طرح معلوم ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقت دراصل تمام اہلِ دنیا کو خبردار کرتی ہے کہ تم یہ خیال ہرگز نہ کرو کہ تم اس قانون سے مستثنیٰ ہو یا یہ حکم گزشتہ اقوام کے ساتھ مخصوص تھا۔

البتہ "ظلم" کے وسیع معنی میں تمام گناہ شامل ہیں۔

نیز یہ جو "ھی ظالمۃ" کہہ کر بستی، شہر اور آبادی کو ظالم کہا گیا ہے حالانکہ یہ صفت شہر اور آبادی کے ساکنوں سے مربوط ہے۔ یہ گویا اس لطیف نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ظلم و ستم اور بیدادگری میں اتنے ڈوبے ہوئے ہیں کہ گویا شہر کا شہر ظلم و ستم کا حصہ بن گیا ہے۔ یہ تعبیر فارسی زبان کی اس تعبیر سے ملتی جلتی ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ فلاں شہر کے در و دیوار سے ظلم برستا ہے۔ اور یہ چونکہ ایک عمومی قانون ہے اس لیے بلافاصلہ فرمایا گیا ہے: یہ عبرت انگیز سرگزشتیں اور دردناک شوم اور منحوس حوادث کہ جو گزشتہ لوگوں پر گزرے ہیں ان میں اُن راہِ حق پانے والوں کے لیے نشانی ہے کہ جو عذابِ آخرت سے ڈرتے ہیں (ان فی ذالک لاٰیۃ لمن خاف عذاب الاٰخرۃ)۔ کیونکہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی ہر چیز حقیر اور معمولی ہے یہاں تک کہ اس کی سزائیں اور عذاب بھی۔ دوسرا جہان ہر لحاظ سے وسیع تر ہے اور وہ لوگ جو قیامت پر ایمان رکھتے ہیں دنیا کے یہ نمونے دیکھ کر ہل جاتے ہیں، عبرت حاصل کرتے ہیں اور ان کے سامنے راستہ کھل جاتا ہے۔

آیت کے آخر میں روزِ قیامت کے دو اوصاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ ایسا دن ہے کہ جس میں سب لوگ جمع ہوں گے (ذالک یوم مجموع لہ الناس)۔ وہ ایسا دن ہے کہ جو تمام لوگوں کا مشہود ہے (و ذالک یوم مشھود)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جیسے اس جہان میں خدائی قوانین و سنن عمومی اور سب کے لیے ہیں اُس عدالت میں بھی لوگوں کا اجتماع ہوگا۔ یہاں تک کہ ایک ہی وقت اور زمانے میں ہوگا۔ ایسا دن جو سب کے لیے واضح اور آشکار ہے۔ اس طرح کہ تمام انسان اس میں حاضر ہوں گے اور اسے دیکھیں گے۔

---

[1] "تتبیب" کا مادہ "تب" ہے۔ اس کا معنی ہے نقصان اور خسارے میں استمرار۔ نیز یہ لفظ ہلاکت اور نابودی کے معنی میں بھی آیا ہے۔

(۹۱) قَالُوا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرٰىكَ فِينَا ضَعِيفًا ۖ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۖ وَمَآ أَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ○

(۹۲) قَالَ يٰقَوْمِ أَرَهْطِيٓ أَعَزُّ عَلَيْكُم مِّنَ اللّٰهِ ۖ وَاتَّخَذْتُمُوهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۖ إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ○

(۹۳) وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۙ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۖ وَارْتَقِبُوٓا إِنِّي مَعَكُمْ رَقِيبٌ ○

ترجمہ

(۹۱) انہوں نے کہا: اے شعیب! بہت سی وہ باتیں جو تُو کہتا ہے ہم نہیں سمجھ پاتے اور ہم تجھے اپنے مابین کمزور پاتے ہیں اور اگر تیرے چھوٹے سے قبیلے کا احترام پیشِ نظر نہ ہوتا تو ہم تجھے سنگسار کرتے اور تُو ہمارے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتا۔

(۹۲) اس نے کہا: اے قوم! کیا میرا چھوٹا سا قبیلہ تمہارے نزدیک خدا سے زیادہ عزت دار ہے جبکہ تم نے اس کے فرمان کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ جو کچھ تم انجام دیتے ہو میرا پروردگار اس پر محیط ہے (اور اس سے آگاہ ہے)۔

(۹۳) اے قوم! جو کچھ تم سے ہو سکے کر گزرو اور میں بھی اپنا کام کروں گا اور عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ خوار و رسوا کرنے والا عذاب کس کے پیچھے آتا ہے اور کون جھوٹا ہے۔

تم انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

تفسیر

ایک دوسرے کو دھمکیاں

یہ عظیم پیغمبر۔ حضرت شعیبؑ کہ انتہائی بچے تلے، بلیغ اور دلنشین کلام کی وجہ سے جن کا لقب "خطیب الانبیاء" ہے۔ ان کا کلام ان لوگوں کی روحانی و مادی زندگی کی راہیں کھولنے والا تھا۔ انہوں نے بڑے صبر حوصلے، متانت اور دلسوزی کے ساتھ ان سے تمام باتیں کیں لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس گمراہ قوم نے انہیں کس طرح سے جواب دیا۔

انہوں نے چار جملوں میں کہ جو ڈھٹائی، جہالت اور بے خبری کا مظہر تھے آپ کو جواب دیا۔

پہلے وہ کہنے لگے: اے شعیب! تمہاری زیادہ تر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں (قالوا یاشعیب ما نفقہ کثیرًا مما تقول)۔ بنیادی طور پر تیری باتوں کا کوئی سر پیر ہی نہیں۔ ان میں کوئی خاص بات اور منطق ہی نہیں کہ ہم ان پر کوئی غور و فکر کریں۔ لہٰذا ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جس پر ہم عمل کریں اس لیے تم اپنے آپ کو زیادہ نہ تھکاؤ اور دوسرے لوگوں کے پیچھے جاؤ۔

دوسرا یہ کہ ہم تجھے اپنے مابین کمزور پاتے ہیں (وانا لنرٰىك فینا ضعیفًا)۔ لہٰذا اگر تم یہ سوچتے ہو کہ تم اپنی بے منطق باتیں طاقت کے بل پر منوا لوگے تو یہ بھی تمہاری غلط فہمی ہے۔

یہ گمان نہ کرو کہ اگر ہم تم سے پوچھ گچھ نہیں کرتے تو یہ تمہاری طاقت کے خوف سے ہے "اگر تیری قوم و قبیلہ کا احترام پیش نظر نہ ہوتا تو ہم تجھے بدترین طریقے سے قتل کر دیتے اور تجھے سنگسار کرتے (ولولا رھطك لرجمناك)۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ انہوں نے حضرت شعیبؑ کے قبیلے کو "رھط" کے لفظ سے یاد کیا کہ جس کا لغت عرب میں تین سے کم تعداد سے لے کر سات یا دس یا بعض کے بقول زیادہ سے زیادہ چالیس افراد پر اطلاق ہوتا ہے۔[1] یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تیرے قبیلے کی بھی ہماری نظر میں کوئی طاقت نہیں بلکہ دوسرے لحاظ ہیں جو ہمیں اس کام سے روکتے ہیں۔ یہ بالکل اس طرح ہے جیسے ہم کسی سے کہتے ہیں کہ اگر تیری قوم اور خاندان کے ان چار افراد کا لحاظ نہ ہو تو ہم تیرا حق تیرے ہاتھ پر رکھ دیتے جبکہ در اصل اس کی قوم اور خاندان کے وہی چار افراد نہیں ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ طاقت کے لحاظ سے اہمیت نہیں رکھتے۔

---

[1] سفینۃ البحار مادہ "شعیب"۔

آخر میں انہوں نے کہا: تو ہمارے لیے کوئی طاقتور اور ناقابلِ شکست شخص نہیں ہے (وما انت علینا بعزیز)۔ اگرچہ تو اپنے قبیلے کے بزرگوں میں شمار ہوتا ہے لیکن جو پروگرام تیرے پیشِ نظر ہے اس کی وجہ سے ہماری نگاہ میں تیری کوئی وقعت اور منزلت نہیں ہے۔

حضرت شعیبؑ ان باتوں کے نشتروں اور توہین آمیز رویے سے (سیخ پا ہو کر) اٹھ کر نہ چلے گئے بلکہ آپ نے اسی طرح انہیں پُرمنطق اور بلیغ پیرائے میں جواب دیا: اے قوم! کیا میرے قبیلے کے یہ چند افراد تمہارے نزدیک خدا سے زیادہ عزیز ہیں (قال یا قوم ارھطی اعز علیکم من اللہ)۔ تم میرے خاندان کی خاطر کہ جو تمہارے بقول چند نفر سے زیادہ نہیں ہے مجھے آزار نہیں پہنچاتے ہو تو کیوں خدا کے لیے تم میری باتوں کو قبول نہیں کرتے ہو۔ کیا عظمتِ خدا کے سامنے چند افراد کی کوئی حیثیت ہے؟

کیا تم خدا کے کسی احترام کے قائل ہو، جبکہ اسے اور اس کے فرمان کو تم نے پس پشت ڈال دیا ہے" (واتخذتموہ وراءکم ظھریا)[1]

آخر میں حضرت شعیبؑ کہتے ہیں: یہ خیال نہ کرو کہ خدا تمہارے اعمال کو نہیں دیکھتا اور تمہاری باتیں نہیں سنتا۔ یقین جانو کہ میرا پروردگار ان تمام اعمال پر محیط ہے جو تم انجام دیتے (ان ربی بما تعملون محیط)۔

بلیغ سخن در وہ ہے کہ جو اپنی باتوں میں مدِمقابل کی تمام تنقیدوں کا جواب دے۔ قوم شعیب کے مشرکین نے چونکہ اپنی باتوں کے آخر میں ضمناً انہیں سنگسار کرنے کی دھمکی دی تھی اور ان کے سامنے اپنی طاقت کا اظہار کیا تھا لہٰذا ان کی دھمکی کے جواب میں حضرت شعیبؑ نے اپنا موقف اس طرح سے بیان کیا: اے میری قوم! جو کچھ تمہارے بس میں ہے کرگزرو اور اس میں کوتاہی نہ کرو اور جو کچھ تم سے ہو سکتا ہے اس میں رُو رعایت نہ کرو (ویا قوم اعملوا علٰی مکانتکم)[2] میں بھی اپنا کام کروں گا (انی عامل)۔ لیکن تم جلد سمجھ جاؤ گے کہ کون رسوا کن عذاب میں

---

[1] عربی زبان میں جب کسی چیز کے بارے میں اپنی بے اعتنائی کا اظہار کرتے ہیں تو کہتے ہیں "جعلتہ تحت قدمی" یا "جعلتہ دبر اذنی" یا "جعلتہ وراء ظھری" یا "جعلتہ ظھریا" (یعنی وہ میرے زیرِ پا ہے یا اسے میں نے پس پشت ڈال رکھا ہے وغیرہ)۔ اور "ظھری" کا مادہ "ظھر" (بروزن "قہر") ہے اور "ی" یہاں یائے نسبت ہے اور "ظ" کے نیچے زیر ان تبدیلیوں کی بنا پر ہے جو کبھی اسم منسوب میں کی جاتی ہیں۔

[2] "مکانۃ" مصدر یا اسم مصدر ہے اور یہ کسی چیز پر قدرت رکھنے کے معنی میں ہے۔

گرفتار ہوتا ہے اور کون جھوٹا ہے میں یا تم (سوف تعلمون من یأتیہ عذاب یخزیہ ومن ھو کاذب)۔

اور اب جبکہ معاملہ اس طرح ہے تو تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں (وارتقبوا انی معکم رقیب)[1]

تم اپنی طاقت، تعداد، سرمائے اور اثر و رسوخ سے مجھ پر کامیابی کے انتظار میں رہو اور میں بھی اس انتظار میں ہوں کہ عنقریب دردناک عذاب الٰہی تم جیسی گمراہ قوم کے دامن گیر ہو اور تمہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔

---

[1] "رقیب" کا معنی ہے محافظ، نگران اور نگہبان۔ یہ دراصل "رقبہ" سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے "گردن"۔ یہ معنی یا اس کے لیے کہ پھر گردن کا محافظ اور نگران اس کی حفاظت کرتا ہے کہ جو اس کی حفاظت میں ہو (یہ اس سے کنایہ ہے کہ اس کی جان کی حفاظت کرتا ہے) یا اس بنا پر کہ وہ گردن اونچی رکھتا ہے تاکہ پاسداری اور حفاظت کا کام انجام دے سکے۔

(۹۴) وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝

(۹۵) كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ۝

ترجمہ

(۹۴) اور جب ہمارا فرمان آپہنچا تو ہم نے شعیب کو اور ان پر ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت کے ذریعے نجات دی اور جنہوں نے ظلم کیا تھا انہیں (آسمانی) صیحہ نے آلیا اور وہ اپنے گھروں میں منہ کے بل گرے (اور مر گئے)۔

(۹۵) اس طرح کہ گویا وہ ان گھروں میں رہتے ہی نہ تھے۔ دُور ہو مدین (رحمت خدا سے) جیسے کہ قوم ثمود دور ہوئی۔

تفسیر

مدین کے تباہ کاروں کا انجام

گزشتہ اقوام کی سرگزشت کے بارے میں قرآن مجید میں ہم نے بارہا پڑھا ہے کہ پہلے مرحلے میں انبیاء انہیں خدا کی طرف دعوت دینے کے لیے قیام کرتے تھے اور ہر طرح سے تعلیم و تربیت اور پند و نصیحت میں کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے تھے۔ دوسرے مرحلے میں جب ایک گروہ پر پند و نصائح کا کوئی اثر نہ ہوتا تو انہیں عذاب الٰہی سے ڈراتے تاکہ وہ آخری افراد تسلیم حق ہو جائیں جو قبولیت کی اہلیت رکھتے ہیں اور وہ راہ خدا کی طرف پلٹ آئیں نیز اتمام حجت ہو جائے۔

تیسرے مرحلے میں جب ان میں سے کوئی چیز مؤثر نہ ہوتی تو روئے زمین کی ستھرائی اور پاکبازی کے لیے سنت الٰہی کے مطابق عذاب آجاتا اور راستے کے ان کانٹوں کو دُور کر دیتا۔

قوم شعیب یعنی اہل مدین کا بھی آخرکار مرحلۂ انجام آپہنچا چنانچہ قرآن کہتا ہے : جب (اس گمراہ ، ظالم اور ہٹ دھرم قوم کو عذاب دیئے جانے کے بارے میں) ہمارا فرمان آپہنچا تو ہم نے شعیب اور اس پر ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت کی برکت سے نجات دی (ولما جاء امرنا نجینا شعیبًا والذین اٰمنوا معه برحمة منا)۔ پھر آسمانی پکار اور مرگ آفریں عظیم صیحہ نے ظالموں اور ستمگروں کو اپنی گرفت میں لے لیا (واخذت الذین ظلموا الصیحة)۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں "صیحہ" ہر قسم کی عظیم آواز اور پکار کے معنی میں ہے۔ قرآن نے بعض قوموں کی نابودی صیحۂ آسمانی کے ذریعے بتائی ہے۔ یہ صیحہ احتمالاً صاعقہ کے ذریعے اور اس کی مانند ہوتی ہے اور جیسا کہ ہم نے قوم ثمود کی داستان میں بیان کیا ہے کہ صوتی امواج بعض اوقات اس قدر قوی ہو سکتی ہیں کہ ایک گروہ کی موت کا سبب بن جائیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے : اس آسمانی صیحہ کے اثر سے قوم شعیب کے لوگ اپنے گھروں میں منہ کے بل جا گرے اور مر گئے اور ان کے بے جان جسم درس عبرت بنے ہوئے ایک مدت تک وہیں پڑے رہے (فاصبحوا فی دیارھم جاثمین)۔ ان کی زندگی کی کتاب اس طرح بند کر دی گئی کہ گویا کبھی وہ اس سرزمین کے ساکن ہی نہ تھے (کان لم یغنوا فیھا)۔

وہ تمام دولت و ثروت کہ جس کی خاطر انہوں نے گناہ اور ظلم و ستم کیے نابود ہو گئی، ان کی زمینیں اور زرق برق زندگی ختم ہو گئی اور ان کا شور و غوغا خاموش ہو گیا اور آخرکار جیسا کہ قوم عاد و ثمود کی داستان کے آخر میں بیان ہوا ہے فرمایا گیا ہے : دُور ہو سرزمین مدین لطف و رحمت پروردگار سے جیسے کہ قوم ثمود دور ہوئی (الا بعدًا لمدین کما بعدت ثمود)۔

واضح ہے کہ یہاں "مدین" سے مراد اہل مدین ہیں جو رحمت خدا سے دُور ہوتے۔

شعیبؑ کی داستان میں تربیتی درس

انبیاء کے حالات اور گزشتہ اقوام کی داستانیں ہمیشہ بعد کی اقوام کے لیے الہام بخش اور سبق آموز ہوتی ہیں کیونکہ ان کی زندگی کی آزمائشیں کہ جو بعض اوقات دسیوں سال یا سینکڑوں سال تک جاری رہیں تاریخ کے چند صفحات میں سمٹ کر سب کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں اور ہر کوئی اپنی زندگی میں ان سے سبق حاصل کر سکتا ہے ۔ اس عظیم پیغمبر حضرت شعیبؑ کی زندگی بھی ہمیں بہت سے درس دیتی ہے، مثلاً :

۱۔ **اقتصادی مسائل کی اہمیت :** اس سرگزشت میں ہم نے پڑھا ہے کہ حضرت شعیبؑ نے انبیاء دعوت توحید کے بعد مال اور تجارت میں حق و عدالت کی دعوت دی۔ یہ چیز نشاندہی کرتی ہے کہ ایک معاشرہ کے اقتصادی مسائل کو معمولی اور غیر اہم شمار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ انبیاء صرف اخلاقی مسائل

کے لیے مامور نہ تھے بلکہ اجتماعی اور اقتصادی کیفیت کی خرابی کی اصلاح بھی ان کی دعوت کا ایک اہم حصہ تھی، اس حد تک اہم کہ وہ اسے دعوتِ توحید کے ساتھ قرار دیتے تھے۔

۲۔ نماز۔ توحید اور پاکیزگی کی طرف دعوت دیتی ہے: حضرت شعیبؑ کی گمراہ قوم نے بڑے تعجب سے ان سے پوچھا کہ کیا تیری یہ نماز بتوں کی پرستش نہ کرنے اور کم فروشی اور دھوکا بازی نہ کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ ان حرکات اور اذکار کا ان امور میں کیا دخل ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان قوی ترین رابطہ ہے۔ اگر نماز اپنے حقیقی مفہوم کے ساتھ ادا ہو یعنی انسان اپنے تمام وجود کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں کھڑا ہو تو یہ حضور تکامل و ارتقاء کا زینہ، تربیتِ روح کا وسیلہ اور دل سے گناہ کا زنگ صاف کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہ حضور انسان کے ارادہ کو قوی اور اس کے عزم کو راسخ کرتا ہے اور غرور و تکبر کو اس سے دُور کرتا ہے۔

۳۔ خود بینی جمود کا باعث ہے: جیسا کہ مندرجہ بالا آیات سے ہمیں معلوم ہوا ہے قوم شعیب کے افراد خود خواہ اور خود بین تھے۔ وہ اپنے آپ کو فہمیدہ اور سمجھدار خیال کرتے تھے۔ حضرت شعیبؑ کو نادان سمجھتے تھے ان کا مذاق اڑاتے تھے، ان کی باتوں کو بے معنی اور ان کی شخصیت کو کمزور جانتے تھے۔ اس خود پرستی اور خود بینی نے ان کی زندگی کو تاریک کر دیا تھا اور انہیں خاکِ سیاہ پر لا بٹھایا تھا۔

نہ فقط انسان بلکہ اگر جانور بھی خود بین ہو تو وہ راستے میں اٹک کر رہ جاتا ہے۔ کہتے ہیں گھوڑا سوار ایک شخص ایک نہر کے پاس پہنچا لیکن اس نے حیرت سے دیکھا کہ گھوڑا ایک چھوٹی سی اور کم گہری نہر سے گزرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ ایک دانا شخص کا وہاں سے گزر ہوا۔ اس نے کہا: نہر کے پانی کو ہلاؤ تاکہ وہ مٹی سے آلودہ ہو جائے، مشکل حل ہو جائے گی۔ اس نے یہ کام کیا۔ گھوڑے نے آرام سے اسے عبور کر لیا۔ اس پر لوگ بہت حیران ہوئے۔ انہوں نے اس دانا شخص سے اس کی وجہ دریافت کی۔

اس مردِ حکیم نے کہا: جب پانی صاف تھا تو گھوڑے نے اپنا عکس پانی میں دیکھا۔ اس نے سمجھا کہ یہ وہ خود ہے۔ وہ تیار نہ ہوا کہ اپنا ہی پاؤں اپنے آپ پر رکھے لیکن جب پانی مٹی سے آلودہ ہو گیا تو اس کا عکس غائب ہو گیا اور وہ آسانی سے وہاں سے گزر گیا۔

۴۔ اصولوں کو تعصب پر قربان نہیں کرنا چاہیئے: اس سرگزشت میں ہم نے پڑھا ہے کہ اس گمراہ قوم کی بدبختی کے عوامل میں سے ایک یہ تھا کہ وہ ذاتی کینہ پرستی اور عداوتوں کی وجہ سے حقائق کو بھلا دیتے تھے حالانکہ عقلمند اور حقیقت شناس وہ انسان ہے کہ ہر شخص سے حق بات سنے اور اسے قبول کرے چاہے کہنے والا اس کا اوّل درجے کا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

۵۔ ایمان اور عمل ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہیں: ابھی بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ جن کا

خیال ہے کہ صرف عقیدہ رکھ کر ہی مسلمان ہوا جا سکتا ہے۔ اگرچہ وہ عمل نہ بھی کریں۔ بہت سے ایسے افراد ہیں کہ جو چاہتے ہیں کہ دین ان کی سرکش ہوا و ہوس کے راستے میں رکاوٹ نہ بنے۔ اور انہیں ہر لحاظ سے آزاد رکھے۔

داستانِ شعیبؑ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قوم بھی ایسے ہی دین کی خواہاں تھی۔ لہٰذا وہ حضرت شعیبؑ سے کہتے تھے کہ ہم نہ اس کے لیے تیار ہیں کہ اپنے بڑوں کے بتوں کو فراموش کریں اور نہ ہم اپنے سرمائے اور اموال کے بارے میں اپنی آزادی ہاتھ سے دیں گے۔ وہ یہ بات بھولے ہوتے تھے کہ اصولی طور پر شجرِ ایمان کا ثمر عمل ہے اور انبیاء کا دین و آئین اسی لیے تھا کہ انسان کی ذاتی خرابیوں، عملی کمزوریوں اور انحرافات کی اصلاح کرے ورنہ جس درخت کی نہ کوئی شاخ ہو نہ پتے اور نہ پھل وہ جلانے کے ہی کام آئے گا۔

انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے ایک طبقے میں یہ فکر بڑی راسخ ہو چکی ہے۔ وہ اسلام کو بس خشک عقائد کا ایک ایسا مجموعہ سمجھتے ہیں کہ جو فقط مسجد کے اندر ان کے ساتھ ہے اور جونہی وہ مسجد کے دروازے سے باہر نکلتے ہیں تو اسے خدا حافظ کہہ دیتے ہیں۔ ان کے دفتروں میں، بازاروں میں اور کاروبار میں اسلام کا کوئی عمل دخل اور نام و نشان نہیں ہے۔

بہت سے اسلامی ممالک کو ہم نے دیکھا ہے یہاں تک کہ وہ ممالک جو ظہورِ اسلام کا مرکز تھے وہاں یہ تلخ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ اسلام چند عقائد اور چند کم روح عبادات میں منحصر ہو گیا ہے۔ علم و آگہی، عدالتِ اجتماعی، رشدِ ثقافتی، بینشِ فرہنگی اور اخلاقِ اسلامی میں سے کسی چیز کا نام و نشان اور خبر نہیں ہے۔ اگرچہ خوش بختی سے چند ایک اسلامی تحریکوں کی وجہ سے خصوصاً نوجوان طبقے میں سچے اسلام اور ایمان و عمل کی یکجائی کی ایک تحریک پیدا ہوئی ہے۔ لہٰذا اب یہ جملہ کہ اسلام کو ہمارے عمل سے کیا کام یا اسلام کا تعلق دل سے ہے نہ کہ زندگی سے ، کم سنا جاتا ہے۔

نیز یہ جو التقاطی لوگوں (کہ جو کسی ایک مکتب کے پیروکار نہیں ہوتے) کا نظریہ ہے کہ ہم عقیدہ اسلام سے اور اقتصادیات مارکس سے لیتے ہیں یہ بھی قومِ شعیب کے گمراہوں کی سی طرزِ تفکر رکھتے ہیں۔ یہ نظریہ بھی قابلِ مذمت ہے۔ لیکن بہر حال یہ طرز فکر بھی قدیم زمانے سے ہے اور آج بھی موجود ہے۔ ہمیں اس کے خلاف جہاد کرنا چاہیئے۔

۴۔ بلا شرط اور لامحدود ملکیت فساد کا سرچشمہ ہے: قومِ شعیب اس اشتباہ میں گرفتار تھی کہ کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی شخص کے لیے اس کے اموال میں تصرف کے بارے میں تھوڑی سی بھی حد بندی کی بات کرے۔ یہاں تک کہ وہ حضرت شعیبؑ سے تعجب کرتے اور کہتے تھے کہ تجھ سا دانا شخص کیونکر ہمارے اموال کے بارے میں ہماری آزادیٔ عمل میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ انہوں نے یہ بات تمسخر کے طور پر کہی ہو یا حقیقت کے طور پر نشاندہی کرتی ہے کہ وہ مالی تصرفات میں کسی حد بندی کو خلافِ عقل سمجھتے تھے۔ حالانکہ یہی ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اگر لوگ اپنے اموال میں تصرف کرنے کے بارے میں آزاد ہوں تو پورا معاشرہ بدبختی اور خرابی کی لپیٹ میں آجائے گا۔ مالی امور کو صحیح اور نپے تلے ضوابط کے تابع ہونا چاہیئے۔ جیسے انبیاءِ الٰہی لوگوں کے سامنے

پیش کرتے تھے ورنہ معاشرہ تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔

۷۔ انبیاء کا ہدف فقط اصلاح تھا: یہ جو حضرت شعیبؑ نے فرمایا: "ان ارید الا الاصلاح ما استطعت" (میں تو فقط حتی المقدور اصلاح چاہتا ہوں)۔ یہ فقط ان کا شعار نہ تھا بلکہ تمام انبیاء اور تمام حقیقی راہبروں کا شعار تھا۔ ان کا گفتار و کردار ان کے اس ہدف کا شاہد ہے۔ وہ نہ لوگوں کی مشغولیت کے لیے آئے تھے، نہ ان کے گناہ بخشنے کے لیے، نہ انہیں جنت بیچنے کے لیے، نہ طاقتوروں کی حمایت کے لیے اور نہ عوام کے ذہنوں کو ماؤف کرنے کے لیے بلکہ ان کا ہدف اور مقصد ایک مکمل اور حقیقی اصلاح تھا۔ اصلاح سے ان کی مراد وسیع تر اصلاح تھی۔ فکر و نظر کی اصلاح، اخلاق کی اصلاح، معاشرے کے ثقافتی نظام کی اصلاح، اقتصادی اصلاح اور سیاسی اصلاح۔

خلاصہ یہ کہ معاشرے کے تمام پہلوؤں کی اصلاح ان کے مدنظر تھی۔

اور اس مقصد کے حصول کے لیے ان کا سہارا فقط خدا تھا۔ وہ کسی سازش اور دھمکی سے نہیں ڈرتے تھے جیسا کہ حضرت شعیبؑ نے کہا:

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب ٥

(۹۶) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۙ

(۹۷) اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ۝

(۹۸) یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ۝

(۹۹) وَاُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّیَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ۝

ترجمہ

(۹۶) ہم نے موسٰی کو اپنی آیات اور واضح دلیل کے ساتھ بھیجا۔

(۹۷) فرعون اور اس کے حواریوں کی طرف لیکن انہوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی جبکہ فرعون کا حکم رشد و نجات کا باعث نہیں تھا۔

(۹۸) وہ روزِ قیامت اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور وہ انہیں (جنت کے خوشگوار چشموں کی طرف لے جانے کی بجائے) آتشِ جہنم میں پہنچا دے گا اور کتنا بُرا ہے کہ آگ انسان کے لیے پانی کا گھاٹ قرار پائے۔

(۹۹) وہ اس جہان میں اور روزِ قیامت رحمتِ خدا سے دُور ہوں گے اور انہیں کیا بُرا تحفہ دیا جائے گا۔

تفسیر

فرعون کے ساتھ زبردست مقابلہ

حضرت شعیبؑ اور اہل مدین کی داستان ختم ہونے کے بعد اب ایک اشارہ حضرت موسیٰ بن عمران کی سرگزشت کے ایک پہلو کی طرف کیا گیا ہے۔ یہاں فرعون کے ساتھ ان کے مقابلوں کا ذکر ہے اور اس سورت میں یہ انبیاء الٰہی سے متعلق ساتویں داستان ہے۔

تمام پیغمبروں کی نسبت قرآن میں حضرت موسیٰؑ کا واقعہ زیادہ آیا ہے۔ تیس سے زیادہ سورتوں میں موسیٰؑ و فرعون اور بنی اسرائیل کے واقعہ کی طرف سو سے زیادہ مرتبہ اشارہ ہوا ہے۔

حضرت صالحؑ، شعیبؑ، ہودؑ اور لوطؑ جیسے انبیاء کہ جن کے واقعات ہم پڑھ چکے ہیں کی نسبت حضرت موسیٰؑ کے واقعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ ان انبیاء نے گمراہ قوموں کے خلاف قیام کیا تھا لیکن حضرت موسیٰؑ نے علاوہ ازیں ایک خودسر حکومت اور فرعون جیسے جابر حکمران کے خلاف قیام کیا تھا۔

اصولی طور پر صاف پانی کے لیے سرچشمے کو صاف کرنا چاہیئے۔ جب تک فاسد حکومتیں برسرِ اقتدار ہیں کوئی معاشرہ سعادت اور نیک بختی کا منہ نہیں دیکھے گا۔ خدائی رہبروں کو ایسے معاشروں میں سب سے پہلے فساد کے ان مراکز کو درہم برہم کرنا چاہیئے۔

توجہ رہے کہ یہاں ہم حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کے ایک مختصر سے گوشے کا مطالعہ کریں گے کہ جو مختصر ہونے کے باوجود تمام انسانوں کو ایک عظیم پیغام دے رہا ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہو رہا ہے: ہم نے موسیٰ کو اپنے عطا کردہ معجزات اور قوی دلیل و منطق کے ساتھ بھیجا (ولقد ارسلنا موسٰی بأیاتنا و سلطان مبین)۔

"سلطان" کا معنی ہے "تسلط"۔ یہ کبھی ظاہری تسلط کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی منطقی تسلط کے معنی میں، یعنی ایسا تسلط کہ جو مخالف کے سامنے ایسی دیوار بن جائے کہ اسے فرار کا کوئی راستہ نہ ملے۔

مندرجہ بالا آیت میں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "سلطان" دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے اور لفظ "آیات" حضرت موسیٰؑ کے واضح معجزات کی طرف اشارہ ہے۔ مفسرین نے ان دو لفظوں کے بارے میں دیگر احتمالات بھی ذکر کیے ہیں۔

بہرحال موسیٰؑ کو سرکوبی کرنے والے ان معجزات اور قوی منطق کے ساتھ "ہم نے فرعون اور اس کے اطرافیوں کی طرف بھیجا" (الٰی فرعون و ملائہ)۔

جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے "ملأ" ایسے لوگوں کو کہا جاتا ہے کہ جن کا ظاہر آنکھوں کو پُر کر دیتا ہے اگرچہ وہ اندر سے خالی ہوتے ہیں۔ منطق قرآن میں اس کا اطلاق زیادہ تر اعیان و اشراف اور پُر فریب اشخاص پر ہوتا ہے جو

ظالم طاقتوں کے گرد رہتے ہیں۔

فرعون کے اطرافی جو دیکھ رہے تھے کہ حضرت موسیٰ کے قیام سے ان کے ناجائز مفادات خطرے میں ہیں حضرت موسیٰ کے معجزات اور منطق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر تیار نہ ہوتے لہٰذا انہوں نے حکم فرعون کی پیروی کی (فاتبعوا امر فرعون)۔ مگر فرعون کا حکم ہرگز ان کی سعادت کا ضامن اور سرمایۂ رشد و نجات نہیں ہو سکتا تھا (وما امر فرعون برشید)۔

البتہ فرعون کو یہ مقام آسانی سے نہیں مل گیا تھا بلکہ اس نے اپنے مقاصد کے لیے ہر طرح کے سازشی حربے استعمال کیے، طاقت استعمال کی اور حضرت موسیٰ کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا۔ یہاں تک کہ وہ اس کے لیے کوئی نفسیاتی ہتھکنڈہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

کبھی وہ کہتا تھا کہ موسیٰ چاہتا ہے کہ تم سے ساری زمینیں ہتھیا لے اور تمہیں کہ جو ان کے اصلی مالک ہو نکال باہر کرے۔ قرآن نے اس کی بات کو یوں نقل کیا ہے:

يُرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ (اعراف - ۱۱۰)

کبھی وہ اپنی قوم کے مذہبی احساس کو تحریک دیتا اور کہتا:

اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ

میں اس سے ڈرتا ہوں کہ یہ کہیں تمہارے دین ہی کو نہ بدل ڈالے۔ (المؤمن - ۲۶)

کبھی کہتا:

اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِى الْاَرْضِ الْفَسَادَ

مجھے ڈر ہے کہ یہ تمہاری زمین پر فتنہ و فساد برپا نہ کر دے۔ (المؤمن - ۲۶)

کبھی حضرت موسیٰ پر تہمت لگاتا، کبھی انہیں دھمکی دیتا، کبھی اہل مصر کے سامنے اپنی قدرت و شوکت کا مظاہرہ کرتا اور کبھی بڑی مکاری سے اپنے آپ کو ایک ایسے رہبر کی حیثیت سے پیش کرتا کہ جو ان کی خیر اور اصلاح کا ضامن ہے اور چونکہ روزِ قیامت ہر قوم و ملت اور ہر گروہ اپنے رہبر کے ساتھ محشور ہوگا اور اس جہان کے رہبر وہاں بھی رہبر شمار ہوں گے لہٰذا فرعون بھی کہ جو اپنے زمانے کے گمراہوں کا رہبر تھا میدانِ حشر میں ان کے آگے آگے ہوگا (یقدم قومہ یوم القیامۃ)۔ لیکن یہ پیشوا اپنے پیروکاروں کو اس جلا دینے والی گرمی میں کسی ٹھنڈے میٹھے پانی کے خوشگوار چشمے کے کنارے لے جانے کی بجائے انہیں آتشِ جہنم میں لے کر داخل ہوگا (فاوردھم النار)۔ اور کیسی بُری چیز ہے کہ آگ انسان کے لیے پانی کا گھاٹ قرار پائے کہ جس میں وہ داخل ہو (وبئس الورد المورود)۔ وہ چیز کہ جو تشنگی دور کرنے کی بجائے انسان کے سارے وجود کو جلا دے اور سیراب کرنے کی بجائے اس کی پیاس اور بھڑکا دے۔

توجہ رہے کہ "ورود" دراصل پانی کی طرف چلنے اور اس کے قریب ہونے کے معنی میں ہے لیکن بعد ازاں

ہر قسم کی چیز کے کسی چیز پر داخل ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

"وِرد" (بروزن "ذکر") اس پانی کے معنی میں ہے جس پر انسان وارد ہو اور پانی پر وارد ہونے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

اور "مورود" اس پانی کو کہتے ہیں جس پر وارد ہوا جائے (یہ اسم مفعول ہے)۔

اس بنا پر "بئس الورد المورود" کا معنی یہ ہوگا: آگ پانی پینے کی بُری جگہ ہے کہ جس پر وہ وارد ہوں گے[1]

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد والا جہان جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، ایک ایسا عالم ہے کہ جہاں اس دنیا کے ہمارے اعمال و افعال ایک وسیع صورت (ENLARGED FORM) میں مجسم ہوں گے۔ اُس جہان کی خوش بختیاں اور بدبختیاں ہمارے اس جہان کے کاموں کا پَرتو ہیں۔ جو اشخاص یہاں اہل بہشت کے رہبر و رہنما ہیں وہاں بھی وہ مختلف گروہوں کو جنت اور سعادت کی طرف لے جائیں گے اور جو لوگ یہاں ستمگروں، گمراہوں اور دوزخیوں کے رہبر ہیں وہاں بھی اپنے پیروکاروں کو جہنم کی طرف لے جائیں گے اور خود ان کے آگے آگے ہوں گے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: اس جہان میں وہ لعنتِ خدا سے ملحق ہو گئے، سخت عذاب اور سزا میں گرفتار ہو گئے اور ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں میں غرق ہو گئے اور روزِ قیامت بھی رحمتِ الٰہی سے دور ہوں گے (واتبعوا فی هذه لعنة و یوم القیامة)۔

ان کا ننگین نام صفحاتِ تاریخ میں ہمیشہ کے لیے ایک گمراہ اور جابر قوم کے عنوان سے ثبت ہوگا۔ لہٰذا انہیں اس دنیا میں بھی نقصان اٹھانا پڑا اور دوسرے جہان میں بھی، اور جہنم کی آگ انہیں دیا جانے والا کیسا بُرا عطیہ ہے (بئس الرفد المرفود)۔

"رفد" دراصل کوئی کام انجام دینے میں مدد کرنے کے معنی میں ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی چیز کو دوسری چیز کا سہارا قرار دیا جائے تو اسے بھی "رفد" سے تعبیر کرتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ یہ لفظ عطا اور بخشش کے معنی میں استعمال ہونے لگا کیونکہ یہ عطا کرنے والے کی طرف سے اس کی مدد ہوتی ہے جیسے عطا کی جاری ہو[2]

---

[1] ترکیب نحوی کے لحاظ سے یہ جملہ اس طرح ہے:
"بئس" فعل ذم ہے۔ اس کا فاعل "الورد" ہے "المورود" صفت ہے اور مخصوص بالذم لفظ "النار" ہے، جو محذوف ہے۔
بعض لوگوں نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ "المورود" مخصوص بالذم ہے اور آیت میں کوئی چیز محذوف نہیں ہے۔ لیکن پہلا احتمال زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔

[2] ترکیب نحوی کے لحاظ سے یہ جملہ اسی طرح ہے جس طرح ہم نے "بئس الورد المورود" بیان کیا ہے۔

(۱۰۰) ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ○

(۱۰۱) وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِىْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَىْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ○

(۱۰۲) وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ○

(۱۰۳) اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ○

(۱۰۴) وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ○

ترجمہ

(۱۰۰) یہ شہروں اور آبادیوں کی خبریں ہیں کہ جو ہم تجھ سے بیان کرتے ہیں کہ جن میں سے بعض ابھی تک قائم ہیں اور بعض کٹ چکی ہیں (اور ختم ہو چکی ہیں)۔

(۱۰۱) ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا ہے اور جب عذاب الٰہی کا حکم آپہنچا تو وہ خدا کہ جنہیں وہ۔ اللہ۔ کے سوا پکارتے تھے انہوں نے ان کی مدد نہ کی اور ان کے لیے ہلاکت کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کیا۔

(۱۰۲) اور تیرے پروردگار کا عذاب ایسا ہی ہوتا ہے جب وہ ظالم شہروں اور آبادیوں

کو سزا دیتا ہے۔ (جی ہاں) اس کی سزا اور عذاب دردناک اور شدید ہوتا ہے۔

(۱۰۳) اس میں اس شخص کے لیے نشانی ہے کہ جو عذاب آخرت سے ڈرتا ہے۔ وہی دن کہ جب لوگ جمع ہوں گے اور وہ دن کہ جس کا مشاہدہ سب کریں گے۔

(۱۰۴) اور ہم اس میں محدود مدت کے سوا تاخیر نہیں کریں گے۔

تفسیر

اس سورہ کی آیات میں گزشتہ اقوام میں سے سات کی سرگزشت بیان کی گئی ہے اور کچھ حصہ ان کے انبیاء کی تاریخ کا بھی بیان ہوا ہے۔ ان میں سے ہر سرگزشت بھرپور انسانی زندگی کے مختلف زاویوں کا اہم حصہ واضح کرتی ہے اور ہر ایک میں عبرت کے بہت سے درس ہیں۔ یہاں ان تمام واقعات کی طرف مجموعی طور پر اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ شہروں اور آبادیوں کے واقعات کا ایک حصہ ہے کہ جو ہم تجھ سے بیان کر رہے ہیں (ذالک من انباء القری نقصہ علیک)۔ وہی شہر اور آبادیاں جن کے کچھ حصے ابھی قائم ہیں اور کچھ حصے کشت زار کی طرح کٹ چکے ہیں اور تباہ ہو چکے ہیں (منھا قائم وحصید)۔

"قائم" گزشتہ اقوام کے ان شہروں اور آبادیوں کی طرف اشارہ ہے جو ابھی باقی ہیں۔ مثلاً سرزمین مصر کہ جہاں فرعونی رہا کرتے تھے اور یہ علاقہ اس ظالم قوم کے غرق ہو جانے کے بعد بھی اسی طرح باقی ہے۔ اس کے باغات، کھیت اور بہت سی غیرہ کن عمارتیں ابھی تک باقی ہیں۔

"حصید" کا معنی ہے "کٹ جانے والی" یہ ایسی سرزمینوں اور بستیوں کی طرف اشارہ ہے جو قوم نوح اور قوم لوط کے علاقوں کی طرح ہیں کہ جن میں سے ایک بستی پانی میں غرق ہو گئی اور دوسری زیر و زبر ہو گئی اور ان پر سنگباری ہوئی۔

لیکن یہ گمان نہ کرنا کہ ہم نے ان پر ظلم کیا ہے بلکہ انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے (وما ظلمناھم ولکن ظلموا انفسھم)۔

انہوں نے بتوں اور جھوٹے خداؤں کی پناہ لی لیکن وہ جن خداؤں کو پروردگار کے مقابلے میں پکارتے تھے انہوں نے ان کی کوئی مشکل حل نہ کی (فما اغنت عنھم اٰلھتھم التی یدعون من دون اللہ من شیء لما جاء امر ربک)۔

جی ہاں! ان مکار اور دھوکا باز خداؤں نے ان کے لیے ضرر، نقصان، ہلاکت اور بدبختی کے سوا کسی

چیز کا کوئی اضافہ نہ کیا (وما زادوھم غیر تتبیب) [1]

جی ہاں! تیرے پروردگار کی سزا ان شہروں اور آبادیوں کے لیے اسی طرح تھی جنہوں نے ظلم کیا کہ جب اللہ نے انہیں پکڑ و ہلاکت کیا (وکذالک اخذ ربك اذا اخذ القرٰی وھی ظالمة)۔ یقیناً اللہ کی سزا اور عذاب دردناک اور شدید ہے (ان اخذہ الیم شدید)۔

یہ خدا کا ایک عمومی قانون ہے۔ یہ ایک ہمیشگی مناسبت اور دائمی طریقہ ہے کہ جو قوم و ملت اپنے ہاتھ آلودۂ ظلم کرے، خدائی قوانین کی سرحد سے تجاوز کرے اور انبیاء الٰہی کی رہبری، رہنمائی اور پند و نصائح کی پرواہ نہ کرے تو خدا آخرکار انہیں سختی سے جکڑ لیتا ہے اور پنجۂ عذاب میں پکڑ لیتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مندرجہ بالا طریقہ کار ایک عمومی طرزِ عمل ہے اور دائمی سنت ہے۔ یہ سنت دیگر قرآنی آیات سے بھی اچھی طرح معلوم ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقت دراصل تمام اہلِ دنیا کو خبردار کرتی ہے کہ تم یہ خیال نہ کرو کہ تم اس قانون سے مستثنیٰ ہو یا یہ حکم گزشتہ اقوام کے ساتھ مخصوص تھا۔

البتہ ”ظلم“ کے وسیع معنی میں تمام گناہ شامل ہیں۔

نیز یہ جو ”ھی ظالمة“ کہہ کر بستی، شہر اور آبادی کو ظالم کہا گیا ہے حالانکہ یہ صفت شہر اور آبادی کے ساکنوں سے مربوط ہے، یہ گویا اس لطیف نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ظلم و ستم اور بیدادگری میں اتنے ڈوبے ہوئے ہیں کہ گویا شہر کا شہر ظلم و ستم کا حصہ بن گیا ہے۔ یہ تعبیر فارسی زبان کی اس تعبیر سے ملتی جلتی ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ فلاں شہر کے در و دیوار سے ظلم برستا ہے۔ اور یہ چونکہ ایک عمومی قانون ہے اس لیے بلا فاصلہ فرمایا گیا ہے: یہ عبرت انگیز سرگزشتیں اور دردناک شوم اور منحوس حوادث کہ جو گزشتہ لوگوں پر گزرے ہیں ان میں اُن راہِ حق پانے والوں کے لیے نشانی ہے کہ جو عذابِ آخرت سے ڈرتے ہیں (ان فی ذالك لاٰية لمن خاف عذاب الاٰخرة)۔ کیونکہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی ہر چیز حقیر اور معمولی ہے یہاں تک کہ اس کی سزائیں اور عذاب بھی۔ دوسرا جہان ہر لحاظ سے وسیع تر ہے اور وہ لوگ جو قیامت پر ایمان رکھتے ہیں دنیا کے یہ نمونے دیکھ کر ہل جاتے ہیں، عبرت حاصل کرتے ہیں اور ان کے سامنے راستہ کھل جاتا ہے۔

آیت کے آخر میں روزِ قیامت کے دو اوصاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ ایسا دن ہے کہ جس میں سب لوگ جمع ہوں گے (ذالك يوم مجموع له الناس)۔ وہ ایسا دن ہے کہ جو تمام لوگوں کا مشہود ہے (و ذالك يوم مشهود)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جیسے اس جہان میں خدائی قوانین و سنن عمومی اور سب کے لیے ہیں اُس عدالت میں بھی لوگوں کا اجتماع ہوگا۔ یہاں تک کہ ایک ہی وقت اور زمانے میں ہوگا۔ ایسا دن جو سب کے لیے واضح اور آشکار ہے۔ اس طرح کہ تمام انسان اس میں حاضر ہوں گے اور اسے دیکھیں گے۔

---

[1] ”تتبیب“ کا مادہ ”تب“ ہے اس کا معنی ہے نقصان اور خسارے میں استمرار۔ نیز یہ لفظ ہلاکت اور نابودی کے معنی میں بھی آیا ہے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ فرمایا گیا ہے : "یوم مجموع له الناس" یعنی ۔ ایسا دن جس کے لیے لوگ جمع ہوں گے ، یہ نہیں کہا کہ ۔ فیہ الناس ۔ یعنی ۔ اس میں لوگ جمع ہوں گے ۔ یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت کا دن صرف ایسا ظرف نہیں ہے کہ جس میں لوگ جمع ہوں گے بلکہ ایک ہدف اور مقصد ہے کہ جس کی طرف انسان اپنے تکامل و ارتقاء کے لیے بڑھیں گے ۔

سورہ تغابن کی آیہ ۹ میں بھی ہے :

يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ

وہ دن کہ جو جمع کرنے اور اجتماع کا دن ہے ، جو تم سب کو اکٹھا کرے گا اور وہ ایسا دن ہے کہ جس میں سب احساس زیاں کریں گے ۔

چونکہ ممکن ہے بعض لوگ کہیں کہ اس دن کے بارے میں گفتگو کرنا ادھار والی بات ہے ، معلوم نہیں وہ کب آئے گا ؟ لہٰذا قرآن بلافاصلہ کہتا ہے : اس دن کو ہم صرف ایک محدود زمانے کے لیے تاخیر میں ڈالیں گے (ومانؤخرہ الا لاجل معدود) ۔

وہ بھی ایک مصلحت کے لیے جو واضح ہے تاکہ عالم دنیا کے لوگ آزمائش اور پرورش کے میدان دیکھ لیں اور انبیاء کا آخری پروگرام عملی شکل اختیار کرلے اور یہ جہان تکامل و ارتقاء کے جس آخری سلسلے کی استعداد رکھتا ہے وہ ظاہر ہوجائے اور پھر اس جہان کے اختتام کا اعلان کیا جائے ۔

۔ معدود " (یعنی ۔ شمار کیا ہوا) ، یہ تعبیر قیامت کے نزدیک ہونے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جو چیز قابل شمار اور گنی جاسکے وہ محدود اور نزدیک ہے ۔

خلاصہ یہ کہ اس دن کی تاخیر غافلوں کو ہرگز مغرور نہ کر دے کیونکہ اگرچہ دیر ہوجائے قیامت آکر رہے گی ۔ یہاں تک کہ اس کے لیے دیر سے آنے کی تعبیر بھی صحیح نہیں ہے ۔

(۱۰۵) يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ ○

(۱۰۶) فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ ○

(۱۰۷) خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ ○

(۱۰۸) وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۖ عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوذٍ ○

ترجمہ

(۱۰۵) اور جس روز (قیامت) آجائے گی، کوئی شخص اس کی اجازت کے بغیر بات نہیں کرے گا۔ ان میں سے ایک گروہ شقی ہے اور ایک گروہ سعادت مند (ایک گروہ بدبخت ہے اور ایک نیک بخت ہے)۔

(۱۰۶) جو شقی ہیں وہ آگ میں ہیں اور ان کے لیے زفیر و شہیق (طویل اور دم گھٹنے والے نالے) ہیں۔

(۱۰۷) جب تک زمین و آسمان قائم ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، مگر جو کچھ تیرا پروردگار چاہے کیونکہ تیرا پروردگار جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے انجام دیتا ہے۔

(۱۰۸) لیکن جو سعادت مند ہیں وہ جب تک آسمان و زمین قائم ہیں ہمیشہ جنت میں رہیں گے

مگر جو کچھ تیرا پروردگار چاہے، بخشش ہے منقطع نہ ہونے والی۔

تفسیر

سعادت وشقاوت یا مشکلات؟

گزشتہ آیات میں مسئلہ قیامت اور اس عظیم عدالت میں تمام لوگوں کے اجتماع کی طرف اشارہ ہوا تھا زیر بحث آیات میں اس دن لوگوں کے انجام کے ایک پہلو کو بیان کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جب وہ دن آپہنچے گا تو پروردگار کے ارادے کے بغیر کوئی شخص بات نہیں کر سکے گا (یوم یأت لا تکلم نفس الا باذنہ)۔

بعض اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ آیت جو اس دن اذن الٰہی سے لوگوں کو بات کرنے کی دلیل ہے اُن آیات کے منافی ہے جو مطلقاً بات کرنے کی نفی کرتی ہیں۔ مثلاً سورہ یٰسین کی آیہ ۶۵:

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤی اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَاۤ اَیْدِیْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ۝

آج کے دن ان کے دہنوں پر مہر لگا دیں گے اور ہمارے ساتھ ان کے ہاتھ بات کریں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے، ان کاموں کی جو وہ انجام دیتے تھے۔

سورہ مرسلات کی آیت ۳۵ میں ہے:

هٰذَا یَوْمُ لَا یَنْطِقُوْنَ ۝

یہ وہ دن ہے جس میں وہ بول نہیں سکیں گے۔

اسی بناء پر بعض عظیم مفسرین کا نظریہ ہے کہ اصولی طور پر اس دن بات کرنے کا کوئی مفہوم نہیں کیونکہ "بات کرنا" تو ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم انسان کے اندر کے حالات معلوم کرتے ہیں، اگر ہماری کوئی ایسی حس ہوتی کہ جس سے ہم ہر شخص کے افکار معلوم کر سکتے تو گفتگو کی ہرگز ضرورت نہ ہوتی۔ اس بناء پر قیامت میں جو اسرار ظاہر ہوں گے اور ہر چیز "بروز و ظہور" کی حالت میں ظاہر ہو جائے گی تو اصولاً بات کرنے اور تکلم کا کوئی معنی نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں آخرت کا گھر جزا کا گھر ہے نہ کہ عمل کا۔ لہٰذا ارادے اور اختیار سے انسان کے بات کرنے کی کوئی خبر نہیں ہے بلکہ وہاں انسان ہے، اس کے اعمال ہیں اور جو کچھ ان سے مربوط ہے۔ اس لیے اگر وہاں انسان بات بھی کرے گا تو وہ دنیا میں کی جانے والی باتوں کی طرح نہیں ہوگی کہ جس کا سرچشمہ خود اس کا اختیار اور ارادہ ہوتا ہے اور جو اندرونی اسرار ظاہر کرنے کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ وہاں وہ جو کچھ کہے وہ

کا ایک قسم کا اس کے اعمال کا عکس العمل ہوگا، وہ اعمال کہ جو وہاں ظاہر و آشکار ہیں۔ لہٰذا اس دن بات کرنا دنیا میں بات کرنے کی طرح نہیں ہے کہ انسان اپنے میل و رغبت سے جھوٹ سچ کہہ سکے۔

بہرحال وہ دن حقائق اشیاء کے کشف اور "غیب" کے شہود کی طرف پلٹ آنے کا دن ہے اور وہ اِس جہان کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں رکھتا۔

لیکن۔ مندرجہ بالا آیت سے مذکورہ نتیجہ نکالنا قرآن کی دیگر آیات کے ظاہری مفہوم سے زیادہ مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ قرآن مومنین اور مجرمین کی پیشواؤں، جابروں اور ان کے پیروکاروں کی، اسی طرح شیطان اور اس کے فریب خوردگان کی اور دوزخیوں اور جنتیوں کی گفتگو نقل کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس جہان میں بھی اس جہان کی سی باتوں کا وجود ہے۔

یہاں تک کہ قرآن کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ گنہگار بعض سوالات کے جواب میں جھوٹ بھی بولیں گے، مثلاً سورہ انعام کی آیہ ۲۲ تا ۲۴ میں ہے:

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ۝ ثُمَّ لَمْ تَكُن فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ۝ انظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ ۚ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝

وہ دن کہ جس میں ہم ان سب کو محشور کریں گے، مشرکین سے کہیں گے کہ وہ معبود جنہیں تم خدا کا شریک سمجھتے تھے کہاں ہیں؟ ان کا جواب اور عذر اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا کہ وہ کہیں گے کہ اس خدا کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے ہم مشرک نہیں تھے۔ دیکھو وہ کس طرح اپنے آپ سے جھوٹ بولتے ہیں اور جسے وہ خدا کا جھوٹا شریک خیال کرتے تھے اسے بھی ہاتھ سے دے بیٹھیں گے۔

اس بناء پر بہتر یہ ہے کہ ہم بات کرنے سے متعلق ظاہراً آیات کے تناقض سے مربوط سوال کا وہی جواب دیں جو بہت سے مفسرین نے دیا ہے اور وہ یہ کہ اس دن لوگ کئی مرحلوں سے گزریں گے کہ جن میں سے ہر ایک کی کچھ اپنی خصوصیات ہیں۔ کچھ مراحل میں ان سے کوئی بازپرس نہیں ہوگی۔ یہاں تک کہ ان کے منہ پر مُہر لگا دی جائے گی صرف ان کے اعضاء جسم کہ جن میں آثار اعمال محفوظ ہیں زبان بے زبانی سے کلام کریں گے لیکن دوسرے مراحل میں ان کی زبان کا قفل کھول دیا جائے گا اور وہ اذنِ الٰہی سے بات کریں گے اور اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے۔ خطاکار ایک دوسرے کو ملامت کریں گے بلکہ ان کی کوشش یہ ہوگی کہ اپنے گناہ دوسرے کی گردن پر ڈال دیں۔

بہرحال آیت کے آخر میں تمام لوگوں کی دو گروہوں میں تقسیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وہاں ایک گروہ شقی ہوگا اور دوسرا سعید، ایک گروہ بدبخت ہوگا اور دوسرا خوش بخت (فمنھم شقی وسعید)۔

"سعید" مادہ "سعادت" سے اسباب نعمت فراہم ہونے کے معنی میں ہے اور "شقی" مادہ "شقاوت" سے سزا، پکڑ اور بلاء کے اسباب فراہم ہونے کے معنی میں ہے۔ اس بناء پر اُس جہان میں سعید وہی نیک لوگ ہیں جو انواع واقسام کی نعمتوں میں جاگزیں ہوں گے اور شقی وہی بدکار ہیں جو دوزخ میں مختلف عذابوں میں گرفتار ہوں گے۔

بہرحال یہ شقاوت اور وہ سعادت دنیا میں انسانی اعمال، کردار، گفتار اور نیتوں کے نتیجے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ بعض مفسّرین نے جبر واکراہ پر مبنی اپنے باطل عقیدے کے لیے اس آیت کو دستاویز قرار دیا ہے حالانکہ یہ آیت اس معنی پر کمترین دلالت بھی نہیں کرتی بلکہ روزِ قیامت کے سعادتمندوں اور شقی افراد کے بارے میں بات کر رہی ہے کہ وہ سب اپنے اعمال کی وجہ سے اس مرحلے میں پہنچے ہیں۔ شاید کچھ ایسی احادیث سے اس آیت کے مفہوم کے بارے میں اشتباہ ہوا ہے کہ جو قبل پیدائش سعادت و شقاوت کے بارے میں ہیں کہ جو ایک الگ داستان ہے۔

اس کے بعد شقاوت مندوں اور سعادت مندوں کے حالات کی تشریح بڑے بچے تلے انداز میں اور واضح عبارات کے ذریعے کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: رہے وہ جو شقاوت مند ہوئے، جہنم کی آگ میں زفیر وشہیق میں مبتلا ہیں، نالہ و فریاد اور شور وشین کرتے ہیں (فاما الذین شقوا ففی النار لھم فیھا زفیر وشھیق)۔

مزید فرمایا: وہ ہمیشہ آگ میں رہیں گے جب تک کہ آسمان و زمین موجود ہیں (خالدین فیھا ما دامت السمٰوات والارض) مگر جو کچھ تیرا پروردگار چاہے (الا ما شاء ربک) کیونکہ خدا جس کام کا ارادہ کرتا ہے اسے انجام دیتا ہے (ان ربک فعال لما یرید)۔ لیکن جو لوگ سعادت مند ہوئے جب تک آسمان و زمین موجود ہیں وہ ہمیشہ بہشت میں رہیں گے (واما الذین سعدوا ففی الجنۃ خالدین فیھا مادامت السمٰوات والارض) مگر جو کچھ تیرے پروردگار کا ارادہ ہو (الا ما شاء ربک) یہ بخشش وعطیہ جو ان سے ہرگز منقطع نہ ہوگا (عطاء غیر مجذوذ)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ جبر واکراہ کی نفی: جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ بعض نے مندرجہ بالا آیات سے سعادت وشقاوت کا ذاتی ہونا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ مندرجہ بالا آیات نہ صرف اس امر پر دلالت نہیں کرتیں بلکہ

وضاحت سے ثابت کرتی ہیں کہ سعادت و شقاوت اکتسابی ہیں کیونکہ فرمایا گیا ہے: "فاما الذین شقوا" یعنی۔ وہ لوگ جو شقاوت مند ہوئے۔ اسی طرح فرمایا گیا ہے: "اما الذین سعدوا" یعنی۔ وہ لوگ جو سعادت مند ہوئے۔ اگر شقاوت و سعادت ذاتی ہوتیں تو کہنا چاہیئے تھا: "اما الاشقیاء اما السعداء" یا ایسی ہی کوئی اور عبارت ہوتی۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ تفسیر رازی کی یہ بات بالکل بے بنیاد ہے جو اس نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

> ان آیات میں خدا ابھی سے یہ حکم لگا رہا ہے کہ قیامت میں ایک گروہ سعادت مند ہوگا اور ایک شقاوت مند ہوگا اور جنہیں خدا ایسے حکم سے محکوم کرتا ہے اور جانتا ہے کہ آخرکار قیامت میں سعید یا شقی ہوں گے۔ محال ہے کہ وہ تبدیل ہو جائیں ورنہ لازم آئے گا کہ خدا کا خبر دینا جھوٹ ہو اور اس کا علم جہالت ہو۔ اور یہ محال ہے۔

یہ مسئلہ جبر و اختیار میں "علم خدا" کے حوالے سے وہی مشہور اعتراض ہے کہ جس کا جواب ہمیشہ دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم اپنے خود ساختہ افکار کو آیات پر نہ ٹھونسیں تو ان کے مفاہیم روشن اور واضح ہیں۔ یہ آیات کہتی ہیں کہ اس دن ایک گروہ اپنے اعمال کی وجہ سے سعادت مند ہوگا اور ایک گروہ اپنے کردار کے باعث شقاوت مند ہوگا اور خدا جانتا ہے کہ کون سے افراد اپنے ارادے، خواہش اور اختیار سے سعادت کی راہ اپنائیں گے اور کونسے اپنے ارادے سے راہِ شقاوت پر گامزن ہوں گے۔ اس بنا پر اگر اس کے کہنے کے برعکس لوگ یہ راہ منتخب کرنے پر مجبور ہوں تو علمِ خدا جہل ہو جائے گا کیونکہ سب کے سب اپنے ارادہ و اختیار سے اپنی راہ انتخاب کریں گے۔

ہماری گفتگو کا شاہد یہ امر ہے کہ مندرجہ بالا آیات گزشتہ قوموں کے واقعات کے بعد آئی ہیں۔ ان واقعات کے مطابق ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد اپنے ظلم و ستم کی وجہ سے، حق و عدالت کے راستے سے اپنے انحراف کے باعث، شدید اخلاقی مفاسد کے سبب اور خدائی رہبروں کے خلاف جنگ کی وجہ سے اس جہان میں دردناک عذابوں میں مبتلا ہوئی۔ یہ واقعات قرآن نے ہماری تربیت و ارشاد کے لیے، راہِ حق کو باطل سے جدا کر کے نمایاں کرنے کے لیے اور راہِ سعادت کو راہِ شقاوت سے جدا کر کے دکھانے کے لیے بیان کیے ہیں۔

اصولی طور پر جیسا کہ فخر رازی اور اس کے ہم فکر افراد خیال کرتے ہیں اگر ہم پر ذاتی سعادت و شقاوت کا حکم نافذ ہو اور ہم بغیر ارادہ و اختیار کے بدیوں اور نیکیوں کی طرف کھینچے جائیں تو تعلیم و تربیت لغو اور بے سود ہو جائے گی۔ پیغمبروں کا آنا جانا، کتبِ آسمانی کا نزول، پند و نصیحت، تشویق و توبیخ، سرزنش و ملامت، مواخذہ و سوال غرضیکہ سزا و جزا سب کی سب بے فائدہ یا ظالمانہ امور شمار ہوں گے۔

وہ جو لوگوں کو نیک و بد کی انجام دہی میں مجبور سمجھتے ہیں، چاہے اس جبر کو جبرِ خدائی سمجھیں یا جبرِ طبیعی،

چاہے جبر اقتصادی سمجھیں یا جبر ماحول، صرف بات کرتے وقت یا کتابی دنیا میں اس مسلک کی طرفداری کرتے ہیں لیکن عملی طور پر خود بھی ہرگز یہ عقیدہ نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ان کے حقوق پر تجاوز ہو تو وہ زیادتی کرنے والے کو سرزنش، ملامت بلکہ سزا کا مستحق سمجھتے ہیں اور اس بات کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں کہ اسے مجبور قرار دے کر اس سے صرف نظر کر لیں یا اس کی سزا کو بالکل نہ خیال کریں یا کہیں کہ وہ یہ کام کرنے پر قدرت نہیں رکھتا تھا چونکہ خدا نے ایسا چاہا تھا یا ماحول اور طبیعت کا جبر تھا۔ یہ خود اصل اختیار کے فطری ہونے پر ایک اور دلیل ہے۔

بہرحال ہمیں کوئی جبری مسلک والا ایسا نہیں ملتا جو اپنے روزمرہ کے عمل میں اس عقیدے کا پابند ہو بلکہ وہ تمام افراد سے ان کے آزاد، مسئول، جوابدہ اور مختار ہونے کے لحاظ سے ملتا اور پیش آتا ہے۔ دنیا کی تمام اقوام نے عدالتیں قائم کر رکھی ہیں، قوانین بنائے ہیں اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دینے کے لیے اقدامات کیے جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں عملی طور پر ثابت کرتی ہیں کہ ارادے کی آزادی اور انسان کے مختار ہونے کو قبول کیا گیا ہے۔ دنیا کے تمام تربیتی ادارے ضمنی طور پر اس بنیادی نظریئے کو قبول کرتے ہیں کہ انسان اپنے میل و رغبت اور ارادہ و اختیار سے کام کرتا ہے اور تعلیم و تربیت کے ذریعے اس کی رہنمائی کی جا سکتی ہے اور اسے ارشاد و ہدایت کی جا سکتی ہے اور اسے خطاؤں، غلطیوں اور کج فکریوں سے روکا جا سکتا ہے۔

۲۔ **"شقوا" اور "سعدوا" میں ایک باریک فرق:** یہ بات جاذب نظر ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں "شقوا" فعل معلوم کے طور پر اور "سعدوا" فعل مجہول کی صورت میں آیا ہے۔[1]

تعبیر کا یہ اختلاف شاید اس لطیف نکتے کی طرف اشارہ ہو کہ انسان راہ شقاوت کو اپنے قدموں سے طے کرتا ہے لیکن راہ سعادت پر چلنے کے لیے جب تک خدائی امداد اور تعاون نہ ہو اور اس راہ میں وہ اس کی نصرت نہ کرے تو یہ کامیاب نہیں ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ امداد اور تعاون صرف ان لوگوں کے شامل حال ہوتا ہے جنہوں نے ابتدائی قدم اپنے ارادہ و اختیار سے اٹھائے ہوں اور اس طرح ایسی امداد کی اہلیت پیدا کر لی ہو (غور کیجئے گا)۔

۳۔ **قرآن میں مسئلہ خلود:** اصل لغت میں "خلود" طولانی بقاء کے معنی میں ہے اور ابدیت کے معنی میں بھی آیا ہے اس لیے اکیلا "خلود" ابدیت کی دلیل نہیں ہوتا کیونکہ ہر قسم کی طولانی بقاء بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے لیکن بہت سی آیات قرآنی میں یہ کلمہ کچھ قیود کے ساتھ ذکر ہوا ہے جن سے وضاحت کے ساتھ ابدیت

---

[1] "سعدوا" "سعد" کے مادہ سے ہے جو بعض ارباب لغت کے مطابق فعل لازم ہے اور مفعول کو نہیں چاہتا۔ اس بناء پر یہ صیغہ مجہول نہیں ہے لہٰذا یہ اہل لغت مجبور ہوتے ہیں کہ اسے مختف "سعدوا" (باب افعال کے فعل مجہول) سے سمجھیں لیکن جس طرح آلوسی نے روح المعانی میں آیت کے ذیل میں بعض اہل لغت سے نقل کیا ہے اس کا فعل ثلاثی بھی متعدی ہے اور "سعدہ اللہ" اور "مسعود" کہا جاتا ہے۔ اس بناء پر ضرورت نہیں ہے کہ ہم اس فعل مجہول کو باب افعال سے سمجھیں (غور کیجئے گا)۔

کا مفہوم معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً توبہ - ۱۰۰، طلاق - ۱۱ اور تغابن - ۹ میں اہل بہشت کے لیے۔ خالدین فیھا ابداً۔ کی تعبیر موجود ہے۔ اس تعبیر سے ان لوگوں کے لیے بہشت کی ابدیت معلوم ہوتی ہے اور دوسری آیات مثلاً نساء - ۱۶۹ اور جن - ۲۳ میں دوزخیوں کے ایک گروہ کے بارے میں یہی تعبیر "خالدین فیھا ابداً" نظر آتی ہے جو اُن کے لیے عذاب جاوداں ہونے کی دلیل ہے۔

اسی طرح کچھ اور تعبیرات بھی ہیں، مثلاً:

مَاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝ (کہف - ۳)

اور

لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ۝ (کہف - ۱۰۸)

یا اس قسم کی تعبیرات کی جو نشاندہی کرتی ہیں کہ حتماً بہشتیوں اور دوزخیوں کے کچھ گروہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نعمت یا عذاب میں رہیں گے۔

بعض افراد سزا کے جاوداں ہونے کے اشکالات کو اپنی نظر میں حل نہیں کر سکے مجبوراً انھوں نے اس کے لغوی معنی کا سہارا لیا ہے اور انھوں نے اسے مدتِ طولانی کے معنی میں لیا ہے حالانکہ بعض تعبیرات جیسے مذکورہ بالا آیات میں ان کی ایسی تفسیر نہیں کی جا سکتی۔

مزید وضاحت کے لیے ہم آپ کی توجہ ذیل کی اہم بحث کی جانب مبذول کراتے ہیں۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

یہاں فوراً ہر سننے والے کے صفحۂ ذہن پر ایک بہت اہم سوال ابھرتا ہے اور وہ یہ کہ گناہ اور عذاب میں یہ عدم مساوات خدا کی طرف سے کیسے ممکن ہے۔ کیسے قبول کیا جا سکتا ہے کہ ایک انسان اپنی ساری عمر جو زیادہ سے زیادہ اسی یا سو سال ہوتی ہے میں اچھا یا بُرا کام انجام دے لیکن اس کی جزاء یا سزا کروڑوں سالوں پر یا اس سے بھی طولانی عرصے پر محیط ہو۔

البتہ یہ مسئلہ جزاء کے بارے میں تو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ بخشش اور جزاء جتنی بھی زیادہ ہو جزاء دینے والے کے فضل وکرم کی نشانی ہے لہٰذا اس پر اعتراض یا اشکال نہیں کیا جا سکتا لیکن بُرے کام، گناہ، ظلم اور کفر کے بارے میں یہ سوال ہے کہ ایک محدود گناہ پر دائمی عذاب عدلِ الٰہی کے نظریے کے ساتھ کیونکر مناسبت رکھتا ہے۔ جس شخص کی سرکشی اور تجاوز کا دور ایک سو سال سے زیادہ نہیں ہمیشہ کے لیے جہنم کی آگ اور عذاب کے شکنجے میں کیوں گرفتار رہے۔

کیا عدالت کا تقاضا نہیں کہ یہاں پر ایک توازن برقرار رکھا جائے اور مثلاً سو سال کے غلط اعمال کی مقدار کے برابر اسے عذاب اور سزا ہو؟

مطمئن نہ کرنے والے جوابات: اس اعتراض کے جواب کی پیچیدگی اس بات کا سبب بنی ہے کہ بعض علماء نے آیات خلود کی توجیہ کا راستہ اختیار کیا ہے اور ان کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ ان سے ہمیشہ کی سزا اور عذاب معلوم نہ ہو کیونکہ دائمی عذاب ان کے عقیدے کے مطابق خلاف عدل ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اس طرح کی باتیں کی ہیں:

(۱) بعض کہتے ہیں کہ "خلود" سے مراد اس کا کنائی اور مجازی معنی ہے۔ یعنی ایک مدت جو نسبتاً طولانی ہو۔ جیسا کہ جن افراد کو آخر عمر تک کے لیے سزائے قید سنائی جائے ان کے لیے کہا جاتا ہے کہ انہیں دائمی قید سنائی گئی ہے حالانکہ مسلّم ہے کہ کسی قید خانے میں ابدیت نہیں ہوتی اور قید کی عمر ختم پر ختم ہو جاتی ہے یہاں تک کہ عربی زبان میں بھی "یخلّد فی السجن" جو کہ مادہ "خلود" سے ہے ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے۔

(۲) بعض دیگر کہتے ہیں کہ ایسے باغی اور سرکش افراد کہ جن کے پورے وجود کو گناہ نے گھیر لیا ہو اور ان کا سارا وجود کفر اور گناہ میں ڈھل گیا ہو اگرچہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے لیکن دوزخ ہمیشہ ایک ہی حالت میں نہیں رہے گی۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ اس کی آگ آخرکار دوسری آگ کی طرح بجھ جائے گی اور دوزخیوں کو ایک خاص قسم کا سکون مل جائے گا۔

(۳) بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ اور بہت سی سزا جھیلنے کے بعد آخرکار دوزخی ایک طرح سے اس کے عادی اور خوگر ہو جائیں گے اور وہ اپنے ماحول کے رنگ میں رنگ جائیں گے اور ماحول کے ساتھ ایک طرح کی موافقت پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح انہیں کسی قسم کی ناراحتی، تکلیف اور عذاب کا احساس نہیں ہوگا۔

البتہ جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ سب توجیہات "خلود" اور دائمی عذاب کے مسئلہ کے بارے میں جواب دینے سے عجز و ناتوانی کی وجہ سے ہیں یہ بات ناقابلِ انکار ہے کہ آیاتِ خلود کا ظہور یہ ہے کہ ایک خاص طبقہ ہمیشہ کے لیے عذاب میں رہے گا۔

حتمی جواب: اس مشکل کے حل کے لیے گزشتہ مباحث کی طرف لوٹنا پڑے گا اور اس اشتباہ کی اصلاح کرنا پڑے گی کہ جس میں عذاب قیامت کا دوسری سزاؤں پر قیاس کیا جاتا ہے تاکہ یہ بات واضح ہو سکے کہ مسئلہ خلود اصلِ عدالتِ الٰہی کے منافی نہیں ہے۔

(۱) جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے ابدی اور دائمی عذاب اور سزا ایسے لوگوں کے لیے منحصر ہے جنہوں نے اپنے لیے نجات کے تمام راستے بند کر لیے ہیں اور جان بوجھ کر فساد و تباہی اور کفر و نفاق میں غرق ہو گئے ہیں۔ گناہ کے منحوس سائے نے جن کے تمام قلب و روح کو ڈھانپ دیا ہے اور درحقیقت جو گناہ اور کفر کے رنگ میں رنگ گئے ہیں، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ہے:

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓـئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ

هُمْ فِيهَا خَالِدُوْنَ ۝

جی ہاں ! جو شخص گناہ کا مرتکب ہوا اور اس کے آثار اس کے تمام وجود کا احاطہ کرلیں ایسے لوگ اہل دوزخ ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (بقرہ - ۸۰)

(۲) بعض لوگوں کا یہ غلط اشتباہ ہے کہ سزا اور عذاب کی مدت گناہ کی مدت کے برابر ہونا چاہیئے کیونکہ گناہ اور سزا کے درمیان "رابطۂ زمانی" نہیں ہے بلکہ "رابطۂ کیفی" ہے یعنی زمانۂ سزا کا تعلق گناہ کی کیفیت سے ہے نہ کہ اس کے زمانے کی مقدار سے۔ مثلاً ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی نفس کو قتل کرنے کے لیے لحظہ بھر کیلئے ہاتھ اٹھائے اور مختلف قوانین کی روشنی میں اسے عمر قید کی سزا ملے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ گناہ صرف لحظہ بھر کا تھا جبکہ اس کی سزا ممکن ہے اسی سال پر محیط ہو۔ لہٰذا معاملہ کیفیت کا ہے نہ کہ زمانی کمیت کا۔

(۳) ہم کہہ چکے ہیں قیامت کی زیادہ تر سزائیں اور عذاب عمل کے طبیعی و فطری اثر اور خاصیت گناہ کے حوالے سے ہیں۔ زیادہ واضح الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رنج و تکالیف اور پریشانیاں جن کا دوسرے جہان میں گنہ گار سامنا کریں گے ان کے اپنے اعمال کا اثر اور نتیجہ ہیں جو انہیں دامنگیر ہوگا۔ قرآن کہتا ہے :

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَّلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (یٰسٓ - ۵۴)

آج (روز قیامت) کسی شخص پر ظلم نہیں ہوگا اور تمہارے اعمال کے سوا تمہاری جزا نہیں ہوگی۔

یہ بھی ارشادِ الٰہی ہے :

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهِ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (جاثیہ - ۳۳)

اور اُنکے بُرے اعمال اُنکے سامنے آشکار ہوجائینگے اور جسکا ہمیشہ تمسخر اڑایا کرتے تھے وہ انہیں گھیر لے گا۔

فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ إِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (القصص - ۸۴)

جنہوں نے بُرے کام کیے ہیں ان کے اعمال کے علاوہ انہیں کوئی جزا نہیں دی جائیگی۔

اب جبکہ یہ تین پہلو واضح ہو چکے ہیں تو مسئلے کا صحیح جواب ہماری دسترس سے زیادہ دُور نہیں رہا اور اس تک پہنچنے کے لیے کافی ہے کہ آپ ذیل کے چند سوالات کا جواب دیں :

٭ فرض کریں کہ کوئی شخص پے در پے مشروبات الکحل کے استعمال کی وجہ سے ہفتہ بھر میں معدے کے شدید زخم میں مبتلا ہوگیا ہے اور بات یہاں تک جا پہنچی ہے کہ اب اسے یہ درد آخر عمر تک برداشت کرنا پڑے گا۔ تو کیا یہ نتیجہ اس کے بُرے عمل کے برابر ہے اور کیا یہ خلاف عدالت ہے؟ اب اگر اس شخص کی عمر اسی سال کی بجائے ایک ہزار سال یا ایک ملین سال ہو تو اسے ایک ہفتے کی ہوس رانی کی خاطر ایک ملین سال دکھ درد جھیلنا پڑیں گے تو کیا یہ اصل عدالت کے خلاف ہوگا جبکہ شراب خوری کے اس خطرے کے بارے میں پہلے سے بتایا جا چکا ہے اور اس کا انجام بھی اس کے سامنے واضح کیا جا چکا ہے۔

٭ نیز فرض کریں کہ کوئی شخص ڈرائیونگ کے قوانین بھلا دے جبکہ یہ بات مسلّم ہے کہ یہ قوانین سودمند ہیں اور

حادثات سے رونما ہونے والی پریشانیوں اور تکالیف میں کمی کا باعث ہیں۔ یہ شخص سمجھدار دوستوں کی طرف سے خطرے کی بار بار کی تنبیہوں پر کان نہ دھرے۔ اب اگر کوئی حادثہ کسی مختصر لمحے میں اسے آلے (اور حادثات تو لمحوں ہی میں رونما ہوتے ہیں)۔ اس حادثے میں اس کی آنکھیں، ہاتھ یا پاؤں ضائع ہو جائیں اور اس کے بعد اسے اندھے پن میں یا اپاہج ہو کر زندگی گزارنا پڑے تو کیا یہ نتیجہ پروردگار کی عدالت کے کسی طرح بھی منافی ہے؟

* اس سلسلے میں ہمارے پاس ایک اور مثال بھی ہے اور مثالیں عقلی حقائق کو ذہن کے قریب کرتی ہیں اور اصلی، حتی اور استدلالی نتیجہ حاصل کرنے کے لیے ذہن کو تیار کرتی ہیں۔

فرض کریں ہم اپنے راستے میں خار مغیلاں کے چند گرام بیج چھڑک دیتے ہیں۔ چند ماہ یا چند سالوں بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے راستے میں کانٹوں کا ایک وسیع صحرا ہے جو ہمیشہ کے لیے ہماری دردسری اور تکلیف کا باعث بن گیا ہے۔

یا یہ کہ ہم پھولوں کے چند گرام بیج چھڑک دیتے ہیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے سامنے بہت دلکش اور مہک دار گلشن کھل اٹھا ہے جو ہمیشہ ہمارے مشام جان کو معطر رکھتا ہے اور دل کو لبھاتا ہے۔

کیا یہ امور جو سب کے سب اعمال کے آثار ہیں عدالت کے کسی طور بھی منافی ہیں حالانکہ اس عمل اور اس کے نتیجہ کی مقدار میں مساوات نہیں ہے۔

جو کچھ کہا جا چکا ہے اس سے مجموعی طور پر ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب جزا اور سزا خود انسان کے عمل کا نتیجہ ہے تو کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بسا اوقات ظاہراً ایک چھوٹا سا عمل ہوتا ہے جس کا اثر ایک عمر کی محرومیت، ابتلا اور ناراحتی کی صورت میں نکلتا ہے اور بعض اوقات ایک اور ظاہراً چھوٹا سا عمل ایک عمر کے لیے سرچشمۂ خیرات و برکات بن جاتا ہے (اشتباہ نہ ہو۔ چھوٹے سے ہماری مراد مقدار زمانہ کے لحاظ سے ہے ورنہ وہ کام اور گناہ جو عذاب میں ہمیشگی کا باعث ہیں یقیناً کیفیت اور اہمیت کے لحاظ سے چھوٹے نہیں ہیں)، اس بناء پر جب گناہ، کفر، طغیان اور سرکشی پورے انسانی وجود کا احاطہ کر لیں اور اس کی جان کے تمام بال و پر بیدادگری اور نفاق کی آگ میں جلیں تو کونسا مقام تعجب ہے کہ وہ دوسرے جہان میں آسمانِ بہشت میں پرواز کی نعمت سے محروم ہو جائے اور ہمیشہ کے لیے عظیم محرومیت کے درد و رنج میں گرفتار رہے۔ کیا اسے بتایا نہیں گیا اور کیا اسے اس عظیم خطرے سے آگاہ نہیں کیا گیا۔

جی ہاں! ایک طرف سے انبیاء الٰہی نے اور دوسری طرف سے عقل و خرد نے ضروری آگاہی دی تھی۔ کیا اس نے بے خبری میں اور بغیر اختیار کے اس کام میں ہاتھ ڈالا تھا اور اب ایسے انجام کو پہنچا ہے؟ نہیں بلکہ اس نے یہ کام علم کے ساتھ، جان بوجھ کر اور اختیار سے انجام دیا ہے۔

کیا یہ انجام خود اس کے اعمال اور سیدھا اس کے اعمال کا نتیجہ نہیں ہے۔ یقیناً یہ انجام خود اس کے کام کے آثار میں سے ہے۔

اس بنا پر نہ شکایت کی گنجائش ہے نہ کسی پر اشکال کی اور نہ ہی یہ انجام عدالت الٰہی کے قانون کے منافی ہے[1]

۴۔ زیر بحث آیات میں "خلود" کا معنی؟ کیا۔ خلود۔ زیر بحث آیات میں ہمیشگی اور جاودانی کے معنی میں آیا ہے یا یہاں اس کا مفہوم "طولانی مدت" والا ہے جو اس کے لغوی مفہوم کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔

اس بنیاد پر کہ یہاں "خلود" کے ساتھ یہ شرط ہے کہ: ما دامت السمٰوات والارض (یعنی۔ جب تک آسمان و زمین باقی ہیں)، بعض مفسرین نے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ اس خاص موقع پر خلود ہمیشگی اور جاودانی کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ آسمان و زمین ابدیت اور ہمیشگی نہیں رکھتے اور قرآن کی صریح آیات کے مطابق ایک زمانہ آئے گا کہ آسمان درہم برہم ہو جائیں گے اور زمین تباہ ہو کر ایک اور زمین میں بدل جائے گی[2]

لیکن توجہ رہے کہ عربی ادبیات میں ایسی تعبیریں عموماً ابدیت کے لیے کنایہ کے طور پر استعمال ہوتی ہیں، لہٰذا محل بحث آیات میں بھی خلود ہمیشگی کے معنی میں آیا ہے۔

مثلاً عرب کہتے ہیں: یہ کیفیت برقرار رہے گی مالاح کوکب (جب تک ستارہ چمکتا ہے)، یا مالاح الجدیدان (جب تک دن رات موجود ہیں) یا ما اضاء فجر (جب تک صبح روشن ہوتی رہے) یا ما اختلف اللیل والنہار (جب تک رات دن ایک دوسرے کے بعد آتے رہیں)۔

ایسی ہی بہت سی مثالیں ہیں جو سب کی سب ہمیشگی اور ابدیت کے لیے کنایہ ہیں۔

امام امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کے کلام نہج البلاغہ میں ہے کہ جب جاہل مفسرین نے امامؑ پر اعتراض کیا کہ آپ بیت المال کی تقسیم میں مساوات کیوں برتتے ہیں اور اپنی حکومت مستحکم کرنے کے لیے بعض لوگوں کو دوسروں پر ترجیح کیوں نہیں دیتے تو امامؑ کو یہ بات سن کر رنج ہوا اور آپؑ نے فرمایا:

اتأمرونی ان اطلب النصر بالجور فیمن ولیت علیہ واللّٰہ لا اطور بہ ما سمر سمیر وما ام نجم فی السماء نجماً

کیا مجھ سے کہتے ہو کہ میں کامیابی کے لیے اپنی حکومت میں رہنے والوں کی طرف دست ظلم دراز کروں۔ خدا کی قسم! میں اس کام کے نزدیک بھی نہیں جاؤں گا جب تک رات کو جاگ کر لوگ قصہ گوئی کریں گے اور جب تک آسمان کے ستارے ایک دوسرے کے بعد طلوع و غروب کرتے رہیں گے[3]

---

[1] "معاد و جہان پس از مرگ" صفحہ ۴۸۵ تا صفحہ ۴۹۳۔

[2] ابراہیم۔ ۴۸ اور انبیاء۔ ۱۰۴۔

[3] نہج البلاغہ صبحی صالح خطبہ ۱۲۶۔

دعبل خزاعی کے اشعار میں سے ایک ان کا مشہور قصیدہ ہے جو انہوں نے امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام کے حضور پڑھا۔ اس کا ایک شعر یوں ہے:

سأبکیهم ما ذر فی الافق شارق

و نادی منادی الخیر فی الصلوات

میں خاندانِ نبوت کے شہیدوں پر گریہ و زاری کرتا رہوں گا، اس وقت تک جب تک سورج افق مشرق پر روشنی چھڑکتا رہے گا اور جب تک اذان کی صدا دعوتِ نماز کے لیے میناروں سے گونجتی رہے گی۔[1]

البتہ یہ چیز عربی ادبیات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ دوسری زبانوں میں بھی کم و بیش موجود ہے بہرحال ابدیت اور ہمیشگی پر آیت کی دلالت بحث و تحیص سے ماوراء ہے اور اسی طرح یہاں ان لوگوں کی گفتگو کی بھی ضرورت نہیں جو کہتے ہیں کہ یہاں آسمان و زمین سے مراد قیامت کے زمین و آسمان ہیں جو جاودانی ہیں۔

۵۔ آیت میں استثناء کا کیا مفہوم ہے؟ مندرجہ بالا آیات میں اہل بہشت اور اہل جہنم دونوں کے بارے میں جملہ "استثنائیہ" الا ماشاء ربک (مگر وہ جو تیرا پروردگار چاہے) آیا ہے۔ اس سے مفسرین کے لیے ایک وسیع بحث کا دروازہ کھل گیا ہے۔

عظیم مفسر طبرسی نے اپنی تفسیر میں مفسرین سے اس استثناء کی دس وجوہات نقل کی ہیں۔ ہماری نظر میں ان میں سے زیادہ تر کمزور ہیں اور قبل و بعد کی آیات سے ہرگز مناسبت نہیں رکھتیں لہٰذا یہاں ہم ان کا ذکر نہیں کرتے اور ان میں سے جو دو وجہیں زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہیں وہ پیش کرتے ہیں:

(۱) اس استثناء کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ تصور نہ ہو کہ بے ایمان افراد کی دائمی سزا اور سچے مومنین کی جزا اور ثواب خدا کی مشیت اور مرضی کے بغیر ہیں اور ان سے اس کی قدرت و توانائی اور ارادہ محدود ہو جاتا ہے اور یہ سزا و جزا جبر اور لزوم کی صورت اختیار کر لیتی ہیں بلکہ ان دونوں کے جاودانی اور دائمی ہونے کے باوجود اس کی قدرت اور ارادہ ہر چیز پر حاکم ہے۔

اس بات کا شاہد یہ ہے کہ دوسرے جملے میں سعادت مندوں کے بارے میں استثناء کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے:

عطاء غیر مجذوذ

یہ ایسی عطا اور جزا ہے کہ جو ان سے ہرگز منقطع نہ ہوگی۔

یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ جملہ استثنائیہ صرف بیانِ قدرت کے لیے ہے۔

---

[1] نور الابصار صفحہ ... ، الغدیر اور دیگر کتب۔

(۲) یہ آیات چونکہ شقی اور سعید دو گروہوں کے بارے میں ہیں اور ضروری نہیں کہ تمام شقاوتمند بے ایمان افراد ہوں جو خلود کے مستحق ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ ان کے درمیان خطاکار مومنین بھی ہوں لہٰذا استثناء کا تعلق اس گروہ سے ہے۔

لیکن یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے پھر دوسرے جملے میں استثناء کا کیا مفہوم ہوگا کہ جو سعادت مندوں کے بارے میں ہے۔ اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ وہ بھی خطاکار مومنین کے بارے میں ہے کہ جنہیں ابتداء میں ایک مدت تک دوزخ میں جاکر پاک ہونا ہوگا اس کے بعد وہ اہل بہشت کی صف میں شامل ہو جائیں گے۔ درحقیقت پہلے جملے میں استثناء انجام اور آخرکار کے متعلق ہے جبکہ دوسرے جملے میں آغاز اور ابتداء کے بارے میں ہے (غور کیجئے گا)۔

مندرجہ بالا سوال کے جواب میں یہ احتمال بھی ہے کہ پہلے جملے میں استثناء خطاکار مومنین کی طرف اشارہ ہے کہ جو ایک عرصے کے بعد دوزخ سے رہائی پائیں گے اور دوسرے جملے میں صرف پروردگار کی قدرت اور توانائی کی طرف اشارہ ہے۔ اس بات کی دلیل یہ ہے کہ پہلے جملے میں استثناء کے بعد "ان ربک فعال لما یرید" آیا ہے جو اس کی مشیت کے انجام کی دلیل ہے اور دوسرے جملے میں "عطاء غیر مجذوذ" آیا ہے جو ابدیت کی دلیل ہے (ذرا غور کیجئے گا)۔

رہا یہ احتمال جو بعض نے ذکر کیا ہے کہ یہ جزاء اور سزا برزخ کی جنت اور دوزخ سے مربوط ہے جس کی مدت محدود ہے اور ختم ہو جائے گی، بہت بعید ہے کیونکہ قبل کی آیات صراحت کے ساتھ قیامت کے بارے میں ہیں اور ان آیات کا تعلق اُن سے ٹوٹنے والا نہیں ہے۔

اسی طرح یہ احتمال بھی درست نہیں کہ ان آیات میں "خلود" قرآن کی دیگر آیات کی طرح مدت طولانی کے معنی میں ہے نہ کہ ابدیت کے معنی میں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ جملہ "عطاء غیر مجذوذ" اور خود استثناء کہ جو اس سے قبل کے جملوں کے ابدیت کی دلیل ہے سے یہ احتمال مطابقت نہیں رکھتا۔

۴۔ **"زفیر" اور "شھیق" کا مفہوم:** مندرجہ بالا آیات میں دوزخیوں کے بارے میں ہے کہ وہ وہاں "زفیر" اور "شھیق" کے حامل ہوں گے۔

ان دو الفاظ کے معانی کے بارے میں ارباب لغت اور مفسرین نے متعدد احتمالات ذکر کیے ہیں،

بعض نے کہا ہے کہ "زفیر" داد و فریاد اور چیخ و پکار کرنے کے معنی میں ہے کہ جس کے ساتھ باہر کی طرف سانس لیا جائے اور "شھیق" اس نالہ و فریاد کو کہتے ہیں جس کے ساتھ اندر کی طرف سانس کھینچا جائے۔

بعض نے "زفیر" گدھے کی ابتدائی آواز کو اور "شھیق" اس کی اختتامی آواز کو قرار دیا ہے شاید یہ معنی پہلے معنی سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

بہرحال یہ دونوں الفاظ ایسے اشخاص کے نالہ و فریاد کا مفہوم دیتے ہیں کہ غم واندوہ کے مارے جن کا پورا وجود

واویلا کر رہا ہو اور ایسی داد و فریاد جو انتہائی پریشانی، ناراضی اور شدت کرب و تکلیف کی نشانی ہو۔

توجہ رہے کہ "زفیر" اور "شہیق" دونوں مصدر ہیں اور "زفیر" دراصل کندھے پر بھاری بوجھ اٹھانے کے معنی میں ہے اور چونکہ یہ کام آہ و نالہ کا سبب بنتا ہے اس لیے آہ و نالہ کو "زفیر" کہتے ہیں اور "شہیق" اصل میں طولانی ہونے کے معنی میں ہے جیسا کہ بلند پہاڑ کو "جبل شاھق" کہتے ہیں بعد ازاں یہ لفظ طولانی نالہ و فریاد کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

سعادت و شقاوت کے اسباب

سعادت جو تمام انسانوں کی گمشدہ چیز ہے اور اسے ہر کوئی ہر کسی چیز میں اور ہر جگہ تلاش کرتا پھرتا ہے یہ ایک فرد یا معاشرے کے تکامل و ارتقاء کے اسباب فراہم کرنے کا نام ہے۔ اس کے مقابل شقاوت و بدبختی ہے جس سے سب نفرت کرتے ہیں اور وہ کامیابی، تکامل اور ارتقاء کے لیے درکار اسباب، حالات اور شرائط کے نامساعد ہونے کو کہتے ہیں۔

اس بنا پر جس شخص کو روحانی، جسمانی، خاندانی، معاشرتی اور تمدنی لحاظ سے بلند تر اہداف تک پہنچنے کے لیے زیادہ اسباب حاصل ہوں وہ سعادت کے زیادہ نزدیک ہے یا دوسرے لفظوں میں زیادہ سعادتمند ہے۔ دوسری طرف جو شخص ان پہلوؤں کی کمی اور نارسائی میں گرفتار ہو وہ شقاوت مند اور بدبخت ہے اور سعادت سے بے بہرہ ہے۔

لیکن توجہ رہے کہ سعادت و شقاوت کی حقیقی بنیاد انسان کا اپنا ارادہ اور خواہش ہے۔ انسانی ارادہ ہی اپنی اصلاح بلکہ معاشرے کی اصلاح و درستی کے لیے ضروری وسائل فراہم کر سکتا ہے اور یہ انسان خود ہے جو بدبختی اور شقاوت کے عوامل کے خلاف جنگ کے لیے کھڑا ہو یا اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

انبیاء کی منطق میں سعادت و شقاوت کوئی ایسی چیز نہیں جو انسان کے لیے ذاتی ہو۔ یہاں تک کہ ماحول، خاندان اور وراثت بھی خود انسانی ارادے کے سامنے قابل تغییر ہیں مگر یہ کہ ہم خود انسانی ارادے اور آزادی کا انکار کر دیں، اسے جبری شرائط و حالات کا محکوم قرار دے دیں اور اس کی سعادت یا شقاوت کو ذاتی یا ماحول وغیرہ کی جبری پیداوار سمجھیں حالانکہ یہ نظریہ قطعی طور پر مکتب انبیاء اور اسی طرح مکتب عقل کے نزدیک محکوم و مذموم ہے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے مروی روایات میں مختلف امور کی اسباب سعادت یا اسباب شقاوت کے طور پر نشاندہی کروائی گئی ہے کہ جن کا مطالعہ انسان کو اس اہم مسئلے کے بارے میں اسلامی طرز فکر سے آشنا کرتا ہے اور انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ سعادت تک پہنچنے اور شقاوت سے بچنے کے لیے بیہودہ و خرافاتی مسائل اور غلط قسم کے خیالات اور طور طریقے کہ جو بہت سے معاشروں میں رائج ہوتے

ہیں کا سہارا لینے کی بجائے اور بے بنیاد امور کو سعادت و شقاوت کے اسباب خیال کرنے کی بجائے حقائق عینی اور سعادت کے اسباب حقیقی کی جستجو کرے۔

نمونے کے طور پر ذیل کی چند پر معانی احادیث کی طرف توجہ فرمایئے:

(۱) امام صادق علیہ السلام اپنے جد بزرگوار امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں:

حقیقة السعادة ان یختم للرجل عمله بالسعادة و حقیقة الشقاوة ان یختم للمرء عمله بالشقاوة

حقیقت سعادت یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا آخری مرحلہ سعادت مندانہ عمل کے ساتھ ختم ہو اور حقیقت شقاوت یہ ہے کہ اس کی زندگی کا آخری مرحلہ شقاوت مندانہ عمل پر اختتام پذیر ہو[1]

یہ روایت صراحت سے کہتی ہے کہ انسان کی زندگی کا آخری مرحلہ اور اس مرحلے میں اس کے اعمال اس کی سعادت یا شقاوت کا مظہر ہیں۔ گویا اس طرح آپؑ ذاتی سعادت و شقاوت کی مکمل نفی کر رہے ہیں اور انسان کو اس کے اعمال کا گروی قرار دے رہے ہیں اور اس کی عمر کے آخری مرحلے تک اس کے لیے لوٹ آنے کا راستہ کھلا قرار دے رہے ہیں۔

(۲) ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

السعید من وعظ بغیره والشقی من انخدع لهواه وغروره

سعادت مند وہ شخص ہے جو دوسروں کی زندگی سے نصیحت حاصل کرے اور شقاوت مند وہ شخص ہے جو ہوائے نفس اور غرور نفس سے دھوکا کھا جائے[2]

حضرت علیؑ کی یہ گفتگو بھی سعادت و شقاوت کے اختیاری ہونے کی تاکید مزید ہے اور اس میں آپؑ ان دونوں کے بعض اسباب کو بیان فرما رہے ہیں۔

(۳) پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

اربع من اسباب السعادة و اربع من الشقاوة

فالاربع التی من السعادة المرئة الصالحة والمسکن الواسع والجار الصالح والمرکب البهی،

والاربع التی من الشقاوة الجار السوء والمرئة السوء والمسکن الضیق والمرکب السوء۔

۱۔ تفسیر نور الثقلین ج ۲ ص ۳۹۵

۲۔ نہج البلاغہ صبحی صالح خطبہ ۸۶

چار چیزیں اسباب سعادت ہیں اور چار چیزیں اسباب شقاوت ہیں۔

وہ چار جو اسباب سعادت ہیں یہ ہیں: نیک بیوی، وسیع گھر، نیک ہمسایہ اور اچھی سواری۔

اور وہ چار جو اسباب شقاوت ہیں یہ ہیں: بُرا ہمسایہ، بُری بیوی، تنگ مکان اور بُری سواری۔[1]

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ چار امور ہر شخص کی مادی اور روحانی زندگی میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں اور کامیابی یا شکست کے عوامل بن سکتے ہیں، اس سے اسلامی منطق میں سعادت و بدبختی کے مفہوم کی وسعت واضح ہو جاتی ہے۔

ایک اچھی بیوی انسان کو طرح طرح کی نیکیوں کا شوق دلاتی ہے۔ ایک وسیع گھر انسان کی روح و فکر کو سکون بخشتا ہے اور زیادہ فعالیت کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ بُرا ہمسایہ قابلِ تعریف نہیں ہے اور اچھا ہمسایہ آسائش و آرام میں مؤثر مددگار ہوتا ہے بلکہ انسان کی پیش رفت میں معاون ہوتا ہے۔ ایک اچھی سواری اپنے کام انجام دینے اور اجتماعی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے بہت کارمند ہے جبکہ خراب اور بے کار سواری پیچھے رہ جانے کا باعث ہے کیونکہ وہ اپنے مالک کو اس کے مقاصد تک کم ہی پہنچاتی ہے۔

(۲) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور حدیث بھی نقل ہوئی ہے، فرمایا:

من علامات الشقاء جمود العين، وقسوة القلب، وشدة الحرص في طلب الرزق، والاصرار على الذنب۔

یہ چیزیں شقاوت کی علامتوں میں سے ہیں:

آنکھوں کی قطرۂ اشک سے محرومی، سنگدلی، حصولِ رزق میں شدید حرص اور گناہ پر اصرار۔[2]

یہ چار امور جو مندرجہ بالا حدیث میں آئے ہیں سب اختیاری ہیں۔ ان کا سرچشمہ انسان کے خود کردہ اعمال و اخلاق ہیں۔ اسی طرح ان اسبابِ شقاوت سے بچنا بھی خود انسان کے اختیار میں ہے۔

سعادت و شقاوت کے وہ اسباب جو مندرجہ بالا احادیث میں ذکر ہوتے ہیں اگر ان سب کی حیثیت اور انسانی زندگی میں ان کے نقشِ مؤثر کا موازنہ ان بے ہودہ اور خرافاتی اسباب سے کریں کہ جن کے ہمارے ایٹمی اور خلائی دور کے بہت سے گروہ پابند ہیں تو یہ حقیقت آشکار ہو جائے گی کہ تعلیماتِ اسلام کس قدر منطقی اور حساب شدہ ہیں۔

ابھی بہت سے افراد ہیں جو گھوڑے کی نعل کو خوش بختی کی علامت سمجھتے ہیں، تیرھویں کے دن کو بدبختی

۱۔ مکارم الاخلاق صفحہ ۱۹۹

۲۔ تفسیر نور الثقلین، ج ۲، صفحہ ۳۹۰

کا سبب جانتے ہیں، سال کی بعض راتوں میں آگ کے اوپر سے پرندہ اُڑنے کو خوش بختی کی دلیل قرار دیتے ہیں، بعض راتوں میں پرندے کی آواز کو بدبختی مانتے ہیں، مسافر کی پشت کے پیچھے پانی چھڑکنے کو خوش بختی کا سبب سمجھتے ہیں سیڑھی کے نیچے سے گزرنے کو بدبختی کی علامت جانتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے ساتھ یا اپنے کسی ذریعۂ آمد و رفت کے ساتھ گھونگا آویزاں کرنے کو بھی خوش بختی کا سبب سمجھتے ہیں۔ چھینک آجائے تو اسے پیش نظر کام کا انجام دینے میں بدبختی کی علامت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح کی بہت سی خرافات ہیں جو شرق و مغرب کی اقوام میں رائج ہیں۔

ایسے کتنے زیادہ انسان ہیں جو ان خرافات میں گرفتار ہونے کی وجہ سے زندگی میں فعالیت اور کارکردگی سے رہ گئے ہیں اور بے شمار مصیبتوں میں گرفتار ہیں۔

اسلام نے ان تمام بیہودہ خیالات پر سرخ لکیر کھینچ دی ہے اور انسان کی سعادت و شقاوت کی بنیاد اس کے مثبت و منفی کام اور اخلاقی قوت و کمزوری، طرز عمل، انداز فکر اور عقیدے کو قرار دیا ہے کہ جس کے نمونے مندرجہ بالا چار احادیث میں واضح طور پر بیان ہوئے ہیں۔

(۱۰۹) فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هَٰؤُلَاءِ ۚ مَا يَعْبُدُونَ إِلَّا كَمَا يَعْبُدُ آبَاؤُهُم مِّن قَبْلُ ۚ وَإِنَّا لَمُوَفُّوهُمْ نَصِيبَهُمْ غَيْرَ مَنقُوصٍ ○

(۱۱۰) وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتُلِفَ فِيهِ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ ○

(۱۱۱) وَإِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ ۚ إِنَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ○

(۱۱۲) فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَن تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ○

ترجمہ

(۱۰۹) جن معبودوں کی وہ پرستش کرتے ہیں تم ان کے بارے میں شک میں نہ پڑنا. یہ توان معبودوں کی ایسے ہی پرستش کرتے ہیں جیسے پہلے ان کے آباؤ اجداد کرتے تھے اور ہم انہیں ان کا حصہ بے کم وکاست دیں گے۔

(۱۱۰) ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب دی۔ اس کے بعد ان لوگوں نے اس میں اختلاف کیا اور اگر پہلے سے (ان کی آزمائش اور اتمام حجت کے بارے میں) خدا کا فرمان نہ ہوتا تو ان کے درمیان فیصلہ ہو جاتا۔ اور یہ (کفار مکہ) بھی اس (قرآن) کی طرف سے گہرے شک میں ہیں۔

(۱۱۱) اور تیرا پروردگار ہر شخص کا عمل بے کم و کاست اسے دے گا وہ ان کی کارگزاری سے آگاہ ہے۔

(۱۱۲) لہٰذا تمہیں جس طرح حکم ہوا ہے استقامت اختیار کرو اور اسی طرح وہ لوگ بھی جو تیرے ساتھ خدا کی جانب آتے ہیں اور سرکشی نہ کرو کیونکہ جو کچھ تم کرتے ہو خدا اسے دیکھتا ہے۔

تفسیر

استقامت کا دامن تھامے رکھو

یہ آیات درحقیقت پیغمبر اکرمؐ کی دلجوئی اور تسلی کی خاطر اور ان کی مسئولیت و ذمہ داری بیان کرنے کے لیے نازل ہوئی ہیں۔

دراصل گزشتہ قوموں کے حالات سے یہ اہم نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبرؐ اور ان کے بعد سچے مومنین دشمنوں کی کثرت سے خوفزدہ نہ ہوں اور جس بت پرست اور ظالم قوم کا انہیں سامنا ہے اس کی شکست کے بارے میں شک و شبہ میں نہ پڑیں اور خدائی امداد پر مطمئن رہیں۔

اسی لیے پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: اس چیز کے بارے میں کسی شک و شبہ میں نہ پڑو کہ جس کی یہ پرستش کرتے ہیں کیونکہ یہ بھی اسی راستے پر گامزن ہیں جس پر گزشتہ لوگوں کا ایک گروہ گیا ہے اور یہ بھی اسی طرح پرستش کرتے ہیں جیسے پہلے ان کے بڑے کیا کرتے تھے لہٰذا ان کا انجام ان سے بہتر نہیں ہوگا (فلا تک فی مریة مما یعبد هؤلاء ما یعبدون الا کما یعبد اٰباؤهم من قبل)[1]

لہٰذا بلافاصلہ فرمایا گیا ہے: ہم یقیناً سزا اور عذاب میں سے ان کا حصہ انہیں بے کم و کاست دیں گے اور اگر وہ راہِ حق کی طرف پلٹ آئیں تو ہماری جزا میں سے ان کا حصہ محفوظ ہے (وانا لموفوهم نصيبهم غير منقوص)۔

---

[1] "مریہ" (بروزن "جزیہ" اور بروزن "قریہ" بھی آیا ہے) جرم وارادے میں تردد و شک کے معنی میں ہے۔ بعض نے اسے ایسے شک کے معنی میں لیا ہے جس میں قرائن تہمت موجود ہوں۔ بنیادی طور پر اس کا معنی ہے اونٹنی کے پستان سے دودھ دوہنے کے بعد اسے اس امید پر نچوڑنا کہ اگر کچھ دودھ پستان میں باقی ہے تو وہ نکل آئے۔ یہ کام چونکہ تردد و شک کے عالم میں انجام پاتا ہے لہٰذا اس لفظ کا اطلاق ہر قسم کے تردد و شک پر ہونے لگا۔

باوجودیکہ لفظ "موفوھم" خود حق کی مکمل ادائیگی کے معنی میں ہے لفظ "غیر منقوص" (بے کم وکاست) بھی اس مسئلے پر زیادہ تاکید کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔

دراصل یہ آیت اس حقیقت کو مجسم کرتی ہے کہ گزشتہ لوگوں کی جو سرگزشت ہم نے پڑھی ہے وہ ناول یا افسانہ نہیں تھا نیز وہ انجام گزشتہ لوگوں کے ساتھ مخصوص نہیں تھا بلکہ یہ ایک ابدی اور جاودانی سنت ہے اور تمام انسانوں کے بارے میں ہے، کل آج اور آئندہ کل کے لیے البتہ یہ عذاب اور سزائیں بہت سی گزشتہ قوموں میں ہولناک اور عظیم بلاؤں کی صورت میں عمل پذیر ہوئیں لیکن پیغمبر اسلامؐ کے دشمنوں کے لیے ایک اور شکل میں ظاہر ہوئیں۔ وہ صورت یہ تھی کہ خدا نے اپنے پیغمبر کو اس قدر قدرت اور طاقت دی کہ آپؐ ہٹ دھرم اور بے رحم دشمنوں کو کہ جو کسی طور بھی راہ مستقیم پر آنے کے لیے تیار نہ تھے گروہ مومنین کے ذریعے درہم برہم کرسکیں۔

دوبارہ پیغمبر اکرمؐ کی تسلی کے لیے فرمایا گیا ہے، اگر تیری قوم تیری آسمانی کتاب کے بارے میں یعنی قرآن کے متعلق بہانہ جوئی کرتی ہے تو پریشان نہ ہو کیونکہ ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب (توراۃ) دی تھی، ان کی قوم نے اس میں اختلاف کیا بعض نے قبول کرلیا اور بعض نے انکار کردیا (ولقد اتینا موسی الکتاب فاختلف فیہ)۔

اگر تم دیکھتے ہو کہ تمہارے دشمنوں کو سزا دینے کے بارے میں ہم جلدی نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قوم کی تعلیم و تربیت اور ہدایت کے حوالے سے جو مصلحتیں ہیں وہ ایسا تقاضا نہیں کرتیں اور اگر یہ مصلحت نہ ہوتی اور وہ پروگرام جو تیرے پروردگار نے اس سلسلے میں پہلے سے شروع کر رکھا ہے تاخیر کا تقاضا نہ کرتا تو لازماً ان کے درمیان فیصلہ ہوجاتا اور سزا انہیں دامنگیر ہوجاتی (ولولا کلمة سبقت من ربك لقضی بینھم)۔ اگر انہیں اس حقیقت کا ابھی تک یقین نہیں آیا اور اس کے بارے میں اسی طرح شک و شبہ میں ہیں ایسا شک و شبہ جس میں سوءِ ظن اور بدبینی کی آمیزش ہے (وانھم لفی شك منه مریب)[1]

"مریب" مادہ "ریب" سے ایسے شک کے معنی میں ہے کہ جو بدبینی، سوءِ ظن اور مخالف قرائن کی آمیزش رکھتا ہو۔ اس بناء پر اس لفظ کا مفہوم یہ ہوگا کہ بت پرست نہ صرف حقانیت قرآن کے بارے میں اور تباہ کاروں پر نزولِ عذاب کے معاملے میں شک کرتے ہیں بلکہ مدعی ہیں کہ اس کے خلاف قرائن بھی ہمارے پاس ہیں۔

---

[1] اس بارے میں کہ اس آیت میں "ھم" کی ضمیر اور اسی طرح "منه" کی ضمیر کس کی طرف لوٹتی ہے مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کا نظریہ ہے کہ "ھم" کی ضمیر قوم موسیٰ کی طرف اور "منه" کی ضمیر کتاب موسیٰ کی طرف لوٹتی ہے اور آیت کا معنی یوں ہے:

"اس قوم کے لوگ ابھی تک کتاب موسیٰ کے بارے میں تردد و شک میں ہیں"

لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ پہلی ضمیر مشرکین مکہ اور دوسری قرآن (یا ان کی سزا اور عذاب) کی طرف لوٹتی ہے۔ اس طرف توجہ کرتے ہوئے قبل اور بعد کی آیات پیغمبر اسلامؐ کی دلجوئی اور تسلی کے لیے ہیں دوسری تفسیر زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے اور ہم نے بھی متن میں اسے ہی منتخب کیا ہے۔

"راغب" نے مفردات میں "ریب" کا معنی ایسا شک کیا ہے کہ جس کے چہرے سے بعد میں پردہ اٹھ جائے اور وہ یقین میں بدل جائے۔ اس بناء پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ عنقریب تیری دعوت کی حقانیت سے اور اسی طرح تباہ کاروں کی سزا اور عذاب سے پردہ اٹھ جائے گا اور حقیقت امر ظاہر ہو جائے گی۔

مزید تاکید کے لیے اضافہ کیا گیا ہے، تیرا پروردگار ان دو گروہوں (مومنین اور کافرین) میں سے ہر ایک کو ان کے اعمال کی پوری جزا دے گا اور ان کے اعمال بے کم و کاست خود انہی کی تحویل میں دے دے گا (وان کلا لما لیوفینھم ربک اعمالھم)۔ خدا کے لیے یہ کام مشکل نہیں کیونکہ وہ ہر چیز سے آگاہ ہے اور وہ جو کچھ بھی انجام دیتے ہیں اس سے باخبر ہے (انہ بما یعملون خبیر)۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ فرمایا گیا ہے کہ ہم انہیں ان کے اعمال دے دیں گے اور یہ مسئلہ تجسیم اعمال کی طرف ایک اور اشارہ ہے اور اس بات کی نشاندہی ہے کہ جزا اور سزا در اصل انسان کے اعمال ہی کی مختلف شکل ہے جو اس تک پہنچ جاتے ہیں۔

گزشتہ انبیاء اور قوموں کی سرگزشت اور ان کی کامیابی کی رمز بیان کرنے کے بعد اور اسی طرح پیغمبر اسلامؐ کی دلجوئی اور ان کے ارادے کی تقویت کے بعد اگلی آیت میں پیغمبر اکرمؐ کو اہم ترین حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے، استقامت و پامردی اختیار کرو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے (فاستقم)۔

تبلیغ و ارشاد کی راہ میں استقامت اختیار کرو، جہاد و پیکار کے راستے میں استقامت اختیار کرو، خدائی ذمہ داریوں کی انجام دہی اور تعلیمات قرآن کو عملی شکل دینے میں استقامت اختیار کرو۔ لیکن یہ استقامت اسے اور اُسے خوش کرنے کے لیے نہ ہو، نہ ظاہر داری اور ریاکاری کے لیے ہو، نہ شہرت اور تسلط کے لیے ہو، نہ مقام و منصب اور دولت و ثروت کے لیے ہو اور نہ طاقت و اقتدار کے لیے ہو بلکہ صرف فرمان خدا کی خاطر ہو اور جس طرح تجھے حکم دیا گیا اسی طرح ہونا چاہیئے (کما امرت)۔

لیکن یہ حکم صرف تجھ سے مربوط نہیں ہے تمہیں بھی استقامت کرنا چاہیئے۔ اور وہ تمام لوگ بھی جو شرک سے ایمان کی طرف لوٹے ہیں اور انہوں نے اللہ کی دعوت کو قبول کیا ہے" (ومن تاب معک)۔

ایسی استقامت جو افراط و تفریط سے پاک ہو، جو کمی بیشی سے خالی اور جس میں سرکشی نہ ہو (ولا تطغوا)۔

کیونکہ خدا تمہارے اعمال سے آگاہ اور باخبر ہے اور کوئی حرکت و سکون، گفتگو اور پروگرام اس سے مخفی نہیں ہے (انہ بما تعملون بصیر)۔

پُر معنی اور روح فرسا آیت

ابن عباس سے مروی ایک مشہور حدیث میں ہے :

ما نزل علی رسول اللّٰہ (ص) اٰیۃ کانت اشد علیہ ولا اشق من ھذہ الاٰیۃ۔

ولذالک قال لاصحابہ حین قالوا لہ اسرع الیک الشیب یارسول اللہ شیبتنی ھود والواقعہ۔

پیغمبر خدا پر اس آیت سے زیادہ شدید اور گراں آیت نازل نہیں ہوئی، اسی لیے جب اصحاب نے آنحضرت سے پوچھا کہ یارسول اللہ! آپ کے بال اتنی جلدی کیوں سفید ہو گئے اور پیری کے آثار اتنی جلدی کیوں نمایاں ہو گئے تو آپ نے فرمایا: مجھے سورہ ہود اور سورہ واقعہ نے بوڑھا کر دیا ہے۔[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ جس وقت مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی تو پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

شمروا، شمروا، فما رئی ضاحکا

دامن سمیٹ لو، دامن سمیٹ لو (کہ کام اور کوشش کا وقت ہے)،

اور اس کے بعد کبھی آپ کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔[2]

اس کی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ اس آیت میں چار اہم احکام موجود ہیں کہ جن میں سے ہر ایک انسان کے کندھے پر بارگراں کی مانند ہے۔

ان میں سے سب سے اہم حکم استقامت ہے۔ استقامۃ۔ جو۔ قیام۔ کے مادہ سے لی گئی ہے، اس لحاظ سے کہ انسان حالت قیام میں اپنے کام کاج پر زیادہ مسلط ہوتا ہے۔

استقامت جو طلب قیام کے معنی میں ہے یعنی اپنے آپ میں ایسی حالت پیدا کر کہ تجھ میں سستی کی کوئی گنجائش نہ ہو ـ کیسا سخت اور سنگین حکم ہے۔

ہمیشہ کامیابیاں حاصل کرنا نسبتاً آسان کام ہے لیکن ان کی نگہداشت کرنا اور انہیں محفوظ رکھنا بہت ہی مشکل ہے ـــ وہ بھی ایسے معاشرے میں جو پس ماندہ اور عقل و دانش سے دور ہو ـــ ایسے لوگوں کے مقابلے میں جو ہٹ دھرم اور سخت مزاج ہوں ـــ کثیر اور مصمم ارادے والے دشمنوں کے درمیان ـــ صحیح، سالم، سربلند، باایمان اور آگے بڑھنے والے معاشرے کی تعمیر کے راستے میں استقامت کوئی آسان کام نہیں تھا۔

دوسرا حکم یہ کہ یہ استقامت ایسی ہو کہ اس کا ہدف صرف خدائی ہو اور اس کا سبب حکم خدا ہو اور یہ ہر قسم کے شیطانی وسوسے سے دور رہے یعنی بہت بڑی سیاسی اور اجتماعی طاقت ہاتھ میں لینے کے لیے ہو اور وہ بھی صرف خدا کی خاطر۔

تیسرا مسئلہ ان لوگوں کی رہبری کا ہے کہ جو راہ حق کی طرف لوٹے ہیں اور انہیں استقامت پر ابھارنا۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، ج ۵ صفحہ ۱۹۹۔

[2] در المنثور، مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

اور آمادہ کرنا ہے ، اور

چونکہ حق و عدالت کے راستے میں جہاد کی رہبری کرنا اور ہر قسم کے تجاوز اور سرکشی کو روکنا ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے افراد مقصد تک پہنچنے کے لیے انتہائی استقامت و پامردی دکھاتے ہیں لیکن عدالت کا لحاظ نہیں رکھتے اور وہ اکثر اوقات طغیان و سرکشی اور حد سے تجاوز کرنے لگتے ہیں۔

جی ہاں! یہ تمام احکام جمع ہو گئے اور پیغمبر اکرمؐ پر ذمہ داریوں کا ایسا بوجھ لاد دیا کہ آپؐ نے مسکرانا چھوڑ دیا اور آپؐ کو بوڑھا کر دیا

بہرحال یہ حکم صرف کل کے لیے نہیں تھا بلکہ آج کے لیے اور آئندہ کل اور اس کے بعد کیلئے بھی ہے۔

آج بھی ہم مسلمانوں کی ذمہ داری، خصوصاً رہبران اسلام کی ذمہ داری کا خلاصہ یہی چار جملے ہیں۔ استقامت، خلوص، مومنین کی رہبری اور سرکشی و تجاوز سے اجتناب۔ اور ان اصولوں کو پلے باندھے بغیر ان دشمنوں پر کامیابی ممکن نہیں جنہوں نے داخلی اور خارجی طور پر ہمارا احاطہ کر رکھا ہے اور جو تمام ثقافتی، فرہنگی، سیاسی، اقتصادی، اجتماعی اور فوجی وسائل ہمارے خلاف استعمال کرتے ہیں۔

۱۱۳ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ○

ترجمہ

۱۱۳۔ ظالموں پر بھروسہ نہ کرو کہ جو اس بات کا باعث ہوگا کہ آگ تمہیں چھوئے اور اس حالت میں خدا کے سوا تمہارا کوئی ولی و سرپرست نہیں ہوگا اور تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔

تفسیر

ظالموں پر بھروسہ نہ کرو

یہ آیت ایک نہایت بنیادی، اجتماعی، سیاسی، فوجی اور نظریاتی لائحہ عمل بیان کر رہی ہے۔ تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے ان کی ایک قطعی اور حتمی ذمہ داری کے طور پر ان سے کہا گیا ہے: ان لوگوں پر بھروسہ نہ کرو کہ جنہوں نے ظلم و ستم کیا ہے، نہ اُن پر اعتماد کرو، نہ ان کا سہارا لو اور نہ ان پر تمہارا تکیہ ہو (ولا ترکنوا الی الذین ظلموا) کیونکہ اس کام کے سبب آتشِ جہنم کا عذاب تمہیں دامن گیر ہو جائے گا (فتمسکم النار) اور خدا کے علاوہ تمہارا کوئی ولی، سرپرست اور یاور نہ ہوگا (وما لکم من دون اللہ من اولیاء) اور واضح ہے کہ اس حالت میں کوئی تمہاری مدد نہیں کرے گا (ثم لا تنصرون)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ "رکون" کا مفہوم: "رکون" مادہ "رکن" سے ستون اور ان دیواروں کے معنی میں ہے جو کسی عمارت یا دوسری چیزوں کو کھڑا کیے رکھتی ہیں۔ بعد ازاں یہ لفظ کسی پر اعتماد اور تکیہ کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں اس لفظ کے لیے بہت سے معانی ذکر کیے ہیں لیکن وہ سب یا ان میں سے زیادہ تر ایک جامع اور کلی مفہوم کی طرف لوٹتے ہیں مثلاً بعض نے اس کا معنی تمایل کیا ہے، بعض نے ہمکاری، بعض نے اظہارِ رضایت یا دوستی، بعض نے خیرخواہی اور بعض نے اس کا معنی اطاعت کیا ہے کہ جو سب کے سب تکیہ، اعتماد اور وابستگی کے جامع مفہوم میں جمع ہیں۔

۲۔ کن امور میں ظالموں سے وابستگی نہیں کرنا چاہیئے: واضح ہے کہ سب سے پہلے قرآن کے ظلم و ستم میں شرکت نہیں کرنا چاہیئے اور نہ ہی ایسے کام میں ان سے مدد لینا چاہیئے۔ اس کے بعد ان چیزوں میں ان سے تعلق نہیں رکھنا چاہیئے جو اسلامی معاشرے کے ضعف و ناتوانائی کا باعث ہو، استقلال اور خود کفالت کھو دینے کا سبب ہو اور ایک عضو ناتواں اور وابستہ میں تبدیل کر دینے کا ذریعہ ہو۔ ایسے امور میں ان پر اعتماد اور بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ایسے سہاروں کا نتیجہ اسلامی معاشروں کے لیے شکست، ناکامی اور کمزوری کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔

باقی رہا مثال کے طور پر مسلمانوں کا غیر مسلمان معاشروں سے تجارتی یا علمی روابط اس بنیاد پر رکھنا کہ اسلامی معاشروں کے مفادات، استقلال اور ثبات محفوظ رہیں تو ایسے روابط ظالمین سے "رکون" اور وابستگی کے مفہوم میں داخل نہیں اور نہ ہی اسلام کی نظر میں ایسی کوئی چیز ممنوع ہے۔ خود پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں اور بعد کے ادوار میں ہمیشہ ایسے روابط موجود رہے ہیں۔

۳۔ ظالموں سے وابستگی کی حرمت کا فلسفہ: ظالموں پر تکیہ اور بھروسہ کرنے سے بہت سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں جو اجمالی طور پر کسی شخص سے پوشیدہ نہیں ہیں لیکن اس مسئلے میں جتنا زیادہ غور و فکر کریں اتنا ہی نئے پہلو واضح ہوتے جائیں گے۔

ظالموں پر تکیہ کرنا ان کی تقویت کا باعث ہے اور ان کی تقویت معاشروں میں ظلم، فساد اور تباہی پھیلانے کا باعث ہے۔

احکام اسلامی میں ہے کہ جب تک انسان مجبور نہ ہو (بلکہ بعض اوقات مجبور بھی ہو تب بھی) ظالم کے مقرر کردہ قاضی کے ذریعے اپنا حق حاصل نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ایسے جج اور ایسی حکومت کی طرف احقاق حق کے رجوع کرنے کا مفہوم ضمنی طور پر اس حکومت کو تسلیم کرنا اور اسے تقویت پہنچانا ہے اور اس کام کا ضرر بعض اوقات اپنا حق کھو دینے سے زیادہ ہوتا ہے۔

ظالموں پر بھروسہ تدریجاً معاشرے کی ثقافت و تمدن کے فکری پہلوؤں پر اثر انداز ہوتا ہے، رفتہ رفتہ ظلم اور گناہ کی برائی اور قباحت کا تصور ختم کر دیتا ہے اور لوگوں کو ظلم کرنے اور ظالم بننے کی ترغیب دیتا ہے۔

اصولی طور پر دوسروں پر تکیہ اور بھروسہ کرنا کہ جو وابستگی کی صورت میں ہو اس کا نتیجہ سوائے بدبختی کے کچھ نہیں چہ جائیکہ ظالم اور ستمگر پر ایسا بھروسہ کیا جائے۔

ایک آگے بڑھنے والا، سربلند اور قوی معاشرہ وہ ہے جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جیسا کہ سورہ فتح کی آیہ ۲۹ میں قرآن ایک خوبصورت مثال میں فرماتا ہے:

فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ

سرسبز پودے کی طرح کہ جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہو اور زندہ و سرفراز رہنے کے لیے کسی دوسری

چیز سے وابستگی نہ رکھتا ہو۔

ایک با استقلال اور آزاد معاشرہ وہ ہے جو ہر لحاظ سے خود کفیل اور خود کفایت ہو اور دوسروں سے اس کا ارتباط برابر کے منافع کی بنیاد پر ہو، نہ کہ ایک ضعیف کے طاقتور پر بھروسے اور انحصار کی بنیاد پر۔ یہ وابستگی چاہے فکری اور ثقافتی ہو یا فوجی، اقتصادی اور سیاسی ہو۔ ورنہ اس کا نتیجہ غلامی اور استعمار کے اور کچھ برآمد نہیں ہوگا اور اگر یہ وابستگی ظالموں کے ساتھ ہو تو اس کا نتیجہ ان کے ظلم سے وابستگی اور ان کے پروگراموں میں شرکت ہوگا۔

البتہ مندرجہ بالا آیت کا حکم معاشرے کے روابط کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دو افراد کے ایک دوسرے سے رابطے کے بارے میں بھی ہے یہاں تک کہ ایک آزاد باایمان شخص کو کبھی بھی ایک ظالم و ستمگر کا سہارا نہیں لینا چاہیئے ورنہ وہ اپنا استقلال گنوا بیٹھے گا، اس کے دائرہ ظلم و ستم کی طرف کھنچ جائے گا اور فساد و بے دادگری کی تقویت و وسعت کا باعث بھی ہوگا۔

۴۔ "الذین ظلموا" سے مراد کون لوگ ہیں؟ اس سلسلے میں مفسرین نے بہت سے احتمالات ذکر کیے ہیں۔ بعض نے ان سے مشرکین مراد لیے ہیں لیکن جیسا کہ بعض دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ انہیں مشرکین میں منحصر سمجھنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے اگر نزول آیت کے وقت ظالمین کا مصداق مشرک تھے تب بھی منحصر کرنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے جیسا کہ روایات میں اس لفظ کی جو مشرکین کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے وہ بھی انحصار کی دلیل نہیں بنتی کیونکہ ہم نے بارہا لکھا ہے کہ ایسی روایات واضح اور آشکار مصداق بیان کرتی ہیں۔

اس بنا پر وہ تمام اشخاص جنہوں نے بندگانِ خدا پر ظلم اور فساد کے لیے ہاتھ دراز کیے ہیں، انہیں اپنا غلام بنایا ہے اور ان کی قوت و استعداد سے اپنے لیے فائدہ اٹھایا ہے "الذین ظلموا" کے عام مفہوم میں داخل ہیں اور آیت کے مصادیق میں سے ہیں لیکن مسلّم ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی میں کسی چھوٹے ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں اور کبھی اس عنوان کے مصداق تھے اس کے مفہوم میں داخل نہیں ہیں ورنہ اس صورت میں تو بہت کم افراد ہی اس سے مستثنیٰ ہوں گے اور پھر کسی شخص پر اعتماد اور بھروسہ کرنا جائز نہیں رہے گا ہاں البتہ اگر "رکون" کا معنی ظلم و ستم کے پہلو پر اعتماد اور بھروسہ کیا جائے تو پھر وہ اشخاص بھی اس کے مفہوم میں شامل ہوں گے جنہوں نے ایک ہی مرتبہ ظلم میں ہاتھ آلودہ کیے ہیں۔

۵۔ ایک اشکال اور اس کی وضاحت: بعض اہل سنت مفسرین نے یہاں ایک اشکال پیش کیا ہے جس کا جواب اُن کے مبانی کی رُو سے ہرگز آسان نہیں ہے اور وہ یہ کہ ایک طرف ان کی روایات میں آیا ہے کہ ضروری ہے سلطانِ وقت کو اولوا الامر سمجھتے ہوئے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جائے چاہے وہ کوئی بھی ہو مثلاً انہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث یوں بیان کی ہے:

تم پر لازم ہے کہ سلطان اور بادشاہ کی اطاعت کرو۔

وان اخذ مالک وضرب ظھرک

(اگرچہ وہ تمہارا مال لے لے اور تمہاری پشت پر تازیانے لگائے)۔

اسی طرح اور روایات بھی ہیں کہ جو وسیع معنی کے لحاظ سے اطاعت سلطان کی تاکید کرتی ہیں جبکہ دوسری طرف مندرجہ بالا آیت کہتی ہے کہ ظالم افراد پر تکیہ اور اعتماد نہ کرو۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان دونوں احکام کو ایک جگہ جمع کیا جا سکتا ہے؟

بعض نے چاہا ہے کہ ایک استثناء کے ذریعے اس تضاد کو ختم کریں اور وہ یہ کہ بادشاہ کی اطاعت اس وقت تک ضروری ہے جب تک وہ عصیان و نافرمانی کی راہ پر نہ چلے اور کفر کے راستے پر قدم نہ رکھے۔

لیکن ان کی روایات کا لب و لہجہ اطاعت سلطان کے لیے ہرگز اس استثناء سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

بہرصورت ہماری نظر یہ ہے کہ جس طرح مکتب اہل بیت میں آیا ہے کہ صرف اس حاکم اور متولی امور مسلمین کی اطاعت ضروری ہے جو عالم و عادل ہو اور جو عام مفہوم کے اعتبار سے پیغمبر اکرمؐ اور امام معصومؑ کا جانشین شمار ہو سکے۔ نیز اگر بنی امیہ اور بنی عباس کے بادشاہوں نے اپنے مفاد کے لیے اس سلسلے میں کچھ حدیثیں گھڑلی ہیں تو وہ کسی طرح بھی ہمارے مکتب کے اصول اور ان تعلیمات کے ہم آہنگ نہیں ہیں جو قرآن سے لی گئی ہیں۔ ایسی روایات اگر قابل تخصیص ہیں تو انہیں تخصیص دی جائے ورنہ انہیں بالکل چھوڑ دیا جائے کیونکہ جو روایت کتاب اللہ کے خلاف ہو وہ مردود ہے۔ قرآن کی صراحت ہے کہ مومنین کا امام اور پیشوا ظالم نہیں ہو سکتا اور زیر بحث آیت بھی صراحت کے ساتھ کہتی ہے کہ ظالموں کا سہارا نہ لو اور ان پر اعتماد نہ کرو۔ یا پھر ایسی روایات کو ضرورت اور مجبوری کی حالت کے ساتھ مخصوص قرار دیا جائے۔

(۱۱۴) وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ ؕ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡهِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكۡرٰی لِلذّٰكِرِیۡنَ ۚ

(۱۱۵) وَاصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ۝

ترجمہ

(۱۱۴) نماز کو دن کے دو اطراف اور ابتدائے رات میں بپا کرو کیونکہ نیکیاں برائیوں (اور ان کے آثار) کو برطرف کر دیتی ہیں۔ یہ تذکرہ ہے ان لوگوں کے لیے جو اہلِ ذکر ہیں۔

(۱۱۵) اور صبر کرو کہ خدا نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

تفسیر

نماز اور صبر

ان آیات میں اسلامی احکام میں سے دو اہم ترین کی نشاندہی کی گئی ہے جو درحقیقت روحِ ایمان اور رُکنِ اسلام ہیں۔

پہلے نماز کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: نماز کو دن کے دو اطراف میں اور اوائلِ شب میں قائم کرو (واقم الصلوٰۃ طرفی النهار وزلفا من اللیل)۔

"طرفی النهار" (یعنی دن کے دو طرف) ظاہراً یہ تعبیر صبح اور مغرب کی نماز کے بارے میں ہے جو دن کے دو اطراف میں قرار پائی ہیں اور لفظ "زلف" (بروزن "غرف") "زلفہ" کی جمع ہے نزدیکی کے معنی میں رات کے ابتدائی حصوں پر کہ جو دن کے قریب ہیں بولا جاتا ہے اس بنا پر یہ لفظ نمازِ عشاء پر منطبق ہوگا۔ روایاتِ اہلِ بیتؑ میں بھی یہی تفسیر وارد ہوئی ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں تین نمازوں (فجر، مغرب اور عشاء) کی طرف اشارہ ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پنجگانہ نمازوں میں سے صرف تین نمازوں فجر، مغرب اور عشاء کا ذکر کیوں ہوا ہے اور ظہر و عصر کی نمازوں کے بارے میں گفتگو کیوں نہیں کی گئی؟

اس سوال کا جواب پیچیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین نے "طرفی النهار" کا مفہوم اس قدر وسیع

لیا ہے کہ اس میں فجر، ظہر، عصر اور مغرب سب کو شامل کر لیا ہے اور «زلفا من اللیل» کی تعبیر کہ جو نماز عشا کیلئے ہے اس کے ساتھ پانچ نمازوں کی گنتی پوری کر لی ہے۔

لیکن انصاف یہ ہے کہ «طرفی النہار» کے الفاظ ایسی تفسیر کی تاب نہیں رکھتے خصوصاً اس طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ صدر اوّل کے مسلمان پابندی سے نماز ظہر کو اوّل وقت میں اور نماز عصر کو درمیانے وقت میں (زوال اور غروب آفتاب کے درمیان) انجام دیتے تھے۔

یہاں جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ آیات قرآن میں پانچوں نمازوں کا ذکر ہوا ہے مثلاً:

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَىٰ غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ (بنی اسرائیل - ۷۸)

کبھی تین نمازوں کا ذکر ہے جیسے محلِ بحث آیت اور کبھی صرف ایک نماز کا تذکرہ ہے مثلاً:

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ۔ (البقرہ - ۲۳۸)

اس بناء پر ضروری نہیں کہ ہر موقع پر تمام پانچ نمازوں کا ایک ساتھ ذکر ہو خصوصاً یہ کہ کبھی مناسبات کا تقاضا ہوتا ہے کہ صرف نماز ظہر (صلوۃ الوسطیٰ) کی اہمیت کے پیش نظر اس کا ذکر کیا جائے اور کبھی فجر، مغرب اور عشاء ہی کے ذکر کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ کبھی خستگی اور تکان کی وجہ سے یا نیند کی بناء پر ہو سکتا ہے یہ نمازیں معرضِ فراموشی میں چلی جائیں۔

اس کے بعد روزانہ نمازوں کے لیے خصوصاً اور تمام عبادات، اطاعات اور حسنات کے لیے عموماً فرمایا گیا ہے: نیکیاں برائیوں کو برطرف کر دیتی ہیں (ان الحسنات یذھبن السیئات) اور یہ ان کے لیے تذکر اور یاددہانی ہے جو توجہ رکھتے ہیں (ذٰلك ذکریٰ للذاکرین)۔

یہ آیت قرآن کی دیگر آیات کی طرح بتاتی ہیں کہ نیک اعمال کی تاثیر یہ ہے کہ وہ بُرے اعمال کے اثرات کو برطرف کر دیتے ہیں۔ سورہ نساء کی آیت ۳۱ میں ہے:

إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ

اگر بڑے گناہوں سے اجتناب کرو تو ہم تمہارے چھوٹے گناہوں کو چھپا دیں گے۔

اور سورہ عنکبوت کی آیہ ۷ میں ہے:

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال انجام دیئے ہم ان کے گناہوں کو چھپا دیں گے۔

اسی طرح اطاعت اور نیک اعمال کے ذریعے گناہوں کے اثرات کا زائل ہونا ثابت کیا گیا ہے۔

نفسیاتی طور پر بھی اس میں شک نہیں کہ ہر گناہ اور بُرا عمل انسانی روح میں ایک طرح کی تاریکی پیدا کر دیتا ہے اور اگر اسے جاری رکھا جائے تو اس کے پیہم اور تہ در تہ اثرات انسان کو ایک وحشت ناک صورت میں مسخ کر دیتے ہیں۔

لیکن نیک اعمال کہ جن کا سرچشمہ رضائے الٰہی ہوتا ہے روحِ انسانی کو ایک لطافت بخشتے ہیں کہ جو اس سے آثارِ گناہ دھو دیتے ہیں اور ان تاریکیوں کو روشنی میں بدل دیتے ہیں۔

• ان الحسنات یذھبن السیئات - چونکہ نماز کے حکم کے بعد فوراً آیا ہے اس لیے اس کا ایک واضح مصداق روزانہ کی نماز ہے اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ روایات میں اس کی تفسیر صرف روزانہ کی نماز ہوئی ہے تو وہ اس کے منحصر ہونے کی دلیل نہیں بلکہ جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے یہ ایک واضح قطعی مصداق بیان کیا گیا ہے۔

نماز کی انتہائی اہمیت

متعدد روایات جو مندرجہ بالا آیات کے ذیل میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومینؑ سے نقل ہوئی ہیں ان میں کچھ ایسی تعبیرات نظر آتی ہیں جو مکتبِ اسلام میں نماز کی انتہائی اہمیت سے پردہ اٹھاتی ہیں۔

ابو عثمان کہتا ہے:

میں سلمان فارسی کے ساتھ ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ انہوں نے درخت کی ایک خشک شاخ پکڑ کر ہلائی یہاں تک کہ اس کے سارے پتے جھڑ گئے۔ اس کے بعد میری طرف رخ کر کے کہا، تُو نے پوچھا نہیں کہ میں نے یہ کام کیوں کیا ہے۔ میں نے کہا: بتایئے آپ کی اس کام سے کیا مراد تھی؟ انہوں نے کہا: یہی کام ایک مرتبہ پیغمبرِ اکرمؐ نے انجام دیا تھا جب میں ان کی خدمت میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے مجھ سے کہا، سلمان! پوچھتے نہیں ہو کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ میں نے عرض کیا: فرمایئے آپ نے ایسا کیوں کیا تو آپؐ نے فرمایا:

ان المسلم اذا توضأ فاحسن الوضوء ثم صلی الصلوٰت الخمس تحاتت خطایاہ کما تحات ھذا الورق ثم قرء ھذہ الاٰیۃ واقم الصلوٰۃ ....

جب مسلمان وضو کرتا ہے اور اچھی طرح وضو کرتا ہے پھر وہ پنجگانہ نماز ادا کرتا ہے تو اس کے گناہ اسی طرح جھڑ جاتے ہیں جیسا کہ اس شاخ کے پتے جھڑ گئے ہیں اس کے بعد آپؐ نے یہ آیت • واقم الصلوٰۃ ... • کی تلاوت فرمائی [1]

ایک اور حدیث رسول اللہ کے صحابی ابی امامہ سے مروی ہے، ابی امامہ کہتے ہیں:

ایک دن میں مسجد میں رسول اللہ کی خدمت میں بیٹھا تھا کہ ایک شخص آیا۔ اس نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں نے ایک گناہ کیا ہے کہ جس کی وجہ سے مجھ پر حد لازم ہو جاتی ہے۔ وہ حد مجھ پر جاری کیجئے۔ فرمایا: کیا تُو نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے؟ اس نے عرض کی: جی ہاں یا رسول اللہ!

---

[1] مجمع البیان۔ مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

فرمایا: خدا نے تیرا گناہ یا تیری حد تجھے بخش دی ہے۔[1]

نیز حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے، آپ فرماتے ہیں:

میں رسول خدا کے ساتھ مسجد میں نماز کے انتظار میں تھا کہ ایک شخص کھڑا ہو گیا، اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے ایک گناہ کیا ہے۔ رسول اللہ نے اس سے منہ پھیر لیا۔ جب نماز ختم ہوئی تو وہی شخص پھر کھڑا ہوا اور پہلی بات دہرائی۔ رسول خدا نے فرمایا: کیا تُو نے ہمارے ساتھ یہ نماز ادا کی ہے؟ اور اچھی طرح وضو نہیں کیا؟۔ اس نے عرض کیا: کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ تیرے گناہوں کا کفارہ ہے۔[2]

نیز حضرت علی علیہ السلام ہی کے واسطے سے پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

انما منزلة الصلوٰت الخمس لامتی کنهر جار علیٰ باب احدکم فما یظن احدکم لو کان فی جسده درن ثم اغتسل فی ذٰلک النهر خمس مرات لو کان یبقی فی جسده درن فکذٰلک والله الصلوات الخمس لامتی۔

پنجگانہ نماز میری امت کے لیے پانی کی جاری نہر کی طرح ہے کہ جو کسی شخص کے گھر کے دروازے سے گزرتی ہے۔ کیا تم گمان کرتے ہو کہ اگر اس کے بدن پر میل کچیل ہو اور پھر وہ پانچ مرتبہ روزانہ اس نہر میں غسل کرے تو پھر کوئی میل کچیل اس کے بدن پر رہ جائے گی؟ (یقیناً نہیں)، خدا کی قسم اسی طرح میری امت کے لیے پنجگانہ نماز ہے۔[3]

بہرحال اس میں شک و شبہ نہیں کہ جب نماز اپنی شرائط کے ساتھ انجام پائے تو انسان کو معنویت اور روحانیت کے ایک ایسے عالم میں لے جاتی ہے کہ اس کے ایمانی رشتے خدا کے ساتھ ایسے مستحکم کر دیتی ہے کہ آلودگیوں اور گناہوں کے آثار اس کے قلب و جان سے دُھل جاتے ہیں۔

نماز انسان کا گناہ کے مقابلے میں بیمہ کر دیتی ہے اور گناہ کا زنگ آئینۂ دل سے صاف کر دیتی ہے۔

نماز ملکات عالی کے ——— پودے انسانی روح کی گہرائیوں میں اگاتی ہے۔ نماز ارادے کو قوی، دل کو پاک اور روح کو طاہر کرتی ہے اور اگر نماز جسم بے روح کی صورت میں نہ ہو تو تربیت کا اعلیٰ مکتب ہے۔

قرآن کی نہایت امید افزا آیت

زیر بحث آیت کی تفسیر میں حضرت علیؑ سے ایک عمدہ اور جاذب نظر حدیث منقول ہے جو اس طرح ہے:

---

[1] مجمع البیان، مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

[2] مجمع البیان، مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

[3] مجمع البیان، مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

ایک دن آپ نے لوگوں کی طرف رخ انور کرکے فرمایا:
تمہاری نظر میں قرآن کی کونسی آیت زیادہ امید بخش ہے؟
بعض نے کہا:
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ [1]
(خدا شرک کو ہرگز نہیں بخشتا اور اس سے کم تر جس شخص کے لیے چاہے بخش دیتا ہے)۔
امام نے فرمایا خوب ہے لیکن جو میں چاہتا تھا وہ نہیں ہے۔
بعض نے کہا:
وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا [2]
(جو شخص کوئی برا عمل انجام دے یا اپنے اوپر ظلم کرے اس کے بعد خدا سے بخشش طلب کرے تو خدا کو غفور و رحیم پائے گا)۔
امام نے فرمایا: یہ بھی خوب ہے لیکن جو میں چاہتا تھا وہ نہیں ہے۔
بعض نے کہا:
قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ [3]
(کہہ دو: اے میرے بندو! کہ جنہوں نے اپنے نفسوں پر اسراف کیا ہے! خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونا)۔
فرمایا اچھی ہے لیکن جو میں چاہتا تھا وہ نہیں ہے۔
بعض دیگر نے کہا:
وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ [4]
پرہیزگار لوگ ہیں جو جب کوئی برا کام انجام دیں یا اپنے اوپر ظلم کریں تو خدا کی یاد میں پڑ جاتے ہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں اور خدا کے علاوہ کون ہے جو گناہوں کو بخشے گا۔
امام نے فرمایا: یہ بھی اچھی ہے لیکن جو میں چاہتا تھا وہ نہیں ہے۔

---

[1] سورہ نساء - ۱۱۶
[2] سورہ نساء - ۱۱۰
[3] سورہ زمر - ۵۳
[4] سورہ آل عمران - ۱۳۵

اس وقت لوگ ہر طرف سے امام کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کیا تو فرمایا: کیا بات ہے مسلمانو! تو وہ عرض کرنے لگے: خدا کی قسم! ہماری نظر میں اس سلسلے میں اور کوئی آیت نہیں۔

امام نے فرمایا: میں نے اپنے حبیب رسول اللہؐ سے سنا کہ آپؐ نے فرمایا:

قرآن کی امید بخش ترین آیت یہ ہے:

واقم الصلوٰة طرفی النھار وزلفاً من الیل ان الحسنات یذھبن السیئات ذٰلک ذکریٰ للذاکرین[1]

البتہ جیسا کہ ہم نے سورۂ نساء کی آیہ ۴۸ کے ذیل میں کہا ہے کہ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ قرآن کی زیادہ امید بخش آیت یہ ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ

یعنی — خدا شرک کو نہیں بخشتا اور اس سے کمتر جتنے گناہ ہیں جسے چاہے بخش دے۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ان آیات میں سے ہر ایک اس بحث کے ایک زاویے کے بارے میں ہے اور اس کے پہلوؤں میں سے ایک پہلو کو بیان کرتی ہے، لہٰذا ان کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ درحقیقت زیر بحث آیت ایسے لوگوں کے بارے میں ہے جو اپنی نمازیں اچھی طرح سے بجا لاتے ہیں — ایسی نماز جو حضور قلب کے ساتھ ہوتی ہے وہ ان کے قلب و روح سے گناہوں کے آثار دھو دیتی ہے۔

جبکہ دوسری آیت ایسے لوگوں کے بارے میں ہے جو ایسی نماز کے حامل نہیں اور صرف توبہ کا راستہ اپناتے ہیں لہٰذا یہ آیت اس گروہ کیلئے اور وہ آیت اُس گروہ کے لیے زیادہ امید بخش ہے۔

اس سے زیادہ امید افزا بات کیا ہوگی کہ انسان جان لے کہ جس وقت اس کا پاؤں پھسلے یا ہوا و ہوس کا اُس پر غلبہ ہو (جبکہ وہ گناہ پر اصرار نہ کرے اور نہ اس کا پاؤں گناہ کی طرف کھنچا رہے) وقت نماز آپہنچے تو وہ وضو کرے اور بارگاہ معبود میں راز و نیاز کے لیے کھڑا ہو جائے، گزشتہ اعمال کے بارے میں احساس شرمندگی اس میں موجود ہو — وہ احساس ندامت کہ جو خدا کی طرف توجہ کے لوازمات میں سے ہے، تو اس کا گناہ بخشا جائے گا اور اس گناہ کی تاریکی اس کے دل سے ہٹ جائے گی۔

نماز کہ جو انسان ساز پروگرام ہے اور حسنات کی یہ تاثیر کہ وہ برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں، کے ذکر کے بعد اگلی آیت میں "صبر" کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: صبر کرو کہ خدا نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا (واصبر فان اللہ لا یضیع اجر المحسنین)۔

اگرچہ بعض مفسرین نے یہاں صبر کو نماز کے معنی میں یا رسول اللہؐ کے سامنے جو دشمن تھے ان کی اذیت کے مقابلے کے مفہوم میں محدود کر دیا ہے لیکن واضح ہے کہ محل بحث آیت میں صبر کے معنی کو محدود کرنے کیلئے کوئی دلیل موجود نہیں ہے

---

[1] مجمع البیان، مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

بلکہ اس کا ایک عمومی اور جامع مفہوم ہے کہ جس میں مشکلوں، مخالفتوں، ایذاؤں، بیماریوں، طغیانوں اور طرح طرح کی مصیبتوں کے مقابلے میں صبر کرنے کا معنی شامل ہے اور ان تمام حوادث کے مقابلے میں پامردی اور قیام صبر کا جامع مفہوم کیں مندرج ہے۔

صبر کو جو اسلام کا ایک اساسی حکم ہے قرآن میں کئی مواقع پر اس کا ذکر نماز کے ساتھ آیا ہے۔ شاید ایسا اس بنا پر ہے کہ نماز انسان میں حرکت پیدا کرتی ہے اور صبر کا حکم مقاومت اور استقامت کو ضروری قرار دیتا ہے اور یہ دونوں۔ یعنی حرکت اور مقاومت جب دوش بدوش ہوں تو ہر قسم کی کامیابی کا اصل عامل بن جاتے ہیں۔

اصولی طور پر کوئی نیکی صبر اور استقامت کے بغیر ممکن نہیں ہے کیونکہ نیک کاموں کے اختتام پذیر ہونے پر حتی طور پر استقامت لازمی ہے۔ اسی بنا پر مندرجہ بالا آیت میں صبر کا حکم دینے کے بعد فرمایا گیا ہے: وہ نیکوکاروں کی جزا ضائع نہیں کرتا۔ یعنی نیکی صبر اور قیام کے بغیر میسر نہیں آتی۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ناگوار حوادث کے مقابلے میں مختلف لوگ مختلف ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

۱۔ کچھ لوگ فوراً اپنے حواس کھو بیٹھتے ہیں اور قرآنی ارشاد کے مطابق یہ ہے کہ وہ واویلا شروع کر دیتے ہیں۔ قرآنی الفاظ ہیں:

اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًاہ

یعنی۔ جب اسے کوئی تکلیف چھوتی ہے تو جزع فزع شروع کر دیتا ہے۔ (معارج۔ ۲۰)

۲۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو حواس نہیں کھو بیٹھتے بلکہ حادثے کے مقابلے میں تحمل و بردباری سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۳۔ بعض لوگ تحمل و بردباری کے ساتھ شکر گزاری بھی کرتے ہیں۔

۴۔ کچھ لوگ ایسے حوادث کے مقابلے میں والہانہ جدوجہد کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور حادثے کے منفی اثرات ختم کرنے کے لیے انتظامات کرتے ہیں اور ایسا جہاد شروع کر دیتے ہیں کہ تھکنے کا نام نہیں لیتے اور جب تک مشکل کو سامنے سے ہٹا نہیں دیتے چین نہیں لیتے۔

خدا نے ایسے صابروں کے لیے کامیابی کا وعدہ کیا ہے:

اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ

اگر تم لوگوں میں ثابت قدم رہنے والے بیس بھی ہوئے تو دو سو پر غالب آ جاؤ گے۔ (انفال۔ ۶۵)

اور ان کے لیے دوسرے جہان کی جزا، نعمات بہشت کو قرار دیا گیا ہے:

وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًاہ

اور ان کے صبر کے بدلے خدا انہیں باغ بہشت اور ریشمی پوشاک عطا کرے گا۔ (دہر۔ ۱۲)

(۱۱۶) فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ○

(۱۱۷) وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ○

ترجمہ

(۱۱۶) تم سے پہلے کے زمانوں (اور قوموں) میں طاقتور علما، کیوں نہیں تھے کہ جو زمین میں فساد کو روکتے مگر یہ کہ ان میں سے بہت کم تھے کہ جنہیں ہم نے نجات دی اور جو ظلم وستم کرتے تھے انہوں نے عیش وعشرت اور لذتوں کی پیروی کی اور وہ گنہ گار تھے (اور وہ نابود ہوگئے)۔

(۱۱۷) اور ایسا نہ تھا کہ تیرا پروردگار آبادیوں کو ظلم وستم کے باعث نابود کرتا جبکہ ان کے باسی اصلاح کے درپے ہوتے۔

تفسیر

معاشروں کی تباہی کا سبب

گزشتہ مباحث کی تکمیل کے لیے ان دو آیات میں ایک ایسا اہم نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ جو معاشروں کی تباہی سے نجات کا ضامن ہے اور وہ یہ کہ ہر معاشرے میں جب تک صاحبانِ عقل وفکر کا ایک متعہد اور ذمہ دار گروہ موجود ہے کہ جو مفاسد کو دیکھ کر ساکت اور خاموش ہو کر نہیں بیٹھ جاتا بلکہ ان کے خلاف

مقابلے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور فکری و ثقافتی حوالے سے لوگوں کی رہبری و رہنمائی اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ تو اس صورت میں یہ معاشرہ تباہی اور نابودی کی طرف نہیں جا سکتا۔

لیکن جب بے اعتنائی اور سکوت ہر سطح اور ہر طبقے میں حکم فرما ہو اور فساد اور برائی کے عوامل کے مقابلے میں معاشرے کا کوئی دفاع نہ ہو اور اس کا کوئی حامی و مددگار نہ ہو تو پھر فساد اور اس کے پیچھے پیچھے نابودی و تباہی یقینی ہے۔

پہلی آیت میں ان گزشتہ اقوام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار تھیں ارشاد ہوتا ہے، تم سے پہلے کے قرنوں، امتوں اور قوموں میں ایسے نیک پاک باقتدار اور صاحب شعور لوگ کیوں نہیں تھے کہ جو زمین میں فساد کو پھیلنے سے روکتے (فلولا کان من القرون من قبلکم اولوا بقیۃ ینھون عن الفساد فی الارض)۔

اس کے بعد استثناء کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، مگر تھوڑے سے افراد کو جنہیں ہم نے نجات دی (الا قلیلا ممن انجینا منھم)۔

یہ چھوٹا سا گروہ اگرچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا رہا۔ لیکن یہ لوگ لوطؑ اور ان کے چھوٹے سے خاندان کی مثل، نوحؑ اور ان کے چند ایمان لانے والوں کی طرح اور صالحؑ اور ان کے چند پیروکاروں کی مانند۔ اتنے کم تھے اور اس قدر تھوڑے تھے کہ جو پورے معاشرے کی اصلاح نہ کر سکے۔

بہر حال ظالم کہ جن کی اس معاشرے میں کثرت تھی ناز و نعمت اور عیش نوشی کے پیچھے لگے رہے اور بادہ غرور اور نعمتوں اور لذتوں میں اس طرح سے مست ہوئے کہ طرح طرح کے گناہوں میں جا پڑے (واتبع الذین ظلموا ما اترفوا فیہ وکانوا مجرمین)۔

اس کے بعد اس حقیقت پر زور دینے کے لیے اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: یہ جو تم دیکھ رہے ہو کہ خدا نے اس قوم کو دیارِ عدم کی طرف بھیج دیا تو یہ اس بنا پر تھا کہ ان کے درمیان اصلاح کرنے والے نہ تھے، کیونکہ خدا کسی قوم و ملت اور شہر و دیار کو اس کے ظلم کی وجہ سے نابود نہیں کرتا اگر وہ اصلاح کی طرف قدم اٹھائے (وما کان ربک لیھلک القری بظلم و اھلھا مصلحون)۔ کیونکہ عام طور پر ہر معاشرے میں ظلم اور برائی ہوتی ہے لیکن اہم یہ ہے کہ لوگ اس ظلم اور برائی کا احساس کریں اور خدا انہیں اصلاح کیلئے اقدام کی مہلت دیتا ہے اور قانونِ آفرینش ان کے لیے حقِ حیات کا قائل ہے لیکن جب یہ احساس ختم ہو جاتا ہے، معاشرے بے پرواہی اور لاابالی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ظلم و فساد پوری طرح چھا جاتا ہے تو یہ ایسی منزل ہوتی ہے کہ سنتِ فطرت کے مطابق ان کے لیے زندہ رہنے کا حق نہیں رہتا۔ اس حقیقت کو ایک واضح مثال سے بیان کیا جا سکتا ہے۔

انسانی بدن میں ایک قوت مدافعت موجود ہوتی ہے۔ یہ قوت مدافعت خون کے سفید گلبول کی صورت میں ہوتی ہے۔ جب ہوا، آب و غذا اور چمڑے کی خراش وغیرہ کے ذریعے بیرونی جراثیم بدن کے اندر حملہ آور ہوتے ہیں تو خون کے یہ سفید ذرات سپاہیوں کی طرح ان کے مقابلے میں قیام کرتے ہیں اور انہیں نابود کرتے ہیں یا کم از کم ان کے پھیلاؤ کو روکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی دن لاکھوں سپاہیوں کا یہ عظیم لشکر کمزور پڑ جائے اور بدن کا دفاع نہ کر سکے تو بدن مضر جراثیموں کے تاخت و تاراج کا میدان بن جائے گا اور طرح طرح کی بیماریاں اس پر حملہ آور ہو جائیں گی۔

ہمارے انسانی معاشرے کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اگر دافع قوت اور محافظ لشکر کہ جسے "اولوا بقیة" کہا گیا ہے ہٹ جائے تو اجتماعی بیماری کے حامل جراثیم کہ جو معاشرے کے گوشہ و کنار میں موجود ہوتے ہیں بڑی تیزی سے نشوونما پاتے ہیں اور کثرت حاصل کر کے معاشرے کو سرتاپا بیمار کر دیتے ہیں۔

"اولوا بقیة" کا اثر معاشروں کی بقاء کے لیے اتنا حساس ہے کہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے بغیر معاشروں سے حق حیات سلب ہو جاتا ہے اور یہ وہی چیز ہے جس کی طرف مندرجہ بالا آیات اشارہ کرتی ہیں۔

اولوا بقیۃ کون ہیں ؟

"اولوا" کا معنی ہے "صاحبان" اور "بقیة" کا معنی ہے باقی ماندہ۔ لغتِ عرب میں عموماً یہ تعبیر "اولوا الفضل" (صاحبانِ فضیلت اور نیک پاک شخصیات) کے معنی میں استعمال ہوتی ہے کیونکہ عام طور پر انسان بہتر اجناس اور زیادہ نفیس چیزوں کو سنبھال رکھتا ہے اور وہ اس کے پاس رہ جاتی ہیں۔ اسی لیے یہ لفظ نفاست اور نیکی کا مفہوم بھی رکھتا ہے اس کے علاوہ اجتماعی مقابلوں میں جو لوگ زیادہ ضعیف ہوتے ہیں میدان اور منظر سے زیادہ جلدی ہٹ جاتے ہیں یا نابود ہو جاتے ہیں اور وہ افراد باقی رہ جاتے ہیں جو فکر و نظر اور جسمانی قوت کے اعتبار سے زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ اسی بناء پر باقی رہ جانے والے طاقتور اور قوی ہوتے ہیں۔ اس لیے عربوں میں یہ ضرب المثل ہے :

فی الزوایا خبایا و فی الرجال بقایا

گوشہ و کنار میں ابھی چھپے ہوئے مسائل موجود ہیں اور مردوں میں سے باقی ماندہ شخصیتیں موجود ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ لفظ "بقیة" جو قرآن میں تین مواقع پر آیا ہے اسی مفہوم کا حامل ہے۔ طالوت و جالوت کے واقعہ میں قرآن مجید میں ہے :

اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى

حکومتِ طالوت کی حقانیت کی نشانی یہ ہے کہ صندوقِ عہد تمہارے ہاتھ آنے کا وہی صندوق

کہ جس میں موسٰی و ہارون کے خاندان کی نفیس یادگار ہے اور تمہارے سکون کی پونجی ہے۔ (بقرہ - ۲۴۸)

نیز حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعہ میں زیر بحث سورہ میں ہم نے پڑھا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا:

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

بقیۃ اللہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ (ہود - ۸۶)

نیز یہ جو بعض تعبیرات میں حضرت مہدی موعود علیہ السلام کو "بقیۃ اللہ" کہا گیا ہے وہ بھی اسی امر کی طرف اشارہ ہے کیونکہ وہ خدا کی طرف سے ایک عظیم اور پرفیض ذخیرہ ہیں کہ جنہیں اس جہان سے ظلم و ستم کی بساط الٹنے اور عدل و داد کا پرچم گاڑنے کے لیے باقی رکھا گیا ہے۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ قیمتی شخصیتیں، برائی کے خلاف کام کرنے والے افراد اور "اولوا بقیۃ" انسانی معاشرہ پر کتنا بڑا حق رکھتے ہیں کیونکہ یہ اقوام و ملل کی بقاء اور ہلاکت سے نجات کا وسیلہ ہیں۔

مندرجہ آیت میں جو دوسرا قابلِ توجہ نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ جب تک کسی شہر اور آبادی کے رہنے والے مصلح ہیں خدا اسے نابود نہیں کرتا۔ "مصلح" اور "صالح" میں جو فرق ہے اس کی طرف توجہ کرنے سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ صرف صالحیت اور اچھا ہونا ضامن بقاء نہیں بلکہ اگر معاشرہ صالح نہ ہو لیکن اصلاح کی کوشش کرے تو وہ بھی بقاء و حیات کا حق رکھتا ہے لیکن جب نہ صالح ہوں نہ مصلح تو پھر سنتِ آفرینش کے لحاظ سے اس کے لیے حقِ حیات نہیں ہے اور وہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔

دوسرے لفظوں میں جب معاشرہ ظالم ہو لیکن وہ اپنی طرف متوجہ ہو جائے اور اصلاح کے درپے ہو تو ایسا معاشرہ باقی رہ جاتا ہے لیکن اگر ظالم ہو اور اصلاح کے لیے قدم نہ اٹھائے تو وہ باقی نہیں رہ سکتا۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں ظلم و جرم کا ایک سرچشمہ ہوس رانی، لذت پرستی اور عیش و نوش کی پیروی کو قرار دیا گیا ہے جسے قرآن میں "اتراف" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ بے قید و بے حد عیش کوشی اور لذت پرستی طرح طرح کے خرافات کا سرچشمہ ہے جو معاشرے کے خوشحال طبقوں میں پیدا ہوتے ہیں کیونکہ شہوت کی مستی انہیں حقیقی انسانی اقدار اور اجتماعی حقائق کے ادراک سے روک دیتی ہے اور عصیان و گناہ میں غرق کر دیتی ہے۔

(۱۸) وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ○

(۱۹) اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ○

ترجمہ

(۱۸) اور اگر تیرا پروردگار چاہتا تو سب لوگوں کو (بغیر کسی اختلاف کے) ایک ہی امت قرار دیتا لیکن وہ ہمیشہ مختلف ہیں۔

(۱۹) مگر یہ کہ جس پر تیرا پروردگار رحم کرے اور اسی (رحمت کو قبول کرنے اور اس کے زیر سایہ حصول کمال) کے لیے انہیں پیدا کیا گیا ہے اور تیرے پروردگار کا فرمان قطعی ہے کہ وہ جہنم کو جنوں اور انسانوں (میں سے سرکشوں اور نافرمانوں) سے بھر دے گا۔

تفسیر

پہلی زیر بحث آیت میں ایک سنت فطرت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ جو در اصل انسان سے مربوط تمام مسائل کی حقیقی بنیاد ہے اور وہ ہے انسانوں کی روح، جسم، فکر، ذوق اور عشق کی عمارت میں اختلاف و فرق اور ارادہ واختیار کی آزادی۔ ارشاد ہوتا ہے: اگر خدا چاہتا تو تمام لوگوں کو امت واحدہ بنا دیتا لیکن خدا نے ایسا نہیں کیا اور ہمیشہ انسان ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں (ولو شاء ربك لجعل الناس امة واحدة ولا يزالون مختلفين)۔

اس لیے کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ انہیں اپنی اطاعت پر پروردگار کی تاکید اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر نہیں کہ ان سب کو ایک ہی راستے اور ایک ہی معین پروگرام پر چلاتا۔ اس لیے فرمایا گیا ہے کہ اس میں کوئی رکاوٹ نہ تھی کہ وہ تمام انسانوں کو جبری طور پر ایک ہی طرز پر خلق کرتا اور وہ سب صاحبان ایمان ہوتے اور ایمان کو قبول کرنے پر مجبور ہوتے لیکن ایسے ایمان کا کوئی فائدہ نہ تھا اور نہ ہی جبری ایمان کی

بنیاد پر ایسا اتحاد اور ہم آہنگی کہ جو غیر ارادی اسباب پر قائم ہو کسی کے مقام و مرتبے کی دلیل ہے نہ یہ حصول کمال اور تکامل کا ذریعہ ہے نہ ہی جزاء و سزا کا موجب ۔ بالکل ایسے جیسے خدا نے شہد کی مکھی کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ وہ اپنی فطرت کے جبری حکم پر پھولوں کا شیرہ جمع کرتی ہے اور مکڑی کے مجر کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اکیلا سوراخوں میں اپنا آشیانہ بناتا ہے اور ان میں سے کوئی بھی اس راستے میں خود سے کوئی اختیار نہیں رکھتا ۔

اصول طور پر انسان کی قدر و قیمت اور دوسرے موجودات سے اس کا اہم ترین امتیاز یہی ارادہ و اختیار کی آزادی کی نعمت ہے ۔ اسی طرح انسان میں مختلف ذوق ، سلیقے ، نظریات اور تصورات موجود ہیں کہ جن میں سے ہر ایک معاشرے کے ایک حصّے کی تعمیر و اصلاح کرتا ہے اور اس کے کسی ایک تقاضے کو پورا کرتا ہے ۔

جب انسان کو ارادے کی آزادی میسّر آئی ہے تو پھر عقیدے اور مذہب و مکتب کے انتخاب میں اختلاف فطری بات ہے ۔ اسی اختلاف سے ایک گروہ راہ حق کو قبول کرلیتا ہے اور دوسرا باطل کا راستہ اپنا لیتا ہے لیکن اگر انسانوں کی تربیت ہو اور وہ پروردگار کے دامن رحمت اور اس کی نعمتوں سے استفادہ کرتے ہوئے صحیح تعلیمات پالیں تو پھر تفاوت کے باوجود اور آزادی اختیار کے ہوتے ہوئے راہ حق پر گامزن ہوں گے اگرچہ اس راہ میں بھی وہ مختلف ہوں گے ۔

اسی بناء پر بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے : لوگ حق کو قبول کرنے کے بارے میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر وہ کہ رحمتِ پروردگار جن کے شاملِ حال ہے (الا من رحم ربك) ۔ لیکن یہ رحمتِ الٰہی کسی خاص گروہ کے لیے مخصوص نہیں ہے ۔ سب لوگ (بشرطیکہ وہ چاہیں) اس سے استفادہ کرسکتے ہیں درحقیقت خدا نے لوگوں کو اس نعمت و رحمت کو قبول کرنے کے لیے پیدا کیا ہے (ولذٰلك خلقهم) جو لوگ رحمتِ الٰہی کے سائے میں آنا چاہتے ہیں ان کے لیے راستہ کھلا ہے ، وہ رحمت کہ جس کا فیضان عقل و ادراک ، ہدایتِ انبیاء اور کتبِ آسمانی کے ذریعے سب کے لیے عام ہے اور جب اس نعمت و رحمت سے فائدہ اٹھائیں گے تو جنت اور ابدی سعادت کے دروازے ان کے سامنے کھل جائیں گے ۔

اور اگر یہ صورت نہ ہوئی تو خدا کا فرمان صادر ہو چکا ہے کہ وہ سرکش و نافرمان جنّوں اور انسانوں سے جہنم کو بھر دے گا (و تمت كلمة ربك لاملئن جهنم من الجنة والناس اجمعين) ۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ ارادے کی آزادی ۔ اساسِ دعوت : انسانی خلقت میں ارادے کی آزادی تمام انبیاء کی دعوت کی اساس ہے ۔ اصولی طور پر اس کے بغیر انسان ترقی اور کمال کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکتا (یہاں انسانی اور روحانی کمال مراد ہے) اس بناء پر قرآن کی متعدد آیات میں یہ بات دہرائی گئی ہے کہ اگر خدا

چاہتا تو تمام لوگوں کو جبری طور پر ہدایت کرتا لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا۔

خدا تاکید کرتا ہے کہ راہِ حق کی دعوت دیتا ہے، راستے کی نشاندہی کرتا ہے، نشانیاں اور علامتیں بتاتا ہے، بےراہ روی کے نتیجے سے خبردار کرتا ہے، رہبر متعین کرتا ہے اور راستے پر چلنے اور اسے طے کرنے کا پروگرام دیتا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى

راستے کی نشاندہی ہمارے ذمہ ہے (لیل - ۱۲)

یہ بھی فرماتا ہے:

اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ

تو صرف یاد دہانی کروانے والا ہے نہ کہ زبردستی کرنے والا۔ (غاشیہ - ۲۱ ، ۲۲)۔

نیز سورہ شمس آیہ ۸ میں ہے:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا

خدا نے انسان کو پیدا کیا اور اسے فجور و تقویٰ کا راستہ بتا دیا۔

سورہ دہر کی آیہ ۳ میں ہے:

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا

ہم نے انسان کو راستے کی نشاندہی کر دی ہے۔ اب وہ چاہے شکرگزاری کرے یا کفران کرے۔

اس بنا پر محلِ بحث آیات انسانی ارادے کی آزادی اور مکتبِ جبر کی نفی پر زور دینے والی واضح ترین آیات میں سے ہیں اور اس امر کی دلیل ہیں کہ حتمی فیصلہ کرنا خود انسان ہی کا کام ہے۔

۲۔ **قرآنی آیات اور مقصدِ خلقت:** مقصدِ خلقت کے بارے میں قرآنی آیات میں مختلف بیانات موجود ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اس مقصد کے کسی ایک زاویے کی طرف اشارہ ہے۔ ان میں سے ایک آیت یہ ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ

میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ (ذاریات - ۵۶)

یعنی مکتبِ بندگی میں تکامل و ارتقاء کو پہنچ جائیں اور اس مکتب میں انسانیت کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچ جائیں۔

ایک اور مقام پر ہے:

اَلَّذِىْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا

وہ خدا کہ جس نے موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے بہتر عمل کون کرتا ہے

(یعنی ایسی آزمائش کو جس میں تربیت کی آمیزش ہو اور جس کا نتیجہ ترقی و کمال ہیں)۔ (ملک - ۲)

زیر بحث آیت میں فرمایا گیا ہے: "ولذٰلک خلقھم"۔ یعنی — لوگوں کو قبولِ رحمت کے لیے پیدا کیا گیا ہے — ایسی رحمت کہ جس میں ہدایت اور حق فیصلے کی طاقت کی آمیزش ہے۔

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، یہ تمام خطوط ایک ہی نکتے پر پہنچ کر ختم ہوتے ہیں اور وہ ہے انسانوں کی پرورش، ہدایت، پیش رفت اور تکامل و ارتقاء کہ جو حقیقی و اصلی مقصدِ خلقت شمار ہوتا ہے۔ ایسا مقصد کہ جس کی بازگشت خود انسان کے ساتھ ہے نہ کہ خدا کے ساتھ کیونکہ وہ ایک ایسا وجود ہے کہ جس کی تمام پہلوؤں سے کوئی انتہا نہیں اور وہ ایسا معبود ہے کہ جس میں کوئی نقص نہیں کہ وہ مخلوق کو پیدا کرکے کمی اور ضرورت کو پورا کرے۔

۳۔ **ایک نکتے کی وضاحت:** آخری آیت میں جن و انس سے جہنم کو بھرنے کے بارے میں خدا کا تاکیدی فرمان موجود ہے لیکن واضح ہے کہ اس حتمی فرمان کی صرف ایک شرط ہے اور وہ ہے رحمتِ الٰہی کے دائرے سے باہر نکلنا اور اس کے بھیجے ہوئے بزرگوں کی ہدایت و رہنمائی کو ٹھکرانا۔ لہٰذا اس طرح سے یہ آیت نہ صرف مکتبِ جبر کے لیے دلیل نہیں بنتی بلکہ اختیار و آزادی کے لیے تاکید مزید ہے۔

(۱۲۰) وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِىْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○

(۱۲۱) وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ○

(۱۲۲) وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ○

(۱۲۳) وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

(۱۲۰) ہم نے پیغمبروں میں سے ہر ایک کی سرگزشت تم سے بیان کی ہے تاکہ تمہارا دل آرام و سکون پائے (اور تمہارا ارادہ قوی ہو) اور ان (واقعات) میں مومنین کے لیے حق، نصیحت اور یاد دہانی آئی ہے۔

(۱۲۱) اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تمہارے بس میں ہے اسے انجام دو، ہم بھی انجام دیتے ہیں۔

(۱۲۲) اور انتظار کرو ہم بھی منتظر ہیں۔

(۱۲۳) اور آسمانوں اور زمین کے غیب (اور مخفی اسرار) خدا کے لیے ہیں اور تمام امور کی

بازگشت اس کی طرف ہے، اس کی پرستش کرو اور اس پر توکل کرو اور جو کچھ تم کرتے ہو تمہارا پروردگار اس سے غافل نہیں ہے۔

تفسیر

گزشتگان کے واقعات کے مطالعہ کے چار اثرات

ان آیات کے ساتھ ہی سورہ ہود اختتام پذیر ہوتی ہے۔ ان آیات میں اس سورہ کی تمام مباحث کا کلی نتیجہ بیان ہوا ہے۔ اس سورہ کا چونکہ زیادہ حصہ انبیاء کے بارے میں اور گزشتہ اقوام کے عبرت ناک واقعات کے بارے میں ہے لہٰذا یہاں ان داستانوں کے گراں بہا نتائج کو چار عنوانات کے تحت بطور خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے انبیاء کے مختلف واقعات تجھ سے بیان کیے ہیں تاکہ تیرے دل کو مضبوط کریں اور تیرے ارادے کو تقویت دیں (وکلا نقص علیک من انباء الرسل ما نثبت بہ فؤادک)۔

لفظ "کلا" ان سرگزشتوں کے تنوع اور ان کی مختلف اقسام کی طرف اشارہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک میں انبیاء سے ایک قسم کی روگردانی، ایک قسم کے انحرافات اور ایک قسم کے عذاب کی طرف اشارہ ہے یہ تنوع انسانی زندگی کے مختلف زاویوں اور گوشوں پر کسی طرح سے واضح روشنی ڈالتا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تثبیت قلب اور ان کے ارادے کو تقویت بخشنا۔ کہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے بالکل ایک فطری امر ہے کیونکہ سخت ہٹ دھرم اور نہایت بے رحم دشمنوں کی مخالفتیں خواہ نخواہ پیغمبر اکرمؐ کے دل پر اثر ڈالتی تھیں کیونکہ آپ بھی انسان اور بشر تھے لیکن اس بناء پر کہ ناامیدی اور یاس کی تھوڑی سی گرد بھی آپؐ کے قلب پاک پر نہ پڑے اور آپؐ کا آہنی ارادہ ان مخالفتوں اور کارشکنیوں سے کمزور نہ ہو خدا تعالیٰ آپؐ سے انبیاء کے واقعات، ان کے کام کی مشکلات، ہٹ دھرم قوموں کے مقابلے میں ان کی استقامت و پامردی اور بالآخر کامیابی کے واقعات یکے بعد دیگرے بیان کرتا ہے تاکہ رسول اللہ کا قلب و روح اور اسی طرح وہ مومنین کہ جو اس عظیم جنگ اور معرکے میں آپؐ کے دوش بدوش شریک تھے ہر روز قوی تر ہوتے رہیں۔

اس کے بعد ان واقعات کا بیان کرنے کے دوسرے عظیم نتیجے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: ان واقعات انبیاء میں زندگی سے مربوط حقائق ہیں۔ ان میں کامیابی اور ناکامی کے عوامل تمام تر تجھ

بیان کر دیئے گئے ہیں (وجاءک فی ھٰذہ الحق)[1] ۔

ان واقعات کے بیان کا تیسرا اور چوتھا نتیجہ جو واضح ہو کر سامنے آتا ہے یہ ہے کہ مومنین کے لیے وعظ و نصیحت اور تذکر و یاد دہانی ہے (وموعظۃ و ذکرٰی للمؤمنین) ۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ مؤلف المنار نے اس آیت کے ذیل میں کہا ہے کہ اس آیت میں ایجاز و اختصار کا ایسا معجزہ ہے کہ گویا گزشتہ تمام واقعات کا اعجاز اس نے اپنے اندر سمو لیا ہے اور چند مختصر سے الفاظ کے ذریعہ اس میں اس کے تمام فوائد بیان کر دیئے گئے ہیں ۔

بہرحال یہ آیت دوبارہ تاکید کرتی ہے کہ قرآن کے تاریخی واقعات کو معمولی نہ سمجھا جائے اور ان سے سننے والوں کی ضیافت طبع کے لیے استفادہ نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ یہ زندگی کے بہترین دروس کا مجموعہ ہیں ۔ ان میں انسانوں کے آج اور کل کے لیے تمام زاویوں اور پہلوؤں سے راہ کشائی کی گئی ہے ۔

اس کے بعد حضرت پیغمبرؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ تم بھی دشمن کی طرف سختیوں اور ہٹ دھرمیوں کے مقابلے میں وہی کہو جو کچھ بعض پیغمبر اُن کے جواب میں کہتے تھے ۔ فرمایا : وہ کہ جو ایمان نہیں لائیں گے ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تمہارے بس میں ہے وہ انجام دو اور کوئی گنجائش نہ چھوڑو اور جو کچھ ہماری طاقت ہوگی ہم بھی انجام دیں گے (وقل للذین لا یؤمنون اعملوا علٰی مکانتکم انا عاملون) ۔ تم انتظار میں رہو اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ کون کامیاب ہوتا ہے اور کون ہزیمت اٹھاتا ہے (وانتظروا انا منتظرون) ۔

تم ہماری شکست کے خیالِ خام میں رہو اور ہم تمہارے لیے خدا کے واقعی عذاب کے انتظار میں ہیں کہ جو یا ہمارے ہاتھوں تمہیں پہنچے گا یا براہِ راست خدا کی طرف سے ۔

ایسی دھمکیاں جو امر کی صورت میں ذکر ہوئی ہیں قرآن کے دیگر مقامات پر بھی ہیں ۔ مثلاً :

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ

جو چاہو کرو خدا تمہارے اعمال سے آگاہ ہے ۔ (حٰمٓ السجدہ ۔ ۴۰)

شیطان کے بارے میں ہے :

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ ۔

اپنی آواز سے انہیں حرکت میں لے آ اور اپنا سوار اور پیادہ لشکر ان کی طرف

---

[1] جو کچھ کہا جا چکا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ " ھٰذہ " ضمیر کا مرجع " انباء الرسل " ہیں ۔ یہ مرجع ضمیر کے قریب بھی ہے ، عبارت میں اس کا ذکر بھی ہے اور آیت میں موجود مباحث سے مناسبت بھی رکھتا ہے ۔ اس کے برخلاف توجہ کرتے ہوئے ضمیر کا ایسے مرجع کی طرف لوٹنا بالکل واضح ہے ۔

اسی طرح کے دوسرے احتمالات کہ مشار الیہ " دنیا " ہے یا خصوصیت سے قبل کی آیات ہیں ۔ یہ احتمالات بعید معلوم ہوتے ہیں ۔

نیز یہ جو بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مشار الیہ سورہ ہے ، ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے مطابقت رکھتا ہے کیونکہ سورہ کا زیادہ تر حصہ جو گزر چکا ہے گزشتہ انبیاء کے حالات کے بارے میں ہی تھا ۔

بیبیو۔ (بنی اسرائیل - ۶۴)

واضح ہے کہ امر کے یہ تمام صیغے کسی کام پر ابھارنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ وہ سب کے سب دھمکی کا پہلو رکھتے ہیں۔

اس سورہ کی آخری آیت توحید (توحید علم، توحید افعال اور توحید عبادت) بیان کر رہی ہے جیسا کہ اس سورہ کی ابتدائی آیات علم توحید کے بارے میں تھیں۔

درحقیقت اس آیت میں توحید کے تین پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے:

پہلا: پروردگار کی توحید علمی۔ آسمانوں اور زمینوں کے غیبی اسرار خدا کے ساتھ مخصوص ہیں اور وہی ہے جو تمام آشکار و نہاں بھیدوں سے باخبر ہے (وللّٰہ غیب السمٰوٰت والارض)۔ اور اس کے غیر کا علم محدود ہے اور محدود ہونے کے علاوہ خدائی تعلیم کا مرہون منت ہے اور خدا کی طرف سے ہے۔ اس بنا پر یہ لامحدود علم اور زمین و آسمان کے طول و عرض میں موجود تمام چیزوں کے بارے میں وہ علم ذاتی پروردگار کی ذات پاک کے ساتھ مخصوص ہے۔

دوسرا یہ کہ۔ تمام امور کی باگ ڈور اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور تمام چیزوں کی بازگشت بھی اسی کی طرف ہے (والیہ یرجع الامر کلہ)۔ اور یہ توحید افعالی کا مرحلہ ہے۔

تیسرا یہ کہ۔ اب جبکہ لامحدود علم اور بے پایاں قدرت اس کی ذات پاک سے مخصوص ہے اور ہر چیز کی بازگشت اس کی طرف ہے لہٰذا صرف اس کی پرستش و عبادت کرو (فاعبدہ)۔ اور اس پر توکل کرو (وتوکل علیہ)۔ اور یہ توحید عبادت کا پہلو ہے۔

اور چونکہ نافرمانی و سرکشی گناہ ہے لہٰذا اس سے بچو کیونکہ، جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے غافل نہیں ہے (وما ربک بغافل عما تعملون)۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ علم غیب خدا سے مخصوص ہے: جیسا کہ ہم چوتھی جلد میں سورہ اعراف کی آیہ ۱۸۸ اور تیسری جلد میں سورہ انعام کی آیہ ۵۰ کے ذیل میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اسرار نہاں اور اسرار گزشتہ و آئندہ پر آگاہی اور ان کا علم خدا کے ساتھ مخصوص ہے۔ قرآن مجید کی مختلف آیات بھی اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ وہ اس صفت میں اکیلا ہے اور کوئی شخص اس کی مانند نہیں ہے۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ بعض آیات قرآن میں علم غیب کے کچھ حصوں کی نسبت انبیاء کی طرف دی گئی ہے یا بہت سی آیات و روایات میں پیغمبر اکرمؐ، حضرت علیؑ اور دیگر آئمہ معصومینؑ کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ وہ حضرات بعض اوقات آنے والے واقعات اور اسرار نہاں کی خبر دیتے تھے تو یہ جاننا چاہیے کہ یہ بھی خدائی تعلیم

سے ہوتا ہے۔

وہی ہے کہ جب مصلحت دیکھتا ہے تو اسرارِ غیب کا کچھ علم اپنے خاص بندوں کو تعلیم دیتا ہے لیکن یہ علم نہ ذاتی ہے اور نہ لامحدود بلکہ تعلیم الٰہی کے ذریعے سے ہے اور اتنا ہی ہوتا ہے جتنا وہ اپنے ارادے سے عطا کرتا ہے۔

اس وضاحت سے ان تمام بدگوئی کرنے والوں کا جواب واضح ہو جاتا ہے کہ جو شیعہ عقیدے پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ انبیاء اور آئمہ کو عالم الغیب جانتے ہیں۔

خدا نہ صرف انبیاء اور آئمہ کو مناسب موقع اور محل پر اسرارِ غیب تعلیم کرتا ہے بلکہ بعض اوقات ان کے علاوہ افراد کو بھی اس قسم کی تعلیم دیتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ کی والدۂ گرامی کے بارے میں قرآن حکیم میں ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان سے کہا:

ڈرو نہیں اور غم نہ کرو۔ ہم یہ بچہ تمہاری طرف پلٹا دیں گے اور اسے انبیاء میں سے قرار دیں گے۔

قرآنی الفاظ ہیں:

وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ اِنَّا رَآدُّوْہُ اِلَیْکِ وَجَاعِلُوْہُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ۔ (قصص - ۷)

یہاں تک کہ پرندے اور دوسرے جانور ضروریاتِ زندگی کے ماتحت مخفی اسرار سے آگاہی حاصل کر لیتے ہیں، حتیٰ کہ نسبتاً مستقبل بعید کے واقعات سے بھی آگاہ ہو جاتے ہیں کہ جس کا تصور ہمارے لیے مشکل امر ہے اور یوں بعض مسائل جو ہمارے لیے غیب شمار ہوتے ہیں ان کے لیے غیب نہیں ہیں۔

۲۔ عبادت خدا کے لیے مخصوص ہے: مندرجہ بالا آیت میں عبادت خدا کے لیے مخصوص ہونے کے بارے میں ایک لطیف دلیل بیان ہوئی ہے اور وہ یہ کہ اگر پرستش عظمت اور صفاتِ جمال و جلال کی بنا پر ہے تو یہ صفات سب سے بڑھ کر خدا میں موجود ہیں اور دوسرے اس کے مقابلے میں ناچیز و حقیر ہیں۔ عظمت کی سب سے بڑی نشانی علمِ لامحدود اور قدرتِ بے پایاں ہے کہ جن کے بارے میں زیرِ نظر آیت کہتی ہے کہ یہ دونوں اس کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور اگر پرستش مشکلات کے موقع پر معبود کی پناہ چاہنے کی خاطر ہے تو یہ اہلیت اس میں ہے کہ جو بندوں کی تمام ضروریات، حاجات اور اسرارِ غیب سے باخبر ہو اور ان کی دعا قبول کرنے اور ان کی آرزوؤں کو پورا کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔ اسی بنا پر توحیدِ صفات توحیدِ عبادت کا سبب بن جاتی ہے۔ (غور کیجیے گا)۔

۳۔ تمام ترسیر و سلوک کا خلاصہ: بعض مفسرین نے کہا ہے کہ پروردگار کی عبودیت کے ذریعے انسان کی تمام ترسیر و سلوک کا خلاصہ زیرِ بحث آیت کے دو لفظوں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ یعنی "فاعبدہ وتوکل علیہ" کیونکہ عبادت چاہے عام عبادات کی طرح جسمانی ہو یا روحانی مثلاً عالم آفرینش اور نظامِ اسرارِ ہستی میں

غور و فکر ۔ وہ اس سیر و سلوک کا آغاز ہے اور توکل یعنی مطلق طور پر تمام امور کو خدا کے سپرد کرنا کہ جو ایک طرح سے "فنا فی اللہ" ہے اس سیر کا آخری نقطہ ہے ۔

اس تمام راستے میں ابتداء سے لے کر انتہا تک توحید صفات کی طرف توجہ راہرو کی مدد کرتی ہے اور کوشش و عشق سے ملی ہوئی جستجو پر ابھارتی ہے ۔

پروردگارا ! ایسا کر کہ ہم تجھے تیری صفات جمال و جلال کے ساتھ پہچانیں اور ایسا کر کہ ہم آگاہی اور علم کے ساتھ تیری طرف حرکت کریں ۔

پروردگارا ! ہمیں توفیق دے کہ ہم خلوص کے ساتھ تیری عبادت کریں اور عشق کے ساتھ تجھ پر توکل کریں ۔

پروردگارا ! اس سختی کے زمانے میں جبکہ ہمارے عظیم الشان اسلامی انقلاب کے بعد روز افزوں مشکلات نے ہر طرف سے ہمیں گھیر رکھا ہے اور دشمن اس انقلاب کے نور کو بجھا دینے کے درپے ہیں ۔ ہماری امید صرف تو ہے اور ان مشکلات کے حل کے لیے ہمارا سہارا تیری ذات پاک ہے ۔

پروردگارا ! یہاں تک کا راستہ ہم نے طے نہیں کیا بلکہ یہ تیری آشکارا اور مخفی تائیدیں تھیں کہ جنہوں نے اس مرحلے تک پہنچنے کے لیے ہر جگہ ہمیں توانائی بخشی ۔ جو راستہ باقی رہ گیا ہے اس میں بھی ہمیں اس عظیم نعمت سے محروم نہ فرما ، اپنا لطف خاص ہم سے دور نہ کر ۔ اور ہمیں اس کی بھی توفیق دے کہ ہم اس تفسیر کو کہ جو تیری عظیم آسمانی کتاب کی طرف ایک نیا دریچہ کھولتی ہے تکمیل تک پہنچا سکیں ۔

سورہ ھود کی تفسیر اختتام کو پہنچی

سورۂ یوسف

اس میں

* ۱۱۱- آیات ہیں
* کہ جو سب مکہ میں نازل ہوئی ہیں

سورۂ یوسف

چند ضروری امور

اس سورہ کی تفسیر شروع کرنے سے پہلے چند امور کا ذکر ضروری ہے :

۱۔ **یہ سورہ کہاں نازل ہوئی ؟** اس بارے میں کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی مفسرین میں کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ صرف ابن عباس سے منقول ہے کہ اس کی چار آیات (پہلی تین آیات اور ایک ساتویں آیت) مدینہ میں نازل ہوئیں ۔

لیکن دوسری آیات سے ان آیات کے ربط پر غور و فکر کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہیں دیگر آیات سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس بناء پر ان چار آیات کے مدینہ میں نازل ہونے کا احتمال بہت ہی ضعیف ہے۔

۲۔ **سورہ کا مضمون :** اس سورہ کی چند آخری آیات کے سوا تمام آیات خدا کے پیغمبر حضرت یوسف علیہ السلام کی خوبصورت، دل نشیں اور عبرت انگیز داستان بیان کرتی ہیں۔ اسی بناء پر یہ سورۃ حضرت یوسفؑ کے نام سے موسوم ہے ۔ نیز اسی بناء پر قرآن مجید میں جو مجموعاً حضرت یوسفؑ کا نام ۲۷ مرتبہ آیا ہے اس میں سے ۲۵ مرتبہ اسی سورۃ میں ذکر ہوا ہے۔ صرف دو مواقع پر دیگر سورتوں (سورہ غافر آیہ ۳۴ اور سورہ انعام آیہ ۸۴) میں آپ کا نام آیا ہے ۔

قرآن کی دیگر سورتوں کے برعکس اس سورہ کا پورا مضمون ایک دوسرے سے مربوط اور ایک واقعہ کے نشیب و فراز سے متعلق ہے ۔ دس سے زیادہ حصوں میں بیان ہونے والی یہ داستان نہایت واضح، جاذب، بچی تلی، رنگین اور ہیجان خیز ہے ۔

بے ہدف داستان پردازوں نے یا پست اور غلیظ مقاصد رکھنے والوں نے اس اصلاح کنندہ واقعہ کو ہوس بازوں کے لیے ایک عشقیہ داستان بنانے اور حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے واقعات کے حقیقی چہرے کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے ۔ یہاں تک کہ انہوں نے اسے ایک رومانی فلم بنا کر پردہ سیمیں پر پیش کرنا چاہا ہے لیکن قرآن کہ جس کی ہر چیز نمونہ اور اسوہ ہے اس واقعے کے مختلف مناظر پیش کرتے ہوئے اعلیٰ ترین عفت و پاکدامنی، خود داری، تقویٰ، ایمان اور ضبط نفس کے درس دیتے ہیں ۔ اس طرح سے کہ ایک شخص اسے جتنی مرتبہ بھی پڑھے ان قوی جذبوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اسی بناء پر قرآن نے اسے "احسن القصص" (بہترین داستان) جیسا خوبصورت نام دیا ہے اور اس میں اولوالالباب (صاحبانِ فکر و نظر) کے لیے کئی عبرتیں بیان کی ہیں ۔

۴۔ یہ سورہ ۔ قرآن کا ایک اور اعجاز : اس سورہ کی آیات میں غور و فکر سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قرآن تمام پہلوؤں سے معجزہ ہے اور اپنے واقعات میں وہ جو ہیرو پیش کرتا ہے وہ حقیقی ہیرو ہوتے ہیں، نہ کہ خیالی ۔ کہ جن میں سے ہر ایک اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے نظیر ہوتا ہے ۔

حضرت ابراہیمؑ، وہ بُت شکن ہیرو، جن کی رُوح بلند تھی اور جو طاغوتیوں کی کسی سازش میں نہ آئے ۔

حضرت نوحؑ ۔ طویل اور پُر برکت عمر میں ۔ صبر و استقامت، پامردی اور دلسوزی کے ہیرو ۔

حضرت موسیٰؑ ۔ وہ ہیرو کہ جنہوں نے ایک سرکش اور عصیان گر طاغوت کے مقابلے کے لیے ایک ہٹ دھرم قوم کو تیار کر لیا ۔

حضرت یوسفؑ ۔ ایک خوبصورت، ہوس باز اور حیلہ گر عورت کے مقابلے میں پاکیزگی، پارسائی اور تقویٰ کے ہیرو ۔

علاوہ ازیں اس واقعے میں قرآنی وحی کی قدرتِ بیان اس طرح جھلکتی ہے کہ انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے کیونکہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کئی مواقع پر یہ واقعہ عشق کے بہت ہی باریک مسائل تک جا پہنچتا ہے اور قرآن انہیں چھوڑ کر ایک طرف سے گزرے بغیر ان تمام مناظر کو ان کی باریکیوں کے ساتھ اس طرح سے بیان کرتا ہے کہ سامع میں ذرہ بھر منفی اور غیر مطلوب احساس پیدا نہیں ہوتا ۔ قرآن تمام واقعات کے متن سے گزرتا ہے لیکن تمام مقامات پر تقویٰ و پاکیزگی کی قوی شعاعوں نے مباحث کا احاطہ کیا ہوا ہے ۔

۵۔ حضرت یوسفؑ کا واقعہ اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد : اس میں شک نہیں کہ قبل از اسلام بھی داستانِ یوسف لوگوں میں مشہور تھی کیونکہ توراۃ میں سفرِ پیدائش کی چودہ فصلوں (فصل ۳۷ تا ۵۰) میں یہ واقعہ تفصیل سے مذکور ہے ۔ البتہ ان چودہ فصلوں کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ توراۃ میں جو کچھ ہے وہ قرآن سے بہت ہی مختلف ہے ۔ ان اختلافات کے موازنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ قرآن میں آیا ہے وہ کس حد تک پیراستہ اور ہر قسم کے خرافات سے پاک ہے ۔ یہ جو قرآن پیغمبرؐ سے کہتا ہے : "اس سے پہلے تو غافل تھا ۔ اس حیرت انگیز داستان کی خاص واقفیت سے ان کی عدمِ آگہی کی طرف اشارہ ہے (اگر احسن القصص سے مراد واقعۂ یوسف ہو) ۔

موجودہ توراۃ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے جب حضرت یوسفؑ کی خون آلود قمیص دیکھی تو کہا :

> یہ میرے بیٹے کی قبا ہے جسے جانور نے کھا لیا ہے ۔ یقیناً یوسف چیر پھاڑ ڈالا گیا ہے ۔

پھر یعقوبؑ نے اپنا گریبان چاک کیا ۔ ٹاٹ اپنی کمر سے باندھا اور مدتِ دراز تک اپنے بیٹے کے لیے گریہ کرتے رہے ۔ تمام بیٹوں اور بیٹیوں نے انہیں تسلی دینے میں کسر اٹھا نہ رکھی لیکن

انہیں قرار نہ آیا اور کہا کہ میں اپنے بیٹے کے ساتھ اسی طرح خود قبر میں جاؤں گا۔

جبکہ قرآن کہتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ذات سے بیٹوں کے جھوٹ کو بھانپ گئے اور انہوں نے اس مصیبت میں داد و فریاد نہیں کی اور نہ اضطراب دکھایا بلکہ جیسا کہ انبیاء کی سنت ہے اس مصیبت کا بڑے صبر سے سامنا کیا۔ اگرچہ ان کا دل جل رہا ہے آنکھیں اشکبار تھیں، فطری طور پر کثرت گریہ سے ان کی بینائی جاتی رہی۔ لیکن قرآن کی تعبیر کے مطابق انہوں نے صبر جمیل کا مظاہرہ کیا اور اپنے اوپر قابو رکھا (کظیم)۔ انہوں نے گریبان چاک کرنے، داد و فریاد کرنے اور پھٹے پرانے کپڑے پہننے سے گریز کیا جو کہ عزاداری کی مخصوص علامات تھیں۔

بہر حال اسلام کے بعد بھی یہ واقعہ مشرق و مغرب کے مؤرخین کی تحریروں میں بعض اوقات حاشیہ آرائی کے ساتھ آیا ہے۔ فارسی اشعار میں سب سے پہلے "یوسف زلیخا" کے قصے کی نسبت فردوسی کی طرف دی جاتی ہے اس کے بعد شہاب الدین عمق اور مسعودی قمی کی "یوسف زلیخا" ہے اور ان کے بعد نویں صدی کے مشہور شاعر عبدالرحمٰن جامی کی "یوسف زلیخا" ہے۔[1]

۵۔ داستان یوسفؑ ایک ہی جگہ کیوں بیان ہوئی: سوال پیدا ہوتا ہے کہ دیگر انبیاء کے واقعات کے برعکس حضرت یوسفؑ کا واقعہ ایک ہی جگہ کیوں بیان ہوا ہے؟ حضرت یوسفؑ کے واقعہ کی خصوصیات میں سے ہے کہ یہ تمام ایک ہی جگہ بیان ہوا ہے جبکہ اس کے برعکس باقی انبیاء کے حالات زندگی علیحدہ علیحدہ حصوں کی شکل میں قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

یہ خصوصیت اس بنا پر ہے کہ اس واقعے کی کڑیاں خاص وضع و کیفیت کے باوجود اگر ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو ان کا باہمی ربط ختم ہو جاتا ہے۔ مکمل نتیجہ اخذ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سارا واقعہ ایک ہی جگہ ذکر ہو۔ مثلاً حضرت یوسفؑ کے خواب دیکھنے کا واقعہ اور اس کی تعبیر جو کہ آپ کے والد نے بیان کی تھی اس سورہ کے شروع میں ہے۔ اس واقعے کا آخری حصہ بیان نہ کیا جاتے تو اس پہلے حصے کا کوئی مفہوم نہیں بنتا۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ کے آخر میں ہے کہ جس وقت حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے بھائی مصر میں آئے اور ان کے باعظمت مقام کے سامنے جھک گئے تو حضرت یوسفؑ نے اپنے والد گرامی کی طرف رخ کر کے کہا:

یا ابت ھٰذا تأویل رؤیای من قبل قد جعلھا ربی حقا۔

اے میرے پدر بزرگوار! یہ ہے میرے خواب کی تعبیر کہ جو میں نے ابتدا میں دیکھا تھا۔ خدا نے اسے سچ کر دکھایا ہے۔ (آیت - ۱۰۰)

یہ مثال اس واقعہ کے آغاز و اختتام کے درمیان نہ ٹوٹنے والے تعلق کو واضح کرتی ہے۔

---

[1] کشف الظنون حاج خلیفہ۔ ج ۲ ص ۹۹۱۔

جبکہ دوسرے انبیاء کے واقعات اس طرح کے نہیں ہیں اور ان کے واقعات کا ہر حصہ الگ نتیجہ رکھتا ہے۔

ایک اور خصوصیت اس سورہ کی یہ ہے کہ قرآن میں جو دیگر انبیاء کے حالات و واقعات آئے ہیں عام طور پر ان میں سرکش اقوام کے ساتھ ان کے مقابلوں کی تفصیل ہے کہ جن میں آخرکار ایک گروہ ایمان لے آتا ہے اور دوسرا اپنی مخالفت عذاب الٰہی سے نابود ہو جانے تک جاری رکھتا ہے لیکن داستانِ یوسفؑ میں اس سلسلے میں بات نہیں کی گئی بلکہ زیادہ تر خود حضرت یوسفؑ کی زندگی کے بارے میں ہے اور زندگی کی سخت وادیوں سے ان کے گزرنے کی داستان ہے کہ جس میں آخرکار انہیں ایک طاقتور حکومت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ واقعہ اپنی مثال آپ ہے۔

۶۔ سورہ یوسف کی فضیلت: اسلامی روایات میں اس سورہ کی فضیلت کے بارے میں مختلف فضائل مذکور ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث حضرت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

> من قرء سورة یوسف فی کل یوم او فی کل لیلة بعثه الله یوم القیامة وجماله مثل جمال یوسف ولا یصیبه فزع یوم القیامة وکان من خیار عباد الله الصالحین۔

> جو شخص ہر روز یا ہر شب سورہ یوسف کی تلاوت کرے گا، خدا اسے روزِ قیامت اس حالت میں اٹھائے گا کہ اس کا حسن و جمال حضرت یوسف علیہ السلام کا سا ہو گا اور اسے روزِ قیامت کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور وہ خدا کے بہترین صالح اور نیک بندوں میں سے ہو گا۔[1]

ہم نے بارہا کہا ہے کہ قرآن کی سورتوں کی فضیلت میں جو روایات آئی ہیں ان کا مطلب سطحی مطالعہ نہیں ہے اور ان کا مقصد یہ نہیں کہ بغیر غور و فکر اور بغیر عمل کے پڑھا جائے بلکہ ان سے مراد ایسی تلاوت ہے کہ جو غور و فکر کی تمہید ہے اور ایسا غور و فکر کہ جو عمل کا سرآغاز ہے۔

اس سورہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زندگی کا طرزِ عمل اس سورہ کی روشنی میں مرتب کرے اور ہوا و ہوس، مال و منال، جاہ و جلال اور مقام و منصب کے شدید طوفانوں کے مقابلے میں اپنے آپ پر قابو رکھے، یہاں تک کہ زندان کی تاریکیوں میں پاکدامنی محفوظ رکھنے کو برائی سے آلودہ قصرِ شاہی پر مقدم رکھے تو ایسے شخص کے قلب و روح کا حسن و جمال حضرت یوسفؑ کے

---

[1] مجمع البیان، محل بحث سورہ کے ضمن میں۔

حُسن وجمال کی طرح ہے اور قیامت کے دن کہ جب اندر کی ہر چیز نمایاں ہو جائے گی وہ خیرہ کن زیبائی حاصل کرے گا اور خدا کے صالح اور نیک بندوں کی صف میں شامل ہوگا۔

اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ چند ایک روایات میں عورتوں کو اس سورہ کی تعلیم دینے سے منع کیا گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عزیز مصر کی بیوی اور مصر کی ہوس باز عورتوں سے مربوط آیات اگرچہ پورے عفت بیان کے ساتھ آئی ہیں مگر ہو سکتا ہے بعض عورتوں کے لیے تحریک کا باعث ہوں اور اس کے برعکس تاکید کی گئی ہے کہ عورتوں کو سورہ نور کی تعلیم دی جائے کہ جس میں حجاب کے بارے میں آیات ہیں۔

لیکن ان روایات کی اسناد ہرگز قابلِ اعتماد نہیں ہیں جبکہ اس کے برعکس روایات بھی موجود ہیں کہ جن میں گھر والوں کو اس سورہ کی تعلیم دینے کا شوق دلایا گیا ہے۔

علاوہ ازیں اس سورہ میں غور و خوض کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نہ صرف یہ کہ عورتوں کیلئے کوئی نقطۂ ضعف موجود نہیں ہے بلکہ عزیز مصر کی بیوی کا واقعہ ان سب کے لیے درسِ عبرت ہے کہ جو شیطانی وسوسوں میں گرفتار ہوتی ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۱) الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ○

(۲) اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○

(۳) نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ○

ترجمہ

اللہ کے نام سے شروع جو رحمان و رحیم ہے

(۱) الٓر وہ واضح کتاب کی آیات ہیں۔

(۲) ہم نے اس پر عربی قرآن نازل کیا ہے تاکہ تم سمجھو (اور غور و فکر کرو)۔

(۳) ہم نے تیرے سامنے بہترین واقعہ بیان کیا ہے، تجھ پر اس قرآن کی وحی کر کے، اگرچہ اس سے پہلے تو غافلین میں سے تھا۔

تفسیر

یہ داستان۔ "احسن القصص" ہے

اس سورہ کا آغاز بھی حروف مقطعات (الف۔ لام۔ را) سے ہوا ہے کہ جو عظمت قرآن کی نشانی ہے اور اس بات کی مظہر ہے کہ یہ عمیق اور معنی خیز آیات حروف الف با کے سادہ ترین اجزاء سے ترکیب دی گئی ہیں۔

قرآن کے حروف مقطعات کے بارے میں اب تک تین مواقع پر (سورہ بقرہ، آل عمران اور اعراف کی ابتداء میں) کافی بحث ہو چکی ہے لہٰذا اب تکرار کی ضرورت نہیں اور ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ یہ حروف

عظمتِ قرآن پر دلالت کرتے ہیں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ حروفِ مقطعات کے فوراً بعد عظمتِ قرآن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "یہ کتابِ مبین کی آیات ہیں"۔ وہ کتاب جو ضو فشاں ہے، حق کو باطل سے جدا کرکے دکھانے والی ہے، صراطِ مستقیم کی رہنما ہے اور نجات و کامیابی کا راستہ بتانے والی ہے (تلك اٰيٰت الكتاب المبين)۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ اس آیت میں دُور کے اسمِ اشارہ (تلك) سے استفادہ کیا گیا ہے کہ جس کی نظیر سورہ بقرہ اور بعض دیگر سورتوں کی ابتداء میں بھی موجود ہے۔ اس کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ ایسی تمام تعبیرات ان آیات کی عظمت کی طرف اشارہ ہیں یعنی یہ آیات ایسی بلند و برتر ہیں کہ گویا ان کا مقام بہت ہی بالا ہے، آسمانوں کی بلندی پر بیکراں فضاؤں کی گہرائیوں میں کہ جن تک پہنچنے کے لیے بہت تگ و دو کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی گرے پڑے مطالب کی طرح نہیں ہیں کہ جو ہر قدم پر انسان کو مل جاتے ہیں۔

ایسی تعبیر کے نمونے فارسی ادب میں بھی ہیں کہ ایک بلند مرتبہ شخصیت کے حضور ہم کہتے ہیں آن جناب، آن مقام محترم .... وغیرہ۔

اس کے بعد ان آیات کے نزول کا مقصد یوں بیان کیا گیا ہے: ہم نے اسے عربی قرآن بھیجا ہے تاکہ تم اسے اچھی طرح سمجھ سکو (انا انزلنٰه قرءٰنا عربيا لعلكم تعقلون)۔

مقصد صرف ان آیات کی قرأت، تلاوت اور تبرکاً پڑھنا نہیں ہے بلکہ اصل انہیں سمجھنا ہے اور یہ تمام انسانی وجود کو عمل کی دعوت ہے۔

باقی رہا قرآن کا عربی میں ہونا تو اس کی شہادت دنیا کی مختلف زبانوں کا مطالعہ کرنے والوں نے دی ہے کہ یہ ایسی وسیع زبان ہے کہ جو لسانِ وحی کی ترجمان ہو سکتی ہے اور خدا کی باتوں کے مفہوم اور باریکیوں کو واضح کرتی ہے۔ اس کے علاوہ مسلم ہے کہ اسلام نے جزیرہ عربستان سے طلوع کیا ہے کہ جو تاریکی، ظلمت، وحشت اور بربریت کا مرکز ہے۔ ظاہر ہے سب سے پہلے اسے وہاں کے لوگوں ہی کو اپنے گرد جمع کرنا تھا اور اسے اس طرح سے گویا واضح ہونا چاہیئے تھا کہ ان پڑھ اور علم و دانش سے بے بہرہ افراد کو تعلیم دیتا اور تعلیم ہی کے ذریعے انہیں تبدیل کرتا اور اس دین کے نفوذ کے لیے ایسا حقیقی بیج بوتا کہ دنیا کے تمام علاقے اس کے زیرِ سایہ آجاتے۔

البتہ قرآن ایسی زبان کا حامل ہونے کے باوجود ساری دنیا کے لوگوں کے لیے قابلِ فہم نہیں ہے (اور اگر کسی اور زبان میں ہوتا تو پھر بھی یہی کچھ ہوتا) کیونکہ ہمارے پاس کوئی ایسی عالمی زبان نہیں ہے کہ جسے ساری دنیا کے لوگ سمجھتے ہوں لیکن یہ بات ساری دنیا کے باقی لوگوں کے لیے اس کے تراجم کے ذریعے اس سے فائدہ اٹھانے میں رکاوٹ نہیں ہے یا اس سے بالاتر یہ بات اس میں بھی رکاوٹ نہیں کہ لوگ اس زبان سے تدریجی طور پر آشنا ہو کر خود آیات کو سمجھ سکیں اور مفاہیم وحی کا اسی کے الفاظ میں ادراک کر سکیں۔

بہرحال قرآن کے عربی ہونے کا ذکر کہ جو قرآن میں دس مواقع پر آیا ہے ان لوگوں کا جواب ہے جنہوں نے

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تہمت لگائی کہ انہوں نے یہ آیات ایک عجمی شخص سے یاد کی ہیں اور قرآن کے مضامین ایک فکر کا نتیجہ ہیں نہ کہ سرچشمۂ وحی سے پھوٹے ہیں۔

ضمنی طور پر پے درپے یہ تعبیرات تمام مسلمانوں کے لیے اس ذمہ داری کا تعین کرتی ہیں کہ وہ سب کوشش کریں اور عربی زبان کو اپنی دوسری زبان کے طور پر سیکھیں اس لیے کہ یہ وحی کی زبان ہے اور حقائق اسلام سمجھنے کی کلید ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ہم وحی کے ذریعے اور یہ قرآن بھیج کر تم سے ایک بہترین قصہ بیان کر رہے ہیں اگرچہ اس سے پہلے تو غافلین میں سے تھا (نحن نقص علیك احسن القصص بما اوحينا اليك هٰذا القراٰن وان كنت من قبله لمن الغافلين)۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ "احسن القصص" پورے قرآن کی طرف اشارہ ہے اور وہ "بما اوحينا اليك هٰذا القراٰن" کو اس کے لیے قرینہ قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لفظ "قصہ" یہاں صرف داستان اور واقعہ کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اصل لغت کے لحاظ سے کسی چیز کے آثار کی جستجو کرنے کے معنی میں ہے اور جو چیز ایک دوسرے کے پیچھے ہو عرب اسے "قصہ" کہتے ہیں اور چونکہ ایک موضوع کو بیان کرتے وقت کلمات اور جملے پے درپے بیان ہوتے ہیں اس لیے اس کام کو "قصہ" کہا جاتا ہے۔

بہر حال خدا نے اس قرآن کو "احسن القصص" قرار دیا ہے کہ جس کا بیان نہایت زیبا ہے اور جس کے الفاظ انتہائی فصیح و بلیغ ہیں اور جس کے الفاظ کے معانی نہایت اعلیٰ اور عمیق ترین ہیں، جو ظاہری نظر سے بہت زیبا، انتہائی شیریں اور خوشگوار اور جو باطنی لحاظ سے بہت ہی معنی خیز ہے۔

متعدد روایات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تعبیر پورے قرآن کے لیے بھی استعمال ہوئی ہے اگرچہ یہ احادیث زیر بحث آیت کی تفسیر کے طور پر نہیں ہیں۔ (غور کیجئے گا)

مثلاً ایک حدیث علی بن ابراہیم نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کی ہے، آپؐ نے فرمایا:

واحسن القصص هٰذا القراٰن

بہترین قصہ یہ قرآن ہے [1]

کتاب روضۃ الکافی میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے ایک خطبے میں ہے:

ان احسن القصص وابلغ الموعظة وانفع التذكر كتاب الله عز ذكره

بہترین قصہ بلیغ ترین وعظ و نصیحت اور مفید ترین تذکر اور یاد دہانی کتاب خدا ہے [2]

لیکن اس کے بعد کی آیات کہ جن میں حضرت یوسف کی سرگزشت بیان کی گئی ہے کا تعلق زیر بحث

---

[1] نور الثقلین ج ۲ ص ۴۰۹

[2] نور الثقلین ج ۲ ص ۴۰۹

آیت سے ایسا ہے کہ ذہن انسانی زیادہ تر اسی معنی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور خدا نے حضرت یوسفؑ کے واقعے کو "احسن القصص" کا نام دیا ہے یہاں تک کہ شاید اس سورہ کی ابتدائی آیات کا مطالعہ کرتے وقت بہت سے لوگوں کے ذہن میں اس معنی کے علاوہ کوئی دوسرا مفہوم نہیں آئے گا۔

مگر ہم نے بارہا کہا ہے کہ کوئی مانع نہیں کہ ایسی آیات دونوں معانی بیان کرنے کے لیے ہوں۔ قرآن بھی بطور عموم "احسن القصص" ہے اور حضرت یوسف کی داستان بھی بطور خصوص "احسن القصص" ہے۔

یہ واقعہ کیسے بہترین نہ ہو جبکہ اس کے ہیجان انگیز پیچ و خم میں زندگی کے اعلیٰ ترین دروس کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

اس واقعے میں ہر چیز پر خدا کے ارادے کی حاکمیت کا ہم اچھی طرح مشاہدہ کرتے ہیں۔

حسد کرنے والوں کا منحوس انجام ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور ان کی سازشوں کو نقش بر آب ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

بے عفتی کی عار و ننگ اور پارسائی و تقویٰ کی عظمت و شکوہ اس کی سطور میں ہم مجسم پاتے ہیں۔

کنویں کی گہرائی میں ایک ننھے بچے کی تنہائی، زندان کی تاریک کوٹھری میں ایک بے گناہ قیدی کے شب و روز، یاس و ناامیدی کے سیاہ پردوں کے پیچھے نور امید کی تجلی اور آخرکار ایک وسیع حکومت کی عظمت و شکوہ کہ جو آگاہی و امانت کا نتیجہ ہے ۔ یہ تمام چیزیں اس داستان میں انسان کی آنکھوں کے سامنے ساتھ ساتھ گزرتی ہیں۔

وہ لمحے کہ جب ایک معنی خیز خواب سے ایک قوم کی سرنوشت بدل جاتی ہے۔

وہ وقت کہ جب ایک قوم کی زندگی ایک بیدار خدائی زمام دار کے علم و آگہی کے زیر سایہ نابودی سے نجات پا لیتی ہے۔

اور ایسے ہی دیسیوں درس ۔ جس داستان میں موجود ہوں وہ کیوں نہ "احسن القصص" ہو۔

البتہ یہی کافی نہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان "احسن القصص" ہے اہم بات یہ ہے کہ ہم میں یہ لیاقت ہو کہ یہ عظیم درس ہماری روح میں اتر جائے۔

بہت سے ایسے لوگ ہیں جو حضرت یوسف کے واقعے کو ایک اچھے رومانوی واقعے کے عنوان سے دیکھتے ہیں، ان جانوروں کی طرح جنہیں ایک سرسبز و شاداب اور پھل پھول سے لدے ہوئے باغ میں صرف کچھ گھاس نظر پڑتی ہے کہ جو اُن کی بھوک کو زائل کر دے۔

ابھی تک بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ جو اس داستان کو جھوٹے پر و بال دے کر کوشش کرتے ہیں کہ اس سے ایک سیکسی (SEX) داستان بنالیں جبکہ اس واقعہ کے لیے یہ بات ناشائستہ ہے اور اصل داستان میں تمام اعلیٰ انسانی قدریں جمع ہیں۔ آئندہ صفحات میں ہم دیکھیں گے کہ اس واقعے کے جامع اور خوبصورت پیچ و خم کو

استدلال حسی، عینی اور تجرباتی مسائل کا ماحصل ہیں۔

۴۔ داستان اور تاریخ ہر شخص کے لیے قابلِ فہم ہے جبکہ اس کے برعکس عقلی استدلالات کی رسائی میں سب لوگ برابر کے شریک نہیں ہیں۔

اسی لیے وہ کتاب کہ جو عمومیت رکھتی ہے اور سب کے لیے ہے، نیم وحشی، اَن پڑھ عرب کے بیابانی بدو سے لے کر عظیم مفکر اور فلسفی تک کے استفادہ کے لیے ہے اسے حتمی طور پر تاریخ، داستانوں اور مثالوں کا سہارا لینا چاہیئے۔

ان تمام پہلوؤں کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ تمام تاریخیں اور داستانیں بیان کرکے قرآن نے تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بہترین راستہ اپنایا ہے۔

خصوصاً اس نکتے کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن نے کسی موقع پر بھی خالی تاریخی واقعات ہی بیان نہیں کر دیئے بلکہ ہر قدم پر اس سے نتائج اخذ کیے ہیں اور اس سے تربیتی حوالے سے استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ آپ اسی سورت میں اس کے کئی نمونے دیکھیں گے۔

(۴) اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰاَبَتِ اِنِّىْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِىْ سٰجِدِيْنَ ○

(۵) قَالَ يٰبُنَىَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○

(۶) وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○

ترجمہ

(۴) وہ وقت (یاد کرو) جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا: ابا جان! میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے، سورج اور چاند میرے سامنے سجدہ کر رہے ہیں۔

(۵) اس نے کہا: اے میرے بیٹے! اپنا خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا ورنہ وہ تیرے لیے خطرناک سازش کریں گے کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

(۶) اور اس طرح تیرا پروردگار تجھے منتخب کرے گا، تجھے خوابوں کی تعبیر کا علم دے گا اور اپنی نعمت تجھ پر اور آلِ یعقوب پر تمام کرے گا جیسے اس سے پہلے تیرے باپ ابراہیم اور اسحاق پر تمام کی ہے، تیرا پروردگار عالم اور حکیم ہے۔

تفسیر

اُمید کی کرن اور مشکلات کی ابتداء

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے کا آغاز قرآن ان کے عجیب اور معنی خیز خواب سے کرتا ہے کیونکہ یہ خواب دراصل حضرت یوسفؑ کی تلاطم خیز زندگی کا پہلا موڑ شمار ہوتا ہے۔

ایک دن صبح سویرے آپ بڑے شوق اور وارفتگی سے باپ کے پاس آئے اور انہیں ایک نیا واقعہ سنایا جو ظاہراً کوئی زیادہ اہم نہ تھا لیکن درحقیقت ان کی زندگی میں ایک تازہ باب کھلنے کا پتہ دے رہا تھا۔

یوسفؑ نے کہا: اباجان! میں نے کل رات گیارہ ستاروں کو دیکھا کہ وہ آسمان سے نیچے اترے سورج اور چاند ان کے ہمراہ تھے، سب کے سب میرے پاس آئے اور میرے سامنے سجدہ کیا (اذ قال یوسف لابیہ یاابت انی رأیت احد عشر کوکبا والشمس والقمر رأیتھم لی ساجدین)۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ نے یہ خواب شب جمعہ دیکھا تھا کہ جو شب قدر بھی تھی (وہ رات جو مقدرات کے تعین کی رات ہے)۔

یہ کہ حضرت یوسفؑ نے جب یہ خواب دیکھا اس وقت آپ کی عمر کتنے سال تھی، اس سلسلے میں بعض نے نو سال، بعض نے بارہ سال اور بعض نے سات سال عمر لکھی ہے۔ جو بات مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت آپ بہت کم سن تھے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ لفظ رأیت کا اس آیت میں تاکید اور قاطعیت کے ساتھ تکرار ہوا ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ میں ان بیشتر افراد کی طرح نہیں ہوں کہ جو خواب کا کچھ حصہ بھول جاتے ہیں اور اس کے بارے میں تردد و شک سے بات کرتے ہیں۔ میں نے پورے یقین سے دیکھا ہے کہ گیارہ ستاروں، سورج اور چاند نے میرے سامنے سجدہ کیا ہے۔ اور اس امر میں مجھے کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہاں ضمیر "ھم" استعمال ہوئی ہے کہ جو ذوی العقول کے لیے بولی جانے والی جمع مذکر کی ضمیر ہے۔ اسی طرح لفظ "ساجدین" بھی آیا ہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا سجدہ کرنا کوئی اتفاقی امر نہ تھا بلکہ ایک واضح پروگرام کے ماتحت وہ عاقل افراد کی طرح سجدہ کر رہے تھے۔

البتہ واضح ہے کہ سجدہ سے یہاں مراد خضوع اور احترام ہے ورنہ سورج، چاند اور ستاروں کے لیے سجدے کا مفہوم عام انسانوں کے سجدے کا سا نہیں ہے۔

اس ہیجان انگیز اور معنی خیز خواب پر خدا کے پیغمبر یعقوبؑ فکر میں ڈوب گئے کہ سورج، چاند اور آسمان کے

آیت سے ایسا ہے کہ ذہن انسانی زیادہ تر اسی معنیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور خدا نے حضرت یوسفؑ کے واقعے کو "احسن القصص" کا نام دیا ہے یہاں تک کہ شاید اس سورہ کی ابتدائی آیات کا مطالعہ کرتے وقت بہت سے لوگوں کے ذہن میں اس معنیٰ کے علاوہ کوئی دوسرا مفہوم نہیں آئے گا۔

مگر ہم نے بارہا کہا ہے کہ کوئی مانع نہیں کہ ایسی آیات دونوں معانی بیان کرنے کے لیے ہوں، قرآن بھی بطور عموم "احسن القصص" ہے اور حضرت یوسفؑ کی داستان بھی بطور خصوص "احسن القصص" ہے۔

یہ واقعہ کیسے بہترین نہ ہو جبکہ اس کے ہیجان انگیز پیچ و خم میں زندگی کے اعلیٰ ترین دروس کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

اس واقعے میں ہر چیز پر خدا کے ارادے کی حاکمیت کا ہم اچھی طرح مشاہدہ کرتے ہیں۔

حسد کرنے والوں کا منحوس انجام ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور ان کی سازشوں کو نقش بر آب ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

بے عفتی کی عار و ننگ اور پارسائی و تقویٰ کی عظمت و شکوہ اس کی سطور میں ہم مجسم پاتے ہیں۔

کنویں کی گہرائی میں ایک ننھے بچے کی تنہائی، زندان کی تاریک کوٹھڑی میں ایک بے گناہ قیدی کے شب و روز، یاس و ناامیدی کے سیاہ پردوں کے پیچھے نور امید کی تجلی اور آخرکار ایک وسیع حکومت کی عظمت و شکوہ کہ جو آگاہی و امانت کا نتیجہ ہے۔ یہ تمام چیزیں اس داستان میں انسان کی آنکھوں کے سامنے ساتھ ساتھ گزرتی ہیں۔

وہ لمحے کہ جب ایک معنیٰ خیز خواب سے ایک قوم کی سرنوشت بدل جاتی ہے۔

وہ وقت کہ جب ایک قوم کی زندگی ایک بیدار خدائی زمام دار کے علم و آگہی کے زیر سایہ نابودی سے نجات پالیتی ہے۔

اور ایسے ہی دسیوں درس ۔ جس داستان میں موجود ہوں وہ کیوں نہ "احسن القصص" ہو۔

البتہ یہی کافی نہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان "احسن القصص" ہے اہم بات یہ ہے کہ ہم میں یہ لیاقت ہو کہ یہ عظیم درس ہماری روح میں اتر جائے۔

بہت سے ایسے لوگ ہیں جو حضرت یوسفؑ کے واقعے کو ایک اچھے رومانوی واقعے کے عنوان سے دیکھتے ہیں، ان جانوروں کی طرح جنہیں ایک سرسبز و شاداب اور پھل پھول سے لدے ہوئے باغ میں صرف کچھ گھاس نظر پڑتی ہے کہ جو ان کی بھوک کو زائل کر دے۔

ابھی تک بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ جو اس داستان کو جھوٹے پر و بال دے کر کوشش کرتے ہیں کہ اس سے ایک سیکسی (SEXI) داستان بنالیں جبکہ اس واقعہ کے لیے یہ بات ناشائستہ ہے اور اصل داستان میں تمام اعلیٰ انسانی قدریں جمع ہیں۔ آئندہ صفحات میں ہم دیکھیں گے کہ اس واقعے کے جامع اور خوبصورت پیچ و خم کو

استدلال حسی، عینی اور تجرباتی مسائل کا ماحصل ہیں۔

۲۔ داستان اور تاریخ ہر شخص کے لیے قابلِ فہم ہے جبکہ اس کے برعکس عقلی استدلالات کی رسائی میں سب لوگ برابر کے شریک نہیں ہیں۔

اسی لیے وہ کتاب کہ جو عمومیت رکھتی ہے اور سب کے لیے ہے، نیم وحشی، اَن پڑھ عرب کے بیابانی بدو سے لے کر عظیم مفکر اور فلسفی تک کے استفادہ کے لیے ہے اسے حتمی طور پر تاریخ، داستانوں اور مثالوں کا سہارا لینا چاہیئے۔

ان تمام پہلوؤں کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ تمام تاریخیں اور داستانیں بیان کرکے قرآن نے تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بہترین راستہ اپنایا ہے۔

خصوصاً اس نکتے کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن نے کسی موقع پر بھی خالی تاریخی واقعات ہی بیان نہیں کر دیئے بلکہ ہر قدم پر اس سے نتائج اخذ کیے ہیں اور اس سے تربیتی حوالے سے استفادہ کیا ہے، چنانچہ آپ اسی سورت میں اس کے کئی نمونے دیکھیں گے۔

(۴) إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ○

(۵) قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا ۖ إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُبِينٌ ○

(۶) وَكَذَٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَمَّهَا عَلَىٰ أَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ○

ترجمہ

(۴) وہ وقت (یاد کرو) جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا : ابا جان! میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے، سورج اور چاند میرے سامنے سجدہ کر رہے ہیں۔

(۵) اس نے کہا : اے میرے بیٹے! اپنا خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا ورنہ وہ تیرے لیے خطرناک سازش کریں گے کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

(۶) اور اس طرح تیرا پروردگار تجھے منتخب کرے گا، تجھے خوابوں کی تعبیر کا علم دے گا اور اپنی نعمت تجھ پر اور آلِ یعقوب پر تمام کرے گا جیسے اس سے پہلے تیرے باپ ابراہیم اور اسحاق پر تمام کی ہے، تیرا پروردگار عالم اور حکیم ہے۔

تفسیر

اُمید کی کرن اور مشکلات کی ابتداء

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے کا آغاز قرآن ان کے عجیب اور معنی خیز خواب سے کرتا ہے کیونکہ یہ خواب دراصل حضرت یوسفؑ کی تلاطم خیز زندگی کا پہلا موڑ شمار ہوتا ہے۔

ایک دن صبح سویرے آپ بڑے شوق اور وارفتگی سے باپ کے پاس آئے اور انہیں ایک نیا واقعہ سنایا جو ظاہراً کوئی زیادہ اہم نہ تھا لیکن درحقیقت ان کی زندگی میں ایک تازہ باب کھلنے کا پتہ دے رہا تھا۔

یوسفؑ نے کہا: ابا جان! میں نے کل رات گیارہ ستاروں کو دیکھا کہ وہ آسمان سے نیچے اترے سورج اور چاند ان کے ہمراہ تھے، سب کے سب میرے پاس آئے اور میرے سامنے سجدہ کیا (اذ قال یوسف لابیہ یاابت انی رأیت احد عشر کوکبا والشمس والقمر رأیتھم لی ساجدین)۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ نے یہ خواب شب جمعہ دیکھا تھا کہ جو شب قدر بھی تھی (وہ رات جو مقدرات کے تعین کی رات ہے)۔

یہ کہ حضرت یوسفؑ نے جب یہ خواب دیکھا اس وقت آپ کی عمر کتنے سال تھی، اس سلسلے میں بعض نے نو سال، بعض نے بارہ سال اور بعض نے سات سال عمر لکھی ہے۔ جو بات مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت آپ بہت کم سن تھے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ لفظ رأیت کا اس آیت میں تاکید اور قاطعیت کے ساتھ تکرار ہوا ہے، یہ اس طرف اشارہ ہے کہ میں ان بیشتر افراد کی طرح نہیں ہوں کہ جو خواب کا کچھ حصہ بھول جاتے ہیں اور اس کے بارے میں تردد و شک سے بات کرتے ہیں، میں نے پورے یقین سے دیکھا ہے کہ گیارہ ستاروں، سورج اور چاند نے میرے سامنے سجدہ کیا ہے۔ اور اس امر میں مجھے کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہاں ضمیر "ھم" استعمال ہوئی ہے کہ جو ذوی العقول کے لیے بولی جانے والی جمع مذکر کی ضمیر ہے۔ اسی طرح لفظ "ساجدین" بھی آیا ہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا سجدہ کرنا کوئی اتفاقی امر نہ تھا بلکہ ایک واضح پروگرام کے ماتحت وہ عاقل افراد کی طرح سجدہ کر رہے تھے۔

البتہ واضح ہے کہ سجدہ سے یہاں مراد خضوع اور احترام ہے ورنہ سورج، چاند اور ستاروں کے لیے سجدے کا مفہوم عام انسانوں کے سجدے کا سا نہیں ہے۔

اس ہیجان انگیز اور معنی خیز خواب پر خدا کے پیغمبر یعقوبؑ فکر میں ڈوب گئے کہ سورج، چاند اور آسمان کے

آیت سے ایسا ہے کہ ذہن انسانی زیادہ تر اسی معنی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور خدا نے حضرت یوسفؑ کے واقعے کو "احسن القصص" کا نام دیا ہے یہاں تک کہ شاید اس سورہ کی ابتدائی آیات کا مطالعہ کرتے وقت بہت سے لوگوں کے ذہن میں اس معنی کے علاوہ کوئی دوسرا مفہوم نہیں آئے گا۔

مگر ہم نے بارہا کہا ہے کہ کوئی مانع نہیں کہ ایسی آیات دونوں معانی بیان کرنے کے لیے ہوں۔ قرآن بھی بطور عموم "احسن القصص" ہے اور حضرت یوسفؑ کی داستان بھی بطور خصوص "احسن القصص" ہے۔

یہ واقعہ کیسے بہترین نہ ہو جبکہ اس کے ہیجان انگیز پیچ و خم میں زندگی کے اعلیٰ ترین دروس کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

اس واقعے میں ہر چیز پر خدا کے ارادے کی حاکمیت کا ہم اچھی طرح مشاہدہ کرتے ہیں۔

حسد کرنے والوں کا منحوس انجام ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور ان کی سازشوں کو نقش بر آب ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

بے عفتی کی عار و ننگ اور پارسائی و تقویٰ کی عظمت و شکوہ اس کی سطور میں ہم مجسم پاتے ہیں۔

کنویں کی گہرائی میں ایک ننھے بچے کی تنہائی، زندان کی تاریک کوٹھڑی میں ایک بے گناہ قیدی کے شب و روز، یاس و ناامیدی کے سیاہ پردوں کے پیچھے نورِ امید کی تجلی اور آخر کار ایک وسیع حکومت کی عظمت و شکوہ کہ جو آگاہی و امانت کا نتیجہ ہے — یہ تمام چیزیں اس داستان میں انسان کی آنکھوں کے سامنے ساتھ ساتھ گزرتی ہیں۔

وہ لمحے کہ جب ایک معنی خیز خواب سے ایک قوم کی سرنوشت بدل جاتی ہے۔

وہ وقت کہ جب ایک قوم کی زندگی ایک بیدار خدائی زمام دار کے علم و آگہی کے زیر سایہ نابودی سے نجات پالیتی ہے۔

اور ایسے ہی دسیوں درس — جس داستان میں موجود ہوں وہ کیوں نہ "احسن القصص" ہو۔

البتہ یہی کافی نہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان "احسن القصص" ہے اہم بات یہ ہے کہ ہم میں یہ لیاقت ہو کہ یہ عظیم درس ہماری روح میں اتر جائے۔

بہت سے ایسے لوگ ہیں جو حضرت یوسفؑ کے واقعے کو ایک اچھے رومانوی واقعے کے عنوان سے دیکھتے ہیں، ان جانوروں کی طرح جنہیں ایک سرسبز و شاداب اور پھل پھول سے لدے ہوئے باغ میں صرف کچھ گھاس نظر پڑتی ہے کہ جو اُن کی بھوک کو زائل کر دے۔

ابھی تک بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ جو اس داستان کو جھوٹے پر و بال دے کر کوشش کرتے ہیں کہ اس سے ایک سیکسی (SEXY) داستان بنالیں جبکہ اس واقعہ کے لیے یہ بات ناشائستہ ہے اور اصل داستان میں تمام اعلیٰ انسانی قدریں جمع ہیں۔ آئندہ صفحات میں ہم دیکھیں گے کہ اس واقعے کے جامع اور خوبصورت پیچ و خم کو

نظر انداز کر کے نہیں گزرا جا سکتا۔ ایک شاعر شیریں سخن کے بقول:

کبھی کبھی اس داستان کے پُرکشش پہلوؤں کی مہک انسان کو اس طرح سرمست کر دیتی ہے کہ وہ بے خود ہو جاتا ہے۔

انسان کی زندگی پر اس داستان کا اثر

قرآن کا بہت سا حصّہ گزشتہ قوموں کی سرگزشت اور گزرے ہوئے لوگوں کے واقعاتِ زندگی کی صورت میں ہے۔ اس پہلو پر نظر کرنے سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ایک تربیت کنندہ اور انسان ساز کتاب میں یہ سب تاریخ اور داستانیں کیوں ہیں۔

لیکن ذیل کے چند نکات کی طرف توجہ کرنے سے یہ مسئلہ واضح ہو جاتا ہے:

۱۔ تاریخ انسانی زندگی کے مختلف مسائل کی تجربہ گاہ ہے اور جو چیزیں انسان عقلی دلائل سے اپنے ذہن میں منعکس کرتا ہے انہیں تاریخ کے صفحات میں عینی صورت میں کھلا ہوا پاتا ہے اور اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ معلومات میں سے زیادہ قابلِ اعتماد وہ ہیں جو حسی پہلو رکھتی ہیں۔ واقعاتِ زندگی میں تاریخ کا اثر واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ انسان اپنی آنکھوں سے صفحاتِ تاریخ میں اختلاف و انتشار کی وجہ سے کسی قوم کی مرگ بار شکست دیکھتا ہے اور اسی طرح اتحاد و ہم بستگی کے باعث کسی دوسری قوم کی درخشاں کامیابی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ تاریخ اپنی زبانِ بے زبانی سے ہر قوم کے مکتب، روش اور طرزِ عمل کے قطعی اور ناقابلِ انکار نتائج بیان کرتی ہے۔

گزشتہ لوگوں کے حالات ان کے نہایت قیمتی تجربات کا مجموعہ ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ زندگی کا ماحصل تجربے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

تاریخ ایک آئینہ ہے جو اپنے اندر تمام انسانی معاشروں کا ڈھانچہ منعکس کرتا ہے۔ یہ آئینہ ان کی برائیاں، اچھائیاں، کامیابیاں، ناکامیاں، فتوحات، شکستیں اور ان سب امور کے عوامل و اسباب دکھا دیتا ہے۔ اسی بناء پر گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ انسان کی عمر کو بالکل ان کی تمام عمر جتنا طویل کر دیتا ہے کیونکہ اس طرح وہ ان کی پوری عمر کے تجربات سمیٹ لیتا ہے۔ اسی بناء پر حضرت علیؑ اپنے آبرومند فرزند کے نام اپنے تاریخی وصیت نامہ میں فرماتے ہیں:

ای بنی انی و ان لم اکن عمرت عمر من کان قبلی فقد نظرت فی اعمالھم و فکرت فی اخبارھم و سرت فی اثارھم حتی عدت کاحدھم بل کانی بما انتھی الی من امورھم قد عمرت من اولھم الی اٰخرھم۔

اے میرے بیٹے! اگر گزشتہ لوگوں کی عمر یکجا مجھے حاصل نہیں تاہم میں نے ان کے اعمال دیکھے ہیں، ان کے واقعات میں غور و فکر کیا ہے اور ان کے آثار کی سیر و سیاحت کی ہے اس

طرح سے گویا میں ان میں سے ایک ہوگیا ہوں بلکہ اسی بنا پر کہ میں نے ان کی تاریخ کے تجربات معلوم کیے ہیں تو گویا میں نے ان کے اوّلین و آخرین کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔[1]

البتہ۔ یہاں تاریخ سے مراد وہ تاریخ ہے جو خرافات، اتہامات، دروغ گوئیوں، چاپلوسیوں، ثنا خوانیوں، تحریفوں اور مسخ شدہ واقعات سے خالی ہو لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے؛

کہ ایسی تاریخیں بہت کم ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن نے حقیقی تاریخ کے جو نمونے پیش کیے ہیں اس کے اثر کو نظر سے اوجھل نہیں رہنا چاہیئے۔

ایسی تاریخ کی ضرورت ہے کہ جو آئینے کی طرح صاف ہو نہ کہ کثر نما ہو۔ ایسی تاریخ کہ جو صرف واقعات ذکر نہ کرے بلکہ اس کی بنیاد اور نتائج بھی تلاش کرے۔

ان حالات میں قرآن کہ جو تربیت کی ایک اعلیٰ کتاب ہے تاریخ سے استفادہ کیوں نہ کرے اور گزشتہ لوگوں کے واقعات سے مثالیں اور شواہد کیوں پیش نہ کرے۔

۲۔ علاوہ ازیں تاریخ ایک خاص قوت جاذبہ رکھتی ہے اور انسان بچپن سے لے کر بڑھاپے تک اپنی عمر کے تمام ادوار میں اس زبردست قوت جاذبہ کے زیر اثر رہتا ہے۔ اسی بنا پر دنیا کی ادبیات کا ایک اہم حصہ اور انشاپردازوں کے عظیم آثار تاریخ اور واقعات پر مشتمل ہیں۔

شعراء اور عظیم مصنفین کے بہترین آثار چاہے وہ فارسی میں ہوں یا دوسری زبانوں میں یہی داستانیں اور واقعات ہیں۔ گلستانِ سعدی، شاہنامہ فردوسی، خمسہ نظامی اور معاصر مصنفین کے دلکش آثار، اسی طرح ایجان آفرین فرانسیسی مصنف وکٹر ہوگو، برطانیہ کے شکسپیئر اور جرمنی کے گوئٹے سب کی تصانیف داستان کی صورت میں ہیں۔

داستان اور واقعہ چاہے نظم کی صورت میں ہو یا نثر کی، نمائش کے انداز میں ہو یا فلم کے پڑھنے والے اور دیکھنے والے پر اثر انداز ہوتا ہے اور ایسی تاثیر عقلی استدلالات کے بس کی بات نہیں ہے۔

اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ انسان عقلی سے پہلے حسی ہے اور وہ جس قدر فکری مسائل میں غور و فکر کرتا ہے اس سے زیادہ حسی مسائل میں غوطہ زن ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف مسائل جس قدر میدان حس سے دُور ہوتے ہیں اور خالص عقلی حوالے سے ہوتے ہیں اسی قدر ثقیل اور سنگین ہوتے ہیں اور اتنی ہی دیر سے ہضم ہوتے ہیں۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیشہ عقلی استدلالات کو مضبوط بنانے کے لیے حسی مثالوں سے مدد لی جاتی ہے۔ بعض اوقات ایک مناسب اور برمحل مثال استدلال کا اثر کئی گنا زیادہ کر دیتی ہے۔ اسی لیے کامیاب علماء وہ ہیں جو بہترین مثالیں انتخاب کرنے پر زیادہ دسترس رکھتے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ عقلی

---

[1] نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱، بنام امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام۔

استدلال حسی، عینی اور تجرباتی مسائل کا ماحصل ہیں۔

۳۔ داستان اور تاریخ ہر شخص کے لیے قابلِ فہم ہے جبکہ اس کے برعکس عقلی استدلالات کی رسائی میں سب لوگ برابر کے شریک نہیں ہیں۔

اسی لیے وہ کتاب کہ جو عمومیت رکھتی ہے اور سب کے لیے ہے، نیم وحشی، اَن پڑھ عرب کے بیابانی بدو سے لے کر عظیم مفکر اور فلسفی تک کے استفادہ کے لیے ہے اسے حتمی طور پر تاریخ، داستانوں اور مثالوں کا سہارا لینا چاہیے۔

ان تمام پہلوؤں کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ تمام تاریخیں اور داستانیں بیان کر کے قرآن نے تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بہترین راستہ اپنایا ہے۔

خصوصاً اس نکتے کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن نے کسی موقع پر بھی خالی تاریخی واقعات ہی بیان نہیں کر دیئے بلکہ ہر قدم پر اس سے نتائج اخذ کیے ہیں اور اس سے تربیتی حوالے سے استفادہ کیا ہے، چنانچہ آپ اسی سورت میں اس کے کئی نمونے دیکھیں گے۔

(۴) اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّیْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِيْنَ ○

(۵) قَالَ يٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○

(۶) وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○

ترجمہ

(۴) وہ وقت (یاد کرو) جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا : ابا جان! مَیں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے، سورج اور چاند میرے سامنے سجدہ کر رہے ہیں۔

(۵) اس نے کہا : اے میرے بیٹے! اپنا خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا ورنہ وہ تیرے لیے خطرناک سازش کریں گے کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

(۶) اور اس طرح تیرا پروردگار تجھے منتخب کرے گا، تجھے خوابوں کی تعبیر کا علم دے گا اور اپنی نعمت تجھ پر اور آلِ یعقوب پر تمام کرے گا جیسے اس سے پہلے تیرے باپ ابراہیم اور اسحاق پر تمام کی ہے، تیرا پروردگار عالم اور حکیم ہے۔

تفسیر

اُمید کی کرن اور مشکلات کی ابتداء

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے کا آغاز قرآن ان کے عجیب اور معنی خیز خواب سے کرتا ہے کیونکہ یہ خواب دراصل حضرت یوسفؑ کی تلاطم خیز زندگی کا پہلا موڑ شمار ہوتا ہے۔

ایک دن صبح سویرے آپ بڑے شوق اور وارفتگی سے باپ کے پاس آئے اور انہیں ایک نیا واقعہ سنایا جو ظاہراً کوئی زیادہ اہم نہ تھا لیکن درحقیقت ان کی زندگی میں ایک تازہ باب کھلنے کا پتہ دے رہا تھا۔

یوسفؑ نے کہا: ابا جان! میں نے کل رات گیارہ ستاروں کو دیکھا کہ وہ آسمان سے نیچے اترے سورج اور چاند ان کے ہمراہ تھے، سب کے سب میرے پاس آئے اور میرے سامنے سجدہ کیا (اذ قال یوسف لابیہ یاابت انی رأیت احد عشر کوکبا والشمس والقمر رأیتھم لی ساجدین)۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ نے یہ خواب شب جمعہ دیکھا تھا کہ جو شب قدر بھی تھی (وہ رات جو مقدرات کے تعین کی رات ہے)۔

یہ کہ حضرت یوسفؑ نے جب یہ خواب دیکھا اس وقت آپ کی عمر کتنے سال تھی، اس سلسلے میں بعض نے نو سال، بعض نے بارہ سال اور بعض نے سات سال عمر لکھی ہے۔ جو بات مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت آپ بہت کم سن تھے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ لفظ رأیت کا اس آیت میں تاکید اور قاطعیت کے ساتھ تکرار ہوا ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ میں ان بیشتر افراد کی طرح نہیں ہوں کہ جو خواب کا کچھ حصہ بھول جاتے ہیں اور اس کے بارے میں تردد و شک سے بات کرتے ہیں۔ میں نے پورے یقین سے دیکھا ہے کہ گیارہ ستاروں، سورج اور چاند نے میرے سامنے سجدہ کیا ہے اور اس امر میں مجھے کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہاں ضمیر۔ ھم۔ استعمال ہوئی ہے کہ جو ذوی العقول کے لیے بولی جانے والی جمع مذکر کی ضمیر ہے۔ اسی طرح لفظ۔ ساجدین۔ بھی آیا ہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا سجدہ کرنا کوئی اتفاقی امر نہ تھا بلکہ ایک واضح پروگرام کے ماتحت وہ عاقل افراد کی طرح سجدہ کر رہے تھے۔

البتہ واضح ہے کہ سجدہ سے یہاں مراد خضوع اور احترام ہے ورنہ سورج، چاند اور ستاروں کے لیے سجدے کا مفہوم عام انسانوں کے سجدے کا سا نہیں ہے۔

اس ہیجان انگیز اور معنی خیز خواب پر خدا کے پیغمبر یعقوبؑ فکر میں ڈوب گئے کہ سورج، چاند اور آسمان کے

گیارہ ستارے، وہ بھی گیارہ ستارے نیچے اُترے اور میرے بیٹے یوسف کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے، یہ کس قدر معنی آفریں ہے۔ یقیناً سورج اور چاند میں اور اس کی ماں (یا میں اور اس کی خالہ) ہیں اور گیارہ ستارے اس کے بھائی ہیں۔ میرے بیٹے کی قدر و منزلت اور مقام اس قدر بلند ہو گا کہ آسمان کے ستارے، سورج اور چاند اس کے آستانہ پر جبہ سائی کریں گے۔ یہ بارگاہِ الٰہی میں اس قدر عزیز اور باوقار ہو گا کہ آسمان والے بھی اس کے سامنے خضوع کریں گے۔ کتنا پُرشکوہ اور پُرکشش خواب ہے:

لہٰذا پریشانی اور اضطراب کے انداز میں کہ جس میں ایک مسرت بھی تھی، اپنے بیٹے سے کہنے لگے، میرے بیٹے! اپنا یہ خواب بھائیوں کو نہ بتانا (قال یابنی لا تقصص رءیاک علی اخوتک) کیونکہ وہ تیرے خلاف خطرناک سازش کریں گے (فیکیدوا لک کیدا)۔

میں جانتا ہوں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے (ان الشیطان للانسان عدو مبین)۔ وہ موقع کی تاڑ میں ہے تاکہ اپنے وسوسوں کا آغاز کرے، کینہ و حسد کی آگ بھڑکائے۔ یہاں تک کہ بھائیوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ حضرت یعقوب نے یہ نہیں کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ بھائی تیرے بارے میں بُرا ارادہ کریں گے بلکہ اسے ایک قطعی امر کی شکل میں خصوصاً لفظ "کیدا" کی تکرار کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جو تاکید کی دلیل ہے کیونکہ آپ اپنے سب بیٹوں کی نفسیات سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ وہ یوسف کے بارے میں کتنے حساس ہیں۔ شاید یوسف کے بھائی بھی خواب کی تعبیر کے بارے میں ناواقف نہ تھے۔ علاوہ ازیں یہ خواب ایسا تھا کہ جس کی تعبیر زیادہ پیچیدہ نہ تھی۔

دوسری طرف یہ خواب بچگانہ خیالات کی طرح نہ تھا۔ ہو سکتا ہے کوئی بچہ خواب میں چاند اور ستارے دیکھے لیکن باشعور ہو جاتا ہے کی طرح چاند ستارے اس کے آگے سجدہ کریں، یہ کوئی بچگانہ خواب نہیں ہے۔ اسی وجہ کی بنیاد پر حضرت یعقوب بجا طور پر یوسف کے بارے میں بھائیوں کی طرف سے حسد کی آگ بھڑک اٹھنے کے بارے میں فکر مند تھے۔

لیکن یہ خواب صرف مستقبل میں یوسف کے مقام کی ظاہری و مادی عظمت بیان نہیں کرتا تھا بلکہ نشاندہی کرتا تھا کہ وہ مقامِ نبوت تک بھی پہنچیں گے کیونکہ آسمان والوں کا سجدہ کرنا آسمانی مقام کے بلندی پر پہنچنے کی دلیل ہے اسی لیے قرآن کے بعد جزو کلام حضرت یعقوب نے مزید کہا: اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھے منتخب کرے گا (وکذلک یجتبیک ربک) اور تجھے تعبیرِ خواب کا علم دے گا (ویعلمک من تاویل الاحادیث)۔[۱]

۱۔ تاویل در اصل کسی چیز کو لوٹا دینے کے معنی میں ہے اور کسی کام یا بات کو اس کے آخری مقصد تک پہنچانا تاویل کہلاتا ہے۔ بعض خواب کو صورت پذیر ہونا بھی "تاویل" کا مصداق ہے۔

"احادیث" "حدیث" کی جمع ہے جس کا معنی ہے ایک واقعہ نقل کرنا۔ انسان چونکہ اپنا خواب دوسروں سے بیان کرتا ہے لہٰذا یہ لفظ خواب کے لیے کنایہ ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

اور اپنی نعمت تجھ پر اور آلِ یعقوب پر تمام کرے گا (و یتم نعمته علیك و علی آل یعقوب)۔
جیسے اس نے قبل ازیں تیرے باپ ابراہیم اور اسحاق پر تمام کی ہے (کما اتمها علی ابویك من قبل ابراهیم و اسحاق)۔
ان تیرا پروردگار عالم ہے اور حکمت کے مطابق کام کرتا ہے (ان ربك علیم حکیم)۔

اہم نکات

۱۔ خواب دیکھنا: رؤیا اور خواب دیکھنے کا مسئلہ ایسے مسائل میں سے رہا ہے جنہوں نے عام افراد اور اہل علم کی فکر و نظر کو کئی پہلوؤں سے اپنی طرف مبذول رکھا ہے۔
یہ اچھے اور بُرے، وحشت ناک اور دلپذیر، سرور آفریں اور غم انگیز مناظر جو انسان خواب میں دیکھتا ہے کیا ہیں؟
کیا یہ گزشتہ زمانے سے مربوط ہیں اور ان مناظر نے بیتے ہوئے زمانے میں انسانی روح کی گہرائیوں میں آشیانہ بنایا ہوا تھا یا یہ تخیلات کا مظہر ہیں یا آئندہ زمانے سے مربوط ہیں کہ جن کی فلم انسانی روح مخفی طریقے سے اپنے حساس کیمروں کے ذریعے بنالیتی ہے یا پھر یہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں کہ جن میں سے بعض کا تعلق گزشتہ سے ہے اور بعض کا آئندہ سے اور بعض ان آرزوؤں اور تمناؤں کا عکس ہیں کہ جو پوری نہیں ہو سکیں۔
متعدد آیات میں قرآن تصریح کرتا ہے کہ کم از کم کچھ خواب ایسے ہیں کہ جو مستقبل بعید یا مستقبل قریب کی عکاسی کرتے ہیں۔
حضرت یوسفؑ کا مذکورہ بالا خواب اسی طرح اس سورہ کی آیہ ۳۶ میں مذکور قیدیوں کا خواب۔ نیز عزیز مصر کے خواب کا واقعہ آیہ ۴۳ میں ہے یہ مختلف خوابوں کے نمونے ہیں کہ جو تمام تر مستقبل کے واقعات سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی نسبتاً مستقبل بعید سے متعلق ہے مثلاً حضرت یوسفؑ کا خواب کہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ چالیس سال بعد صورت پذیر ہوا اور کوئی مستقبل قریب کے بارے میں ہے مثلاً عزیز مصر کا خواب اور حضرت یوسفؑ کے ساتھی قیدیوں کا خواب کہ جو بہت جلد ہی وقوع پذیر ہو گئے۔
اس سورہ کے علاوہ بھی مختلف مقامات پر تعبیر دار خوابوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مثلاً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خواب کہ جس کی طرف سورہ فتح میں اشارہ ہوا ہے اور اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خواب کہ جو سورہ صٰفٰت میں مذکور ہے (یہ خواب امر الٰہی بھی تھا اور اس کی تعبیر بھی تھی)۔
یہ بات جاذب نظر ہے کہ ایک روایت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:
الرؤیا ثلاثة بشری من الله و تحزین من الشیطان والذی یحدث به الانسان نفسه فیراه فی منامه۔

خواب تین قسم کے ہیں :

* کبھی خدا کی طرف سے بشارت ہوتی ہے ،
* کبھی شیطان کی طرف سے حزن و غم کا سامان ہوتا ہے اور
* کبھی ایسے مسائل ہوتے ہیں جو انسانی فکر میں پلتے رہتے ہیں اور پھر وہ انہیں خواب میں دیکھتا ہے [1]

واضح ہے کہ شیطانی خواب کچھ بھی نہیں ہیں کہ ان کی کوئی تعبیر ہو۔ البتہ رحمانی خواب کہ جو بشارت کا پہلو رکھتے ہیں یقیناً ایسے ہوتے ہیں کہ جو آئندہ کے کسی مسرت بخش واقعے سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

بہرحال ضروری ہے کہ ہم یہاں حقیقت خواب کے بارے میں مختلف نظریات کی طرف اجمالی طور پر اشارہ کریں۔ حقیقت رؤیا کے بارے میں بہت سی تفسیریں کی گئی ہیں۔ شاید انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکے :

(۱) تفسیر مادی اور

(۲) تفسیر روحانی

۱۔ تفسیر مادی

مادیین کہتے ہیں کہ خواب کے چند علل و اسباب ہو سکتے ہیں :

الف۔ ہو سکتا ہے خواب انسان کے روزمرہ کے کاموں کا سیدھا نتیجہ ہو یعنی جو گزشتہ دنوں میں انسان کو پیش آتا ہے خواب کے وقت اس کی فکر کے سامنے وہ مجسم ہو جاتا ہے۔

ب۔ ہو سکتا ہے یہ وہ آرزوئیں ہوں جو پوری نہیں ہوئیں۔ جیسے پیاسا شخص خواب میں پانی دیکھتا ہے اور جو شخص کسی کے سفر سے لوٹ آنے کے انتظار میں ہوتا ہے وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ آگیا ہے۔ پرانے زمانے سے کہاوت ہے :

شتر در خواب بیند پنبہ دانہ ! ....

اونٹ خواب میں بنولے دیکھتا ہے ....

ج۔ ہو سکتا ہے کسی چیز کے خوف کے سبب انسان اسے خواب میں دیکھے۔ کیونکہ بارہا تجربہ ہوا ہے کہ جو لوگ چور سے خوفزدہ ہوتے ہیں رات کو خواب میں چور دیکھتے ہیں۔ مشہور ضرب المثل ہے :

دور از شتر بہ خواب و خواب آشفتہ نبین ۔

---

[1] بحار الانوار ج ۱۴ ص ۴۴۱۔ بعض علماء نے ان خوابوں میں ایک قسم کا اضافہ کیا ہے اور وہ ایسا خواب ہے جو انسان کے مزاج اور بدن کی کیفیت کا سیدھا نتیجہ ہو۔ اسی کی طرف آئندہ مباحث میں اشارہ ہوگا۔

اونٹ سے دور ہو کر سو جا تاکہ تُو خواب پریشان نہ دیکھے۔

یہ بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

فرائڈ اور اس کے مکتب کے پیروکاروں نے خواب کے لیے ایک اور تفسیر مادی بیان کی ہے۔ وہ تفصیلی تمہیدات کے ساتھ اظہار کرتے ہیں کہ خواب ناکام آرزوؤں کو پورا کرنے سے عبارت ہے کہ جو ہمیشہ تبدیل ہو کر ۔یں ۔کو فریب دینے کے لیے خود آگاہی کی منزل میں آتی ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ قبول کر لینے کے بعد کہ نفسِ انسانی دو حصّوں پر مشتمل ہے ایک حصہ آگاہ ہے (وہ کہ جو روز مرہ کے افکار، ارادی معلومات اور انسانی اختیارات سے مربوط ہے) دوسرا حصّہ ناآگاہ ہے (وہ باطنی ضمیر میں تشنہ تمناؤں کی شکل میں پنہاں ہے)۔ کہتے ہیں کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہماری وہ خواہشیں جو ہم مختلف اسباب کی وجہ سے پوری نہیں کر سکتے اور ہمارے باطنی ضمیر میں جا گزیں ہیں وہ عالم خواب میں جب خود آگاہی کا سسٹم معطل ہو جاتا ہے تو ایک طرح کی تخیلاتی تکمیل کے لیے خود آگاہ مرحلہ کا رُخ کرتی ہیں۔ کبھی وہ بغیر کسی تبدیلی کے منعکس ہوتی ہیں (یعنی عاشق اپنے اس محبوب کو عالم خواب میں دیکھتا ہے جو اس سے جدا ہو چکا ہے) اور کبھی ان کی شکل تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ مناسب شکلوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس صورت میں خواب تعبیر کے محتاج ہوتے ہیں۔

اس تفسیر کی بناء پر خوابوں کا تعلق ہمیشہ گزشتہ زمانے سے ہوتا ہے اور وہ کبھی بھی آئندہ کے بارے میں خبر نہیں دیتے اور وہ صرف ضمیر ناآگاہ کے پڑھنے کا اچھا وسیلہ بن سکتے ہیں۔ اسی بناء پر نفسیاتی بیماریوں کے علاج کے لیے اکثر بیمار کے خوابوں سے مدد لی جاتی ہے کیونکہ ان کا علاج ضمیر ناآگاہ کے ظاہر ہونے پر منحصر ہوتا ہے۔

غذا شناسی کے بعض ماہرین خواب اور بدن کی غذائی ضرورت کے درمیان رابطے کے قائل ہیں اور ان کا نظریہ ہے کہ مثلاً اگر انسان خواب میں دیکھے کہ اس کے دانتوں سے خون نکل رہا ہے تو لازماً اس کے بدن میں وٹامن سی کی کمی ہے اور اگر کوئی خواب میں دیکھے کہ اس کے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں تو معلوم ہوگا کہ وہ وٹامن بی کی کمی میں گرفتار ہے۔

(۲) تفسیر روحانی

لیکن روحانی فلاسفر خوابوں کی ایک اور تفسیر کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ خواب چند قسم کے ہیں،

الف۔ وہ خواب کہ جو انسان کی گزشتہ زندگی کی آرزوؤں سے مربوط ہے۔ انسان کے خوابوں کا ایک اہم حصہ اسی سے مربوط ہوتا ہے۔

ب۔ وہ خواب کہ جو مفہوم سے عاری اور خیال پریشان ہوتے ہیں یہ توہمات کا نتیجہ ہوتے ہیں (اگرچہ

ممکن ہے ان کے نفسیاتی اسباب بھی ہوں)۔

ج۔ وہ خواب کہ جو آئندہ سے مربوط ہیں اور مستقبل کے بارے میں گواہی دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جو خواب انسان کی گزشتہ زندگی سے مربوط ہیں اور وہ مناظر کہ جو انسان کی اپنی طویل زندگی میں دیکھے ہوتے ان کی تصویر کشی کی کوئی خاص تعبیر نہیں ہے۔ اسی طرح خواہ اسے پریشاں کہ جو افکار پریشاں کا نتیجہ ہوتے ہیں اور جنہیں اصطلاحاً "اضغاث احلام" کہا جاتا ہے ان افکار کی طرح ہیں کہ جن بخار اور ہذیان کی حالت میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے آئندہ مسائل کے بارے میں ان کی بھی کوئی خاص تعبیر نہیں ہوتی۔ اگرچہ روحانیات اور نفسیات کے ماہرین ان سے انسان کے ناآگاہ ضمیر کو سمجھنے کا کام لیتے ہیں اور ان سے آگاہی کو نفسیاتی بیماریوں کے علاج کی کلید سمجھتے ہیں۔ اس بناء پر ان کی تعبیر نفسیاتی اسرار اور بیماریوں کی تشخیص کے لیے ہے نہ کہ زندگی کے آئندہ حوادث و واقعات کے لیے۔

باقی رہے وہ خواب کہ جو مستقبل سے مربوط ہیں انہیں بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ایک قسم صریح اور واضح خوابوں کی ہے کہ جن کے لیے کسی قسم کی تعبیر کی ضرورت نہیں۔ بعض اوقات ایسے خواب مستقبل قریب یا بعید میں کسی معمولی فرق کے بغیر صورت پذیر ہو جاتے ہیں۔

دوسری قسم: آئندہ کے واقعات کی حکایت کرنے کے باوجود خاص ذہنی و روحانی عوامل کے زیر اثر جن کی شکل متغیر ہو جاتی ہے اور جو تعبیر کے محتاج ہوتے ہیں۔

ان خوابوں کی ہر قسم کے لیے بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ جن سب کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نہ صرف مذہبی مصادر اور تاریخی کتب میں ان کی مثالیں مذکور ہیں بلکہ ہماری اپنی خاص زندگی میں یا ایسے افراد کی زندگی میں جنہیں ہم جانتے ہیں ان کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ان کی تعداد اس قدر ہے کہ انہیں ہرگز اتفاقات کا نتیجہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

چند خواب

یہاں ہم چند ایسے خوابوں کے نمونے پیش کرتے ہیں کہ جنہوں نے عجیب انداز سے آئندہ کے واقعات سے پردہ اٹھایا ہے اور جنہیں ہم نے قابل اعتماد افراد سے سنا ہے۔

(۱) ہمدان کے ایک مشہور اور کاملاً قابل وثوق عالم مرحوم آخوند ملا علی نے مرحوم آقا میرزا عبدالنبی سے کہ جو تہران کے بزرگ علماء میں سے تھے، اس طرح نقل کیا ہے:

جب میں سامرا میں تھا تو مازندران سے مجھے ہر سال تقریباً ایک سو تومان[1] بھیجے جاتے تھے اور اسی وجہ سے پہلے ضرورت پڑتی تو میں قرض لے لیتا اور اس رقم کے پہنچنے پر اپنے سارے

---

[1] تومان ایرانی سکہ ہے (مترجم)۔

قرضے ادا کر دیا۔

ایک سال مجھے خبر ملی کہ اس سال فصل کی حالت بہت خراب رہی ہے لہٰذا وہ رقم نہیں بھیجی جائے گی۔ میں بہت پریشان ہوا۔ اسی پریشانی کے عالم میں سو گیا۔ اچانک میں نے خواب میں پیغمبر اسلام کو دیکھا۔ آپ نے مجھے پکار کر کہا:

اے شخص! کھڑے ہو جاؤ، وہ الماری کھولو (ایک الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) وہاں ایک سو تومان ہے وہ لے لو۔

میں خواب سے بیدار ہوا، تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ زوال کے بعد کی بات ہے۔ میں نے دیکھا کہ اہل تشیع کے عظیم مرجع تقلید مرحوم میرزا شیرازی کا بھیجا ہوا قاصد ہے۔ وہ کہنے لگا: میرزا تمہیں بلا رہے ہیں۔

مجھے تعجب ہوا کہ اس وقت مجھے وہ مرد بزرگ کس لیے بلا رہے ہیں۔ میں گیا تو دیکھا کہ وہ ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں (میں اپنا خواب بھول چکا تھا)۔ اچانک حضرت میرزا شیرازی نے کہا: میرزا عبدالنبی! اس الماری کا دروازہ کھولو اور اس میں ایک سو تومان ہیں اٹھا لو۔

فوراً خواب کا واقعہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ اس واقعے سے مجھے بہت تعجب ہوا۔ میں نے چاہا کچھ کہوں لیکن دیکھا کہ میرزا اس سلسلے میں کوئی بات کرنے کے لیے مائل نہیں ہیں۔ میں وہ رقم لے کر باہر آ گیا۔

(۲) ایک قابل اعتماد دوست نقل کرتا ہے:

کتاب "ریحانۃ الادب" کے مؤلف مرحوم تبریزی کا ایک لڑکا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ خراب تھا (شاید اسے شدید رو ماٹزم تھا)، حالت یہ تھی کہ وہ مشکل سے قلم اٹھا سکتا تھا۔ طے پایا کہ وہ علاج کے لیے مغربی جرمنی جائے۔

وہ کہتا ہے کہ میں جس بحری جہاز میں تھا اس میں خواب دیکھا کہ میری والدہ فوت ہو گئی ہیں۔ میں نے ڈائری کھولی اور یہ واقعہ دن اور وقت کے ساتھ لکھ لیا۔ کچھ عرصے کے بعد میں ایران واپس آیا۔ عزیزوں میں سے کچھ لوگ میرے استقبال کے لیے آئے۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے سیاہ لباس پہن رکھے ہیں تو مجھے تعجب ہوا۔ خواب کا واقعہ میرے ذہن سے بالکل اتر چکا تھا۔ آخر کار انہوں نے آہستہ آہستہ مجھے بتایا کہ میری والدہ فوت ہو گئی ہیں۔

مجھے فوراً وہ خواب یاد آیا۔ میں نے ڈائری کھولی اور وفات کے دن کے بارے میں سوال کیا تو دیکھا کہ ٹھیک اسی روز میری والدہ فوت ہوئی تھیں۔

(۳) مشہور اسلامی مؤلف سید قطب اپنی تفسیر فی ظلال القرآن میں سورہ یوسف سے مربوط آیات کے

ذیل میں لکھتے ہیں :

تم نے خوابوں کے بارے میں جو تمام باتیں کی ہیں اگر میں ان تمام کا انکار بھی کر دوں تو بھی میں اس واقعے کا انکار نہیں کر سکتا جو خود میرے ساتھ پیش آیا کہ جب میں امریکہ میں تھا۔ وہاں میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے بھانجے کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے اور وہ دیکھ نہیں سکتا۔ میرا بھانجا اس وقت میرے سب افراد خانہ کے ساتھ مصر میں تھا۔ میں اس واقعے پر پریشان ہوا۔ میں نے فوراً گھر والوں کو مصر خط لکھ بھیجا اور اپنے بھانجے کی آنکھوں کے بارے میں خصوصیت سے سوال کیا۔

کچھ عرصے بعد میرے خط کا جواب آیا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اس کی آنکھوں سے داخلی طور پر خون رستا ہے اور وہ دیکھ نہیں سکتا اور اس وقت زیر علاج ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ داخلی طور پر اس کی آنکھوں سے خون اس طرح سے رستا تھا کہ جو عام مشاہدے سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ صرف طبی آلات سے اسے دیکھنا ممکن تھا لیکن بہرحال وہ آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو چکا تھا۔

بہرکیف میں نے خواب میں یہاں تک کہ داخلی طور پر رسنے والے خون کو واضح طور پر دیکھا تھا۔

ایسے خواب کہ جن سے اسرار و رموز سے پردہ اٹھا ہے اور آئندہ سے مربوط حقائق یا حالات منکشف ہوتے ہیں بہت زیادہ ہیں۔ یہاں تک کہ دیر سے یقین کرنے والے افراد بھی ان کا انکار نہیں کر سکتے اور نہ انہیں محض اتفاق قرار دے سکتے ہیں۔

آپ اپنے قریبی دوستوں سے تحقیق کر کے عام طور پر ایسے خوابوں کی مثالیں معلوم کر سکتے ہیں کہ جن کی تفسیر مادی حوالے سے ہرگز نہیں ہو سکتی اور صرف فلاسفہ کی روحانی تفسیر اور استقلال روح کے اعتقاد سے ان کی تعبیر ہو سکتی ہے۔

لہٰذا ایسی تمام خوابوں سے مجموعی طور پر ایک مستقل روح کی موجودگی کے شاہد کے طور پر استفادہ کیا جا سکتا ہے۔[1]

۲۔ **حضرت یعقوب نے تعبیر کیسے بتائی :** زیر بحث آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ حضرت یعقوب نے بھائیوں کے سامنے خواب بیان کرنے سے ڈرانے کے علاوہ اجمالی طور پر خواب کی تعبیر بھی بیان کر دی۔ انہوں نے کہا کہ تو برگزیدۂ خدا ہوگا، خدا تجھے تعبیر خواب کا علم دے گا اور اپنی نعمت تجھ پر اور آل یعقوب پر تمام

---

[1] معاد و جہان پس از مرگ ص ۳۹۷۔

کرے گا۔

اس امر پر یوسف کے خواب کی دلالت کہ وہ آئندہ بلند روحانی و مادی مقامات پر فائز ہوں گے بالکل قابل فہم ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے حضرت یعقوبؑ کو یہ کیسے علم ہوا کہ آئندہ یوسف کو تعبیر خواب کا علم حاصل ہوگا کیا یہ ایک اتفاقی خبر تھی جو حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسف کو دی اور اس کا ان کے خواب سے کوئی تعلق نہ تھا یا یہ کہ انہوں نے یہ بات اسی خواب سے معلوم کی۔

ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ بات حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب ہی سے کشف کی اور ممکن ہے ایسا ان دو میں سے ایک طریقے سے ہوا ہو۔

پہلا یہ کہ یوسفؑ نے اس کم سنی کے باوجود خصوصی طور پر بھائیوں کی آنکھوں سے بچ کر اپنے باپ سے خواب بیان کیا (یہ بات اس سے معلوم ہوتی کہ والد نے انہیں وصیت کی کہ اسے چھپانے کی کوشش کریں) یہ امر ظاہر کرتا ہے کہ یوسف بھی اپنے خواب سے ایک خاص احساس رکھتے تھے۔ تبھی تو اسے کسی کے سامنے بیان نہیں کیا۔ یوسفؑ جیسے ایک ننھے سے بچے میں ایسا احساس پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ تعبیر خواب کے علم کے لیے اس میں ایک روحانی صلاحیت موجود ہے۔ اس سے انہوں نے محسوس کیا کہ اس صلاحیت کی پرورش سے اس سلسلے میں وہ ایک وسیع علم حاصل کر لیں گے۔

دوسرا، یہ کہ عالم غیب سے انبیاء و رسل کا ارتباط مختلف ذرائع سے تھا۔ کبھی قلبی الہامات کے ذریعے کبھی فرشتۂ وحی کے نزول کے ذریعے اور کبھی خواب کے ذریعے۔ حضرت یوسف اگرچہ اس وقت تک ابھی مقام نبوت تک نہیں پہنچے تھے تاہم یوسفؑ کے لیے ایسے معنی خیز خواب کا ہونا نشاندہی کرتا تھا کہ وہ آئندہ اس طریق سے عالم غیب سے ارتباط پیدا کریں گے لہٰذا فطرتاً انہیں خوابؑ کی تعبیر اور مفہوم کو سمجھنا چاہیے تاکہ وہ عالم غیب سے اس قسم کا رابطہ رکھ سکیں۔

۲۔ رازداری کا سبق: ان آیات سے جہاں ہمیں بہت سے درس ملتے ہیں ایک درس رازداری ہے جو بعض اوقات بھائیوں تک سے اختیار کرنا پڑتی ہے۔ انسان کی زندگی میں ہمیشہ ایسے راز ہوتے ہیں جو اگر فاش ہو جائیں تو ہو سکتا ہے اس کا مستقبل یا معاشرے کا مستقبل خطرے میں پڑ جاتے۔

ان اسرار کی حفاظت کے بارے میں اپنے اوپر کنٹرول کرنا وسعت ظرف اور قوت ارادی کی ایک نشانی ہے۔ ایسے بہت سے افراد ہیں جنہوں نے اس سلسلے میں کمزوری کی بناء پر اپنے انجام یا معاشرے کو خطرے میں ڈال دیا اور ایسی بہت سی پریشانیاں ہیں جو رازداری نہ رکھنے کی وجہ سے انسان کو پیش آتی ہیں۔

ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ہے:

لا یکون المؤمن مؤمناً حتی تکون فیہ ثلاث خصال سنۃ من ربہ

وسنة من نبيه (ص)، وسنة من وليه (ع)، فاما السنة من ربه فكتمان السر واما السنة من نبيه فمداراة الناس واما السنة من وليه فالصبر فى البأساء والضراء۔

مومن۔ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس میں تین خصلتیں نہ ہوں، ان میں سے ایک پروردگار کی سنت، ایک پیغمبر کی سنت ہے اور ایک امام و ولی کی سنت ہے:

خدا کی سنت رازوں کو چھپانا ہے۔
پیغمبر کی سنت لوگوں سے نرمی اور مدارات کرنا ہے۔ اور
امام کی سنت مصیبتوں اور پریشانیوں پر صبر کرنا ہے۔[1]
(البتہ یہاں مراد زیادہ تر دوسروں کے رازوں کو چھپانا ہے)۔
ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

سرك من دمك فلا يجرين من غير اوداجك

تیرے اسرار اور راز تیرے خون کی طرح ہیں جنہیں صرف تیری ہی رگوں میں جاری ہونا چاہیئے۔[2]

---

1. بحار، طبع جدید، ج ۷۰، ص ۳۳۴۔
2. سفینۃ البحار (کتم)۔

(۷) لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِلسَّائِلِينَ ○

(۸) إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ○

(۹) اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ ○

(۱۰) قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا يُوسُفَ وَأَلْقُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ ○

ترجمہ

(۷) یوسف اور ان کے بھائیوں (کے واقعے) میں سوال کرنے والوں کیلئے (ہدایت کی) نشانیاں تھیں۔

(۸) جس وقت کہ (بھائیوں نے) کہا: یوسف اور اس کا بھائی (بنیامین) باپ کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں حالانکہ ہم زیادہ طاقتور ہیں، یقیناً ہمارا باپ کھلی گمراہی میں ہے۔

(۹) یوسف کو قتل کر دو یا اسے دُور دراز کی زمین میں پھینک آؤ تاکہ باپ کی توجہ صرف تمہاری طرف ہو اور اس کے بعد (اپنے گناہ سے توبہ کر لینا اور) نیک بن جانا۔

(۱۰) ان میں سے ایک نے کہا: یوسف کو قتل نہ کرو اور اگر کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو اسے کسی اندھے کنویں میں پھینک دو تاکہ قافلوں میں سے کوئی اسے اٹھالیں (اور

اسے اپنے ساتھ کسی دُور کے مقام پر لے جائیں)۔

تفسیر

بھائیوں کی سازش

یہاں سے یوسف کے بھائیوں کی یوسف کے خلاف سازش شروع ہوتی ہے۔ پہلی آیت میں ان بہت سے اصلاحی دروس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اس داستان میں موجود ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: یقیناً یوسف اور اس کے بھائیوں کی داستان میں سوال کرنے والوں کے لیے نشانیاں تھیں (لقد کان فی یوسف واخوته اٰیات للسائلین)۔

اس بارے میں کہ ان سوال کرنے والوں سے کون سے اشخاص مراد ہیں، بعض مفسرین (مثلاً قرطبی نے تفسیر جامع میں اور دوسرے حضرات نے) کہا ہے کہ یہ سوال کرنے والے مدینہ کے یہودیوں کی ایک جماعت تھی جو اس سلسلے میں پیغمبر اکرمؐ سے مختلف سوالات کیا کرتے تھے لیکن ظاہری طور پر آیت مطلق ہے اور کہتی ہے کہ اس واقعے میں تمام جستجو کرنے والوں کے لیے آیات، نشانیاں اور دروس چھپے ہوتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر کیا درس ہوگا کہ چند طاقتور افراد ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہ جس کا سرچشمہ حسد تھا، ظاہراً ایک کمزور اور تنہا شخص کو نابود کرنے کے لیے اپنی تمام تر کوشش صرف کرتے ہیں مگر اس کام سے انہیں خبر نہیں ہوتی کہ وہ اسے ایک حکومت کے تخت پر بٹھا رہے ہیں اور ایک وسیع مملکت کا فرماں روا بنا رہے ہیں اور آخرکار وہ سب اس کے سامنے سرِ تعظیم و تسلیم خم کرتے ہیں۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ جب خدا کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اتنی طاقت رکھتا ہے کہ اس کام کو اس کے مخالفین کے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچا دے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ایک پاک اور صاحبِ ایمان انسان اکیلا نہیں ہے اور اگر سارا جہان اس کی نابودی پر کمر باندھ لے لیکن خدا نہ چاہے تو کوئی اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔

حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹے تھے۔ ان میں یوسفؑ اور بنیامین ایک ماں سے تھے۔ ان کی والدہ کا نام راحیل تھا۔ یعقوبؑ ان دونوں بیٹوں سے خصوصاً یوسفؑ سے زیادہ محبت کرتے تھے کیونکہ ایک تو یہ ان کے چھوٹے بیٹے تھے لہٰذا فطرتاً زیادہ توجہ اور محبت کے محتاج تھے اور دوسرا ان کی والدہ - راحیل - فوت ہو چکی تھیں اس بنا پر بھی انہیں زیادہ محبت کی ضرورت تھی علاوہ ازیں خصوصیت کے ساتھ حضرت یوسفؑ میں نابغہ اور غیر معمولی شخصیت ہونے کے آثار نمایاں تھے۔ مجموعی طور پر ان سب باتوں کی بناء پر حضرت یعقوبؑ واضح طور پر ان سے زیادہ پیار محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔

حاسد بھائیوں کی توجہ ان پہلوؤں کی طرف نہیں تھی اور وہ اس پر بہت ناراحت اور ناراض تھے۔

خصوصاً شاید ماؤں کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے بھی فطرتاً ان میں رقابت موجود تھی لہٰذا وہ اکٹھے ہوئے اور کہنے لگے کہ یوسف اور اس کے بھائی کو باپ ہم سے زیادہ پیار کرتا ہے حالانکہ ہم طاقتور اور مفید لوگ ہیں اور باپ کے امور کو بہتر طور پر چلا سکتے ہیں۔ اس لیے اسے ان چھوٹے بچوں کی نسبت ہم سے زیادہ محبت کرنا چاہیئے جبکہ ان سے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا (اذ قالوا لیوسف واخوہ احب الی ابینا منا ونحن عصبۃ)۔[1]

اس طرح یکطرفہ فیصلہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنے باپ کے خلاف کہا کہ ہمارا باپ واضح گمراہی میں ہے (ان ابانا لفی ضلال مبین)۔

حسد اور کینہ کی آگ نے انہیں اجازت نہ دی کہ وہ معاملے کے تمام اطراف پر غور و فکر کرتے اور ان دو بچوں سے اظہار محبت پر باپ کے دلائل معلوم کرتے کیونکہ ہمیشہ ذاتی مفادات ہر شخص کی فکر پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور اسے یک طرفہ فیصلوں پر ابھارتے ہیں کہ جن کا نتیجہ حق و عدالت کے راستے سے گمراہی ہے۔

البتہ ان کی مراد دین و مذہب کے اعتبار سے گمراہی نہ تھی کیونکہ بعد میں آنے والی آیات نشاندہی کرتی ہیں کہ اپنے باپ کی عظمت اور نبوت پر ان کا عقیدہ تھا اور انہیں صرف ان کے طرز معاشرت پر اعتراض تھا۔

بغض، حسد اور کینے کے جذبات نے آخر کار بھائیوں کو ایک منصوبہ بنانے پر آمادہ کیا۔ وہ ایک جگہ جمع ہوئے اور دو تجاویز ان کے سامنے تھیں۔ کہنے لگے: یا یوسف کو قتل کر دو یا اسے دور دراز کے کسی علاقے میں پھینک آؤ تاکہ باپ کی محبت کا پورا رخ تمہاری طرف ہو جائے (اقتلوا یوسف او اطرحوہ ارضا یخل لکم وجہ ابیکم)۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس کام پر تمہیں احساس گناہ ہوگا اور وجدان کی ندامت ہوگی کیونکہ اپنے چھوٹے بھائی پر یہ ظلم کرو گے لیکن اس گناہ کی تلافی ممکن ہے، توبہ کر لینا اور اس کے بعد صالح جمعیت بن جانا (وتکونوا من بعدہ قوما صالحین)۔

اس جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ان کی مراد یہ تھی کہ یوسف کو باپ کی آنکھوں سے دور کرنے کے بعد ان کے ساتھ تمہارا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا اور اس طرف سے تمہیں جو پریشانی ہے وہ ختم ہو جائے گی۔

ان میں سے پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] عصبۃ۔ افراد کی جماعت اور گروہ کے معنی میں ہے کہ جس کے افراد باہم شریک کار ہوں اور کسی کام کی انجام دہی میں ہم آہنگ ہوں، یہ لفظ جمع کا معنی دیتا ہے اور اس کا مفرد نہیں ہے۔

بہر حال یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس عمل کے بارے میں انہیں احساسِ گناہ تھا اور اپنے دل کی گہرائیوں میں وہ تھوڑا سا خوفِ خدا رکھتے تھے۔ اسی بنا پر وہ یہ گناہ انجام دینے کے بعد توبہ تجویز کر رہے تھے لیکن اہم مسئلہ یہ ہے کہ انجام جرم سے پہلے توبہ کے بارے میں گفتگو کرنا درحقیقت وجدان کو دھوکا دینے کے مترادف ہے اور گناہ کے لیے راستہ ہموار کرنے کے لیے ہے اور یہ بات کسی طرح بھی پشیمانی اور ندامت کی دلیل نہیں بنتی۔

دوسرے لفظوں میں حقیقی توبہ یہ ہے کہ گناہ کے بعد انسان میں ندامت اور شرمندگی کی حالت پیدا ہو جائے لیکن گناہ سے پہلے توبہ کے بارے میں گفتگو کرنا توبہ نہیں ہے۔

اس کی وضاحت یوں ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان جب گناہ کا ارادہ کرتا ہے تو اسے ضمیر کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے یا مذہبی اعتقادات اس کے سامنے بند باندھ دیتے ہیں اور گناہ کی طرف قدم اٹھانے سے روکتے ہیں۔ اس موقع پر وہ شخص ان بند سے گزرنے کے لیے اور گناہ کی طرف راستہ ہموار کرنے کے لیے اپنے ضمیر اور مذہب کو دھوکا دیتا ہے کہ میں گناہ کر لینے کے فوراً بعد اس کی تلافی کر لوں گا، ایسا نہیں ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤں گا، میں توبہ کروں گا، بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوں گا، نیک اعمال بجا لاؤں گا اور آخر کار آثارِ گناہ دھو ڈالوں گا یعنی جس طرح انجام گناہ کے لیے ایک شیطانی منصوبہ بناتا ہے ضمیر کو دھوکا دینے اور مذہبی عقائد پر مسلط ہونے کے لیے بھی ایک شیطانی منصوبہ بناتا ہے اور اکثر اوقات یہ شیطانی منصوبہ بھی بہت مؤثر ثابت ہوتا ہے اور اس محکم دیوار کو اس ذریعے سے اپنے راستے سے ہٹا دیتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے بھی یہی راستہ اختیار کیا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ انہوں نے کہا کہ یوسف کو راستے سے ہٹا لینے کے بعد باپ کی توجہ اور نگاہ تمہاری طرف ہو جائے گی (یخل لکم وجہ ابیکم)۔ یہ نہیں کہا کہ باپ کا دل تمہاری طرف مائل ہو جائے گا (یخل لکم قلب ابیکم)۔ کیونکہ انہیں اطمینان نہیں تھا کہ باپ اتنی جلدی اپنے بیٹے یوسف کو بھول جائے گا۔ یہی کافی ہے کہ باپ کی ظاہری توجہ ان کی طرف ہو۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اگر باپ کا رُخ اور نظر مائل ہو جائے تو یہ دل کے مائل ہونے کی بنیاد بن جائے گا۔ جب باپ کی نظر ان کی طرف ہوئی تو آہستہ آہستہ دل بھی ہو جائے گا۔

لیکن بھائیوں میں سے ایک بہت سمجھدار تھا یا اس کا ضمیر نسبتاً زیادہ بیدار تھا اسی لیے اس نے یوسف کو قتل کرنے کے منصوبے کی مخالفت کی اور اسی طرح کسی دور دراز علاقے میں پھینک آنے کی تجویز کی بھی، کیونکہ اس منصوبے میں یوسف کی ہلاکت کا خطرہ تھا۔ اس نے ایک تیسرا منصوبہ پیش کیا۔ وہ کہنے لگا: اگر تمہیں ایسا کام کرنے پر اصرار ہی ہے تو یوسف کو قتل نہ کرو بلکہ اسے کسی کنوئیں میں پھینک دو (اس طرح سے کہ وہ زندہ رہے) تاکہ راہ گزاروں کے کسی قافلے کے ہاتھ لگ جائے اور وہ اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور اس

طرح یہ ہماری اور باپ کی آنکھوں سے دور ہو جائے (قال قائل منهم لا تقتلوا یوسف والقوه فی غیابت الجب یلتقطه بعض السیارة ان کنتم فاعلین)۔

چند نکات

۱۔ "غیابات الجب" کا مفہوم: "جب" اس کنویں کو کہتے ہیں جسے پتھروں سے چُنا گیا ہو۔ شاید زیادہ تر بیابانی کنویں اسی قسم کے ہوتے ہیں اور "غیابت" کنویں میں پوشیدہ جگہ کو کہتے ہیں کہ جو نگاہوں سے غیب اور اوجھل ہو۔ یہ تعبیر گویا اس چیز کی طرف اشارہ ہے جو عموماً بیابانی کنووں میں ہوتی ہے اور وہ یہ کہ کنویں کی تہ میں پانی کی سطح کے قریب، کنویں کی دیوار میں طاقچہ کی صورت میں ایک چھوٹی سی جگہ بنا دیتے ہیں تاکہ اگر کوئی کنویں کی تہ میں جائے تو اس پر بیٹھ سکے اور برتن اپنے ساتھ لے جائے، خود پانی میں جائے بغیر اسے بھر لے۔ ظاہر ہے کہ اگر کنویں کے اوپر سے دیکھا جائے تو یہ جگہ صحیح طور پر نظر نہیں آتی۔ اسی بنا پر اسے "غیابات" کہا گیا ہے۔[1]

ہمارے ہاں بھی اس قسم کے کنویں پائے جاتے ہیں۔

۲۔ اس تجویز کا مقصد: اس میں شک نہیں کہ یہ تجویز پیش کرنے والے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ یوسف کو کنویں میں اس طرح سے پھینکا جائے کہ وہ ختم ہو جائے بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ کنویں کے پنہاں مقام پر رہے تاکہ صحیح سالم قافلوں کے ہاتھ لگ جائے۔

۳۔ "ان کنتم فاعلین" کا مطلب: اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہنے والے نے حتیٰ یہ تجویز بھی ایک قطعی اور فیصلہ کن بات کے طور پر پیش نہیں کی شاید وہ ترجیح دیتا تھا کہ یوسف کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا جائے۔

۴۔ کنویں والی تجویز کس نے پیش کی: کنویں والی تجویز پیش کرنے والے کا نام کیا تھا۔ اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا نام "روبین" تھا کہ جو ان سب سے زیادہ سمجھدار شمار ہوتا تھا۔ بعض نے "یہودا" کا نام لیا ہے اور بعض نے "لاوی" کا ذکر کیا ہے۔

۵۔ انسانی زندگی میں حسد کے تباہ کن اثرات: ایک اور اہم درس جو ہم اس واقعے سے سیکھتے ہیں یہ ہے کہ کس طرح حسد انسان کو بھائی کے قتل یا اس سے بھی زیادہ سخت تکلیف دہ مقام تک لے جاتا ہے اور اگر اس اندرونی آگ پر قابو نہ پایا جائے تو یہ کس طرح دوسروں کو بھی آگ میں دھکیل دیتی ہے اور خود حسد کرنے والے کو بھی۔

اصولاً جب کوئی نعمت کسی دوسرے کو میسر آتی ہے اور خود انسان اس سے محروم رہ جاتا ہے تو اس

[1] تفسیر المنار سے اقتباس، مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

میں چار مختلف حالتیں پیدا ہوتی ہیں :

پہلی یہ کہ وہ آرزو کرتا ہے کہ جس طرح یہ نعمت دوسروں کو حاصل ہے مجھے بھی ہو۔ اس حالت کو "غبطہ" (رشک) کہتے ہیں اور یہ قابلِ تعریف حالت ہے کیونکہ یہ انسان کو ایک اصلاحی کوشش کی طرف ابھارتی ہے اور معاشرے پر کوئی بُرا اثر مرتب نہیں کرتی ۔

دوسری یہ کہ وہ خواہش کرتا ہے کہ یہ نعمت دوسروں سے چھن جائے اور وہ اس مقصد کیلئے کوشش کرنے لگتا ہے۔ یہی وہ انتہائی مذموم حالت ہے جسے "حسد" کہتے ہیں۔ یہ حالت انسان کو دوسرے کے خلاف غلط کوشش پر ابھارتی ہے اور خود اپنے بارے میں کسی اصلاحی کوشش پر آمادہ نہیں کرتی ۔

تیسری یہ کہ وہ تمنا کرے کہ خود یہ نعمت حاصل کرے اور دوسرے اس سے محروم رہ جائیں۔ اسی حالت کو "بخل" اور اجارہ داری کہتے ہیں یعنی ہر چیز انسان اپنے لیے چاہے اور دوسروں کی اس سے محرومیت پر لذت محسوس کرے ۔

چوتھی یہ کہ وہ چاہے کہ دوسرے اس نعمت میں رہیں اگرچہ وہ خود محرومیت میں زندگی بسر کرے ۔ یہاں تک کہ وہ اس پر بھی تیار ہو کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ بھی دوسروں کو دے دے اور اپنے مفادات سے صرف نظر کرے۔ اس بالا و برتر حالت کو "ایثار" کہتے ہیں کہ جو اہم ترین اور بلند انسانی صفات میں سے ہے ۔

بہرحال حسد نے صرف برادرانِ یوسف کو اپنے بھائی کے قتل کی سرحد تک نہیں پہنچایا بلکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ حسد انسان کو خود اس کی اپنی تباہی پر بھی ابھارتا ہے۔ اسی بناء پر اسلامی احادیث میں اس گھٹیا صفت کے خلاف جہاد کے لیے بلا دینے والی تعبیرات دکھائی دیتی ہیں۔ نمونے کے طور پر ہم یہاں چند ایک احادیث نقل کرتے ہیں ۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

خدا نے موسٰی بن عمران کو حسد سے منع کیا اور ان سے فرمایا :

ان الحاسد ساخط لنعمی صاد لقسمی الذی قسمت بین عبادی ومن یک کذٰلک فلست منہ ولیس منی ۔

یعنی ۔ حسد کرنے والا میرے بندوں کو ملنے والی نعمتوں پر ناخوش رہتا ہے اور اپنے بندوں میں جو کچھ میں نے تقسیم کیا ہے اس میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ جو شخص ایسا ہو نہ وہ مجھ سے ہے اور نہ میں اس سے ہوں [1]

امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے :

---

[1] اصول کافی ج ۲ ص ۳۰۷

آفة الدین الحسد والعجب والفخر

دین کے لیے تین چیزیں آفت اور مصیبت ہیں حسد، خود پسندی اور غرور۔

ایک اور حدیث میں اسی امامؑ سے منقول ہے:

ان المؤمن یغبط ولا یحسد، والمنافق یحسد ولا یغبط

اہل ایمان رشک کرتے ہیں حسد نہیں کرتے لیکن منافق حسد کرتے ہیں رشک نہیں کرتے۔[1]

۹۔ ماں باپ کیلئے ایک سبق: اس واقعے کے اس حصے سے یہ درس بھی لیا جا سکتا ہے کہ ماں باپ کو اولاد سے اظہار محبت میں بہت زیادہ غور و خوض کرنا چاہیئے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ حضرت یعقوبؑ نے اس معاملے میں کسی خطا کا ارتکاب نہیں کیا تھا اور وہ حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائی بنیامین سے جو اظہار محبت کرتے تھے وہ کسی اصول اور وجہ کے تحت تھا اور جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں تاہم یہ ماجرا نشاندہی کرتا ہے کہ ضروری ہے کہ اس مسئلے میں انسان بہت حساس ہو اور اس پہلو کو سختی سے ملحوظ رکھے کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک بیٹے سے اظہار محبت دوسرے بیٹے کے دل میں ایسے جذبات پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ہر کام کر گزرنے پر تیار ہو جاتا ہے، اس طرح وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی اپنی شخصیت درہم برہم ہو گئی ہے اور پھر وہ اپنے بھائی کی شخصیت کو نقصان پہنچانے کیلئے کسی حد کو خاطر میں نہیں لاتا۔ یہاں تک کہ اگر وہ خود کسی ردعمل کا اظہار نہ کر سکے تو اندر ہی اندر کڑھتا رہتا ہے اور بعض اوقات نفسیاتی بیماری کا شکار ہو جاتا ہے۔

ایک واقعہ مجھے نہیں بھولتا کہ میرے ایک دوست کا چھوٹا بچہ بیمار تھا۔ فطری طور پر اسے زیادہ محبت کی ضرورت تھی۔ ماں باپ نے بڑے بیٹے کو اس کی خدمت پر لگا دیا۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ بڑا بیٹا ایک ایسی نفسیاتی بیماری میں گرفتار ہو گیا کہ جس کی شناخت نہیں ہوتی تھی۔ میں نے اس عزیز دوست سے کہا کہ اس کی وجہ اظہار محبت میں عدم عدالت ہی نہ ہو؟ وہ میری اس بات کا یقین نہیں کرتا تھا۔ وہ ایک ماہر نفسیات طبیب کے پاس گیا۔ طبیب نے کہا کہ تمہارے بیٹے کو کوئی خاص بیماری نہیں ہے اس بیماری کی وجہ یہ ہے کہ وہ محبت کی کمی کے مسئلے میں گرفتار ہے اور اسکی شخصیت پر ضرب لگی ہے جبکہ اس کے چھوٹے بھائی کو یہ تمام محبت حاصل ہوئی ہے۔

اسی لیے اسلامی احادیث میں ہے کہ:

ایک روز امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

بعض اوقات میں اپنے کسی بچے سے اظہار محبت کرتا ہوں اسے اپنے زانو پر بٹھاتا ہوں اسے بکری کی دستی دیتا ہوں اور اسکے منہ میں چینی ڈالتا ہوں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ حق دوسرے کا ہے لیکن پھر بھی یہ کام اس لیے کرتا ہوں تاکہ وہ میرے دوسرے بچوں کے خلاف نہ ہو جائے اور جیسے برادران یوسف نے یوسف کے ساتھ کیا وہ اس طرح نہ کرے۔[2]

---

[1] اصول کافی ج ۲ ص ۳۰۷۔ [2] بحار ج ۷۴، ص ۷۸۔

(۱۱) قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ○

(۱۲) اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○

(۱۳) قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ○

(۱۴) قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ○

ترجمہ

(۱۱) (یوسف کے بھائی باپ کے پاس آئے اور) کہنے لگے: ابا جان! تم (ہمارے بھائی) یوسف کے بارے میں ہم پر اطمینان کیوں نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں۔

(۱۲) اسے کل ہمارے ساتھ (شہر سے باہر) بھیج دو تاکہ خوب کھائے پیئے، کھیلے کودے اور سیر و تفریح کرے اور ہم اس کے محافظ ہیں۔

(۱۳) باپ نے کہا: اس کے دور ہونے سے میں غمگین ہوں گا اور مجھے ڈر ہے کہ اسے بھیڑیا نہ کھا جائے اور تم اس سے غافل رہو۔

(۱۴) انہوں نے کہا: اگر اسے بھیڑیا کھا جائے، جبکہ ہم طاقتور گروہ ہیں، تو ہم زیاںکاروں میں

سے ہوں (اور ہرگز ایسا ممکن نہیں ہے)۔

تفسیر

منحوس سازش

یوسف کے بھائیوں نے جب یوسف کو کنویں میں ڈالنے کی آخری سازش پر اتفاق کر لیا تو یہ سوچنے لگے کہ یوسف کو کس طرح سے کر جائیں لہٰذا اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک اور منصوبہ تیار کیا۔ اس کیلئے وہ باپ کے پاس آئے اور اپنے حق جتانے کے انداز میں، نرم و نازک لہجے میں محبت بھرے شکوے کی صورت میں کہنے لگے: ابا جان! آپ یوسف کو کیوں کبھی اپنے سے جدا نہیں کرتے اور ہمارے سپرد نہیں کرتے، آپ ہمیں بھائی کے بارے میں امین کیوں نہیں سمجھتے حالانکہ ہم یقیناً اس کے خیر خواہ ہیں (قالوا یا ابانا مالك لا تأمنا علی یوسف وانا له لناصحون)۔

آیئے! جس کا آپ ہمیں ستم سمجھتے ہیں اسے جانے دیجئے، علاوہ ازیں ہمارا بھائی نوعمر ہے، اس کا بھی حق ہے، اسے بھی شہر سے باہر کی آزاد فضا میں گھومنے پھرنے کی ضرورت ہے، اسے گھر کے اندر قید کر دینا درست نہیں۔ کل اسے ہمارے ساتھ بھیجئے تاکہ یہ شہر سے باہر نکلے، چلے پھرے، درختوں کے پھل کھائے، کھیلے کودے اور سیر و تفریح کرے (ارسله معنا غدًا یرتع ویلعب)[1]

اور اگر آپ کو اس کی سلامتی کا خیال ہے اور پریشانی ہے تو ہم سب اپنے بھائی کے محافظ و نگہبان ہوں گے۔ کیونکہ آخر یہ ہمارا بھائی ہے اور ہماری جان کے برابر ہے (وانا له لحافظون)۔

اس طرح انہوں نے بھائی کو باپ سے جدا کرنے کا بڑا ماہرانہ منصوبہ تیار کیا۔ ہو سکتا ہے انہوں نے یہ باتیں یوسف کے سامنے کی ہوں تاکہ وہ بھی باپ سے تقاضا کریں اور ان سے صحرا کی طرف جانے کی اجازت لے لیں۔

اس منصوبے میں ایک طرف باپ کے لیے انہوں نے یہ مشکل پیدا کر دی تھی کہ اگر وہ یوسف کو ہمارے سپرد نہیں کرتا تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ہمیں متہم سمجھتا ہے اور دوسری طرف کھیل کود اور سیر و تفریح کے لیے شہر سے باہر جانے کی یوسف کے لیے تحریک تھی۔

جی ہاں! جو لوگ غفلت میں ضرب لگانا چاہتے ہیں ان کے منصوبے ایسے ہی ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے تمام نفسیاتی اور جذباتی پہلوؤں سے کام لیتے ہیں لیکن صاحبانِ ایمان

---

[1] "یرتع" "رتع" (بروزن "قطع") کے مادہ سے دراصل جانوروں کے چرنے اور خوب کھانے کے معنی میں ہے لیکن کبھی انسان کیلئے تفریح کرنے اور خوب کھانے پینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

افراد کو۔ المؤمن کیس " (مومن ہوشیار ہوتا ہے) کے مصداق ایسے خوبصورت ظواہر سے کبھی دھوکا نہیں کھانا چاہیئے اگرچہ ایسی سازش بھائی کی طرف سے ہو۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے برادران یوسف کی باتوں کے جواب میں بجائے اس کے کہ انہیں بُرے ارادے کا الزام دیتے کہنے لگے کہ میں جو تمہارے ساتھ یوسف کو بھیجنے پر تیار نہیں ہوں تو اس کی دو وجوہ ہیں:

پہلی یہ کہ یوسف کی جدائی میرے لیے غم انگیز ہے (قال انی لیحزننی ان تذھبوا بہ)۔

اور دوسری یہ کہ ہو سکتا ہے کہ ان کے اردگرد کے بیابانوں میں خونخوار بھیڑیے ہوں۔ اور مجھے ڈر ہے کہ مبادا کوئی بھیڑیا میرے فرزند دلبند کو کھا جائے اور تم اپنے کھیل کود، سیر و تفریح اور دوسرے کاموں میں مشغول ہو (واخاف ان یاکلہ الذئب وانتم عنہ غافلون)۔

یہ بالکل فطری امر تھا کہ اس سفر میں بھائی اپنے آپ میں مشغول ہوں اور اپنے چھوٹے بھائی سے غافل ہوں اور بھیڑیوں سے بھرے اس بیابان میں کوئی بھیڑیا یوسف کو آ لے۔ البتہ بھائیوں کے پاس باپ کی پہلی دلیل کا کوئی جواب نہ تھا کیونکہ یوسف کی جدائی کا غم ایسی چیز نہ تھی کہ جس کی وہ تلافی کر سکتے بلکہ شاید اس بات نے بھائیوں کے دل میں حسد کی آگ کو اور بھڑکا دیا ہو۔

دوسری طرف بیٹے کو باہر لے جانے کے بارے میں باپ کی دلیل کا جواب تھا کہ جس کے ذکر کی چنداں ضرورت نہ تھی اور وہ یہ کہ آخرکار بیٹے کو نشوونما اور تربیت کے لیے چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے باپ سے جدا ہونا ہے اور اگر وہ گلدستہ کے پودے کی طرح ہمیشہ باپ کے زیر سایہ رہے تو نشوونما نہیں پا سکے گا اور بیٹے کے تکامل و ارتقاء کے لیے باپ مجبور ہے کہ یہ جدائی برداشت کرے۔ آج کھیل کود ہے کل تحصیل علم و دانش ہے پرسوں زندگی کے لیے کسب و کار اور سعی و کوشش ہے۔ آخرکار جدائی ضروری ہے۔

لہٰذا اصلاً انہوں نے اس کا جواب نہیں دیا بلکہ دوسری دلیل کا جواب شروع کیا کہ جو اُن کی نگاہ میں اہم اور بنیادی تھی اور کہنے لگے: کیسے ممکن ہے کہ ہمارے بھائی کو بھیڑیا کھا جائے حالانکہ ہم طاقتور گروہ ہیں اگر ایسا ہو جائے تو ہم زیاں کار و بدبخت ہوں گے" (قالوا لئن اکلہ الذئب ونحن عصبۃ انا اذا لخاسرون)۔

یعنی کیا ہم مُردہ ہیں کہ بیٹھ جائیں اور دیکھتے رہیں گے اور بھیڑیا ہمارے بھائی کو کھا جائے گا۔ بھائی کو بھائی سے جو تعلق ہوتا ہے اس کے علاوہ جو بات اس کی حفاظت پر ہمیں ابھارتی ہے یہ ہے کہ ہماری لوگوں میں عزت و آبرو ہے، لوگ ہمارے متعلق کیا کہیں گے، یہی نا کہ طاقتور موٹی گردنوں والے بیٹھے رہے اور اپنے بھائی پر بھیڑیے کو حملہ کرتے دیکھتے رہے۔ کیا پھر ہم لوگوں میں جینے کے قابل رہیں گے۔

انہوں نے ضمناً باپ کی اس بات کا بھی جواب دیا کہ ہو سکتا ہے تم کھیل کود میں لگ جاؤ اور یوسف

سے غافل ہو جاؤ اور وہ یہ کہ یہ مسئلہ گویا ساری دولت اور عزت و آبرو کے ضائع ہونے کا ہے ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ کھیل کود ہمیں غافل کر دے کیونکہ اس صورت میں ہم لوگ بے وقعت ہو جائیں گے اور ہماری کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ تمام خطرات میں سے حضرت یعقوبؑ نے صرف بھیڑیے کے حملے کے خطرے کی نشاندہی کیوں کی تھی۔

بعض کہتے ہیں کہ کنعان کا بیابان بھیڑیوں کا مرکز تھا۔ اس لیے زیادہ خطرہ اسی طرف سے محسوس ہوتا تھا۔
بعض دیگر کہتے ہیں کہ یہ ایک خواب کی وجہ سے تھا کہ جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے پہلے دیکھا تھا کہ بھیڑیوں نے ان کے بیٹے یوسف پر حملہ کر دیا ہے۔
یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے کنائے کی زبان میں بات کی تھی اور ان کی نظر بھیڑیا صفت انسانوں کی طرف تھی، جیسے یوسف کے بعض بھائی تھے۔
بہر حال انہوں نے بہت حیلے کیے۔ خصوصاً حضرت یوسفؑ کے معصوم جذبات کو تحریک کی اور انہیں شوق دلایا کہ وہ شہر سے باہر تفریح کے لیے جائیں اور شاید یہ ان کے لیے پہلا موقع تھا کہ وہ باپ کو اس کیلئے راضی کریں اور ہر صورت اس کام کے لیے ان کی رضامندی حاصل کریں۔

چند قابل توجہ دروس

داستان کے اس حصے سے ہمیں چند زندہ درس ملتے ہیں کہ جن کی طرف توجہ کرنا چاہیئے۔
۱۔ دوستی کے لبادے میں دشمن کی سازشیں: دشمن عموماً کھل کر بغیر کسی پردے کے میدان میں نہیں آتے بلکہ مخالف کو غفلت میں رکھنے اور اسے ہر قسم کے دفاع سے روکنے کے لیے اپنے کاموں کو پرفریب لباس میں پوشیدہ رکھتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے ان کے قتل یا جلاوطنی کی سازش کو نہایت اعلیٰ احساسات اور برادرانہ جذبات کے پردے میں چھپائے رکھا، ایسے احساسات کہ جو حضرت یوسفؑ کے لیے بھی تحریک آمیز تھے اور ظاہراً باپ کے لیے بھی قابل قبول تھے۔

یہ وہی روش ہے جس کا سامنا ہم اپنی روزمرہ زندگی میں وسیع سطح پر کرتے ہیں۔ جو دشمن ہمارے خلاف قسم کھائے ہوتے ہیں ان سے اس طرح سے جو سخت ضربات اور صدمے ہم نے جھیلے ہیں وہ کچھ کم نہیں ہیں۔ کبھی اقتصادی امداد کے نام پر، کبھی ثقافتی روابط کے عنوان سے، کبھی حقوقِ انسانی کی حمایت کے لباس میں اور کبھی دفاعی معاہدوں کی صورت میں انہوں نے مستضعف قوموں کے خلاف بدترین اور شرمناک استعماری ہتھکنڈے آزمائے ہیں ہم بھی ان کی ایسی قراردادوں اور سازشوں کا ایک شکار ہیں۔
لیکن ان سب تاریخی تجربات کی روشنی میں اب تو ہمیں اتنی ہوش آجانا چاہیئے کہ اب ہم ان خونخوار بھیڑیوں

کے اظہارِ محبت اور چکنی چپڑی باتوں سے خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ جو اپنے آپ کو ہمدرد انسانوں کے لباس میں پیش کرتے ہیں۔

ہم ابھی تک بھولے نہیں کہ مسلط عالمی سپر طاقتوں نے ڈاکٹروں اور دوائیوں کے پردے میں بعض جنگ زدہ افریقی ملکوں میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے اسلحہ اور اہم چیزیں بھیجیں۔ وہ سفارت کاروں اور ناظم الاموروں کے پردے میں اپنے نہایت خطرناک جاسوس دنیا کے مختلف علاقوں میں بھیجتے ہیں، فوجی مشیروں اور ماڈرن اور پیچیدہ اسلحے کی تربیت دینے والوں کے نام پر تمام فوجی راز ساتھ لے جاتے ہیں۔ ٹیکنیشنز اور فنی ماہرین کے ذریعے وہ قوموں کو اپنی مرضی کے اقتصادی راستے پر ڈال دیتے ہیں۔

کیا یہ تمام تاریخی تجربے ہمارے لیے کافی نہیں ہیں کہ ہم کبھی ان خوبصورت لبادوں سے دھوکا نہ کھائیں اور ان ظاہری انسانی نقابوں کے پیچھے ان بھیڑیوں کے حقیقی چہرے شناخت کرلیں۔

۲۔ سیر و تفریح انسان کی فطری ضرورت ہے: درست سرگرمیاں اور صحیح قسم کی سیر و تفریح انسان کی فطری ضرورت ہے، یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ جب بیٹوں نے حضرت یعقوبؑ سے حضرت یوسفؑ کے لیے سیر و تفریح کی ضرورت کا استدلال پیش کیا تو انہوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور عملاً اسے قبول کر لیا۔ یہ خود اس امر کی دلیل ہے کہ کوئی عقلِ سلیم اس فطری اور طبیعی ضرورت کا انکار نہیں کر سکتی۔ انسان کوئی لوہے کی مشین نہیں کہ جتنا چاہیں اس سے کام لیں بلکہ وہ روح رکھتا ہے کہ جو اس کے جسم کی طرح تھک جاتی ہے، وہ بھی تازہ جوش اور صحیح سیر و تفریح کی احتیاج رکھتی ہے۔

نیز تجربہ بتاتا ہے کہ انسان اگر ایک طرز کا کام جاری رکھے تو نشاط اور خوشی کی کمی کی وجہ سے تدریجاً اس کا فائدہ کم ہوتا جاتا ہے اور اس کی کارکردگی میں کمی آتی جاتی ہے لیکن اس کے برعکس چند گھنٹوں کی سیر و تفریح اور کوئی صحیح قسم کی بھاگ دوڑ اور خوشی کے بعد اس میں ایسی نشاطِ کار پیدا ہوتی ہے کہ کام کی کمیت اور کیفیت دونوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی بناء پر وہ گھڑیاں جو سیر و تفریح میں صرف ہوتی ہیں وہ کام کے لیے مددگار ہوتی ہیں۔

اسلامی روایات میں یہ حقیقت نہایت عمدہ پیرائے میں ایک حکم کے طور پر بیان ہوئی ہے۔ اس ضمن میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

للمؤمن ثلاث ساعات فساعة يناجي فيها ربه و ساعة يرم معاشه، و ساعة يخلي بين نفسه و بين لذتها فيما يحل و يجمل۔

مومن کی زندگی تین حصوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ ایک حصے میں وہ روحانیت حاصل کرتا ہے اور اپنے پروردگار سے مناجات کرتا ہے دوسرا حصہ حصولِ معاش کی فکر اور تگ و دو میں

گزارتا ہے اور تیسرا حصہ حلال (شرعی) لذتیں حاصل کرنے کے لیے مختص کرتا ہے[1]

یہ امر جاذب نظر اور قابل غور ہے کہ ایک اور حدیث میں اس جملے کا اضافہ ہوا ہے:

وذٰلک عون علی سائر الساعات۔

اور یہ سرگرمی اور صحیح تفریح دیگر پروگراموں کے لیے مددگار ہے۔ بعض کے بقول یہ دوڑ بھاگ اور سیر و تفریح کار کی سروس اور ٹیوننگ (TUNING) کی طرح ہے۔ اگرچہ یہ گاڑی اس کام کے لیے ایک گھنٹہ کھڑی رہے گی لیکن بعد میں نئی طاقت حاصل کرے گی جو اس وقت کی تلافی کئی گنا وقت سے کر دے گی علاوہ ازیں سروس (SERVICE) وغیرہ سے اس گاڑی کی عمر میں اضافہ ہوگا۔

لیکن اہم بات یہ ہے کہ سیر و تفریح اور ایسی سرگرمیاں صحیح اور درست ہوں ورنہ نہ صرف مشکل حل نہیں ہوگی بلکہ مشکلات میں اضافہ ہوگا کیونکہ بہت سی غلیظ تفریحات ایسی ہیں جو انسانی روح اور اعصاب کے لیے تباہ کن ہیں اور اس سے ایک مدت کے لیے کام اور فعالیت کی طاقت چھین لیتی ہیں یا کم از کم کام کے نتیجے اور کارکردگی کا گراف بہت گرا دیتی ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اسلام میں صحیح تفریح کے مسئلے کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ اسلام نے مختلف قسم کے مقابلوں کی بلکہ یہاں تک کہ ان میں شرط لگانے کی بھی اجازت دی ہے تاریخ کہتی ہے کہ بعض مقابلے خود پیغمبر اکرمؐ کے سامنے اور آپؐ کی نگرانی میں ہوئے۔ حتیٰ کہ آپؐ مقابلے میں سواری کے لیے اپنے اصحاب کو اپنا خاص اونٹ دے دیتے تھے۔

ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

ان النبی (ص) اجری الابل مقبلة من تبوك فسبقت العضباء وعليها اسامة، فجعل الناس يقولون سبق رسول الله (ص) و رسول الله يقول سبق اسامة۔

جب پیغمبر (ص) تبوک سے واپس آرہے تھے تو آپ نے اصحاب کے درمیان سواریوں کی دوڑ کا مقابلہ کروایا۔ اسامہ رسول اللہ (ص) کی مشہور اونٹنی "عضباء" پر سوار تھے وہ سب سے آگے نکل گئی، چونکہ وہ رسول اللہ (ص) کی اونٹنی تھی اس لیے لوگ پکارے کہ رسول اللہ جیت گئے لیکن رسول اللہ (ص) نے پکار کر کہا: اسامہ جیت گیا (یہ اس طرف اشارہ تھا کہ اہم کام سوار کا ہے نہ کہ سواری کا کیونکہ بعض اوقات سواری ناتجربہ کار ہاتھوں میں ہو تو ان سے کچھ نہیں ہو پاتا)[2]

اس میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جیسے برادران یوسف نے انسان خصوصاً نو عمر کے سیر و تفریح سے لگاؤ سے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے سوء استفادہ کیا آج کی دنیا میں بھی حق و عدالت کے دشمنوں کے خفیہ ہاتھ

---

1. نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۳۹۰
2. سفینۃ البحار ج۱، ص۵۹۶

ورزش اور تفریح کے عنوان سے نسل جوان کے افکار کو مسموم کرنے کے لیے بہت غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہمیں خبردار رہنا چاہیئے کہ بھیڑیا صفت سوپر طاقتیں ورزش اور تفریح کے نام پر نوجوانوں کے درمیان کھیلوں وغیرہ کے علاقائی یا عالمی مقابلے منعقد کروا کر اپنے منحوس منصوبوں کو عملی جامہ پہناتی ہیں۔

مجھے نہیں بھولتا کہ زمانۂ طاغوت[1] میں جب وہ لوگ کچھ خاص منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا چاہتے اور ملک کے اہم سرمائے اور ذخائر معمولی سی قیمت پر غیروں کے ہاتھ بیچنا چاہتے تو کھیلوں کے مقابلوں کا ایک طویل و عریض سلسلہ شروع کر دیتے اور لوگوں کو ان کھیلوں سے اس قدر مشغول رکھتے کہ ان کے بنیادی مسائل کی طرف توجہ کا موقع ہی نہ آنے دیتے کہ جو ان کے معاشرے پر اثر انداز ہوتے تھے۔

۴۔ بیٹا باپ کے زیر سایہ: اگرچہ ماں باپ کی اپنے بچے سے محبت تقاضا کرتی ہے کہ وہ ہمیشہ اسے اپنے پاس رکھیں لیکن واضح ہے کہ قانون فطرت کے لحاظ سے اس محبت کی وجہ بوقت ضرورت بیٹے کے لیے بے دریغ حمایت ہے۔ اسی بنا پر اس کے بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ خود پر اس کا انحصار کم کرنا چاہیئے اور بیٹے کو موقع دینا چاہیئے کہ وہ زندگی میں استقلال اور خود اعتمادی کی طرف قدم بڑھائے کیونکہ اگر ایک تازہ پکے ہوئے پھول کی طرح ہمیشہ تنومند درخت کے سائے میں رہے تو وہ ضروری رشد و نمو حاصل نہیں کر سکے گا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ بیٹوں کے تقاضے پر حضرت یعقوبؑ یوسفؑ سے تمام تر لگاؤ اور عشق کے باوجود اسے اپنے سے جدا کرنے پر تیار ہو گئے اور اسے شہر سے باہر بھیجنے پر آمادہ ہو گئے۔ اگرچہ یہ کام یعقوبؑ کے لیے بہت بھاری تھا لیکن یوسف کی مصلحت اور اس کا مستقل رشد و نمو تقاضا کرتا تھا کہ وہ آہستہ آہستہ اسے اپنے سے دور گھنٹے اور کئی دن بسر کرنے کی اجازت دے دیں۔

یہ ایک اہم تربیتی مسئلہ ہے جس سے بہت سے ماں باپ غافل ہیں اور اصطلاح کے مطابق اپنی اولاد کی ۔ لاڈلے بچوں ۔ کی طرح پرورش کرتے ہیں، اس طرح سے کہ ماں باپ کی سرپرستی کے بغیر ہرگز زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ وہ طوفان زندگی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ حوادث کا تھپیڑا انہیں زمین پر پٹخ دیتا ہے۔ اسی بنا پر عظیم شخصیات میں سے بہت سی ایسی تھیں کہ جو بچپن ہی سے ماں باپ سے محروم ہو گئیں۔ انہوں نے اپنی زندگی خود بنائی اور بڑی مشکلات میں انہوں نے پرورش پائی۔

یہ بات ضروری ہے کہ ماں باپ کی اس اہم تربیتی معاملے کی طرف توجہ ہو اور جھوٹی محبتیں خود اعتمادی پیدا کرنے میں حائل نہ ہوں۔

یہ امر قابل غور ہے کہ یہی بات فطری جذبے کے طور پر بعض جانوروں میں دیکھی گئی ہیں کہ مثلاً ابتدا میں بچے ماں کے پر و بال کے نیچے رہتے ہیں اور ماں اپنی جان عزیز کی طرح ہر حادثے کے موقع پر ان کا دفاع کرتی

---

[1] معدوم شاہ ایران کے دور کو اہل ایران ۔ زمانۂ طاغوت کہتے ہیں (مترجم)۔

ہے لیکن جب وہ بڑے ہوتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ ماں ان سے اپنی حمایت اٹھا لیتی ہے بلکہ اگر وہ اس کے پیچھے آئیں تو اپنی چونچ کے ذریعے انہیں سختی سے اپنے سے دُور کر دیتی ہے۔ یعنی وہ کہتی ہے کہ جاؤ اور مستقل زندگی کا طریقہ سیکھو، کب تک انحصار کرتے ہوئے وابستہ رہ کر ایسی زندگی گزارو گے کہ جو استقلال سے عاری ہو، تم بھی خود سے "ایک شخص" ہو۔

لیکن بہرحال یہ امر رشتۂ قرابت اور حفظِ مودّت و محبت کے منافی نہیں ہے بلکہ یہ گہری محبت ہے اور سوچا سمجھا تعلق ہے جس میں دونوں طرف کی مصلحت ہے۔

۴۔ جرم سے پہلے نہ قصاص ہے نہ الزام: اس داستان کے اس حصے میں ہم اچھی طرح مشاہدہ کرتے ہیں کہ اگرچہ حضرت یعقوبؑ یوسفؑ سے ان کے بھائیوں کا حسد جانتے تھے اور اسی لیے آپ نے حضرت یوسف کو حکم دیا کہ اپنا عجیب و غریب خواب ان سے چھپائے رکھیں لیکن ان پر یہ الزام لگانے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوئے کہ تم میرے بیٹے یوسف کے بارے میں بُرا ارادہ رکھتے ہو بلکہ انہوں نے یوسف کی جدائی کے ناگوار ہونے اور بیابان کے بھیڑیوں کے خوف کا عذر پیش کیا۔

انسانی اخلاق و معیار اور عادلانہ اصولِ قضاوت بھی اسی کا تقاضا کرتے ہیں کہ جب تک کسی شخص سے غلط کام کی نشانیاں ظاہر نہ ہوں اس پر الزام نہ لگائیں۔ اصل یہ ہے کہ ہر کسی کی پاکیزگی اور درستی تسلیم کی جائے جب تک کہ اس کے برعکس ثابت نہ ہو جائے۔

۵۔ دشمن کو تلقین: ایک اور نکتہ یہ ہے کہ مذکورہ آیات کے ذیل میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مروی ہے کہ:

> لا تلقنوا الكذاب فتكذب فان بنی یعقوب لم یعلموا ان الذئب یأکل الانسان حتی لقنهم ابوهم۔
>
> جھوٹے کو تلقین نہ کرو کہ وہ تم سے جھوٹ بولے کیونکہ یعقوبؑ کے بیٹے اس وقت نہیں جانتے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ بھیڑیا انسان پر حملہ کرکے اسے کھالے جب تک کہ باپ نے انہیں تلقین نہیں کی تھی [1]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دوسرا عذر بہانہ اور انحرافی راستے کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ تم متوجہ رہو کہ کہیں خود تم مختلف احتمالات ذکر کرکے اسے انحرافی راستوں کا پتہ نہ بتا دو۔

یہ بالکل ایسے ہے جیسے بعض اوقات انسان اپنے چھوٹے بچے کو کہتا ہے کہ اپنی گیند لیمپ پر نہ مارنا بچہ جو اب تک نہیں جانتا تھا کہ گیند لیمپ کو ماری جا سکتی ہے، اس طرف متوجہ ہوتا ہے کہ یہ کام ہو سکتا ہے اور اس کی جستجو کی حس اسے تحریک دیتی ہے کہ دیکھنا چاہیئے کہ اگر لیمپ کو گیند لگے تو اس کا کیا اثر ہوگا۔ اس کے بعد

---

1. نور الثقلین، ج ۲ ص ۴۱۵۔

وہ تجربہ کرتا ہے اور اس تجربے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لیمپ ٹوٹ جاتا ہے۔

یہ صرف بچوں کے لیے ہی کوئی سادہ اور عام سا معاملہ نہیں ہے۔ ایک بڑے معاشرے کی سطح پر بھی کبھی انحرافی او امراضی سبب بن جاتے ہیں کہ لوگ بہت سی وہ چیزیں کہ جنہیں وہ نہیں جانتے ہوتے انہیں یاد کر لیتے ہیں اور اس کے بعد انہیں آزمانے کا وسوسہ شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے مواقع پر مسائل کو کلی اور عمومی حوالے سے پیش کرنا چاہیئے تاکہ اس میں بُری تعلیم و تربیت نہ ہو جائے۔ البتہ پیغمبرِ خدا حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں سے یہ بات پاکیزگی اور صفائے دل کے ساتھ کی تھی لیکن گمراہ بیٹوں نے باپ کے بیان سے غلط فائدہ اٹھایا۔

اس امر کی نظیر وہ طریقہ ہے کہ جس کا سامنا ہم بہت سی تحریروں میں کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی صاحب منشیات کے مضرات کے بارے میں یا استمناء کے متعلق گفتگو کرنا چاہتے ہیں اور ان مسائل کی اس طرح تشریح کرتے ہیں یا ان کے مناظر فلم کے ذریعے اس طرح دکھاتے ہیں کہ ناآگاہ لوگ ان کاموں کے رموز و اسرار سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں وہ باتیں بھول جاتی ہیں جو ان کاموں کی مذمت میں اور ان سے بچنے کے لیے کی جاتی ہیں۔ اسی بناء پر ایسی تحریروں اور فلموں کی بدآموزی کے نقصانات اور غلط اثرات ان کے فوائد کی نسبت زیادہ ہوتے ہیں۔

۶۔ اپنا عہد پورا کرنا چاہیئے: اس بحث کا آخری نکتہ یہ ہے کہ یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا کہ اگر ہمارے ہوتے ہوئے بھیڑیا ہمارے بھائی کو کھا گیا تو ہم خسارے میں ہیں۔ یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ انسان جب ذمہ داری قبول کر لیتا ہے تو اسے آخری سانس تک ثابت قدم رہنا چاہیئے ورنہ اپنی وقعت کھو بیٹھے گا اور اپنے مقام و آبرو کا سرمایہ اجتماعی حیثیت کی قدر و قیمت اور ضمیر کا سرمایہ گنوا بیٹھے گا۔

کیسے ممکن ہے کہ انسان کا ضمیر بیدار اور شخصیت بلند ہو اور اسے اپنی اجتماعی آبرو کا پاس ہو لیکن پھر بھی جو ذمہ داریاں وہ قبول کر چکا ہے ان سے انحراف کرے اور ان کے بارے میں لاپرواہی سے کام لے۔

(۱۵) فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَنْ يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ○

(۱۶) وَجَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ ○

(۱۷) قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ ۖ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ ○

(۱۸) وَجَاءُوا عَلَىٰ قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ ۚ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ○

ترجمہ

(۱۵) جس وقت وہ اپنے ساتھ لے گئے اور مصمم ارادہ کر چکے کہ اسے کنویں کے مخفیہ گوشے میں ڈال دیں تو ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ تُو انہیں آئندہ ان کے اس کام سے باخبر کرے گا جبکہ وہ نہیں جانیں گے۔

(۱۶) رات کے وقت وہ گریہ کناں باپ کے پاس آگئے۔

(۱۷) کہنے لگے: ابا! ہم گئے اور باہمی مقابلے میں مشغول ہو گئے اور یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے اور اسے بھیڑیا کھا گیا اگرچہ ہم سچے ہوں لیکن تُو ہرگز ہماری

بات کی تصدیق نہیں کرے گا۔

(۱۸) اور اس کا پیراہن جھوٹ موٹ خون سے آلودہ کرکے (باپ کے پاس) لے آئے۔ اس نے کہا: تمہاری نفسانی ہوا و ہوس نے یہ کیا تمہارے لیے پسندیدہ بنا دیا، مَیں صبرِ جمیل کروں گا (اور ناشکری نہیں کروں گا)، اور جو کچھ تم کہتے ہو اس کے مقابلے میں خدا سے مدد طلب کرتا ہوں۔

تفسیر

رُسوا کُن جھوٹ

آخرکار بھائی کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے باپ کو راضی کرلیا کہ وہ یوسفؑ کو ان کے ساتھ بھیج دے۔ وہ رات انہوں نے اس خوش خیالی میں گزاری کہ کل یوسف کے بارے میں ان کا منصوبہ عملی شکل اختیار کرے گا اور راستے کی رکاوٹ اس بھائی کو ہمیشہ کے لیے راستے سے ہٹا دیں گے۔ پریشانی انہیں صرف یہ تھی کہ باپ پشیمان نہ ہو اور اپنی بات واپس نہ لے لے۔

صبح سویرے وہ باپ کے پاس گئے اور یوسف کی حفاظت کے بارے میں باپ نے ہدایات دہرائیں۔ انہوں نے بھی اظہارِ اطاعت کیا۔ باپ کے سامنے اسے بڑی محبت و احترام سے اٹھایا اور چل پڑے۔

کہتے ہیں شہر کے دروازے تک باپ ان کے ساتھ آئے اور آخری دفعہ یوسفؑ کو ان سے لے کر اپنے سینے سے لگایا۔ آنسو اُن کی آنکھوں سے برس رہے تھے۔ پھر یوسفؑ کو ان کے سپرد کرکے ان سے جدا ہوگئے لیکن حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں اسی طرح بیٹوں کے پیچھے تھیں۔ جہاں تک باپ کی آنکھیں کام کرتی تھیں وہ بھی یوسفؑ پر نوازش اور محبت کرتے رہے لیکن جب انہیں اطمینان ہوگیا کہ اب باپ انہیں نہیں دیکھ سکتا تو اچانک انہوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ سالہا سال سے حسد کی وجہ سے جو اُن کے اندر تہ بہ تہ بغض و کینہ موجود تھا وہ حضرت یوسفؑ پر نکلنے لگا۔ ہر طرف سے اسے مارنے لگے۔ وہ ایک سے بچ کر دوسرے کی پناہ لیتے لیکن کوئی انہیں پناہ نہ دیتا۔

ایک روایت میں ہے کہ اس طوفانِ بلا میں حضرت یوسفؑ آنسو بہا رہے تھے اور جب وہ انہیں کنویں میں پھینکنے لگے تو اچانک حضرت یوسفؑ ہنسنے لگے۔ بھائیوں کو بہت تعجب ہوا کہ یہ ہنسنے کا کونسا مقام ہے گویا یوسف نے اس مسئلے کو مذاق سمجھا ہے اور بات سے بے خبر ہے کہ سیاہ وقت اور بدبختی اس کے انتظار میں ہے لیکن یوسفؑ نے اس ہنسنے کے مقصد سے پردہ اٹھایا اور سب کو عظیم درس دیا۔ وہ کہنے لگے:

مجھے نہیں بھولتا کہ ایک دن تم طاقتور بھائیوں، تمہارے قوی بازوؤں اور بہت زیادہ جسمانی طاقت پر میں نے نظر ڈالی تو میں بہت خوش ہوا اور میں نے اپنے آپ سے کہا کہ جس کے اتنے دوست اور مددگار ہوں اسے سخت حوادث کا کیا غم ہے۔ اس دن میں نے تم پر بھروسہ کیا اور تمہارے بازوؤں پہ دل باندھا۔ اب تمہارے چنگل میں گرفتار ہوں اور تم سے بچ کر تمہاری طرف پناہ لیتا ہوں اور تم مجھے پناہ نہیں دیتے۔ خدا نے تمہیں مجھ پر مسلط کیا ہے تاکہ میں یہ درس سیکھوں کہ اس کے غیر پر یہاں تک کہ بھائیوں پر بھی بھروسہ نہ کروں۔

بہرحال قرآن کہتا ہے: جب وہ یوسف کو اپنے ساتھ لے گئے اور انہوں نے متفقہ فیصلہ کر لیا کہ اسے کنویں کی مخفی جگہ پر پھینک دیں گے، اس کام کے لیے جو ظلم و ستم ممکن تھا انہوں نے روا رکھا (فلما ذھبوا بہ واجمعوا ان یجعلوہ فی غیابت الجب)[1]

لفظ "اجمعوا" نشاندہی کرتا ہے کہ سب بھائی اس پروگرام پر متفق تھے اگرچہ حضرت یوسف کو قتل کرنے میں وہ متفق نہ تھے۔

اصولی طور پر "اجمعوا" "جمع" کے مادہ سے اکٹھا کرنے کے معنی میں ہے اور ایسے مواقع پر آراء و افکار جمع کرنے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اس وقت ہم نے یوسف کی طرف وحی بھیجی، اسے تسلی دی اور اس کی دلجوئی کی اور اس سے کہا کہ غم نہ کھاؤ۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ تم انہیں ان تمام منحوس سازشوں اور منصوبوں سے آگاہ کرو گے اور وہ تمہیں پہچان نہیں سکیں گے (و اوحینا الیہ لتنبئنھم بامرھم ھذا و ھم لا یشعرون)۔

وہ دن کہ جب تم تختِ حکومت پر تکیہ لگاتے ہو گے اور تمہارے یہ بھائی تمہاری طرف دست نیاز پھیلائیں گے اور ایسے تشنہ کاموں کی طرح کہ جو چشمۂ خوشگوار کی تلاش میں تپتے ہوئے بیابان میں سرگرداں ہوتے ہیں، تمہارے پاس بڑی انکساری اور فروتنی سے آئیں گے۔ لیکن تم اتنے بلند مقام پر پہنچے ہو گے کہ انہیں خیال بھی نہ ہوگا کہ تم ان کے بھائی ہو۔ اس روز تم ان سے کہو گے کہ کیا تم نہ تھے جنہوں نے اپنے چھوٹے بھائی یوسف کے ساتھ یہ سلوک کیا اور اس دن یہ کس قدر شرمسار اور پشیمان ہوں گے۔

اسی سورۃ کی آیت ۲۲ کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وحی الٰہی وحیِ نبوت نہ تھی بلکہ یوسف کے دل

---

[1] مندرجہ بالا آیت میں "لما" کا جواب محذوف ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے:

فلما ذھبوا بہ واجمعوا ان یجعلوہ فی غیابت الجب عظمت فتنتھم (تفسیر قرطبی)۔

اور یہ حذف شاید اس بنا پر ہو کہ اس دردناک حادثے کی عظمت کا تقاضا تھا کہ کہنے والا اس کے بارے میں خاموش رہے یہ خود بلاغت کے فنون میں سے ایک فن ہے (تفسیر المیزان)

پر الہام تھا تاکہ وہ جان لے کہ وہ تنہا نہیں ہے اور اس کا ایک حافظ و نگہبان ہے۔ اس وحی نے قلب یوسف پر امید کی ضیا پاشی کی اور یاس و ناامیدی کی تاریکیوں کو اس کی روح سے نکال دیا۔

یوسف کے بھائیوں نے جو منصوبہ بنا رکھا تھا اس پر انہوں نے اپنی خواہش کے مطابق عمل کر لیا لیکن آخرکار انہیں واپس لوٹنے کے بارے میں سوچنا تھا کہ جا کر کوئی ایسی بات کریں کہ باپ کو یقین آ جائے کہ یوسف کسی سازش کے تحت نہیں بلکہ طبیعی طور پر وادیٔ عدم میں چلا گیا ہے اور اس طرح وہ باپ کی نوازشات کو اپنی جانب موڑ سکیں۔

اس مقصد کے لیے انہوں نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ بالکل وہی تھا جس کا باپ کو خوف تھا اور وہ جس کی پیش بینی کر چکے تھے۔ یعنی انہوں نے فیصلہ کیا کہ جا کر کہیں کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہے اور اس کے لیے فرضی کہانیاں پیش کریں۔

قرآن کہتا ہے: رات کے وقت بھائی روتے ہوئے آئے (وجاءو اباھم عشاءً یبکون)۔

ان کے جھوٹے آنسوؤں اور ٹسوے بہانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جھوٹا رونا بھی ممکن ہے اور صرف روتی ہوئی آنکھ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔

باپ جو بڑی بے تابی اور بے قراری سے اپنے فرزند دلبند یوسف کی واپسی کے انتظار میں تھا اس نے جب انہیں واپس آتے دیکھا اور یوسف ان میں دکھائی نہ دیا تو وہ لرز گیا اور کانپ اٹھا۔ حالات پوچھے تو انہوں نے کہا: ابا جان! ہم گئے اور باہم (سواری اور تیر اندازی کے) مقابلوں میں مشغول ہو گئے اور یوسف کو جو چھوٹا تھا اور ہم سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اسے ہم اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے، اس کام میں ہم اتنے محو ہو گئے کہ ہر چیز یہاں تک کہ بھائی کو بھی بھول گئے، اس اثناء میں ایک بے رحم بھیڑیا اس طرف آ پہنچا اور اس نے اسے چیر پھاڑ کھایا (قالوا یا ابانا انا ذھبنا نستبق و ترکنا یوسف عند متاعنا فاکلہ الذئب)۔

لیکن ہم جانتے ہیں کہ تم ہرگز ہماری باتوں کا یقین نہیں کرو گے اگرچہ ہم سچے ہوں کیونکہ تم نے پہلے ہی اس قسم کی پیش بینی کی تھی لہٰذا اسے بہانہ سمجھو گے (وما انت بمؤمن لنا ولو کنا صادقین)۔

بھائیوں کی باتیں بڑی سوچی سمجھی تھیں۔ پہلی بات یہ کہ انہوں نے باپ کو "یا ابانا" (اے ہمارے والد) کے لفظ سے مخاطب کیا کہ جس میں ایک جذباتی پہلو تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ فطری طور پر ایسی تفریح گاہ میں طاقتور بھائی بھاگ دوڑ میں مشغول ہوں گے اور چھوٹے کو سامان کی نگہداشت پر مقرر کریں گے اور اس کے علاوہ انہوں نے باپ کو غفلت میں رکھنے کے لیے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور روتی ہوئی آنکھوں سے کہا کہ تم ہرگز یقین نہیں کرو گے اگرچہ ہم سچ بول رہے ہوں۔

نیز اس بناء پر کہ باپ کو ایک زندہ نشانی بھی پیش کریں۔ وہ یوسف کی قمیص کو جھوٹے خون میں تر کیے ہوئے تھے، (وہ خون انہوں نے بکری یا بھیڑ کے بچے یا ہرن کا لگا رکھا تھا) (وجاءو علی قمیصہ بدم کذب)۔

لیکن ۔ دروغ گو حافظہ ندارد ۔ ایک حقیقی واقعہ کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور اس کے مختلف کوائف اور مسائل ہوتے ہیں ۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ان سب کو ایک فرضی کہانی میں سمویا جاسکے لہٰذا برادران یوسف بھی اس نکتے سے غافل رہے کہ کم از کم یوسفؑ کے کرتے کو چند جگہ سے پھاڑ لیتے تاکہ وہ بھیڑیے کے حملے کی دلیل بن سکتا ۔ وہ بھائی کی قمیص کو اس کے بدن سے صحیح سالم اتار کر خون آلود کر کے باپ کے پاس لے آئے ۔ سمجھدار اور تجربہ کار باپ کی جب اس کرتے پر نگاہ پڑی تو وہ سب کچھ سمجھ گئے اور کہنے لگے کہ تم جھوٹ بولتے ہو ۔ بلکہ نفسانی ہوا و ہوس نے تمہارے لیے یہ کام پسندیدہ بنا دیا ہے " اور یہ شیطانی سازشیں ہیں (قال بل سولت لکم انفسکم امرًا) ۔

بعض روایات میں ہے کہ :

انہوں نے کرتہ اٹھا لیا اور اس کا پچھلا حصہ آگے کر کے پکار کر کہا ، تو پھر اس میں بھیڑیے کے پنجوں اور دانتوں کے نشان کیوں نہیں ہیں ۔

ایک اور روایت کے مطابق :

حضرت یعقوبؑ نے کرتہ اپنے منہ پر ڈال لیا ۔ فریاد کرنے لگے اور آنسو بہانے لگے ۔ وہ کہہ رہے تھے : یہ کیسا مہربان بھیڑیا تھا جس نے میرے بیٹے کو تو کھا لیا لیکن اس کے کرتے کو تو ذرہ بھر نقصان نہ پہنچایا ۔ اس کے بعد وہ بے ہوش ہو کر خشک لکڑی کی طرح زمین پر گر پڑے ۔ بعض بھائیوں نے فریاد کی : اے وائے ہو ہم پر روز قیامت عدلِ الٰہی کی عدالت میں ہم بھائی بھی ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں اور باپ کو بھی ہم نے قتل کر دیا ہے ۔ باپ اسی طرح سحری تک بے ہوش رہے لیکن سحرگاہی کی نسیم سرد کے جھونکے ان کے چہرے پر پڑے تو وہ ہوش میں آگئے [1]

باوجودیکہ یعقوبؑ کے دل میں آگ لگی ہوئی تھی ، ان کی روح جل رہی تھی لیکن زبان سے ہرگز ایسی بات نہ کہتے تھے جو ناشکری ، یاس و ناامیدی اور جزع و فزع کی نشانی ہو بلکہ کہا : میں صبر کروں گا ۔ صبرِ جمیل ، ایسی شکیبائی جو شکرگزاری اور حمدِ خدا کے ساتھ ہو" (فصبر جمیل) [2]

اس کے بعد یعقوبؑ کہنے لگے : جو کچھ تم کہتے ہو اس کے مقابلے میں میں خدا سے مدد طلب کرتا ہوں (واللہ المستعان علیٰ ماتصفون) ۔ میں اس سے چاہتا ہوں کہ جامِ صبر کی تلخی میرے حلق میں شیریں کر دے اور مجھے زیادہ تاب و توانائی دے تاکہ اس عظیم طوفان کے مقابلے میں اپنے اوپر کنٹرول رکھ سکوں اور میری زبان نادرست اور غلط بات سے آلودہ نہ ہو ۔

انہوں نے یہ نہیں کہا کہ یوسف کی موت کی مصیبت پر مجھے شکیبائی دے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یوسف قتل

---

[1] تفسیر آلوسی ، مذکورہ آیت کے ذیل میں ۔

[2] ۔ صبر جمیل ۔ صفت و موصوف کے قبیل میں سے ہیں اور یہ مبتدائے محذوف کی خبر بھی ہے ۔ یہ در اصل اس طرح تھا :

صبری صبر جمیل

نہیں ہوتے بلکہ کیا کروں پھر تم کہتے ہو کہ جس کا تجربہ بہرحال اپنے بیٹے سے میری جدائی ہے میں صبر طلب کرتا ہوں۔

چند اہم نکات

۱۔ ایک ترک اولیٰ کے بدلے .... : ابوحمزہ ثمالی نے ایک روایت امام سجاد علیہ السلام سے نقل کی ہے۔ ابوحمزہ کہتے ہیں :

جمعہ کے دن میں مدینہ منورہ میں تھا۔ نمازِ صبح میں نے امام سجاد کے ساتھ پڑھی۔ جس وقت امام نماز اور تسبیح سے فارغ ہوئے تو گھر کی طرف چل پڑے۔ میں آپ کے ساتھ تھا۔

آپؑ نے خادمہ کو آواز دی اور کہا :

خیال رکھنا، جو سائل ضرورت مند گھر کے دروازے سے گزرے اسے کھانا دینا کیونکہ آج جمعہ کا دن ہے۔

ابوحمزہ کہتے ہیں :

میں نے کہا : ہر وہ شخص جو مدد کا تقاضا کرتا ہے مستحق نہیں ہوتا، تو امام نے فرمایا :

ٹھیک ہے لیکن میں اس سے ڈرتا ہوں کہ ان میں مستحق افراد ہوں اور ہم انہیں غذا نہ دیں اور اپنے گھر کے دروازے سے دھتکار دیں تو کہیں ہمارے گھر والوں پر وہی مصیبت نہ آن پڑے جو یعقوبؑ اور آلِ یعقوب پر آن پڑی تھی۔

اس کے بعد فرمایا :

ان سب کو کھانا دو کہ (کیا تم نے سنا نہیں ہے کہ) یعقوبؑ کے لیے ہر روز ایک گوسفند ذبح کی جاتی تھی۔ اس کا ایک حصہ مستحقین کو دیا جاتا تھا۔ ایک حصہ وہ جناب خود اور ان کی اولاد کھاتے تھے ایک دن ایک سائل آیا۔ وہ مومن اور روزہ دار تھا۔ خدا کے ہاں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ وہ شہر (کنعان) سے گزرا۔ شب جمعہ تھی۔ افطار کے وقت وہ دروازۂ یعقوبؑ پر آیا اور کہنے لگا بچی کھچی غذا سے مدد کے طالب غریب و مسافر بھوکے مہمان کی مدد کرو۔ اس نے یہ بات کئی مرتبہ دہرائی انہوں نے سُنا تو سہی لیکن اس کی بات کو باور نہ کیا۔ جب وہ مایوس ہوگیا اور رات کی تاریکی ہر طرف چھا گئی تو وہ لوٹ گیا۔ جاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے بارگاہِ الٰہی میں بھوک کی شکایت کی۔ رات اس نے بھوک ہی میں گزاری اور صبح اسی طرح روزہ رکھا جبکہ وہ صبر کیے ہوئے تھا اور خدا کی حمد و ثنا کرتا تھا لیکن حضرت یعقوبؑ اور ان کے گھر والے مکمل طور پر سیر تھے اور صبح کے وقت ان کا کچھ کھانا بچا بھی رہ گیا تھا۔

امام نے اس کے بعد مزید فرمایا :

خدا نے اسی صبح یعقوبؑ کی طرف وحی بھیجی : اے یعقوب ! تُو نے میرے بندے کو خوار کیا ہے اور میرے غضب کو ابھارا ہے اور تُو اور تیری اولاد نزولِ سزا کی مستحق ہو گئی ہے ۔ اے یعقوب ! میں اپنے دوستوں کو زیادہ جلدی سرزنش کرتا اور سزا دیتا ہوں اور یہ اس لیے کہ میں ان سے محبت کرتا ہوں ۔[1]

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اس حدیث کے بعد ہے کہ ابو حمزہ ثمالی کہتے ہیں :

مَیں نے امام سجادؑ سے پوچھا ، کہ یوسفؑ نے وہ خواب کس موقع پر دیکھا تھا ؟

امام نے فرمایا : اسی رات ۔[2]

اس حدیث سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء و اولیائے حق سے ایک چھوٹی سی لغزش یا زیادہ صریح الفاظ میں ایک " ترکِ اولیٰ " کہ جو گناہ اور معصیت بھی شمار نہیں ہوتا تھا (کیونکہ اس سائل کی حالت حضرت یعقوب علیہ السلام پر واضح نہیں تھی) بعض اوقات خدا کی طرف سے ان کی تنبیہ کا سبب بنتا ہے اور یہ صرف اس لیے ہے کہ ان کا بلند و بالا مقام تقاضا کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات اور عمل کی طرف متوجہ رہیں کیونکہ

حسنات الابرار سیئات المقربین

وہ کام جو نیک لوگوں کے لیے نیکی شمار ہوتے ہیں مقربینِ بارگاہِ الٰہی کے لیے برائی ہیں ۔

جہاں حضرت یعقوبؑ ایک سائل کے دردِ دل سے بے خبر رہنے کی وجہ سے یہ رنج و غم اٹھائیں تو ہمیں سوچنا چاہیئے کہ وہ معاشرہ جس میں چند لوگ سیر ہوں اور زیادہ تر لوگ بھوکے ہوں کیسے ممکن ہے کہ اس پر غضبِ الٰہی نہ ہو اور کس طرح خدا اسے سزا نہ دے ۔

۲ ۔ **حضرت یوسفؑ کی دلکش دُعا :** روایاتِ اہلِ بیتؑ اور طرقِ اہلِ سنت میں ہے کہ جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کنویں کی تہ میں پہنچ گئے تو ان کی امید ہر طرف سے منقطع ہو گئی اور ان کی تمام تر توجہ ذاتِ پاکِ خدا کی طرف ہو گئی ۔ انہوں نے اپنے خدا سے مناجات کی اور جبرئیل کی تعلیم سے راز و نیاز کرنے لگے کہ جو روایات میں مختلف عبارتوں میں منقول ہے ۔

ایک روایت میں ہے کہ آپؑ نے خدا سے یوں مناجات کی :

اللّٰھم یا مونس کل غریب و یا صاحب کل وحید و یا ملجأ کل خائف و یا کاشف کل کربۃ و یا عالم کل نجوی و یا منتھی کل شکوی و یا حاضر کل ملاء یا حی یا قیوم اسئلک ان تقذف رجائک فی قلبی حتی لا یکون لی ھم و لا شغل غیرک و ان تجعل لی من امری فرجاً و مخرجاً انک علی کل شیء قدیر ۔

---

[1] ، [2] تفسیر برہان ج ۲ ص ۲۴۳ اور نور الثقلین ج ۲ ص ۴۱۱ ۔

بارالٰہا! اے وہ جو غریب مسافر کا مونس ہے اور تنہا کا ساتھی ہے۔ اے وہ جو ہر خائف کی پناہ گاہ ہے، ہر غم کو برطرف کرنے والا ہے، ہر فریاد سے آگاہ ہے، ہر شکایت کرنے والے کی آخری امید ہے اور ہر مجمع میں موجود ہے۔ اے حی! اے قیوم! (اے زندہ! اے ساری کائنات کے نگران!) میں تجھ سے چاہتا ہوں کہ اپنی امید میرے دل میں ڈال دے تاکہ تیرے علاوہ کوئی فکر نہ رکھوں اور تجھ سے چاہتا ہوں کہ میرے لیے اس عظیم مشکل سے راہِ نجات پیدا کر دے کہ تُو ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ امر جاذب نظر ہے کہ اس حدیث کے ذیل میں ہے کہ فرشتوں نے حضرت یوسفؑ کی آواز سُنی تو عرض کیا:

الٰھنا نسمع صوتاً و دعاء: الصوت صوت صبی والدعاء دعاء نبی!

پروردگارا! ہم آواز اور دعا سن رہے ہیں۔ آواز تو بچے کی ہے لیکن دعا نبی کی ہے [1]

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ جس وقت حضرت یوسف کے بھائیوں نے انہیں کنوئیں میں پھینکا تو ان کا کُرتہ اتار لیا اور ان کا بدن برہنہ ہوگیا تو یوسف نے بہت داد و فریاد کی کہ کم از کم میرا کُرتہ تو مجھے دے دو تاکہ اگر میں زندہ رہوں تو میرا بدن ڈھانپے اور اگر مر جاؤں تو میرا کفن ہو۔ بھائی کہنے لگے: اسی سورج، چاند اور ستاروں سے کہ جنہیں خواب میں دیکھا تھا تقاضا کرو کہ اس کنوئیں میں تیرے مونس و غمخوار ہوں اور تجھے لباس پہنائیں۔

حضرت یوسفؑ جب غیر خدا سے مطلقاً ناامید ہو گئے تو مذکورہ بالا دعا کی [2]

امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

جب انہوں نے یوسف کو کنوئیں میں پھینکا تو جبرائیل ان کے پاس آئے اور کہا: بچے! یہاں کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: بھائیوں نے مجھے کنوئیں میں پھینک دیا ہے۔

جبرائیل کہنے لگے: کیا تم کنوئیں سے باہر نکلنا چاہتے ہو؟

وہ کہنے لگے: خدا کی مرضی ہے، اگر وہ چاہے گا تو مجھے باہر نکال لے گا۔

جبرائیل نے کہا: خدا نے حکم دیا ہے کہ یہ دُعا پڑھو تاکہ باہر آجاؤ۔

انہوں نے کہا: کونسی دعا؟

جبرائیل نے کہا: کہو:

اللّٰھم انی اسئلک بان لک الحمد لا الٰہ الا انت المنان، بدیع السمٰوٰت والارض، ذوالجلال والاکرام، ان تصلی علی محمد و آل محمد و ان تجعل لی مما انا فیہ فرجاً و مخرجاً۔

---

[1] و [2] تفسیر قرطبی ج ۵ ص ۳۳۴۳

پروردگارا! میں تجھ سے دعا کرتا ہوں، اسے کہ حمد و تعریف تیرے لیے ہے، تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں، تُو ہے جو بندوں کو نعمت بخشتا ہے، آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، صاحب جلال و اکرام ہے۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ محمد و آل محمد پر درود بھیج اور جس میں میں ہوں اس سے مجھے کشائش و نجات عطا فرما۔[1]

کوئی مانع نہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ دونوں دعائیں کی ہوں۔

۳۔ "واجمعوا ان یجعلوہ فی غیابت الجب" کا مفہوم: یعنی — انہوں نے اتفاق کیا کہ اسے کنویں کی مخفی جگہ پر ڈال دیں۔ یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے حضرت یوسفؑ کو کنویں میں پھینکا نہیں تھا بلکہ نیچے لے گئے تھے۔ کنویں کی تہ میں جہاں ایک چبوترا سا نیچے جانے والوں کے لیے بنایا جاتا ہے اور سطح آب کے قریب ہوتا ہے انہوں نے حضرت یوسفؑ کی کمر میں طناب ڈال کر وہاں تک پہنچایا اور وہاں چھوڑ دیا۔ مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں جو متعدد روایات وارد ہوئی ہیں وہ بھی اس مطلب کی تائید کرتی ہیں۔

۴۔ تسویلِ نفس سے کیا مراد ہے؟: لفظ "سوّلت" "تسویل" کے مادہ سے "تزئین" کے معنی میں ہے۔ بعض اوقات اس کا معنی "ترغیب" اور بعض اوقات "وسوسہ پیدا کرنا" بھی بیان کیا جاتا ہے۔ ان تمام معانی کی بازگشت تقریباً ایک ہی مفہوم کی طرف ہے یعنی تمہاری نفسانی خواہشات نے تمہارے لیے یہ کام مزین کر دیا ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جس وقت سرکش ہوا و ہوس انسانی روح اور فکر پر غلبہ کر لیتی ہے تو بدترین جرائم مثلاً بھائی کو قتل کرنا یا جلا وطن کرنا وغیرہ بھی انسان کی نظر میں ایسے پسندیدہ ہو جاتے ہیں کہ وہ انہیں ایک مقدس اور ضروری چیز خیال کرنے لگتا ہے۔ یہاں سے نفسیاتی مسائل کی ایک گہری بنیاد کی طرف دریچہ کھلتا ہے وہ یہ کہ ہمیشہ کسی ایک مسئلے کی طرف افراطی میلان خصوصاً جب اس میں اخلاقی رذائل بھی شامل ہوں انسان کی قوتِ شناخت پر پردہ ڈال دیتا ہے اور اس کی نظر میں حقائق کو الٹ کر پیش کرتا ہے۔

اسی لیے تہذیب نفس کے بغیر فیصلہ کرنا اور عینی حقائق کو پہچاننا ممکن نہیں ہے اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ قاضی کے لیے عدالت شرط ہے تو اس کی دلیل یہی ہے اور قرآن مجید میں سورہ بقرہ کی آیہ ۲۸۲ بھی اسی طرف اشارہ ہے، جس میں فرمایا گیا ہے:

"وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ"

اور تقویٰ اختیار کرو خدا تمہیں علم و دانش دے گا۔

۵۔ دروغ گو حافظہ ندارد: حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ بھائیوں کے سلوک کی داستان سے یہ مشہور حقیقت پھر درجۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ جھوٹا آدمی ہمیشہ کے لیے اپنا راز نہیں چھپا سکتا کیونکہ عینی حقائق جب خارجی وجود حاصل کر لیتے ہیں تو دیگر امور کے ساتھ ان کے بے شمار روابط ہوتے ہیں اور جھوٹا آدمی جو اپنے

---

[1] نور الثقلین ج ۲ ص ۴۱۶۔

جھوٹ کے ذریعے ایک غلط منظر تخلیق کرنا چاہتا ہے تو وہ جس قدر بھی زیرک و ہوشیار ہو ان تمام روابط کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ بالفرض اگر وہ مسئلہ سے متعلق چند جعلی رابطے تیار بھی کرلے پھر بھی یہ بناوٹی رابطے حافظے میں ہمیشہ کیلئے رکھنا آسان کام نہیں ہے اور اس سے تھوڑی غفلت تضاد بیانی کا سبب بن جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ان میں سے بہت سے روابط غفلت میں رہ جاتے ہیں اور انہی سے آخرکار حقیقت فاش ہو جاتی ہے۔ اور یہ ان تمام افراد کے لیے ایک درس ہے جنہیں اپنی عزت و آبرو عزیز ہے کہ وہ کبھی جھوٹ کا طواف نہ کریں، اپنی معاشرتی حیثیت کو خطرے میں نہ ڈالیں اور اپنے لیے خدا کا غضب نہ خریدیں۔

۶۔ صبر جمیل کیا ہے؟ سخت حوادث اور سنگین طوفانوں کے مقابلے میں پامردی و شکیبائی انسان کی روحانی عظمت اور بلند شخصیت کی نشانی ہے، ایسی عظمت کہ جس میں عظیم حادث سما جاتے ہیں لیکن انسان ڈگمگاتا اور لرزتا نہیں۔

ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا چھوٹے سے تالاب کے پانی کو ہلا دیتا ہے لیکن بحراوقیانوس جیسے بڑے سمندروں میں بڑے بڑے طوفان آرام سے سما جاتے ہیں اور انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

بعض اوقات انسان ظاہراً پامردی و شکیبائی دکھاتا ہے لیکن بعد میں چبھنے والی باتیں کرتا ہے کہ جو ناشکری اور عدم برداشت کی نشانی ہے۔ اس طرح وہ خود اپنے صبر و تحمل کا چہرہ بدنما کر دیتا ہے لیکن باایمان، قوی الارادہ اور عالی ظرف وہ لوگ ہیں کہ ایسے حوادث میں جن کا پیمانۂ صبر لبریز نہیں ہوتا اور ان کی زبان پر کوئی ایسی بات نہیں آتی کہ جو ناشکری، کفران، بے تابی اور جزع و فزع کی مظہر ہو۔ ان کا صبر "صبر زیبا" اور "صبر جمیل" ہے۔

اس وقت یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس سورہ کی دوسری آیات میں ہم پڑھتے ہیں کہ حضرت یعقوبؑ نے اس قدر گریہ اور غم کیا کہ ان کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ کیا یہ بات صبر جمیل کے منافی نہیں؟

اس سوال کا جواب ایک جملے میں دیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ مردانِ خدا کا دل احساسات اور عواطف کا مرکز ہوتا ہے۔ مقام تعجب نہیں کہ بیٹے کے فراق میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑے۔ یہ ایک حساس مسئلہ ہے۔ اہم یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر ضبط رکھیں یعنی کوئی بات اور کوئی حرکت رضائے الٰہی کے خلاف نہ کریں۔ اسلامی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پیغمبر اسلامؐ اپنے بیٹے ابراہیم کی موت پر آنسو بہا رہے تھے تو اتفاقاً یہی اعتراض آپؐ پر کیا گیا کہ آپ ہمیں رونے سے منع کرتے ہیں لیکن آپ خود آنسو بہاتے ہیں تو پیغمبر اکرمؐ نے جواب میں فرمایا:

> آنکھیں روتی ہیں اور دل غم زدہ ہوتا ہے لیکن ہم کوئی ایسی بات نہیں کرتے جو خدا کو ناراض کردے۔

حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

> تدمع العین و یحزن القلب ولا نقول ما یسخط الرب۔

ایک اور حدیث میں یہ الفاظ ہیں :

لیس هٰذا بكاء ان هٰذا رحمة۔

یہ (بے تابی کا) گریہ نہیں ہے یہ تو (جذبات کا اظہار اور) رحمت ہے۔[1]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے سینے میں دل ہے پتھر نہیں اور فطری امر ہے کہ جن معاملات کا تعلق دل کے جذبات سے ہو ان پر وہ ردّ عمل تو کرتا ہے اور اس کا سادہ ترین اظہار آنکھوں سے اشک رواں ہوتا ہے۔ یہ عیب نہیں ہے بلکہ یہ تو حسن ہے۔ عیب یہ ہے کہ انسان ایسی بات کرے جس سے خدا غضب ناک ہو۔

---

[1] بحار طبع جدید، ج ۲۲ ص ۱۵۰ و ص ۱۵۱۔

(۱۹) وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ ۖ قَالَ يَا بُشْرَىٰ هَٰذَا غُلَامٌ ۚ وَأَسَرُّوهُ بِضَاعَةً ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ○

(۲۰) وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ ۚ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ○

ترجمہ

(۱۹) اور قافلہ آپہنچا (انہوں نے) پانی پر مامور (شخص کو پانی کی تلاش) کو بھیجا۔ اس نے اپنا ڈول کنویں میں ڈالا اور وہ پکارا: خوشخبری ہو، یہ لڑکا ہے (خوبصورت اور قابلِ محبت) انہوں نے اسے ایک سرمایہ سمجھتے ہوئے دوسروں سے مخفی رکھا اور جو کچھ وہ انجام دیتے تھے خدا اس سے آگاہ ہے۔

(۲۰) اور انہوں نے اسے چند درہموں کی معمولی قیمت پر بیچ دیا اور (اسے بیچتے ہوئے) وہ اس کے بارے میں بے اعتناء تھے (کیونکہ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں ان کا راز فاش نہ ہو جائے)۔

تفسیر

سرزمینِ مصر کی جانب

یوسفؑ نے کنویں کی وحشت ناک تاریکی اور ہولناک تنہائی میں بہت تلخ گھڑیاں گزاریں لیکن خدا پر ایمان اور ایمان کے زیرِ سایہ ایک اطمینان نے ان کے دل میں نورِ امید کی کرنیں روشن کر دی تھیں اور انہیں ایک توانائی بخشی تھی تاکہ وہ اس ہولناک تنہائی کو برداشت کریں اور آزمائش کی اس بھٹی سے کامیابی کے ساتھ

نکل آئیں۔ اس حالت میں وہ کتنے دن رہے، یہ خدا جانتا ہے۔ بعض مفسرین نے تین دن لکھے ہیں اور بعض نے دو دن، بہرحال "ایک قافلہ آپہنچا" (وجاءت سیارۃ) [1]

اور اس قافلے نے وہیں نزدیک ہی پڑاؤ ڈالا۔ واضح ہے کہ قافلے کی پہلی ضرورت یہی ہوتی ہے کہ وہ پانی حاصل کرے۔ اس لیے انہوں نے پانی پر مامور شخص کو پانی کی تلاش میں بھیجا" (فارسلوا واردھم) [2] اس نے اپنا ڈول کنویں میں ڈالا (فادلی دلوہ)۔

یوسف کنویں کی تہ میں سے متوجہ ہوتے کہ کنویں کے اوپر سے کوئی آواز آرہی ہے۔ ساتھ ہی دیکھا کہ ڈول اور رسی تیزی سے نیچے آرہی ہے۔ انہوں نے موقع غنیمت جانا اور اس عطیۂ الٰہی سے فائدہ اٹھایا اور فوراً اس سے لپٹ گئے۔ بہشتی [3] نے محسوس کیا کہ اس کا ڈول اندازے سے زیادہ بھاری ہے۔ جب اس نے زور لگا کر اسے اوپر کھینچا تو اچانک اس کی نظر ایک چاند سے بچے پر پڑی۔ وہ چلایا: خوشخبری ہو! یہ تو پانی کی بجائے بچہ ہے (قال یابشری ھذا غلام)۔

آہستہ آہستہ قافلے میں سے چند لوگوں کو اس بات کا پتہ چل گیا لیکن اس بناء پر کہ دوسروں کو پتہ نہ چلے اور یہ خود ہی مصر میں اس خوبصورت بچے کو ایک غلام کے طور پر بیچ دیں۔ اسے انہوں نے ایک اچھا سرمایہ سمجھتے ہوئے دوسروں سے مخفی رکھا" (واسروہ بضاعۃ) [4]

البتہ اس جملے کی تفسیر کے بارے میں کچھ اور احتمال بھی ذکر کیے گئے ہیں:

ایک یہ ہے کہ یوسف جن کے ہاتھ لگا انہوں نے اس کا کنویں سے ملنا مخفی رکھا اور کہا کہ یہ سرمایہ ہمیں کنویں کے مالکوں نے دیا ہے تاکہ اسے ان کے لیے مصر میں بیچ دیں۔

دوسرا یہ کہ یوسف کے بعض بھائی جو اس کی خبر لینے کے لیے یا اسے غذا دینے کے لیے کبھی کبھی کنویں کے پاس آیا کرتے تھے جب انہیں اس واقعے کا پتہ چلا تو انہوں نے اس بات کو چھپایا کہ یوسف ان کا بھائی ہے۔ صرف یہ کہا کہ یہ ہمارا غلام ہے جو بھاگ آیا ہے اور یہاں چھپا بیٹھا ہے اور انہوں نے یوسف کو دھمکی دی کہ

---

[1] کاروان کو "سیارۃ" اس لیے کہتے ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے۔

[2] "وارد" پانی لانے والے کے معنی میں ہے۔ اصل میں یہ لفظ "ورود" سے لیا گیا ہے جس کا معنی جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے پانی کا قصد کرنا ہے اگرچہ بعد میں اس کے معنی میں وسعت پیدا ہوگئی اور ہر ورود و دخول کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔

[3] "بہشتی" اُردو میں پانی بھرنے والے کو کہتے ہیں۔ (مترجم)

[4] "بضاعۃ" اصل میں "بضع" (بروزن "قذر") کے مادہ سے گوشت کے ایک ٹکڑے کے معنی میں ہے کہ جسے جدا کر لیا جائے۔ بعد ازاں اس معنی میں وسعت پیدا ہوگئی اور یہ لفظ مال اور سرمائے کے اہم حصے کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔ "بضعۃ" بدن کے ٹکڑے کے معنی میں ہے اور "حسن البضع" موٹے اور پُرگوشت انسان کے معنی میں آیا ہے اور "بضع" (بروزن "حزب") تین سے لے کر دس تک کے عدد کے معنی میں آیا ہے۔

اصل معاملے سے پردہ اٹھائے گا تو قتل کر دیا جائے گا۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

آیت کے آخر میں ہے: جو کچھ وہ انجام دیتے ہیں خدا اس سے آگاہ ہے (واللّٰہ علیم بما یعملون)۔

آخرکار انہوں نے یوسفؑ کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ دیا (وشروہ بثمن بخس دراھم معدودۃ)۔

یوسفؑ کو بیچنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض انہیں یوسف کے بھائی سمجھتے ہیں۔ لیکن آیات کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ یہ کام قافلے والوں نے کیا۔ کیونکہ زیر نظر آیات میں بھائیوں کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی اور ان سے قبل کی آیت کے اختتام پر بھائیوں سے متعلق بحث ختم ہو گئی ہے اور جمع کی ضمیریں "ادسلوا"، "اسروہ" اور "شروہ" سب ایک ہی طرف لوٹتی ہیں (یعنی۔ قافلے والے)۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انہوں نے حضرت یوسفؑ کو تھوڑی سی قیمت پر کیوں بیچ دیا۔ قرآن نے اسے "بثمن بخس" سے تعبیر کیا ہے کیونکہ حضرت یوسفؑ کم از کم ایک قیمتی غلام سمجھے جاسکتے تھے۔

لیکن یہ معمول کی بات ہے کہ ہمیشہ چور یا ایسے افراد جن کے ہاتھ کوئی اہم سرمایہ بغیر کسی زحمت کے آجاتے تو وہ اس خوف سے کہ کہیں دوسروں کو معلوم نہ ہو جائے اسے فوراً بیچ دیتے ہیں اور یہ فطری بات ہے کہ اس جلد بازی میں وہ زیادہ قیمت حاصل نہیں کر سکتے۔

"بخس" اصل میں کسی چیز کو ظلم کے ساتھ کم کرنے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے:

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ

لوگوں کی چیزوں کو ظلم کے ساتھ کم نہ کرو (ہود۔ ۸۵)۔

اس بارے میں کہ انہوں نے حضرت یوسفؑ کو کتنے داموں میں بیچا اور پھر یہ رقم آپس میں کس طرح تقسیم کی اس سلسلے میں بھی مفسرین میں اختلاف ہے بعض نے یہ رقم ۲۰ درہم، بعض نے ۲۲ درہم، بعض نے ۴۰ درہم اور بعض نے ۱۸ درہم لکھی ہے اور اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ بیچنے والوں کی تعداد دس بیان کی جاتی ہے، اس ناچیز رقم میں سے ہر ایک کا حصہ واضح ہو جاتا ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یوسف کو بیچنے کے بارے میں وہ بے اعتنا تھے (وکانوا فیہ من الزاھدین)۔ یہ جملہ درحقیقت گزشتہ جملے کی علت بیان کرنے کے لیے ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر انہوں نے یوسف کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ دیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے اور اسکے بارے میں بے اعتنا تھے۔

ایسا یا اسلیے تھا کہ یوسفؑ کو قافلے والوں نے بے مول لیا تھا اور انسان جو چیز معمولی قیمت پر لے عموماً کم قیمت پر ہی بیچتا ہے اور یا وہ ڈرتے تھے کہ مبادا ان کا راز فاش ہو اور کوئی مدعی پیدا ہو جائے اور یا اس بنا پر کہ انہیں یوسفؑ میں غلام ہونے کی نشانیاں نظر نہیں آتی تھیں بلکہ آزادی اور حریت کے آثار ان کے چہرے سے ہویدا تھے۔ اسی بنا پر بیچنے والے ان میں کوئی دلچسپی رکھتے تھے نہ خریدار۔

(۲۱) وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا ۚ وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۚ وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ○

(۲۲) وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ○

ترجمہ

(۲۱) اور وہ شخص جس نے اسے سرزمین مصر سے خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا: اس کے مقام و منزلت کی تکریم کرنا شاید ہمارے لیے مفید ہو اور یا ہم اسے بیٹے کے طور پر اپنالیں اس طرح ہم نے یوسف کو اس سرزمین میں متمکن کر دیا، (ہم نے یہ کام کیا) تاکہ وہ خواب کی تعبیر سیکھ لے خدا اپنے کام پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(۲۲) اور جب وہ بلوغ و قوت کے مرحلے میں داخل ہوا تو ہم نے اسے "حکم" اور "علم" عطا کیے اور ہم اس طرح نیک لوگوں کو جزاء دیتے ہیں۔

تفسیر

عزیزِ مصر کے محل میں

حضرت یوسف کی بھرپور داستان جب یہاں پہنچی کہ بھائی انہیں کنویں میں پھینک چکے تو بہر صورت

بھائیوں کے ساتھ والا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اب اس ننھے بچے کی زندگی کا ایک نیا مرحلہ مصر میں شروع ہوا۔ اس طرح سے کہ آخرکار یوسف مصر لائے گئے۔ وہاں انہیں فروخت کے لیے پیش کیا گیا۔ چونکہ یہ ایک نفیس تحفہ تھا لہذا معمول کے مطابق "عزیز مصر" کو نصیب ہوا کہ جو درحقیقت فرعون کی طرف سے وزیر یا وزیر اعظم تھا۔ اور ایسے ہی لوگ "تمام پہلوؤں سے ممتاز اس غلام" کی زیادہ سے زیادہ قیمت دے سکتے تھے۔ اب دیکھتے ہیں کہ عزیز مصر کے گھر یوسف پر کیا گزرتی ہے۔

قرآن کہتا ہے: جس نے مصر میں یوسف کو خریدا اس نے اپنی بیوی سے اس کی سفارش کی اور کہا کہ اس غلام کی منزلت کا احترام کرنا اور اسے غلاموں والی نگاہ سے نہ دیکھنا کیونکہ ہمیں امید ہے کہ مستقبل میں ہم اس غلام سے بہت فائدہ اٹھائیں گے یا اسے فرزند کے طور پر اپنا لیں گے (وقال الذی اشترٰىہ من مصر لامراتہ اکرمی مثوٰىہ عسٰی ان ینفعنآ او نتخذہ ولدًا)۔[1]

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ عزیز مصر کی کوئی اولاد نہ تھی اور وہ بیٹے کے شوق میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ جب اس کی آنکھ اس خوبصورت اور آبرومند بچے پر پڑی تو اس کا دل آیا کہ یہ اس کے بیٹے کے طور پر ہو۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: اس طرح اس سرزمین میں ہم نے یوسف کو متمکن اور صاحب نعمت و اختیار کیا (وکذٰلک مکنا لیوسف فی الارض)۔

یہ "تمکین فی الارض" اس بنا پر تھا کہ یوسف کا مصر میں آنا اور خصوصاً عزیز مصر کی زندگی میں قدم رکھنا ان کی آئندہ کی انتہائی قدرت کے لیے تمہید تھا اور یا اس بنا پر تھا کہ عزیز مصر کے محل کی زندگی کا کنوئیں کی تہ کی زندگی سے کوئی موازنہ نہ تھا۔ وہ تنہائی، بھوک اور وحشت کی شدت کہاں اور یہ سب نعمت و آسائش اور آرام و سکون کہاں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے ایسا اس لیے کیا تاکہ اسے احادیث کی تاویل کی تعلیم دیں (ولنعلمہ من تأویل الاحادیث)۔

"تأویل الاحادیث" سے مراد، جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے تعبیر خواب کا علم ہے کہ جس کے ذریعے یوسف آئندہ کے اسرار کے اہم حصے سے آگاہ ہو سکتے تھے اور یا اس سے مراد وحی الٰہی ہے کیونکہ حضرت یوسف نے خدائی آزمائشوں کی سنگلاخ گھاٹیوں سے گزر کر دربار مصر میں پہنچنے تک ایسی قابلیت پیدا کر لی تھی کہ حامل رسالت و وحی ہوں۔

لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے: خدا اپنے کام پر مسلط اور غالب ہے، لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے (واللہ غالب علٰی امرہ ولٰکن اکثر الناس لایعلمون)۔

---

[1] "مثوا" کا معنی ہے مقام۔ یہ مادہ "ثوی" سے ہے جو اقامت کے معنی میں ہے لیکن یہاں حیثیت اور مقام و منزلت کے معنی میں ہے۔

خدا کے مظاہر قدرت میں سے ایک عجیب مظہر اور امور پر اس کا تسلط یوں ہے کہ بہت سے مواقع پر وہ انسان کی کامیابی اور نجات کے وسائل اس کے دشمنوں کے ہاتھوں فراہم کرتا ہے چنانچہ حضرت یوسف کے سلسلے میں اگر بھائیوں کا منصوبہ نہ ہوتا تو وہ ہرگز کنویں میں نہ جاتے اور اگر کنویں میں نہ گئے ہوتے تو مصر نہ آتے اور اگر مصر نہ آئے ہوتے تو زندان میں نہ جاتے اور نہ فرعون کے عجیب خواب کا معاملہ ان کے سامنے پیش ہوتا اور نہ ہی یوسف عزیز مصر بنتے۔

درحقیقت خدا نے بھائیوں کے ہاتھوں یوسف کو تخت قدرت پر بٹھایا اگرچہ وہ سمجھتے تھے کہ ہم نے اسے بدبختی کے کنویں میں پھینک دیا ہے۔

اس نئے ماحول میں جو درحقیقت مصر کا ایک اہم سیاسی مرکز تھا یوسف کو نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف خیرہ کن طاقت اور طاغوتیانِ مصر کے محلات (جنہیں خواب سمجھا جاتا) اور ان کی بے کراں ثروت کو دیکھتے ہوتے دوسری طرف بردہ فروشوں کے بازار کا منظر ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا۔ وہ ان دونوں کا موازنہ کرتے اور دیکھتے کہ عام لوگوں کی اکثریت فراواں رنج وغم اور دکھ درد کا شکار ہے، تو ان کی روح اور فکر پر بہت بوجھ پڑتا اور وہ سوچتے کہ اگر مجھے طاقت حاصل ہو جائے تو یہ کیفیت ختم کر دوں۔

جی ہاں! انہوں نے بہت سی چیزیں اس شور وغل کے ماحول میں سیکھیں۔ ان کے دل میں ہمیشہ غم و اندوہ کا ایک طوفان موجزن ہوتا تھا کیونکہ ان حالات میں وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے، اس دور میں وہ مسلسل خودسازی اور تہذیب نفس میں مشغول تھے۔

قرآن کہتا ہے: جب وہ بلوغ اور جسم و روح کے تکامل کے مرحلے میں پہنچا اور انوارِ وحی قبول کرنے کے قابل ہوگیا، تو ہم نے اسے حکم اور علم دیا (ولما بلغ اشدہ اٰتیناہ حکماً و علماً)۔

اور اس طرح ہم نیکوکار لوگوں کو جزا دیتے ہیں (وکذٰلک نجزی المحسنین)۔

"اشد" "شد" کے مادہ سے مضبوط گرہ کے معنی میں ہے۔ یہاں جسمانی اور روحانی استحکام کی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ "اشد" جمع ہے جس کا مفرد نہیں ہے لیکن بعض نے اسے "شد" (بروزن "سد") کی جمع کہا ہے۔ بہرحال اس کے معنی کا جمع ہونا قابل انکار نہیں ہے۔

یہ جو مذکورہ آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے یوسفؑ کی جسمانی و روحانی بلوغت پر اسے "حکم" اور "علم" عطا کیا یا تو مقام وحی و نبوت ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے اور یا "حکم" سے مراد عقل و فہم اور صحیح فیصلے کی قدرت ہے کہ جو ہوس پرستی اور اشتباہ سے خالی ہو اور "علم" سے مراد آگاہی اور دانش ہے کہ جس کے ساتھ جہالت نہ ہو۔ بہرحال "حکم" اور "علم" جو کچھ بھی تھے دو ممتاز اور قیمتی خدائی انعام تھے کہ جو خدا نے حضرت یوسف کو ان کی پاکیزگی تقویٰ، صبر و شکیبائی اور توکل کی وجہ سے دیئے تھے اور یوسف کی یہ تمام خوبیاں لفظ "محسنین" میں جمع ہیں۔

بعض مفسرین نے "حکم" اور "علم" کے بارے میں تمام تر احتمالات کو تین احتمالات کے طور پر ذکر کیا ہے:

۱۔ "حکم" مقام نبوت کی طرف اشارہ ہے (چونکہ پیغمبر برحق حاکم ہے) اور علم اشارہ ہے علم دین کی طرف۔

۲۔ "حکم" سرکش ہوا و ہوس کے مقابلے میں اپنے اوپر ضبط رکھنے کے معنی میں ہے کہ جو یہاں حکمت عملی کی طرف اشارہ ہے اور علم اشارہ ہے نظری حکمت (علم و دانش) کی طرف اور "حکم" کو "علم" پر اس لیے مقدم رکھا گیا ہے کہ انسان جب تک تہذیب نفس اور خود سازی نہ کرلے صحیح علم تک نہیں پہنچ سکتا۔

۳۔ حکم اس معنی میں ہے کہ انسان نفس مطمئنہ کے مقام پر پہنچ جائے اور اپنے اوپر کنٹرول حاصل کرے اس طرح کہ نفس امارہ اور وسوسہ پیدا کرنے والے نفس پر اسے کنٹرول حاصل ہو جائے اور علم سے مراد انوار قدسیہ اور فیض الٰہی کی شعاعیں ہیں کہ جو عالم ملکوت سے پاک انسان کے دل پر پڑتی ہیں[1]

چند اہم نکات

۱۔ عزیز مصر کا نام کیوں نہیں لیا گیا: زیر نظر آیات میں جاذب توجہ مسائل میں سے ایک یہ ہے کہ ان میں عزیز مصر کا نام نہیں لیا گیا فقط اتنا کہا گیا ہے کہ وہ شخص جس نے مصر سے یوسف کو خریدا لیکن آیت میں یہ بیان نہیں ہوا کہ یہ شخص کون تھا۔ آئندہ آیات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی دفعہ اس شخص کے منصب سے پردہ نہیں اٹھتا بلکہ تدریجاً اس کا تعارف کروایا گیا ہے مثلاً آیہ ۲۵ میں فرمایا گیا ہے:

والفیا سیدھا لدا الباب

جس وقت یوسف نے زلیخا کے عشق کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا اور بیرونی دروازے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا تو اس عورت کے شوہر کو اچانک دروازے پر دیکھا۔

جب ان آیات سے گزرتے ہوئے آیہ ۳۰ تک پہنچتے ہیں تو اس میں "امراۃ العزیز" (عزیز کی بیوی) کی تعبیر آئی ہے۔

یہ تدریجی بیان یا تو اس لیے ہے کہ قرآن اپنی سنت کے مطابق ہر بات کو ضروری مقدار کے مطابق بیان کرتا ہے جو کہ فصاحت و بلاغت کی نشانی ہے اور یا یہ کہ جیسے آج کل بھی ادبیات کا معمول ہے کہ ایک داستان بیان کرتے ہوئے اسے کسی سربستہ نکتے سے شروع کیا جاتا ہے تاکہ پڑھنے والے میں تجسس پیدا ہو اور اس کی پوری توجہ اس داستان کی طرف کھنچ جائے۔

۲۔ علم تعبیر خواب اور عزیز مصر کا محل: دوسرا سوال جو مذکورہ بالا آیات سے پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ علم تعبیر خواب اور عزیز مصر کے محل میں حضرت یوسفؑ کی موجودگی کا کیا ربط ہے کہ اس کی طرف "لنعلمہ" کی "لام"

۱۔ تفسیر کبیر، ج ۱۸ ص ۱۱۱

کہ جو لام غایت ہے کے ذریعے اشارہ کیا گیا ہے۔

لیکن اگر ہم اس نکتے کی طرف توجہ دیں تو ہو سکتا ہے مذکورہ سوال کا جواب واضح ہو جائے کہ خدا تعالیٰ بہت سی علمی نعمات و عنایات گناہ سے پرہیز اور سرکش ہُوا و ہوس کے مقابلے میں استقامت کی وجہ سے بخشتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ نعمات کہ جو دل کی نورانیت کا ثمرہ ہیں، ایک انعام ہیں کہ جو خدا اس قسم کے اشخاص کو بخشتا ہے۔

ابن سیرین تعبیرِ خواب جاننے میں بڑے مشہور ہیں۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ کپڑا بیچا کرتے تھے اور بہت ہی خوبصورت تھے۔ ایک عورت انہیں اپنا دل دے بیٹھی۔ بڑے حیلے بہانے کرکے انہیں اپنے گھر میں لے گئی اور دروازے بند کر لیے لیکن انہوں نے عورت کی ہوس کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کیا اور مسلسل اس عظیم گناہ کے مفاسد اس کے سامنے بیان کرتے رہے لیکن اس عورت کی ہوس کی آگ اس قدر سرکش تھی کہ وعظ و نصیحت کا پانی اسے نہیں بجھا سکتا تھا۔

ابن سیرین کو اس چنگل سے نجات پانے کے لیے ایک تدبیر سوجھی۔ وہ اٹھے اور اپنے بدن کو اس گھر میں موجود گندگی کی چیزوں سے اس طرح کثیف آلودہ اور نفرت انگیز کر لیا کہ جب عورت نے یہ منظر دیکھا تو ان سے متنفر ہو گئی اور انہیں گھر سے باہر نکال دیا۔

کہتے ہیں اس واقعے کے بعد ابن سیرین کو تعبیرِ خواب کے بارے میں بہت فراست نصیب ہوئی اور ان کی تعبیر سے متعلق کتابوں میں عجیب و غریب واقعات لکھے ہوتے ہیں کہ جو اس سلسلے میں ان کی گہری معلومات کی خبر دیتے ہیں۔

اس بنا پر ممکن ہے کہ یہ خاص علم و آگاہی حضرت یوسف کو عزیزِ مصر کی بیوی کی انتہائی قوتِ جذب کے مقابلے میں نفس پر کنٹرول رکھنے کی بنا پر حاصل ہوئی ہو۔

علاوہ ازیں اس زمانے میں بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار تعبیرِ خواب بیان کرنے والوں کے مرکز تھے اور یوسف جیسا ذہین نوجوان عزیزِ مصر کے دربار میں دوسروں کے تجربات سے آگاہی اور علمِ الٰہی سے فیض حاصل کرنے کے لیے روحانی طور پر تیار ہو سکتا تھا۔

بہرحال یہ نہ پہلا موقع ہے نہ آخری کہ خدا نے جہادِ نفس کے میدان میں سرکش ہُوا و ہوس پر کامیابی حاصل کرنے والے اپنے مخلص بندے کو علوم و دانش کی ایسی نعمات و عنایات سے نوازا ہو کہ جنہیں کسی مادی ترازو سے نہیں تولا جا سکتا۔ مشہور حدیث ہے:

العلم نور یقذفہ اللہ فی قلب من یشاء

علم نور ہے خدا جس کے دل میں چاہتا ہے ڈالتا ہے۔

یہ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ یہ وہ علم و دانش نہیں جو استاد کے سامنے زانوئے تلمذ

تہ کرکے حاصل کی جائے یا کسی کو بغیر کسی حساب کتاب کے مل جاتے ۔ یہ تو انعامات ہیں، جہاد بالنفس میں سبقت لے جانے والوں کے لیے۔

۲۔ **"بلوغ اشد" کیا ہے؟** ہم کہہ چکے ہیں کہ "اشد" استحکام اور جسمانی و روحانی قوت کے معنی میں ہے اور "بلوغ اشد" اس مرحلے تک پہنچنے کے معنی میں ہے لیکن قرآن مجید میں اس کا اطلاق عمر انسانی کے مختلف مراحل پر ہوا ہے۔

بعض اوقات یہ "سن بلوغ" کے معنی میں آیا ہے۔ مثلاً ہم پڑھتے ہیں:

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ

یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ سوائے احسن طریقے سے، جب تک کہ وہ حدِ بلوغ کو نہ پہنچ جائے۔ (بنی اسرائیل ـ ۳۴)

کبھی چالیس سال کی عمر تک پہنچنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، مثلاً:

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً

یہاں تک کہ بلوغ اشد کے مرحلے تک پہنچا اور چالیس سال کا ہوگیا۔ (احقاف ـ ۱۵)

اور کبھی یہ لفظ بڑھاپے سے قبل کے مرحلے کے لیے آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا

اس کے بعد خدا تمہیں عالم جنین سے بچوں کی شکل میں باہر نکالتا ہے پھر تم جسم و روح کے استحکام کے مرحلے میں پہنچ جاتے ہو اس کے بعد بڑھاپے کے مرحلے میں۔ (المومن ـ ۶۷)

تعبیرات کا یہ فرق ہو سکتا ہے اس بناء پر ہو کہ روح و جسم کے استحکام کے لیے انسان کئی مراحل طے کرتا ہے اور بلاشبہ ان میں سے ہر مرحلہ ایک حدِ بلوغ ہے اور چالیس سال کی عمر کہ جس میں عام طور پر فکر و عقل پختہ ہوتی ہے دوسرا مرحلہ ہے اور اسی طرح انسان کی عمر ڈھلنے لگے اور وہ کمزوری کی طرف مائل ہو تو یہ ایک اور مرحلہ ہے۔ لیکن بہر حال زیر بحث آیت جسمانی و روحانی بلوغ کے بارے میں ہے کہ جو حضرت یوسفؑ میں جوانی کی ابتداء ہی میں پیدا ہوگیا تھا۔ اس سلسلے میں فخرالدین رازی نے ایک بات کی ہے جو ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں:

چاند کی گردش کی مدت (جس میں وہ محاق تک پہنچتا ہے) ۲۸ دن ہے۔ جب اسے چار حصوں میں تقسیم کریں تو ہر حصہ ۷ دن کا بنتا ہے (جس سے ایک ہفتہ بنتا ہے)۔

اسی لیے دانشمندوں نے بدن انسانی کے حالات کو سات سات سال پر مشتمل چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا دور اس وقت کا ہے جب انسان پیدا ہوتا ہے تو ضعیف و ناتواں ہوتا ہے نہ جسم

کے لحاظ سے بھی اور روح کے لحاظ سے بھی، لیکن جب وہ سات سال کا ہو جاتا ہے تو اس میں فکر و ہوش اور قوتِ جسمانی کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔

دوسرا مرحلہ سات سال مکمل ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے اور انسان اپنا تکامل و ارتقاء جاری رکھتا ہے یہاں تک کہ پیچھے بعد دیگرے چودہ سال پورے ہو جاتے ہیں۔

تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے تو پندرہ سال کی عمر میں وہ جسمانی اور روحانی بلوغ کے مرحلے میں پہنچتا ہے۔ اس میں جنسی شہوت حرکت میں آتی ہے اور (پندرہ سال کی تکمیل پر) وہ مکلف ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اپنا تکامل و ارتقاء جاری رکھتا ہے یہاں تک کہ تیسرا دور ختم ہو جاتا ہے۔

چوتھا دور ختم ہونے اور ۲۰ سال کی مدت پوری ہونے پر جسمانی رشد و نمو کی مدت ختم ہو جاتی ہے اور انسان ایک نئے مرحلے میں داخل ہوتا ہے۔

یہ نیا مرحلہ توقف کا مرحلہ ہے اور یہی "بلوغِ اشد" کا زمانہ ہے اور یہ حالتِ توقف پانچویں دور کے اختتام یعنی ۳۵ سال تک جاری رہتی ہے (اور اس کے بعد تنزل کا دور شروع ہو جاتا ہے)[1]

مندرجہ بالا تقسیم اگرچہ ایک حد تک قابلِ قبول ہے لیکن دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اوّل تو مرحلۂ بلوغ دوسرے دور کے اختتام پر نہیں ہے۔ اسی طرح رشدِ جسمانی کی انتہا، جیسا کہ آج کل کے ماہرینِ فن کہتے ہیں، ۲۵ سال ہے اور بعض روایات کے مطابق مکمل فکری بلوغ ۴۰ سال میں ہوتا ہے۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر جو کچھ سطورِ بالا میں کہا گیا ہے ایک ایسا ہمہ گیر قانون شمار نہیں ہوتا جو سب اشخاص پر صادق آئے۔

۴۔ نعماتِ الٰہی انبیاء کو بھی حساب کتاب سے ملتی ہے: آخری نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ ضروری ہے یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں جس وقت قرآن حضرت یوسفؑ کو علم و حکمت دینے کے بارے میں بات کرتا ہے تو کہتا ہے: "ہم اس طرح نیکوکاروں کو جزا دیتے ہیں" یعنی نعماتِ الٰہی انبیاء تک کو بغیر کسی حساب کتاب کے نہیں ملتیں اور ہر شخص کو اس کی نیکوکاری اور اچھائی کی مقدار کے مطابق فیضِ الٰہی کے بحرِ بے کراں سے فیض ملتا ہے اور وہ اسی حساب سے اس سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسفؑ کو ان تمام مشکلات کے مقابلے میں صبر و استقامت کرنے کی وجہ سے وافر حصہ نصیب ہوا۔

---

[1] تفسیر فخر رازی، ج ۱۸ ص ۱۱۱

(۲۳) وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۚ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۚ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ○

(۲۴) وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۚ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۚ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ○

ترجمہ

(۲۳) اور جس عورت کے گھر میں یوسف رہتا تھا اُس نے اُس سے اپنے مطلب کے حصول کی خواہش کی اور دروازے بند کر دیئے اور کہا کہ اس چیز کی طرف جلدی آؤ جو تمہارے لیے مہیا ہے۔ (یوسف نے) کہا: میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں وہ (عزیز مصر) میرا صاحب نعمت ہے اور اس نے مجھے محترم جانا (تو کیا ممکن ہے کہ میں اس پر ظلم کروں اور اس سے خیانت کروں)، یقیناً ظالم کامیاب نہیں ہوں گے اور فلاح نہیں پائیں گے۔

(۲۴) اُس عورت نے تو یہ ارادہ کیا اور وہ بھی اگر پروردگار کی برہان نہ دیکھتا تو ارادہ کرتا۔ ہم نے ایسا اس لیے کیا تاکہ بدی اور فحشاء کو اس سے دُور رکھیں کیونکہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔

تفسیر

عزیز مصر کی بیوی کا عشق سوزاں

حضرت یوسف نے اپنے خوبصورت، پرکشش اور ملکوتی چہرے سے نہ صرف عزیز مصر کو اپنی طرف جذب کر لیا بلکہ عزیز کی بیوی بھی بہت جلد آپ کی گرویدہ ہو گئی۔ آپ کا عشق اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اس عشق کی حدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا لیکن یوسف کہ جو پاکیزہ اور پرہیزگار انسان تھے انہیں خدا کے علاوہ کسی کی کوئی فکر اور سوچ نہ تھی۔ ان کا دل فقط عشق الٰہی کا گرویدہ تھا۔

پھر اور امور بھی شامل ہو گئے جنہوں نے عزیز کی بیوی کے عشق سوزاں کو اور بھڑکا دیا۔

ایک تو اسے اولاد نہ ہونے کا ارمان تھا، دوسرا اس کی رنگینیوں سے بھرپور اشراف کی زندگی تھی، تیسرا داخلی زندگی میں اسے کوئی پریشانی اور مسئلہ نہ تھا جیسا کہ اشراف اور ناز و نعمت میں پلنے والوں کی زندگی ہوتی ہے اور چوتھا دربار مصر میں کسی قسم کی کوئی پابندی اور قدغن نہ تھی۔ ان حالات میں وہ عورت کہ جو ایمان و تقویٰ سے بھی بے بہرہ تھی شیطانی وسوسوں کی موجوں میں غوطہ زن ہو گئی۔ یہاں تک کہ اس نے ارادہ کر لیا کہ اپنے دل کا راز یوسف سے بیان کرے اور اپنے دل کی تمنا ان سے پورا کرنے کا تقاضا کرے۔

اپنے مقصد کے حصول کی خاطر اس نے ہر ذریعہ اور ہر طور طریقہ اختیار کیا اور بڑی خواہش کے ساتھ کوشش کی کہ ان کے دل کو متاثر کرے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: جس عورت کے گھر یوسف تھے اس نے اپنی آرزو پوری کرنے کے لیے پیہم ان سے تقاضا کیا (وراودته التی هو فی بیتها عن نفسه)۔

"راودته" اصل میں "مراودہ" کے مادہ سے چراگاہ کی تلاش کے معنی میں ہے۔ مثل مشہور ہے:

الرائد لا یکذب قومه

جو چراگاہ کی تلاش میں جاتا ہے وہ اپنی قوم قبیلے سے جھوٹ نہیں بولتا۔

یہ بھی اسی مذکورہ معنی کی طرف اشارہ ہے۔

اسی طرح سرمہ سلائی کہ جس سے آنکھوں میں آرام آرام سے سرمہ لگاتے ہیں کو "مرود" (بروزن "منبر") کہا جاتا ہے۔

بعد ازاں یہ لفظ ہر اس کام کے لیے بولا جانے لگا جو نرمی، ملائمت اور آرام سے کیا جاتا ہے۔

یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ زوجۂ عزیز نے اپنا مقصود پانے کے لیے بڑی نرمی سے اور کسی قسم کی دھمکی کے بغیر ملائمت اور اظہار محبت سے یوسف کو دعوت دی۔

آخر کار جو آخری راستہ اسے نظر آیا یہ تھا کہ ایک دن انہیں تنہا اپنی خلوت گاہ میں پھنسا لے اور ان کے جذبات ابھارنے کے لیے تمام وسائل سے کام لے۔ جاذب ترین لباس پہنے، بہترین بناؤ سنگھار کرے

بہت مہک دار عطر لگائے اور اس طرح سے آرائش و زیبائش کرے کہ یوسفؑ جیسے قوی انسان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دے۔

قرآن کہتا ہے: اُس نے سارے دروازوں کو اچھی طرح بند کر لیا اور کہا آؤ میں تمہارے لیے حاضر ہوں (و غلقت الابواب و قالت ھیت لك)۔

لفظ۔ غلقت ۔ مبالغہ کا معنی دیتا ہے اور نشاندہی کرتا ہے کہ اس نے تمام دروازے مضبوطی سے بند کیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یوسفؑ کو محل کی ایسی جگہ پر لے گئی کہ جہاں کمروں کے اندر کمرے بنے ہوئے تھے اور جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے اس نے سات دروازے بند کیے تاکہ یوسفؑ کے لیے فرار کی کوئی راہ باقی نہ رہے۔

علاوہ ازیں شاید وہ اس طرح حضرت یوسفؑ کو سمجھانا چاہتی تھی کہ وہ راز فاش ہونے سے پریشان نہ ہوں کیونکہ ان بند دروازوں کے ہوتے ہوئے کسی شخص کے بس میں نہیں کہ وہ اندر آ سکے۔

جب حضرت یوسفؑ نے دیکھا کہ تمام حالات لغزش و گناہ کی حمایت میں ہیں اور ان کے لیے کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا تو انہوں نے زلیخا کو بس یہ جواب دیا: میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں (قال معاذ اللہ)۔

اس طرح حضرت یوسفؑ نے زوجۂ عزیز کی خواہش کو قطعی و حتمی طور پر رد کر دیا اور اسے سمجھایا کہ وہ ہرگز اس کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کریں گے۔ آپؑ نے ضمناً اسے اور تمام افراد کو یہ حقیقت سمجھا دی کہ ایسے سخت اور بحرانی حالات میں شیطانی وسوسوں اور ان سے کہ جو شیطانی اخلاق و عادات رکھتے ہیں نجات کیلئے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ خدا کی طرف پناہ لی جائے۔ وہ خدا کہ جس کے لیے خلوت اور بزم ایک سی ہے اور جس کے ارادے کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔

اس مختصر سے جملے سے انہوں نے عقیدے اور عمل کے لحاظ سے خدا کی وحدانیت کا اعتراف کیا۔ اس کے بعد مزید کہا کہ تمام چیزوں سے قطع نظر۔ میں ایسی خواہش کے سامنے کس طرح سے سر تسلیم خم کر لوں جبکہ میں عزیز مصر کے گھر میں رہتا ہوں، اس کے دستر خوان پر ہوں اور اس نے مجھے بہت احترام سے رکھا ہوا ہے" (انه ربی احسن مثوای)، کیا یہ واضح ظلم اور خیانت نہ ہوگی، "یقیناً ستمگار فلاح نہیں پائیں گے" (انه لا یفلح الظالمون)۔

اس جملے میں رب سے کیا مراد ہے؟

اس سلسلے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے۔ اکثر مفسرین نے مثلاً مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں اور مؤلف المنار نے المنار میں یہاں " رب " کو اس کے وسیع معنی میں لیا ہے اور کہا ہے کہ اس سے مراد عزیز مصر ہے کہ جس نے حضرت یوسفؑ کے احترام و اکرام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی اور شروع ہی میں "اکرمی

مثواہ، کہہ کر یوسفؑ کے لیے اپنی بیوی سے سفارش کی تھی۔

یہ گمان بالکل غلط ہے کہ لفظ "رب" اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا کیونکہ اسی سورۃ میں متعدد مقامات پر لفظ "رب" کا اطلاق غیرِ خدا پر ہوا ہے، کبھی حضرت یوسفؑ کی زبان سے اور کبھی کسی اور کی زبان سے۔ مثلاً قیدیوں کے خواب کے واقعہ میں ہم پڑھتے ہیں کہ جس قیدی کو آپؑ نے آزادی کی بشارت دی تھی اس سے کہا کہ اپنے رب (عزیزِ مصر) سے میرا ذکر کرنا۔

وَقَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ۔ (آیت ۴۲)

نیز حضرت یوسفؑ کی زبانی ہے کہ:

فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ۔ (آیت ۵۰)

جب فرعونِ مصر کا فرستادہ ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہا اپنے رب (فرعون) کے پاس واپس جاؤ اور اس سے تقاضا کرو کہ وہ تحقیق کرے کہ زنانِ مصر نے اپنے ہاتھ کیوں کاٹ لیے تھے:

اسی سورہ کی آیت ۴۱ میں حضرت یوسفؑ کی زبانی اور آیہ ۴۲ میں قرآن کی زبانی لفظ "رب" کا اطلاق مالک اور صاحبِ نعمت پر ہوا ہے۔

لہٰذا آپ دیکھ رہے ہیں کہ زیرِ بحث آیت کے علاوہ اسی سورہ میں چار مرتبہ لفظ "رب" کا اطلاق غیرِ خدا پر ہوا ہے اگرچہ اسی سورہ میں اور قرآن کی دوسری سورتوں میں یہ لفظ بارہا پروردگارِ عالم کیلئے استعمال ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ ایک مشترک لفظ ہے اور اس کا اطلاق دونوں معانی پر ہوتا ہے۔

بہرحال بعض مفسرین نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ زیرِ بحث آیت (انہ ربی احسن مثوای) میں لفظ "رب" "خدا" کے معنی میں ہے کیونکہ لفظ "اللہ" کہ جو ساتھ ذکر ہوا ہے، سبب بنتا ہے کہ ضمیر اسی کی طرف لوٹے۔ لہٰذا اس صورت میں جملے کا معنی یوں ہوگا۔

میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ جو میرا پروردگار ہے اور جس نے میرے مقام کو محترم قرار دیا ہے اور مجھے حاصل نعمت اسی کی طرف سے ہے۔

لیکن "اکرمی مثواہ" کے لفظوں سے عزیزِ مصر کی سفارش کی طرف توجہ کی جاتے تو اسی لفظ "مثوای" کا تکرار زیرِ بحث آیت میں ہوا ہے، اس سے پہلے معنی کو تقویت ملتی ہے، توراۃ کی فصل ۳۹ شمارہ ۸، ۹ اور ۱۰ میں ہے:

اور اس کے بعد یہ ہوا کہ اس کے آقا کی بیوی نے اپنی آنکھیں یوسف پر مرکوز کر دیں اور کہنے لگی: میرے ساتھ سو جا۔

لیکن اس نے انکار کر دیا اور اپنے آقا کی بیوی سے کہا: جو کچھ اس گھر میں میرے ساتھ ہو

رہا ہے میرا آقا اس سے آگاہ نہیں ہے۔ اس نے اپنی تمام ملکیت میرے سپرد کر رکھی ہے اس گھر میں مجھ سے بڑا کوئی نہیں ہے اور میرے کسی چیز کے بارے میں اس نے کوئی مضائقہ نہیں کیا سوائے تیرے کہ جو اس کی بیوی ہے لہٰذا میں یہ قباحت عظیم کیسے انجام دوں گا کہ جو خدا کا معصیت ہے ....

توراۃ کے یہ جملے بھی پہلے معنی کی تائید کرتے ہیں۔

یہاں یوسف اور زوجہ عزیز کا معاملہ نہایت باریک مرحلہ اور انتہائی حساس کیفیت تک پہنچ جاتا ہے جس کے متعلق قرآن بہت معنی خیز انداز میں گفتگو کرتا ہے: عزیز مصر کی بیوی نے اس کا قصد کیا اور اگر یوسف بھی برہان پروردگار نہ دیکھتا تو ایسا ارادہ کرتا (ولقد همت به وهم بها لولا ان رأى برهان ربه)۔

اس جملے کے معنی کے متعلق مفسرین میں بہت اختلاف ہے۔ اس کا خلاصہ درج ذیل تین تفسیروں میں کیا جا سکتا ہے:

۱۔ عزیز مصر کی بیوی نے یوسف سے اپنی آرزو کو پورا کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور اس کے لیے اپنی انتہائی کوشش کی۔ یوسف بھی نوخیز جوان تھے، ابھی تک ان کی شادی بھی نہ ہوئی تھی اور نہایت ہیجان انگیز جنسی کیفیت ان کے سامنے تھی وہ بھی طبع بشری کے تقاضے سے ایسا ارادہ کر لیتے اگر برہان پروردگار یعنی روح ایمان و تقویٰ، تربیت نفس اور آخرکار مقام عصمت اس میں حائل نہ ہوتا۔

اس بناء پر عزیز مصر کی بیوی کے "همّ" (قصد) اور یوسف کے قصد کے درمیان فرق یہ تھا کہ یوسف کی طرف سے ایک شرط سے مشروط تھا کہ جو حاصل نہ ہوئی (یعنی برہان پروردگار کا عدم وجود) لیکن عزیز کی بیوی کی طرف سے مطلق تھا اور چونکہ وہ اس قسم کے مقام تقویٰ و پرہیزگاری کی حامل نہ تھی اس لیے اس نے یہ ارادہ کر لیا اور آخری مرحلے تک اس پر قائم رہی، یہاں تک کہ اس کی پیشانی پتھر سے ٹکرائی۔

ایسے جملوں کی نظیر عربی اور فارسی ادب میں بھی موجود ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ بے لگام افراد نے فلاں کسان کے پھلوں کا باغ غارت کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے، میں نے بھی اگر سالہا سال مکتب استاد میں تربیت حاصل نہ کی ہوتی تو اس قسم کا ارادہ کرتا۔

اس بناء پر حضرت یوسف کا ارادہ ایک شرط سے مشروط تھا، جو حاصل نہ ہوئی اور یہ شرط نہ صرف حضرت یوسف کے مقام عصمت اور تقویٰ کے منافی نہیں بلکہ اس بلند مقام کی وضاحت ہے۔

اس تفسیر کے مطابق حضرت یوسف سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی کہ جو ان کے ارادہ گناہ کی نشانی ہو بلکہ انہوں نے دل میں بھی ایسا ارادہ نہیں کیا۔

لہٰذا بعض ایسی روایات کہ جن میں ہے کہ یوسف عزیز مصر کی بیوی سے خواہش پوری کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے تھے یہاں تک کہ لباس بھی اتار لیا تھا اور ایسی ہی دوسری عبارتیں کہ جنہیں نقل کرتے ہوئے شرم آتی ہے

سب بے بنیاد، مجہول اور جعلی ہیں اور ایسے اعمال آلودہ، بے لگام، ناپاک اور غلط افراد سے صادر ہوتے ہیں حضرت یوسف اپنی پاکیزگی روح اور بلند مقام تقویٰ کے حامل تھے انہیں ایسے کاموں سے کس طرح متہم کیا جاسکتا ہے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ حضرت امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے ایک حدیث میں یہی پہلی تفسیر بہت ہی جچی تلی اور مختصر عبارت میں بیان ہوئی ہے، حدیث کچھ یوں ہے:

عباسی خلیفہ مامون امامؑ سے پوچھتا ہے: کیا آپ حضرات نہیں کہتے کہ انبیاء معصوم ہیں۔

فرمایا: جی ہاں۔

اُس نے کہا: پھر قرآن کی اس آیت کی تفسیر کیا ہے " ولقد همت به وهم بها لولا ان رأ برهان ربه "

امامؑ نے فرمایا:

لقد همت به ولولا ان رأی برهان ربه لهم بها کما همت به لکنه کان معصوما والمعصوم لایهم بذنب ولا یأتیه ....

یعنی ۔ زوجۂ عزیز نے یوسف سے اپنی خواہش کی تکمیل کا ارادہ کیا اور یوسف بھی اگر اپنے پروردگار کی برہان نہ دیکھتے تو عزیز مصر کی بیوی کی طرح ارادہ کرتے لیکن وہ تو معصوم تھے اور معصوم کبھی بھی گناہ کا ارادہ نہیں کرتا اور گناہ کے پیچھے نہیں جاتا۔

مامون کو اس جواب پر بہت لطف آیا، اُس نے کہا:

لله درک یا ابا الحسن

آفرین آپ پر اے ابوالحسن! [1]

۲۔ عزیز مصر کی بیوی اور یوسفؑ میں سے کسی کا ارادہ بھی جنسی خواہش سے مربوط نہ تھا بلکہ حملہ کرنے اور ایک دوسرے کو مارنے پیٹنے کا ارادہ تھا، زوجۂ عزیز چونکہ عشق میں شکست خوردہ تھی اس لیے اس میں انتقام کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا اور یوسفؑ اپنا دفاع کرنا چاہتے تھے اور اس عورت کے سامنے سرتسلیم خم نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اس امر کے لیے جو قرائن ذکر کیے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ زوجۂ عزیز نے مطلب براری کا ارادہ تو بہت پہلے سے کیا ہوا تھا اور اس کے لیے اس نے تمام لوازمات پورے کر رکھے تھے لہٰذا اس بات کا کوئی موقع نہ تھا کہ قرآن کہے کہ اس نے اس کام کا ارادہ کیا کیونکہ ارادے کا موقع نہ تھا۔

دوسرا یہ کہ اس شکست کے بعد سختی اور انتقام جوئی کی کیفیت پیدا ہونا فطری ہے کیونکہ یوسف سے نرمی

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۲ ص ۴۲۱۔

اور پیار محبت کے لیے جو کچھ اس کے بس میں تھا وہ کر چکی تھی اور چونکہ اس طرح ان پر اثر انداز نہیں ہو سکی تھی اس لیے اس نے دوسرا ہتھیار استعمال کرنا چاہا اور یہ سختی کا ہتھیار تھا۔

تیسرا یہ کہ آیت میں ہے: کذٰلک لنصرف عنہ السوء والفحشاء (ہم نے بدی اور فحشاء دونوں کو یوسف سے دُور کر دیا۔" فحشاء" کا معنی وہی بے حیائی سے آلودہ ہونا ہے اور "سوء" عزیز مصر کے تشدد سے نجات ہے۔

لیکن یوسف نے چونکہ برہان پروردگار کو دیکھ لیا تھا لہٰذا اپنے آپ کو اس عورت سے دست و گریبان ہونے سے بچایا تاکہ کہیں وہ حملہ کر کے انہیں زخمی نہ کر دے اور یہ پھر ان کے ارادۂ تجاوز کی دلیل بن جائے لہٰذا انہوں نے اس بات کو ترجیح دی کہ اس جگہ سے دُور چلے جائیں اور وہ دروازے کی طرف بھاگے۔

۳۔ اس میں شک نہیں کہ یوسف جوان تھے، جوانی کے تمام احساسات و جذبات بھی ان میں موجود تھے اگرچہ ان کے قوی جذبات ان کی عقل اور ایمان کے ماتحت تھے لیکن فطری بات ہے کہ جب ایسا انسان کسی انتہائی ہیجان انگیز موقع سے دوچار ہو تو اس کے اندر ایک طوفان پیدا ہوتا ہے۔ جذبات اور عقل ایک دوسرے کے خلاف جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جذبات کو بھڑکانے والے عوامل کی موجیں جس قدر زیادہ قوی ہوں گی ان کا پلڑا بھاری ہو گا۔ یہاں تک کہ ہو سکتا ہے ایک انتہائی مختصر لمحے کے لیے ان کی شدت اتنی زیادہ ہو کہ قدم تھوڑا سا آگے پڑے تو ہولناک لغزش کا سامنا کرنا پڑے۔

اچانک ایمان و عقل کی قوت ہیجان میں آجاتی ہے اور اصطلاح کے مطابق آمادۂ جنگ ہو جاتی ہے اور مخالف فوج کو شکست دے دیتی ہے اور جذبات کی قوت کے جو قعرِ مذلت کے کنارے پہنچ جاتی ہے اسے پیچھے دھکیل دیتی ہے۔

یہ مختصر حساس اور بحرانی لحظہ کہ جو اطمینان وسکون کے دو زمانوں کے درمیان تھا، قرآن نے اس کی تصویر کشی کی ہے۔ اس بنا پر "ھم بھا لولا ان رأ برھان ربہ" سے مراد یہ ہے کہ جذبات اور عقل کی کشمکش میں یوسف قعرِ مذلت و گناہ کے لبوں تک آپہنچے تھے کہ اچانک ایمان و عقل کی بہت زیادہ قوت جمع ہو گئی اور اس نے جذبات کے طوفان کو شکست دے دی[1] اب کوئی یہ گمان نہ کرے کہ یوسف اگر اس پھسلن اور گرنے کی جگہ سے بچ گئے تو یہ کوئی معمولی کام تھا کیونکہ گناہ اور ہیجان کے عوامل ان کے وجود سے بہت کمزور تھے۔ نہیں، ایسا ہرگز نہیں بلکہ آپ اپنی پاکیزگی کی حفاظت کے لیے اس حساس ترین لمحے میں جہاد بالنفس کے انتہائی شدید معرکے سے گزرے۔

---

[1] یہ اقتباس ہم نے تفسیر فی ظلال، ج ۵ ص ۳۱ سے زیر بحث آیت کی تفسیر سے لیا ہے۔

برہان پروردگار سے کیا مراد ہے؟

"برھان" دراصل "برہ" کا مصدر ہے جس کا معنی ہے "سفید ہونا" بعد ازاں ہر محکم و قوی دلیل کو برہان کہا جانے لگا جو مقصود واضح ہونے کا سبب بنے۔ اس بناء پر برہان الٰہی کہ جو نجات یوسفؑ کا سبب بنی ایک قسم کی واضح خدائی دلیل ہے۔ اس کے بارے میں مفسرین نے بہت سے احتمالات ذکر کیے ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ علم وایمان، انسانی تربیت اور برجستہ و عمدہ صفات۔

۲۔ زنا کے حکم تحریم کے بارے میں آگاہی وعلم۔

۳۔ مقام نبوت اور گناہ سے معصوم ہونا۔

۴۔ ایک قسم کی الٰہی امداد و نصرت جو ان کے نیک اعمال کی وجہ سے اس حساس لمحے میں انہیں میسر آئی۔

۵۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ ایک بت تھا کہ جو زوجہ عزیز کا معبود شمار ہوتا تھا۔ اچانک اس عورت کی نگاہ اس بت پر پڑی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اسے گھور رہا ہے اور اس کی خیانت آمیز حرکات کو غیظ و غضب کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ وہ اٹھی اور اس بت پر کپڑا ڈال دیا۔ یوسفؑ نے یہ منظر دیکھا تو ان کے دل میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ لرز گئے اور کہنے لگے تُو تو ایک بے عقل، بے شعور، حس و تشخیص سے عاری بت سے شرم کرتی ہے، کیسے ممکن ہے کہ میں اپنے پروردگار سے شرم نہ کروں کہ جو تمام چیزوں کو جانتا ہے اور تمام مخفی امور اور خلوت گاہوں سے باخبر ہے۔

اس احساس نے یوسفؑ کو ایک نئی توانائی اور قوت بخشی اور شدید جنگ کہ جو ان کی روح کی گہرائیوں میں جذبات اور عقل کے درمیان جاری تھی اس میں ان کی مدد کی تاکہ وہ جذبات کی سرکش موجوں کو پیچھے دھکیل سکیں۔[1]

اس کے باوجود کوئی مانع نہیں کہ یہ سب معانی یکجا مراد ہوں کیونکہ "برہان" کے وسیع مفہوم میں سب موجود ہیں اور قرآنی آیات و روایات میں لفظ "برہان" کا مندرجہ بالا اکثر معانی پر اطلاق ہوا ہے۔

باقی رہیں وہ بے بنیاد روایات جو مفسرین نے نقل کی ہیں کہ جن کے مطابق حضرت یوسفؑ نے گناہ کا ارادہ کر لیا تھا کہ اچانک حالت مکاشفہ میں جبرائیل یا حضرت یعقوبؑ کو دیکھا کہ جو اپنی انگلی دانتوں سے کاٹ رہے تھے انہیں دیکھا تو یوسفؑ پیچھے ہٹ گئے ـــ ایسی روایات کی کوئی معتبر سند نہیں ہے۔ یہ اسرائیلیات کی طرح ہیں اور کوتاہ فکر انسانوں کے دماغوں کی پیداوار ہیں جنہوں نے مقام انبیاء کو بالکل نہیں سمجھا۔

---

[1] نورالثقلین ج ۲ صفحہ ۴۲۱ و تفسیر قرطبی صفحہ ۳۳۹۸ ج ۵۔

اب ہم باقی آیت کی تفسیر کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے: ہم نے یوسف کو اپنی ایسی برہان پیش کی تاکہ بدی اور فحشاء کو اس سے دور کریں (کذٰلك لنصرف عنه السوء والفحشاء)۔ کیونکہ وہ ہمارے برگزیدہ اور مخلص بندوں میں سے تھا (انه من عبادنا المخلصین)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ہم نے جو اس کے لیے غیبی اور روحانی امداد بھیجی تاکہ وہ بدی اور گناہ سے رہائی پاتے تو یہ بے دلیل نہیں تھا۔ وہ ایک ایسا بندہ تھا جس نے اپنے آپ کو آگاہی، ایمان، پرہیزگاری اور پاکیزہ عمل سے آراستہ کیا ہوا تھا اور اس کا قلب و روح شرک کی تاریکیوں سے پاک اور خالص تھا۔ اسی لیے وہ ایسی خدائی امداد کی اہلیت و لیاقت رکھتا تھا۔ اس دلیل کا ذکر نشاندہی کرتا ہے کہ ایسی خدائی امداد جو طغیانی و بحرانی لمحات میں یوسف جیسے انبیاء کو میسر آئی تھی ان سے مخصوص نہ تھی بلکہ جو شخص بھی خدا کے خالص بندوں اور "عباد اللّٰہ المخلصین" کے زمرے میں آتا ہو ایسی نعمات کے لائق ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ نفس سے جہاد: ہم جانتے ہیں کہ اسلام میں افضل ترین جہاد جہاد بالنفس ہے جسے پیغمبر اکرمؐ نے اپنی ایک مشہور حدیث میں "جہادِ اکبر" کا نام دیا ہے یعنی بڑے دشمن سے جہاد کہ جسے جہادِ اصغر کا نام دیا گیا ہے میں اصولی طور پر اس وقت تک کامیابی ممکن نہیں جب تک حقیقی معنی میں انسان جہادِ اکبر کے مرحلے سے نہ گزرے۔

قرآن مجید میں جہادِ اکبر کے میدان میں انبیاء اور دیگر اولیائے خدا سے مربوط بہت سے مناظر کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان میں سے نہایت اہم حضرت یوسفؑ کی سرگزشت اور زوجۂ عزیزِ مصر کے عشق سوزاں کی داستان ہے۔ اگرچہ اس کے تمام پہلوؤں کی قرآن نے اختصار کے سبب وضاحت نہیں کی تاہم ایک مختصر جملے "وھم بھا لو لا ان رأ برھان ربه" کے ذریعے اس طوفان کی شدت کو بیان کیا ہے۔

اس میدانِ مقابلہ سے حضرت یوسفؑ روسفید نکلے۔ ان کی کامیابی کی تین وجوہ ہیں:

پہلی یہ کہ آپؑ نے اپنے تئیں خدا کے سپرد کیا اور اس کے لطف و کرم کی پناہ لی (قال معاذ اللّٰہ)۔

دوسری یہ کہ آپؑ نے عزیزِ مصر کے احسانات کی طرف توجہ کی، جس کے گھر میں آپؑ زندگی بسر کر رہے تھے۔ یا یہ کہ خدا کی لامتناہی نعمات کی طرف توجہ کی کہ جس نے انہیں وحشتناک کنویں کی تہ سے نکال کر امن و امان اور سکون و آرام کے ماحول میں پہنچا دیا۔ اس امر نے آپؑ کو اس بات پر ابھارا کہ اپنے گزشتہ اور آئندہ پر زیادہ غور و فکر کریں اور اپنے آپ کو زود گزر طوفانوں کے حوالے نہ کریں۔

تیسری یہ کہ یوسفؑ کی خود سازی و بندگی کہ جس میں خلوص شامل تھا اور جو "انه من عبادنا المخلصین" سے معلوم ہوتی ہے نے آپؑ کو قوت بخشی کہ اس عظیم میدان میں کئی گنا وسوسوں کے مقابلے میں کہ جو اندر اور باہر سے آپؑ پر حملہ آور ہو رہے تھے گھٹنے نہ ٹیک دیں۔

اور یہ درس ہے تمام آزاد انسانوں کے لیے کہ جو جہاد نفس کے میدان میں اس خطرناک دشمن پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام دعائے صباح میں بہت دلکش پیرائے میں فرماتے ہیں:

وان خذلنی نصرک عند محاربة النفس والشیطان فقد وکلنی خذلانک الی حیث النصب والحرمان۔

بارالٰہا! اگر نفس اور شیطان سے مقابلے کے وقت ہم تیری نصرت سے محروم رہ جائیں تو یہ محرومیت ہمیں رنج و حرمان کے سپرد کردے گی اور ہماری نجات کی امید نہیں رہے گی۔

ایک حدیث میں ہے:

ان النبی (ص) بعث سریة فلما رجعوا قال مرحبًا بقوم قضوا الجهاد الاصغر و بقی علیهم الجهاد الاکبر، فقیل یارسول الله ما الجهاد الاکبر قال جهاد النفس۔

رسول اکرمؐ نے کچھ مسلمانوں کو ایک جنگ پر بھیجا۔ جب وہ (تھکے ماندے اور مجروح بدن) واپس آئے تو فرمایا: آفرین ہے ان لوگوں پر کہ جنہوں نے جہادِ اصغر انجام دیا ہے لیکن جہادِ اکبر کی ذمہ داری ان پر باقی ہے۔

انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! جہادِ اکبر کیا ہے؟

فرمایا: نفس کے ساتھ جہاد[1]

امیرالمؤمنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

المجاهد من جاهد نفسه

حقیقی مجاہد وہ ہے جو نفس کی سرکش خواہشوں کے خلاف جہاد کرے[2]

امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

من ملک نفسه اذا رغب، و اذا رهب، و اذا اشتهی، و اذا غضب، و اذا رضی، حرم الله جسده علی النار۔

جو شخص چند حالت میں خود پر کنٹرول رکھے۔

• جب اسے کسی کی طرف رغبت ہو،

• جب خوف میں ہو،

---

[1] وسائل الشیعہ صفحہ ۱۲۲ ج ۱۱

[2] وسائل الشیعہ ج ۱۱ صفحہ ۱۲۴

٥ جب شعلۂ شہوت بھڑکتا ہو،
٥ جب عالمِ غیظ و غضب ہو اور
٥ جب کسی پر خوش ہو،
(اپنے ارادے سے ان جذبات کو اس طرح کنٹرول میں رکھے کہ یہ اسے حکمِ خدا سے منحرف نہ کردیں)، تو خدا اس کا بدن جہنم پر حرام کردے گا۔[1]

۲۔ اخلاص کی جزا: جیسا کہ مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں اشارہ کیا جاچکا ہے کہ قرآن مجید اس خطرناک گرداب کہ جو زوجۂ عزیزِ مصر نے پیدا کردیا ، سے یوسف کی نجات کی نسبت خدا کی طرف دیتا ہے اور کہتا ہے:
ہم نے "سوء" اور "فحشاء" کو یوسف سے دُور کردیا۔

لیکن ۔ بعد کا جملہ کہ جس میں کہا گیا ہے کہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا، کی طرف توجہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان بحرانی لمحات میں خدا اپنے مخلص بندوں کو تنہا نہیں چھوڑتا اور ان کے لیے اپنی معنوی امداد سے دریغ نہیں کرتا بلکہ اپنے غیبی الطاف و امداد سے کہ جن کی تعریف و توصیف کسی طرح بھی ممکن نہیں اپنے بندوں کی حفاظت کرتا ہے اور یہ درحقیقت ایسی جزا ہے جو خدا نے بزرگ و برتر ایسے بندوں کو عطا فرماتا ہے ۔ یہ دراصل پاکیزگی، تقویٰ اور اخلاص کی جزا ہے۔

ضمنی طور پر اس نکتے کی یاددہانی بھی ضروری ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں حضرت یوسف کا ذکر "مُخلَص" (بروزن "مُطلَق") بصورت اسم مفعول ہوا ہے یعنی ۔ خالص کیا ہوا، نہ کہ بصورت "مُخلِص" (بروزن "مُحسِن") اسم فاعل کی شکل میں جس کا معنی ہے "خالص کرنے والا"۔

غور و خوض سے معلوم ہوتا ہے کہ "مخلص" (لام کے نیچے زیر کی صورت میں) زیادہ تر ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں انسان تکامل و ارتقاء کے ابتدائی مراحل میں ہو اور ابھی خودسازی کے عمل سے گزر رہا ہو۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

فَاِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ

جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں خدا کو خلوص سے پکارتے ہیں۔ (عنکبوت ۔ ۶۵)

اسی طرح ایک اور آیت میں ہے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ

انہیں حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ خدا کی خلوص کے ساتھ پرستش کریں۔ (بینہ ۔ ۵)

لیکن ۔ "مُخلَص" (لام پر زبر کی صورت میں)، اعلیٰ مرحلے کے لیے بولا جاتا ہے کہ جو ایک مدت تک جہاد بالنفس سے حاصل ہوتا ہے وہی مرحلہ کہ جب شیطان انسان میں اپنے وسوسے پیدا کرنے سے مایوس ہوجاتا ہے

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۱ صفحہ ۱۲۳

درحقیقت اس مرحلے میں خدا کی طرف سے بیمہ ہو جاتا ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے:

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۙ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝

شیطان نے کہا: تیری عزت کی قسم! ان سب کو گمراہ کروں گا مگر تیرے مخلص بندوں کو۔

(ص - ۸۲ و ۸۳)

یوسفؑ اس مرحلے پر پہنچے ہوئے تھے کہ اس بحرانی حالت میں انہوں نے پہاڑ کی طرح استقامت دکھائی اور کوشش کرنا چاہیئے کہ انسان اس مرحلے تک پہنچ جائے۔

۴۔ متین و پاکیزہ کلام: قرآن کے عجیب و غریب پہلوؤں میں سے ایک کہ جو اعجاز کی ایک نشانی بھی ہے یہ ہے کہ اس میں کوئی بھبھنے والی، رکیک، ناموزوں، متبذل اور عفت و پاکیزگی سے عاری تعبیر نہیں ہے اور کسی عام ان پڑھ اور جہالت کے ماحول میں پرورش پانے والے کا کلام ہرگز اس طرز کا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہر شخص کی باتیں اس کے افکار اور ماحول سے ہم رنگ ہوتی ہیں۔

قرآن کی بیان کردہ تمام داستانوں میں ایک حقیقی عشقیہ داستان موجود ہے اور یہ حضرت یوسفؑ اور عزیز مصر کی بیوی کی داستان ہے۔

یہ ایک خوبصورت اور ہوس آلود عورت کے ایک زیرک اور پاک دل نوجوان سے شعلہ ور عشق کی داستان ہے۔

کہنے والے اور لکھنے والے جب ایسے مناظر تک پہنچتے ہیں تو وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ یا تو ہیرو اور اس واقعے کے اصل مناظر کی تصویر کشی کے لیے قلم کو کھلا چھوڑ دیں اور بزبان اصطلاح حق سخن ادا کر دیں اگرچہ اس میں ہزاروں تحریک آمیز، بھبھنے والے اور غیر اخلاقی لفظ آجائیں۔

یا وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ زبان و قلم کی نزاکت و عفت کی حفاظت کے لیے کچھ مناظر کو پردہ ابہام میں لپیٹ دیں اور سامعین و قارئین کو سربستہ طور پر بات بتائیں۔

کہنے والا اور لکھنے والا کتنی بھی مہارت رکھتا ہو اکثر اوقات ان میں سے کسی ایک مشکل سے دوچار ہو جاتا ہے۔

کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ ایک ان پڑھ شخص ایسے شور انگیز عشق کے نہایت حساس لمحات کی دقیق اور مکمل تصویر کشی بھی کرے لیکن بغیر اس کے کہ اس میں معمولی سی تحریک آمیز اور عفت سے عاری تعبیر استعمال ہو۔

لیکن قرآن اس داستان کے حساس ترین مناظر کی تصویر کشی شگفتہ انداز میں متانت و عفت کے ساتھ کرتا ہے۔ بغیر اس کے کہ اس میں کوئی واقعہ چھوٹ جائے اور اظہار عجز ہو۔ جبکہ تمام اصول اخلاق و پاکیزگی بیان

بھی ممنوع ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ اس داستان کے تمام مناظر میں سے زیادہ حساس "خلوت گاہ عشق" کا ماجرا ہے جسے زوجۂ عزیز مصر کی بیقراری اور ہوا و ہوس نے وجود بخشا۔

قرآن اس واقعے کی وضاحت میں تمام کہنے کی باتیں بھی کہہ گیا ہے لیکن پاکیزگی اور عفت کے اصول سے ہٹ کر اس نے تھوڑی سی بات بھی نہیں کی۔ قرآن اس طرح سے کہتا ہے:

وراودته التی هو فی بیتها عن نفسه وغلقت الابواب وقالت هیت لك قال معاذ الله انه ربی احسن مثوای انه لا یفلح الظالمون۔

جس خاتون کے گھر یوسف تھے، اس نے ان سے تقاضا کیا اور اظہارِ تمنا کیا اور تمام دروازے بند کر لیے اور کہنے لگی: جلدی آجاؤ، اس کی طرف جو تمہاری خاطر مہیا ہے۔ انہوں نے کہا: میں اس کام سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ (عزیز مصر) بزرگ اور میرا مالک ہے۔ اس نے مجھے بڑی عزت سے رکھا ہے۔ یقیناً ظالم (اور آلودہ دامن افراد) فلاح نہیں پائیں گے۔ (یوسف - ۲۳)۔

اس آیت میں یہ الفاظ قابلِ غور ہیں:

۱۔ لفظ "راود" وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں کوئی شخص دوسرے سے کوئی چیز بڑی محبت اور نرمی سے مانگے (لیکن زوجۂ عزیز مصر یوسف سے جو کچھ طلب کرتی تھی، چونکہ یہاں واضح تھی لہٰذا قرآن نے اسی واضح کہنے پر کنایت کی ہے اور نام نہیں لیا۔

۲۔ یہاں قرآن لفظ "امرأة العزیز" (یعنی عزیز مصر کی بیوی) تک استعمال نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے "التی هو فی بیتها" (وہ خاتون کہ یوسف جس کے گھر میں رہتا تھا)۔ یہ اس لیے ہے تاکہ کلام پردہ پوشی اور عفت بیان سے زیادہ قریب ہو۔

ضمنی طور پر اس تعبیر سے قرآن نے حضرت یوسف کی حسِ حق شناسی کو بھی مجسم کیا ہے یعنی یوسف نے تمام مشکلات کے باوجود اس کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کیا جس کے پنجے میں آپ کی زندگی تھی۔

۳۔ "غلقت الابواب" کہ جو مبالغے کا معنی دیتا ہے، دلالت کرتا ہے کہ تمام دروازے مضبوطی اور سختی سے بند کر دیئے اور یہ اس ہیجان انگیز منظر کی تصویر کشی ہے۔

۴۔ "قالت هیت لك" اس کا معنی ہے "جلدی آ، اس کی طرف جو تمہارے لیے مہیا ہے" یا "آجاؤ کہ میں تمہارے اختیار میں ہوں"۔

اس جملے میں وصالِ یوسف سے ہمکنار ہونے کے لیے زوجۂ عزیز مصر کی آخری بات پیش کی گئی ہے لیکن ایک وزنی، پُر متانت اور معنی خیز انداز میں بغیر کسی تحریک آمیزی اور بد آموزی کے۔

۵۔ "معاذ الله انه ربی احسن مثوای" یہ جملہ حضرت یوسفؑ نے اس حسین ساحرہ کی دعوت کے جواب میں کہا۔ اکثر مفسرین کے بقول اس کا معنی ہے: "میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں، تیرا شوہر عزیز مصر میرا بزرگ اور مالک ہے اور وہ میرا احترام کرتا ہے اور مجھ پر اعتماد کرتا ہے۔ میں اس سے کس طرح خیانت کروں، یہ کام خیانت بھی ہے اور ظلم بھی "انه لا یفلح الظالمون"۔

اس طرح قرآن حضرت یوسفؑ کے بارے میں بیان کرتا ہے کہ انہوں نے عزیز مصر کی بیوی کے احساسات بیدار کرنے کی کوشش کی۔

۶۔ "ولقد همت به وهم بها لولا ان رأ برهان ربه" ایک طرف قرآن اس خلوت گاہِ عشق کے انتہائی حساس مناظر کی تصویر کشی کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ کیفیت اس قدر تحریک آمیز تھی کہ اگر حضرت یوسفؑ عقل، ایمان یا عصمت کے بلند مقام پر نہ ہوتے تو گرفتار ہو جاتے۔ دوسری طرف آیت کے اس حصے میں قرآن طغیان گر شہوت کے دیو پر حضرت یوسفؑ کی آخری کامیابی پر ایک خوبصورت انداز میں خراج تحسین پیش کر رہا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ لفظ "هم" استعمال ہوا ہے یعنی عزیز مصر کی بیوی نے پختہ ارادہ کر رکھا تھا اور یوسف نے بھی اگر برہانِ پروردگار نہ دیکھی ہوتی تو وہ بھی ارادہ کرتے۔

کیا کوئی لفظ یہاں قصد و ارادہ سے بڑھ کر متانت آمیز استعمال کیا جا سکتا ہے؟

(۲۵) وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

(۲۶) قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○

(۲۷) وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○

(۲۸) فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ○

(۲۹) يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ○

ترجمہ

(۲۵) اور دونوں دروازے کی طرف دوڑے (جبکہ زوجۂ عزیز یوسف کا تعاقب کررہی تھی) اور پیچھے سے اس کی قمیص پھاڑ دی اور اس دوران اس عورت کے سردار کو ان دونوں نے دروازے پر پایا۔ اس عورت نے کہا: جو تیرے اہل سے خیانت کا ارادہ کرے اس کی سزا سوائے زندان یا دردناک عذاب کے کیا ہوگی۔

(۲۶) (یوسف) نے کہا : اس نے مجھے اصرار سے اپنی طرف دعوت دی اور اس موقع پر اس عورت کے خاندان میں سے ایک شاہد نے گواہی دی کہ اگر اس کی قمیص آگے سے پھٹی ہے تو عورت سچ کہتی ہے اور یہ جھوٹوں میں سے ہے۔

(۲۷) اور اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو پھر وہ عورت جھوٹ بولتی ہے اور یہ سچوں میں سے ہے۔

(۲۸) جب (عزیز مصر نے) دیکھا تو اس (یوسف) کی قمیص پیچھے سے پھٹی تھی تو اس نے کہا کہ یہ تمہارے مکر و فریب میں سے ہے اور میں جانتا ہوں کہ عورتوں کا مکر و فریب عظیم ہوتا ہے۔

(۲۹) یوسف ! اس امر سے صرف نظر کرو اور (اے عورت!) تو بھی اپنے گناہ پر استغفار کر کہ تو خطاکاروں میں سے تھی۔

تفسیر

زوجۂ عزیز مصر کی رسوائی

یوسفؑ کی انتہائی استقامت نے زوجۂ عزیز کو تقریباً مایوس کر دیا۔ یوسفؑ اس معرکے میں اس تازہ ادا والی اور سرکش ہوا و ہوس والی عورت کے مقابلے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اس لغزش گاہ میں مزید ٹھہرنا خطرناک ہے۔ انہوں نے اس محل سے نکل جانے کا ارادہ کیا۔ لہٰذا وہ تیزی سے قصر کے دروازے کی طرف بھاگے تاکہ دروازہ کھول کر نکل جائیں۔ زوجۂ عزیز بھی بے اختیار نہ رہی وہ بھی یوسفؑ کے پیچھے دروازے کی طرف بھاگی تاکہ یوسفؑ کو باہر نکلنے سے روکے۔ اس نے اس مقصد کے لیے یوسفؑ کی قمیص پیچھے سے پکڑ لی اور اسے اپنی طرف کھینچا اس طرح سے کہ قمیص پیچھے سے لمبائی کے رُخ پھٹ گئی۔

(واستبقا الباب وقدت قمیصہ من دبر)۔

۔ استباق ۔ لغت میں دو یا چند افراد کے ایک دوسرے پر سبقت لینے کے معنی میں ہے اور ۔ قد ۔ لمبائی کے رُخ پھٹنے کے معنی میں ہے جیسا کہ ۔ قط ۔ عرض میں پھٹ جانے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے حدیث

میں ہے:

کانت ضربات علی بن ابی طالب (ع) ابکاراً کان اذا اعتلی قد، واذا اعترض قط۔

علی ابن ابی طالب (ع) کی ضربیں اپنی نوع میں نئی اور انوکھی تھیں جب اوپر سے ضرب لگاتے تو نیچے تک چیر دیتے اور جب عرض میں ضرب لگاتے تو دو نیم کر دیتے۔[1]

لیکن جس طرح بھی ہوا یوسف دروازے تک پہنچ گئے اور دروازہ کھول لیا۔ اچانک عزیز مصر کو دروازے کے پیچھے دیکھا جس طرح قرآن کہتا ہے: ان دونوں نے اس عورت کے آقا کو دروازے پر پایا (والفیا سیدھا لدا الباب)۔

"الفیت" "الفاء" کے مادہ سے اچانک پانے کے معنی میں ہے اور شوہر کو "سید" سے تعبیر کرنا جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے اہل مصر کے رواج کے مطابق تھا۔ وہاں کی عورتیں اپنے شوہر کو "سید" کہہ کر خاطب کرتی ہیں۔ آج کی فارسی زبان میں بھی عورتیں اپنے شوہر کو "آقا" سے تعبیر کرتی ہیں۔

اب جبکہ زوجۂ عزیز نے ایک طرف اپنے تئیں رسوائی کے آستانے پر دیکھا اور دوسری طرف انتقام کی آگ اس کی روح میں بھڑک اٹھی تو پہلی بات جو اسے سوجھی یہ تھی کہ اس نے اپنے آپ کو حق بجانب ظاہر کرتے ہوئے اپنے شوہر کی طرف رخ کیا اور یوسف پر تہمت لگائی: اس نے پکار کر کہا: جو شخص تیری اہلیہ سے خیانت کا ارادہ کرے اس کی سزا زندان یا دردناک عذاب کے سوا کیا ہو سکتی ہے (قالت ما جزاء من اراد باھلک سوءاً الا ان یسجن او عذاب الیم)۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اس خیانت کار عورت نے جب تک اپنے آپ کو رسوائی کے آستانے پر نہیں دیکھا تھا، بھول چکی تھی کہ وہ عزیز مصر کی بیوی ہے لیکن اس موقع پر اس نے "اھلک" (تیری گھروالی) کا لفظ استعمال کر کے عزیز کی غیرت کو ابھارا کہ میں تیرے ساتھ مخصوص ہوں لہٰذا کسی دوسرے کو نہیں چاہیئے کہ میری طرف حرص کی آنکھ سے دیکھے۔ یہ گفتگو حضرت موسیٰ کے زمانے کے فرعون مصر کی گفتگو سے مختلف نہیں کہ وہ تختِ حکومت پر بھروسے کے وقت کہتا تھا:

الیس لی ملک مصر

کیا مصر کی سلطنت کا میں مالک نہیں ہوں (زخرف ۔ ۵۱)۔

لیکن جب اس نے دیکھا کہ تخت و تاج خطرے میں ہے اور میرے اقبال کا ستارہ ڈوب رہا ہے تو کہا:

یُرِیْدُ اَنْ یُّخْرِجَکُمْ مِّنْ اَرْضِکُمْ

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

یہ دونوں بھائی (موسیٰ و ہارون) چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہاری سر زمین سے نکال دیں۔ (طٰہٰ - ۶۳)

دوسرا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ عزیز مصر کی بیوی نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ یوسف میرے بارے میں بُرا ارادہ رکھتا تھا بلکہ عزیز مصر سے اس کی سزا کے بارے میں بات کی۔ اس طرح سے کہ اصل مسئلہ مسلّم ہے اور بات صرف اس کی سزا کے بارے میں ہے۔ ایسے لمحے میں جب وہ عورت اپنے آپ کو بھول چکی تھی اس کی یہ نپی تلی گفتگو اس کی انتہائی حیلہ گری کی نشانی ہے [1]

پھر یہ کہ پہلے وہ قید خانے کے بارے میں بات کرتی ہے اور بعد میں گویا وہ قید پر بھی مطمئن نہیں ہے ایک قدم اور آگے بڑھاتی ہے اور "عذاب الیم" کا ذکر کرتی ہے کہ جو سخت جسمانی سزا اور قتل تک بھی ہو سکتی ہے۔

اس مقام پر حضرت یوسفؑ نے خاموشی کو کسی طور پر جائز نہ سمجھا اور صراحت سے زوجۂ عزیز مصر کے عشق سے پردہ اٹھایا۔ انہوں نے کہا: اس نے مجھے اصرار اور التماس سے اپنی طرف دعوت دی تھی (قال هي راودتني عن نفسي)۔

واضح ہے اس قسم کے موقع پر ہر شخص ابتداء میں بڑی مشکل سے یہ باور کر سکتا ہے کہ ایک نوخیز جوان غلام کہ جو شادی شدہ نہیں بے گناہ ہو اور ایک شوہر دار عورت کہ جو ظاہراً باوقار ہے گنہگار ہو۔ اس بناء پر الزام زوجۂ عزیز کی نسبت زیادہ یوسف کے دامن پر لگتا تھا لیکن چونکہ خدا نیک اور پاک افراد کا حامی و مددگار ہے۔ وہ اجازت نہیں دیتا کہ یہ نیک اور پارسا مجاہد نوجوان تہمت کے شعلوں کی لپیٹ میں آئے۔ لہٰذا قرآن کہتا ہے: اس موقع اس عورت کے اہل خاندان میں سے ایک گواہ نے گواہی دی کہ اصل مجرم کی پہچان کے لیے اس واضح دلیل سے استفادہ کیا جائے کہ اگر یوسف کا کُرتہ آگے کی طرف سے پھٹا ہے تو وہ عورت سچ کہتی ہے اور یوسف جھوٹا ہے (وشهد شاهد من اهلها ان كان قميصه قد من قبل فصدقت وهو من الكاذبين)۔ اور اگر اس کا کُرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو وہ عورت جھوٹی اور یوسف سچا ہے (وان كان قميصه قد من دبر فكذبت وهو من الصادقين)۔

اس سے زیادہ مضبوط دلیل اور کیا ہوگی۔ کیونکہ زوجۂ عزیز کی طرف سے تقاضا تھا تو وہ یوسف کے پیچھے دوڑی ہے اور یوسف اس سے بھاگ رہے تھے کہ وہ ان کے کُرتے سے لپٹی ہے، تو یقیناً وہ پیچھے سے پھٹا ہے اور اگر یوسف نے عزیز کی بیوی پر حملہ کیا ہے اور وہ بھاگی ہے یا سامنے سے اپنا دفاع کیا ہے تو یقیناً یوسف کا کُرتہ آگے سے پھٹا ہے۔

---

[1] یہ کہ "ما جزاء" میں لفظ "ما" نافیہ ہے یا استفہامیہ، اس سلسلہ میں مفسرین میں اختلاف ہے لیکن دونوں صورتوں میں اس کے نتیجہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یہ امر کس قدر جاذبِ نظر ہے کہ کرتہ پھٹنے کا سادہ سا مسئلہ بے گناہی کا تعین کر دیتا ہے۔ یہی چھوٹی سی چیز ان کی پاکیزگی کی سند اور مجرم کی رسوائی کا سبب ہو گئی۔

عزیزِ مصر نے یہ فیصلہ کہ جو بہت ہی جچا تلا تھا بہت پسند کیا۔ یوسف کی قمیص کو غور سے دیکھا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ ان کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے (خصوصاً اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس دن تک اس نے کبھی یوسف سے کوئی جھوٹ نہیں سنا تھا) اس نے اپنی بیوی کی طرف رُخ کیا اور کہا یہ کام تم عورتوں کے مکر و فریب میں سے ہے، بے شک تم عورتوں کا مکر و فریب عظیم ہے (فلما را قمیصه قد من دبر قال انه من کیدکن ان کیدکن عظیم)۔

اس وقت عزیزِ مصر کو خوف ہوا کہ یہ رسوا کن واقعہ ظاہر نہ ہو جائے اور مصر میں اس کی آبرو نہ جاتی رہے۔ اُس نے بہتر سمجھا کہ معاملے کو سمیٹ کر دبا دیا جائے۔ اُس نے یوسف کی طرف رُخ کیا اور کہا: اے یوسف تم صرفِ نظر کرو اور اس واقعے کے بارے میں کوئی بات نہ کہو (یوسف اعرض عن ھذا)۔ پھر اس نے بیوی کی جانب رُخ کیا اور کہا: تم بھی اپنے گناہ سے استغفار کرو کہ تم خطا کاروں میں سے تھی (واستغفری لذنبک انک کنت من الخاطئین)[1]

بعض کہتے ہیں یہ بات کہنے والا عزیزِ مصر نہ تھا بلکہ وہی شاہد تھا لیکن اس احتمال کیلئے کوئی دلیل موجود نہیں ہے خصوصاً جبکہ یہ جملہ عزیزِ مصر کی گفتگو کے بعد آیا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ شاہد کون تھا؟ : شاہد کون تھا کہ جس نے یوسف اور عزیزِ مصر کی فائل اتنی جلدی درست کر دی اور مہر لگا دی اور بے گناہ کو گنہگار سے الگ کر دکھایا، اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ وہ عزیزِ مصر کی بیوی کے رشتہ داروں میں سے تھا اور لفظ "من اھلھا" اس پر گواہ ہے اور قاعدتاً ایک حکیم، دانشمند اور سمجھدار شخص تھا۔ اس واقعے میں کہ جس کا کوئی عینی شاہد نہ تھا اُس نے شگافِ پیراہن سے حقیقت معلوم کر لی۔ کہتے ہیں کہ یہ شخص عزیزِ مصر کے مشیروں سے تھا اور اُس وقت اس کے ساتھ تھا۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ وہ شیرخوار بچہ تھا۔ یہ بچہ عزیزِ مصر کی بیوی کے رشتہ داروں میں سے تھا۔ اس وقت یہ بچہ وہیں قریب تھا۔ یوسف نے عزیزِ مصر سے خواہش کی کہ اس سے فیصلہ کروا لو۔ عزیزِ مصر نے پہلے تو

---

[1] اس جملے میں "من الخاطئین" کہ جو جمع مذکر ہے کہا گیا ہے نہ کہ "من الخاطئات" کہ جو جمع مؤنث ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ بہت سے مواقع پر تغلیب کے طور پر جمع مذکر کا دونوں پر اطلاق کیا جاتا ہے یعنی تُو خطا کاروں کے زمرے میں ہے۔

بہت تعجب ہوا کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے لیکن جب وہ شیر خوار حضرت عیسیٰؑ کی طرح گہوارے میں بول اٹھا اور اس نے گنہگار کو بے گناہ سے الگ کر کے معیار بتایا تو وہ متوجہ ہوا کہ یوسف ایک غلام نہیں بلکہ نبی ہے یا نبی جیسا ہے۔

وہ روایات کہ جو اہل بیت اور اہل تسنن کے طریقوں سے منقول ہیں ان میں اس دوسری تفسیر کی طرف اشارہ ہے۔ ان میں سے ایک روایت ابن عباس نے رسول اکرمؐ سے نقل کی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

چار افراد نے بچپن میں بات کی۔ فرعون کی آرائش کرنے والی کا بیٹا، یوسف کا شاہد، صاحب جریج اور عیسیٰ بن مریم [1]

تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

شہادت دینے والا چھوٹا بچہ گہوارے میں تھا [2]

لیکن توجہ رہے کہ مندرجہ بالا دونوں احادیث میں سے کسی کی بھی سند محکم نہیں ہے بلکہ دونوں مرفوعہ ہیں۔

تیسرا احتمال یہ ذکر کیا گیا ہے کہ شاہد وہی کرتے کا پھٹا ہونا تھا کہ جس نے زبان حال سے شہادت دی مگر کلمہ۔ من اھلھا۔ (شاہد عزیز کی بیوی کے خاندان میں سے تھا) کی طرف توجہ کرنے سے یہ احتمال بہت بعید نظر آتا ہے بلکہ یہ کلمہ اس احتمال کی نفی کرتا ہے۔

۲۔ **عزیز مصر نے خفیف ردّ عمل کیوں ظاہر کیا؟** اس داستان میں جو مسائل انسان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایسے اہم مسئلہ میں عزیز مصر نے صرف ایک ہی جملے پر قناعت کیوں کی۔ جبکہ یہ اس کی عزت و ناموس کا معاملہ تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ اپنے گناہ پر استغفار کر کہ تو خطا کاروں میں سے تھی۔

شاید یہی مسئلہ سبب بنا کہ اپنے اسرار فاش ہونے کے بعد عزیز مصر کی بیوی نے اشراف اور بڑے لوگوں کی بیویوں کو ایک خاص محفل میں دعوت دی اور ان کے سامنے اپنے عشق کی داستان کو صراحت سے اور کھول کر بیان کیا۔

کیا رسوائی کے خوف نے عزیز کو آمادہ کیا کہ وہ اس معاملے کو طول نہ دے یا یہ کہ طاغوتی حکمرانوں کے لیے یہ کام اور عزت و ناموس کی حفاظت کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ وہ گناہ، برائی اور بے عفتی میں اس قدر غرق ہوتے ہیں کہ اس بات کی ان کی نظر میں حیثیت اور وقعت ختم ہو چکی ہوتی ہے۔

---

[1] تفسیر المنار ج ۱۲ صفحہ ۲۸۵۔

[2] تفسیر نور الثقلین ج ۲ صفحہ ۴۲۲۔

دوسرا احتمال زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ **بحرانی لمحات میں نصرتِ الٰہی:** داستانِ یوسف کا یہ حصہ ہمیں ایک اور بہت بڑا درس دیتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایسے انتہائی بحرانی لمحات میں پروردگار کی وسیع حمایت انسانی مدد کو آپہنچتی ہے۔

جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

.... يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ

.... خدا اس کے لیے نجات کی راہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسی جگہ سے رزق دے گا کہ جہاں سے وہم بھی نہ ہو۔ (طلاق - ۲ و ۳)

اسی کے مصداق ایسے ذرائع سے کہ انسان جن کے متعلق سوچتا بھی نہیں کہ کوئی امید کی کرن پیدا ہوگی، خدا تعالیٰ کی مدد ہوتی ہے۔

کیا خبر تھی کہ کرتے کا پھٹنا حضرت یوسفؑ کی پاکیزگی اور برائت کی سند بن جائے گا۔ وہی واقعات کو جنم دینے والا کرتہ کہ جو ایک دن یوسف کے بھائیوں کو پھٹا نہ ہونے کی وجہ سے باپ کے حضور ذلیل و رسوا کرتا ہے لیکن دوسری طرف یہ کرتہ عزیز کی ہوس آلود بیوی کو پھٹا ہونے کی وجہ سے خوار کرتا ہے اور تیسری مرتبہ حضرت یعقوبؑ کی بے نور آنکھوں کے لیے نور آفرین بن جاتا ہے اور اس کی بوتے آشنائی نسیمِ صبحگاہی کے ہمراہ مصر سے کنعان تک سفر کرتی ہے اور پیرِ کنعان کو خوشخبری لیکر آنے والے سوار کی خبر دیتی ہے۔

بہرحال خدا تعالیٰ کے ایسے پوشیدہ الطاف ہیں کہ جن کی گہرائی سے کوئی شخص آگاہ نہیں ہے اور جس وقت اس کے لطف کی بادِ صبا چلتی ہے تو منظر اس طرح سے بدل جاتے ہیں کہ سمجھدار ترین افراد بھی جس کی پیش گوئی کے قابل نہیں ہوتے۔

کرتہ اگرچہ بہت چھوٹا ہوتا ہے لیکن ایک اہم چیز ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مکڑی کے جالے کے چند تار ایک ملت کی زندگی کو ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیتے ہیں جیسا کہ ہجرتِ رسولؐ کے وقت غارِ ثور پر ہوا۔

۴۔ **عزیزِ مصر کی بیوی کا منصوبہ:** مندرجہ بالا آیات میں عورتوں کے مکر کی طرف اشارہ ہوا ہے (البتہ ایسی عورتیں جو زوجۂ عزیزِ مصر کی طرح بے لگام اور ہوس ران ہوں) اور اس مکر و فریب کو "عظیم" قرار دیا گیا ہے (ان کیدکن عظیم)۔

تاریخ میں اور تاریخ ہی کے تسلسل میں ایسی بہت سی داستانیں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سی

باتیں منقول ہیں کہ جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوس باز عورتیں اپنا مقصود حاصل کرنے کے لیے ایسے ایسے منصوبے بناتی ہیں جو بے نظیر ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا داستان میں ہم نے دیکھا ہے کہ زوجہ عزیز نے عشق میں شکست کھانے کے بعد اور اپنے آپ کو رسوائی کے آستانے پر پا کر کس طرح بڑی مہارت سے اپنی پاکدامنی اور یوسف کی آلودگی کو پیش کیا یہاں تک کہ اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ یوسف نے میری طرف بُرا ارادہ کیا بلکہ اسے مسلّم امر کے طور پر فرض کیا اور صرف ایسے شخص کی سزا کے متعلق سوال کیا اور ایسی سزا کا ذکر کیا جو صرف قید پر موقوف نہ تھی بلکہ اس کی کوئی حد نہ تھی۔

اسی واقعے میں ہم بعد میں دیکھیں گے کہ جب مصر کی عورتوں نے سرزنش کی اور اپنے غلام سے اس کے بے قرار عشق پر انگلی اٹھائی تو اس نے کس طرح اپنی برائت کے لیے انتہائی مکارانہ لوچ بھرے طریقے سے حیران کن چال چلی۔

اور یہ ایسی عورتوں کے مکر کے بارے میں ایک اور تاکید ہے۔

(۳۰) وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۚ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

(۳۱) فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ○

(۳۲) قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ وَلَىِٕنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ○

(۳۳) قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ○

(۳۴) فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○

ترجمہ

(۳۰) شہر کی بعض عورتوں نے کہا: زوجۂ عزیز اپنے جوان (غلام) کو اپنی طرف دعوت دیتی ہے اور اس جوان کا عشق اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا ہے۔ ہم دیکھتی ہیں کہ وہ کھلی گمراہی میں ہے۔

(۳۱) جس وقت (عزیز کی بیوی) کو ان کے خیال کی خبر ہوئی تو اس نے انہیں بلایا اور (انہیں دعوت دی) اور ان کے لیے قیمتی تکیوں سے مجلس آراستہ کی اور ہر ایک کے ہاتھ میں (پھل کاٹنے کے لیے) چھری تھما دی اور اس موقع پر (یوسف سے) کہا: ان کی محفل میں داخل ہو۔ جب ان کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ دنگ رہ گئیں اور (بے اختیار) انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور کہا حاشا للہ یہ بشر نہیں ہے یہ تو کوئی بزرگوار فرشتہ ہے۔

(۳۲) (عزیز کی بیوی نے) کہا: یہ وہی ہے جس (کے عشق) کی بنا پر تم نے مجھے سرزنش کی ہے۔ جی ہاں! میں نے اسے اپنی طرف دعوت دی ہے مگر یہ بچ نکلا اور جو کچھ میں کہتی ہوں اس نے انجام نہ دیا تو یہ زندان میں جائے گا تو یقیناً ذلیل و خوار ہو گا۔

(۳۳) (یوسف نے) کہا: پروردگارا! جس طرف یہ لوگ مجھے بلاتے ہیں اس سے قیدخانہ مجھے زیادہ محبوب ہے اور اگر تُو نے ان کی چالوں کو مجھ سے دُور نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔

(۳۴) اس کے پروردگار نے اس کی دعا قبول کر لی اور ان عورتوں کی چالیں اس سے دور کر دیں کیونکہ وہ سننے اور جاننے والا ہے۔

تفسیر

زوجۂ عزیز مصر کی ایک اور سازش

زوجۂ عزیز کے اظہار عشق کا معاملہ مذکورہ داستان میں اگرچہ خاص لوگوں تک تھا اور خود عزیز نے بھی اسے چھپانے کی تاکید کی تھی تاہم ایسی باتیں چھپائے نہیں چھپتیں۔ خصوصاً بادشاہوں اور اہل دولت و اقتدار کے محلوں کی دیواریں بھی سنتی ہیں۔ بہرحال آخرکار یہ راز قصر سے باہر نکل گیا اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے

شہر کی کچھ عورتیں اس بارے میں ایک دوسرے سے باتیں کرتی تھیں اور اس بات کا چرچا کرتی تھیں کہ عزیز کی بیوی نے اپنے غلام سے راہ و رسم پیدا کرلی ہے اور اسے اپنی طرف دعوت دیتی ہے (وقال نسوة فی المدینة امرأة العزیز تراود فتٰها عن نفسه) اور غلام کا عشق تو اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا ہے (قد شغفها حبا)۔

پھر وہ یہ کہہ کر اس پر تنقید کرتیں کہ "ہماری نظر میں تو وہ واضح گمراہی میں ہے (انا لنرٰها فی ضلال مبین)۔

واضح ہے کہ ایسی باتیں کرنے والی مصر کے طبقۂ امراء کی عورتیں تھیں جن کے لیے فرعونوں اور مستکبرین کے محلات کی گھٹیا کہانیاں بہت دلچسپ ہوتی تھیں اور وہ ہمیشہ ان کی ٹوہ میں لگی رہتی تھیں۔

اشراف کی یہ عورتیں کہ جو خود بھی زوجۂ عزیز کی نسبت ہوس رانی میں کسی طرح کم نہ تھیں ان کی چونکہ یوسف تک پہنچ نہیں تھی لہٰذا بقولے "جانماز آب می کشیدند" مکر و فریب میں لگی ہوئی تھیں اور زوجۂ عزیز کو اس کے عشق پر واضح گمراہی میں قرار دیتی تھیں، یہاں تک کہ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ راز بعض زنانِ مصر نے ایک سازش کے تحت پھیلایا۔ وہ چاہتی تھیں کہ زوجۂ عزیز مصر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے انہیں اپنے محل میں دعوت دے تاکہ وہ خود وہاں یوسف کو دیکھ سکیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ یوسف کے سامنے ہوں تو ہو سکتا ہے اس کی نظر ان کی طرف مائل ہو جائے کہ جو شاید زوجۂ عزیز مصر سے بھی بڑھ کر حسین تھیں اور پھر یوسف کے لیے ان کا جمال بھی نیا تھا اور پھر یوسف کے لیے عزیز مصر کی بیوی ماں یا مولی یا ولی نعمت کا مقام رکھتی تھی اور ایسی کوئی صورت ان کے لیے نہ تھی لہٰذا وہ کہتی تھیں کہ زوجۂ عزیز کی نسبت ان کے اثر کا احتمال زیادہ ہے۔

"شغف" "شغاف" کے مادہ سے ہے۔ یہ دل کے اوپر کی گرہ یا دل پر موجود ایک پتلا سا چھلکا جس نے غلاف کی طرح اسے ڈھانپ رکھا ہوتا ہے، تو کہتے ہیں "شغفها" تو یوسف کی اتنی شیدائی ہو گئی ہے کہ اس کی محبت اس کے دل کے اندر اتر گئی ہے اور اس کی گہرائیوں میں سما گئی ہے اور یہ شدید محبت اور عشق سوزاں کی طرف اشارہ ہے۔

"آلوسی" نے تفسیر "روح المعانی" میں کتاب "اسرار البلاغة" سے عشق و محبت کے کئی مراتب کا ذکر کیا ہے جن میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

محبت کا پہلا درجہ میلان ہے۔ اس کے بعد "علاقہ" یعنی ایسی محبت جس کا تعلق دل سے ہو۔ اس کے بعد "کلف" یعنی شدید محبت ہے۔ پھر "عشق" کا درجہ ہے۔ اس کے بعد "شعف" (عین کے ساتھ) ہے یعنی وہ حالت کہ جس میں دل آتش عشق میں جلتا ہے اور اسے اس جلن سے لذت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد "لوعة" کا مرحلہ ہے اور پھر "شغف" کا درجہ ہے۔ یہ وہ مرحلہ کہ جہاں عشق دل کے تمام گوشوں کو

زاویوں میں اتر جاتا ہے اور اس کے بعد "تدلّہ" ہے، یہ وہ درجہ ہے کہ جس میں عشق عقل انسانی کو لے جاتا ہے اور آخری مرحلہ "ھیوم" ہے کہ جو مطلق بے قراری کا نام ہے اس مرحلے میں عاشق کو بے اختیار ہر طرف کھینچتی ہے۔[1]

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ کس شخص نے یہ راز فاش کیا تھا۔ زوجۂ عزیز تو یہ رسوائی ہرگز گوارا نہ کرتی تھی اور عزیز نے تو خود اسے چھپانے کی تاکید کی تھی۔ رہ گیا وہ حکیم و دانا کہ جس نے اس کا فیصلہ کیا تھا، اس سے تو ویسے ہی یہ کام بعید نظر آتا ہے بہرحال جیسا کہ ہم نے کہا کہ خرابیوں سے پُر ان محلات میں ایسی کوئی چیز نہیں کہ جسے مخفی رکھا جاسکے اور آخر کار ہر بات نامعلوم افراد کی زبانوں سے درباریوں تک اور ان سے باہر کی طرف پہنچ جاتی ہے اور یہ فطری امر ہے کہ لوگ اسے زیبِ داستان کے لیے اور بڑھا چڑھا کر دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔

زوجۂ عزیز کو مصر کی حیلہ گر عورتوں کے بارے میں پتہ چلا تو پہلے وہ پریشان ہوئی۔ پھر اسے ایک تدبیر سوجھی۔ اس نے انہیں ایک دعوت پر مدعو کیا۔ فرش سجایا اور قیمتی گاؤ تکیے لگا دیئے۔ وہ آبیٹھیں تو ہر ایک کے ہاتھ میں پھل کاٹنے کے لیے چھری تھما دی (یہ چھریاں پھل کاٹنے کی ضرورت سے زیادہ تیز تھیں) (فلما سمعت بمکرھن ارسلت الیھن واعتدت لھن متکأ واتت کل واحدۃ منھن سکینا)۔[2]

یہ کام خود اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اپنے شوہر کی پرواہ نہ کرتی تھی اور گزشتہ رسوائی سے اس نے کوئی سبق نہ سیکھا تھا۔

اس کے بعد اس نے یوسف کو حکم دیا کہ اس مجلس میں داخل ہو تاکہ تنقید کرنے والی عورتیں اس کے حُسن و جمال کو دیکھ کر اسے اس کے اس عشق پر ملامت نہ کریں (وقالت اخرج علیھن)۔

"ادخل" (داخل ہو جاؤ) کی بجائے یہاں "اخرج علیھن" (ان کی طرف باہر نکلو) کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زوجۂ عزیز نے حضرت یوسفؑ کو کہیں باہر نہیں بٹھا رکھا تھا بلکہ اندر کے کسی کمرے میں کہ غالباً جہاں غذا اور پھل رکھا گیا تھا مشغول رکھا تھا تاکہ وہ محفل میں داخل ہونے والے دروازے سے نہ آئیں بلکہ بالکل غیر متوقع طور پر اور اچانک آئیں۔

زنانِ مصر جو بعض روایات کے مطابق دس یا اس سے زیادہ تھیں جب انہوں نے زیبا قامت اور نورانی

---

[1] تفسیر روح المعانی ج ۱۲ ص ۲۲۳۔

[2] "متکأ" - اس چیز کو کہتے ہیں جس پر تکیہ کیا جائے جیسے کرسیوں اور تخت کے پیچھے ٹیک یا پشت بنی ہوتی ہے اور جیسا کہ اس زمانے کے محلات میں معمول تھا لیکن بعض نے "متکأ" کا معنی ترنج بین کیا ہے کہ جو ایک قسم کا پھل ہے۔ جنہوں نے اس کا معنی ٹیک کیا ہے یہ بھی کہا ہے کہ وہ ترنج بین کی بنی ہوئی تھی۔ فارسی میں اسے بالنگ کہتے ہیں۔ یہ ترش مزہ پھل ہوتا ہے جس کا چھلکا موٹا ہوتا ہے اور اس کے موٹے چھلکے کا مربہ بنایا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ پھل مصر میں ہمارے پھل سے مشابہ ہو اور مکمل طور پر ترش نہ ہو۔

چہرہ دیکھا اور ان کی نظر یوسف کے دلربا چہرے پر پڑی تو انہیں یوں لگا جیسے اس محل میں آفتاب اچانک بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا ہے اور آنکھوں کو خیرہ کر رہا ہے۔ وہ اس قدر حیران اور دم بخود ہوئیں کہ انہیں ہاتھ اور پاؤں میں اور ہاتھ اور ترنج بین میں فرق بھول گیا۔ انہوں نے یوسف کو دیکھتے ہی کہا یہ تو غیر معمولی ہے (فلما رأینہ اکبرنہ)۔ وہ خود سے اس قدر بے خود ہوئیں کہ (ترنج بین کی بجائے) اپنے ہاتھ کاٹ لیے (وقطعن ایدیھن)۔ اور جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی دلکش آنکھوں میں تو عفت و حیا کا نور ضوفشاں ہے اور ان کے معصوم رخسار شرم و حیا سے گلگوں ہیں تو۔ سب پکار اٹھیں کہ نہیں یہ جوان ہرگز گناہ سے آلودہ نہیں ہے یہ تو کوئی بزرگوار آسمانی فرشتہ ہے (وقلن حاش للہ ما ھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم) [1]

اس بارے میں کہ زنانِ مصر نے اس وقت اپنے ہاتھوں کی کتنی مقدار کاٹی تھی، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض نے یہ بات مبالغہ آمیز طور پر نقل کی ہے لیکن قرآن سے اجمالاً یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔

اس وقت مصر کی عورتیں پوری طرح بازی ہار چکی تھیں۔ ان کے زخمی ہاتھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ پریشانی کے عالم میں وہ بے روح مجسمے کی طرح اپنی جگہ چپکی سی بیٹھی تھیں۔ ان کی حالت کہہ رہی تھی کہ انہوں نے زوجۂ عزیز سے کچھ کم نہیں کیا۔ اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور کہا: یہ ہے وہ شخص جس کے عشق پر تم مجھے طعنے دیتی تھیں (قالت فذٰلکن الذی لمتننی فیہ)۔

گویا زوجۂ عزیز چاہتی تھی کہ انہیں کہے کہ تم نے تو یوسف کو ایک مرتبہ دیکھا ہے اور یوں اپنے ہوش و حواس گنوا بیٹھی ہو کہ تم نے اپنے ہاتھ تک کاٹ لیے ہیں۔ اس کے جمال میں مستغرق ہوگئی ہو اور اس کی ثنا خوانی کرنے لگی ہو تو پھر مجھے کیونکر ملامت کرتی ہو جبکہ میں صبح و شام اس کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی ہوں۔

زوجۂ عزیز نے جو منصوبہ بنایا تھا اس میں اپنی کامیابی پر وہ بہت مغرور اور خوش تھی۔ وہ اپنے کام کو معقول ثابت کر رہی تھی۔ اس نے ایک ہی دفعہ تمام پردے ہٹا دیئے اور پوری صراحت کے ساتھ اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور کہا: جی ہاں! میں نے اسے اپنی آرزو پورا کرنے کے لیے دعوت دی تھی لیکن یہ بچا رہا (ولقد راودتہ عن نفسہ فاستعصم)۔

اس کے بعد بجائے اس کے کہ اپنے گناہ پر اظہارِ ندامت کرتی یا کم از کم مہمانوں کے سامنے کچھ پردہ پڑا رہنے دیتی اس نے بڑی بے اعتنائی اور سخت انداز میں کہ جس سے اس کا قطعی ارادہ ظاہر ہوتا تھا، صراحت کے ساتھ اعلان کیا: اگر اس (یوسف) نے میرا حکم نہ مانا اور میرے عشقِ سوزاں کے سامنے سر

---

[1] "حاش للہ" "حشی" کے مادہ سے ایک طرف کے معنی میں ہے اور "تحاشی" کنارہ کرنے کے معنی میں ہے اور "حاش للہ" کا معنی یہ ہے کہ خدا منزہ ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یوسف بھی پاک و منزہ بندہ ہے۔

نہ جھکایا تو یقیناً اسے قید میں جانا پڑے گا (ولئن لم یفعل ما اٰمرہ لیسجنن)۔ نہ صرف یہ کہ میں اسے زندان میں ڈال دوں گی بلکہ قید خانے کے اندر بھی ذلیل و خوار ہوگا (ولیکونًا من الصاغرین)۔

فطری امر ہے کہ جب عزیز مصر نے اس واضح خیانت پر اپنی بیوی سے فقط یہی کہنے پر قناعت کی کہ "واستغفری لذنبک" (اپنے گناہ پر استغفار کر) تو اس کی بیوی رسوائی کی اس منزل تک آپہنچی۔ اصولی طور پر جیسا کہ ہم نے کہا ہے مصر کے فرعون اور عزیزوں کے دربار میں ایسے مسائل کوئی نئی بات نہ تھی۔

بعض نے تو اس موقع پر ایک تعجب انگیز روایت نقل کی ہے۔ وہ یہ کہ چند زنانِ مصر جو اس دعوت میں موجود تھیں وہ زوجہ عزیز کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوئیں اور اسے حق بجانب قرار دیا۔ وہ یوسف کے گرد جمع ہوگئیں۔ اور ہر ایک نے یوسف کو رغبت دلانے کے لیے مختلف بات کی۔

ایک نے کہا: اے جوان! یہ اپنے آپ کو بچانا، یہ ناز و نخرے آخر کس لیے؟ کیوں اس عاشق دلدادہ پر رحم نہیں کرتے؟ کیا اس خیرہ کن جمالِ دل آرا کو نہیں دیکھتے؟ کیا تمہارے سینے میں دل نہیں ہے؟ کیا تم جوان نہیں ہو؟ کیا تمہیں عشق و زیبائی سے کوئی رغبت نہیں اور کیا تم پتھر اور لکڑی کے بنے ہوئے ہو۔

دوسری نے کہا: میں حیران ہوں چونکہ حُسن و عشق کی وجہ سے مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا لیکن کیا تم سمجھتے نہیں ہو کہ وہ عزیز مصر اور اس ملک کے صاحب اقتدار کی بیوی ہے؟ کیا تم یہ نہیں سوچتے کہ اس کا دل تمہارے ہاتھ میں ہو تو یہ ساری حکومت تمہارے قبضے میں ہوگی اور تم جو مقام چاہو تمہیں مل جائے گا؟۔

تیسری نے کہا: میں حیران ہوں کہ نہ تو تم اس کے جمالِ زیبا کی طرف مائل ہو اور نہ اس کے مقام و مال کی طرف لیکن کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ ایک خطرناک انتقام جو عورت ہے اور انتقام لینے کی طاقت بھی پوری طرح اس کے ہاتھ میں ہے؟ کیا تمہیں اس کے وحشتناک اور تاریک زندان کا کوئی خوف نہیں؟ کیا تم اس قیدِ تنہائی کے عالمِ غربت و بیچارگی کے بارے میں غور و فکر نہیں کرتے؟۔

ایک طرف عزیز کی بیوی کی دھمکی اور ان آلودہ گناہ عورتوں کا وسوسہ تھا کہ جو اس وقت دلّال کا کھیل کھیل رہی تھیں اور دوسری طرف یوسف کے لیے ایک شدید بحرانی لمحہ تھا۔ ہر طرف سے مشکلات کے طوفان نے انہیں گھیر رکھا تھا لیکن وہ تو پہلے سے اپنے آپ کو اصلاح سے آراستہ کیے ہوئے تھے۔ نورِ ایمان، پاکیزگی اور تقویٰ نے ان کی روح میں ایک خاص اطمینان پیدا کر رکھا تھا۔ وہ بڑی شجاعت اور عزم سے اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔ بغیر اس کے کہ وہ ان ہوس باز اور ہوس ران عورتوں سے باتوں میں الجھتے انہوں نے پروردگار کی بارگاہ کا رُخ کیا اور اس طرح سے دعا کرنے لگے: بارالٰہا! پروردگارا! جس کی طرف یہ عورتیں مجھے دعوت دیتی ہیں اس کی نسبت قید خانہ اپنی تمام تر سختیوں کے باوجود مجھے زیادہ محبوب ہے (قال رب السجن احب الیّ مما یدعوننی الیہ)۔

اس کے بعد چونکہ وہ جانتے تھے کہ تمام حالات میں خصوصاً مشکلات میں لطفِ الٰہی کے سوا کوئی راہ

نجات نہیں کہ جس پر بھروسہ کیا جائے، انہوں نے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کیا اور اس سے مدد مانگی اور پکارے، پروردگارا! اگر تو مجھے ان عورتوں کے مکر اور خطرناک منصوبوں سے نہ بچائے تو میرا دل ان کی طرف مائل ہو جائے گا اور میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا (و ان لا تصرف عنی کیدھن اصب الیھن و اکن من الجاھلین)۔ خداوندا! میں تیرے فرمان کا احترام کرتے ہوئے اور اپنی پاکدامنی کی حفاظت کرتے ہوئے اس وحشت ناک قید خانے کا استقبال کرتا ہوں۔ وہ قید خانہ کہ جس میں میری روح آزاد ہے اور میرا دامن پاک ہے اس کے بدلے میں اس ظاہری آزادی کو ٹھوکر مارتا ہوں کہ جس میں میری روح کو زندانِ ہوس نے قید کر رکھا ہو اور جو میرے دامن کو آلودہ کر سکتی ہے۔

خدایا! میری مدد فرما، مجھے قوت بخش اور میری عقل، ایمان اور تقویٰ کی طاقت میں اضافہ فرما تاکہ میں ان شیطانی وسوسوں پر کامیابی حاصل کروں۔

اور چونکہ خدا تعالیٰ کا ہمیشہ سے وعدہ ہے کہ وہ مخلص مجاہدین کی (چاہے وہ نفس کے خلاف برسرپیکار ہوں یا ظاہری دشمن کے خلاف) مدد کرے گا، اس نے یوسفؑ کو اس عالم میں تنہا نہ چھوڑا۔ حق تعالیٰ کا لطف و کرم اس کی مدد کو آگے بڑھا جیسا کہ قرآن کہتا ہے: اس کے پروردگار نے اس کی اس مخلصانہ دعا کو قبول کیا (فاستجاب لہ ربہ) ان کے مکر اور سازشوں کو پلٹا دیا (فصرف عنہ کیدھن) کیونکہ وہ سننے اور جاننے والا ہے (انہ ھو السمیع العلیم)۔ وہ بندوں کی دعا بھی سنتا ہے اور ان کے اندرونی اسرار سے بھی آگاہ ہے اور انہیں مشکلات سے بچانے کی راہ سے بھی واقف ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ طاغوت کے پرانے ہتھکنڈے: جیسا کہ ہم جانتے ہیں عزیز کی بیوی نے اور مصر کی دوسری عورتوں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے مختلف طریقے آزمائے۔ اظہارِ عشق کیا، شدید محبت ظاہر کی، اور تسلیم محض کا اظہار کیا۔ پھر لالچ دینے کی کوشش کی اور پھر ڈرایا دھمکایا۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے شہوت، زر اور زور کے تمام حربے استعمال کیے۔

یہی ہر خود غرض اور ہر زمانے کے طاغوت کا متفقہ اصول ہے۔ یہاں تک کہ ہم نے خود بارہا دیکھا ہے کہ وہ مردانِ حق کو جھکانے کے لیے پہلے تو انتہائی نرم دلی اور خوش روئی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پھر لالچ اور طرح طرح کی امداد کے ذریعے کام نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر کچھ نہ بن پائے تو پھر اسی موقع پر نہایت سخت دھمکیاں دیتے ہیں اور ہرگز کوئی لحاظ نہیں رکھتے کہ یہ تضاد بیانی ہے اور وہ بھی ایک ہی مجلس میں۔ ان کا یہ طریقہ کس قدر بُرا، تکلیف دہ اور باعثِ تحیر ہے۔

ان کے اس عمل کی دلیل واضح ہے۔ وہ تو اپنے ہدف کے متلاشی ہوتے ہیں لہٰذا ان کے لیے ذریعہ

اہمیت نہیں رکھتا۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ہر ذریعے سے فائدہ اٹھانا جائز سمجھتے ہیں۔

اس دوران کمزور اور کم رُشد افراد پہلے ہی مراحل میں یا آخری مرحلے میں جھک جاتے ہیں اور ہمیشہ کیلئے ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں لیکن اولیائے حق نور ایمان کے زیر سایہ حاصل کردہ عزم و شجاعت سے ان مراحل میں آگے نکل جاتے ہیں اور تمام تر قاطعیت سے اپنے سازش ناپذیر ہونے کا مظاہرہ کرتے ہیں اور آخری سانس تک کمال کی طرف رواں دواں رہتے ہیں۔

۲۔ تقویٰ یہ نہیں کہ ..... : بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جب تک وہ گڑھے کے کنارے ہوتے ہیں تو اپنے تئیں بہت پاک دامن قرار دیتے ہیں اور تقویٰ و پارسائی کی ڈینگیں مارتے ہیں اور زوجہ عزیز جیسے آلودہ افراد انہیں "ضلال مبین" میں دکھائی دیتے ہیں لیکن جب ان کا اپنا پاؤں گڑھے میں جا پڑتا ہے تو پہلے ہی پاؤں پر وہ پھسل جاتے ہیں۔ یہ لوگ عملی طور پر ثابت کرتے ہیں کہ ان کی باتیں زبانی دعویٰ سے زیادہ کچھ نہ تھیں۔

زوجہ عزیز تو کئی برس یوسف کے ساتھ رہنے کے بعد ان کے عشق میں گرفتار ہوئی لیکن اسے طعنے دینے والیاں تو پہلی نشست میں ہی مبتلائے عشق ہو گئیں اور ترنج بین کی بجائے اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں۔

۳۔ یوسف محفل زنان میں کیوں آئے؟ : یہاں ایک اور سوال سامنے آتا ہے وہ یہ کہ حضرت یوسف نے زوجہ عزیز کی بات کیوں مانی اور اس بات پر کیوں آمادہ ہو گئے کہ زوجہ عزیز مصر کی محفل میں قدم رکھیں کہ جو گناہ کے لیے برپا کی گئی تھی یا وہ ایک گناہ گار کو بے گناہ ثابت کرنے کیلئے تھی۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس محل میں یوسف کی حیثیت ایک غلام اور بردہ کی تھی۔ وہ مجبور تھے کہ وہاں خدمت کریں ہو سکتا ہے زوجہ عزیز نے خدمت کے بہانے ہی سے ایسا کیا ہو کہ انہیں کھانے کے برتن یا پینے کی کوئی چیز لانے کے بہانے محفل میں لے گئی ہو جبکہ حضرت یوسف اس منصوبے اور سازش سے آگاہ نہ تھے۔

۴۔ "یدعوننی الیہ" اور "کیدھن" کا مفہوم : "یدعوننی الیہ" کا معنی ہے "جس چیز کی یہ عورتیں مجھے دعوت دیتی ہیں" اور "کیدھن" کا معنی ہے "ان عورتوں کا منصوبہ" ان الفاظ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مصر کی ہوس باز عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لینے اور یوسف کی فریفتہ ہونے کے بعد باری باری خود بھی وہی کام کیا جو زوجہ عزیز نے کیا تھا اور انہوں نے بھی یوسف کو دعوت دی کہ وہ ان کے سامنے یا زوجہ عزیز کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور یوسف نے ان سب کو ٹھکرا دیا۔

یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ عزیز کی بیوی اس گناہ میں اکیلی نہ تھی اور کئی ایک اس کی شریک گناہ تھیں۔

۵۔ یوسف خدا کی پناہ میں : جب انسان مشکلات میں گھرا ہو اور کسی مصیبت کے کنارے تک

پہنچ جائے تو اسے صرف خدا کی پناہ لینا چاہیئے اور اسی سے مدد طلب کرنا چاہیئے کیونکہ اگر اس کا لطف وکرم اور نصرت و مدد نہ ہو تو کوئی کام بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ سبق ہے جو حضرت یوسف جیسے پاکدامن بزرگوار نے ہمیں دیا ہے۔ وہی ہیں جو کہتے ہیں: پروردگارا! اگر تُو ان کے منحوس منصوبوں سے مجھے نجات نہ دے تو میں بھی ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور اگر تو مجھے ان ہلاکت خیزیوں میں تنہا چھوڑ دے تو طوفانِ حوادث مجھے اپنے ساتھ لے جائے، تُو ہے کہ جو میرا حافظ و نگہبان ہے نہ کہ میری طاقت اور تقویٰ۔

لطف الٰہی سے وابستگی کی یہ حالت بندگانِ خدا کو لامحدود طاقت اور عزم عطا کرنے کے علاوہ اس کے الطافِ خفی سے بہرہ ور ہونے کا سبب بنتی ہے ۔ وہ الطاف کہ جن کی تعریف و توصیف ناممکن ہے ان کا صرف مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور اسی طرح ان کی تصدیق ہو سکتی ۔ ایسے ہی لوگ اس دنیا میں بھی لطفِ الٰہی کے سائے میں ہیں اور اُس جہان میں بھی لطفِ پروردگار سے ہمکنار ہوں گے۔ ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے مروی ہے:

سبعة يظلهم الله في ظل عرشه يوم لا ظل الا ظله : امام عادل ، و شاب نشأ في عبادة الله عزوجل ، ورجل قلبه متعلق بالمسجد اذا خرج منه حتى يعود اليه ، ورجلان كانا في طاعة الله عزوجل فاجتمعا على ذٰلك وتفرقا ، ورجل ذكر الله عزوجل خاليًا ففاضت عيناه ، ورجل دعته امراة ذات حسن وجمال فقال اني اخاف الله تعالٰى ، ورجل تصدق بصدقة فاخفاها حتى لا تعلم شماله ما تصدق بيمينه !

جس روز عرشِ الٰہی کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا اس دن اللہ تعالیٰ سات طرح کے لوگوں کو اپنے عرش کے سائے میں رکھے گا:

۰۔ امام عادل،

۰۔ وہ جوان کہ جس نے ابتدائے عمر ہی سے خدا کی بندگی میں پرورش پائی ہو،

۰۔ وہ شخص کہ جس کا دل مسجد اور عبادتِ الٰہی کے مرکز سے بندھا ہو۔ جب وہ اس سے نکلا ہو تو اس کے خیال میں رہتا ہو یہاں تک کہ اس کی طرف لوٹ آتا ہو،

۰۔ وہ لوگ جو فرمانِ خدا کی اطاعت میں مل جل کر کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے جدا ہوتے وقت ان کا روحانی رشتۂ اتحاد اسی طرح برقرار رہتا ہو،

۰۔ وہ شخص کہ پروردگار کا نام سنتے وقت جس کی آنکھوں سے (احساسِ مسئولیت سے یا گناہوں کے خوف سے) آنسو جاری ہو جاتے ہوں،

۰۔ وہ شخص کہ جسے حسین وجمیل عورت اپنی طرف دعوت دے اور وہ کہے کہ میں خدا

سے ڈرتا ہوں اور

۶۔ وہ شخص جو ضرورت مندوں کی مدد کرتا ہو اور اپنے صدقے کو اس طرح سے مخفی رکھتا ہو کہ دائیں ہاتھ سے دے تو بائیں کو خبر نہ ہونے پائے

(۳۵) ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰیٰتِ لَیَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰی حِیْنٍ ۝

(۳۶) وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَیٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّیْٓ اَرٰىنِیْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّیْٓ اَرٰىنِیْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِیْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝

(۳۷) قَالَ لَا یَاْتِیْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِیْلِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّاْتِیَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ ؕ اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝

(۳۸) وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ۝

۱۔ سفینۃ البحار ج ۱ ص ۵۹۵ (نقل)۔

ترجمہ

۳۵ جب وہ (یوسف کی پاکیزگی کی) نشانیاں دیکھ چکے تو انہوں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ اسے ایک مدت تک قید خانے میں رکھیں۔

۳۶ اور دو نوجوان اور اُس کے ساتھ قید خانے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے کہا: مَیں نے عالم خواب میں دیکھا ہے کہ شراب کے لیے (انگور) نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا، مَیں نے خواب میں دیکھا ہے کہ مَیں روٹیاں اپنے سر پر اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے ان میں سے کھا رہے ہیں۔ ہمیں ان کی تعبیر بتاؤ کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم نیکوکاروں میں سے ہو۔

۳۷ یوسف نے کہا: اس سے پہلے کہ تمہارے کھانے کا راشن تم تک پہنچے مَیں تمہیں تمہارے خواب کی تعبیر سے آگاہ کردوں گا، یہ وہ علم ہے جس کی تعلیم میرے پروردگار نے مجھے دی ہے مَیں نے ان لوگوں کے دین کو ترک کر رکھا ہے جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں (اسی لیے مَیں ایسی نعمت کے لائق ہوا ہوں)۔

۳۸ مَیں نے اپنے آباء ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کی پیروی کی ہے۔ ہمارے لیے یہ مناسب نہ تھا کہ کسی کو خدا کا شریک قرار دیں، یہ خدا کا ہم لوگوں پر فضل ہے لیکن اکثر لوگ شکرگزاری نہیں کرتے۔

تفسیر

بے گناہی کی پاداش میں قید

قصرِ عزیز میں یوسف کی موجودگی میں زنانِ مصر کی حیران کن محفل اُس شور و غوغا کے عالم میں تمام ہوئی۔

فطری بات تھی کہ یہ خبر عزیز کے کان تک پہنچ گئی۔ ان تمام واقعات سے واضح ہو گیا کہ یوسف کوئی معمولی انسان نہیں ہے اور اس قدر پاکیزہ ہے کہ کوئی طاقت اسے گناہ پر ابھار نہیں سکتی۔ مختلف حوالوں سے اکی پاکیزگی کی نشانیاں واضح ہوئیں۔

یوسف کی قمیص کا پیچھے سے پھٹا ہونا، زنانِ مصر کے وسوسے کے مقابلے میں استقامت کا مظاہرہ کرنا، قید خانے میں جانے کے لیے آمادہ ہونا اور زوجۂ عزیز کی طرف سے قید اور عذاب الیم کی دھمکیوں کے سامنے سر نہ جھکانا یہ سب اس کی پاکیزگی کی دلیل تھیں۔ یہ ایسے دلائل تھے کہ کوئی شخص نہ اسے چھپا سکتا تھا نہ ان کا انکار کر سکتا تھا۔ ان کا لازمی نتیجہ زوجۂ عزیزِ مصر کی ناپاکی اور جرم تھا۔ یہ جرم ثابت ہونے کے بعد عوام میں خاندانِ عزیز کی جنسی حوالے سے رسوائی کا خوف بڑھ رہا تھا۔ عزیزِ مصر اور اس کے مشیروں کو اس کے لیے صرف یہی چارہ دکھائی دیا کہ یوسفؑ کو منظر سے ہٹا دیا جائے، اس طرح سے کہ لوگ اسے اور اس کا نام بھول جائیں۔ اس کیلئے ان کی نظر میں بہترین راستہ اسے تاریک قید خانے میں بھیجنا تھا کہ جس سے یوسف کو بھلا بھی دیا جائے گا اور وہ یہ بھی سمجھیں گے کہ اصلی مجرم یوسف تھا۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے: جب انہوں نے (یوسف کی پاکیزگی کی) نشانیاں دیکھ لیں تو پختہ ارادہ کر لیا کہ اسے ایک مدت تک قید میں ڈالا جائے (ثم بدالهم من بعد مارأ وا الأيات ليسجننه حتیٰ حين)۔

"بدا" کا معنی ہے "نئی رائے پیدا ہونا" یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ پہلے اس کے بارے میں ان کا کوئی ارادہ نہ تھا اور پہلی مرتبہ زوجۂ عزیز نے یہ بات احتمال کے طور پر پیش کی تھی۔ بہر حال اس طرح یوسفؑ پاکدامنی کے گناہ میں قید خانے میں پہنچ گئے اور یہ پہلی مرتبہ نہ تھا کہ ایک قابل اور لائق انسان پاکیزگی کے جرم میں زندان میں گیا۔

جی ہاں! ایک آلودہ اور گندے ماحول میں آزادی تو ان آلودہ لوگوں کے لیے ہوتی ہے جو پانی کے بہاؤ کے ساتھ چلتے ہیں۔ ایسے ماحول میں نہ صرف آزادی بلکہ سب کچھ انہی کو میسر ہوتا ہے اور یوسف جیسے پاکدامن اور قیمتی افراد کہ جو اس ماحول کے رنگ میں رنگے نہیں جاتے اور پانی کے بہاؤ کے مخالف چلتے ہیں انہیں ایک طرف ہونا پڑتا ہے لیکن کب تک؟ کیا ہمیشہ کے لیے؟ نہیں یقیناً نہیں۔

یوسفؑ کے ساتھ زندان میں داخل ہونے والوں میں دو جوان بھی تھے (ودخل معه السجن فتيان)۔

جب انسان کسی معمول کے طریقے سے خبروں تک رسائی حاصل نہ کر سکے تو اس کیلئے دوسرے احساسات کو استعمال کرتا ہے تاکہ حوادث کا اندازہ لگا سکے۔ خواب بھی اس مقصد کے لیے کارآمد ہو سکتا ہے۔

اسی بناء پر۔ دو نوجوان کہ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک بادشاہ کے گھر مشروبات پر مامور تھا اور دوسرا باورچی خانے کا کنٹرولر دشمنوں کی چغلخوری اور بادشاہ کو زہر دینے کے الزام میں قید تھے، ایک روز

یوسف کے پاس آئے۔ دونوں نے اپنا گزشتہ شب کا خواب سنایا جو کہ ان کے لیے عجیب تھا۔ ایک نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ شراب بنانے کے لیے انگور نچوڑ رہا ہوں (قال احدھما انی اراٰنی اعصر خمرًا)۔

دوسرے نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں نے کچھ روٹیاں سر پہ اٹھا رکھی ہیں اور آسمان کے پرندے آتے ہیں اور ان میں سے کھاتے ہیں (وقال الاٰخر انی اراٰنی احمل فوق رأسی خبزًا تاکل الطیر منہ)۔

اس کے بعد انہوں نے مزید کہا: ہمیں ہمارے خواب کی تعبیر بتاؤ کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم نیکو کاروں میں سے ہو (نبئنا بتاویلہ انا نراک من المحسنین)۔

یہ کہ ان دونوں جوانوں کو کیسے معلوم ہوا کہ یوسف تعبیر خواب کے بارے میں اتنا وسیع علم رکھتے ہیں، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یوسف نے خود سے قید خانے میں قیدیوں سے اپنا تعارف کروایا تھا کہ وہ تعبیر خواب کے بارے میں وسیع علم رکھتے ہیں۔

بعض دیگر نے کہا ہے کہ یوسف کی طرح صفات نشاندہی کرتی تھیں کہ وہ ایک عام آدمی نہیں ہیں بلکہ آگاہ اور صاحب فکر و بینش انسان ہیں۔ اسی سے انہوں نے سمجھا کہ ایسا انسان تعبیر خواب کے بارے میں درپیش مشکل کو حل کر سکتا ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت یوسف نے قید خانے میں آتے ہی اپنے نیک اطوار، حسن اخلاق اور قیدیوں کی دلجوئی، خدمت اور بیماروں کی عیادت سے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ ایک نیک اور گرہ کشا انسان ہیں۔ اسی لیے قیدی مشکلات میں انہی کی پناہ لیتے تھے اور ان سے مدد مانگتے تھے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ یہاں قرآن نے لفظ "عبد" یا "بردہ" کی بجائے لفظ "فتی" (جوان) استعمال کیا ہے جو کہ ایک قسم کا احترام ہے۔ ایک حدیث میں ہے:

لا یقولن احدکم عبدی وامتی ولکن فتای وفتاتی۔

تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ میرا غلام اور میری کنیز بلکہ کہو میرا جوان (لڑکا یا لڑکی)۔[1]

(یہ اس لیے تھا تاکہ اسلام نے غلاموں کی آزادی کے لیے جو وسیع پروگرام بنایا ہے اس تدریجی آزادی کے دور میں بھی غلام ہر قسم کی تحقیر و تذلیل سے محفوظ رہیں)۔

جملہ "انی اعصر خمرًا" (میں شراب نچوڑ رہا ہوں)، یا اس بنا پر ہے کہ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ شراب بنانے کے لیے انگور نچوڑ رہا تھا یا وہ انگور جو خم میں تھا شراب ہو چکا تھا اسے وہ صاف کرنے

---

[1] کنز العمال ج ۹ ص ۳۳۴۔

کے لیے اور شراب بنانے کے لیے باہر نکال کر نچوڑ رہا تھا یا یہ کہ انگور نچوڑ رہا تھا تاکہ انگور کا پانی بادشاہ کو دے بغیر شراب بناتے ہوئے لیکن چونکہ یہ انگور شراب میں تبدیل ہونے کے قابل ہے اس لیے اس کے لیے لفظ "خمر" استعمال کیا گیا ہے۔

"اری" (میں دیکھ رہا ہوں)، یہ جملہ حالیہ ہے حالانکہ قاعدتاً اسے کہنا چاہیے تھا کہ "میں نے خواب میں دیکھا ہے" یعنی بیان کرتے ہوئے وہ اپنے تئیں خواب میں فرض کرتا ہے اور اس حالت کی تصویر کشی کرتے ہوئے اسے بیان کرتا ہے۔

بہرحال وہ یوسف کہ جو قیدیوں کی ہدایت اور راہنمائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے انہوں نے ان دو قیدیوں کی طرف سے تعبیر خواب کے لیے رجوع کرنے کو غنیمت جانا اور اس بہانے سے ایسے اہم حقائق بیان کیے جو ان کے تعبیر خواب سے متعلق اپنی آگاہی کے بارے میں کہ جو ان دو قیدیوں کے لیے بہت اہمیت رکھتے تھے، اور تمام انسانوں کے لیے راستہ کھولنے والے تھے۔ آپ نے پہلے تو ان کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ان سے کہا: تمہارے کھانے کا راشن آنے سے پہلے میں تمہیں خواب کی تعبیر سے آگاہ کردوں گا (قال لا یأتیکما طعام ترزقانه الا نبأتکما بتأویله قبل ان یأتیکما)۔

اس طرح آپ نے انہیں اطمینان دلایا کہ کھانا آنے سے پہلے وہ اپنا مقصود پالیں گے۔

اس جملے کی تفسیر کے بارے میں مفسرین نے بہت سے احتمالات ذکر کیے ہیں۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت یوسف نے کہا کہ میں حکم پروردگار سے کچھ اسرار سے آگاہ ہوں اور نہ صرف تمہارے خواب کی تعبیر بتاؤں گا بلکہ میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ تمہارے لیے آج کونسی اور کس قسم کی غذا لائی جائے گی اور میں اس کی خصوصیات بھی بتا سکتا ہوں۔ اس بنا پر "تاویل" سے یہاں مراد "غذا کی خصوصیات" ہیں (البتہ اس معنی میں "تاویل" کا استعمال بہت کم ہوا ہے خصوصاً گزشتہ جملے میں یہ لفظ تعبیر خواب کے معنی میں ہے)۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ کی مراد یہ تھی کہ تم جس قسم کا طعام خواب میں دیکھو میں تم سے اس کی تعبیر بیان کر سکتا ہوں لیکن یہ احتمال "قبل ان یاتیکما" کے جملے سے مناسبت نہیں رکھتا۔

اس بنا پر مذکورہ جملہ کی بہترین تفسیر وہی ہے جو ہم نے ابتدائے سخن میں پیش کی ہے۔

اس کے بعد باایمان اور خدا پرست یوسفؑ کہ جن کے وجود کی گہرائیوں میں توحید پوری وسعت سے جڑ پکڑ چکی تھی، نے یہ واضح کرنے کے لیے کہ امر الٰہی کے بغیر کوئی چیز حقیقت کا روپ اختیار نہیں کرتی، اپنی بات کو اسی طرح سے جاری رکھا: تعبیر خواب کے متعلق میرا یہ علم و دانش ان امور میں سے ہے کہ جن کی تعلیم مجھے میرے پروردگار نے دی ہے (ذلکما مما علمنی ربی)۔

نیز اس بنا پر کہ وہ یہ خیال نہ کریں کہ خدا کوئی چیز بغیر کسی بنیاد کے بخش دیتا ہے، آپ نے مزید فرمایا:

میں نے ان لوگوں کا دین و مذہب ترک کر دیا ہے کہ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے منکر ہیں اور اس نور ایمان اور تقویٰ نے مجھے اس نعمت کے لائق بنایا ہے (انی ترکت ملۃ قوم لا یؤمنون باللہ وھم بالاٰخرۃ ھم کافرون)۔

اس قوم و ملت سے مصر کے بت پرست لوگ یا کنعان کے بت پرست مراد ہیں۔

مجھے ایسے عقائد سے الگ ہی ہونا چاہیئے کیونکہ یہ انسان کی پاک فطرت کے خلاف ہیں۔ علاوہ ازیں میں نے ایسے خاندان میں پرورش پائی ہے کہ جو وحی و نبوت کا خاندان ہے۔ میں نے اپنے آباء و اجداد اور بزرگوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے دین کی پیروی کی ہے (واتبعت ملۃ اٰبائی ابراھیم و اسحاق و یعقوب)۔

شاید پہلا موقع تھا کہ حضرت یوسفؑ نے قیدیوں سے اپنا تعارف کروایا تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ وحی و نبوت کے گھرانے سے ہیں اور دیگر بہت سے قیدیوں کی طرح کہ جو ظالمانہ نظاموں میں قید ہوتے ہیں بیگناہ زندان میں ڈالے گئے ہیں۔

انہوں نے مزید کہا: ہمارے لیے مناسب نہیں کہ کسی چیز کو خدا کا شریک قرار دیں۔ کیونکہ ہمارا خاندان خاندانِ توحید ہے، بت شکن ابراہیم کا خاندان ہے (ماکان لنا ان نشرک باللہ من شیء)۔ اور یہ ہم پر اور تمام لوگوں پر خدا کی نعمات میں سے ہے (ذٰلک من فضل اللہ علینا وعلی الناس)۔

لہٰذا یہ خیال نہ کرنا کہ خدا کا یہ فضل اور محبت صرف ہم خانوادہ نبوت کے شاملِ حال ہوئی ہے بلکہ یہ ایسی نعمت ہے جو عام ہے اور تمام بندگانِ خدا کے شاملِ حال ہے کہ جو اُن کی روح کے اندر ایک فطرت کے عنوان سے ودیعت کی گئی ہے اور یہ انبیاء کی رہبری و ہدایت کے ذریعے کمال حاصل کرتی ہے۔

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ: اکثر انسان ان خدائی نعمات کی شکر گزاری نہیں کرتے۔ اور راہِ توحید سے منحرف ہو جاتے ہیں (ولٰکن اکثر الناس لا یشکرون)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں حضرت اسحاقؑ کا نام حضرت یوسفؑ کے "آباء" کے زمرے میں آیا ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ حضرت یعقوبؑ کے بیٹے ہیں اور حضرت یعقوبؑ حضرت اسحاقؑ کے فرزند ہیں، یہ اس بنا پر ہے کیونکہ لفظ "اب" کا اطلاق "جد" پر بھی ہوتا ہے۔

(۳۹) يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؕ

(۴۰) مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۚ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۚ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ

(۴۱) يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۚ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ؕ

(۴۲) وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ؕ

ترجمہ

(۳۹) اے میرے قیدی دوستو! کیا متفرق خدا بہتر ہیں یا واحد و قہار خدا؟

(۴۰) یہ معبود کہ جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو ان کی حیثیت اسماء (بلا مسمیٰ) کے اور کچھ نہیں کہ جنہیں تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے خدا کا نام دے رکھا ہے۔ خدا نے اس کے لیے کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے۔ حکم کرنے کا حق صرف خدا کو ہے۔

اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہ ہے محکم دین لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(۴۱) اے میرے قیدی دوستو! بہرحال تم میں سے ایک (آزاد ہو جائے گا اور) اپنے صاحب کو شراب پلانے کا کام کرے گا۔ رہا دوسرا تو وہ سولی پر لٹکایا جائے گا اور پرندے اس کے سر میں سے کھائیں گے۔ جس امر کے بارے میں تم نے مجھ سے دریافت کیا ہے وہ قطعی اور حتمی ہے۔

(۴۲) ان دونوں میں سے جس کے متعلق وہ جانتا تھا کہ وہ رہائی پائے گا اس سے کہا کہ اپنے صاحب (بادشاہ مصر) کے پاس میرا ذکر کرنا لیکن اس کے صاحب کے پاس شیطان اس کی یاد اس کے دل سے لے گیا لہٰذا اس کے بعد وہ چند سال قید میں رہا۔

تفسیر

قید خانہ یا مرکز تربیت

جس وقت حضرت یوسفؑ نے گزشتہ گفتگو کے بعد ان قیدیوں کے دلوں کو حقیقت توحید قبول کرنے کے لیے آمادہ کر لیا تو ان کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا: اے میرے قیدی ساتھیو! کیا متفرق خدا اور متفرق معبود بہتر ہیں یا یگانہ و یکتا اور قہار اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا خدا (یاصاحبی السجن ءارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القهار)۔

گویا یوسفؑ انہیں سمجھانا چاہتے تھے کہ کیوں تم فقط عالم خواب میں آزادی کو دیکھتے ہو بیداری میں کیوں نہیں دیکھتے، آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا اس کا سبب تمہارا انتشار، تفرقہ بازی اور نفاق نہیں کہ جس کا سرچشمہ شرک، بت پرستی اور ارباب متفرق ہیں جن کی وجہ سے ظالم طاغوت تم پر غالب آگئے ہیں۔ تم لوگ پرچم توحید کے تلے کیوں جمع نہیں ہوتے اور «اللہ واحد قہار» کا دامن پرستش کیوں نہیں تھامتے تاکہ ان خود غرض ستمگروں کو اپنے معاشرے سے نکال باہر کرو کہ جو تمہیں بے گناہ اور صرف الزام کی بنیاد پر قید میں ڈال دیتے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے مزید کہا : یہ جو غیر خدا معبود تم نے بنا رکھے ہیں ان کی حیثیت اسماء بلا مسمی کے کچھ نہیں کہ جنہیں تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے خدا کا نام دے رکھا ہے (ما تعبدون من دونہ الا اسماء سمیتموھا انتم و اباؤکم)۔

• یہ ایسے امور ہیں کہ جن کے لیے خدا نے کوئی دلیل و مدرک نازل نہیں فرمایا " بلکہ یہ تمہارے کمزور ذہن کی پیداوار ہیں (ما انزل اللہ بھا من سلطان)۔

• جان لو کہ حکومت خدا کے علاوہ کسی کے لیے نہیں ہے " اور اسی لیے تمہیں ان بتوں، طاغوتوں اور فرعونوں کی تعظیم کے لیے سر نہیں جھکانا چاہیئے (ان الحکم الا للہ)۔

انہوں نے مزید تاکید کے لیے اضافہ کیا : خدا نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرو (امر ان لا تعبدوا الا ایاہ)۔ • یہ ہے مستحکم و مستقیم دین " کہ جس میں کسی قسم کا کوئی پیچ و خم نہیں (ذلك الدین القیم)۔

یعنی توحید ہر لحاظ سے ـــ عبادت، معاشرے پر حکومت، ثقافت اور ہر چیز میں مستحکم اور مستقیم دین ہے۔

لیکن کیا کیا جائے کہ لوگ ہی آگاہی نہیں رکھتے اور اسی عدم آگہی کے باعث شرک کی بھول بھلیوں میں سرگرداں ہیں اور اپنے آپ کو غیر اللہ کی حکومت کے سپرد کر دیتے ہیں اور اس طرح انہیں کیسی کیسی سختیوں، قید و بند اور بدبختیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے (ولکن اکثر الناس لا یعلمون)۔

اپنے دو قیدی ساتھیوں کو رہبری و ارشاد اور انہیں حقیقت توحید کی طرف مختلف پہلوؤں کے حوالے سے دعوت دینے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کے خواب کی تعبیر بیان کی کیونکہ وہ دونوں اسی مقصد کے لیے آپ کے پاس آئے تھے اور آپ نے بھی انہیں قول دیا تھا کہ انہیں ان کے خوابوں کی تعبیر بتائیں گے لیکن آپ نے موقع غنیمت جانا اور توحید کے بارے میں اور شرک کے خلاف واضح اور زندہ دلائل کے ساتھ گفتگو کی۔

اس کے بعد آپ نے ان دو قیدی ساتھیوں کی طرف رُخ کر کے کہا : اے میرے قیدی ساتھیو! تم میں سے ایک آزاد ہو جائے گا اور اپنے "ارباب" کو شراب پلانے پر مامور ہوگا (یا صاحبی السجن اما احدکما فیسقی ربہ خمرا)۔ لیکن دوسرا سولی پر لٹکایا جائے گا اور اتنی دیر تک اس کی لاش لٹکائی جاتے گی کہ آسمانی پرندے اس کے سر کو نوچ نوچ کر کھائیں گے (واما الاخر فیصلب فتاکل الطیر من رأسہ)۔

ان دونوں مذکورہ خوابوں کی مناسبت سے اگرچہ اجمالاً واضح تھا کہ ان میں سے کون آزاد ہوگا اور کون سولی پر لٹکایا جائے گا لیکن حضرت یوسفؑ نے نہ چاہا کہ یہ ناگوار خبر اس سے زیادہ صراحت سے بیان کریں لہذا آپ نے "تم میں سے ایک" کہہ کر گفتگو کی۔

اس کے بعد اپنی بات کی تائید کے لیے مزید کہا : یہ معاملہ جس کے بارے میں تم نے مجھ سے سوال کیا ہے اور مسئلہ پوچھا ہے حتمی اور قطعی ہے (قضی الامر الذی فیہ تستفتیان)۔ یہ اس طرف اشارہ تھا کہ یہ خواب کی کوئی معمولی سی تعبیر نہیں ہے بلکہ ایک غیبی خبر ہے جسے میں نے الٰہی تعلیم سے حاصل کیا ہے لہٰذا اس مقام پر تردد و شک اور چون و چرا کی کوئی گنجائش نہیں۔

بہت سی تفاسیر میں اس جملے کے ذیل میں مرقوم ہے کہ جب دوسرے شخص نے یہ ناگوار خبر سنی تو وہ اپنی بات کی تکذیب کرنے لگا اور کہنے لگا، میں نے جھوٹ بولا تھا، میں نے ایسا کوئی خواب نہیں دیکھا تھا میں نے مذاق کیا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ اگر وہ اپنے خواب کی تردید کر دے گا تو اس کی سرنوشت تبدیل ہو جائے گی۔ لہٰذا حضرت یوسف نے ساتھ ہی یہ بات کہہ دی کہ جس چیز کے بارے میں تم نے دریافت کیا وہ ناقابلِ تغیر ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ حضرت یوسف کو اپنی تعبیرِ خواب پر اس قدر یقین تھا کہ انہوں نے یہ جملہ تاکید کے طور پر کہا۔

لیکن جس وقت آپ نے محسوس کیا کہ یہ دونوں عنقریب ان سے جدا ہو جائیں گے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ ان کے ذریعے آزادی کا کوئی دریچہ کھل جاتے اور روشنی کی کوئی کرن پھوٹے اور جس گناہ کی آپؑ کی طرف نسبت دی گئی تھی اس سے اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کریں۔ آپؑ نے ان دو قیدی ساتھیوں میں سے جس کے بارے میں جانتے تھے کہ وہ آزاد ہو گا اس سے فرمائش کی کہ اپنے مالک و صاحبِ اختیار (بادشاہ) کے پاس میرے متعلق بات کرنا۔ تاکہ وہ تحقیق کرے اور میری بے گناہی ثابت ہو جائے (وقال للذی ظن انہ ناج منھما اذکرنی عند ربک)۔

لیکن اس فراموش کار غلام نے یوسف کا مسئلہ بالکل بھلا دیا جیسا کہ کم ظرف لوگوں کا طریقہ ہے کہ جب نعمت حاصل کر لیتے ہیں تو صاحبِ نعمت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ البتہ قرآن نے یہ بات یوں بیان کی ہے: جب وہ اپنے مالک کے پاس پہنچا تو شیطان نے اس کے دل سے یوسف کی یاد بھلا دی (فانساہ الشیطان ذکر ربہ) اور اس طرح یوسف فراموش کر دیئے گئے۔ اور چند سال مزید قید خانے میں رہے (فلبث فی السجن بضع سنین)۔

اس بارے میں کہ "انساہ الشیطان" کی ضمیر بادشاہ کے ساقی کے لیے ہے یا حضرت یوسفؑ کیلئے، اس سلسلے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے۔

بہت سوں کے نزدیک یہ ضمیر حضرت یوسفؑ کی طرف لوٹتی ہے۔ اس احتمال کی بنا پر جملے کا معنی اس طرح ہو گا، شیطان یادِ خدا یوسفؑ کے دل سے لے گیا اور اسی بنا پر وہ غیرِ خدا سے متوسل ہوئے۔

لیکن گزشتہ جملے کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یوسف نے اس سے فرمائش کی تھی کہ میرا تذکرہ اپنے صاحبؑ

ملک سے کرتا، ظاہری مفہوم یہ نکلتا ہے کہ ضمیر ساقی کی طرف لوٹتی ہے۔ اور لفظ "رب" کا دونوں جگہ ایک ہی مفہوم ہے۔

علاوہ ازیں "وادکر بعد امة" (ایک مدت کے بعد اسے یاد آیا)۔ یہ جملہ بھی بعد کی چند آیات میں اس داستان کے ذیل میں ساقی کے بارے میں آیا ہے، جو نشاندہی کرتا ہے کہ بھول جانے والا وہی تھا نہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام۔

البتہ زندان یا دیگر مشکلات سے نجات کے لیے ایسی کوشش عام افراد کے لیے کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے اور طبیعی اسباب سے کام لینے کے ضمن میں ہے لیکن ایسے افراد کے لیے کہ جو نمونہ ہوں اور ایمان و توحید کی بلند سطح پر فائز ہوں ان کے لیے اشکال سے خالی نہیں ہو سکتی۔ شاید اسی بنا پر خدا نے یوسف کے اس "ترک اولیٰ" کو نظر انداز نہیں کیا اور اس کی وجہ سے ان کی قید چند سال مزید جاری رہی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

مجھے اپنے بھائی یوسف پر تعجب ہوتا ہے کہ انہوں نے کیونکر خالق کی بجائے مخلوق کی پناہ لی اور اس سے مدد طلب کی۔[1]

ایک اور روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

اس واقعے کے بعد جبرائیل یوسف کے پاس آئے اور کہا: کس نے تمہیں سب لوگوں سے زیادہ حسین بنایا؟

کہنے لگے: میرے پروردگار نے۔

کہا: کس نے تمہارے باپ کے دل میں تمہاری اس قدر محبت ڈالی؟

بولے: میرے پروردگار نے۔

کہا: کس نے قافلے کو تمہاری طرف بھیجا تاکہ وہ تمہیں کنویں سے نجات دے؟

کہنے لگے: میرے پروردگار نے۔

پوچھا: کس نے اس پتھر کو (جو انہوں نے کنویں کے اوپر سے گرایا تھا) تم سے دور رکھا؟

بولے: میرے پروردگار نے۔

پوچھا: کس نے تمہیں کنویں سے نجات دی؟

کہنے لگے: میرے پروردگار نے۔

کہا: کس نے مصر کی عورتوں کے مکر و فریب سے تمہیں دور رکھا؟

کہنے لگے: میرے پروردگار نے۔

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

اس پر جبرائیل نے کہا، تمہارا پروردگار کہہ رہا ہے کس چیز کے سبب تم اپنی حاجت مخلوق کے پاس لے گئے ہو اور میرے پاس نہیں لائے ہو۔ لہٰذا چاہیئے کہ چند سال زندان میں رہو۔[1]

چند اہم نکات

۱۔ قید خانہ مرکز ہدایت یا بُرائی کا دبستان : دُنیا میں زندان کی تاریخ بہت ہی دردناک اور غم انگیز ہے۔ بدترین مجرم اور بہترین انسان دونوں قید خانے میں رہے ہیں۔ اسی بنا پر قید خانہ ہمیشہ بہترین اصلاحی یا بدترین بُری چیزیں سکھانے کا مرکز رہا ہے۔ قید خانے میں اگر تباہ کار اور بُرے لوگ ایک جگہ جمع ہو جائیں تو در حقیقت یہ بُرائی کی ایک بڑی سطح کی تربیت گاہ بن جاتی ہے۔ ان قید خانوں میں تخریبی منصوبوں پر تبادلۂ خیالات ہوتا ہے اور مجرم اپنے تجربات ایک دوسرے تک پہنچاتے ہیں اور ہر مجرم در اصل اپنا خصوصی درس دوسروں تک پہنچاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ جیل سے نکل کر آزادی کے بعد پہلے سے بہتر اور زیادہ ماہرانہ انداز میں اپنے جرائم جاری رکھتے ہیں۔ یہ لوگ آپس میں مربوط ہو کر اور نئے انداز میں اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ البتہ جیل کے نگران اس سلسلے میں خصوصی نگرانی کریں، قیدیوں کو تبلیغ و وعظ کا انتظام کریں اور ان کی تربیت کا اہتمام کریں یہ ذہن میں رکھتے ہوئے کہ یہ لوگ عام طور پر با صلاحیت ہوتے ہیں تو انہیں صالح، مفید اور اصلاح شدہ افراد میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

رہے وہ زندان کہ جن میں پاک نیک، بے گناہ، حق و آزادی کے مجاہدین ہوتے ہیں، وہاں عقائد، عملی جہاد کے طریقوں اور اصلاحی امور کی تدریس ہوتی ہے۔ ایسے زندان راہِ حق کے مجاہدین کے لیے اچھا موقع مہیا کرتے ہیں کہ وہ آزادی کے بعد اپنی کاوشوں کو ہم آہنگ اور منظم کر سکیں۔

حضرت یوسف کہ جو (وجہ عزیزِ مصر جیسی ہوس باز، حیلہ گر اور ہٹ دھرم عورت کے خلاف کامیاب ہوتے تھے ان کی کوشش تھی کہ قید خانے کے ماحول کو ارشاد و ہدایت اور تعلیم و تربیت کے مرکز میں بدل دیں یہاں تک کہ اپنی اور دوسروں کی آزادی کی بنیاد انہی پروگراموں پر رکھ دیں۔

یہ سرگزشت ہمیں یہ اہم درس دیتی ہے کہ ارشاد اور تعلیم و تربیت کسی معین مرکز مثلاً مسجد و مدرسہ میں محدود و محصور نہیں ہے بلکہ اس مقصد کے لیے ہر موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ یہاں تک کہ قید خانے میں بھی اور اسیری کی زنجیروں میں جکڑے ہونے کی حالت میں بھی۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قید کی مجموعی مدت سات سال تھی لیکن بعض کا کہنا ہے کہ آپ قیدیوں کے خواب کے واقعہ سے پہلے پانچ سال قید میں رہے اور اس کے بعد بھی سات سال قید رہے۔ یہ بہت رنج و زحمت کے سال تھے لیکن ارشاد و ہدایت اور اصلاح و تربیت

---

[1] مجمع البیان، ج ۵، ص ۲۳۴۔

کے لحاظ سے بہت پُربرکت تھے۔[1]

۲۔ جہاں نیک سولی پر لٹکائے جاتے ہیں: یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس داستان میں ہے کہ جس نے خواب میں دیکھا تھا کہ شراب کا جام بادشاہ کو تھما رہا ہے وہ رہا ہو گیا اور جس نے دیکھا تھا کہ روٹیوں کا طبق اس کے سر پر ہے اور فضا کے پرندے اس میں سے کھا رہے ہیں وہ سولی پر لٹکا دیا گیا۔

کیا اس کا مفہوم یہ نہیں کہ فاسد اور گندے ماحول میں اور طاغوتی حکومتوں میں وہ لوگ آزاد ہیں جو اپنی شہوات کی راہ پر چلتے ہیں اور جو معاشرے کی خدمت، مدد اور بھوکوں کو روٹی کھلانے کی کوشش کرتے ہیں وہ زندگی کا حق نہیں رکھتے، ایسے لوگوں کا انجام موت ہے۔

جس معاشرے پر خراب اور فاسد نظام حکمران ہو اس کی یہی کیفیت ہوتی ہے اور ایسے معاشرے میں اچھے اور بُرے لوگوں کی ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے۔

۳۔ آزادی کا عظیم درس: ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے قیدیوں کو جو سب سے بالا درس دیا ہے وہ توحید پرستی کا درس ہے۔ وہی درس کہ جس کا خلاصہ حریت و آزادی ہے۔

وہ جانتے تھے کہ "ارباب متفرقون"، منتشر مقاصد اور مختلف معبود، تفرقہ اور پراگندگی کا سرچشمہ ہیں اور جب تک تفرقہ اور انتشار موجود ہے طاغوت اور جابر افراد لوگوں پر مسلط رہیں گے لہٰذا آپ نے ان کی جڑ کاٹنے کا حکم دیا اور اس کے لیے توحید کی شمشیرِ بُرّاں سے کام لینے کے لیے کہا تاکہ آزادی کو صرف خواب میں نہ دیکھتے رہیں بلکہ عالمِ بیداری میں دیکھیں۔

لیکن جابر اور متکبر لوگوں کی گردنوں پر سوار ہوتے ہیں اگرچہ وہ کم ہوتے ہیں مگر تفرقہ بازی اور نفاق سے کام لیتے ہیں۔ یہ لوگ "ارباب متفرقون" کے ذریعے معاشرے کی طاقت کو منتشر کر دیتے ہیں اور اس طرح عوام کی عظیم کثرت پر حکومت کرنا ان کے لیے ممکن ہو جاتا ہے۔

جس دن قومیں توحید اور وحدتِ کلمہ کی طاقت سے آشنا ہوں گی اور سب لوگ "اللہ الواحد القہار" کے پرچم تلے جمع ہو جائیں گے اور اپنی عظیم قوت کا ادراک کریں گے وہ دن جابروں اور متکبروں کی نابودی کا دن ہوگا۔ یہ درس ہمارے آج کے لیے، ہمارے کل کے لیے تمام انسانی معاشروں کے لیے اور پوری تاریخ کے سب انسانوں کے لیے بہت ہی اہم ہے۔

خصوصاً اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ یوسفؑ کہتے ہیں حکومت مخصوص ہے خدا کے لیے (ان الحکم الا للّٰہ) اور اس کے بعد تاکید کرتے ہیں کہ پرستش، خضوع اور تسلیم بھی صرف اسی کے حکم کے سامنے ہونا چاہیئے (امر الا تعبدوا الا ایاہ)۔ پھر تاکید کرتے ہیں کہ مستقیم اور مستحکم آئین اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں (ذٰلک الدین القیم)۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر المنار، قرطبی، المیزان اور تفسیر کبیر کی طرف رجوع کریں۔

لیکن آپ نے اس کا انجام بھی بتا دیا کہ ان سب چیزوں ـــ باوجود افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اکثر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں (ولکن اکثر الناس لا یعلمون)۔ لہٰذا اگر لوگ صحیح تربیت و آگہی حاصل کریں اور ان میں حقیقتِ توحید زندہ ہو جائے تو ان کی یہ ساری مشکلات حل ہو جائیں۔

۴۔ **ایک اصلاحی شعار سے سوءِ استفادہ:** "ان الحکم الا للّٰہ" قرآن کا ایک مثبت شعار ہے اور یہ نعرہ اللہ کی حکومت اور اللہ تک پہنچنے والی حکومت کے علاوہ ہر حکومت کی نفی کرتا ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تاریخ کے ایک طویل دور میں اس سے عجیب و غریب غلط فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ان میں سے جیسا کہ ہم جانتے ہیں نہروان کے خوارج بھی تھے۔ یہ بہت ظاہر بین، جامد فکر، احمق اور بد سلیقہ لوگ تھے۔ جنگِ صفین کے موقع پر یہ لوگ حکمیت اور تحکیم کی نفی کے لیے اس شعار سے چمٹ گئے اور کہنے لگے کہ جنگ ختم کرنے یا خلیفہ معین کرنے کے لیے حکم کا تعین گناہ ہے کیونکہ خدا کہتا ہے: ان الحکم الا للّٰہ" (حکومت و حکمیت خدا سے مخصوص ہے)۔

وہ اس واضح مسئلے سے غافل تھے یا انہوں نے اپنے آپ کو غافل بنا لیا تھا کہ اگر حکمیت کا تعین پیشواؤں کی طرف سے ہو ـــ وہ پیشوا کہ جن کے رہبر کا حکم خدا کی طرف سے صادر ہو تو ان کا حکم بھی حکم خدا ہے کیونکہ آخرکار یہ حکم اس تک جا پہنچتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ جنگِ صفین کے موقع پر حکم (اور فیصلہ کرنے والوں) کا تعین حضرت علی علیہ السلام کی طرف سے نہیں ہوا تھا لیکن اگر ایسا ہوتا تو اُن کا حکم علیؑ کا حکم، علیؑ کا حکم پیغمبر اکرمؐ کا حکم اور پیغمبر اکرمؐ کا حکم خدا کا حکم ہے۔

اصولی طور پر کیا خدا براہِ راست انسانی معاشرے پر حکومت اور قضاوت کرتا ہے؟ کیا اس کے لیے اس کے علاوہ کوئی صورت ہے کہ نوعِ انسانی میں سے کچھ افراد ـــ البتہ فرمانِ خدا سے اس امر کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیں؟

لیکن خوارج نے اس واضح حقیقت کی طرف توجہ کیے بغیر اصلاً حضرت علیؑ پر واقعہ حکمیت اور تحکیم کے بارے میں اعتراض کیا، یہاں تک کہ اسے معاذ اللہ آپؑ کے اسلام سے انحراف کی دلیل سمجھا۔ افسوس ہے ـــ اس خود خواہی، جہالت اور جمود پر۔

ایسے اصلاحی پروگرام جب جاہل و نادان افراد کے ہاتھ جا پڑیں تو بدترین تباہ کن وسائل میں بدل جاتے ہیں۔

آج بھی وہ گروہ کہ جو درحقیقت خوارج کی نفسیات رکھتے ہیں اور جہالت اور ہٹ دھرمی میں ان سے کم نہیں ہیں ـــ مندرجہ بالا آیت کو مجتہدین کی تقلید کی نفی یا ان سے صلاحیتِ حکومت کی نفی پر دلیل سمجھتے ہیں ـــ لیکن ان سب کا جواب مندرجہ بالا سطور میں دیا جا چکا ہے۔

غیر خدا کی طرف توجہ

توحید کا خلاصہ اور معنی صرف یہ نہیں کہ خدا یگانہ و یکتا ہے بلکہ توحید پرستی کو انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں میں عملی صورت اختیار کرنا چاہیئے اور اس کی روشن ترین نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ موحد انسان غیر خدا پر بھروسہ نہیں کرتا اور اس کے غیر کی پناہ نہیں لیتا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ عالم اسباب کی پرواہ نہیں کرتا اور زندگی میں وسیلے اور سبب سے کام نہیں لیتا بلکہ میں کہتا ہوں کہ تاثیر حقیقی کو سبب میں نہیں سمجھتا بلکہ تمام اسباب کا سرا ۔ مسبب الاسباب ۔ کے ہاتھ میں جانتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں اسباب کے لیے استقلال کا قائل نہیں ہے اور ان سب کو ذات پاک پروردگار کا پرتو سمجھتا ہے۔ ہوسکتا ہے اس عظیم حقیقت سے عدم واقفیت عام لوگوں کے بارے میں چشم پوشی کے قابل ہو لیکن اولیائے حق کے لیے اس بنیاد سے سرمو بے توجہی مستوجب سزا ہے ۔ اگرچہ اس کی حیثیت ترک اولیٰ سے زیادہ نہیں ہے اور ہم نے دیکھا ہے کہ اس سے حضرت یوسفؑ کی لحظہ بھر کی بے توجہی سے ان کی قید کی مدت طویل ہوگئی تاکہ حوادث کی بھٹی میں وہ زیادہ پختہ اور آبدیدہ ہو جائیں اور طاغوت اور طاقتوں کے خلاف جہاد کے لیے زیادہ تیار ہو جائیں اور جان لیں کہ اس راستے میں اللہ کی قوت و طاقت پر بھروسہ کرنا ہے اور ان محروم اور ستم رسیدہ لوگوں پر بھروسہ کرنا ہے جو اللہ کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں اور یہ اس راہ کے تمام راہیوں اور سچے مجاہدین کے لیے ایک عظیم درس ہے کہ جو ایک شیطان کی سرکوبی کے لیے اپنے اندر دوسرے شیطان کی محبت کو داخل نہیں ہونے دیتے ۔ وہ مشرق و مغرب کی طرف نہیں جھکتے اور صراط مستقیم کہ جو امت وسط کی شاہراہ ہے اس کے علاوہ کسی راستے پر قدم نہیں رکھتے۔

(۴۳) وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّيْٓ أَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّأُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۚ يٰٓأَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ إِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ○

(۴۴) قَالُوْٓا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ ۖ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيْلِ الْأَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ○

(۴۵) وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيْلِهٖ فَأَرْسِلُوْنِ ○

(۴۶) يُوْسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيْقُ أَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّأُخَرَ يٰبِسٰتٍ لَّعَلِّيْٓ أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○

(۴۷) قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَأَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ إِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَأْكُلُوْنَ ○

(۴۸) ثُمَّ يَأْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ○

(۴۹) ثُمَّ يَأْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ○ ع

ترجمہ

(۴۳) بادشاہ نے کہا: میں نے خواب دیکھا ہے کہ سات موٹی تازی گائیں ہیں انہیں سات دبلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سبز خوشے ہیں اور سات خشک شدہ خوشے ہیں (اور خشک شدہ خوشے سبز خوشوں پر پلٹے ہوتے ہیں اور انہیں ختم کر دیا ہے)۔ اے سردارو! اگر تم خواب کی تعبیر کر سکتے ہو تو میرے خواب کے بارے میں کوئی نقطۂ نظر پیش کرو۔

(۴۴) انہوں نے کہا یہ تو خواب پریشان ہیں اور ہم اس قسم کی خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے۔

(۴۵) ان دو افراد میں سے ایک کہ جسے نجات مل گئی تھی اسے ایک مدت کے بعد یاد آیا۔ کہنے لگا: میں تمہیں اس کی تعبیر بتاؤں گا۔ مجھے (اس قیدی جوان کے پاس) بھیج دو۔

(۴۶) یوسف! اے بہت سچے! اس خواب کے بارے میں رائے دو کہ سات موٹی تازی گائیں ہیں انہیں سات دبلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سبز خوشے ہیں اور سات خشک شدہ خوشے ہیں، تاکہ میں لوگوں کے پاس لوٹ جاؤں اور وہ آگاہ ہوں۔

(۴۷) اس نے کہا: سات سال تک خوب محنت سے کاشت کاری کرو اور جو کچھ کاٹو اس میں تھوڑی سی مقدار کھا لو اور باقی کو خوشوں میں رہنے دو (اور ذخیرہ کر لو)۔

(۴۸) اس کے بعد سات سال سخت (خشکی اور قحط کے) آئیں گے کہ جو کچھ تم نے ان کے لیے ذخیرہ کیا ہوگا اسے کھالیں گے مگر قدر قلیل کہ جو تم (بیج کے لیے) بچا پاؤگے۔

(۴۹) اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا کہ لوگوں کو خوب بارش نصیب ہوگی اور اس سال لوگ (رس بھرے پھل اور روغن دار دانے) پائیں گے۔

تفسیر

بادشاہ مصر کا خواب

حضرت یوسف علیہ السلام سات برس تک قید خانے میں تنگ و گھٹن میں ایک فراموش شدہ انسان کی طرح رہے۔ وہ خود سازی، قیدیوں کو ارشاد و ہدایت، بیماروں کی عیادت اور دردمندوں کی دلجوئی میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ ایک ظاہراً چھوٹا سا واقعہ رونما ہوا جس نے نہ صرف ان کی بلکہ مصر اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کی سرنوشت کو بدل کے رکھ دیا۔

بادشاہ مصر کہ جس کا نام کہا جاتا ہے کہ ولید بن ریان تھا (اور عزیز مصر اس کا وزیر تھا) نے ایک خواب دیکھا یہ ظاہراً ایک پریشان کن خواب تھا۔ دن چڑھا تو اس نے خواب کی تعبیر بتانے والوں اور اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور کہنے لگا: میں نے خواب دیکھا ہے کہ سات کمزور سی گائیں ہیں اور سات موٹی تازی گائیں ہیں اور دبلی پتلی گائیں ان پر حملہ آور ہوتی ہیں اور انہیں کھا رہی ہیں۔ نیز سات ہرے بھرے اور سات خشک شدہ خوشے ہیں اور خشک شدہ خوشے سبز خوشوں پر لپٹ گئے ہیں اور انہیں ختم کردیا ہے (وقال الملك انی اریٰ سبع بقرات سمان یأکلهن سبع عجاف وسبع سنبلات خضر واخر یابسات)۔

اس کے بعد اس نے ان کی طرف روئے سخن کیا اور کہنے لگا: اے سردارو! میرے خواب کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرو اگر تم خواب کی تعبیر بتا سکتے ہو (یا ایها الملا افتونی فی رءیای ان کنتم للرءیا تعبرون)۔ لیکن سلطان کے حواریوں نے فوراً کہا کہ یہ خواب پریشان ہیں اور ہم ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے (قالوا اضغاث احلام وما نحن بتأویل الاحلام بعالمین)۔

۔ "اضغاث" ۔ "ضغث" ۔ (بروزن حِرص) کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے لکڑیوں، خشک گھاس، سبزی یا کسی اور چیز کا گٹھا۔

۔ "احلام" ۔ "حلم" ۔ (بروزن نہم) کی جمع ہے اور خواب کے معنی میں ہے۔

لہٰذا "اضغاث و احلام" ۔ پریشان اور خلط ملط خوابوں کے معنی میں ہے۔ یعنی مختلف چیزوں کے

مختلف گُتھے ہوئے خواب۔ اخلاط۔ کا جو ۔ ما نحن بتأویل الاحلام بعالمین۔ میں الف لام عہد کے ساتھ آیا ہے اس طرف اشارہ ہے کہ ہم ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں کر سکتے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ان کا اظہارِ عجز حقیقتاً اس بنا پر تھا کہ چونکہ اس خواب کا حقیقی مفہوم ان پر واضح نہیں تھا لہٰذا انہوں نے اسے خواب پریشان قرار دیا کیونکہ ان کے نزدیک خوابوں کی دو قسمیں تھیں ایک با معنی و با مفہوم خواب کہ جو قابلِ تعبیر تھے اور دوسری خوابِ پریشاں اور بے معنی خواب کہ جن کی تعبیر ان کے پاس کوئی نہ تھی ایسے خوابوں کو وہ قوتِ خیال کی فعالیت کا نتیجہ سمجھتے تھے جبکہ اس کے برخلاف پہلی قسم کے خوابوں کو وہ روح کے عالمِ غیب سے اتصال کا نتیجہ سمجھتے تھے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ وہ اس خواب کو آئندہ کے پریشان کن حوادث کی دلیل سمجھ رہے تھے لیکن جیسا کہ بادشاہوں اور طاقتوروں کے حاشیہ نشینوں کا طریقہ ہے وہ انہیں صرف وہی امور بتلاتے ہیں کہ جو شاہی مزاج کے لیے باعثِ انبساط ہو اور جو چیز ان کی ۔ ذاتِ مبارک ۔ کو مضطرب کر دے اس کا ذکر نہیں کرتے ایسی جابر اور ظالم حکومتوں کے زوال اور بدبختی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

یہاں یہ سوال پیش آتا ہے کہ انہوں نے کس طرح جرأت کی شاہِ مصر کے سامنے اس رائے کا اظہار کریں کہ وہ اسے خوابِ پریشاں دیکھنے کا الزام دیں جبکہ ان حاشیہ نشینوں کا معمول یہ ہے کہ وہ ان کی ہر چھوٹی بڑی اور بے معنی حرکت کے لیے کوئی فلسفہ گھڑتے ہیں اور بڑی معنی خیز تفسیریں کرتے ہیں۔

یہ ہو سکتا ہے کہ یہ اس لیے ہو کہ انہوں نے دیکھا تھا کہ بادشاہ یہ خواب دیکھ کر پریشان و مضطرب ہے اور وہ پریشانی میں حق بجانب بھی تھا کیونکہ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ کمزور اور لاغر گائیں توانا اور موٹی تازی گائیوں پر حملہ آور ہوتی ہیں اور انہیں کھا رہی ہیں اور یہی صورت خشک خوشوں کی تھی۔ کیا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کمزور لوگ اچانک اس کے ہاتھ سے حکومت چھین لیں گے۔ لہٰذا انہوں نے بادشاہ کے دل کا اضطراب دور کرنے کے لیے اسے خوابِ پریشاں قرار دے دیا۔ یعنی پریشانی کی کوئی بات نہیں، یہ کوئی خاص معاملہ نہیں ہے، ایسے خواب کسی چیز کی دلیل نہیں ہوتے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ۔ اضغاث احلام ۔ سے ان کی مراد یہ نہ تھی کہ ایسے خواب کی کوئی تعبیر نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ یہ ایک پیچیدہ سا خواب ہے مختلف امور اس میں جمع ہو گئے ہیں اور ہم تو صرف ایک قسم کے خوابوں کی تعبیر کر سکتے ہیں نہ کہ اس قسم کے خوابوں کی۔ لہٰذا انہوں نے اس بات کا انکار نہیں کیا کہ ممکن ہے کوئی ماہر استاد مل جائے اور وہ اس کی تعبیر بیان کر سکے البتہ انہوں نے خود اظہارِ عجز کیا ہے۔

اس موقع پر بادشاہ کا ساقی کہ جو چند سال قبل قید خانے سے آزاد ہوا تھا، اسے قید خانے کا خیال آیا اُسے یاد آیا کہ یوسف اس خواب کی تعبیر بیان کر سکتے ہیں۔ اس نے بادشاہ کے حاشیہ نشینوں کی طرف رُخ

کرکے کہا : میں تمہیں اس خواب کی تعبیر بتا سکتا ہوں۔ مجھے اس کام کے ماہر استاد کے پاس بھیجو کہ جو زندان میں پڑا ہے تاکہ تمہیں بالکل صحیح خبر لاکر دوں (وقال الذی نجا منھما وادکر بعد امۃ انا انبئکم بتأویلہ فارسلون)۔ جی ہاں! اس گوشۂ زنداں میں ایک روشن ضمیر، صاحب ایمان اور پاک دل انسان زندگی کے دن گزار رہا ہے کہ جس کا دل حوادث آئندہ کا آئینہ ہے، وہ ہے کہ جو اس راز سے پردہ اٹھا سکتا ہے اور اس خواب کی تعبیر بیان کرسکتا ہے۔

لفظ "فارسلون" (مجھے بھیجو) ہوسکتا ہے اس طرف اشارہ ہو کہ قید خانے میں حضرت یوسفؑ سے ملاقات پر پابندی ہو اور وہ بادشاہ اور اس کے حواریوں سے اس کی اجازت لینا چاہتا ہو۔

اس کی اس بات نے محفل کی کیفیت ہی بدل دی۔ سب کی آنکھیں ساقی پر لگ گئیں۔ آخرکار اسے اجازت ملی اور حکم ملا کہ جتنی جلدی ہوسکے اس کام کے لیے نکل کھڑا ہو اور جلد نتیجہ پیش کرے۔ ساقی زندان میں آیا اور اپنے پرانے دوست یوسفؑ کے پاس پہنچا، وہی دوست یوسفؑ کہ جس سے بڑی بے وفائی کی گئی تھی لیکن شاید وہ جانتا تھا کہ اس کی عظمت سے توقع نہیں کہ وہ دفتر شکایت کھول بیٹھے۔

اس نے حضرت یوسفؑ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا : یوسف! اے سراپا صداقت! اس خواب کے بارے میں تم کیا کہتے ہو کہ کسی نے دیکھا ہے کہ سات لاغر گائیں موٹی تازی کو کھا رہی ہیں۔ نیز سات ہرے خوشے ہیں اور سات خشک شدہ (کہ جن میں سے دوسرا پہلے سے لپٹ گیا ہے اور اسے نابود کر دیا ہے) (یوسف ایھا الصدیق افتنا فی سبع بقرات سمان یأکلھن سبع عجاف وسبع سنبلات خضر واخر یابسات) شاید میں اس طرح ان لوگوں کے پاس لوٹ کے جاؤں تو وہ اس خوابؔ کے اسرار سے آگاہ ہوسکیں (لعلی ارجع الی الناس لعلھم یعلمون)۔

لفظ "الناس" ہوسکتا ہے اس طرف اشارہ ہو کہ چاپلوس حاشیہ نشینوں کے ذریعے بادشاہ کا خواب اس وقت کے ایک اہم واقعے کے طور پر لوگوں میں پھیل چکا تھا اور اس پریشانی کو دربار سے عام لوگوں تک کھینچ لاتے تھے۔

بہرحال حضرت یوسف علیہ السلام نے بغیر کسی شرط کے اور بغیر کسی صلے کے تقاضے کے فوراً خواب کی واضح اور نہایت اعلیٰ تعبیر بیان کی۔ اس میں آپ نے کچھ چھپائے بغیر درپیش تاریک مستقبل کے بارے میں بتایا ساتھ ہی اس کے لیے راہنمائی کردی اور ایک مرتب پروگرام بتا دیا۔ آپؑ نے کہا: سات سال پیہم محنت سے کاشت کاری کرو کیونکہ ان سات برسوں میں بارش خوب ہوگی لیکن جو فصل کاٹو اسے خوشوں سمیت انباروں کی صورت میں جمع کرلو سوائے کھانے کے لیے جو تھوڑی سی مقدار ضروری ہو (قال تزرعون سبع سنین دأبا فما حصدتم فذروہ فی سنبلہ الا قلیلا

مما تأکلون)[1]

لیکن جان لو کہ ان سات برسوں کے بعد سات برس خشک سالی، بارش کی کمی اور سختی کے آئیں گے کہ جن میں صرف اس ذخیرے سے استفادہ کرنا ہوگا جو گزشتہ سالوں میں جمع کیا ہوگا، ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے (ثم یأتی من بعد ذلک سبع شداد یأکلن ما قدمتم لھن)۔

البتہ خیال رہے کہ خشکی اور قحط کے ان سات سالوں میں تمام ذخیرہ شدہ گندم نہ کھا جانا بلکہ کچھ مقدار بیج کے طور پر آئندہ کاشت کیلئے رکھ چھوڑنا کیونکہ بعد کا سال اچھا ہوگا (الا قلیلا مما تحصنون)۔

اگر خشک سالی اور سختی کے یہ سال تم سوچے سمجھے پروگرام اور پلان کے تحت ایک ایک کرکے گزار لو تو پھر تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا کہ خوب باران رحمت ہوگی اور لوگ اس آسمانی نعمت سے خوب بہرہ مند ہوں گے (ثم یأتی من بعد ذلک عام فیہ یغاث الناس)۔

اس سے نہ صرف زراعت اور اناج کا مسئلہ حل ہو جائے گا بلکہ رس دار پھل اور روغن دار دانے بھی فراواں ہوں گے کہ لوگ جن سے رس اور روغن حاصل کریں گے (و فیہ یعصرون)۔

چند اہم نکات

اچھی تعبیر: حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی جو تعبیر بیان کی وہ کس قدر جچی تلی تھی۔ قدیم کہانیوں میں گائے سال کا سمبل سمجھی جاتی تھی اور اس کا توانا ہونا فراواں نعمت کی دلیل ہے جبکہ لاغر ہونا مشکلات اور سختی کی دلیل ہے۔ سات لاغر گائیں سات توانا گاؤں پر حملہ آور ہوئیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سختی کے سات سالوں میں قبل کے سالوں کے ذخائر سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اور سات خشک شدہ خوشے جو سات سبز خوشوں سے لپٹ گئے تو یہ فراوانئ نعمت اور خشک سالی کے دو مختلف ادوار کے لیے ایک اور دلیل تھی۔ اس میں اس نکتے کا اضافہ تھا کہ اناج کو خوشوں کی شکل میں ذخیرہ کیا جانا چاہیئے تاکہ جلد خراب نہ ہو اور سات برس تک چل سکے۔

نیز یہ کہ لاغر گائیں اور خشک شدہ خوشے سات سات سالوں کے بعد نہ تھے یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان سخت سات سالوں کے بعد یہ کیفیت ختم ہو جائے گی اور فطری طور پر بیج کی فکر بھی کرنا چاہیئے اور ذخیرے کا کچھ حصہ اس کے لیے محفوظ رکھنا چاہیئے۔

حضرت یوسف درحقیقت کوئی عام تعبیر خواب بیان کرنے والے شخص نہ تھے بلکہ ایک رہبر تھے کہ جو گزشتہ

---

[1] "دأب" (بر وزن "صبر") دراصل مسلسل چلتے رہنے کے معنی میں ہے اور مسلسل عادت کے معنی میں بھی آیا ہے۔ لہٰذا اس کا معنی یہ ہوگا کہ تم اپنی جاری عادت کے مطابق زراعت کو زیادہ اہمیت دیتے ہو۔ اسے معمول کے مطابق جاری رکھو لیکن اسے اقتصادی طور پر استعمال کرو۔ یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ مراد یہ تھی کہ سختی اور محنت سے زراعت میں محنت کرو کیونکہ "دأب" و "دؤب" مشقت و محنت کے معنی میں بھی آیا ہے یعنی اتنا کام کرو کہ تھک جاؤ۔

زندان میں بیٹھے ایک ملک کے مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کر رہے تھے اور انہیں کم از کم پندرہ برس کے لیے مختلف مراحل پر مشتمل ایک پلان دے رہے تھے اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ یہ تعبیر جو آئندہ کیلئے منصوبہ بندی اور راہنمائی پر مشتمل تھی نے جابر بادشاہ اور اس کے حواریوں کو ہلا کے رکھ دیا اور اہل مصر کے ہلاکت خیز قحط سے نجات کا سبب بنی اور اسی کے سبب حضرت یوسفؑ کو زندان سے اور حکومت کو بھی خود غرض اور خود سر لوگوں سے نجات مل گئی۔

۲۔ **قدرت الٰہی کا عظیم مظہر:** یہ داستان ہمیں پھر یہ عظیم درس دیتی ہے کہ قدرت الٰہی اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا کہ ہم سوچتے ہیں۔ خدا وہ ہے کہ جو ایک دور کے جابر حکمران کے ایک معمولی سے خواب کے ذریعے ایک بہت بڑی ملت کو ایک عظیم مصیبت سے نجات عطا کر دے اور ساتھ ہی اپنے ایک خاص بندے کو بھی سالہا سال کی مصیبت سے رہائی دے دے۔

اس سارے معاملے میں ضروری تھا کہ بادشاہ خواب دیکھے۔ وہ خواب بیان کرے تو ساقی موجود ہو اور یہی کہ اسے قید خانے میں دیکھا ہوا اپنا خواب یاد آجائے اور آخر کار اہم واقعات رونما ہوں۔ خدا وہ ہے کہ جو ایک چھوٹے سے عمل سے عظیم واقعات پیدا کر دیتا ہے۔ جی ہاں! ہمیں ایسے خدا سے دل باندھنا چاہیئے۔

۳۔ **علم تعبیر خواب۔ حضرت یوسفؑ کا معجزہ:** اس سورہ میں متعدد خوابوں کا ذکر ہوا ہے۔ حضرت یوسفؑ کا خواب، قیدیوں کا خواب اور فرعون مصر کا خواب، یہ تمام خواب اس بہت زیادہ اہمیت کی نشاندہی کرتے ہیں جو اس زمانے کے لوگ تعبیر خواب کو دیتے تھے۔ اصولاً اس زمانے میں علم تعبیر خواب زمانے کی پیش رفت کے علوم میں سے شمار ہوتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس زمانے کے پیغمبر یعنی حضرت یوسفؑ اس علم میں درجۂ کمال پر فائز تھے کہ جو دراصل ایک معجزہ شمار ہوتا تھا۔

کیا ایسا ہی نہیں کہ ہر پیغمبر کا معجزہ اپنے زمانے کے ترقی یافتہ ترین میں سے ہونا چاہیئے تاکہ اس کے مقابلے میں اس زمانے کے علماء عاجز ہو کر یقین حاصل کر لیں کہ اس علم کا سرچشمہ علم الٰہی ہے نہ کہ انسانی اور بشری۔

(۵۰) وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ○

(۵۱) قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدْتُنَّ يُوسُفَ عَنْ نَفْسِهِ ۚ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوءٍ ۚ قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ○

(۵۲) ذَٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ ○

(۵۳) وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي ۚ إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ ○

ترجمہ

(۵۰) بادشاہ نے کہا: اسے میرے پاس لے آؤ لیکن جب اس کا فرستادہ اس (یوسف) کے پاس آیا تو اس نے کہا: اپنے صاحب کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا ماجرا کیا تھا کہ جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے بے شک میرے خدا نے مجھے ان کے مکر و فریب سے آگاہ کیا ہے۔

(۵۱) (بادشاہ نے ان عورتوں کو بلوایا اور) کہا: جب تم نے یوسف کو اپنی طرف

دعوت دی تھی تو تمہیں کیا معاملہ پیش آیا تھا۔ انہوں نے کہا: حاش للہ! ہم نے اس میں کوئی عیب نہیں دیکھا۔ (اس موقع پر) زوجۂ عزیز نے کہا: اس وقت حق آشکارا ہو گیا، وہ میں ہی تھی جس نے اسے اپنی طرف دعوت دی تھی اور وہ سچوں میں سے ہے۔

(۵۲) یہ بات میں نے اس لیے کہی ہے تاکہ وہ جان لے کہ میں نے اس کی غیبت میں اس سے خیانت نہیں کی اور خدا خیانت کرنے والوں کی مکاری چلنے نہیں دیتا۔

(۵۳) مجھے ہرگز اپنے نفس کی برأت کا اعلان نہیں کرنا کیونکہ (سرکش) نفس تو بدیوں پر بہت اکساتا ہے مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم کرے، میرا پروردگار غفور و رحیم ہے۔

تفسیر

یوسف ہر الزام سے بری ہو گئے

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے شاہ مصر کے خواب کی جو تعبیر بیان کی وہ اس قدر جچی تلی اور منطقی تھی کہ اس نے بادشاہ اور اس کے حاشیہ نشینوں کو جذب کر لیا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ ایک غیر معروف سے قیدی نے کسی معاد کی توقع کے بغیر اس کے خواب کی مشکل تعبیر کس بہترین طریقے سے بیان کر دی ہے اور ساتھ ہی آئندہ کے لیے نہایت جچا تلا پروگرام بھی پیش کر دیا ہے۔

اجمالاً اس نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی غلام قیدی نہیں ہے بلکہ غیر معمولی شخصیت ہے کہ جو کسی پر اسرار ماجرے کے باعث قید میں ڈالا گیا ہے لہٰذا اُسے اس کے دیدار کا اشتیاق پیدا ہوا لیکن ایسا نہیں کہ سلطنت کا غرور ایک طرف رکھ کر وہ دیدار یوسف کے لیے چل پڑے بلکہ اس نے حکم دیا کہ اسے میرے پاس لے آؤ۔ (و قال الملك ائتونی بہ)۔

لیکن جب اس کا فرستادہ یوسفؑ کے پاس آیا تو بجائے اس کے کہ یوسفؑ اس خوشی میں پھولے نہ سماتے کہ سالہا سال قید خانے کے گڑھے میں رہنے کے بعد اب نسیم آزادی چل رہی ہے، آپؑ نے بادشاہ

کے نمائندے کو منفی جواب دیا اور کہا کہ میں اس وقت تک زندان سے باہر نہیں آؤں گا جب تک کہ تو اپنے مالک کے پاس جاکر اس سے یہ نہ پوچھے کہ وہ عورتیں جنہوں نے تیرے وزیر (عزیز مصر) کے محل میں اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، ان کا ماجرا کیا تھا (فلما جاءہ الرسول قال ارجع الی ربک فسئلہ ما بال النسوۃ اللاتی قطعن ایدیھن)۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایسے ہی جیل سے رہا ہو جائیں اور شاہ کی طرف سے معافی کی رسوائی قبول کر لیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ آزادی کے بعد وہ شاہ کی طرف سے معاف کیے گئے ایک مجرم یا کم از کم ایک ملزم کی صورت میں زندگی بسر کریں۔ وہ چاہتے تھے کہ سب سے پہلے ان کی قید کے سبب کے بارے میں تحقیق ہو اور ان کی بے گناہی اور پاکدامنی پوری طرح درجۂ ثبوت کو پہنچ جائے اور برأت کے بعد وہ سربلندی سے آزاد ہوں اور ضمناً حکومت مصر کی مشینری کی آلودگی بھی ثابت ہو جائے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کے وزیر کے دربار میں کیا گزرتی ہے۔

جی ہاں! وہ اپنے عزو شرف کو آزادی سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور یہی ہے حریت پسندوں کا راستہ۔

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنی گفتگو میں اس قدر عظمت کا مظاہرہ کیا کہ یہاں تک تیار نہ ہوئے کہ عزیز مصر کی بیوی کا نام لیں کہ جو اُن پر الزام لگانے اور جیل بھیجنے کا اصلی عامل تھی بلکہ مجموعی طور پر زنانِ مصر کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کیا کہ جو اس ماجرا میں دخیل تھیں۔

اس کے بعد آپؑ نے مزید کہا: اگرچہ اہلِ مصر نہ جانیں اور یہاں تک دربار سلطنت بھی بے خبر ہو کہ مجھے قید کیے جانے کا منصوبہ کیا تھا اور کن افراد کی وجہ سے پیش آیا لیکن میرا پروردگار ان کے مکرو فریب اور منصوبہ سے آگاہ ہے (ان ربی بکیدھن علیم)۔

شاہ کا خاص نمائندہ اس کے پاس لوٹ آیا اور یوسفؑ کی تجویز بیان کی۔ یہ تجویز کہ جس سے عالی ظرفی اور بلند نظری جھلکتی تھی، بادشاہ نے سنی تو وہ یوسفؑ کی بزرگواری سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ لہٰذا اس نے فوراً اس ماجرے میں شریک عورتوں کو بلا بھیجا۔ وہ حاضر ہوئیں تو ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: بتاؤ میں دیکھوں کہ جب تم نے یوسفؑ سے اپنی خواہش پورا کرنے کا تقاضا کیا تو اصل معاملہ کیا تھا (قال ما خطبکن اذ راودتن یوسف عن نفسہ)۔

سچ کہنا، حقیقت بیان کرنا کہ کیا تم نے اس میں کوئی عیب، تقصیر اور گناہ دیکھا ہے؟

ان کے خوابیدہ ضمیر اس سوال پر اچانک بیدار ہو گئے اور سب نے متفقہ طور پر یوسفؑ کی پاکدامنی کی گواہی دی اور کہا: منزہ ہے خدا، ہم نے یوسف میں کوئی گناہ نہیں دیکھا (قلن حاش للہ ما علمنا علیہ من سوء)۔

عزیزِ مصر کی بیوی وہاں موجود تھی۔ بادشاہ اور زنانِ مصر کی باتیں سن رہی تھی بغیر اس کے کہ کوئی اس سے سوال کرے، ضبط نہ کر سکی، اس نے محسوس کیا کہ اب وہ موقع آگیا ہے کہ ضمیر کی سالہا سال کی شرمندگی کی یوسفؑ کی پاکیزگی اور اپنی گنہگاری کے اظہار سے تلافی کرے۔ خصوصاً جبکہ اس نے یوسفؑ کی بے نظیر عظمت کو اس پیغام میں جو انہوں نے بادشاہ کو بھیجا تھا دیکھ لیا کہ اپنے پیغام میں انہوں نے اس کے بارے میں تھوڑی سی بات بھی نہیں کی اور اشارتاً صرف زنانِ مصر کے بارے میں بات کی ہے۔ اس کے اندر گویا ایک ہلچل مچ گئی وہ چیخ اٹھی: اب حق آشکارا ہو گیا ہے۔ میں نے اس سے خواہش پوری کرنے کا تقاضا کیا تھا، وہ سچا ہے اور میں نے اس کے بارے میں اگر کوئی بات کی ہے تو وہ جھوٹ تھی بالکل جھوٹ تھی (قالت امرأت العزیز الأن حصحص الحق انا راودته عن نفسه وانه لمن الصادقین)۔

زوجۂ عزیز نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: میں نے یہ صریح اعتراف اس بنا پر کیا ہے تاکہ یوسف کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی غیبت میں اس کے بارے میں خیانت نہیں کی (ذٰلک لیعلم انی لم اخنه بالغیب)۔

کیونکہ اتنی مدت میں اور اس سے حاصل ہونے والے تجربات کے بعد میں نے سمجھ لیا ہے کہ خدا خیانت کرنے والوں کے مکر و فریب کو چلنے نہیں دیتا (وان الله لا یهدی کید الخائنین)۔

(اگرچہ یہ جملہ عزیزِ مصر کی بیوی کا ہے، جیسا کہ ظاہر عبارت کا تقاضا ہے تو) درحقیقت اس نے یوسفؑ کی پاکیزگی اور اپنی گنہگاری کے صریح اعتراف کے لیے دو دلیلیں قائم کیں:

پہلی یہ کہ اس کا ضمیر اور احتمالاً یوسفؑ سے اس کا باقی ماندہ لگاؤ اسے اجازت نہیں دیتا کہ حق کی لب وہ اس سے زیادہ پردہ پوشی کرے اور عدم موجودگی میں اس پاکدامن نوجوان سے خیانت کرے اور

دوسری یہ کہ وقت گزرنے کے ساتھ اور درسِ عبرت حاصل کرنے کے بعد یہ حقیقت اس پر واضح ہو گئی کہ خدا پاک اور نیک لوگوں کا حامی و مددگار ہے اور کبھی بھی خیانت کرنے والوں کا ساتھ نہیں دیتا اور اسی لیے محلوں کی پُرخواب زندگی کے پردے آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئے اور وہ زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے لگی۔ خصوصاً عشق میں شکست نے اس کے افسانوی غرور پر جو ضرب لگائی اس سے اس کی نگاہِ حقیقت اور کھل گئی۔

اس حالت میں تعجب کی بات نہیں کہ وہ اس طرح کا صریح اعتراف کرے۔

اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا: میں ہرگز اپنے نفس کی برأت کا اعلان نہیں کرتی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ یہ نفسِ امارہ مجھے برائیوں کا حکم دیتا ہے (وما ابرئ نفسی ان النفس لامارة بالسوء)۔

مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم کرے۔ اور اس کی حفاظت اور نصرت و مدد کے باعث بچ جاؤں (الا ما رحم ربی)۔

بہرحال اس گناہ پر میں اس سے عفو و بخشش کی امید رکھتی ہوں۔ کیونکہ میرا پروردگار غفور و رحیم ہے۔
(ان ربی غفور رحیم)۔

بعض مفسرین نے آخری دو آیتوں کو حضرت یوسفؑ کی گفتگو سمجھا ہے اور کہا ہے کہ یہ دونوں آیتیں درحقیقت اس پیغام کا آخری حصہ ہیں جو حضرت یوسفؑ نے بادشاہ کے فرستادہ شخص کے ذریعے اسے بھیجا اور وہ ان آیات کا معنی یہ کرتے ہیں: اگر میں مصر کی عورتوں کے بارے میں تحقیق کا تقاضا کرتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بادشاہ (یا اس کا وزیر عزیز مصر) جان لے کہ میں نے زوجہ عزیز کے معاملے میں اس سے کوئی خیانت نہیں کی اور خدا خیانت کرنے والوں کا مکر و فریب چلنے نہیں دیتا اس کے باوجود میں اپنی برأت کا اعلان نہیں کرتا کیونکہ نفس سرکش تو انسان کو برائی کا حکم دیتا ہے مگر یہ کہ خدا رحم کرے کیونکہ میرا پروردگار غفور و رحیم ہے۔

ظاہراً اس مخالف ظاہر تفسیر کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے زوجہ عزیز مصر کی اس قدر دانش و معرفت کو قبول نہیں کرنا چاہا کہ وہ ایسے مخلصانہ لہجے میں بات کرے کہ جو عبرت آموزی اور بیداری کی حکایت کرے، حالانکہ بعید نہیں کہ انسان کی زندگی میں جب اس کا پاؤں کسی پتھر سے ٹھوکر کھائے تو اس میں بیداری، احساس گناہ اور ندامت کی ایسی کیفیت پیدا ہو جائے۔ خصوصاً جبکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ عشق مجازی میں شکست انسان پر عشق حقیقی (عشق الٰہی) کا راستہ کھول دیتی ہے۔

اور آج کے علم نفسیات (تصعید) کی تعبیر میں۔ "شدید جذبات جب ملامت سے دوچار ہوتے ہیں تو اوپر کی طرف اٹھتے ہیں اور ختم ہوئے بغیر اعلیٰ ترین شکل میں رونما ہوتے ہیں"۔

چند ایک روایات کہ جو زوجہ عزیز کی بعد کی زندگی کے بارے میں منقول ہیں وہ بھی اس عبرت آموزی اور بیداری کی دلیل ہیں۔

علاوہ ازیں ان دو آیات کو حضرت یوسفؑ سے مربوط کرنا اس قدر بعید اور خلاف ظاہر ہے کہ جو کسی بھی ادبی معیار پر پورا نہیں اترتا۔ کیونکہ:

اولاً۔ ذلک۔ کہ جو آیت کے شروع میں ہے درحقیقت ذکر علت کے عنوان سے ہے۔ یہ گزشتہ گفتگو کی علت ہے کہ جو زوجہ عزیز ہی کی گفتگو ہے اور اسے کلام یوسف سے نقل کرنا بہت ہی عجیب ہے کہ جو گزشتہ آیات میں فاصلے پر آیا ہے۔

ثانیاً اگر یہ آیات کلام یوسف ہوں تو اس میں ایک طرح کا تضاد پیدا ہوگا کیونکہ ایک طرف تو یوسف کہتے ہیں کہ میں نے عزیز مصر سے کوئی خیانت نہیں کی اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ میں اپنے آپ کو بری نہیں کرتا نفس سرکش برائیوں کا حکم دیتا ہے۔ ایسی بات تو وہی شخص کہہ سکتا ہے جس سے کوئی لغزش سرزد ہوئی ہو اگرچہ وہ چھوٹی ہی کیوں نہ ہو جبکہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ سے کوئی لغزش سرزد نہیں ہوئی۔

ثالثاً اگر مراد یہ ہے کہ عزیز مصر جان لے کہ وہ بے گناہ ہیں تو وہ تو شروع ہی میں (شاہد کی گواہی کے بعد)

اس حقیقت کو جان چکا تھا اور اگر مراد یہ ہے کہ ۔ میں نے شاہ سے خیانت نہیں کی ۔ تو اس معاملے کا شاہ سے کوئی رابطہ نہیں تھا اور یہ عذر پیش کرنا کہ وزیر کی بیوی سے خیانت جابر بادشاہ سے خیانت ہے تو یہ ایک کمزور اور مہمل عذر معلوم ہوتا ہے خصوصاً جبکہ درباری لوگ عام طور پر ان مسائل کی پابندی نہیں کرتے ۔

خلاصہ یہ کہ آیات کا ربط نشاندہی کرتا ہے کہ یہ تمام باتیں عزیز مصر کی بیوی نے کی تھیں کہ جو کچھ عبرت حاصل کر چکی تھی اور تھوڑی بہت بیدار ہو چکی تھی لہٰذا اس نے ان حقائق کا اعتراف کر لیا ۔

چند اہم نکات

۱۔ پاکیزگی اور دشمن کا اعتراف : واقعۂ یوسف کے اس حصّے میں ہم نے دیکھا ہے کہ آخرکار ان کے سب سے بڑے دشمن نے ان کی پاکیزگی کا اعتراف کر لیا اور اپنی گنہگاری اور ان کی بیگناہی کا بھی اعتراف کر لیا ۔ یہ ہے تقویٰ ، پاکبازی اور گناہ سے پرہیز کا انجام اور یہ ہے اس فرمان کا مفہوم کہ :

ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجاً و یرزقہ من حیث لا یحتسب

جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے خدا اس کے لیے راہ کشائش کھول دیتا ہے اور اسے وہاں سے رزق دیتا ہے کہ جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا ۔ (طلاق ۔ ۲-۳)

یعنی ۔ تُو پاک رہ اور پاکیزگی کی راہ اختیار کر ، استقامت دکھا ، خدا اجازت نہیں دے گا کہ ناپاک لوگ تیری حیثیت کو برباد کر سکیں ۔

۲۔ کبھی شکست بھی بیداری کا سبب بن جاتی ہے : کبھی ناکامیاں بھی بیداری کا سبب بن جاتی ہیں ، بلکہ بہت سے مواقع پر ظاہراً شکست ہوتی ہے لیکن درحقیقت وہ ایک طرح کی معنوی کامیابی شمار ہوتی ہے ۔ ایسی ہی ناکامیاں انسان کی بیداری کا سبب بن جاتی ہیں اور غرور و غفلت کے پردوں کو چاک کر دیتی ہیں اور انسان کی زندگی میں احساس کی بیداری کی بنیاد بن جاتی ہیں ۔

عزیز مصر کی بیوی (کہ جس کا نام ۔ زلیخا ۔ یا ۔ راعیل ۔ تھا) اگرچہ اپنے معاملے میں بدترین ناکامیوں میں مبتلا ہوئی لیکن گناہ کے اس راستے پر اس کی یہ ناکامیاں اس کے متنبہ اور بیدار ہونے کا باعث بن گئیں ۔ اس کا خوابیدہ ضمیر بیدار ہو گیا اور وہ اپنے بُرے کردار پر پشیمان ہوئی اور اس نے درگاہِ الٰہی کی طرف رخ کر لیا ۔ احادیث میں جو واقعہ حضرت یوسفؑ سے اس کی ملاقات کے بارے میں ہے ، جبکہ یوسفؑ عزیز مصر ہو گئے ، وہ بھی اس دعویٰ کی دلیل ہے ۔ لکھا ہے کہ زلیخا نے حضرت یوسفؑ کی طرف روئے سخن کر کے کہا :

الحمد للہ الذی جعل العبید ملوکاً بطاعتہ وجعل الملوک عبیداً بمعصیتہ

حمد ہے اس خدا کی جس نے غلاموں کو اپنی اطاعت کی بنا پر بادشاہ بنا دیا اور بادشاہوں کو اپنی نافرمانی کے باعث غلام بنا دیا ۔

اس حدیث کے آخر میں ہے کہ آخرکار حضرت یوسف نے اس کے ساتھ شادی کر لی [1]

وہ لوگ خوش بخت ہیں جو ناکامیوں سے فتح حاصل کر لیتے ہیں اور اپنے اشتباہات اور غلطیوں سے زندگی کی صحیح راہ تلاش کر لیتے ہیں اور سیاہ بختیوں میں نیک بختی کو پا لیتے ہیں۔

البتہ سب لوگ شکست پر ایسے ردعمل کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ کم ظرف لوگ شکست کے موقع پر یاس و ناامیدی کی اتھاہ گہرائیوں میں جا پڑتے ہیں اور بعض اوقات وہ خودکشی تک جا پہنچتے ہیں جو کہ کامل شکست ہے لیکن وہ لوگ کہ جو کچھ ظرف کے حامل ہوتے ہیں کوشش کرتے ہیں کہ ناکامی کو اپنی کامیابی کا زینہ قرار دیں۔

۳۔ **شرفِ انسانی ظاہری آزادی سے بہتر ہے:** ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نہ صرف اپنی پاکدامنی کی حفاظت کے لیے قیدخانے میں گئے بلکہ اعلانِ آزادی کے بعد بھی قیدخانہ چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے یہاں تک کہ بادشاہ کا نمائندہ خالی ہاتھ لوٹ گیا اس لیے کہ پہلے مصر کی عورتوں سے یوسف کے بارے میں کافی تحقیق کی جائے اور اس کی بے گناہی ثابت ہو جائے تاکہ وہ عزت و آبرو کے ساتھ قیدخانے سے آزاد ہوں نہ کہ ایک آلودہ مجرم، بے حیثیت انسان اور شاہ کے معاف کیے ہوئے شخص کے طور پر کہ جو خود ایک عظیم ننگ و عار ہے۔

اور یہ تمام گزشتہ، آج کے اور کل کے انسانوں کے لیے ایک عظیم درس ہے۔

۴۔ **نفسِ سرکش:** علماء اخلاق نے نفس (انسانی جذبات، میلانات اور احساسات) کو تین مراحل میں تقسیم کیا ہے کہ جن کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے۔

پہلا "نفس امارہ"، نفس سرکش ہے کہ جو انسان کو گناہ کی ترغیب دیتا ہے اور اسے ہر طرف کھینچتا ہے اس لیے اسے "امّارہ" کہتے ہیں۔ اس مرحلے میں ابھی عقل و ایمان اتنا قوی نہیں ہوتا کہ نفس سرکش کو لگام دے سکے بلکہ اکثر اوقات اس کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیتا ہے یا اس سے دست و گریباں ہو تو نفس سرکش اسے پچھاڑ دیتا ہے اور شکست دے دیتا ہے۔

اسی مرحلے کی طرف مذکورہ بالا آیات میں زوجۂ عزیز مصر کی گفتگو میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یہی انسان کی تمام تر بدبختیوں کا سرچشمہ ہے۔

دوسرا "نفس لوامہ" ہے۔ اس مرحلے پر انسان تعلیم و تربیت اور مجاہدہ سے پہنچتا ہے۔ اس مرحلے میں ہو سکتا ہے انسان بعض اوقات عزائز اور جذبات کے طغیان کے نتیجے میں غلطیوں اور گناہوں کا مرتکب ہو لیکن فوراً پشیمان ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو ملامت شروع کر دیتا ہے اور اس طرح ممکن ہے وہ گناہ کی تلافی کا عزم کرے اور قلب و روح کو آب توبہ سے پاک کر لے۔ دوسرے لفظوں میں عقل اور نفس کے مقابلے میں کبھی عقل

---

[1] سفینہ، ج ۱ ص ۵۵۳۔

کامیاب ہو جاتی ہے اور کبھی نفس، بہر حال عقل و ایمان کا پلڑا بھاری رہتا ہے۔

البتہ اس مرحلے تک پہنچنے کے لیے جہاد اکبر ضروری ہے۔ اس مرحلے میں کافی ریاضت، مکتب استاد میں تربیت، ارشادِ الٰہی اور سنتِ آئمہ سے الہام لینا لازمی ہے۔

اس مرحلے کی قرآن مجید نے سورہ قیامت میں قسم کھائی ہے کہ جو اس کی عظمت کی دلیل ہے:

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ؕ

قسم ہے روزِ قیامت کی اور سرزنش کرنے والے نفس کی۔

تیسرا "نفس مطمئنہ" ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے کہ جس تک انسان قلب و روح کی صفائی، تہذیب اور کامل تربیت کے بعد پہنچتا ہے۔ اس میں سرکش غرائز رام ہو جاتے ہیں اور ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور عقل و ایمان کے مقابلے میں طاقت نہیں رکھتے کیونکہ عقل اور ایمان اس مرحلے میں اس قدر طاقتور ہو جاتے ہیں کہ نفسانی خواہشات ان کے مقابلے کی تاب نہیں رکھتیں۔ یہی سکون و اطمینان کا مرحلہ ہے ایسا سکون و اطمینان کہ جو عظیم بحر اوقیانوس پر حکومت کرتا ہے وہ سمندر کہ سخت طوفانوں پر بھی جن کی جبین پر شکن نہیں پڑتی۔

یہ انبیاء، اولیاء اور ان کے سچے پیروکاروں کا مقام ہے۔ وہ لوگ کہ جنہوں نے مردانِ خدا کے مکتب میں ایمان و تقویٰ کا درس حاصل کیا ہے، سالہا سال تہذیبِ نفس کی ہے اور جہادِ اکبر کے آخری مرحلے تک آپہنچے ہیں۔

اسی مرحلے کی طرف قرآن مجید نے سورہ فجر میں اشارہ کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۖ ارْجِعِىْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۚ فَادْخُلِىْ فِىْ عِبٰدِىْ ۙ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ ؕ

اے مطمئن و باسکون نفس اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آ کہ تو بھی اس سے خوش ہے اور وہ بھی تجھ سے راضی ہے اور میرے خاص بندوں کے زمرے میں داخل ہو جا اور میری جنت میں قدم رکھ۔

پروردگارا! ہماری مدد فرما کہ ہم تیرے قرآن کی نورانی آیات کے زیر سایہ "نفس امارہ" سے "نفس لوامہ" اور اس سے "نفس مطمئنہ" کی طرف ارتقاء کریں۔ اور ایک مطمئن اور پرسکون روح پیدا کریں کہ جسے طوفانِ حوادث متزلزل و مضطرب نہ کر سکے اور ہم دشمنوں کے مقابلے میں قوی تر ہوں، دنیا کی رنگینیوں سے بے اعتناء ہوں اور سختیوں میں صابر و بردبار ہوں۔

بارالہا! اب جبکہ ہمارے اسلامی انقلاب کو ڈیڑھ برس سے زیادہ عرصہ گزر رہا ہے۔

متاسفانہ ہمارے فوجیوں میں اختلاف کی نشانیاں ظاہر ہو رہی ہیں ۔ ایسی نشانیاں کہ جنہوں نے اسلام کے تمام شیدائیوں، انقلاب کے فدائیوں اور شہداء کے خون کے پاسداروں کو پریشان کر رکھا ہے۔[1]

خداوندا ! ہم سب کو ایسی عقل عطا فرما کہ ہم سرکش ہوا و ہوس پر کامیاب ہوں اور اگر ہم غلطی پر ہیں تو توفیق و ہدایت کے روشن چراغ سے ہماری راہ کو منور فرما ۔

الٰہی ! ہم نے یہاں تک کا راستہ اپنے قدموں سے طے نہیں کیا بلکہ ہر مرحلے میں تو ہمارا رہبر و رہنما تھا ۔ اپنا لطف و کرم ہم سے دُور نہ کر اور اگر تیری ان سب نعمتوں کی ناشکری تیری سزا کے استحقاق کا موجب بنی ہے تو اس سے پہلے کہ ہم سزا و عذاب میں گرفتار ہوں، ہمیں بیدار فرما ۔

آمین یا رب العالمین

---

[1] فوج میں جس اختلاف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ سابق صدر ایران بنی صدر کا پیدا کردہ تھا جو اس کی معزولی کے بعد دور ہو گیا ۔ (مترجم)

۵۴۔ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي ۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ ○

۵۵۔ قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ○

۵۶۔ وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ ۖ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ○

۵۷۔ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ○

ترجمہ

۵۴۔ (مصر کے) بادشاہ نے کہا: اس (یوسف) کو میرے پاس لے آؤ تاکہ میں اسے اپنے ساتھ مخصوص کروں۔ جب (یوسف اس کے پاس آئے اور) اس سے گفتگو کی (تو بادشاہ کو ان کی عقل و فہم کا اندازہ ہوا) تو اس نے کہا: آج تو ہمارے ہاں اعلیٰ قدر و منزلت رکھتا ہے تو قابلِ اعتماد ہے۔

۵۵۔ (یوسف نے) کہا: مجھے (مصر کی) زمین کے خزانوں کا سرپرست بنا دے کیونکہ میں حفاظت کرنے والا اور آگاہ ہوں۔

۵۶۔ اس طرح ہم نے یوسف کو (مصر کی) زمین میں قدرت دی کہ اب جہاں چاہتا اس میں رہتا (اور اس میں تصرف کرتا)، ہم جسے چاہتے ہیں (اور لائق سمجھتے ہیں) اپنی رحمت سے نوازتے ہیں اور ہم نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

۵۷۔ اور جو ایمان لائے ہیں اور پرہیزگار ہیں آخرت کا اجر ان کے لیے بہتر ہے۔

تفسیر

یوسفؑ مصر کے خزانہ دار کی حیثیت سے

حضرت یوسف علیہ السلام جیسے عظیم نبی کی عجیب زندگی کی تفصیل میں ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ آخرکار ان کی پاکدامنی سب پر ثابت ہو گئی یہاں تک کہ ان کے دشمنوں نے ان کی پاکیزگی کی گواہی دی اور یہ ثابت ہو گیا کہ جس گناہ کی وجہ سے وہ زندان میں ڈالے گئے تھے وہ پاکدامنی، تقویٰ اور پرہیزگاری کے سوا کچھ نہ تھا۔

نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ بے گناہ قیدی علم، آگہی، دانشمندی، انتظامی صلاحیت اور فہم و فراست کی بہت اعلیٰ سطح کا مظہر ہے کیونکہ اس نے ملک ("بادشاہ مصر") کے خواب کی تعبیر بتاتے ہوئے آئندہ کی پیچیدہ اقتصادی مشکلات بیان کرتے ہوئے ساتھ ہی ان سے نجات کے راستے کی نشاندہی بھی کر دی تھی۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد قرآن کہتا ہے: بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے میرے پاس لے آؤ تاکہ میں اسے اپنا مشیر اور نمائندہ خاص بناؤں اور اپنی مشکلات حل کرنے کے لیے اس کے علم و دانش اور انتظامی صلاحیت سے مدد لوں (وقال الملک ائتونی بہ استخلصہ لنفسی)۔

بادشاہ کا پرجوش پیغام لے کر اس کا خاص نمائندہ قید خانے میں یوسفؑ کے پاس پہنچا۔ اس نے بادشاہ کی طرف سے سلام و دعا پہنچایا اور بتایا کہ اسے آپ سے شدید لگاؤ ہو گیا ہے۔ اس نے مصر کی عورتوں کے بارے میں تحقیق سے متعلق آپ کی درخواست کو عملی جامہ پہنایا ہے اور سب نے مکمل کر آپ کی پاکدامنی اور بے گناہی کی گواہی دی ہے۔ لہٰذا اب تاخیر کرنے کی گنجائش نہیں رہی اٹھیے تاکہ ہم اس کے پاس چلیں۔

حضرت یوسفؑ بادشاہ کے پاس تشریف لائے۔ ان کی آپس میں بات چیت ہوئی۔ بادشاہ نے ان کی گفتگو سنی اور آپ کی پرمغز اور نہایت اعلیٰ باتیں سنیں۔ اس نے دیکھا کہ آپ کی باتیں انتہائی علم و دانش اور دانائی سے معمور ہیں تو پہلے سے بھی زیادہ آپ کا شیفتہ ہو گیا۔ کہنے لگا: آپ آج سے ہمارے ہاں اعلیٰ قدر و منزلت اور وسیع اختیارات کے حامل ہیں اور ہمارے نزدیک قابلِ اعتماد رہیں گے (فلما کلمہ قال انک الیوم لدینا مکین امین)۔

آج سے اس ملک کے اہم کام آپ کے سپرد ہیں اور آپ کو امور کی اصلاح کے لیے کمرہمت باندھ لینا چاہیے کیونکہ میرے خواب کی جو تعبیر آپ نے بیان کی ہے اس کے مطابق اس ملک کو شدید اقتصادی بحران درپیش ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس بحران پر صرف آپ ہی قابو پا سکتے ہیں۔

حضرت یوسفؑ نے تجویز پیش کی کہ مجھے اس علاقے کے خزانوں کی ذمہ داری سونپ دی جائے کیونکہ میں اچھا محافظ ہوں اور اس کام کے اسرار سے بھی واقف ہوں (قال اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم)۔

حضرت یوسفؑ اچھی طرح جانتے تھے کہ ظلم سے بھرے اس معاشرے کی پریشانیوں کی ایک اہم بنیاد اس کے اقتصادی مسائل ہیں۔ لہٰذا انہوں نے سوچا کہ اب جب کہ انہیں مجبوراً آپ کی طرف آنا پڑا ہے تو کیا ہی اچھا ہے کہ مصر کی اقتصادیات کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور محروم مستضعف عوام کی مدد کے لیے آگے بڑھیں اور جتنا ہو سکے طبقاتی تفاوت اور اونچ نیچ کو کم کریں، مظلوموں کا حق ظالموں سے لیں اور اس وسیع ملک

کی بدحالی کو دور کریں۔ آپ کی نظر میں تھا کہ خاص طور پر زرعی مسائل اس ملک میں زیادہ اہم ہیں اس بات پر بھی توجہ رکھنا ہوگی کہ چند سال فراوانی کے ہوں گے اور پھر خشکی کے سال درپیش ہوں گے لہٰذا لوگوں کو زیادہ سے زیادہ غلے پیدا کرنے اور پھر انہیں احتیاط سے محفوظ رکھنے اور نہایت کم خرچ کرنے پر آمادہ کرنا ہوگا تاکہ قحط کے سالوں کے لیے غلہ ذخیرہ کیا جا سکے۔ لہٰذا اس مقصد کے لیے آپ کو یہی بہتر معلوم ہوا کہ آپ مصر کے خزانوں کو اپنی سرپرستی میں لینے کی تجویز پیش کریں۔

بعض نے لکھا ہے کہ اس بحال بادشاہ سخت مشکلات میں گھرا ہوا تھا اور کسی طرح ان سے نجات چاہتا تھا لہٰذا اس نے تمام امور کی باگ ڈور حضرت یوسفؑ کے ہاتھ میں دے دی اور خود کنارہ کشی اختیار کر لی۔

بعض دوسروں کا کہنا ہے کہ اس نے عزیز مصر کی جگہ حضرت یوسفؑ کو اپنا وزیر اعظم بنا لیا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیت کے ظاہری مفہوم کے مطابق وہ صرف مصر کے وزیر خزانہ بنے ہوں لیکن اسی سورہ کی آیت ۱۰۰ اور ۱۰۱ کہ جن کی تفسیر انشاء اللہ آئے گی اس امر کی دلیل ہیں کہ آخرکار آپ بادشاہ ہو گئے اور تمام امور مملکت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ آگئی۔ اگرچہ آیت ۸۸ میں ہے کہ یوسفؑ کے بھائیوں نے ان سے کہا: "یاایھا العزیز"

یہ اس امر کی دلیل ہے کہ آپ نے عزیز مصر کا منصب سنبھالا مگر اس میں کوئی مانع نہیں کہ آپ نے یہ مناصب تدریجاً حاصل کیے ہوں۔ پہلے وزیر خزانہ ہوئے ہوں، پھر وزیر اعظم اور پھر بادشاہ۔

بہرحال اس مقام پر خدا کہتا ہے: اور اس طرح ہم نے یوسف کو سرزمین مصر پر قدرت عطا کی کہ وہ جیسے چاہتا تھا اس میں تصرف کرتا تھا (وکذٰلک مکنا لیوسف فی الارض یتبوأ منھا حیث یشاء)۔

جی ہاں! ہم اپنی رحمت اور مادی و روحانی نعمتیں جسے چاہتے ہیں اور اہل پاتے ہیں عطا کرتے ہیں (نصیب برحمتنا من نشاء)۔

"اور ہم نیکوں کا اجر ہرگز ضائع نہیں کریں گے" اگرچہ اس میں تاخیر ہو جائے تاہم آخرکار جو کچھ ان کے لائق ہوگا انہیں دیں گے کیونکہ ہم کسی نیک کام کو فراموش نہیں کرتے (ولا نضیع اجر المحسنین)۔

لیکن اہم بات یہ ہے کہ ہم صرف دنیاوی اجر ہی نہیں دیں گے بلکہ جو اجر انہیں آخرت میں ملے گا وہ اہل ایمان اور صاحبانِ تقویٰ کے لیے زیادہ اچھا ہے" (ولاجر الاٰخرة خیر للذین اٰمنوا وکانوا یتقون)۔

چند اہم نکات

۱۔ حضرت یوسفؑ نے طاغوتِ وقت کی دعوت کیونکر قبول کی؟ زیر بحث آیات کی طرف توجہ ہوتے ہی پہلا سوال جو ذہن میں آتا ہے یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جیسے عظیم نبی طاغوت زمانہ سے وزارتِ خزانہ یا وزارتِ عظمیٰ کا منصب قبول کرنے اور اس کے ساتھ مل کر کام کرنے پر کیسے تیار ہو گئے؟

اس سوال کا جواب خود مندرجہ بالا آیات ہی میں پوشیدہ ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے یہ منصب ایک "حفیظ و علیم" شخصیت کی حیثیت سے قبول کیا تاکہ عوام کے مفاد میں بیت المال کی حفاظت کریں اور اسے انہی کے مفاد میں خرچ کریں خصوصاً مستضعف اور محروم عوام کے حقوق کہ جو اکثر معاشروں میں پامال ہوتے ہیں ان تک پہنچائیں۔

علاوہ ازیں جیسا کہ ہم نے کہا ہے وہ علم تعبیر کے ذریعے جانتے تھے کہ مصری قوم کو ایک شدید اقتصادی بحران پیش آنے والا ہے لہٰذا اس کے مقابلے کے لیے دقیق پروگرام اور قریب سے اس کی نگرانی کے بغیر ممکن تھا کہ بہت سے لوگ تباہ و برباد ہو جاتے۔ لہٰذا اس مصیبت سے عوام کی نجات اور بے گناہ انسانوں کی جان کی حفاظت کے لیے ضروری تھا کہ حضرت یوسفؑ کو جو موقع مل رہا تھا اس سے فائدہ اٹھاتے اور تمام لوگوں خصوصاً محروم عوام کے لیے اس سے استفادہ کرتے کیونکہ اقتصادی بحران اور قحط سالی میں سب سے زیادہ خطرہ انہی لوگوں کی جان کو تھا اور بحرانوں کی پہلی قربانی یہی لوگ ہوتے ہیں۔

فقہ میں ظالم کی حکومت قبول کرنے کی بحث میں بھی یہ بات تفصیل سے آئی ہے۔ تاہم کہا جاتا ہے کہ کوئی منصب قبول کرنا ہمیشہ حرام نہیں ہوتا بلکہ کبھی مستحب بھی ہوتا ہے، حتیٰ کہ کبھی واجب بھی ہوتا ہے اور ایسا اس صورت میں ہوتا ہے جب اس منصب کو قبول کرنے کے فوائد اور دینی تقاضے اس کی حکومت کو تقویت پہنچنے کے نقصانات سے زیادہ ہوں۔

متعدد روایات میں ہے کہ آئمہ اہل بیتؑ بھی اپنے قریبی ساتھیوں کو اس قسم کی اجازت دے دیتے تھے مثلاً علی بن یقطین امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے فرعون ہارون الرشید کی وزارت امامؑ کی اجازت سے قبول کی۔

بہر صورت اس قسم کے مناصب قبول کرنے یا رد کرنے کا انحصار "قانونِ اہم و مہم" پر ہے۔ اسکے نفع و نقصان کو دینی اور اجتماعی لحاظ سے پرکھا جانا چاہیے۔ بہت سے مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ ایسا عہدہ قبول کرنا ظالم کی معزولی پر منتج ہوتا ہے۔ جیسا کہ بعض روایات کے مطابق حضرت یوسفؑ کے ساتھ بھی یہی اتفاق ہوا اور کبھی ایسا عمل بعد ازاں انقلاب و قیام کا سرچشمہ بن جاتا ہے کیونکہ منصب قبول کرنے والا شخص حکومت کے اندر سے انقلاب کی راہ ہموار کرتا ہے۔ شاید مومن آلِ فرعون اسی قسم کی ایک مثال تھے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایسے افراد مظلوموں اور محروموں کے لیے پناہ گاہ بن جاتے ہیں اور ان کے لیے حکومتی ظلم میں کمی کا باعث بن جاتے ہیں۔

ان مقاصد میں سے کوئی ایک بھی حاصل ہو رہا ہو تو ایسے عہدے قبول کرنے کا جواز بن جاتا ہے۔

ایک مشہور روایت میں امام صادقؑ ایسے ہی افراد کے بارے میں فرماتے ہیں:

کفارة عمل السلطان قضاء حوائج الاخوان

ظالم حکومت کا ساتھ دینے کا کفارہ یہ ہے کہ بھائیوں کی ضروریات پوری کی جائیں۔[1]

یہ روایت بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

لیکن یہ مسئلہ ایسے مسائل میں سے ہے کہ جن میں حلال و حرام کی سرحد ایک دوسرے کے بہت نزدیک ہوتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان تھوڑی سی سہل انگاری کی وجہ سے غلط طور پر ظالم کا ساتھ دینے لگتا ہے اور کسی بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے جب کہ وہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں عبادت اور خدمتِ خلق میں مشغول ہوں۔

بعض اوقات سوءِ استفادہ کرنے والے افراد حضرت یوسفؑ یا علی بن یقطین کا نام غلط طور پر استعمال کرتے ہیں اور اسے بہانے کے

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صفحہ ۱۳۹ (سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۲۲۲ پر اسی قسم کا مضمون امام کاظمؑ سے علی بن یقطین کے بارے میں منقول ہے)۔

طور پر استعمال کرتے ہیں حالانکہ ان کے کام کو حضرت یوسفؑ اور علی بن یقطین سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔[1]

یہاں ایک اور سوال سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ مصر کا ظالم بادشاہ اس کے لیے کیسے تیار ہوگیا جب کہ وہ جانتا تھا کہ حضرت یوسف ظلم و ستم استعماری ہتھکنڈوں اور استثمار کے لیے ہرگز تیار نہ ہوں گے بلکہ اس کے برعکس اس کے مظالم میں رکاوٹ بنیں گے۔

ایک نکتے کی طرف توجہ کی جائے تو اس سوال کا جواب چنداں مشکل نہیں رہتا۔ وہ یہ کہ بعض اوقات معاشرتی اور اقتصادی بحران اس طرح کے ہوتے ہیں کہ خود سروں کی حکومت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیتے ہیں اس طرح سے کہ انہیں اپنی ہر چیز خطرے میں نظر آتی ہے۔ ایسے مواقع پر حالات سے بچنے کے لیے وہ یہاں تک تیار ہو جاتے ہیں کہ ایک عادلانہ عوامی حکومت کو قبول کرلیں تاکہ اپنے آپ کو بچا سکیں۔

۲۔ اقتصادی مسائل اور انتظامی صلاحیت کی اہمیت، بعض مکاتب بالکل یکسر بھتی ہیں اور ہر چیز کو اقتصادی پہلو میں منحصر سمجھتے ہیں۔ انہوں نے انسان اور اس کے وجود کی مختلف جہات کو نہیں پہچانا۔ ہم اگرچہ ان مکاتب سے اتفاق نہیں کرتے تاہم معاشروں کی زندگی میں خصوصیت سے اقتصادی مسائل کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مندرجہ بالا آیات بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کیونکہ تمام مناصب میں سے حضرت یوسفؑ نے وزارت خزانہ کا انتخاب کیا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے اسے ٹھیک کر لیا تو مصر کی زیادہ تر پریشانیاں دور ہو جائیں گی اور عدالت اقتصادی کے ذریعے وہ دوسری مشکلات پر بھی قابو پا سکیں گے۔

اسلامی روایات میں بھی اس موضوع کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ان میں سے ایک مشہور حدیث حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے جس میں لوگوں کی روحانی اور مادی زندگی (قوام الدین و الدنیا) کی حقیقی دو بنیادوں میں سے ایک اقتصادی مسائل بیان کی گئی ہے جب کہ دوسری آگہی اور علم و دانش کو شمار کیا گیا ہے۔ اگرچہ مسلمانوں نے ابھی تک اس اہمیت کی طرف توجہ نہیں کی کہ جو اسلام نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اس حصے کو دی ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمان زندگی کے اس حصے میں اپنے دشمنوں سے پیچھے رہ گئے ہیں اور پس ماندہ ہیں۔

لیکن مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں روز بروز بیداری اور آگاہی میں اضافہ دکھائی دے رہا ہے۔ اس سے امید بندھتی ہے کہ مستقبل میں مسلمان اقتصادی میدان میں کاوشوں کو ایک بہت بڑی اسلامی عبادت سمجھتے ہوئے انجام دینے لگیں گے اور اس لحاظ سے اسلام کے بے رحم دشمنوں کی نسبت جو پس ماندگی ہے اُسے دور کریں گے۔

ضمناً حضرت یوسفؑ نے یہ جو کہا ہے کہ "انی حفیظ علیم" ۔۔۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرے کے کسی حساس منصب کو قبول کرنے کے لیے صرف امانت داری ہی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انتظامی صلاحیت بھی ضروری ہے اور اس کے علاوہ علم و آگاہی اور مہارت بھی ضروری ہے کیونکہ آپ نے "حفیظ" کے ساتھ ساتھ "علیم" بھی کہا ہے۔

---

[1] کئی ایک روایات جو امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے منقول ہیں ان میں ہے کہ کچھ افراد جو اسلامی معیاروں سے ناواقف تھے بعض اوقات آپ پر اعتراض کرتے کہ آپ نے اس زہد و تقویٰ اور دنیا سے بے اعتنائی کے باوجود مامون کی ولی عہدی کو قبول کر لیا ہے۔ امامؑ نے جواب میں فرمایا: کیا پیغمبر افضل ہے یا وصی پیغمبر؟ انہوں نے کہا نہیں پیغمبر ہی افضل ہے۔ فرمایا: کون افضل ہے مسلمان یا مشرک؟ انہوں نے عرض کیا: مسلمان۔ فرمایا: عزیز مصر مشرک تھا اور یوسفؑ پیغمبر تھے اور مامون (ظاہراً) مسلمان ہے اور میں وصی پیغمبر ہوں اور یوسفؑ نے عزیز مصر سے چاہا کہ انہیں مصر کے خزانوں پر مامور کریں اور کہا کہ میں حفیظ و علیم ہوں جب کہ میں اس منصب کو قبول کرنے پر مجبور تھا۔ (وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صفحہ ۱۴۶)

ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ بے خبری، عدم مہارت اور انتظامی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے جو خطرات پیدا ہو جاتے ہیں وہ خیانت سے پیدا ہونے والے خطرات سے کم نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات اس سے بدتر اور زیادہ ہوتے ہیں۔

ان واضح اسلامی تعلیمات کے باوجود معلوم نہیں بعض مسلمان انتظامی صلاحیت اور علم و آگہی کے مسئلے کو کوئی اہمیت کیوں نہیں دیتے اور عہدے سپرد کرنے کے لیے وہ صرف امانت و دیانت کو شرائط سمجھتے ہیں حالانکہ پیغمبر اسلامؐ اور حضرت علیؑ کے دورِ حکومت میں ان کی سیرت نشاندہی کرتی ہے کہ وہ بزرگوار آگاہی اور انتظامی صلاحیت کو امانت و دیانت کی طرح اہمیت دیتے تھے۔

۳۔ **مصارف کی نگرانی:** اقتصادی مسائل میں صرف زیادہ سے زیادہ اجناس پیدا کرنے کا مسئلہ نہیں ہے۔ بعض اوقات مصارف اور خارج پر کنٹرول کرنا اس سے بھی زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے دورِ حکومت میں فراوانی نعمت کے سات سالوں میں مصارف پر سختی سے کنٹرول کیا تاکہ اجناس کی پیداوار کا ایک بڑا حصہ سختی کے سالوں کے لیے بچا کر رکھ سکیں۔

درحقیقت یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں۔ زیادہ پیداوار اس وقت مفید ہوتی ہے جب اسے زیادہ صحیح طور پر کنٹرول کر کے استعمال کیا جائے اور مصارف پر کنٹرول اس وقت زیادہ مفید ہے جب اس کے ساتھ پیداوار بھی زیادہ سے زیادہ ہو۔

مصر میں حضرت یوسفؑ کی اقتصادی سیاست سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ترقی پذیر اقتصادی نظام صرف زمانۂ حال پر نظر نہیں رکھتا بلکہ آئندہ پر بھی نظر رکھتا ہے اور آئندہ نسلوں پر بھی اس کی نظر ہوتی ہے اور یہ انتہائی خود غرضی ہے کہ ہم صرف اپنے آج کے منافع کی فکر میں رہیں مثلاً زمین میں موجود تمام ذخائر کو لوٹ لیں اور آئندہ آنے والوں کی کوئی فکر نہ کریں اور یہ نہ سوچیں کہ وہ کن حالات میں زندگی بسر کریں گے کیا ہمارے بھائی صرف وہی ہیں جو آج ہمارے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں اور بعد میں آنے والے ہمارے کچھ نہیں لگتے؟

یہ بات جاذب نظر ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے مصر کے لوگوں میں طبقاتی تفاوت اور لوٹ کھسوٹ کو ختم کرنے کے لیے قحط کے سالوں سے استفادہ کیا۔ آپ نے زیادہ پیداوار کے عرصے میں لوگوں سے غذائی مواد خرید لیا اور اس کے لیے تیار کیے گئے بڑے بڑے گوداموں میں اسے ذخیرہ کر لیا۔ جب یہ سال گزر گئے اور قحط کے سال شروع ہوئے تو پہلے سال اجناس کو درہم و دینار کے بدلے بیچا۔ اس طرح کرنسی کا ایک بڑا حصہ جمع کر لیا۔ دوسرے سال اسباب زینت اور جواہرات کے بدلے اجناس کو بیچا۔ البتہ جن کے پاس یہ چیزیں نہ تھیں انہیں مستثنیٰ رکھا۔ تیسرے برس چوپایوں کے بدلے، چوتھے برس غلاموں اور کنیزوں کے عوض، پانچویں برس عمارات کے بدلے، چھٹے برس زرعی زمینوں اور پانی کے عوض اور ساتویں سال خود مصر کے لوگوں کے بدلے اجناس دیں۔ پھر یہ سب چیزیں انہیں (عادلانہ طور پر) واپس کر دیں اور کہا کہ میرا مقصد یہ تھا کہ عوام کو بلا و مصیبت اور بے سروسامانی سے نجات دلاؤں۔[1]

۴۔ **اپنی تعریف یا اپنا تعارف:** اس میں شک نہیں کہ اپنی تعریف کرنا ایک ناپسندیدہ کام ہے لیکن اس کے باوجود یہ کلی قانون نہیں بعض اوقات حالات کا تقاضا ہوتا ہے اور ضروری ہوتا ہے کہ انسان معاشرے کو اپنا تعارف کروائے تاکہ لوگ اسے

---

[1] اس حدیث کو اختصار سے ذکر کیا گیا ہے اور صرف مفہوم پیش کیا گیا ہے۔ یہ امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے منقول ہے۔ تفسیر مجمع البیان جلد ۵ صفحہ ۲۴۲ کی طرف رجوع فرمائیں۔

پہچانیں اور اس کی مختلف خوبیوں اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں اور وہ ایک پوشیدہ اور متروک خزانے کی طرح نہ جائے۔

مندرجہ بالا آیات میں بھی ہم نے پڑھا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے مصر کی وزارتِ خزانہ کے منصب کے لیے آپ کو تجویز کرتے ہوئے "حفیظ علیم" کے الفاظ سے اپنی تعریف کی کیونکہ ضروری تھا کہ بادشاہِ مصر اور دوسرے لوگ جان لیں کہ آپ ایسی صفات کے حامل ہیں جو اس شعبے کی سرپرستی کے لیے بہت ہی ضروری ہیں۔

اسی لیے تفسیر عیاشی میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ سے سوال کیا گیا: کیا جائز ہے کہ انسان آپ اپنی تعریف کرے۔

آپؑ نے فرمایا:

نعم، اذا اضطر الیہ اما سمعت قول یوسف اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم وقول العبد الصالح و انا لکم ناصح امین

جی ہاں! جب اس کے سوا چارہ نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ کیا تو نے حضرت یوسف کا قول نہیں سنا۔ انہوں نے فرمایا: مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کردو کیونکہ میں امین و آگاہ ہوں۔ اسی طرح خدا کے عبدِ صالح (ہودؑ) نے فرمایا: میں تمہارے لیے خیر خواہ اور امین ہوں۔[1]

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ خطبہ شقشقیہ اور نہج البلاغہ کے دیگر خطبوں میں حضرت علیؑ نے جو اپنی تعریف کی ہے اور اپنے آپ کو محورِ خلافت کا قطب قرار دیا ہے کہ جس کی اوجِ فکر اور مقام والا تک فکرِ انسانی کا پرندہ پر نہیں مار سکتا اور علوم کے آبشار ان کے کہسارِ وجود سے گرتے ہیں ــــ اور اسی قسم کی دیگر تعریفیں ــــ سب اس لیے ہیں کہ ناآگاہ اور بے خبر لوگ آپ کے مقام کو سمجھیں اور آپ کے گنجینۂ وجود سے معاشرے کی بہبود کے لیے استفادہ کریں۔

۵۔ روحانی اجر بہتر ہے: اگرچہ بہت سے نیک لوگوں کو اس جہان میں مادی اجر مل جاتا ہے جیسا کہ حضرت یوسفؑ نے اپنی پاکدامنی، صبر، پارسائی اور تقویٰ کا نتیجہ اسی دنیا میں پالیا اور اگر وہ پاکدامن نہ ہوتے تو ہرگز اس مقام تک نہ پہنچتے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام لوگوں کو اس قسم کی توقع رکھنا چاہیے اور اگر انہیں مادی اجر نہ ملے تو وہ یہ گمان کرنے لگ جائیں کہ ان پر ظلم ہوا ہے کیونکہ اصلی اجر تو وہ ہے جو آئندہ زندگی میں انسان کے انتظار میں ہے۔

شاید اسی اشتباہ کو رفع کرنے اور اس توہم کو دور کرنے کے لیے قرآن زیرِ بحث آیات میں حضرت یوسفؑ کے دنیاوی اجر کا ذکر کرنے کے بعد مزید فرماتا ہے:

ولاجر الاخرۃ خیر للذین اٰمنوا وکانوا یتقون

اہلِ ایمان اور صاحبانِ تقویٰ کے لیے اجرِ آخرت برتر و بہتر ہے۔

۶۔ قیدیوں کے حقوق کی حمایت: قید خانوں میں ہمیشہ برے لوگ ہی نہیں رہے۔ ان میں کبھی بے گناہ رہے ہیں اور

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۴۳۳۔

کبھی مجرم لیکن ہر صورت میں اصول انسانی کا تقاضا ہے کہ انسانی حقوق کو ملحوظ خاطر رکھا جانا چاہیے۔ ہوسکتا ہے آج کی دنیا یہ سمجھے کہ قیدیوں کے حقوق کی آواز اسی دور میں بلند ہوئی ہے لیکن اسلام کی پرافتخار تاریخ گواہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے اپنی حکومت کی ابتدا ہی میں قیدیوں کے بارے میں نصیحتیں فرمائیں نیز حضرت علیؑ نے اپنے ظالم قاتل عبدالرحمٰن بن ملجم مرادی کے بارے میں جو وصیت فرمائی وہ تو ہم سب نے سنی ہے کہ آپؑ نے حکم دیا کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے یہاں تک کہ آپؑ نے اپنے لیے آنے والا دودھ اس کے لیے بھیجا اور اسے قتل کرنے کے بارے میں فرمایا:

اسے ایک سے زیادہ ضرب نہ لگائی جائے کیونکہ اس نے صرف ایک ضرب لگائی ہے۔

حضرت یوسفؑ بھی جب قید میں تھے تو آپؑ قیدیوں کے لیے مہربان رفیق، دلسوز ساتھی، مخلص دوست اور خیر خواہ مشیر تھے اور جب آپؑ قید خانے سے جانے لگے تو سب سے پہلے آپؑ نے دنیا کی توجہ قیدیوں کی حالت کی طرف مبذول کروائی اور ان کے حقوق کی حمایت کی اور ان سے اظہارِ ہمدردی کیا۔ آپؑ نے حکم دیا کہ قید خانے کے دروازے پر یہ عبارت لکھیں:

هذا قبور الاحياء و بيت الاحزان و تجربة الاصدقاء و شماتة الاعداء

یہ زندوں کا قبرستان ہے غموں کا گھر ہے، دوستوں کی آزمائش گاہ ہے اور دشمنوں کی سرزنش کی جگہ ہے[1]

حضرت یوسفؑ نے یہ دعا کرتے ہوئے قیدیوں سے اپنے لگاؤ کا اظہار کیا:

اللّٰهم اعطف عليهم بقلوب الاخيار، ولا تعم عليهم الاخبار

بارالٰہا! اپنے نیک بندوں کے دل ان کی طرف متوجہ کردے اور ان سے خبروں کو پوشیدہ نہ رکھ[2]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ مذکورہ بالا حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں:

فلذلك يكون اصحاب السجن اعرف الناس بالاخبار في كل بلدة

یہی وجہ ہے کہ ہر شہر میں قیدی اس شہر کی خبروں کے بارے میں دوسروں سے زیادہ آگاہ ہوتے ہیں۔

اس بات کو خود ہم نے قید کے دوران آزمایا ہے استثنائی مواقع کے علاوہ قیدیوں تک ایسی ایسی خبریں عجیب مخفی طریقوں سے پہنچ جاتی تھیں کہ جن سے خود قید خانے کے مامور آگاہ نہیں ہوتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ قید خانے میں آنے والے نئے قیدیوں کو قید خانے میں ایسی خبریں سننے کو ملتیں جن سے وہ باہر آگاہ نہ ہوتے تھے۔

اب اگر ہم اس کی مثالوں میں چلے گئے تو مقصد سے دور ہو جائیں گے۔

---

[1] و [2] نورالثقلین، جلد ۲ ص ۴۴۲۔

۵۸۔ وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ○

۵۹۔ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْۤ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ○

۶۰۔ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ○

۶۱۔ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ○

۶۲۔ وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَاۤ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○

ترجمہ

۵۸۔ اور یوسف کے بھائی آئے اور اس کے پاس پہنچے۔ اس نے انہیں پہچان لیا لیکن وہ اسے نہ پہچان پائے

۵۹۔ جب یوسف ان کے بار تیار کر چکا تو کہا (آئندہ جب آؤ تو) تمہارا جو باپ کی طرف سے بھائی ہے اسے میرے پاس لانا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں پیمانے کا حق ادا کرتا ہوں اور میں بہترین میزبان ہوں۔

۶۰۔ اور اگر تم اسے میرے ہاں نہ لائے تو پھر میرے پاس تمہارے لیے نہ کوئی کیل (اور غلے کا پیمانہ) ہوگا اور نہ ہی (تم ہرگز) میرے پاس آنا۔

۶۱۔ انہوں نے کہا ہم اس کے باپ سے بات کریں گے (اور کوشش کریں گے کہ وہ مان جائے اور ہم یہ کام ضرور کریں گے۔

۶۲۔ (پھر) اس نے اپنے کارندوں سے کہا، جو کچھ انہوں نے قیمت کے طور پر دیا ہے وہ ان کے سامان

میں رکھ دو شاید اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ کر وہ اسے پہچانیں اور شاید پلٹ آئیں۔

تفسیر

یوسفؑ کی بھائیوں کو نئی تجویز

آخرکار جیسا کہ پیش گوئی ہوئی تھی سات سال پے در پے بارش ہونے کے سبب اور دریائے نیل کے پانی میں اضافے کے باعث مصر کی زرعی پیداوار خوب تسلی بخش ہو گئی۔ مصر کا خزانہ اور اقتصادی امور حضرت یوسفؑ کے زیر نظر تھے۔ آپ نے حکم دیا کہ غذائی اجناس کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے چھوٹے بڑے گودام بنائے جائیں۔ آپ نے عوام کو حکم دیا کہ پیداوار سے اپنی ضرورت کے مطابق رکھ لیں اور باقی حکومت کے پاس بیچ دیں۔ اس طرح گودام غلے سے بھر گئے۔

نعمت و برکت کی فراوانی کے یہ سات سال گزر گئے اور قحط سالی اور خشک سالی کا منحوس دور شروع ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان زمین کے لیے بخیل ہو گیا ہے۔ کھیتیاں اور نخلستان خشک ہو گئے۔ عوام کو غلے کی کمی کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ جانتے تھے کہ حکومت نے غلے کے ذخائر جمع کر رکھے ہیں لہٰذا وہ اپنی مشکلات حکومت ہی کے ذریعے دور کرتے تھے۔ حضرت یوسف بھی پوری منصوبہ بندی اور پروگرام کے تحت غلہ فروخت کرتے تھے اور عادلانہ طور پر ان کی ضرورت پوری کرتے تھے۔

یہ خشک سالی صرف مصر ہی میں نہ تھی اطراف کے ملکوں کا بھی یہی حال تھا۔ فلسطین اور کنعان مصر کے شمال مشرق میں تھے۔ وہاں کے لوگ بھی انہی مشکلات سے دوچار تھے۔ حضرت یعقوبؑ کا خاندان بھی اسی علاقے میں سکونت پذیر تھا۔ وہ بھی غلے کی کمی سے دوچار ہو گیا۔ حضرت یعقوبؑ نے ان حالات میں مصمم ارادہ کیا کہ بنیامین کے علاوہ باقی بیٹوں کو مصر کی طرف بھیجیں۔ یوسفؑ کی جگہ اب بنیامین ہی ان کے پاس تھا۔ بہرحال وہ لوگ مصر کی طرف جانے والے قافلے کے ہمراہ ہو لیے اور [illegible] کے بقول اٹھارہ دن کی مسافت کے بعد مصر پہنچے۔

جیسا کہ تواریخ میں ہے، ضروری تھا کہ ملک سے باہر سے آنے والے افراد مصر میں داخل ہوتے وقت اپنی شناخت کروائیں تاکہ مامورین حضرت یوسفؑ کو مطلع کریں۔ جب مامورین نے فلسطین کے قافلے کی خبر دی تو حضرت یوسفؑ نے دیکھا کہ غلے کی درخواست کرنے والوں میں ان کے بھائیوں کے نام بھی ہیں۔ آپ انہیں پہچان گئے اور یہ ظاہر کیے بغیر کہ وہ آپ کے بھائی ہیں آپ نے حکم دیا کہ انہیں حاضر کیا جائے اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے یوسفؑ کے بھائی آئے اور اس کے پاس پہنچے تو اس نے انہیں پہچان لیا لیکن انہوں نے اسے نہیں پہچانا (و جاء اخوة یوسف فدخلوا علیه فعرفهم و هم له منکرون)۔

وہ یوسفؑ کو نہ پہچانتے میں حق بجانب تھے کیونکہ ایک طرف تو تیس سے چالیس سال تک کا عرصہ بیت چکا تھا (اس دن سے لے کر جب انہوں نے حضرت یوسفؑ کو کنویں میں پھینکا تھا ان کے مصر میں آنے تک) اور دوسری طرف وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ان کا بھائی عزیز مصر ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ اسے اپنے بھائی سے مشابہ بھی پاتے تو اسے ایک اتفاق ہی سمجھتے۔ ان تمام امور سے قطع نظر حضرت یوسفؑ کے لباس کا انداز بھی بالکل بدل چکا تھا۔ انہیں مصریوں کے نئے لباس میں پہچاننا کوئی آسان کام نہ تھا بلکہ یوسفؑ کے ساتھ جو کچھ ہو گزرا تھا اس کے بعد ان کی زندگی کا احتمال بھی ان کے لیے بہت بعید تھا۔

بہرحال انہوں نے اپنی ضرورت کا غلہ خریدا اور اس کی قیمت نقدی کی صورت میں اور یا موزے، جوتے یا کپڑا اور اجناس کی صورت میں ادا کی کہ جو وہ کنعان سے مصر لائے تھے۔

حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے بہت محبت کا برتاؤ کیا اور ان سے بات چیت کرنے لگے۔ بھائیوں نے کہا:
ہم دس بھائی ہیں اور حضرت یعقوبؑ کے بیٹے ہیں۔ ہمارے والد خدا کے عظیم پیغمبر ابراہیم خلیل کے پوتے ہیں۔ اگر آپ ہمارے باپ کو پہچانتے ہوتے تو ہمارا بہت احترام کرتے۔ ہمارا بوڑھا باپ انبیاء الٰہی میں سے ہے لیکن ایک نہایت گہرے غم نے اس کے پورے وجود کو گھیر رکھا ہے۔

حضرت یوسفؑ نے پوچھا:

یہ غم کس بنا پر ہے۔

انہوں نے کہا:

اس کا ایک بیٹا تھا جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔ عمر میں وہ ہم سے بہت چھوٹا تھا۔ ایک دن وہ ہمارے ساتھ شکار اور تفریح کے لیے صحرا میں گیا۔ ہم اس سے غافل ہو گئے تو ایک بھیڑیا اسے چیر پھاڑ گیا۔ اس دن سے لے کر آج تک باپ اس کے لیے گریاں اور غمگین ہے۔

بعض مفسرین نے اس طرح سے نقل کیا ہے:

حضرت یوسفؑ کی عادت تھی کہ ایک شخص کو ایک اونٹ کے بار سے زیادہ غلہ نہیں بیچتے تھے۔ حضرت یوسفؑ کے یہ بھائی چونکہ دس تھے لہٰذا انہیں غلے کے دس بار دیئے گئے۔

انہوں نے کہا: ہمارا بوڑھا باپ ہے اور ایک چھوٹا بھائی ہے جو وطن میں رہ گیا ہے۔ باپ غم و اندوہ کی شدت کی وجہ سے سفر نہیں کر سکتا اور چھوٹا بھائی خدمت کے لیے اور مانوسیت کی وجہ سے اس کے پاس رہ گیا ہے۔ لہٰذا ان دونوں کا حصہ بھی ہمیں دے دیجیے۔

حضرت یوسفؑ نے حکم دیا کہ دو اونٹوں کے بار کا اضافہ کیا جائے۔ پھر حضرت یوسفؑ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ہوشمند اور مؤدب افراد ہو اور یہ جو تم کہتے ہو کہ تمہارے باپ کو تمہارے سب سے چھوٹے بھائی سے لگاؤ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی اور عام بچوں سے ہٹ کر ہے۔ میری خواہش ہے کہ تمہارے آئندہ سفر میں میں اُسے ضرور دیکھوں۔ علاوہ ازیں یہاں کے لوگوں کو تمہارے بارے میں کئی بدگمانیاں ہیں کیونکہ تم ایک دوسرے ملک سے تعلق رکھتے ہو لہٰذا بدظنی کی اس فضا کو دور کرنے کے لیے آئندہ سفر میں چھوٹے بھائی کو نشانی کے طور پر ساتھ لے آنا۔

یہاں قرآن کہتا ہے: جب یوسفؑ نے ان کے بار تیار کیے تو اُن سے کہا: تمہارا بھائی جو باپ کی طرف سے ہے اسے میرے پاس لے آؤ (ولما جھزھم بجھازھم قال ائتونی باخ لکم من ابیکم)۔

اس کے بعد مزید کہا: کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں پیمانہ کا حق ادا کرتا ہوں اور میں بہترین میزبان ہوں (الا ترون انی اوفی الکیل وانا خیر المنزلین)۔

اس تشویق اور اظہار محبت کے بعد انہیں یوں تہدید بھی کی، اگر اس بھائی کو میرے پاس نہ لائے تو تمہیں میرے پاس سے غلہ ملے گا اور نہ تم خود میرے پاس پھٹکنا (فان لم تأتونی به فلا کیل لکم عندی و لا تقربون)۔

حضرت یوسفؑ چاہتے تھے کہ جیسے بھی ہو بنیامین کو اپنے پاس بلوائیں۔ اس کے لیے کبھی وہ لطف و محبت کا طریقہ اختیار کرتے اور کبھی تہدید کا۔

ان تعبیرات سے ضمنی طور پر واضح ہوتا ہے کہ مصر میں غلات کی خرید و فروخت تول کر نہیں ہوتی تھی بلکہ پیمانے سے ہوتی تھی۔

نیز یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ اپنے بھائیوں اور دوسرے مہمانوں کی بہت اچھے طریقے سے پذیرائی کرتے تھے اور ہر حوالے سے مہمان نواز تھے۔

بھائیوں نے ان کے جواب میں کہا: ہم اس کے باپ سے بات کریں گے اور کوشش کریں گے کہ وہ رضامند ہو جائیں اور ہم یہ کام ضرور کریں گے (قالوا سنراود عنه اباه و انا لفاعلون)۔

"انا لفاعلون" کی تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ انہیں یقین تھا کہ اس سلسلے میں وہ اپنے باپ کو راضی کر لیں گے اور ان کی موافقت حاصل کر لیں گے۔ اسی لیے وہ عزیز مصر سے ایسا پکا وعدہ کر رہے تھے اور ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کیونکہ جب وہ اپنے اصرار اور آہ و زاری سے یوسفؑ کو اپنے باپ سے لے جا سکتے تھے تو بنیامین کو کیونکر ان سے جدا نہیں کر سکتے تھے۔

اس موقع پر ان کی ہمدردی اور توجہ کو زیادہ سے زیادہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے حضرت یوسفؑ نے "اپنے کارندوں سے کہا کہ ان کی نظر بچا کر وہ اموال ان کے غلے میں رکھ دیں جو انہوں نے اس کے بدلے میں دیے تھے تاکہ جب وہ واپس اپنے خاندان میں جا کر اپنا سامان کھولیں تو انہیں پہچان لیں اور دوبارہ مصر کی طرف لوٹ آئیں (وقال لفتیٰنه اجعلوا بضاعتهم فی رحالهم لعلهم یعرفونها اذا انقلبوا الی اهلهم لعلهم یرجعون)۔

چند اہم نکات

۱۔ حضرت یوسفؑ نے بھائیوں سے اپنا تعارف کیوں نہ کروایا؟ مندرجہ بالا آیات کے مطالعے سے جو پہلا سوال سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے بھائیوں سے اپنا تعارف کیوں نہ کروایا کہ وہ جلد از جلد آپ کو پہچان لیتے اور باپ کے پاس واپس جا کر انہیں آپ کی جدائی کے جانکاہ غم سے نکالتے؟

یہ سوال زیادہ وسیع حوالے سے بھی سامنے آسکتا ہے اور وہ یہ کہ جس وقت حضرت یوسفؑ کے بھائی آپ کے پاس آئے اس وقت آپ کی زندان سے رہائی کو کم از کم آٹھ سال گزر چکے تھے کیونکہ گزشتہ سات سال فراواں نعمتوں پر مشتمل گزر چکے تھے جن کے دوران آپ قحط سالی کے مقابلے کے لیے اناج ذخیرہ کرنے میں مشغول رہے۔ آٹھویں سال قحط کا دور شروع ہوا۔ اس سال یا اس کے بعد آپ کے بھائی غلہ لینے کے لیے مصر آئے۔ کیا یہ بہتر نہ تھا کہ ان آٹھ سالوں میں آپ کوئی قاصد کنعان کی طرف بھیجتے اور اپنے والد کو اپنے حالات سے آگاہ کرتے اور انہیں شدید غم سے نجات دلاتے؟

بہت سے مفسرین نے مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں، علامہ طباطبائی نے المیزان میں اور قرطبی نے الجامع لاحکام القرآن میں اس سوال

کا جواب دیا ہے اور اس سلسلے میں کئی جوابات پیش کیے ہیں۔ ان میں سے زیادہ بہتر یہ نظر آتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کی اجازت نہ تھی کیونکہ فراقِ یوسفؑ دیگر پہلوؤں کے علاوہ حضرت یعقوبؑ کے لیے ایک امتحان بھی تھا اور ضروری تھا کہ آزمائش کا یہ دور فرمانِ الٰہی سے ختم ہو اور اس سے پہلے حضرت یوسفؑ خبر دینے کے مجاز نہ تھے۔

علاوہ ازیں اگر حضرت یوسفؑ فوراً ہی اپنے بھائیوں کو اپنا تعارف کروا دیتے تو ممکن تھا کہ اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوتا اور ہو سکتا تھا کہ وہ اس سے ایسے وحشت زدہ ہوتے کہ پھر لوٹ کر آپ کے پاس نہ آتے کیونکہ انہیں یہ خیال پیدا ہوتا کہ ممکن ہے یوسفؑ ان کے گزشتہ رویے کا انتقام لیں۔

۲۔ غلہ کی قیمت کیوں واپس کر دی؟ حضرت یوسفؑ نے یہ حکم کیوں دیا تھا کہ جو مال ان کے بھائیوں نے غلے کی قیمت کے طور پر دیا ہے وہ ان کے سامان میں رکھ دیا جائے؟

اس سوال کے بھی کئی جوابات دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں دس جوابات ذکر کیے ہیں۔ بعض تو ان میں سے غیر مناسب ہیں البتہ خود مذکورہ آیت نے اس سوال کا جواب دیا ہے: "لعلھم یعرفونھا اذا انقلبوا الی اھلھم لعلھم یرجعون" یعنی حضرت یوسفؑ کا مقصد یہ تھا کہ جب وہ وطن واپسی پر اپنا سامان دیکھیں تو انہیں عزیزِ مصر (حضرت یوسفؑ) کی کرم نوازی کا پہلے سے زیادہ احساس ہو اور اسی بنیاد پر وہ دوبارہ آپ کے پاس آ جائیں یہاں تک کہ اپنے چھوٹے بھائی کو بھی پورے اطمینانِ قلب سے اپنے ساتھ لے آئیں اور خود حضرت یعقوبؑ بھی یہ بات دیکھ کر بنیامین کو بڑے اعتماد سے مصر روانہ کر دیں۔

۳۔ حضرت یوسفؑ نے بیت المال کا مال کیوں بلا معاوضہ دے دیا؟: ایک اور سوال جو یہاں سامنے آتا ہے یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو بیت المال کا کچھ حصہ کیوں بلا معاوضہ دے دیا۔

اس سوال کا جواب دو طرح سے دیا جا سکتا ہے:

پہلا یہ کہ مصر کے بیت المال میں مستضعفین کا حق تھا (اور ہمیشہ ہوتا ہے) اور مختلف ممالک میں موجود سرحدوں سے یہ حق ختم نہیں ہو جاتا۔ اسی لیے حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کے لیے جو اس وقت مستضعف تھے اس حق سے استفادہ کیا جیسا کہ وہ دیگر مستضعفین کے لیے بھی کرتے تھے۔

دوسرا یہ کہ حضرت یوسفؑ اس وقت ایک حساس منصب پر تھے جس کی بنا پر ذاتی طور پر بھی ان کے کچھ حقوق تھے، ان کا کم از کم یہ حق تھا کہ وہ اپنی معاشی ضروریات کا، اپنے ضرورت مند اہل و عیال کا اور اپنے باپ اور بھائیوں جیسے رشتہ داروں کی کم از کم معاشی زندگی کا خیال رکھیں، اسی بنا پر آپ نے ان بخشش و عطا میں اپنے اس حق سے استفادہ کیا۔

۶۳۔ فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○

۶۴۔ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ○

۶۵۔ وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ○

۶۶۔ قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ○

ترجمہ

۶۳۔ جب وہ اپنے والد کے پاس واپس پہنچے تو انہوں نے کہا: ابا جان! ہم سے (غلے کا) پیمانہ روک دیا گیا ہے لہٰذا ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ ہم (غلے کا) حصہ لے سکیں اور ہم اس کی حفاظت کریں گے۔

۶۴۔ اس نے کہا: کیا میں اس کے بارے میں تم پر بھروسہ کروں جیسا کہ اس کے بھائی (یوسف) کے بارے میں تم پر بھروسہ کیا تھا اور (میں نے دیکھا کہ کیا ہوا اور بہرحال) خدا بہترین محافظ اور ارحم الراحمین ہے۔

۶۵۔ اور جس وقت انہوں نے اپنا مال و متاع کھولا تو انہوں نے دیکھا کہ ان کا سرمایہ انہیں واپس کر دیا گیا ہے

انہوں نے کہا، ابا جان! ہمیں اور کیا چاہیے یہ دیکھیے) ہمارا سرمایہ جو ہمیں واپس کر دیا گیا ہے (لہٰذا کیا ہی اچھا ہے کہ بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجیے) اور ہم اپنے گھر والوں کے لیے اناج لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور زیادہ بڑا پیمانہ حاصل کریں گے، یہ تو چھوٹا پیمانہ ہے۔

۶۶۔ اس نے کہا میں ہرگز اسے تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک کہ مجھ سے پکا خدائی وعدہ نہ کرو کہ اسے حتماً میرے پاس لے آؤ گے مگر یہ کہ (موت یا کسی اور سبب سے) تم سے قدرت سلب ہو جائے اور جس وقت انہوں نے اس سے قابلِ وثوق وعدہ کر لیا تو اس نے کہا: جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں خدا اس پر ناظر و حافظ ہے۔

تفسیر

آخر کار باپ راضی ہو گئے

حضرت یوسفؑ کے بھائی مالا مال ہو کر خوشی خوشی کنعان واپس آئے لیکن آئندہ کی فکر تھی کہ اگر باپ چھوٹے بھائی (بنیامین) کو بھیجنے پر راضی نہ ہوئے تو عزیز مصر ان کی پذیرائی نہیں کرے گا اور انہیں غلے کا حصہ نہیں دے گا۔

اسی لیے قرآن کہتا ہے، جب وہ باپ کے پاس لوٹ کر آئے تو انہوں نے کہا، ابا جان! حکم دیا گیا ہے کہ آئندہ ہمیں غلے کا حصہ دیا جائے گا اور پیمانہ ہم سے روک دیا جائے (فلما رجعوا الی ابیھم قالوا یاابانا منع منا الکیل)۔ اب جب یہ صورت درپیش ہے تو ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں تاکہ ہم پیمانہ حاصل کر سکیں (فارسل معنا اخانا نکتل)[1] اور آپ مطمئن رہیں ہم اس کی حفاظت کریں گے (وانا لہ لحافظون)۔

باپ کہ جسے یوسفؑ ہرگز نہیں بھولتا تھا یہ بات سن کر پریشان ہو گیا، ان کی طرف رخ کر کے اس نے کہا: کیا میں تم پر اس بھائی کے بارے میں بھروسہ کروں جب کہ اس کے بھائی یوسفؑ کے بارے میں گزشتہ زمانے میں تم پر بھروسہ کیا تھا (قال ھل اٰمنکم علیہ الا کما امنتکم علی اخیہ من قبل)۔

یعنی جب تمہارا ایسا بُرا ماضی ہے کہ جو بھولنے کے قابل نہیں تو تم کس طرح توقع رکھتے ہو کہ دوبارہ تمہاری فرمائش مان لوں اور اپنے

---

[1] "نکتل" اصل میں "کیل" کے مادے "نکتال" تھا۔ پیمانے سے کوئی چیز حاصل کرنے کے معنی میں ہے لیکن "کال" پیمانے سے کوئی چیز دینے کے معنی میں ہے۔

فرزند دلبند کو تمہارے سپرد کر دوں اور وہ بھی ایک دور دراز سفر اور پرائے وطن کے لیے۔ اس کے بعد اس نے مزید کہا، ہر حالت میں خدا بہترین محافظ اور ارحم الراحمین ہے۔ (فاللہ خیر حافظا و ھو ارحم الراحمین)۔

ہوسکتا ہے یہ جملہ اس طرف اشارہ ہو کہ تم جیسے برے ماضی والے افراد کے ساتھ میرے لیے مشکل ہے کہ بنیامین کو بھیجوں اور بھیجوں گا بھی تو خدا کی حفاظت میں اور اس کے ارحم الراحمین ہونے کے بھروسے پر نہ کہ تمہارے بھروسے پر۔

لہٰذا مندرجہ بالا جملہ ان کی فرمائش قبول کرنے کی طرف قطعی اشارہ نہیں ہے بلکہ ایک احتمالی بات ہے کیونکہ بعد والی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے ابھی تک ان کی فرمائش قبول نہیں کی تھی اور آپ نے پختہ عہد لینے اور پیش آمدہ دیگر واقعات کے بعد اسے قبول کیا۔

دوسرا یہ کہ ممکن ہے حضرت یوسفؑ کی طرف اشارہ ہو کیونکہ اس موقع پر انہیں یوسفؑ یاد آ گئے اور وہ پہلے سے بھی جانتے تھے کہ وہ زندہ ہیں (اور بعد والی آیات میں بھی ہم پڑھیں گے کہ انہیں حضرت یوسفؑ کے زندہ ہونے کا اطمینان تھا) لہٰذا آپ نے ان کے محفوظ و سلامت رہنے کی دعا کی کہ خدایا! وہ جہاں کہیں بھی ہیں انہیں سلامت رکھ۔

پھر ان بھائیوں نے جب اپنا سامان کھولا تو انہوں نے بڑے تعجب سے دیکھا کہ وہ تمام چیزیں جو انہوں نے غلے کی قیمت کے طور پر عزیز مصر کو دی تھیں سب انہیں لوٹا دی گئی ہیں اور وہ ان کے سامان میں موجود ہیں (و لما فتحوا متاعھم وجدوا بضاعتھم ردت الیھم) جب انہوں نے دیکھا کہ یہ تو ان کی گفتگو پر سند قاطع ہے تو باپ کے پاس آئے اور کہنے لگے ابا جان! ہمیں اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے، دیکھیے انہوں نے ہمارا تمام مال و متاع ہمیں واپس کر دیا ہے۔ (قالوا یا ابانا ما نبغی ھذہ بضاعتنا ردت الینا)[1]

کیا اس سے بڑھ کر کوئی عزت و احترام اور مہربانی ہو سکتی ہے کہ ایک غیر ملک کا سربراہ ایسے قحط اور خشک سالی میں ہمیں اناج بھی دے اور اس کی قیمت بھی واپس کر دے، وہ بھی ایسے کہ ہم سمجھ ہی نہ پائیں اور شرمندہ نہ ہوں۔ اس سے بڑھ کر ہم کیا تصور کر سکتے ہیں!؟

ابا جان! اب کسی پریشانی کی ضرورت نہیں۔ ہمارا بھائی ہمارے ساتھ بھیج دیں۔ ہم اپنے گھر والوں کے لیے اناج لے آئیں گے۔ (ونمیر اھلنا)[2] اور اپنے بھائی کی حفاظت کی کوشش کریں گے۔ (ونحفظ اخانا) نیز اس کی وجہ سے ایک اونٹ کا بار بھی زیادہ لائیں گے۔ (ونزداد کیل بعیر)۔ اور عزیز مصر جیسے محترم، مہربان اور سخی شخص کے لیے کہ جسے ہم نے دیکھا ہے ایک آسان اور معمولی کام ہے (ذلک کیل یسیر)[3]۔

---

[1] ہو سکتا ہے "ما نبغی" استفہامیہ جملہ ہو اور اس کی تقدیر "ما نبغی وراء ذلک" (ہمیں اس سے زیادہ اور کیا چاہیے) ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نافیہ ہو اور اس کی تقدیر اس طرح ہو "ما نبغی بذلک الکذب" یا "ما نبغی منک دراھم" (ہم جھوٹ نہیں بولنا چاہتے یا یہ کہ ہم اس سے زیادہ آپ سے نہیں چاہتے یہی مال کافی ہے)۔

[2] "نمیر" "میرہ" کے مادہ سے کھانا اور غذائی مواد حاصل کرنے کے معنی میں ہے۔

[3] "ذلک کیل یسیر" میں یہ احتمال بھی ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ ہم لائے ہیں یہ تو تھوڑا سا پیمانہ ہے اگر ہمارا چھوٹا بھائی ہمارے ساتھ چلے تو ہم زیادہ غلہ حاصل کر سکتے ہیں۔

ان تمام امور کے باوجود حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے بنیامین کو ان کے ساتھ بھیجنے کے لیے راضی نہ تھے لیکن دوسری طرف ان کا اصرار تھا جو واضح منطق کی بنیاد پر تھا۔ یہ صورتِ حال انہیں آمادہ کرتی تھی کہ وہ ان کی تجویز قبول کریں۔ آخرکار انہوں نے دیکھا کہ اس کے بغیر چارہ نہیں کہ مشروط طور پر بیٹے کو بھیج دیا جائے۔ لہٰذا آپ نے انہیں اس طرح سے کہا: میں اسے ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا، جب تک کہ تم ایک خدائی پیمان دو اور کوئی ایسا کام کرو کہ جس سے مجھے اعتماد پیدا ہو جائے کہ تم اسے واپس لے کر آؤ گے مگر یہ کہ موت یا اور عوامل کی وجہ سے یہ امر تمہارے بس میں نہ رہے (قال لن ارسله معکم حتی تؤتون موثقا من الله لتأتننی به الا ان یحاط بکم)۔

"موثقا من الله" سے مراد وہی قسم ہے جو خدا کے نام کے ساتھ ہے۔

"الا ان یحاط بکم" کا معنی اصل میں یہ ہے:

"مگر یہ کہ حوادث تمہیں گھیر لیں"

یعنی "حوادث سے مغلوب ہو جاؤ"

یہ جملہ ہوسکتا ہے موت یا ایسے دوسرے حوادث کے لیے کنایہ ہو جو انسان کو بے بس کردیں۔[1]

یہ استثناء حضرت یعقوبؑ کی عظیم دانائی کی علامت ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ اپنے بیٹے بنیامین سے اس قدر محبت رکھتے تھے انہوں نے اپنے دوسرے بیٹوں کو ایسی مشکل میں نہیں ڈالا جو ان کے بس میں نہ ہو لہٰذا کہا کہ میں تم سے اپنا بیٹا چاہتا ہوں مگر یہ کہ ایسے حوادث پیش آجائیں جو تمہاری قدرت سے ماوراء ہوں، اس صورت میں تمہارا کوئی گناہ نہ ہوگا۔

واضح ہے کہ اگر ان میں سے بعض کسی حادثے میں گرفتار ہو جاتے اور ان سے قدرت چھن جاتی تو باقی رہ جانے والوں کی ذمہ داری تھی کہ وہ باپ کی امانت اس تک پہنچا دیں، اسی لیے حضرت یعقوبؑ کہتے ہیں، مگر یہ کہ تم سب حوادث سے مغلوب ہو جاؤ۔

بہرحال یوسفؑ کے بھائیوں نے باپ کی شرط قبول کرلی اور جب انہوں نے اپنے والد سے عہد و پیمان باندھا تو یعقوبؑ نے کہا: خدا شاہد، ناظر اور محافظ ہے، اس بات پر کہ جو ہم کہتے ہیں (فلما اتوه موثقهم قال الله علی ما نقول وکیل)۔

چند اہم نکات

۱۔ **حضرت یعقوبؑ کیسے راضی ہو گئے:** مندرجہ بالا آیات کے سلسلے میں جو پہلا سوال ذہن میں آتا ہے یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ بنیامین کو ان کے سپرد کرنے پر کیسے آمادہ ہو گئے جب کہ ان کے بھائی یوسفؑ کے بارے میں اپنے سلوک کی وجہ سے پہلے بُرے کردار کے شمار ہوتے تھے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ صرف یوسفؑ کے بارے میں اپنے دل میں کینہ و حسد نہیں رکھتے تھے بلکہ وہی احساسات اگرچہ

---

[1] یہ تعبیر قرآن مجید میں کئی مقامات پر صرف ہلاکت اور نابودی کے معنی میں استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً:

وظنوا انهم احیط بهم (یونس۔ ۲۲)

واحیط بثمره (کہف۔ ۴۲)

لیکن واضح ہے کہ زیر بحث آیات میں مراد بالخصوص ہلاکت نہیں ہے بلکہ ایسا عذر ہے جس کے باعث انسان کا اختیار ختم ہو جائے۔

نسبتاً ضعیف ہی سہی بنیامین کے لیے بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ اس سورۃ کی ابتدائی آیات میں ہے:

اذ قالوا لیوسف واخوہ احب الیٰ ابینا منا و نحن عصبۃ

انہوں نے کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی باپ کے نزدیک ہم سے زیادہ محبوب ہے جب کہ ہم زیادہ طاقتور ہیں۔

اس نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت یوسفؑ والے حادثے کو تیس سے چالیس سال تک کا عرصہ بیت چکا تھا اور حضرت یوسفؑ کے جوان بھائی بڑھاپے کو پہنچ گئے تھے اور فطرتاً اُن کا ذہن پہلے زمانے کی نسبت پختہ ہو چکا تھا علاوہ ازیں گھر کے ماحول پر اور اپنے مضطرب وجدان پر اپنے بُرے ارادے کے اثرات وہ اچھی طرح سے محسوس کرتے تھے اور تجربے نے ان پر ثابت کر دیا کہ یوسفؑ کے فقدان سے نہ صرف یہ کہ ان کے لیے باپ کی محبت میں اضافہ نہ ہوا بلکہ مزید بے مہری اور بے اتفاقی پیدا ہو گئی۔

ان سب باتوں سے قطع نظر یہ تو ایک زندگی کا مسئلہ ہے۔ قحط سالی میں ایک گھرانے کے لیے اناج مہیا کرنا ایک بہت بڑی چیز تھی اور یہ سیر و تفریح کا معاملہ نہ تھا جیسا کہ انہوں نے ماضی میں حضرت یوسفؑ کے متعلق فرمائش کی تھی۔

ان تمام پہلوؤں کے پیش نظر حضرت یعقوبؑ نے ان کی بات مان لی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آپ سے عہد و پیمان باندھیں کہ وہ اپنے بھائی بنیامین کو صحیح سالم آپ کے پاس واپس لے آئیں گے۔

۲۔ **کیا صرف ایک قسم کافی تھی؟** دوسرا سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا صرف قسم کھا لینا اور خدائی پیمان باندھ لینا کافی تھا کہ جس کی بنیاد پر بنیامین کو ان کے سپرد کر دیا جاتا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مسلم ہے کہ عہد و پیمان اور قسم کھا لینا ہی کافی نہیں تھا لیکن قرائن و شواہد نشاندہی کرتے تھے کہ اس دفعہ ایک حقیقت پیش نظر ہے نہ کہ سازش، مکر و فریب اور جھوٹ۔ اس لیے وعدہ اور قسم زیادہ تاکید کے لیے تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ سیاسی اشخاص سے مثلاً صدر مملکت اور اسمبلی کے ارکان سے ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے حلف وفاداری لیا جاتا ہے جب کہ ان کے انتخاب میں بھی کافی دیکھ بھال سے کام لیا جاتا ہے۔

۶۷۔ وَقَالَ يٰبَنِىَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَاۤ اُغْنِىْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَىْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝

۶۸۔ وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ يُغْنِىْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَىْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِىْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

۶۷۔ (جب وہ جانے لگے تو یعقوبؑ نے) کہا: میرے بیٹو! ایک دروازے سے داخل نہ ہونا، بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا اور (میں یہ حکم دے کر) خدا کی طرف سے کسی حتمی حادثے کو نہیں ٹال سکتا۔ حکم اور فرمان صرف خدا کی طرف سے جاری ہوتا ہے۔ اُس پر میں نے توکل کیا ہے اور تمام توکل کرنے والوں کو اسی پر توکل کرنا چاہیے۔

۶۸۔ اور جب اسی طریقے سے جیسا کہ انہیں باپ نے حکم دیا تھا وہ داخل ہوئے تو یہ کام ان سے کسی حتمی خدائی حادثے کو دور نہیں کر سکتا تھا سوائے اس حاجت کے جو یعقوبؑ کے دل میں تھی، (جو اس طرح سے) انجام پائی (اور اس کے دل کو تسکین ہوئی) اور وہ اس تعلیم کی برکت سے جو ہم نے اسے دی بہت سا علم رکھتا تھا جبکہ اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تفسیر

آخرکار حضرت یوسفؑ کے بھائی باپ کی رضامندی کے بعد اپنے چھوٹے بھائی کو ہمراہ لے کر دوسری مرتبہ مصر جانے کو تیار ہوئے تو اس موقع پر باپ نے انہیں نصیحت کی۔ اُس نے کہا: میرے بیٹو! تم ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا (وقال یابنی لا تدخلوا من باب واحد وادخلوا من ابواب متفرقة)۔

اور مزید کہا: میں حکم دے کر میں خدا کی طرف سے کسی حتمی ملنے کو تم سے برطرف نہیں کر سکتا" (وما اغنی عنکم من اللہ من شیء) لیکن ناگوار حوادث کا ایک سلسلہ ایسا ہے جس سے بچا جا سکتا ہے اور ان کے متعلق خدا کا حتمی حکم صادر نہیں ہوا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ایسے حوادث تم سے دُور رہیں اور ایسا ہونا ممکن ہے۔

آخر میں کہا: "حکم اور فرمان خدا کے ساتھ مخصوص ہے" (ان الحکم الا للہ)۔ "میں نے خدا پر توکل کیا ہے" (علیہ توکلت) "اور تمام توکل کرنے والوں کو اسی پر توکل کرنا چاہیے اور اسی سے مدد طلب کرو اور اپنا معاملہ اسی کے سپرد کر دو" (وعلیہ فلیتوکل المتوکلون)۔

اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں دوسرے شہروں کی طرح مصر کے پایۂ تخت کے گرداگرد بھی فصیل تھی۔ اس کے بھی برج و بار تھے اور اس کے متعدد دروازے تھے۔

رہا یہ سوال کہ حضرت یعقوبؑ نے کیوں نصیحت کی کہ ان کے بیٹے ایک دروازے سے داخل نہ ہوں بلکہ مختلف حصوں میں تقسیم ہو کر مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہوں، اس کی وجہ مندرجہ بالا آیت میں مذکور نہیں ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ کے بھائی ایک تو بہت حسین و جمیل تھے (اگرچہ وہ یوسف نہ تھے مگر یوسف کے بھائی تو تھے)۔ ان کا قد کاٹھ بہت اچھا تھا۔ لہٰذا ان کے باپ پریشان تھے کہ گیارہ افراد اکٹھے جن کے چہرے مہرے سے معلوم ہو کہ وہ مصر کے علاوہ کسی اور ملک سے آئے ہیں، لوگ ان کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس طرح انہیں نظرِ بد لگ جائے۔

اس تفسیر کے بعد مفسرین کے درمیان نظرِ بد کی تاثیر کے بارے میں ایک طویل بحث چھڑ گئی ہے۔ انہوں نے اس کے لیے دلایل و تاریخ میں سے کئی ایک شواہد پیش کیے ہیں جنہیں ہم انشاء اللہ اس آیت کی تفسیر میں ذکر کریں گے۔

وان یکاد الذین کفروا لیزلقونک بابصارھم

(ن والقلم - ۵۱)

اس آیت کے ذیل میں ہم ثابت کریں گے کہ اس مسئلے کا کچھ حصہ سچا بھی ہے اور سائنسی لحاظ سے بھی ایک مخصوص مقناطیسی لہر جو آنکھ سے باہر اترتا ہے اس کی توجیہ پیش کی جا سکتی ہے اگرچہ عامتہ الناس نے اس معاملے میں بہت سی خرافات شامل کر دی ہیں۔

حضرت یعقوبؑ کے اس حکم کے بارے میں جو دوسری علت بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے جب اونچے لمبے چوڑے چکلے مضبوط جسموں والے اکٹھے چلیں تو حاسدوں کو انہیں دیکھ کر حسد پیدا ہو اور وہ ان کے بارے میں حکومت سے کوئی شکایت کرنے لگیں اور ان کے متعلق یہ بدظنی کریں کہ وہ کسی خرابی اور فتنہ و فساد کا ارادہ رکھتے ہیں اس لیے باپ نے انہیں حکم دیا کہ مختلف دروازوں سے داخل ہوں تاکہ لوگ ان کی طرف متوجہ نہ ہوں۔

بعض مفسرین[1] نے اس کی ایک عرفانی تفسیر بھی کی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت یعقوبؑ اس جملے کے حوالے سے اپنے بیٹوں کو ایک اہم معاشرتی مسئلہ سمجھانا چاہتے تھے اور وہ یہ کہ کھوئی ہوئی چیز کو صرف ایک ہی راستے سے تلاش نہ کریں بلکہ ہر دروازے سے داخل ہو کر اسے ڈھونڈیں۔

---

[1] عظیم عالم و خطیب مرحوم اشراقی (قدس سرہ)

کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک مقصد تک پہنچنے کے لیے صرف ایک ہی راہ کا انتخاب کرتا ہے اور جب آگے راستہ بند پاتا ہے تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے لیکن اگر وہ اس حقیقت کی طرف متوجہ ہو کہ گمشدہ افراد اور چیزیں عموماً ایک ہی راستے پر جانے سے نہیں ملتیں بلکہ مختلف راستوں سے ان کی جستجو کرنا چاہیے تو عام طور پر کامیاب ہو جاتا ہے۔

برادرانِ یوسفؑ روانہ ہوئے اور کنعان و مصر کے درمیان طویل مسافت طے کرنے کے بعد سرزمین مصر میں داخل ہوئے اور جب باپ کے دیئے ہوئے حکم کے مطابق مختلف راستوں سے مصر میں داخل ہوئے تو یہ کام انہیں کسی خدائی حادثے سے دور نہیں کر سکتا تھا (ولما دخلوا من حیث امرهم ابوهم ما کان یغنی عنهم من الله من شیء) بلکہ اس کا فائدہ صرف یہ تھا کہ "یعقوبؑ کے دل میں ایک حاجت تھی جو اس طرح سے پوری ہوتی تھی" (الا حاجة فی نفس یعقوب قضاها)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس کا اثر صرف باپ کے دل کی تسکین اور آرام تھا کیونکہ وہ اپنے سارے بیٹوں سے دور تھا اور رات دن ان کی اور یوسفؑ کی فکر میں رہتا تھا اور ان کے بارے میں حوادث کے گزند اور حاسدوں اور بدخواہوں کے بغض و حسد سے ڈرتا تھا اور اسے صرف اس بات سے اطمینان تھا کہ وہ اس کے احکام کے کاربند رہیں گے۔ اس پر اس کا دل خوش تھا۔

اس کے بعد قرآن حضرت یعقوبؑ کی یوں مدح و ثنا اور تعریف و توصیف کرتا ہے: وہ ہماری دی ہوئی تعلیم کے سبب علم و آگہی رکھتا تھا جب کہ اکثر لوگ نہیں جانتے (وانه لذو علم لما علمناه ولکن اکثر الناس لا یعلمون)۔

اس طرف اشارہ ہے کہ اسی طرح بہت سے لوگ عالم اسباب میں گم ہو جاتے ہیں، خدا کو بھول جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ بعض لوگوں کی تعریف سے نہیں بچا جا سکتا۔ اسی بنا پر ایسے لوگ خدا اور اس پر توکل کو بھول کر مکر و مہ کے دامن سے جا چپٹتے ہیں لیکن حضرت یعقوبؑ اس طرح کے نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک خدا کسی چیز کو نہ چاہے وہ انجام نہیں پا سکتی لہٰذا پہلے درجے میں ان کا بھروسا اور اعتماد خدا پر تھا۔ اس کے بعد وہ عالم اسباب کی طرف جاتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جانتے تھے کہ ان اسباب کے پیچھے ایک مسبب الاسباب ذات پاک ہے، جیسا کہ قرآن بقرہ ۱۰۲ میں شہر بابل کے جادوگروں کے بارے میں کہتا ہے:

وماهم بضارین به من احد الا باذن الله

وہ جادو سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے مگر یہ کہ خدا چاہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان سب چیزوں سے مافوق خدا کا ارادہ ہے دل اس سے باندھنا چاہیے اور اسی سے مدد لینا چاہیے۔

۶۹۔ وَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰى يُوسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّىٓ اَنَا اَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○

۷۰۔ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِىْ رَحْلِ اَخِيهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُونَ ○

۷۱۔ قَالُوا وَاَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُونَ ○

۷۲۔ قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيمٌ ○

۷۳۔ قَالُوا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِى الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِينَ ○

۷۴۔ قَالُوا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِينَ ○

۷۵۔ قَالُوا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِىْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِى الظّٰلِمِينَ ○

۷۶۔ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيهِ ۭ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ ۭ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِىْ دِينِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ۭ وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيمٌ ○

ترجمہ

۶۹۔ جب یوسفؑ کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے بھائی کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا میں تمہارا بھائی ہوں۔ جو کچھ یہ کرتے ہیں اس سے غمگین اور پریشان نہ ہو۔

۷۰۔ اور جس وقت ان کا سامان باندھا گیا توان کے بادشاہ نے پانی پینے کا برتن اپنے بھائی کے سامان میں رکھ دیا۔ اس کے بعد کسی نے آواز بلند کی کہ اے قافلے والو تم چور ہو۔

۷۱۔ انہوں نے ان کی طرف رخ کر کے کہا تمہاری کیا چیز کھو گئی ہے۔

۷۲۔ انہوں نے کہا: بادشاہ کا پیمانہ، اور جو شخص اسے لے آئے (غلے کا) اونٹ کا ایک بار اسے دیا جائے گا اور میں (اس انعام کا) ضامن ہوں۔

۷۳۔ انہوں نے کہا: قسم بخدا تم جانتے ہو کہ ہم اس علاقے میں فساد کرنے نہیں آئے اور ہم (کبھی بھی) چور نہیں تھے۔

۷۴۔ انہوں نے کہا: اگر تم جھوٹے ہوئے تو تمہاری سزا کیا ہے۔

۷۵۔ انہوں نے کہا: جس کے سامان میں (وہ پیمانہ) مل گیا تو وہ خود اس کی سزا ہو گا (اور اس کام کی بناء پر وہ غلام ہو جائے گا) ہم ظالموں کو اس طرح سے سزا دیتے ہیں۔

۷۶۔ تو اس وقت (یوسف نے) اپنے بھائی کے سامان سے پہلے ان کے سامان کی تلاشی لی اور پھر اپنے بھائی کے سامان سے اسے برآمد کر لیا۔ اس طرح ہم نے یوسف کو چارہ کار یاد دلایا۔ وہ مصر (کے بادشاہ) کے آئین کے مطابق اپنے بھائی کو ہرگز نہیں لے سکتا تھا مگر یہ کہ خدا چاہے۔ ہم جس شخص کے چاہیں درجات بلند کرتے ہیں اور ہر صاحب علم کے اوپر ایک عالم ہے۔

تفسیر

بھائی کو روکنے کی کوشش

آخرکار بھائی یوسفؑ کے پاس پہنچے اور انہیں بتایا کہ ہم نے آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے اور باوجود اس کے کہ ہمارے والد پہلے

چھوٹے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیجنے پر راضی نہ تھے لیکن ہم نے اصرار کر کے اسے راضی کیا ہے تاکہ آپ جان لیں کہ ہم نے قول و قرار پورا کیا ہے۔

حضرت یوسفؑ نے بڑی عزت و احترام سے ان کی پذیرائی کی، انہیں مہمان بلایا اور حکم دیا کہ دسترخوان یا طبق کے پاس دو دو افراد آئیں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اس موقع پر بنیامین جو تنہا رہ گیا تھا رونے لگا اور کہنے لگا کہ اگر میرا بھائی یوسفؑ زندہ ہوتا تو مجھے اپنے ساتھ ایک دسترخوان پر بٹھاتا کیونکہ ہم پدری مادری بھائی تھے۔

پھر حکم دیا کہ دو دو افراد کے لیے ایک ایک کمرہ سونے کے لیے تیار کیا جائے۔ بنیامین پھر اکیلا رہ گیا تو حضرت یوسفؑ نے فرمایا اسے میرے پاس بھیج دو۔ اس طرح حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی کو اپنے ہاں جگہ دی لیکن دیکھا کہ وہ بہت دکھی اور پریشان ہے اور ہمیشہ اپنے کھوئے ہوئے بھائی یوسفؑ کی یاد میں رہتا ہے۔ ایسے میں یوسفؑ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور آپ نے حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹا دیا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے، جب یوسفؑ کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے ہاں جگہ دی اور کہا کہ میں وہی تمہارا بھائی یوسف ہوں، غمگین نہ ہو اور اپنے دل کو دکھی نہ کر اور ان کے کسی کام سے پریشان نہ ہو (ولما دخلوا علی یوسف اٰوی الیہ اخاہ قال انی انا اخوک فلا تبتئس بما کانوا یعملون)۔

"لا تبتئس" اصل میں "بؤس" کے مادہ سے ضرر اور شدت کے معنی میں ہے اور اس مقام پر اس کا معنی ہے "غمگین نہ ہو"۔

بھائیوں کے کام کہ جو بنیامین کو دکھی اور پریشان کرتے تھے ان سے مراد ان کی وہ نامہربانیاں اور بے اعتنائیاں تھیں جو وہ اس کے اور یوسفؑ کے لیے روا رکھتے تھے اور وہ سازشیں کہ جو اسے گھر والوں سے دور کرنے کے لیے انجام دیتے تھے۔ حضرت یوسفؑ کی مراد یہ تھی کہ تم دیکھ رہے ہو کہ ان کی کارستانیوں نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ وہ میری ترقی اور بلندی کا ذریعہ بن گئیں لہٰذا اب تم بھی اس بارے میں اپنے دل کو دکھی نہ کرو۔

بعض روایات کے مطابق اس موقع پر حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی بنیامین سے کہا: کیا تم پسند کرتے ہو کہ میرے پاس رہ جاؤ؟ اس نے کہا: ہاں میں تو راضی ہوں لیکن بھائی ہرگز راضی نہیں ہوں گے کیونکہ انہوں نے باپ سے قول و قرار کیا ہے اور قسم کھائی ہے کہ مجھے ہر قیمت پر اپنے ساتھ واپس لے جائیں گے۔

حضرت یوسفؑ نے کہا: تم فکر نہ کرو میں ایک منصوبہ بناتا ہوں جس سے وہ مجبور ہو جائیں گے کہ تمہیں میرے پاس چھوڑ جائیں۔

غلات کے بار تیار ہو گئے تو حکم دیا کہ مخصوص قیمتی پیمانہ بھائی کے بار میں رکھ دیں (کیونکہ ہر شخص کے لیے غلے کا ایک بار دیا جاتا تھا) (فلما جھزھم بجھازھم جعل السقایۃ فی رحل اخیہ)۔

البتہ یہ کام مخفی طور پر انجام پایا اور شاید اس کا علم مامورین میں سے فقط ایک شخص کو تھا۔

جب اناج کو پیمانے سے دینے والوں نے دیکھا کہ مخصوص قیمتی پیمانے کا کہیں نام و نشان نہیں ہے حالانکہ پہلے وہ ان کے پاس موجود تھا۔ لہٰذا جب قافلہ چلنے لگا تو کسی نے پکار کر کہا: اے قافلے والو! تم چور ہو (ثم اذن مؤذن ایتھا العیر انکم لسارقون)۔

یوسفؑ کے بھائیوں نے جب یہ جملہ سنا تو سخت پریشان ہوئے اور وحشت زدہ ہو گئے کیونکہ ان کے ذہن میں تو اس کا خیال بھی نہ آ سکتا تھا کہ اس احترام و اکرام کے بعد ان پر چوری کا الزام لگایا جائے گا لہٰذا انہوں نے ان کی طرف رخ کر کے کہا: تمہاری کونسی چیز

چوری ہوگئی ہے (قالوا واقبلوا علیہم ماذا تفقدون)۔

انہوں نے کہا ہم سے بادشاہ کا پیمانہ گم ہوگیا ہے اور ہمیں تمہارے بارے میں بدگمانی ہے (قالوا نفقد صواع الملک)۔

پیمانہ چونکہ گراں قیمت ہے اور بادشاہ کو پسند ہے لہٰذا "وہ جس شخص کو ملے اور وہ اسے لے آئے تو اسے ایک اونٹ کا بار بطور انعام دیا جائے گا" (ولمن جاء بہ حمل بعیر)۔

پھر یہ بات کہنے والے نے مزید تاکید سے کہا، اور میں ذاتی طور پر اس انعام کا ضامن ہوں (وانا بہ زعیم)۔

بھائی یہ بات سن کر سخت پریشان ہوئے اور حواس باختہ ہوگئے اور وہ نہیں سمجھتے تھے کہ ماجرا کیا ہوا، ان کی طرف رخ کرکے انہوں نے کہا: خدا کی قسم تم جانتے ہو کہ ہم یہاں اس لیے نہیں آئے کہ فتنہ و فساد کریں اور ہم کبھی بھی چور نہیں تھے" (قالوا تاللہ لقد علمتم ماجئنا لنفسد فی الارض وما کنا سارقین)۔

یہ جو انہوں نے کہا کہ تم خود جانتے ہو کہ ہم فسادی اور چور نہیں ہیں، شاید اس طرف اشارہ ہو کہ تم ہمارا سابقہ کردار اچھی طرح جانتے ہو کہ گزشتہ موقع پر ہماری پیش کردہ قیمت جو تم نے ہمارے غلات میں رکھ دی تھی وہ ہم دوبارہ تمہارے پاس لے آئے اور تمہیں بتایا کہ وہ ہم ساری کی ساری تمہیں واپس کرنے کو تیار ہیں لہٰذا وہ افراد جو دور دراز کے ملک سے اپنا قرض ادا کرنے واپس آجاتے ہیں ان سے کیونکر ممکن ہے کہ چوری کے لیے ہاتھ بڑھائیں۔

اس کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ جب وہ مصر میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے اونٹوں کے منہ دہان بندوں سے باندھ دیئے تھے تاکہ وہ کسی کی زراعت اور مال کا نقصان نہ کریں۔ لہٰذا ان کی مراد یہ تھی کہ ہم جو اس حد تک احتیاط کرتے ہیں حتیٰ کہ ہمارے جانور بھی کسی کو ضرر یا نقصان نہ پہنچائیں تو کس طرح ممکن ہے کہ ہم ایسے کام کے مرتکب ہوں۔

یہ سن کر مامورین ان کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: لیکن اگر تم جھوٹے ہوئے تو اس کی سزا کیا ہے؟ (قالوا فما جزاؤہ ان کنتم کاذبین)۔

"انہوں نے جواب میں کہا: اس کی سزا یہ ہے کہ جس شخص کے بار میں سے بادشاہ کا پیمانہ مل جائے اسے روک لو اور اسے اس کے بدلے میں لے لو" (قالوا جزاؤہ من وجد فی رحلہ فھو جزاؤہ)۔ "جی ہاں! ہم اسی طرح ظالموں کو سزا دیتے ہیں (کذلک نجزی الظالمین)۔

اس موقع پر حضرت یوسفؑ نے حکم دیا کہ ان کے غلات کے بار کھولے جائیں اور ایک ایک کی جانچ پڑتال کی جائے۔ البتہ اس بناء پر کہ ان کے اصلی منصوبے کا کسی کو پتہ نہ چلے، اپنے بھائی بنیامین کے بار سے پہلے دوسروں کے سامان کی پڑتال کی اور پھر وہ مخصوص پیمانہ اپنے بھائی کے بار سے برآمد کر لیا (فبدا باوعیتھم قبل وعاء اخیہ ثم استخرجھا من وعاء اخیہ)۔

بنیامین کے بار سے پیمانہ برآمد ہوا تو تعجب سے بھائیوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ گویا غم و اندوہ کا پہاڑ ان کے سروں پر آگرا اور انہیں یوں لگا جیسے وہ ایک عجیب مقام پر پھنس گئے ہیں کہ جس کے چاروں طرف کے راستے بند ہو گئے ہیں۔ ایک طرف ان کا بھائی ظاہراً ایسی چوری کا مرتکب ہوا جس سے ان کے سر ندامت سے جھک گئے اور دوسری طرف ظاہراً عزیز مصر کی نظروں میں ان کی عزت و حیثیت خطرے میں جا پڑی کہ اب آئندہ کے لیے اس کی حمایت حاصل کرنا ان کے لیے ممکن نہ رہا اور ان تمام باتوں سے

قطع نظر انہوں نے سوچا کہ باپ کو کیا جواب دیں گے اور وہ کیسے یقین کریں گے کہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس موقع پر بھائیوں نے بنیامین کی طرف رخ کرکے کہا: اے بے خبر! تو نے ہمیں رسوا کردیا ہے اور ہمارا منہ کالا کردیا ہے۔ تو نے یہ کیسا غلط کام انجام دیا ہے (نہ تو نے اپنے آپ پر رحم کیا، نہ ہم پر اور نہ خاندان یعقوب پر کہ جو خاندان نبوت ہے) آخر ہمیں بتاؤ تو سہی کہ تو نے کس وقت پیمانہ اٹھایا اور اپنے بار میں رکھ لیا۔

بنیامین نے جو معاملے کی اصل اور قضیے کے باطن کو جانتا تھا ٹھنڈے دل سے جواب دیا کہ یہ کام اسی شخص نے کیا ہے جس نے تمہاری دی ہوئی قیمت تمہارے بار میں رکھ دی تھی لیکن بھائیوں کو اس حادثے نے اس قدر پریشان کر رکھا تھا کہ وہ سمجھ نہ سکے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے[1]

پھر قرآن مزید کہتا ہے: ہم نے اس طرح یوسف کے لیے ایک تدبیر کی (تاکہ وہ اپنے بھائی کو دوسرے بھائیوں کی مخالفت کے بغیر روک سکیں) (کذٰلک کدنا لیوسف)۔

اہم مسئلہ یہ ہے کہ اگر یوسف قوانین مصر کے مطابق سلوک کرتے تو انہیں چاہیے تھا کہ اسے زدوکوب کرتے اور قید خانے میں ڈال دیتے لیکن اس طرح نہ صرف بھائی کو آزار و تکلیف پہنچتی بلکہ خود ان کا مقصد کہ بھائی کو اپنے پاس رکھیں، پورا نہ ہوتا۔ اسی لیے انہوں نے پہلے بھائیوں سے اعتراف لیا کہ اگر تم نے چوری کی ہو تو تمہارے نزدیک اس کی کیا سزا ہے تو انہوں نے اپنے ہاں رائج طریقے کے مطابق جواب دیا کہ ہمارے ہاں یہ طریقہ ہے کہ چور کو اس کی چوری کے بدلے اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں اور اس سے کام لیتے ہیں اور حضرت یوسفؑ نے بھی اسی طریقے کے مطابق ان سے سلوک کیا کیونکہ مجرم کو سزا دینے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اسے اس کے اپنے قانون کے مطابق سزا دی جائے۔

اسی بناء پر قرآن کہتا ہے: یوسفؑ ملک مصر کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو نہیں لے سکتے تھے اور اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تھے (ماکان لیأخذ اخاہ فی دین الملک)۔

اس کے بعد استثناء کے طور پر فرماتا ہے، مگر یہ کہ خدا چاہے (الا ان یشاء اللہ)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ کام جو یوسفؑ نے انجام دیا اور بھائیوں کے ساتھ ان کے طریقے کے مطابق سلوک کیا فرمان الٰہی کے مطابق تھا اور یہ بھائی کی حفاظت اور ان کے باپ کی اور دوسرے بھائیوں کی آزمائش کی تکمیل کے لیے ایک منصوبہ تھا۔

آخر میں قرآن مزید کہتا ہے، ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کرتے ہیں (نرفع درجات من نشاء)۔ ان افراد کے درجات ــــ جو اہل ہوں اور یوسف کی طرح امتحانات کی کٹھالی سے بیرکرہ عالم نکل آئیں۔

بہرحال ہر عالم سے برتر ایک اور عالم و دانا ہے (یعنی خدا) (و فوق کل ذی علم علیم) اور وہی ہے کہ جس نے اس منصوبے کا یوسف کو الہام کیا تھا۔

چند اہم نکات

مندرجہ بالا آیات سے بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا ایک ایک کرکے جواب دیا جائے گا:

---

[1] مجمع البیان جلد ۵ صفحہ ۲۵۳، مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

۱۔ **یوسفؑ نے بھائیوں سے اپنا تعارف کیوں نہ کروایا؟** یوسفؑ نے بھائیوں سے اپنا تعارف کیوں نہیں کروایا، تاکہ ان کے آنے والے کو جانکاہ غم فراق سے جلدی نجات ملتی؟

اس سوال کا جواب جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہوا ہے یہ ہے کہ یہ باپ اور بھائیوں کے امتحان کے پروگرام کی تکمیل کے لیے تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کام خود غرضی کی بناء پر نہ تھا بلکہ ایک فرمانِ الٰہی کے ماتحت تھا۔ خدا چاہتا تھا کہ دوسرے بیٹے کے کھونے پر بھی یعقوبؑ کے عزم اور حوصلے کا امتحان لے اور یوں ان کے تکامل اور ترقی کا آخری زینہ بھی طے ہو جائے اور بھائی بھی آزمائے جائیں کہ ایسے موقع پر جب کہ ان کا بھائی اس طرح کے معاملے میں گرفتار ہوا ہے تو وہ باپ سے باندھے گئے پیمان کی کس طرح سے حفاظت کرتے ہیں۔

۲۔ **بے گناہ پر چوری کا الزام؟** کیا جائز تھا کہ ایک بے گناہ شخص پر چوری کا اتہام لگایا جاتا، ایسا اتہام کہ جس کے بُرے آثار نے باقی بھائیوں کو بھی کسی حد تک اپنی لپیٹ میں لے لیا؟

اس سوال کا جواب بھی خود واقعے میں موجود ہے اور وہ یہ کہ یہ معاملہ خود بنیامین کی رضامندی سے انجام پایا تھا۔ کیونکہ حضرت یوسفؑ نے پہلے اپنے آپ کو اُس سے متعارف کروایا تھا اور وہ جانتا تھا کہ یہ منصوبہ خود اس کی حفاظت کے لیے بنایا گیا ہے۔ نیز اس سے بھائیوں پر بھی کوئی تہمت نہیں لگی البتہ انہیں اضطراب اور پریشانی ضرور ہوئی جس میں کہ ایک اہم امتحان کی وجہ سے کوئی حرج نہ تھا۔

۳۔ **چوری کی نسبت سب کی طرف کیوں دی گئی؟** کیا "انکم لسارقون" یعنی تم چور ہو، کہہ کر سب کی طرف چوری کی نسبت دینا جھوٹ نہ تھا اور اس جھوٹ اور تہمت کا کیا جواز تھا؟

ذیل کے تجزیے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جائے گا:

اولاً یہ معلوم نہیں کہ یہ بات کہنے والے کون لوگ تھے۔ قرآن میں صرف اس قدر ہے: "قالوا" یعنی انہوں نے کہا۔ ہو سکتا ہے یہ بات کہنے والے حضرت یوسفؑ کے کچھ کارندے ہوں کہ جب انہوں نے دیکھا کہ مخصوص پیمانہ نہیں ہے تو یقین کر لیا کہ کنعان کے قافلے میں سے کسی شخص نے اسے چرایا ہے اور یہ معمول ہے کہ اگر کوئی چیز ایسے افراد میں چوری ہو جائے کہ جو ایک ہی گروہ کی صورت میں متشکل ہوں اور اصل چور پہچانا نہ جائے تو سب کو مخاطب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم نے یہ کام کیا ہے یعنی تم میں سے ایک نے یا تم میں سے بعض نے ایسا کیا ہے۔

ثانیاً۔ اس بات کا اصلی نشانہ بنیامین تھا جو کہ اس نسبت پر راضی تھا کیونکہ اس منصوبے میں ظاہراً تو اس پر چوری کی تہمت لگی تھی لیکن درحقیقت وہ اس کے اپنے بھائی یوسفؑ کے پاس رہنے کے لیے مقدمہ تھی اور یہ جو سب پر الزام آیا یہ ایک بالکل عارضی سی بات تھی جو صرف برادرانِ یوسفؑ کے سامان کی تلاشی پر ختم ہو گیا اور جو درحقیقت مراد تھا یعنی "بنیامین" وہ پہچان لیا گیا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں جس چوری کی ان کی طرف نسبت دی گئی ہے وہ گزشتہ زمانے سے مربوط تھی اور وہ تھی بھائیوں کا یوسفؑ کے باپ یعقوبؑ سے یوسفؑ کو چرانا۔ لیکن یہ خیال اس صورت میں درست ہو سکتا ہے جب یہ نسبت حضرت یوسفؑ کی طرف سے انہیں دی جاتی کیونکہ وہی گزشتہ معاملے سے آگاہ تھے اور شاید بعد والے جملے میں اسی کی طرف اشارہ ہو کیونکہ حضرت یوسفؑ کے مامورین نے یہ نہیں کہا کہ تم نے بادشاہ کا پیمانہ چوری کیا ہے بلکہ کہا: "نفقد صواع الملک" یعنی "ہم بادشاہ کا پیمانہ مفقود پاتے ہیں"۔ (لیکن پہلا جواب زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے)۔

۴۔ **اس زمانے میں چوری کی سزا؟** اس زمانے میں چوری کی سزا کیا تھی اس سلسلے میں زیرِ بحث آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصریوں

اور کنعان کے باشندوں میں چوری کی سزا مختلف تھی۔ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں اور احتمالاً اہل کنعان میں اس عمل کی سزا یہ تھی کہ چور کو اس چوری کے بدلے میں (ہمیشہ کے لیے یا وقتی طور پر) غلام بنا لیا جاتا[1] لیکن مصریوں میں یہ سزا رائج نہ تھی بلکہ چوروں کو دوسرے ذرائع سے مثلاً مار پیٹ سے اور قید و بند وغیرہ سے سزا دیتے تھے۔

بہرحال یہ جملہ اس امر کی دلیل نہیں بنتا کہ آسمانی ادیان میں سے کسی میں غلام بنا لینا چوری کی سزا تھی کیونکہ بسا اوقات کسی گروہ میں رائج کوئی طریقہ اس زمانے کے لوگوں کی طرف سے شمار ہوتا ہے۔ غلامی کی تاریخ میں بھی ہم پڑھتے ہیں کہ بے ہودہ اقوام میں یہ طریقہ رہا ہے کہ اگر مقروض اپنا قرض ادا کرنے سے عاجز ہو جاتا تو اسے غلام بنا لیا جاتا۔

۵۔ "سقایہ" یا "صواع": زیر نظر آیات میں کبھی لفظ "صواع" (پیمانہ) استعمال ہوا ہے اور کبھی "سقایۃ" (پانی پینے کا برتن)، ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ یہ پیمانہ ابتدا میں بادشاہ کے پینے کا برتن تھا لیکن جس وقت اناج سرزمین مصر میں گراں اور کمیاب ہو گیا اور اس کی راشن بندی ہو گئی تو اس امر کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے اور اس لیے کہ لوگ نہایت احتیاط سے اور کم خرچ کریں بادشاہ کے پانی پینے کے لیے استعمال ہونے والا مخصوص برتن اس کے لیے پیمانے کے طور پر استعمال کیا گیا۔

اس برتن کی خصوصیات کے ضمن میں مفسرین نے بہت سی باتیں لکھی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ چاندی کا تھا اور بعض کے بقول وہ سونے کا تھا بعض نے اضافہ کیا ہے کہ اس میں جواہرات بھی جڑے ہوئے تھے۔ کچھ غیر معتبر روایات میں بھی ایسے مطالب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن اس سلسلے میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے۔

جو کچھ مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ ایک ایسا پیمانہ تھا جس سے کسی زمانے میں بادشاہِ مصر پانی پیتا تھا بعد میں وہ پیمانے میں تبدیل ہو گیا۔ یہ بھی واضح ہے کہ ایک ملک کی تمام تر ضروریات کو اس قسم کے پیمانے سے ناپ کر پورا نہیں کیا جا سکتا۔ شاید ایسا رمزاً کیا گیا ہو اور ان سالوں میں غلے کی کمیابی اور اہمیت ظاہر کرنے کے لیے خاص طور پر اسے استعمال کیا گیا ہو تاکہ لوگ اسے صرف کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیں ضمناً اس بنا پر کہ وہ پیمانہ اس وقت حضرت یوسفؑ کے قبضے میں تھا لہٰذا وہ اس بات کا سبب بنتا کہ اگر چور کو غلام بنایا جاتا تو وہ صاحبِ پیمانہ یعنی خود حضرت یوسفؑ کا غلام بنتا اور انہی کے پاس رہتا اور بالکل اسی مقصد کے لیے حضرت یوسفؑ نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔

---

[1] طبری نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے کہ اس زمانے میں ایک گروہ میں یہ طریقہ رائج تھا کہ وہ چور کو ایک سال کے لیے غلام بنا لیتے تھے۔ نیز یہ بھی نقل کیا ہے کہ خاندانِ یعقوبؑ میں چوری کی مقدار کے برابر غلامی کی مدت معین کی جاتی تھی (تاکہ وہ اسی کے مطابق کام کرے)۔

۷۷۔ قَالُوٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ○

۷۸۔ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ○

۷۹۔ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ○ ع

ترجمہ

۷۷۔ (بھائیوں نے) کہا اگر اس (بنیامین) نے چوری کی ہے تو (تعجب کی بات نہیں) اس کے بھائی (یوسف) نے بھی اس سے پہلے چوری کی تھی یوسف (کو بہت دکھ ہوا اور اس) نے اس (دکھ) کو اپنے اندر چھپائے رکھا اور ان پر ظاہر نہیں کیا۔ (بس اتنا) کہا: تم بدتر ہو اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو خدا اس سے زیادہ آگاہ ہے۔

۷۸۔ انہوں نے کہا: اے عزیز! اس کا ایک بوڑھا باپ ہے (اور وہ بہت پریشان ہوگا) لہٰذا ہم میں سے کسی ایک کو اس کے بدلے رکھ لے ہم دیکھ رہے ہیں کہ تو نیکوکاروں میں سے ہے۔

۷۹۔ اس نے کہا: اس سے خدا کی پناہ کہ جس شخص کے پاس سے ہمارا مال و متاع ملا ہم سوائے اس کے کسی اور کو لیں کیونکہ اس صورت میں ہم ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔

تفسیر

برادرانِ یوسف کی فداکاری کیوں قبول نہ ہوئی؟

آخرکار بھائیوں نے یقین کر لیا کہ ان کے بھائی بنیامین نے ایسی قبیح اور افسوسناک چوری کی ہے اور اس طرح اس نے ان کے سر کو نیچا

میں ان کا سابقہ ریکارڈ سارا خراب کر دیا ہے۔ لہٰذا اپنے آپ کو بری الذمہ کرنے کے لیے انہوں نے کہا: "اگر اس لڑکے نے چوری کی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ اس کا بھائی یوسف بھی پہلے ایسے کام کا مرتکب ہو چکا ہے" اور یہ دونوں ایک ہی ماں اور باپ سے ہیں اور ہم کہ جو دوسری ماں سے ہیں ہمارا حساب کتاب ان سے الگ ہے (قالوا ان یسرق فقد سرق اخ له من قبل)۔ اس طرح انہوں نے اپنے اور بنیامین کے درمیان ایک حد فاصل قائم کرنا چاہی اور اس کا تعلق یوسفؑ سے جوڑ دیا۔

یہ بات سن کر یوسفؑ بہت دکھی اور پریشان ہوئے اور "اسے دل میں چھپائے رکھا اور ان کے سامنے اظہار نہ کیا" (فاسرها یوسف فی نفسه ولم یبدها لهم)۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ بات کہہ کر انہوں نے ایک بہت بڑا بہتان باندھا ہے لیکن انہوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا بس اجمالی طور پر ان سے اتنا کہا: جس کی طرف تم یہ نسبت دیتے ہو تم اس سے بدتر ہو یا "میرے نزدیک مقام و منزلت کے لحاظ سے تم بدترین لوگ ہو" (قال انتم شر مکانا)۔

اس کے بعد مزید کہا: جو کچھ تم کہتے ہو خدا اس کے بارے میں زیادہ جاننے والا ہے (والله اعلم بما تصفون)۔

یہ ٹھیک ہے کہ یوسفؑ کے بھائیوں نے ان بحرانی لمحوں میں اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کرنے کے لیے اپنے بھائی یوسفؑ پر ایک ناروا تہمت باندھی تھی لیکن پھر بھی اس کام کے لیے کوئی بہانہ اور سند ہونا چاہیے جس کی بناء پر وہ یوسفؑ کی طرف ایسی نسبت دیں۔ اس سلسلے میں مفسرین کاوش و زحمت میں پڑے ہیں اور گزشتہ لوگوں کی تواریخ سے انہوں نے تین روایات نقل کی ہیں۔

پہلی یہ کہ یوسفؑ اپنی ماں کی وفات کے بعد اپنی پھوپھی کے پاس رہا کرتے تھے اور انہیں یوسفؑ سے بہت زیادہ پیار تھا۔ جب آپ بڑے ہو گئے اور حضرت یعقوبؑ نے انہیں ان کی پھوپھی سے واپس لینا چاہا تو ان کی پھوپھی نے ایک منصوبہ بنایا اور وہ یہ کہ کمربند یا ایک خاص شال جو حضرت اسحاقؑ کی جانب سے ان کے خاندان میں بطور یادگار چلی آ رہی تھی یوسفؑ کی کمر سے باندھ دی اور دعویٰ کیا کہ یوسفؑ اسے چھپا کر لے جانا چاہتا تھا۔ ایسا انہوں نے اس لیے کیا تاکہ اس خاص کمربند یا شال کے بدلے یوسفؑ کو اپنے پاس رکھ لیں۔

دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ کے مادری رشتے داروں میں سے ایک کے پاس ایک بت تھا جسے یوسفؑ نے اٹھا کر توڑ دیا اور راستے پر لا پھینکا لہٰذا انہوں نے حضرت یوسفؑ پر چوری کا الزام لگا دیا حالانکہ اس میں تو کوئی گناہ نہیں تھا۔

تیسری روایت یہ ہے کہ کبھی کبھار وہ دسترخوان سے کچھ کھانا لے کر مسکینوں اور حاجت مندوں کو دے دیتے لہٰذا بہانہ تراش بھائیوں نے اسے بھی چوری کا الزام دینے کے لیے سند بنا لیا حالانکہ ان میں سے کوئی چیز گناہ کے زمرے میں نہیں آتی۔

اگر ایک شخص کسی کو کوئی لباس پہنا دے اور پہننے والا نہ جانتا ہو کہ یہ کسی دوسرے کا مال ہے تو کیا اسے چوری کا الزام دیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح کیا کسی بت کو اٹھا کر پھینک دینا گناہ ہے۔

نیز انسان کوئی چیز اپنے باپ کے دسترخوان سے اٹھا کر مسکینوں کو دے دے جب کہ اسے یقین ہو کہ اس کا باپ اس پر راضی ہے تو کیا اسے گناہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

بھائیوں نے دیکھا کہ ان کے چھوٹے بھائی بنیامین کو اس قانون کے مطابق عزیز مصر کے پاس رہنا پڑے گا جسے وہ خود قبول کر چکے ہیں اور دوسری طرف انہوں نے باپ سے پیمان باندھا تھا کہ بنیامین کی حفاظت اور اسے واپس لانے کے لیے اپنی پوری کوشش کریں گے۔ ایسے میں انہوں نے یوسفؑ کی طرف رخ کیا جسے ابھی تک انہوں نے پہچانا نہیں تھا اور کہا: اے عزیز مصر! اسے بوڑھا باپ

اقتدار اس کا باپ بہت بوڑھا ہے اور وہ اس کی جدائی کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہم نے آپ کے اصرار پر اسے باپ سے جدا کیا اور باپ نے ہم سے تاکیدی وعدہ لیا کہ ہم ہر قیمت پر اسے واپس لائیں گے اب ہم پر احسان کیجئے اور اس کے بدلے میں ہم میں سے کسی ایک کو رکھ لیجئے" (قالوا یا ایها العزیز ان له ابا شیخا کبیرا فخذ احدنا مکانه) کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ نیکوکاروں میں سے ہیں" اور یہ پہلا موقع نہیں کہ آپ نے ہم پر لطف و کرم اور مہر و محبت کی ہے یہ مہربانی کر کے اپنی کرم نوازیوں کی تکمیل کیجئے (انا نراك من المحسنين).

حضرت یوسفؑ نے اس تجویز کی شدت سے نفی کی اور کہا: پناہ بخدا! کیسے ہو سکتا ہے کہ جس کے پاس سے ہمارا مال و متاع برآمد ہوا ہے ہم اس کے علاوہ کسی شخص کو رکھ لیں۔ کبھی تم نے سنا ہے کہ ایک منصف مزاج شخص نے کسی بے گناہ کو دوسرے کے جرم میں سزا دی ہو (قال معاذ الله ان ناخذ الا من وجدنا متاعنا عنده) اگر ہم ایسا کریں تو یقیناً ہم ظالم ہوں گے (انا اذا لظالمون).

یہ امر قابل توجہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنی اس گفتگو میں بھائی کی طرف چوری کی کوئی نسبت نہیں دی بلکہ کہتے ہیں کہ جس شخص کے پاس سے ہمیں ہمارا مال و متاع ملا ہے" اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اس امر کی طرف سنجیدگی سے متوجہ تھے کہ اپنی پوری زندگی میں کبھی کوئی غلط بات نہ کریں۔

۸۰۔ فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۖ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۖ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝

۸۱۔ اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ۝

۸۲۔ وَسْــَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝

ترجمہ

۸۰۔ جب (بھائی) اس سے مایوس ہو گئے تو ایک طرف گئے اور آپس میں سرگوشی کی۔ ان میں سب سے بڑے نے کہا: کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ نے تم سے الٰہی پیمان لیا تھا اور اس سے پہلے تم نے یوسف کے بارے میں کوتاہی کی تھی لہٰذا میں اس سرزمین سے نہیں جاؤں گا جب تک میرا باپ اجازت نہ دے یا خدا اپنا حکم میرے بارے میں صادر فرمائے گا اور وہ بہترین حکم کرنے والا ہے۔

۸۱۔ تم اپنے باپ کی طرف پلٹ جاؤ اور اس سے کہو ابا (جان)! تمہارے بیٹے نے چوری کی ہے اور ہم جو کچھ جانتے ہیں اس کے سوا ہم نے گواہی نہیں دی اور نہ ہی ہم غیب سے آگاہ تھے۔

۸۲۔ (مزید اطمینان کے لیے) اس شہر سے پوچھ لیں جس میں ہم تھے نیز اس قافلے سے پوچھ لیں جس کے ساتھ ہم آئے ہیں اور ہم (اپنی بات میں) سچے ہیں۔

تفسیر

بھائی سر جھکائے باپ کے پاس پہنچے

بھائیوں نے بنیامین کی رہائی کے لیے اپنی آخری کوشش کر دیکھی لیکن انہوں نے اپنے سامنے تمام راستے بند پائے۔ ایک طرف تو اس کام کو کچھ اس طرح سے انجام دیا گیا تھا کہ بظاہر بھائی کی برأت ممکن نہ تھی اور دوسری طرف عزیز مصر نے اس کی جگہ کسی اور فرد کو رکھنے کی تجویز قبول نہ کی لہٰذا وہ مایوس ہو گئے۔ یوں انہوں نے کنعان کی طرف لوٹ جانے اور باپ سے سارا ماجرا بیان کرنے کا ارادہ کر لیا۔ قرآن کہتا ہے: جس وقت وہ عزیز مصر سے یا بھائی کی نجات سے مایوس ہو گئے تو ایک طرف کو آئے دوسروں سے الگ ہو گئے اور سرگوشی کرنے لگے (فلما استیئسوا منہ خلصوا نجیًا)۔

"خلصوا" یعنی "خالص ہو گئے" یہ دوسروں سے الگ ہونے اور خصوصی میٹنگ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ اور "نجی" "مناجات" کے مادہ سے دراصل "نجوہ" سے مرتفع زمین کے معنی میں لیا گیا ہے چونکہ اونچی اور مرتفع زمینیں اپنے اطراف سے جدا اور الگ ہوتی ہیں اور مخفی میٹنگیں اور سرگوشیاں اردگرد والوں سے ہٹ کر ہوتی ہیں اس لیے انہیں "نجوی" کہتے ہیں (اس بنا پر "نجوی" ہر قسم کی محرمانہ بات کو کہا جاتا ہے چاہے وہ کان میں کہی جائے یا کسی خفیہ میٹنگ میں)۔

جملہ "خلصوا نجیا" جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے فصیح ترین اور خوبصورت ترین قرآنی تعبیر ہے جس میں دو لفظوں کے ذریعے بہت سے مطالب بیان کر دیئے گئے ہیں جب کہ یہ مطالب بیان کرنے کے لیے بہت سے جملے درکار تھے۔

بہرحال سب سے بڑے بھائی نے اس خصوصی میٹنگ میں ان سے کہا: کیا تم جانتے نہیں ہو کہ تمہارے باپ نے تم سے الٰہی پیمان لیا ہے کہ بنیامین کو ہر حالت صورت میں ہم واپس لائیں گے (قال کبیرھم الم تعلموا ان اباکم قد اخذ علیکم موثقا من اللہ) اور تم نے اس سے پہلے بھی یوسف کے بارے میں کوتاہی کی" اور باپ کے نزدیک تمہارا گزشتہ کردار بُرا ہے (ومن قبل ما فرطتم فی یوسف)[1] "اب جب کہ معاملہ یوں ہے تو میں اپنی جگہ سے (یا سرزمین مصر سے) نہیں جاؤں گا اور یہیں پڑاؤ ڈالوں گا مگر یہ کہ میرا باپ مجھے اجازت دے دے یا خدا میرے متعلق کوئی فرمان صادر کرے جو کہ بہترین حاکم و فرمانروا ہے (فلن ابرح الارض حتی یاذن لی ابی او یحکم اللہ لی وھو خیر الحاکمین)۔

اس حکم سے یا تو موت کا حکم مراد ہے یعنی مرتے دم تک یہاں سے نہیں جاؤں گا یا خدا کی طرف پیدا ہونے والا کوئی چارہ کار مراد ہے یا پھر کوئی قابلِ قبول اور قابلِ توجیہ عذر مراد ہے جو کہ باپ کے نزدیک قطعی طور پر قابلِ قبول ہو۔

پھر بڑے بھائی نے دوسرے بھائیوں کو حکم دیا کہ "تم باپ کے پاس لوٹ جاؤ اور کہو ابا جان آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے

---

[1] "فرطتم" "تفریط" کے مادہ سے دراصل "فرط" (بروزن "شرط") سے مقدم ہونے کے معنی میں ہے اور جب یہ باب تفعیل میں کا ہو تو آگے بڑھنے میں کوتاہی کرنے کے معنی میں ہے اور جب باب افعال سے "افراط" ہو تو تقدم اور آگے بڑھنے میں تجاوز کرنے کے معنی میں ہے۔

"ارجعوا الی ابیکم فقولوا یا ابانا ان ابنک سرق" "اور یہ جو ہم گواہی دے رہے ہیں اتنی ہی ہے جتنا ہمیں علم ہوا ہے" بس ہم نے اتنا دیکھا کہ بادشاہ کا پیمانہ ہمارے بھائی کے بارے برآمد ہوا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے چوری کی ہے، باقی رہا امر باطن تو وہ خدا جانتا ہے (وما شھدنا الا بما علمنا) "اور ہمیں غیب کی خبر نہیں" (وما کنا للغیب حافظین)۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ بھائیوں کا مقصد یہ ہو کہ وہ باپ سے کہیں کہ اگر ہم نے تیرے پاس گواہی دی اور عہد کیا کہ ہم بھائی کو لے جائیں گے اور واپس لے آئیں گے تو یہ اس بنا پر تھا کہ ہم اس کے باطن سے باخبر نہ تھے اور ہم غیب سے آگاہ نہ تھے کہ اس کا انجام یہ ہوگا۔

پھر اس بناء پر کہ باپ سے ہر طرح کی بدگمانی دُور کریں اور اسے مطمئن کریں کہ ماجرا اسی طرح ہے نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ انہوں نے کہا: مزید تحقیق کے لیے اس شہر سے سوال کریں جس میں ہم تھے (وسئل القریۃ التی کنا فیھا)[1] اسی طرح اس قافلے سے پوچھ لیں جس کے ساتھ ہم آپ کے پاس آئے ہیں اور فطری طور پر آپ اہلِ کنعان کو جانتے ہیں جو کہ اس قافلے میں موجود ہیں، ان سے حقیقتِ حال پوچھ لیں (والعیر التی اقبلنا فیھا)[2]

بہرحال مطمئن رہیں کہ ہم اپنی بات میں سچے ہیں اور حقیقت کے سوا کچھ نہیں کہتے (وانا لصادقون)۔

اس ساری گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ بنیامین کی چوری کا واقعہ مصر میں مشہور ہو چکا تھا۔ یہ بات شہرت پا چکی تھی کہ کنعان سے ایک قافلہ یہاں آیا ہے۔ ان میں سے ایک شخص بادشاہ کا پیمانہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ بادشاہ کے مامورین بروقت پہنچ گئے اور انہوں نے اس شخص کو روک لیا۔

شاید بھائیوں نے جو یہ کہا کہ مصر کے علاقے سے پوچھ لیں یہ اس طرف کنایہ ہو کہ یہ واقعہ اس قدر مشہور ہو چکا ہے کہ در و دیوار کو اس کا علم ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ سب سے بڑا بھائی کون تھا؟ بعض نے سب سے بڑے بھائی کا نام "روبین" (روبیل) لکھا ہے۔ بعض نے "شمعون" کو سب سے بڑا بھائی سمجھا ہے۔ بعض نے اس کا نام "یہودا" بیان کیا ہے۔

---

[1] "قریۃ" عربی زبان میں گاؤں اور بستی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق کلی طور پر آبادیوں اور شہروں پر ہوتا ہے اور یہاں مراد اس سے مصر کا علاقہ ہے۔

[2] "عیر" ان لوگوں کو کہتے ہیں جو اونٹوں اور چوپایوں کو اناج لانے اور لے جانے کے لیے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ یعنی انہیں مجموعی طور پر "عیر" کہتے ہیں لہٰذا ان سے سوال کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ لفظ انسانوں کا مفہوم بھی لیے ہوئے ہے اور مقدر و محذوف سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ لفظ "عیر" میں صرف چوپایوں کا مفہوم شامل ہے۔ اس صورت میں آیت تقدیر کی محتاج ہے جیسا کہ "قریۃ" میں بھی ہے۔

نیز اس لحاظ سے بھی مفسرین میں اختلاف ہے کہ یہاں بڑا ہونے سے مراد عمر میں بڑا ہے یا عقل و فہم کے لحاظ سے بڑا ہے۔ البتہ آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ یہاں سن و سال میں بڑا ہونا مراد ہے۔

۲۔ موجود قرائن کی بنیاد پر فیصلہ: اس آیت سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اقرار اور گواہ نہ بھی ہوں تو قاضی قطعی قرائن پر عمل کر سکتا ہے کیونکہ برادرانِ یوسفؑ کے اس واقعے میں نہ گواہ تھے اور نہ اقرار۔ صرف بنیامین کے بارے میں سے بادشاہ کے پیمانے کا مل جانا اس کے مجرم ہونے کی دلیل شمار کیا گیا۔

نیز ان میں سے ہر ایک ذاتی طور پر اپنے بار کو پُر کرتا تھا یا کم از کم پُر کرتے وقت وہاں حاضر ہوتا تھا اور اگر تالا لگا ہوتا یا بند کرنا ہوتا تو چابی وغیرہ بھی خود اسی کے قبضے میں ہوتی۔ دوسری طرف کوئی شخص یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی منصوبہ کار فرما ہے۔ مزید یہ کہ کنعان کے مسافروں (برادرانِ یوسفؑ) کا اس شہر میں کوئی دشمن بھی نہ تھا کہ جو ان کے خلاف کوئی سازش کرتا۔

ان تمام پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ بنیامین کے بارے میں سے جو بادشاہ کا پیمانہ برآمد ہوا ہے یہ خود اسی کا ذاتی کام ہے۔

دورِ حاضر میں بھی ایسی ہی بنیادوں پر فیصلے کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں فقہ اسلامی میں مزید جستجو اور تحقیق کی ضرورت ہے کیونکہ یہ امر موجودہ زمانے میں عدالتی بحثوں میں بہت موثر ہے۔ کتاب القضاء میں اس سلسلے میں بحث کی جانا چاہیے۔

۳۔ برادرانِ یوسفؑ میں فرق: مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ برادرانِ یوسفؑ میں عزم و ہمت کے لحاظ سے بہت فرق تھا۔ سب سے بڑا بھائی اپنے وعدے کا بہت سختی سے پابند تھا جب کہ دوسرے بھائیوں نے جب دیکھا کہ عزیزِ مصر سے ان کی گفتگو نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی تو انہوں نے بس اسی پر اپنے آپ کو معذور سمجھا اور مزید کوشش نہ کی۔ البتہ حق بڑے بھائی کے ساتھ تھا کیونکہ وہ مصر ہی میں ٹھہر گیا خصوصاً عزیزِ مصر کے دربار کے نزدیک اس نے پڑاؤ ڈال لیا۔ اس سے یہ توقع ہو سکتی تھی کہ وہ لطف و مہربانی کرے اور ایک پیمانے کی وجہ سے جو آخرکار مل گیا تھا اور ایک مسافر اس سے دامدار بھی ہو گیا تھا، اب اس کے بدلے بھائیوں اور اس کے بوڑھے باپ کو سزا نہ دے۔ اسی احتمال کی بناء پر وہ مصر میں ٹھہر گیا اور بھائیوں کو باپ کا حکم معلوم کرنے کے لیے باپ کی خدمت میں روانہ کر دیا تاکہ وہ جا کر سارا واقعہ باپ سے بیان کریں۔

۸۳۔ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۖ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۚ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ○

۸۴۔ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ○

۸۵۔ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ○

۸۶۔ قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۸۳۔ (یعقوب نے) کہا: نفس (اور ہوا و ہوس) نے معاملہ تمہاری نگاہ میں اس طرح سے مزین کر دیا ہے میں صبر کروں گا، صبر جمیل (کہ جس میں کفران نہ ہو)، مجھے امید ہے کہ خدا ان سب کو میری طرف پلٹا دے گا کیونکہ وہ علیم حکیم ہے۔

۸۴۔ اور ان سے منہ پھیر لیا اور کہا: ہائے یوسف! اور اس کی آنکھیں غم و اندوہ سے سفید ہو گئیں لیکن وہ اپنا غصہ پی جاتا (اور ہرگز ناشکری نہ کرتا)۔

۸۵۔ انہوں نے کہا: بخدا! تو یوسف کو اس قدر یاد کرتا ہے کہ تو موت کے قریب جا پہنچے گا یا ہلاک ہو جائے گا

۸۶۔ اس نے کہا: میں اپنا درد و غم صرف خدا سے کہتا ہوں (اور اس کے ہاں شکایت کرتا ہوں) اور میں خدا کی طرف سے ایسی چیزیں جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے۔

تفسیر

میں وہ الطافِ الٰہی جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے

بھائی مصر سے چل پڑے سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے بھائی کو وہاں چھوڑ گئے اور پریشان و غم زدہ کنعان پہنچے۔ باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس سفر سے واپسی پر باپ نے جب گزشتہ سفر کے برعکس غم و اندوہ کے آثار اُن کے چہروں پر دیکھے تو سمجھ گئے کہ کوئی ناگوار خبر لائے ہیں خصوصاً جب کہ بنیامین اور سب سے بڑا بھائی اُن کے ہمراہ نہ تھا۔ جب بھائیوں نے بغیر کسی کمی بیشی کے ساری آپ بیتی کہہ دی تو یعقوبؑ بہت حیران ہوئے اور ان کی طرف رُخ کرکے "کہنے لگے: تمہاری نفسانی خواہشات نے یہ معاملہ تمہارے سامنے اس طرح سے پیش کیا ہے اور اسے اس طرح سے مزین کیا ہے" (قال بل سولت لکم انفسکم امرًا)۔

یعنی بالکل وہی جملہ کہا جو انہوں نے حادثۂ یوسفؑ کے بعد کہا تھا جب کہ انہوں نے وہ جھوٹا واقعہ بیان کیا تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت یعقوبؑ نے ان کے سابقہ کردار ہی کے باعث ان کے بارے میں سوءِ ظن کیا اور یقین کر لیا کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں اور اس میں کوئی سازش ہے حالانکہ ایسا کرنا نہ صرف یعقوبؑ جیسے پیغمبر سے بعید معلوم ہوتا ہے بلکہ عام لوگوں سے بھی بعید ہے کہ کسی کو صرف اس کے کسی سابقہ بُرے کردار کی وجہ سے یقینی طور پر متہم کریں جب کہ دوسری طرف گواہ بھی ہوں اور تحقیق کا راستہ بھی بند نہ ہو۔

یا پھر — کیا اس جملے کا مقصد ایک اور نکتہ بیان کرنا ہے جس کے یہ پہلو ہیں:

۱۔ تم فقط بادشاہ کا پیمانہ بھائی کے بار میں دیکھ کر کیوں مان گئے کہ اس نے چوری کی ہے جب کہ تنہا یہ بات منطقی دلیل نہیں بن سکتی۔

۲۔ تم نے عزیزِ مصر سے کیوں کہا کہ چور کی یہ سزا ہے کہ اسے غلام بنا لو حالانکہ یہ کوئی خدائی قانون نہیں ہے بلکہ کنعان کے لوگوں کی ایک غلط رسم ہے (یہ بات اس صورت میں درست ہے جب بعض مفسرین کے قول کے خلاف اس قانون کو شریعتِ یعقوبؑ کا حصہ نہ سمجھا جائے)

۳۔ اس واقعے کے بعد تم فوراً کیوں چل پڑے اور بڑے بھائی کی طرح قیام کیوں نہیں کیا جب کہ تم میرے ساتھ پکا خدائی وعدہ کر چکے تھے[1]

اس کے بعد یعقوبؑ اپنی جانب متوجہ ہوئے اور "کہنے لگے کہ میں صبر کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑوں گا اور میں اچھا صبر کروں گا کہ جو کفران سے خالی ہو (فصبر جمیل)۔

مجھے اُمید ہے کہ خدا ان سب کو (یوسف، بنیامین اور میرے بڑے بیٹے کو) میری طرف پلٹا دے گا (عسی اللّٰہ ان یأتینی بھم

---

[1] یہ جو بعض نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ واقعہ یوسف کی طرف اشارہ ہے، بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ یوسف کو ماں باپ سے جدا کرنے کا معاملہ مندرجہ بالا آیات میں بالکل نہیں آیا۔

جمیعًا) کیونکہ میں جانتا ہوں کہ "وہ ان سب کے دل کی داخلی کیفیات سے باخبر ہے، علاوہ ازیں وہ حکیم بھی ہے اور وہ کوئی کام بغیر کسی حساب کتاب کے نہیں کرتا" (انہ ھو العلیم الحکیم)۔

اس وقت یعقوبؑ رنج و غم میں ڈوب گئے۔ بنیامین کہ جوان کے دل کی ڈھارس تھا واپس نہ آیا تو انہیں اپنے پیارے یوسفؑ کی یاد آگئی۔ انہیں خیال آیا کہ اے کاش آج وہ آبرومند، باایمان، باہوش اور حسین و جمیل بیٹا ان کی آغوش میں ہوتا اور اس کی پیاری خوشبو ہر لمحہ باپ کو ایک حیاتِ نو بخشتی لیکن آج نہ صرف یہ کہ اس کا نام و نشان نہیں بلکہ اس کا جانشین بنیامین بھی اس کی طرح ایک دردناک معاملے میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے رُخ پھیر لیا اور کہا: ہائے یوسفؑ! (و تولی عنھم وقال یا اسفا علی یوسف)۔

بھائی کہ جو پہلے ہی بنیامین کے ماجرے پر باپ کے سامنے شرمندہ تھے یوسفؑ کا نام سن کر فکر میں ڈوب گئے۔ ان کے ماتھے پر عرقِ ندامت کے قطرے چمکنے لگے۔

حزن و ملال اتنا بڑھا کہ یعقوبؑ کی آنکھوں سے بے اختیار اشکوں کا سیلاب بہہ نکلا یہاں تک کہ اس کی آنکھیں درد و غم سے سفید اور نابینا ہو گئیں (وابیضت عیناہ من الحزن)۔

لیکن اس کے باوجود وہ کوشش کرتے تھے کہ ضبط کریں اور اپنا غم و غصہ پی جائیں اور رضائے حق کے خلاف کوئی بات نہ کہیں "وہ باحوصلہ اور جواں مرد تھے اور انہیں اپنے غصے پر پورا کنٹرول تھا" (فھو کظیم)۔

ظاہر آیت سے انداز ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ اس وقت تک نابینا نہیں ہوئے تھے لیکن اب جب کہ رنج و غم کئی گنا بڑھ گیا اور آپ مسلسل گریہ و زاری کرتے رہے اور آپ کے آنسو تھمنے نہ پاتے تھے تو آپ کی بینائی ختم ہو گئی اور جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ کوئی اختیاری چیز نہ تھی کہ جو صبرِ جمیل کے منافی ہو۔[1]

بھائی کہ جو ان تمام واقعات سے بہت پریشان تھے، ایک طرف تو ان کا ضمیر حضرت یوسفؑ کے واقعے کی بناء پر انہیں عذاب دیتا اور دوسری طرف وہ بنیامین کی وجہ سے اپنے آپ کو ایک نئے امتحان کی چوکھٹ پر پاتے تھے اور تیسری طرف باپ کا اتنا غم اور دکھ ان پر بہت گراں تھا لہٰذا انہوں نے پریشانی اور بے حوصلگی کے ساتھ باپ سے کہا: بخدا تو اتنا یوسف یوسف کرتا ہے کہ بیمار ہو جائے گا اور موت کے کنارے پہنچ جائے گا یا ہلاک ہو جائے گا" (قالوا تاللہ تفتؤا تذکر یوسف حتی تکون حرضًا او تکون من الھالکین)۔[2]

لیکن کنعان کے اس سن رسیدہ اور روشن ضمیر پیغمبر نے ان کے جواب میں کہا:

"میں نے تمہارے سامنے اپنی شکایت پیش نہیں کی جو اس طرح کی باتیں کرتے ہو، میں اپنا درد و غم بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتا ہوں اور اس کے ہاں اپنی شکایت پیش کرتا ہوں" (قال انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ)۔[3]

"اور اپنے خدا کی طرف سے مجھے ایسے الطاف و عنایات حاصل ہیں اور ایسی چیزیں مجھے معلوم ہیں کہ جن سے تم بے خبر ہو" (واعلم من اللہ ما لا تعلمون)۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے اسی سورہ کی آیہ ۱۸ کی تفسیر ملاحظہ کیجیے۔

[2] "حرض" (بروزنِ "مرض") فاسد اور پریشان کرنے والی چیز کے معنی میں ہے۔ یہاں اس کا معنی ہے بیمار، نحیف، لاغر اور قریب المرگ۔

[3] "بث" کا معنی ہے پراگندگی اور ایسی چیز جسے چھپایا نہ جاسکے اور یہاں واضح غم و اندوہ اور دل کی نمایاں پراگندگی کے معنی میں ہے۔

۸۷۔ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

۸۸۔ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ۝

۸۹۔ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ۝

۹۰۔ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ۭ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ ۡ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۭ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

۹۱۔ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِــِٕيْنَ ۝

۹۲۔ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝

۹۳۔ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰي وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

ترجمہ

۸۷۔ اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسفؑ اور اس کے بھائی کو تلاش کرو اور خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو کیونکہ خدا کی رحمت سے کافر قوم کے سوا کوئی مایوس نہیں ہوتا۔

۸۸۔ جب وہ اُس (یوسفؑ) کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا: اے عزیز! ہم اور ہمارا خاندان پریشانی میں گھر گیا

ہے اور ہم (اناج خریدنے کے لیے) تھوڑی سی پونجی اپنے ساتھ لائے ہیں۔ ہمارا پیمانہ پوری طرح بھر دے اور ہم پر صدقہ کر دے کیونکہ خدا صدقہ کرنے والوں کو جزا دیتا ہے۔

۸۹۔ اُس نے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ تم نے یوسفؑ اور اُس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا جب کہ تم جاہل تھے۔

۹۰۔ انہوں نے کہا: کیا تو ہی یوسفؑ ہے۔ اس نے کہا: (ہاں) میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے خدا نے ہم پر احسان کیا ہے۔ جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور صبر و استقامت دکھائے (آخر کار وہ کامیاب ہوتا ہے) کیونکہ خدا نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

۹۱۔ انہوں نے کہا: خدا کی قسم! خدا نے تجھے ہم پر مقدم رکھا اور ہم خطا کار تھے۔

۹۲۔ اُس نے کہا: آج تم پر کوئی ملامت و سرزنش نہیں ہے، خدا تمہیں بخشے اور وہ ارحم الراحمین ہے۔

۹۳۔ یہ میری قمیض لے جاؤ اور میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو تو وہ بینا ہو جائے گا اور تمام گھر والوں کو میرے پاس لے آؤ۔

تفسیر

کوشش کرو اور مایوس نہ ہو

مصر اور اطراف مصر جس میں کنعان بھی شامل تھا میں قحط کا زور بڑھ رہا تھا۔ اناج بالکل ختم ہو گیا تو حضرت یعقوبؑ نے دوبارہ اپنے بیٹوں کو مصر کی طرف جانے اور غلہ حاصل کرنے کا حکم دیا لیکن اس مرتبہ اپنی آرزوؤں کی بنیاد یوسفؑ اور ان کے بھائی بنیامین کی تلاش کو قرار دیا اور کہا: "میرے بیٹو! جاؤ اور یوسفؑ اور اس کے بھائی کو تلاش کرو" (یا بنی اذھبوا فتحسسوا من یوسف و اخیہ)۔

حضرت یعقوبؑ کے بیٹے چونکہ اس بارے میں تقریباً مطمئن تھے کہ یوسفؑ موجود ہی نہیں اس لیے وہ باپ کی اس نصیحت اور تاکید پر تعجب کرتے تھے۔

یعقوبؑ نے ان کے گوش گزار کر رہے تھے: رحمتِ الٰہی سے کبھی مایوس نہ ہونا، کیونکہ اس کی قدرت تمام مشکلوں اور سختیوں سے مافوق ہے (ولا تایئسوا من روح اللہ) کیونکہ صرف بے ایمان کافر جو قدرتِ خدا سے بے خبر ہیں اس کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں (انہ لا یایئس من روح اللہ الا القوم الکافرون)۔

"تحسس" مادہ "حس" سے ہے اور یہ قوت حس کے ذریعے کسی چیز کی جستجو اور تلاش کے معنی میں ہے۔ اور یہ کہ "تجسس" میں اور اس میں

کیا فرق ہے، اس سلسلے میں مفسرین اور اربابِ لغت کے درمیان اختلاف ہے۔

ابنِ عباس سے منقول ہے کہ "تحسس" امورِ خیر میں ہے اور "تجسس" امورِ شر میں۔

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ "تحسس" افراد اور اقوام کی سرگزشت جاننے کے لیے کوشش کرنے کے معنی میں ہے اور "تجسس" عیوب و نقائص کی جستجو کرنے کے معنی میں ہے۔

بعض دیگر احباب نے دونوں سے ایک ہی معنی مراد لیا ہے۔

لیکن اس حدیث کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جس میں فرمایا گیا ہے:

لا تجسسوا ولا تحسسوا

—— واضح ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں آپس میں مختلف ہیں۔ نیز ان دونوں کے درمیان فرق کے بارے میں زیرِ بحث آیت کے معنی میں، ابنِ عباس کا قول مناسب معلوم ہوتا ہے اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث میں دونوں سے منع کیا گیا ہے تو ہو سکتا ہے کہ یہ اس طرف اشارہ ہو کہ لوگوں کے کاموں اور معاملات کی ٹوہ میں نہ رہو نہ ان کے اچھے کاموں کی ٹوہ میں اور نہ ہی بُرے کاموں کی ٹوہ میں۔

"روح" رحمت، راحت، سہولت اور کشائشِ کار کے معنی میں ہے۔ مفردات میں راغب کہتا ہے کہ "روح" (بروزنِ "لوح") اور "روح" (بروزنِ "نوح") دونوں کا اصل میں ایک ہی معنی ہے اور "جان" اور "تنفس" کے معنی میں ہیں۔ بعد ازاں "روح" (بروزنِ "لوح") رحمت اور کشائش کے معنی میں استعمال ہونے لگا (اس بناء پر کہ ہمیشہ مشکلات حل ہو جانے پر انسان تئی روح اور جان پاتا ہے اور آزادی کا سانس لیتا ہے)۔

بہر حال فرزندانِ یعقوبؑ نے اپنا مال و اسباب باندھا اور مصر کی طرف چل پڑے اور باپ کے وہ تیسری مرتبہ داستانوں سے معمور اس سرزمین پر پہنچے۔ گزشتہ سفروں کے برخلاف اس سفر میں ان کی روح کو ایک احساسِ ندامت کچوکے لگا رہا تھا کیونکہ مصر میں اور عزیزِ مصر کے نزدیک ان کا سابقہ کردار بہت بُرا تھا اور وہ بدنام ہو چکے تھے اور اندیشہ تھا کہ شاید بعض لوگ انہیں "کنعان کے چور" کے عنوان سے پہچانیں۔ دوسری طرف ان کے پاس گندم اور دوسرے اناج کی قیمت دینے کے لیے درکار مال و متاع موجود نہیں تھا اور ساتھ ہی بھائی بنیامین کے کھو جانے اور باپ کی انتہائی پریشانی نے ان کی مشکلات میں اضافہ کر دیا تھا۔ گویا تلوار ان کے حلقوم تک پہنچ گئی تھی۔ بہت ساری مشکلات اور روح فرسا پریشانیوں نے انہیں گھیر رکھا تھا ایسے میں جو چیز ان کے تسکینِ قلب کا باعث تھی وہ صرف باپ کا آخری جملہ تھا کہ جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونا کیونکہ اُس کے لیے ہر مشکل آسان ہے۔ اس عالم میں "وہ یوسفؑ کے پاس پہنچے اور اس وقت انتہائی پریشانی کے عالم میں انہوں نے اس کی طرف رُخ کیا اور کہا: اے عزیز! ہمیں اور ہمارے خاندان کو قحط، پریشانی اور مصیبت نے گھیر لیا ہے" (فلما دخلوا علیہ قالوا یا ایھا العزیز مسنا و اھلنا الضر) "اور ہمارے پاس صرف تھوڑی سی کم قیمت پونجی ہے" (وجئنا ببضاعۃ مزجاۃ)[1] "لیکن ہم پھر بھی تیرے کرم اور شفقت پر بھروسہ ہے" "اور ہمیں توقع ہے کہ تو ہمارا پیمانہ بالکل پورا کرے گا" (فاوف لنا الکیل) "اور اس معاملے میں ہم پر احسان کرتے ہوئے صدقہ کر" (وتصدق علینا)

---

[1] بضاعت۔ بضع کے مادہ سے ہے بمعنی قطعہ ...

اور اپنا اجر و ثواب ہم سے نہ لے بلکہ اپنے خدا سے لے کیونکہ خدا کریموں اور صدقہ کرنے والوں کو اجر خیر دیتا ہے (ان اللہ یجزی المتصدقین)۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ برادرانِ یوسفؑ کو باپ نے تاکید کی تھی کہ پہلے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے لیے جستجو کریں اور بعد میں اناج حاصل کریں لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس بات کی طرف چنداں توجہ نہیں کی اور سب سے پہلا انہوں نے عزیزِ مصر سے اناج کا تقاضا کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہیں یوسفؑ کے ملنے کی چنداں اُمید نہ تھی یا ممکن ہے انہوں نے سوچا ہو کہ بہتر ہے کہ اپنے آپ کو اناج کے خریداروں کے طور پر پیش کریں جو کہ زیادہ طبعی اور فطری ہے اور بھائی کی آزادی کا تقاضا خاص شرائط دیں تاکہ یہ عزیزِ مصر پر زیادہ اثر انداز ہو۔

بعض نے کہا کہ "تصدق علینا" سے مراد وہی بھائی کی آزادی ہے ورنہ وہ اناج بغیر معاوضے کے حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے کہ اسے "تصدق" قرار دیا جاتا۔

روایات میں بھی ہے کہ بھائی باپ کی طرف سے عزیزِ مصر کے نام ایک خط لے کر گئے تھے اس خط میں حضرت یعقوبؑ نے عزیزِ مصر کے عدل و انصاف کا تذکرہ کیا۔ اپنے خاندان سے اس کی محبتوں اور شفقتوں کی تعریف کی۔ پھر اپنا اور اپنے خاندانِ نبوت کا تعارف کروایا۔ اپنی پریشانیوں کا ذکر کیا اور ساتھ ہی اس کے ضمن میں اپنے بیٹے یوسفؑ اور دوسرے بیٹے بنیامین کے کھو جانے اور خشک سالی سے پیدا ہونے والی مصیبتوں کا ذکر کیا۔ خط کے آخر میں اس سے خواہش کی گئی تھی کہ بنیامین کو آزاد کر دے اور تاکید کی تھی کہ ہمارے خاندان میں چوری چکاری ہرگز نہ تھی اور نہ ہوگی۔

جب بھائیوں نے باپ کا خط عزیزِ مصر کو دیا تو انہوں نے اسے لے کر چوما اور اپنی آنکھوں پر رکھا اور رونے لگے۔ گریہ کا یہ عالم تھا کہ قطراتِ اشک ان کے پیراہن پر گرنے لگے[1] (یہ دیکھ کر بھائی حیرت و فکر میں ڈوب جاتے ہیں کہ عزیزِ مصر کا ان کے باپ سے کیا لگاؤ ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ ان کے باپ کے خط نے اس میں ہیجان و اضطراب کیوں پیدا کر دیا ہے اور شاید اسی موقع پر ان کے دل میں یہ خیال بجلی کی طرح اترا ہو کہ ہو نہ ہو یہی خود یوسفؑ ہو اور شاید باپ کے اسی خط کی وجہ سے یوسفؑ اس قدر بے قرار ہو گئے کہ اب مزید اپنے آپ کو عزیزِ مصر کے نقاب میں نہ چھپا سکے اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ بہت جلد بھائیوں سے بھائی کی حیثیت سے اپنا تعارف کروا دیا)۔

اس موقع پر جب کہ دور یا آزمائش ختم ہو رہا تھا اور یوسفؑ بھی بہت بے تاب اور سخت پریشان نظر آ رہے تھے تعارف کے لیے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بھائیوں کی طرف رُخ کر کے آپ نے کہا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب تم جاہل و نادان تھے تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا (قال هل علمتم ما فعلتم بیوسف و اخیه اذ انتم جاهلون)۔

حضرت یوسفؑ کی عظمت اور شفقت ملاحظہ کیجیے کہ اوّلاً تو ان کا گناہ مجمل طور پر بیان کیا اور کہا: "ما فعلتم" (جو کچھ تم نے انجام دیا) اور ثانیاً انہیں عذر خواہی کا راستہ دکھایا کہ تمہارے یہ اعمال و افعال جہالت کی وجہ سے تھے اور اب جہالت کا زمانہ گزر گیا ہے اور اب تم عاقل اور سمجھدار ہو۔

ضمناً اس گفتگو سے واضح ہوتا ہے کہ گزشتہ زمانے میں انہوں نے صرف یوسفؑ پر ظلم نہیں ڈھایا تھا بلکہ بنیامین بھی اس دور میں ان کے شر سے محفوظ نہیں تھے اور انہوں نے اس کے لیے بھی اس زمانے میں مشکلات پیدا کی تھیں۔ جب بنیامین مصر میں یوسفؑ کے پاس تھے

---

[1] مجمع البیان زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

شاید ان دنوں میں انہوں نے ان کی کچھ بے انصافیاں اپنے بھائی کو بتائی ہوں۔

بعض روایات میں ہے کہ وہ زیادہ پریشان نہ ہوں اور یہ خیال نہ کریں کہ عزیز مصر ہم سے انتقام لینے والا ہے یوسف نے اپنی گفتگو ایک تبسم کے ساتھ ختم کی۔ اس تبسم کی وجہ سے بھائیوں کو حضرت یوسف کے خوبصورت دانت پوری طرح نظر آ گئے۔ جب انہوں نے خوب غور کیا تو انہیں محسوس ہوا کہ یہ دانت ان کے بھائی یوسف سے عجیب مشابہت رکھتے ہیں۔[1]

اس طرح بہت سے پہلو جمع ہو گئے۔ ایک طرف تو انہوں نے دیکھا کہ عزیز مصر یوسف کے بارے میں اور اس پر بھائیوں کی طرف سے کیے گئے مظالم کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے جنہیں سوائے ان کے اور یوسف کے کوئی نہیں جانتا تھا۔

دوسری طرف انہوں نے دیکھا کہ یعقوب کے خط نے اسے اس قدر مضطرب کر دیا ہے جیسے اس کا یعقوب سے کوئی بہت ہی قریبی تعلق ہو۔

تیسری طرف وہ اس کے چہرے مہرے پر جتنا غور کرتے انہیں اپنے بھائی یوسف سے بہت زیادہ مشابہت دکھائی دیتی۔

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ یوسف عزیز مصر کی مسند پر پہنچ گیا ہو۔ وہ سوچتے کہ یوسف کہاں اور یہ مقام کہاں!

لہٰذا انہوں نے شک و تردد کے لہجے میں کہا: کیا تم خود یوسف تو نہیں (قالوا أ انک لانت یوسف)۔

یہ موقع بھائیوں پر بہت زیادہ حساس لمحات گزرا — کیونکہ یہ طور پر معلوم ہی نہ تھا کہ عزیز مصر ان کے سوال کے جواب میں کیا کہے گا۔ کیا پردے ہٹا دے گا اور اپنا تعارف کروائے گا یا انہیں دیوانہ اور بے وقوف سمجھ کر خطاب کرے گا کہ انہوں نے ایک مضحکہ خیز بات کی ہے۔

گھڑیاں بہت تیزی سے گزر رہی تھیں۔ انتظار کے یہ لمحات ان کے دل کو بوجھل کر رہے تھے لیکن حضرت یوسف نے نہ چاہا کہ زیادہ طویل ہو جائے۔ اچانک انہوں نے حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹایا اور کہا: ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی بنیامین ہے" (قال انا یوسف و ھذا اخی)۔ لیکن اس بنا پر کہ وہ خدا کی نعمت کا شکر ادا کریں کہ جس نے یہ سب نعمات عطا فرمائی تھیں اور ساتھ ہی بھائیوں کو بھی ایک عظیم درس دیں، انہوں نے مزید کہا: خدا نے ہم پر احسان کیا ہے جو شخص بھی تقویٰ اور صبر اختیار کرے گا خدا اسے اس کا اجر و ثواب دے گا کیونکہ خدا نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا"۔ (قد من اللہ علینا انہ من یتق ویصبر فان اللہ لا یضیع اجر المحسنین)۔

کسی کو معلوم نہیں کہ ان حساس لمحات میں کیا گزری اور جب دیوں سال بعد بھائیوں نے ایک دوسرے کو پہچانا تو کیا شور و غوغا ہوا، وہ کس طرح آپس میں بغل گیر ہوئے اور کس طرح سے ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو امڈ پڑے۔

ان تمام چیزوں کے باوجود بھائی اپنے آپ میں شرمندہ تھے۔ وہ یوسف کے چہرے کی طرف نظر بھر کے نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں ان کا عظیم گناہ بخشش و عفو کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ لہٰذا انہوں نے بھائی کی طرف رخ کیا اور کہا: خدا کی قسم، اللہ نے تجھے ہم پر مقدم کیا ہے اور تجھے ترجیح دی ہے اور علم و حلم اور عقل و حکومت کے لحاظ سے تجھے فضیلت بخشی ہے (قالوا

---

[1] بعض علماء نے ان نزلے یوسف شاید مشابہت کے ذکر کی ہیں۔

تاللہ لقد آثرک اللہ علینا[1]۔ یقیناً ہم خطاکار اور گناہگار تھے (وان کنا لخاطئین)[2]

لیکن یوسفؑ نہیں چاہتے تھے کہ بھائی اس طرح شرمسار رہیں خصوصاً جب کہ یہ ان کی اپنی کامیابی و کامرانی کا موقع تھا یا یہ کہ احتمالاً بھائیوں کے ذہن میں یہ بات نہ آئے کہ یوسفؑ اس موقع پر انتقام لے گا لہٰذا فوراً یہ کہہ کر انہیں مطمئن اور پرسکون کر دیا کہ "آج تمہیں کوئی سرزنش اور توبیخ نہیں ہوگی" (قال لا تثریب علیکم الیوم)[3] یعنی تمہاری فکر آسودہ رہے اور وجدان کو راحت رہے اور گزشتہ گناہوں پر غم نہ کرو۔

اس بناء پر کہ انہیں بتایا جائے کہ انہیں نہ صرف یوسفؑ کا حق بخش دیا گیا ہے بلکہ ان کی ندامت و پشیمانی کی وجہ سے اس سلسلے میں خدائی حق بھی قابلِ بخشش ہے، مزید کہا: اللہ بھی تمہیں بخش دے گا کیونکہ وہ ارحم الراحمین ہے (یغفر اللہ لکم وھو ارحم الراحمین)۔

یہ حضرت یوسفؑ کی انتہائی عظمت کی دلیل ہے کہ نہ صرف اپنا حق معاف کر دیا بلکہ اس بات پر بھی تیار نہ ہوئے کہ انہیں تھوڑی سی بھی سرزنش کی جائے چہ جائیکہ بھائیوں کو کوئی سزا دیتے بلکہ حقِ الٰہی کے لحاظ سے بھی انہیں اطمینان دلایا کہ خدا غفور اور بخشنے والا ہے بلکہ یہ بات ثابت کرنے کے لیے یہ استدلال پیش کیا کہ وہ ارحم الراحمین ہے۔

اس موقع پر بھائیوں کو ایک اور غم بھی ستا رہا تھا اور وہ یہ کہ باپ اپنے بیٹوں کے فراق میں نابینا ہو چکا ہے اور اس کا اس طرح رہنا پورے خاندان کے لیے ایک جانکاہ رنج ہے علاوہ ازیں ان کے جرم پر ایک مسلسل دلیل ہے۔ لہٰذا یوسفؑ نے اس عظیم مشکل کے حل کے لیے بھی فرمایا: "میرا یہ پیراہن لے جاؤ اور میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو تاکہ وہ بینا ہو جائے" (اذھبوا بقمیصی ھذا فالقوہ علی وجہ ابی یأت بصیرا)۔ "اس کے بعد سارے خاندان کے ہمراہ میرے پاس آ جاؤ" (وأتونی باھلکم اجمعین)۔

چند اہم نکات

۱۔ یوسفؑ کی قمیص کون لے کر گیا؟ چند ایک روایات میں آیا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے کہا:

میرا شفا بخش کرتہ باپ کے پاس وہی لے کر جائے جو خون آلود کرتہ لے کر گیا تھا تاکہ جیسے اس نے باپ کو تکلیف پہنچائی اور پریشان کیا تھا اب کے اسے خوش و خرم کرے۔

لہٰذا یہ کام "یہودا" کے سپرد ہوا کیونکہ اس نے بتایا تھا کہ وہ میں ہی خون آلود کرتہ لے کر باپ کے پاس گیا تھا اور ان سے کہا تھا کہ آپ کے بیٹے کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔

---

[1] "آثرک" "ایثار" کے مادہ سے ہے۔

[2] فخر رازی نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ "خاطی" اور "مخطی" کے درمیان یہ فرق ہے کہ "خاطی" اس شخص کو کہتے ہیں جو جان بوجھ کر غلط کام کرے اور "مخطی" اسے کہتے ہیں جو بھول سے غلط کام کرے۔

[3] "تثریب" اصل میں "ثرب" (بروزن "ضرب") کے مادہ سے ہے۔ "ثرب" دراصل چربی کی اس نازک اور پتلی تہہ کو کہتے ہیں جو معدے اور انتڑیوں کو چھپائے رکھتی ہے اور "تثریب" اسے الگ کرنے کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں یہ سرزنش اور ملامت کے معنی میں استعمال ہونے لگا گویا اس کام سے گناہ کا پردہ دوسرے کے چہرے سے دور کر دیا جاتا ہے۔ (قاموس، مفردات راغب، تفسیر فخر رازی اور روح المعانی کی طرف رجوع فرمائیں)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ حضرت یوسفؑ اس قدر مشکلات اور مصائب میں گرفتار رہے لیکن اخلاقی مسائل کی باریکیوں سے غافل نہیں رہتے تھے۔[1]

۲۔ یوسفؑ کی عظمت: بعض دیگر روایات میں آیا ہے کہ اس ماجرے کے بعد حضرت یوسفؑ کے بھائی ہمیشہ شرمسار رہتے تھے انہوں نے کسی کو یوسفؑ کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ آپ ہر صبح و شام ہمیں اپنے دسترخوان پر بٹھاتے ہیں اور آپ کا چہرہ دیکھ کر ہمیں شرم و ندامت محسوس ہوتی ہے کیونکہ ہم نے آپ کے ساتھ اس قدر جسارتیں کی ہیں۔

اس بناء پر کہ انہیں نہ صرف ذرہ بھر احساس شرمندگی نہ ہو بلکہ یوسفؑ کے دسترخوان پر اپنی موجودگی کو یوسفؑ کی ایک خدمت محسوس کریں، حضرت یوسفؑ نے انہیں بہت ہی عمدہ جواب دیا۔ آپ نے کہا:

مصر کے لوگ اب تک مجھے ایک زرخرید غلام کی نظر سے دیکھتے تھے اور ایک دوسرے سے کہتے تھے:

سبحان من بلغ عبداً بیع بعشرین درهماً ما بلغ

پاک ہے وہ ذات جس نے اس غلام کو کہ جو بیس درہم میں بیچا گیا اس مقام تک پہنچایا۔

لیکن اب جب کہ تم لوگ آگئے ہو اور میری زندگی کی کتاب ان کے سامنے کھل گئی ہے تو وہ سمجھنے لگے ہیں کہ میں غلام نہیں تھا بلکہ میں خاندانِ نبوت سے تعلق رکھتا ہوں اور ابراہیم خلیل اللہ کی اولاد میں سے ہوں اور یہ میرے لیے باعثِ افتخار ہے۔[2]

۳۔ کامیابی کا شکرانہ: مندرجہ بالا آیات میں یہ اہم اخلاقی درس اور واضح ترین اسلامی حکم موجود ہے کہ دشمن پر کامیابی کے وقت انتقام جو اور کینہ پرور نہ ہو۔

یوسفؑ کے بھائیوں نے انہیں نہایت سخت صدمے پہنچائے تھے اور انہیں موت کی دہلیز تک پہنچا دیا تھا۔ اگر لطفِ الٰہی شاملِ حال نہ ہوتا تو بچ جانا اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔ صرف یہی نہیں کہ انہوں نے یوسفؑ کو تکلیف پہنچائی تھی بلکہ ان کے والد کو بھی سخت مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا لیکن اب جب کہ وہ سب کے سب تار و نزار یوسفؑ کے سامنے تھے اور یوسفؑ کے پاس پوری قدرت و طاقت بھی تھی مگر حضرت یوسفؑ کی گفتگو سے اور ان کے کلمات کے اندر جھانکنے سے اچھی طرح محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دل میں نہ صرف یہ کہ کوئی کینہ موجود نہیں تھا بلکہ انہیں اس بات سے تکلیف ہوتی تھی کہ ان کے بھائی گزشتہ واقعے کو یاد کریں اور پریشان و غمزدہ ہوں اور شرمندگی محسوس کریں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت یوسفؑ پوری کوشش کرتے ہیں کہ یہ احساس ان کی روح سے نکال دیں۔ یہاں تک کہ اس سے بھی بڑھ کر وہ چاہتے ہیں کہ انہیں یقین دلائیں کہ ان کا مصر میں آنا اس لحاظ سے باعثِ افتخار ہے کہ خود حضرت یوسفؑ کے بارے میں مزید آگاہی کا سبب بنا ہے اور لوگوں کو معلوم ہوا ہے کہ وہ خاندانِ رسالت میں سے ہیں نہ کہ ایک کنعانی غلام ہیں کہ جسے چند درہموں میں بیچا گیا ہے۔

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر فخر رازی جلد ۱۸ صفحہ ۲۱۰۔

وہ چاہتے ہیں کہ بھائی اس طرح محسوس کریں کہ صرف یہ کہ میں ان پر احسان نہیں کر رہا بلکہ وہ مجھ پر احسان کر رہے ہیں۔

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ جب پیغمبر اسلامؐ کو ایسے ہی حالات پیش آئے اور فتح مکہ کے موقع پر آپ کو خونخوار دشمنوں یعنی شرک و بت پرستی کے سرغنوں پر کامیابی حاصل ہوئی تو ابن عباس کے بقول آپ خانہ کعبہ کے پاس تشریف لائے۔ اس وقت مخالفین کعبہ میں پناہ لے چکے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ پیغمبر اسلامؐ ان کے بارے میں کیا حکم صادر فرماتے ہیں۔ ایسے میں آپؐ نے کعبہ کے کنڈے کو پکڑ کر فرمایا:

الحمد لله الذی صدق وعده ونصر عبده وهزم الاحزاب وحده

شکر ہے اس خدا کا کہ جس کا وعدہ پورا ہوا اور اس نے اپنے بندے کو کامیاب کیا اور دشمنوں کے گروہوں کو شکست دی۔

اس کے بعد آپؐ نے لوگوں کی طرف رُخ کیا اور فرمایا:

ماذا تظنون معشر قریش

اے قریش والو! تمہارا کیا گمان ہے کہ میں تمہارے بارے میں کیا حکم دوں گا۔

قالوا خیرًا اخ کریم وابن اخ کریم وقد قدرت

انہوں نے جواب دیا: ہم تجھ سے خیر اور نیکی کے علاوہ کوئی توقع نہیں رکھتے آپ کریم و شریف بھائی ہیں اور کریم و بزرگوار بھائی کے بیٹے ہیں اور اس وقت قدرت و طاقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔

قال وانا اقول کما قال اخی یوسف، لا تثریب علیکم الیوم

اس پر پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: میں تمہارے بارے میں وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کامیابی کے وقت کہا تھا — لا تثریب علیکم الیوم — یعنی — آج تمہارے لیے کوئی ملامت و سرزنش نہیں ہے۔

عمر کہتے ہیں:

اس موقع پر میرے چہرے پر شرم و حیا سے پسینہ آگیا کیونکہ میں نے مکہ میں داخل ہوتے وقت ان سے کہا تھا: آج کے دن میں تم سے انتقام لوں گا۔ جب پیغمبرؐ نے وہ جملہ فرمایا تو مجھے اپنی گفتگو پر شرم آئی۔[1]

روایات اسلامی میں بھی بار بار یہ آیا ہے کہ

کامیابی کی زکوٰۃ عفو و بخشش ہے۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

اذا قدرت علی عدوک فاجعل العفو عنه شکرا للقدرة علیه

جس وقت تو اپنے دشمن پر کامیاب ہو جائے تو عفو و بخشش کو اپنی کامیابی کا شکرانہ قرار دے۔[2]

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۵ صفحہ ۳۴۸۵

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار، جملہ ۱۱۔

۹۴۔ وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ ○

۹۵۔ قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ ○

۹۶۔ فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَىٰ وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا ۖ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○

۹۷۔ قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ ○

۹۸۔ قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي ۖ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ○

ترجمہ

۹۴۔ جس وقت قافلہ (سرزمین مصر سے) جدا ہوا تو ان کے باپ (یعقوب) نے کہا، اگر مجھے نادانی اور کم عقلی کی نسبت نہ دو تو مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔

۹۵۔ انہوں نے کہا، بخدا تو اسی گزشتہ گمراہی میں ہے۔

۹۶۔ لیکن جب بشارت دینے والا آگیا (اور اس نے) وہ (کرتہ) اس کے چہرے پر ڈالا تو اچانک وہ بینا ہوگیا تو اس نے کہا، کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں خدا کی طرف سے ایسی چیزیں جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے

۹۷۔ انہوں نے کہا ابا (جان)، خدا سے ہمارے گناہوں کی بخشش کی خواہش کریں، بے شک ہم خطاکار تھے

۹۸۔ اس نے کہا عنقریب میں اپنے پروردگار سے تمہارے لیے طلب بخشش کروں گا۔ بے شک وہ غفور و رحیم ہے۔

تفسیر

آخرکار لطفِ الٰہی اپنا کام کرے گا

فرزندانِ یعقوبؑ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ وہ خوشی خوشی یوسفؑ کا پیراہن اپنے ساتھ لیے کر قافلے کے ساتھ مصر سے چل پڑے ادھر ان بھائیوں کے لیے زندگی کے شیریں ترین لمحات تھے ادھر شام کے علاقے کنعان میں بوڑھے باپ یعقوبؑ کا گھر غم واندوہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ سارا گھرانا افسردہ اور غم زدہ تھا۔

لیکن ـــ ادھر یہ قافلہ مصر سے چلا اور اُدھر اچانک یعقوبؑ کے گھر میں ایک واقعہ رونما ہوا جس نے سب کو تعجب میں ڈال دیا۔ یعقوبؑ کا جسم کانپ رہا تھا۔ انہوں نے بڑے اطمینان اور اعتماد سے پکار کر کہا، اگر تم ہرگز ہی رد کرو اور میری طرف نادانی اور جھوٹ کی نسبت نہ دو تو میں تم سے کہتا ہوں کہ مجھے اپنے پیارے یوسفؑ کی خوشبو آرہی ہے۔ میں محسوس کررہا ہوں کہ رنج وغم اور زحمت ومشکل کی گھڑیاں ختم ہونے کو ہیں اور وصال وکامیابی کا زمانہ آنے کو ہے، خاندانِ یعقوبؑ سے اب لباسِ ماتم اتار دے گا اور لباسِ مسرت زیب تن کرے گا لیکن میرا یہ خیال نہیں کہ تم ان باتوں پر یقین کرو گے (ولما فصلت العیر قال ابوھم انی لاجد ریح یوسف لولا ان تفندون)۔[1]

"فصلت" سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ میں یہ احساس اسی وقت پیدا ہوا جب قافلہ مصر سے چلنے لگا۔ قاعدتاً حضرت یعقوبؑ کے پاس اس وقت ان کے پوتے پوتیاں اور بہوئیں وغیرہ تھیں۔ انہوں نے بڑے تعجب اور گستاخی سے اور پورے یقین سے یعقوبؑ سے کہا: بخدا آپ اسی پرانی گمراہی میں ہیں (قالوا تاللہ انک لفی ضلالک القدیم) یعنی اس سے بڑھ کر گمراہی کیا ہوگی کہ یوسفؑ کی موت کو سالہا سال گزر گئے ہیں اور اب بھی آپ کا خیال ہے کہ وہ زندہ ہے اور اب آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ مصر کی طرف سے مجھے یوسفؑ کی خوشبو آرہی ہے، مصر کہاں اور شام وکنعان کہاں، کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ آپ ہمیشہ خواب وخیال کی دنیا میں رہتے ہیں اور اپنے خیالات وتصورات کو حقیقت سمجھتے ہیں، آپ یہ کیسی عجیب وغریب بات کہہ رہے ہیں، بہرحال آپ تو پہلے بھی اپنے بیٹوں سے کہہ چکے ہیں کہ مصر کی طرف جاؤ اور میرے یوسفؑ کو تلاش کرو۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ضلالت وگمراہی سے مراد عقیدے اور نظریے کی گمراہی نہیں ہے بلکہ یوسفؑ سے متعلق مسائل کے سمجھنے میں گمراہی مراد ہے۔

بہرکیف ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس عظیم کہن سال اور روشن ضمیر پیغمبر سے کیسا شدید اور جسارت آمیز سلوک کرتے تھے۔

ایک جگہ انہوں نے کہا، ہمارا باپ "ضلال مبین" (کھلی گمراہی) میں ہے اور یہاں انہوں نے کہا، تم اپنی اسی دیرینہ

---

[1] "تفندون" "فند" (بروزن "قلم") کے مادے سے عقل کی کمزوری اور حماقت کے معنی میں ہے۔ بعض نے اسے "جھوٹ" کے معنی میں سمجھا ہے۔ یہ اصل میں فساد اور تلف کے معنی میں ہے۔ لہٰذا "لولا ان تفندون" کا معنی ہے اگر تم مجھے بے وقوف اور فاسد العقل نہ کہو۔

گمراہی میں ہو۔

وہ پیرِ کنعان کے دل کی پاکیزگی اور روشنی سے بے خبر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کا دل بھی انہی کے دل کی طرح تاریک ہے۔ انہیں یہ خیال نہ تھا کہ آئندہ کے واقعات اور دور و نزدیک کے معاملات اس کے آئینۂ دل میں منعکس ہوتے ہیں۔

کئی رات دن بیت گئے۔ یعقوبؑ اسی طرح انتظار میں تھے ایسا پرسوز انتظار کہ جس کی گہرائی میں مسرت و شادمانی اور سکون و اطمینان موجزن تھا حالانکہ ان کے پاس رہنے والوں کو ان مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ یوسفؑ کا معاملہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔

معلوم نہیں یعقوبؑ پر یہ چند دن اور راتیں کس طرح گزریں۔ آخر ایک دن آیا جب آواز آئی کہ وہ دیکھو مصر سے کنعان کا قافلہ آیا ہے۔

گزشتہ سفروں کے برخلاف فرزندانِ یعقوبؑ شاداں و فرحاں شہر میں داخل ہوئے اور بڑی تیزی سے باپ کے گھر پہنچ گئے۔ سب سے پہلے "بشیر" بوڑھے یعقوبؑ کے پاس آیا (وہی "بشیر" جو وصال کی بشارت لایا تھا اور جس کے پاس یوسفؑ کا پیراہن تھا)۔ اس نے آتے ہی پیراہن یعقوبؑ کے چہرے پر ڈال دیا۔

یعقوبؑ کی آنکھیں تو بے نور تھیں۔ وہ پیراہن کو دیکھ نہ سکتے تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ایک آشنا خوشبو ان کی مشامِ جان میں بس گئی ہے۔ یہ ایک پر کیف زریں لمحہ تھا۔ گویا ان کے وجود کا ہر ذرہ روشن ہو گیا ہو۔ آسمان و زمین مسکرا اٹھے ہوں۔ ہر طرف قہقہے بکھر گئے ہوں، نسیمِ رحمت چل اٹھی ہو اور غم و اندوہ کا گرد و غبار لپیٹ کرلے جا رہی ہو۔ در و دیوار سے خوشی کے نعرے سنائی دے رہے تھے اور یعقوبؑ اس ساری فضا کے ساتھ تبسم کناں تھے۔ ایک عجیب ہیجانی کیفیت تھی جو اس بوڑھے انسان پر طاری تھی۔ اچانک انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی آنکھیں روشن ہو گئی ہیں اور وہ ہر جگہ دیکھ رہے ہیں۔ دنیا اپنی تمام تر زیبائیوں کے ساتھ ایک مرتبہ پھر ان کی آنکھوں کے سامنے تھی جیسا کہ قرآن کہتا ہے: جب بشارت دینے والا آیا تو اس نے وہ (پیراہن) ان کے چہرے پر ڈال دیا تو اچانک وہ بینا ہو گئے (فلما ان جاء البشیر القاہ علی وجہہ فارتد بصیرا)۔

بھائیوں اور گرد و پیش والوں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو امڈ آئے اور یعقوبؑ نے پورے اعتماد سے کہا: میں نہ کہتا تھا کہ میں خدا کی طرف سے ایسی چیزیں جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے (قال الم اقل لکم انی اعلم من اللہ ما لا تعلمون)۔

اس حیران کن معجزے پر بھائی گہری فکر میں ڈوب گئے۔ ایک لمحے کے لیے اپنا تاریک ماضی اُن کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا خطاء گناہ، اشتباہ اور تنگ نظری سے پُر ماضی۔

لیکن ——— کتنی اچھی بات ہے کہ جب انسان اپنی غلطی کو سمجھے تو فوراً اس کی اصلاح اور تلافی کی فکر کرے فرزندانِ یعقوبؑ بھی اسی فکر میں گم ہو گئے۔ انہوں نے باپ کا دامن پکڑ لیا اور کہا: بابا جان! خدا سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمارے گناہوں اور خطاؤں کو بخش دے" (قالوا یا ابانا استغفر لنا ذنوبنا) "کیونکہ ہم گنہگار اور خطاکار تھے" (انا کنا خاطئین)۔

بزرگوار اور باعظمت بوڑھا جس کا ظرف سمندر کی طرح وسیع تھا اس نے کوئی ملامت و سرزنش کیے بغیر اُن سے وعدہ کیا کہ میں بہت جلد تمہارے لیے اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کروں گا (قال سوف استغفر لکم ربی)۔ اور مجھے امید ہے کہ وہ تمہاری توبہ قبول کرے گا اور تمہارے گناہوں سے صرفِ نظر کرے گا کیونکہ وہ غفور و رحیم ہے" (انہ ھو الغفور الرحیم)۔

چند اہم نکات

۱۔ یعقوبؑ نے پیراہنِ یوسفؑ کی خوشبو کیسے محسوس کی؟ یہ سوال بہت سے مفسرین نے اٹھایا ہے اور اس پر بحث کی ہے۔ عام طور پر مفسرین نے اسے یعقوبؑ یا یوسفؑ کا معجزہ قرار دیا ہے لیکن چونکہ قرآن نے اسے معجزہ یا غیر معجزہ ہونے کے لحاظ سے پیش نہیں کیا اور اس سلسلے میں خاموشی اختیار کی ہے، اس کی سائنسی توجیہ معلوم کی جا سکتی ہے۔

موجودہ زمانے میں "ٹیلی پیتھی" ایک مسلمہ علمی مسئلہ ہے (اس میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ ایک دوسرے سے دور رہنے والے افراد کے درمیان فکری ارتباط اور روحانی رابطہ ہو سکتا ہے۔ اسے "انتقالِ فکر" کہتے ہیں) ایسے افراد جو ایک دوسرے سے نزدیکی تعلق رکھتے ہیں یا جو بہت زیادہ روحانی طاقت رکھتے ہیں یہ تعلق ان کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔ شاید ہم میں سے بہت سے افراد نے اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس کا سامنا کیا ہو کہ بعض اوقات کسی کی والدہ یا بھائی اپنے اندر بلا سبب بہت زیادہ اضطراب اور پریشانی محسوس کرتے ہیں اور زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ خبر پہنچتی ہے کہ اس کے بیٹے یا بھائی کو فلاں دور دراز علاقے میں ایک ناگوار حادثہ پیش آیا ہے۔

ماہرین اس قسم کے احساس کو ٹیلی پیتھی اور دور دراز کے علاقوں سے انتقالِ فکر کا عمل قرار دیتے ہیں۔

حضرت یعقوبؑ کے واقعے میں بھی ممکن ہے کہ آپ کی یوسفؑ سے شدید محبت اور آپ کی روحانی عظمت کے سبب آپ میں وہ احساس پیدا ہو گیا ہو جو یوسفؑ کا کرتہ اٹھاتے وقت بھائیوں میں پیدا ہوا تھا۔

البتہ یہ بات بھی ہر طرح ممکن ہے کہ اس واقعے کا تعلق انبیاء کے دائرہ علم کی وسعت سے ہو۔

بعض روایات میں بھی انتقالِ فکر کے مسئلے کی طرف جاذبِ نظر اور عمدہ اشارہ کیا گیا ہے مثلاً:

کسی نے امام باقرؑ سے عرض کیا: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں بغیر کسی مصیبت یا ناگوار حادثے کے غمگین ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ میرے گھر والے اور میرے دوست بھی اس کے اثرات میرے چہرے پر دیکھ لیتے ہیں۔

امامؑ نے فرمایا: ہاں، خدا نے مومنین کو ایک ہی طینت سے پیدا کیا ہے اور اس کی روح ان میں پھونکی ہے لہٰذا مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں جس وقت کسی ایک شہر میں ان میں سے کسی ایک بھائی کو کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو باقیوں پر اس کا اثر ہوتا ہے۔[1]

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کرتہ کوئی عام کرتہ نہ تھا بلکہ ایک جنتی پیراہن تھا جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی طرف سے خاندانِ یعقوبؑ میں یادگار کے طور پر چلا آ رہا تھا اور جو شخص حضرت یعقوبؑ کی طرح جنتی قوتِ شامہ رکھتا تھا وہ اس کی خوشبو دور سے محسوس کر لیتا تھا۔[2]

۲۔ انبیاء کے حالات میں فرق: یہاں پر ایک اور مشہور اعتراض سامنے آتا ہے۔ فارسی زبان کے اشعار میں بھی یہ اعتراض بیان کیا گیا

---

[1] اصولِ کافی جلد ۲ ص [illegible]۔

[2] ان روایات کے بارے میں مزید آگاہی کے لیے نور الثقلین کی دوسری جلد ص [illegible] کی طرف رجوع کریں۔

ہے۔ کسی نے یعقوبؑ سے کہا:

زمصرش بوی پیراہن شنیدی
چرا در چاہ کنعانش نہ دیدی

یعنی — آپ نے مصر سے پیراہن کی خوشبو سونگھ لی لیکن آپ کو کنعان کے کنویں میں یوسفؑ کیوں دکھائی نہ دیا؟

کیسے ہو سکتا ہے کہ اس عظیم پیغمبرؑ نے اتنے دُور دراز کے علاقے سے یوسفؑ کی قمیص کی خوشبو سونگھ لی جب کہ بعض نے یہ فاصلہ اسی فرسخ لکھا ہے اور بعض نے دس دن کی مسافت بیان کی ہے لیکن اپنے ہی علاقے کنعان کے اندر جب کہ یوسفؑ کو اس کے بھائی کنویں میں پھینک رہے تھے اور ان پر وہ واقعات گزر رہے تھے اس سے یعقوبؑ آگاہ نہ ہوئے؟

قبل ازیں انبیاء اور ائمہ کے علم غیب کی حدود کے بارے میں جو کچھ کہا جا چکا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس سوال کا جواب ہرگز مشکل نہیں رہتا۔ امورِ غیب کے متعلق ان کا علم پروردگار کے ارادے اور عطا کیے ہوئے علم پر منحصر ہے۔ جہاں خدا چاہتا ہے وہ جانتے ہیں چاہے واقعے کا تعلق کسی بہت دُور دراز علاقے سے ہو اور جہاں وہ نہ چاہے نہیں جانتے چاہے معاملہ کسی نزدیک ترین علاقے سے مربوط ہو۔ جیسے کسی تاریک رات میں ایک قافلہ کسی بیابان سے گزر رہا ہو۔ آسمان کو بادلوں نے ڈھانپ رکھا ہو۔ ایک لمحے کے لیے آسمان پر بجلی چمک اُٹھے اور بیابان کی تمام گہرائیاں اور گہرائیاں روشن ہو جائیں اور تمام مسافر ہر طرف سب کچھ دیکھ لیں لیکن دوسرے لمحے وہ بجلی خاموش ہو جائے اور پھر تاریکی ہر طرف چھا جائے اس طرح سے کہ کوئی چیز نظر نہ آئے۔

شاید امام جعفر صادق علیہ السلام سے علم امام کے بارے میں مروی یہ حدیث اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے آپؑ فرماتے ہیں:

جعل اللّٰہ بینہ وبین الامام عمودًا من نور ینظر اللّٰہ بہ الی الامام وینظر الامام بہ الیہ

فاذا اراد علم شیء نظر فی ذلک النور فعرفہ

خدا نے اپنے اور امام و پیشوائے خلق کے درمیان نور کا ایک ستون بنایا ہے۔ اسی سے خدا امام کی طرف دیکھتا ہے اور امام بھی اسی طریق سے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتا ہے اور جب امام کوئی چیز جاننا چاہتا ہے تو نور کے اس ستون میں دیکھتا ہے اور اس سے آگاہ ہو جاتا ہے[1]

ایک شعر جو پہلے ذکر کیا گیا ہے اس کے بعد سعدی کے مشہور اشعار میں ایسی ہی روایات کے پیشِ نظر کہا گیا ہے:

بگفت احوال ما برق جہان است
گہی پیدا و دیگر دم نہان است
گہی بر طارم اعلیٰ نشینیم
گہی تا پشت پای خود نبینیم

یعنی — اس نے کہا ہمارے حالات چمکنے والی بجلی کی طرح ہیں جو کبھی دکھائی دیتی ہے اور کبھی چھپ جاتی ہے۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ از خوئی جلد ۵ صفحہ ۲۰۰۔

کبھی ہم آسمان کی بلندیوں پر بیٹھتے ہیں اور کبھی اپنے پاؤں کے پیچھے بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

"جہان" یہاں "جہندہ" یعنی "چمکنے والی" کے معنی میں ہے اور "برق جہان" کا معنی ہے چمکنے والی آسمانی بجلی۔

اس حقیقت کی طرف توجہ کرتے ہوئے تعجب کا مقام نہیں کہ ایک دن مشیتِ الٰہی کی بناء پر یعقوب کی آزمائش کے لیے وہ اپنے قریب رونما ہونے والے واقعات سے آگاہ نہ ہوں اور کسی دوسرے دن جب کہ دورِ آزمائش ختم ہو چکا تھا اور مشکلات کے دن بیت چکے تھے انہوں نے مصر سے قمیصِ یوسف کی مہک سونگھ لی ہو۔

۳۔ بینائی کیسے لوٹ آئی؟ بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ حضرت یعقوب کی آنکھوں کا نور بالکل ضائع نہیں ہو گیا تھا بلکہ ان کی آنکھیں کمزور ہو گئی تھیں اور بیٹے کی ملاقات کے امکانات پیدا ہوئے تو ان میں ایک ایسا ہیجان پیدا ہوا کہ وہ پہلی حالت پر پلٹ آئیں لیکن آیات کا ظاہر نشاندہی کرتا ہے کہ آپ بالکل نابینا ہو گئے تھے یہاں تک کہ آپ کی آنکھیں سفید ہو چکی تھیں لہٰذا آپ کی بینائی معجزانہ طور پر واپس آئی۔ قرآن کہتا ہے:

فارتد بصیرا

بینائی کی طرف لوٹ آیا۔

۴۔ استغفار کا وعدہ: مندرجہ بالا آیات میں ہے کہ بھائیوں کے اظہارِ ندامت پر حضرت یوسف نے کہا:

یغفر اللہ لکم

خدا تمہیں بخش دے گا۔

لیکن جب انہوں نے حضرت یعقوب کے سامنے اعترافِ گناہ اور اظہارِ ندامت کیا اور استغفار کا تقاضا کیا تو انہوں نے کہا:

میں بعد میں تمہارے لیے استغفار کروں گا۔

جیسا کہ روایات میں آیا ہے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس تقاضا پر شبِ جمعہ وقتِ سحر عمل کریں جو کہ اجابتِ دعا اور توبہ کی قبولیت کے لیے مناسب وقت ہے۔[1]

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یوسف نے انہیں کس طرح قطعی جواب دے دیا جب کہ ان کے باپ نے آئندہ پر چھوڑ دیا؟

ہو سکتا ہے یہ فرق اس بناء پر ہو کہ حضرت یوسف بخشش کے امکان کے بارے میں بات کر رہے ہوں یعنی یہ گناہ قابلِ بخشش ہے لیکن حضرت یعقوب اس کی فعلیت کے بارے میں گفتگو کر رہے ہوں یعنی کیا کیا جائے کہ جس سے بخشش ہو جائے (غور کیجئے گا)۔

۵۔ توسل جائز ہے: مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے استغفار کا تقاضا کرنا نہ صرف یہ کہ عقیدۂ توحید کے منافی نہیں ہے بلکہ لطفِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے ورنہ کیسے ممکن تھا کہ یعقوب کہ جو نبی تھے بیٹوں کا یہ تقاضا قبول کرتے کہ ان کے لیے استغفار کی جائے اور کیسے ممکن تھا کہ ان کے توسل کا مثبت جواب دیتے۔

یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ اولیاء اللہ سے توسل بجا لانا ایک جائز امر ہے اور جو اسے ممنوع اور اصلِ توحید کے خلاف سمجھتے ہیں وہ

---

[1] تفسیر قرطبی میں ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ شبِ جمعہ کہ جو روز عاشورہ کے برابر تھی، ان کے لیے استغفار کریں (تفسیر قرطبی۔ جلد ۶ صفحہ ۳۴۹)

متونِ قرآن سے آگاہی نہیں رکھتے یا پھر غلط تعصبات نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔

۶۔ سیاہ رات چھٹ گئی: مندرجہ بالا آیات ہمیں یہ عظیم درس دیتی ہیں کہ مشکلات و حوادث جتنے بھی سخت اور دردناک ہوں اور ظاہری اسباب وعلل جتنے بھی محدود اور نارسا ہوں اور کامیابی و کشائش میں کتنی ہی تاخیر ہو جائے ان میں سے کوئی چیز بھی لطفِ پروردگار پر امید رکھنے سے مانع نہیں ہو سکتی۔ ہاں یہ وہی خدا ہے جو نابینا آنکھ کو پیراہن کے ذریعے روشن کر دیتا ہے اور پیراہن کی خوشبو دور کے فاصلے سے دیگر علاقوں کی طرف منتقل کر دیتا ہے اور گمشدہ عزیز اور محبوب کو سالہا سال بعد لوٹا دیتا ہے اور جدائی سے مجروح دلوں پر مرہم رکھتا ہے اور جاں کاہ تکالیف کو شفا بخشتا ہے۔

جی ہاں! اس سرگزشت میں توحید اور خدا شناسی کا یہ عظیم درس پوشیدہ ہے کہ کوئی چیز بھی خدا کے ارادے کے سامنے پیچیدہ نہیں ہے

۹۹۔ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰی یُوْسُفَ اٰوٰۤی اِلَیْهِ اَبَوَیْهِ وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ ؕ﴿۹۹﴾

۱۰۰۔ وَ رَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَی الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَ قَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا ؕ وَ قَدْ اَحْسَنَ بِیْۤ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ اِخْوَتِیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۰۰﴾

۱۰۱۔ رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۫ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰۱﴾

ترجمہ

۹۹۔ جس وقت یوسف کے پاس پہنچے تو وہ اپنے ماں باپ سے بغل گیر ہوئے اور کہا: سب کے سب مصر میں داخل ہو جاؤ، انشاء اللہ امن و امان میں رہو گے۔

۱۰۰۔ اور ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور سب کے سب اُس کے لیے سجدے میں گر گئے اور اُس نے کہا: ابا جان! یہ اس خواب کی تعبیر ہے کہ جو پہلے میں نے دیکھا تھا، خدا نے اسے حقیقت میں بدل دیا اور اس نے مجھ سے نیکی کی جب کہ مجھے زندان سے نکالا اور آپ کو اُس بیابان سے (یہاں) لے آیا اور جب کہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان خرابی پیدا کر چکا تھا، اور میرا پروردگار جسے چاہتا ہے اور مناسب دیکھتا ہے) اس کے لیے صاحبِ لطف ہے کیونکہ وہ دانا اور حکیم ہے۔

۱۰۱۔ پروردگارا! تو نے مجھے حکومت کا (عظیم) حصہ بخشا ہے اور تو نے مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم دیا ہے تو آسمانوں اور

زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور تو دنیا و آخرت میں میرا سرپرست ہے، مجھے مسلمان مارنا اور صالحین کے ساتھ ملحق فرمانا۔

تفسیر

یوسفؑ، یعقوبؑ اور بھائیوں کی سرگزشت کا اختتام

عظیم ترین بشارت لیے ہوئے مصر سے قافلہ کنعان پہنچا۔ بوڑھے یعقوبؑ بینا ہو گئے۔ عجب جوش و خروش تھا۔ سالہا سال سے جو گھرانا غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا تھا وہ خوشی اور سرور میں ڈوب گیا۔ ماں سب نعمات الٰہی پر وہ پھولے نہیں سماتے تھے۔ یوسفؑ کی خواہش کے مطابق اس خاندان کو اب مصر کی طرف روانہ ہونا تھا۔ سفر کی تیاری ہر لحاظ سے مکمل ہو گئی۔ یعقوبؑ ایک مرکب پر سوار ہوئے جب کہ ان کے مبارک لبوں پر ذکر و شکرِ خدا جاری تھا اور عشقِ وصال نے انہیں اس طرح سے قوت و توانائی بخشی تھی کہ گویا وہ نئے سرے سے جوان ہو گئے تھے۔

بھائیوں کے گزشتہ سفر تو خوف و پریشانی سے گزرے لیکن ان کے برخلاف یہ سفر ہر قسم کے فکر و اندیشہ سے خالی تھا۔ یہاں تک کہ اگر سفر کی کوئی تکلیف تھی بھی تو اس انتظار میں پنہاں مقصد کے سامنے اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

وصال کعبہ چناں می دواندم بشتاب
کہ خار ہای مغیلاں حریر می آید

کعبۂ مقصود کے وصال نے مجھے اتنا تیز دوڑایا کہ خار مغیلاں ریشم معلوم ہوتے تھے۔

رات اور دن گویا بڑی آہستگی سے گزر رہے تھے کیونکہ اشتیاقِ وصال میں ہر گھڑی ایک دن بلکہ ایک سال معلوم ہو رہی تھی مگر جو کچھ بھی تھا آخر گزر گیا۔ مصر کی آبادیاں دور سے نمایاں ہوئیں۔ مصر کے سرسبز کھیت، آسمان سے باتیں کرنے والے درخت اور خوبصورت عمارتیں دکھائی دینے لگیں۔

لیکن — قرآن اپنی دائمی سیرت کے مطابق ان سب مقدمات کو کہ جو تھوڑے سے غور و فکر سے واضح ہو جاتے ہیں حذف کرتے ہوئے کہتا ہے، جب وہ یوسف کے پاس پہنچے تو یوسف اپنے ماں باپ سے بغل گیر ہوئے (فلما دخلوا علی یوسف اٰوٰی الیہ ابویہ)

"اوی" جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے اصل میں کسی چیز کو دوسری چیز سے منضم کرنے کے معنی میں ہے اور یوسفؑ کا اپنے تئیں اپنے ماں باپ سے منضم کرنا، ان سے بغل گیر ہونے کے لیے کنایہ ہے۔

آخر کار یعقوبؑ کی زندگی کا شیریں ترین لمحہ آ گیا۔ دیدار وصال کا یہ لمحہ فراق کے کئی سالوں بعد آیا تھا۔ خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وصال کے یہ لمحات یعقوبؑ اور یوسفؑ پر کیسے گزرے، ان شیریں لمحات میں ان دونوں کے احساسات و جذبات کیا تھے، عالم شوق میں انہوں نے کتنے آنسو بہائے اور عالم عشق میں کیا نالہ و فریاد ہوا۔

پھر یوسفؑ نے سب سے کہا: سرزمین مصر میں قدم رکھیں کہ انشاء اللہ یہاں آپ بالکل امن و امان میں ہوں گے" کیونکہ مصر یوسفؑ کی حکومت میں امن و امان کا گہوارہ بن چکا تھا (وقال ادخلوا مصر ان شاء اللّٰہ اٰمنین)۔

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسفؑ اپنے ماں باپ کے استقبال کے لیے شہر کے دروازے کے باہر تک آئے تھے اور شاید جملہ "دخلوا علی یوسف" کہ جو دروازے سے باہر سے مربوط ہے، اس طرف اشارہ ہے کہ یوسفؑ نے حکم دیا تھا کہ وہاں خیمے نصب کیے جائیں اور ماں باپ اور بھائیوں کی پہلے پہل وہاں پذیرائی کی جائے۔

جب وہ بارگاہِ یوسفؑ میں پہنچے "تو اس نے اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا" (ورفع ابویہ علی العرش)۔

نعمتِ الٰہی کی اس عظمت اور پروردگار کے لطف کی اس گہرائی اور وسعت نے بھائیوں اور ماں باپ کو اتنا متاثر کیا کہ "وہ سب اس کے سامنے سجدے میں گر گئے" (وخروا لہ سجدًا)۔

اس موقع پر یوسفؑ نے باپ کی طرف رُخ کیا "اور عرض کیا: ابا جان! یہ اسی خواب کی تعبیر ہے جو میں نے بچپن میں دیکھا تھا" (وقال یا ابت ھذا تاویل رءیای من قبل) کیا ایسا ہی نہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ سورج، چاند اور گیارہ ستارے میرے سامنے سجدہ کر رہے ہیں۔ دیکھیے! جیسا کہ آپ نے پیش گوئی کی تھی "خدا نے اس خواب کو واقعیت میں بدل دیا ہے" (قد جعلھا ربی حقًا)۔ "اور پروردگار نے مجھ پر لطف و احسان کیا ہے کہ اس نے مجھے زندان سے نکالا ہے" (وقد احسن بی اذ اخرجنی من السجن)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنی زندگی کی مشکلات میں صرف زندانِ مصر کے بارے میں گفتگو کی ہے لیکن بھائیوں کی وجہ سے کنعان کے کنوئیں کی بات نہیں کی۔

اس کے بعد مزید کہا: خدا نے مجھ پر کس قدر لطف کیا کہ آپ کو کنعان کے اس بیابان سے یہاں لے آیا جب کہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد انگیزی کر چکا تھا (وجاء بکم من البدو من بعد ان نزغ الشیطان بینی وبین اخوتی)۔

یہاں یوسفؑ ایک مرتبہ پھر اپنی وسعتِ قلبی اور عظمت کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ کوتاہی کس شخص نے کی بلکہ سربستہ اور اجمالی طور پر کہتے ہیں کہ شیطان نے اس کام میں دخل اندازی کی اور وہ فساد کا باعث بنا کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بھائیوں کی گزشتہ خطاؤں کا گلہ کریں۔

سرزمین کنعان کو "بدو" یعنی "بیابان" کہنا بھی جاذبِ نظر ہے۔ اس طرح سے مصر اور کنعان کا تمدنی فرق واضح کیا گیا ہے۔

آخر میں یوسفؑ کہتے ہیں: یہ سب نعمات و عنایات خدا کی طرف سے ہیں کیونکہ میرا پروردگار مرکزِ لطف و کرم ہے اور جس امر میں چاہتا ہے لطف کرتا ہے، وہ بندوں کے کاموں کی تدبیر کرتا ہے اور ان کی مشکلات کو آسان کرتا ہے (ان ربی لطیف لما یشاء)۔

وہ جانتا ہے کہ کون حاجت مند ہیں اور کون اہل ہیں کیونکہ "وہ علیم و حکیم ہے" (انہ ھو العلیم الحکیم)۔

اس کے بعد یوسفؑ حقیقی مالک الملک اور دائمی ولیِ نعمت کی طرف رُخ کرتے ہیں اور شکر اور تقاضے کے طور پر کہتے ہیں:

"پروردگارا! تو نے ایک وسیع حکومت کا ایک حصہ مجھے مرحمت فرمایا ہے" (رب قد اٰتیتنی من الملک)۔ "اور تو نے مجھے تعبیرِ خواب کے علم کی تعلیم دی ہے" (وعلمتنی من تاویل الاحادیث) اور اسی علم نے جو بظاہر سادہ اور عام ہے میری زندگی

اور تیرے بندوں کی ایک بڑی جماعت کی زندگی میں کس قسم کا انقلاب پیدا کر دیا ہے اور یہ علم کس قدر پُر برکت ہے۔

"تو وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو ایجاد کیا ہے" (فاطر السموات و الارض) اور اسی بناء پر تمام چیزیں تیری قدرت کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں "پروردگارا! دنیا و آخرت میں تو میرا ولی، ناصر، مددگار اور محافظ ہے" (انت ولیّ فی الدنیا و الاٰخرۃ) "مجھے اس جہان سے مسلمان اور اپنے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے لے جا" (توفنی مسلمًا) "اور مجھے صالحین سے ملحق کر دے" (والحقنی بالصالحین)۔

یعنی — میں تجھ سے ملک کے دوام اور اپنی مادی حکومت اور زندگی کی بقاء کا تقاضا نہیں کرتا کیونکہ یہ تو سب فانی ہیں اور صرف دیکھنے میں دل انگیز ہیں بلکہ میں تجھ سے یہ چاہتا ہوں کہ میری عاقبت اور انجام کار بخیر ہو اور میں تیری راہ میں ایمان و تسلیم کے ساتھ رہوں اور تیرے لیے جان دوں اور صالحین اور تیرے باخلوص دوستوں کی صف میں قرار پاؤں، میرے لیے یہ چیزیں اہم ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا غیر خدا کے لیے سجدہ جائز ہے؟ جیسا کہ ہم پہلی جلد[1] میں فرشتوں کے آدم کو سجدہ کرنے کی بحث میں کہہ چکے ہیں کہ پرستش و عبادت کے معنی میں سجدہ خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور کسی مذہب میں کسی شخص کے لیے پرستش جائز نہیں ہے اور توحید عبادت جو مسئلہ توحید کا اہم حصہ ہے اور جس کی تمام پیغمبروں نے دعوت دی ہے، کا یہی مفہوم ہے۔

لہٰذا یوسفؑ جو کہ خدا کے پیغمبر تھے نہ وہ اس کی اجازت دے سکتے تھے کہ انہیں سجدہ کیا جائے اور ان کی عبادت کی جائے اور نہ ہی یعقوبؑ جیسے عظیم پیغمبر ایسا کام کر سکتے تھے اور نہ ہی قرآن اسے ایک اچھے یا کم از کم جائز و مباح کام کے طور پر یاد کر سکتا تھا۔

اس بناء پر مذکورہ سجدہ یا خدا کے لیے "سجدہ شکر" کے طور پر تھا — اسی خدا کے لیے سجدہ شکر جس نے یہ تمام عنایات و نعمات اور مقام عظیم یوسفؑ کو دیا تھا اور جس نے خاندانِ یعقوبؑ کی مشکلوں اور مصیبتوں کو دُور کیا تھا۔ اس صورت میں اگرچہ یہ سجدہ خدا کے لیے تھا لیکن چونکہ یوسفؑ کو عطا کی گئی نعمت کی عظمت کے لیے تھا خود یوسفؑ کا احترام بھی اس سے ظاہر ہوتا تھا اور اس لحاظ سے "لہ" کی ضمیر جو مسلماً یوسفؑ کی طرف لوٹتی ہے اس معنی کے ساتھ پوری طرح مناسب ہوگی۔

یا یہ کہ یہاں "سجدہ" کا وسیع مفہوم مراد ہے یعنی خضوع اور انکساری کیونکہ سجدہ ہمیشہ اپنے مشہور معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ ہر قسم کی انکساری اور تواضع کے معنی میں بھی کبھی کبھی استعمال ہو جاتا ہے لہٰذا بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس زمانے میں خم ہو کر انکساری اور تواضع کا اظہار کرتے تھے اور تعظیم و احترام بجا لانے کا یہ طریقہ رائج تھا۔ ان مفسرین کے نزدیک مندرجہ بالا آیت میں "سجداً" سے یہی مراد ہے لیکن "خروا" کا مفہوم ہے "زمین پر گرنا" اس لفظ کی طرف توجہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سجدہ خم ہونے اور سر جھکانے کے معنی میں نہیں تھا۔

بعض دیگر عظیم مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت یعقوبؑ، بھائیوں اور ان کی والدہ کا سجدہ خدا کے لیے تھا لیکن یوسفؑ خانہ کعبہ

---

[1] جلد اول صفحہ ۱۶۱ (اردو ترجمہ)

کی طرح ان کے قبلہ تھے۔ اسی لیے عربوں کی تعبیرات میں بعض اوقات کہا جاتا ہے:

فلان صلی للقبلہ۔

یعنی — فلاں شخص نے قبلہ کی طرف نماز پڑھی ہے[1]

البتہ پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے بالخصوص جب کہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے اس سلسلے میں متعدد روایات بھی موجود ہیں۔ فرمایا:

کان سجودھم للہ

یعنی — ان کا سجدہ خدا کے لیے تھا۔

یہ بھی الفاظ ہیں:

کان سجودھم عبادۃ للہ

ان کا سجدہ اللہ کی عبادت کے طور پر تھا[2]

نیز کچھ اور احادیث میں ہے:

کان طاعۃ للہ و تحیۃ لیوسف

یہ سجدہ اللہ کی اطاعت کے عنوان سے اور یوسف کے احترام کے لیے تھا[3]

جیسا کہ حضرت آدمؑ کے واقعہ میں بھی سجدہ اس خدائے بزرگ و برتر کے لیے تھا کہ جس نے ایسی بدیع اور عجیب و غریب خلق پیدا کی تھی۔ وہ سجدہ عبادت خدا کے ساتھ ساتھ حضرت آدمؑ کے احترام اور عظمت و مقام کی دلیل بھی تھا۔ یہ بالکل اس طرح ہے کہ ایک شخص کوئی بہت ہی اچھا اور اہم کام انجام دیتا ہے اور ہم اس کام کی بناء پر خدا کے لیے سجدہ کریں کہ جس نے ایسا بندہ پیدا کیا ہے تو یہ سجدہ خدا کے لیے بھی ہے اور اس شخص کے احترام کے لیے بھی۔

۲۔ شیطانی وسوسے: جملہ "نزغ الشیطٰن بینی و بین اخوتی" میں لفظ "نزغ" کسی کام میں فساد و افساد کے ارادے سے داخل ہونے کے معنی میں ہے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ایسے معاملات میں شیطانی وسوسے ہمیشہ بہت اثر رکھتے ہیں۔ لیکن ہم اس سے پہلے بھی کہہ چکے ہیں صرف اس قسم کے وسوسوں سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اصل فیصلہ اور آخری مصمم ارادہ خود انسان کو کرنا ہوتا ہے بلکہ وہی اپنے دل کا دریچہ شیطان کے لیے کھولتا ہے اور اسے اندر داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے لہٰذا مندرجہ بالا آیت سے اختیار و ارادہ کی آزادی کے برخلاف کوئی مفہوم نہیں نکلتا۔

البتہ حضرت یوسفؑ اپنی عظمت و بزرگواری، وسعت ظرف اور کشادہ دلی کی وجہ سے نہیں چاہتے تھے کہ بھائیوں کو اس معاملے

---

[1] تفسیر المیزان و تفسیر فخر رازی — زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۴۷۵۔

[3] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۴۷۵۔

میں زیادہ شرمندہ کریں کہ جو خود ہی بہت شرمندہ تھے۔ اس لیے آخری ارادہ کرنے والے کی طرف اشارہ نہیں کیا اور صرف شیطانی وسوسوں کا ذکر کیا ہے جو کہ دوسرے درجے کے حامل ہیں۔

۳۔ **امن و امان ــــ خدا کی عظیم نعمت:** حضرت یوسفؑ نے مصر کی تمام تر نعمات میں سے صرف امن و امان کا ذکر کیا ہے اور ماں باپ اور بھائیوں سے کہا کہ مصر میں داخل ہو جاؤ انشاء اللہ امن و امان میں رہو گے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ امن و امان کی نعمت تمام نعمتوں کی جڑ ہے اور حقیقت میں ایسا ہی ہے کیونکہ جب امن و امان ختم ہو جائے تو تمام رفاہی امور اور مادی و روحانی نعمتیں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ بے امنی کے ماحول میں نہ اطاعتِ خدا مقدور رہتی ہے اور نہ زندگی میں سربلندی اور آسودگیٔ فکر باقی رہتی ہے اور نہ ہی سعی و کوشش اور اجتماعی مقاصد کی پیش رفت کے لیے جہاد ہو سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے یہ جملہ ضمناً اس نکتے کی طرف اشارہ ہو کہ یوسفؑ چاہتے ہیں کہ یہ بتائیں کہ مصر میری حکومت و سلطنت میں کل کے فراعنہ کی سی سرزمین نہیں ہے۔ وہ خود غرضیاں، خود پرستیاں، مظالم، لوٹ مار، گھٹن اور شکنجے سب کے سب ختم ہو گئے ہیں۔ ایک مکمل امن و امان کا ماحول ہے۔

۴۔ **مقام علم کی اہمیت:** حضرت یوسفؑ آخر میں ایک مرتبہ پھر علم تعبیر خواب کا ذکر کرتے ہیں اور اس عظیم اور بغیر نزاع کے حکومت کی بنیاد اس ظاہراً آسان اور سادہ علم کو قرار دیتے ہیں۔ یہ امر دراصل علم و دانش کی اہمیت و تاثیر پر زیادہ سے زیادہ تاکید کرنے کے لیے ہے۔ چاہے وہ علم سادہ اور عام قسم کا ہی کیوں نہ ہو ــــ لہٰذا کہتے ہیں:

رب قد اٰتیتنی من الملک وعلمتنی من تأویل الاحادیث

۵۔ **اختتام بخیر:** ہو سکتا ہے انسان کی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آئیں لیکن مسلّم ہے کہ اس کی زندگی کے آخری لمحات اس کی ساری زندگی اور سرنوشت سے زیادہ اصلاحی اور تعمیری ہیں کیونکہ عمر کا دفتر ان کے ساتھ بند ہو جاتا ہے اور آخری فیصلہ زندگی کے انہی آخری صفحات سے وابستہ ہے۔ اسی لیے صاحبِ ایمان اور بیدار لوگ ہمیشہ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ان کی عمر کے یہ لمحے نورانی اور درخشاں ہوں۔ یوسفؑ بھی اس مقام پر خدا سے یہی چاہتے ہیں اور کہتے ہیں:

توفنی مسلمًا والحقنی بالصالحین

مجھے دنیا سے ایمان کے ساتھ لے جا اور میرا شمار صالحین کے زمرے میں کر۔

یہ گفتگو خدا سے موت کا تقاضا کرنے کے لیے نہیں جیسا کہ ابن عباس نے گمان کیا ہے اور کہا ہے:

یوسف کے سوا کسی پیغمبر نے خدا سے موت کا تقاضا نہیں کیا۔ ان کے پاس اپنی حکومت کے تمام اسباب و وسائل موجود تھے لیکن ان کی روح میں عشقِ الٰہی کا شعلہ بھڑک اٹھا اور انہوں نے لقائے الٰہی کی آرزو کی۔

لیکن ــــ یوسف کا تقاضا شرائط اور حالات کا تقاضا تھا یعنی انہوں نے یہ تقاضا کیا تھا کہ موت کے وقت وہ ایمان و اسلام کے حامل ہوں جیسا کہ ابراہیمؑ اور یعقوبؑ نے بھی اپنی اولاد کو یہ وصیت کی تھی۔

فلا تموتن الا وانتم مسلمون

میرے بچو! کوشش کرو کہ دنیا سے جاتے وقت ما ایمان اور فرمانِ خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہو (بقرہ ــ ۱۳۲)۔

بہت سے مفسرین نے بھی یہی معنی انتخاب کیا ہے۔

۶۔ کیا یوسفؑ کی والدہ مصر آئی تھیں ؟ مندرجہ بالا آیات کے ظاہری معنی سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کی والدہ اس وقت زندہ و سلامت تھیں اور وہ اپنے شوہر اور بیٹوں کے ساتھ مصر آئی تھیں اور اس نعمت کے شکرانے کے طور پر انہوں نے بھی سجدہ کیا تھا لیکن بعض مفسرین کا اصرار ہے کہ ان کی والدہ "راحیل" فوت ہو چکی تھیں اور یہ حضرت یوسفؑ کی خالہ تھیں جو مصر آئی تھیں اور وہ ماں کی جگہ شمار ہوتی تھیں

موجودہ تورات کے سفر تکوین کی فصل ۳۵ اور جملہ ۱۸ میں ہے :

بنیامین کے پیدا ہونے کے بعد راحیل فوت ہو گئیں۔

بعض روایات جو وہب بن منبہ اور کعب الاحبار سے نقل ہوئی ہیں ان میں بھی یہی بات مذکور ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے انہوں نے یہ بات تورات سے لی ہے۔

بہر حال ہم قرآن کے ظاہری مفہوم سے بغیر کسی یقینی مدرک کے آنکھیں بند کر کے اس کی توجیہ و تاویل نہیں کر سکتے اور ظاہر قرآن یہی ہے کہ اس وقت یوسفؑ کی ماں زندہ تھیں۔

۷۔ باپ کو سرگزشت نہ سنانا : امام صادق علیہ السلام سے مروی ایک روایت میں ہے :

جس وقت یعقوبؑ یوسفؑ سے ملاقات کے لیے پہنچے تو ان سے کہا : میرے بیٹے میرا دل چاہتا ہے کہ میں پوری تفصیل جانوں کہ بھائیوں نے تم سے کیا سلوک کیا۔

حضرت یوسفؑ نے باپ سے تقاضا کیا کہ وہ اس معاملے کو جانے دیں لیکن یعقوبؑ نے انہیں قسم دے کر کہا کہ بیان کریں۔

یوسفؑ نے واقعات کا کچھ حصہ بیان کیا ، یہاں تک کہ بتایا : بھائیوں نے مجھے پکڑ لیا اور کنوئیں میں بٹھایا ، مجھے حکم دیا کہ کرتا اتار دوں تو میں نے ان سے کہا : میں تمہیں اپنے باپ یعقوبؑ کے احترام کی قسم دیتا ہوں کہ میرے بدن سے کرتا نہ اتارو اور مجھے برہنہ نہ کرو۔ ان میں سے ایک کے پاس چھری تھی اس نے وہ چھری نکالی اور چلا کر کہا ، کرتا اتارو۔

یہ جملہ سنتے ہی یعقوبؑ کی طاقت جواب دے گئی ، انہوں نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو بیٹے سے چاہا کہ اپنی بات جاری رکھے لیکن یوسفؑ نے کہا : آپ کو ابراہیمؑ ، اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کے خدا کی قسم مجھے اس کام سے معاف رکھیں۔

جب یعقوبؑ نے یہ جملہ سنا تو اس معاملے سے صرف نظر کر لیا[1]

یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ یوسفؑ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ماضی کے تلخ واقعات اپنے دل میں لائیں یا باپ کے سامنے انہیں دہرائیں اگر چہ حضرت یعقوبؑ کی جستجو کی حس انہیں مجبور کرتی تھی۔

❖

---

[1] مجمع البیان جلد ۵ صفحہ ۲۶۱۔

۱۰۲۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۝

۱۰۳۔ وَمَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝

۱۰۴۔ وَمَا تَسْئَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

۱۰۵۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝

۱۰۶۔ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ۝

۱۰۷۔ اَفَاَمِنُوْۤا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۰۲۔ یہ غیب کی خبروں میں سے ہے کہ جس کی ہم تجھے وحی کرتے ہیں تو (ہرگز) ان کے پاس نہیں تھا جب انہوں نے مصمم ارادہ کیا اور جب وہ منصوبہ بنا رہے تھے۔

۱۰۳۔ اور اگرچہ تو اصرار کرے زیادہ تر لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔

۱۰۴۔ اور تو اس پر (ہرگز) ان سے اجرت کا مطالبہ نہیں کرتا، یہ نہیں ہے مگر یہ کہ عالمین کے لیے یاد دہانی۔

۱۰۵۔ اور (خدا کی)، بہت سی نشانیاں آسمانوں اور زمین میں موجود ہیں کہ وہ جن کے پاس سے گزرتے ہیں اور ان سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

۱۰۶۔ اور ان میں کہ جو خدا پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اکثر مشرک ہیں۔

۱۰۷۔ کیا وہ اس سے مامون ہیں کہ خدا کی طرف سے گھیرنے والا عذاب ان پر آجائے یا قیامت کی گھڑی اچانک

ان پر آجائے جب کہ وہ متوجہ نہ ہوں۔

تفسیر

یہ دعویدار عام طور پر مشرک ہیں

حضرت یوسفؑ کا واقعہ تمام ہوا۔ اس میں عبرت اور اصلاح کے بہت سے درس موجود ہیں۔ اس میں گرانبہا قیمتی اور ثمر بخش نکات موجود ہیں اور یہ تاریخی واقعہ ہر قسم کی خرافات اور خرافات سے پاک کر کے بیان کر دیا گیا ہے۔ اب قرآن روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف کرتے ہوئے کہتا ہے: یہ غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم تیری طرف وحی کر رہے ہیں (ذلک من انباء الغیب نوحیہ الیک) تو بھی تو ان کے پاس نہیں تھا جب کہ وہ عزم اور ارادہ کر رہے تھے اور منصوبہ بنا رہے تھے (وما کنت لدیھم اذ اجمعوا امرھم وھم یمکرون) ان باریکیوں اور تفصیلات کو صرف خدا جانتا ہے یا وہ شخص جو اس موقع پر موجود تھا اور چونکہ تو وہاں موجود نہیں تھا لہٰذا صرف وحی الٰہی ہے جو ایسی خبریں تجھ تک پہنچاتی ہے۔

یہاں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کا واقعہ اگرچہ تورات میں آیا ہے اور قافلہ حجاز والے اس کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات رکھتے تھے پھر بھی پوری تفصیلات کے ساتھ تمام واقعہ حتی کہ جو کچھ خصوصی مجالس میں ہوا تھا لوگوں کو اس طرح سے معلوم نہیں تھا کہ جس میں کوئی اضافہ نہ کیا گیا ہو اور خرافات شامل نہ کی گئی ہوں۔

ان حالات میں لوگوں کو چاہیے کہ ان سب نشانیوں کو دیکھنے کے بعد اور ان خدائی نصیحتوں کو سننے کے بعد ایمان لے آئیں اور غلط راستے سے پلٹ آئیں مگر اے پیغمبر! اگرچہ تو اس پر اصرار کرے کہ یہ ایمان لے آئیں ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائیں گے (وما اکثر الناس ولو حرصت بمؤمنین)۔

لفظ "حرص" لوگوں کے ایمان لانے کے لیے پیغمبر کے شدید لگاؤ اور شوق کی دلیل ہے لیکن صرف آپ کا شوق اور حرص کافی نہ تھا۔ زمینوں اور ظرفوں کی قابلیت بھی شرط تھی۔

یعقوبؑ کے بیٹے کہ جو وحی و نبوت کے ماحول میں پلے بڑھے تھے جب وہ ہوا و ہوس میں گرفتار ہو سکتے ہیں یہاں تک کہ اپنے بھائی کو نابود کرنے پر تل سکتے ہیں تو پھر دوسروں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ہوا و ہوس کے دیو اور شہوت کے بھوت پر غالب آجائیں اور سب کے سب ایک ہی دفعہ پوری طرح خدا کی طرف رخ کریں۔

یہ جملہ ضمنی طور پر پیغمبرؐ کی ایک طرح سے تسلی اور دلجوئی کے لیے ہے کہ وہ لوگوں کے کفر وگناہ پر اصرار سے ہرگز مایوس نہ ہو جائیں اور اس راہ میں ہم سفروں کی کمی سے ملول خاطر نہ ہوں، جیسا کہ قرآن کی دیگر آیات میں بھی ہے مثلاً:

فلعلک باخع نفسک علیٰ اٰثارھم ان لم یؤمنوا بھٰذا الحدیث اسفا

اے پیغمبر! گویا تو چاہتا ہے کہ قرآن پر ان کے ایمان نہ لانے پر شدت تاسف سے اپنی جان گنوا بیٹھے (کہف۔ ۶)

قرآن مزید کہتا ہے کہ دراصل تیری دعوت کو قبول نہ کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی عذر و بہانہ نہیں ہے کیونکہ علاوہ اس کے کہ اس میں حق کی نشانیاں واضح ہیں "تو نے اس کے بدلے ان سے ہرگز کوئی اجر اور معاوضہ نہیں چاہی" کہ جسے وہ مخالفت کا بہانہ بنا سکیں (وما تسئلهم عليه من اجر)۔

"یہ ایک عمومی دعوت ہے اور سب جہانوں کے لیے اور عالمین کے لیے ایک یاددہانی ہے" اور یہ عام و خاص تمام انسانوں کے لیے بچھایا گیا ایک دسترخوان ہے (ان هو الا ذكر للعالمين)۔

وہ دراصل اس لیے گمراہ ہوئے کہ ان کے پاس کھلی اور بینا آنکھ اور سننے والے کان نہیں ہیں لہٰذا "آسمان و زمین میں بہت سی خدائی آیات ہیں کہ وہ جن کے قریب سے گزر جاتے ہیں اور ان سے منہ پھیر لیتے ہیں" (وكاين من اية في السموات والارض يمرون عليها وهم عنها معرضون)۔

یہی حوادث کہ جنہیں ہر روز وہ اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ صبح کے وقت آفتاب افق مشرق سے سر نکالتا ہے۔ اس کی سنہری کرنیں پہاڑوں، دروں، صحراؤں اور دریاؤں پر پڑتی ہیں اور شام کے وقت افق مغرب میں ڈوب جاتا ہے اور رات کی گہری سیاہ چادر ہر جگہ کو ڈھانپ دیتی ہے۔

عجیب و غریب نظام کے یہ اسرار، یہ طلوع و غروب، سبزوں، پرندوں، حشرات اور انسانوں میں زندگی کا یہ شور و غوغا، یہ ندیوں کا زمزمہ، نسیم سحری کا یہ جھاڑ اور یہ سب عجیب و دلنشین نقش کہ جو وجود کے در و دیوار پر ہیں۔۔۔ اس قدر آشکار ہیں کہ جو کوئی ان میں اور ان کے خالق میں غور و فکر نہ کرے وہ ایسے ہی ہے جیسے دیوار پر کوئی نشان تھا۔

بہت سے چھوٹے چھوٹے امور ہیں جو بظاہر کوئی اہمیت نہیں رکھتے، جن کے قریب سے ہم بے اعتنائی سے گزر جاتے ہیں لیکن اچانک گہرائی تک پہنچنے والا ماہر پیدا ہوتا ہے جو کئی ماہ اور سالوں کے مطالعہ کے بعد عجیب و غریب اسرار معلوم کرتا ہے کہ جن سے دنیا کے منہ مارے تعجب کے کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں۔

اصولی طور پر اہم بات یہ ہے کہ ہم جانیں کہ اس عالم میں کوئی چیز معمولی اور بے اہمیت نہیں ہے کیونکہ ہر چیز خدا کی مصنوع و مخلوق ہے۔۔۔ وہ خدا کہ جس کا علم لامتناہی اور جس کی حکمت بے پایاں ہے۔ بے وقعت وہ لوگ ہیں جو اس عالم کو بے اہمیت اور سرسری سی چیز سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اگر وہ ان آیات قرآن پر کہ جو تجھ پر نازل ہوتی ہیں ایمان نہیں لاتے تو اس پر تعجب نہ کر کیونکہ وہ آیات خلقت پر بھی ایمان نہیں لائے کہ جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: وہ جو ایمان لے آتے ہیں ان میں سے بھی اکثر کا ایمان خالص نہیں ہے بلکہ اس میں شرک کی آمیزش ہے (وما يؤمن اكثرهم بالله الا وهم مشركون)۔ ہو سکتا ہے وہ خود یہ سمجھتے ہوں کہ وہ خالص مومن ہیں لیکن شرک کی رگیں عموماً ان کے افکار، گفتار اور کردار میں موجود ہوتی ہیں۔

ایمان صرف یہ نہیں ہے کہ انسان وجود خدا کا اعتقاد رکھتا ہو بلکہ ایک خالص موحد وہ ہے جس کے قلب و جان میں خدا کے علاوہ کسی شکل میں کوئی معبود نہ ہو۔ اس کی گفتار خدا کے لیے، اس کے اعمال خدا کے لیے اور اس کا ہر کام اسی کے لیے انجام پائے۔ خدا کے قانون کے علاوہ وہ کسی قانون کو قبول نہ کرے اور اس کے غیر کی بندگی کا طوق اپنی گردن میں نہ ڈالے اور خدائی فرامین کو دل و

جان سے قبول کرے چاہے وہ اس کے میلان کے مطابق ہوں یا ضد ہوں۔ خدا اور ہوائے نفس کے انتخاب کے دوراہے پر ہمیشہ خدا کو مقدم شمار کرے یہ ہے ہر قسم کے شرک سے پاک ایمان۔ عقیدے کا شرک، گفتار کا شرک اور عمل کا شرک۔ اگر ہم واقعاً جواہر کے بارے میں باریک بینی سے کام لیں تو دیکھیں گے کہ پے، خالص اور حقیقی موحد بہت کم ہیں۔

اسی بناء پر اسلامی روایات میں ہے کہ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

الشرك اخفى من دبيب النمل

انسانی اعمال میں شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ہے[1]

یہ بھی روایت ہے:

ان اخوف ما اخاف عليكم الشرك الاصغر قالوا وما الشرك الاصغر يارسول الله؟ قال الرياء، يقول الله تعالى يوم القيامة اذا جاء الناس باعمالهم اذهبوا الى الذين كنتم تراؤن في الدنيا، فانظروا هل تجدون عندهم من جزاء؟!

رسول اللہ نے فرمایا:

خطرناک ترین چیز کہ جس کا مجھے تم سے خوف ہے شرکِ اصغر ہے۔

اصحاب نے پوچھا:

یارسول اللہ، شرک اصغر کیا ہے؟

فرمایا:

ریاکاری، قیامت کے دن جب لوگ اپنے اعمال کے ساتھ بارگاہِ خدا میں حاضر ہوں گے تو پروردگار انہیں کہ جو دنیا میں ریا کرتے تھے، فرمائے گا: ان کے پاس جاؤ کہ جن کے لیے تم ریا کرتے تھے اور دیکھو کہ ان کے ہاں سے تمہیں کوئی اجر ملتا ہے؟[2]

امام محمد باقر علیہ السلام سے مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

شرك طاعة وليس شرك عبادة والمعاصي التي ترتكبون وهي شرك طاعة اطاعوا فيها الشيطان فاشركوا بالله في الطاعة لغيره

اس آیت سے مراد اطاعت میں شرک کرنا ہے نہ کہ عبادت میں شرک کرنا اور جن گناہوں کے لوگ مرتکب ہوتے ہیں وہ شرکِ اطاعت ہے کیونکہ اس میں وہ شیطان کی اطاعت کرتے ہیں اور اس عمل کی بناء پر خدا کے لیے اطاعت میں شریک کے قائل ہوتے ہیں[3]

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ [illegible]

[2] تفسیر فی ظلال جلد ۵ صفحہ [illegible]

[3] نور الثقلین جلد ۲ صفحہ [illegible] و اصول کافی جلد ۲ صفحہ [illegible]

بعض دوسری روایات میں ہے کہ مراد "شرکِ نعمت" ہے۔ اس معنی میں کہ کوئی نعمت خدا کی طرف سے انسان کو پہنچے اور وہ کہے کہ یہ نعمت فلاں شخص کی طرف سے مجھے پہنچی ہے، اگر وہ نہ ہوتا تو میں مرجاتا یا میری زندگی تباہ ہو جاتی اور میں بے چارہ رہ جاتا[1]

یہاں غیرِ خدا کو روزی اور نعمات بخشنے میں خدا کا شریک شمار کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مندرجہ بالا آیت میں شرک سے مراد کفر، انکارِ خدا اور ظاہری طور پر بت پرستی کرنا نہیں ہے۔ جیسا کہ امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

شرك لا يبلغ به الكفر

ایسا شرک جو کفر کے درجے تک نہ پہنچے۔

البتہ وسیع مفہوم کے لحاظ سے شرک میں یہ تمام امور شامل ہیں۔

زیرِ بحث آخری آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو ایمان نہیں لائے، جو خدا کی واضح آیات کے قریب سے بے خبر گزر جاتے ہیں اور جو اپنے اعمال میں مشرک ہیں خدا تعالیٰ انہیں خبردار کرتے ہوئے کہتا ہے: کیا یہ لوگ اپنے آپ کو اس امر سے مامون سمجھتے ہیں کہ اچانک اور بغیر کسی تمہید کے انہیں عذابِ الٰہی آگھیرے، احاطہ کرنے والا ایسا عذاب کہ جو ان سب کو آگھیرے (أفأمنوا ان تأتيهم غاشية من عذاب الله) اور یا یہ کہ ناگہاں قیامت آپہنچے اور عظیم خدائی عدالت لگ جائے اور ان کا حساب کتاب شروع ہو جائے جب کہ وہ بے خبر اور غافل ہوں (او تأتيهم الساعة بغتة وهم لا يشعرون)۔

"غاشیہ" ڈھانپنے والی چیز اور ڈھکنے کے معنی میں ہے۔ دیگر چیزوں کے علاوہ گھوڑے کی زین پر ڈالے جانے والے بڑے کپڑے کو بھی غاشیۃ کہتے ہیں جو اسے ڈھانپ دیتا ہے یہاں پر اس سے مراد وہ سزا ہے جو تمام بدکاروں کو گھیر لے گی[2]

"ساعۃ" سے مراد قیامت ہے جیسا کہ بہت سی دوسری قرآنی آیات میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔ البتہ یہ احتمال بھی ہے کہ "ساعۃ" ہولناک حوادث کے لیے کنایہ ہو کیونکہ قرآنی آیات بار بار کہتی ہیں کہ قیامت کے دن کا آغاز بہت زیادہ ہولناک حوادث کے ایک سلسلے سے ہوگا۔ مثلاً زلزلے، طوفان اور بجلیاں یا موت کی گھڑی کی طرف اشارہ ہے۔

پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۴۷۹۔

[2] "غاشیۃ" یہاں اس لیے مؤنث ہے کہ یہ لفظ "عقوبۃ" کی صفت ہے کہ جو مقدر ہے۔

۱۰۸۔ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○

۱۰۹۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

۱۱۰۔ حَتّٰٓي اِذَا اسْتَيْــــَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ○

۱۱۱۔ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۭ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ ع

ترجمہ

۱۰۸۔ کہہ دو: یہ میرا راستہ ہے کہ میں اور میرے پیروکار پوری بصیرت سے لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ خدا منزہ ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

۱۰۹۔ اور ہم نے تجھ سے پہلے نہیں بھیجا مگر شہر والوں میں سے ان مردوں کو کہ جن کی طرف ہم نے وحی کی ہے۔ کیا (تیری دعوت کے مخالفین نے) زمین میں سیر نہیں کی کہ وہ دیکھیں کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا کیا انجام ہوا اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لیے بہتر ہے کیا تم عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔

۱۱۰۔ (انبیاء نے اپنی دعوت اور دشمنوں نے اپنی مخالفت اسی طرح جاری رکھی) یہاں تک کہ پیغمبر مایوس ہو گئے اور انہوں نے گمان کیا کہ (حتّٰی مومنین کے چھوٹے سے گروہ نے بھی) ان سے جھوٹ بولا تو اس موقع پر ہماری مدد ان کے پاس آئی۔ ہم جس شخص کو چاہتے ہیں نجات دیتے ہیں اور زیاں کار قوم کے لیے ہماری سزا اور عذاب کو پلٹایا نہیں جا سکتا۔

۱۱۱۔ ان کی سرگزشتوں میں صاحبانِ فکر کے لیے درسِ عبرت ہے۔ یہ واقعات جھوٹی بات نہیں تھے بلکہ (یہ آسمانی وحی ہے اور) اس (گزشتہ آسمانی کتب) سے ہم آہنگ ہیں جو اس کے سامنے ہیں اور ہر چیز (کہ جو سعادت انسانی کی بنیاد ہے) کی تشریح اور ہدایت و رحمت ہے ایسے گروہ کے لیے کہ جو ایمان لایا ہے۔

تفسیر

عبرت کے زندہ درس

زیرِ نظر پہلی آیت میں پیغمبرِ اسلامؐ سے اپنے آئین، دین، روش اور خط کو مشخص کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے، کہہ دو: میری راہ اور طریقہ یہ ہے کہ سب کو اللہ کی طرف (کہ جو ایک اکیلا خدا ہے) دعوت دوں (قل ھٰذہ سبیلی ادعوا الی اللّٰہ)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: میں نے یہ راستہ بے خبری میں یا تقلیداً اختیار نہیں کیا بلکہ میں خود اور میرے پیروکار دنیا کے سب لوگوں کو اس راستے کی طرف آگاہی اور بصیرت سے بلاتے ہیں (علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی)۔

یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ کا پیروکار ہر مسلمان اپنے مقام پر حق کی طرف بلانے والا ہے اور اسے چاہیے کہ اپنی گفتار اور کردار سے دوسروں کو راہِ خدا کی طرف دعوت دے۔ نیز یہ جملہ یہ بھی نشاندہی کرتا ہے کہ رہبر کو کافی بصیرت، بینائی اور آگاہی کا حامل ہونا چاہیے ورنہ اس کی دعوت حق کی طرف نہیں ہوگی۔

اس کے بعد بطور تاکید کہا گیا ہے: خدا — یعنی وہ ذات جس کی طرف میں دعوت دیتا ہوں — ہر قسم کے عیب، نقص، شبیہ اور شریک سے پاک اور منزہ ہے (وسبحان اللّٰہ)۔

مزید تاکید کے لیے ارشاد ہوتا ہے: "میں مشرکین میں سے نہیں ہوں" اور میں اس کے لیے کسی قسم کے شبیہ و شریک کا قائل نہیں ہوں (وما انا من المشرکین)۔

واقعاً ایک سچے رہبر کی ذمہ داریوں میں سے ہے کہ صراحت سے اپنے پروگراموں اور اہداف کا اعلان کرے اور وہ خود اور اس کے پیروکار بھی ایک مشخص اور واضح پروگرام کی پیروی کریں۔ نہ یہ کہ اس کا ہدف، روش اور طریقہ ابہام میں ہو یا یہ کہ ہر ایک الگ الگ

راہ پر چل رہا ہو۔ اصولی طور پر سچے رہبروں کو جھوٹے رہبروں سے جدا پہچاننے کو یہی ایک راستہ ہے کہ یہ صراحت سے گفتگو کرتے ہیں اور ان کا راستہ واضح ہوتا ہے جب کہ جھوٹے رہبر اپنے کاموں کو چھپائے رکھتے ہیں اور ہمیشہ مبہم اور پہلو دار باتیں کرتے ہیں۔

حضرت یوسفؑ سے متعلق آیات کے بعد اس آیت کا آنا اس طرف اشارہ ہے کہ میری راہ و رسم خدا کے عظیم پیغمبر حضرت یوسفؑ کی راہ و رسم سے جدا نہیں ہے۔ وہ بھی ہمیشہ یہاں تک کہ گوشۂ زندان میں بیٹھ کر بھی خدائے واحد و قہار کی طرف دعوت دیتے تھے اور اس کے اغیار کو اسماء بے مسمٰی شمار کرتے تھے کہ جو تقلید آباؤں کے ایک گروہ سے دوسرے تک پہنچے تھے ـــــ جی ہاں! میری روش اور تمام انبیاء کی روش یہی ہے۔

گمراہ اور نادان قوموں کی طرف سے انبیاء پر ہمیشہ یہ اعتراض ہوتا تھا کہ وہ انسان کیوں ہیں، یہ ذمہ داری فرشتے کے کندھے پر کیوں نہیں رکھی گئی؟ طبعاً زمانۂ جاہلیت کے لوگ بھی پیغمبر اسلامؐ پر ان کی عظیم دعوت کے جواب میں یہی اعتراض کرتے تھے لہٰذا قرآن مجید ایک مرتبہ پھر اس اعتراض کا جواب دیتا ہے، ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجے مگر یہ کہ وہ مرد تھے کہ جن کی طرف وحی نازل ہوتی تھی، ایسے مرد کہ جو آباد شہروں اور عوامی مراکز سے اٹھتے تھے (وما ارسلنا من قبلك الا رجالا نوحى اليهم من اهل القرٰى)۔

وہ بھی انہی شہروں اور آبادیوں میں دوسرے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے اور لوگوں سے میل جول رکھتے تھے۔ ان کی مصیبتوں، تکلیفوں، ضرورتوں اور مشکلوں سے اچھی طرح آگاہ تھے۔

آیت میں لفظ "من اهل القرٰى" آیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ عربی زبان میں لفظ "قریۃ" ہر قسم کے شہر اور آبادی کو کہا جاتا ہے اور یہ لفظ "بدو" کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے جس کا معنی ہے بیابان۔ ہوسکتا ہے یہ ضمنی طور پر اس طرف اشارہ ہو کہ انبیاء الٰہی ہرگز بیابان نشینوں میں سے نہیں ہوتے تھے (جیسا کہ بعض مفسرین نے تصریح بھی کی ہے) کیونکہ بیابانوں میں گردش کرنے والے عام طور پر جہالت، نادانی اور قساوت قلبی میں گرفتار ہوتے ہیں اور مسائل زندگی اور روحانی و مادی ضروریات سے بہت کم آگاہی رکھتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ سرزمین حجاز میں صحرا نورد اعراب اور بدو بہت زیادہ تھے لیکن پیغمبر اسلامؐ مکہ میں مبعوث ہوئے کہ جو اس وقت نسبتاً بڑا شہر تھا اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ کنعان کا علاقہ سرزمین مصر کہ جس میں یوسفؑ حکومت کرتے تھے کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا اسی بناء حضرت یوسفؑ نے اس کے بارے میں لفظ "بدو" استعمال کیا لیکن ہم جانتے ہیں پیغمبر خدا حضرت یعقوبؑ اور ان کے بیٹے کبھی بھی صحرا نورد اور بیاباں نشیں نہیں تھے بلکہ ایک چھوٹے سے قصبے کنعان میں زندگی بسر کرتے تھے۔

پھر مزید فرمایا گیا ہے: یہ جو تیری دعوت کے خلاف ہیں، جب کہ تیری دعوت توحید کی طرف ہے ان کے لیے بہتر ہے کہ جائیں اور گزشتہ لوگوں کے آثار اور نشانات دیکھیں تاکہ یہ سمجھ سکیں کہ ان کی مخالفتوں کا انجام کیا ہوگا۔ کیا انہوں نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ وہ دیکھ سکتے کہ گزشتہ قوموں کا انجام کیا ہوا (افلم يسيروا فى الارض فينظروا كيف كان عاقبة الذين من قبلهم)۔

کیونکہ یہ "زمین میں سیر" روشنفکروں پر گردش، گزشتہ لوگوں کے آثار کا مشاہدہ اور عذاب الٰہی کی تباہ کن ضربوں کے نتیجے میں ان کے محلوں اور آبادیوں کی ویرانی بہترین درس ہے۔ یہ زندہ اور محسوس درس ہے اور ایسا درس ہے جو سب کے لیے قابل لمس ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے، اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لیے سب سے بہتر ہے (ولدار الاٰخرة خير للذين اتقوا)۔
کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے اور اپنی فکر و نظر کو کام میں نہیں لاتے (افلا تعقلون) کیونکہ یہاں کا گھر تو ناپائیدار ہے۔ یہاں تو طرح طرح کے

مصائب والام اور تلخیاں ہیں لیکن وہاں کا گھر جاودانی ہے اور ہر قسم کے رنج و تکلیف اور پریشانی سے خالی ہے۔

بعد والی آیت میں انبیاء کی زندگی کے حساس ترین اور زیادہ بحرانی لمحات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے، خدائی پیغمبر حق کی طرف دعوت دینے کی راہ میں استقامت دکھاتے تھے اور ڈٹے رہتے تھے اور دوسری طرف گمراہ اور سرکش قومیں اپنی مخالفت کو اس طرح جاری رکھتی تھیں کہ آخرکار انبیاء مایوس ہو جاتے اور گمان کرنے لگتے کہ شاید مومنین کے چھوٹے سے گروہ نے بھی ان سے جھوٹ بولا ہے اور اپنی دعوت کے راستے میں وہ تن تنہا ہیں۔ اس وقت کہ جب ہر طرف سے ان کی امید ختم ہو گئی تو ہماری طرف سے نصرت و کامیابی آ پہنچی جسے ہم چاہتے ہیں اور اہل پاتے ہیں، نجات دیتے ہیں (حتی اذا استیئس الرسل وظنوا انھم قد کذبوا جاءھم نصرنا فنجی من نشاء)[1]

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے، ہمارا عذاب و عقاب گنہگار اور مجرم قوم سے ہٹایا نہیں جائے گا (ولا یرد باسنا عن القوم المجرمین)۔

یہ ایک سنتِ الٰہی ہے کہ جب مجرمین اپنے کام پر اصرار کرتے ہیں اور اپنے اوپر ہدایت کے دروازے بند کر لیتے ہیں اور ان پر اتمام حجت ہو جاتی ہے تو پھر خدائی عذاب اور سزائیں ان کا تعاقب کرتی ہیں اور پھر کسی کی قدرت میں نہیں کہ انہیں پلٹا سکے۔

اس آیہ کی تفسیر کے متعلق اور یہ کہ "ظنوا انھم قد کذبوا" کس گروہ کے بارے میں ہے مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔

جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے یہی تفسیر بہت سے علماء نے انتخاب کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء کا معاملہ اس حد تک پہنچ جاتا تھا کہ وہ گمان کرنے لگتے کہ بغیر کسی استثناء کے تمام لوگ ان کی تکذیب کریں گے یہاں تک کہ اظہار ایمان کرنے والے مومنین بھی اپنے عقیدے میں ثابت قدم نہیں ہیں۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ "ظنوا" کا فاعل مومنین ہیں۔ یعنی مشکلات اور بحران کا عالم یہ ہوتا کہ ایمان لانے والے یہ خیال کرتے کہ کہیں انبیاء کی طرف سے دیا جانے والا نصرت و کامیابی کا وعدہ غلط ہی نہ ہو اور یہ سوئے ظن اور تزلزل نئے ایمان لانے والوں میں پیدا ہونا کوئی بعید نہیں ہے۔

بعض نے آیت کی ایک اور تفسیر بھی کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء بہرحال ایک بشر تھے جنہیں زیادہ طوفانی حالات کا سامنا ہوتا تو حالات کی اس سنگینی کا اثر ان پر بھی ہوتا۔ وہ دیکھتے کہ تمام دروازے بند ہو گئے ہیں اور کشائش کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا، طوفانی حوادث کے تھپیڑے مسلسل انہیں پڑتے اور جن مومنین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ان کی فریاد متواتر ان کے کانوں سے ٹکراتی رہتی۔ جی ہاں! اس حالت میں ایک ناپائیدار لمحے میں طبیعت بشری کی بناء پر بے اختیار یہ فکر ان کے دماغ سے ٹکراتی کہیں ایسا نہ ہو کہ کامیابی کا وعدہ ہی غلط ثابت ہو جائے یا ممکن ہے کامیابی کا وعدہ ایسی شرائط سے مشروط ہو کہ جو حاصل نہ ہوئی ہوں لیکن بہت جلد وہ اس فکر پر غالب آ جاتے تھے اور اسے متزلزل سے دور کر دیتے اور امید کی بجلی ان کے دلوں میں کوندنے لگتی اور اس کے ساتھ ہی کامیابی کے آثار اور ہراول دستے ظاہر ہو جاتے۔

اس تفسیر کے لیے انہوں نے سورہ بقرہ کی آیہ ۲۱۴ سے شاہد پیش کیا ہے:

---

[1] "حتی" محذوف جملے کے لیے غایت و انتہا کی شکل میں ذکر ہوا ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے:

ان الرسل اقاموا علی دعوتھم والکافرین بھم علی مخالفتھم حتی اذا استیئس الرسل۔ منہ۔

حتی یقول الرسول والذین اٰمنوا معہ متی نصر اللہ

یعنی ـــ گزشتہ قومیں شدائد و مصائب کے بھنور میں اس طرح پھنس گئیں اور وہ خوف سے لرزنے لگیں یہاں تک کہ ان کے پیغمبر اور ان پر ایمان لانے والے پکار کے کہتے تھے، کہاں ہے خدا کی نصرت ـــ لیکن انہیں جواب دیا جاتا تھا:

الا ان نصر اللہ قریب

خدا کی نصرت قریب ہے۔

مفسرین کی ایک جماعت مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں اور فخر رازی نے تفسیر کبیر میں یہ احتمال ذکر کرنے کے بعد اسے بعید قرار دیا ہے کیونکہ مقام انبیاء سے اس قدر بھی بعید ہے۔

بہر حال پہلی تفسیر ہی زیادہ صحیح ہے۔

اس سورہ کی آخری آیت ایک بہت جامع مضمون کی حامل ہے۔ اس میں وہ تمام مباحث مختصر سے الفاظ میں جمع کر دیئے گئے ہیں جو اس سورہ میں گزرے ہیں ـــ اور وہ یہ کہ حضرت یوسفؑ، ان کے بھائیوں، گزشتہ انبیاء و مرسلین اور مومن و غیر مومن قوموں کی سرگزشت اور حالاتِ زندگی میں غور و فکر کرنے والے تمام صاحبانِ عقل کے لیے عبرت کے عظیم درس موجود ہیں (لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب)۔

گزرے ہوؤں کی سرگزشت ایک آئینہ ہے جس میں فتح و شکست، کامیابی و ناکامی، خوش بختی و بدبختی اور سربلندی و ذلت سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان اس آئینے میں وہ کچھ بھی دیکھ سکتا ہے جو اس کی زندگی میں اہمیت اور منزلت رکھتا ہے اور وہ کچھ بھی دیکھ سکتا ہے جو اس کی زندگی میں اہمیت و منزلت نہیں رکھتا۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں گزشتہ قوموں اور عظیم رہبروں کے تمام تجربات کا ماحصل نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے کہ جس کا مشاہدہ کم عمر والے انسان کو تمام عالمِ بشریت کی عمر کے برابر طولانی زندگی عطا کر دیتا ہے لیکن صرف اولوالالباب اور صاحبانِ فکر ہی ہیں جو اس عجیب و غریب آئینے سے ان نقوشِ عبرت کو دیکھ سکتے ہیں۔

مزید فرمایا گیا ہے، جو کچھ کہا گیا ہے کوئی گھڑا ہوا افسانہ اور خیالی داستان نہیں ہے (ما کان حدیثا یفتریٰ)۔

یہ آیات جو تجھ پر نازل ہوئی ہیں اور گزشتہ لوگوں کی صحیح تاریخ کے چہرے سے پردہ ہٹاتی ہیں، کسی کے دماغ اور فکر کی پیداوار نہیں ہیں" بلکہ یہ ایک عظیم آسمانی وحی ہے، گزشتہ انبیاء کی بنیادی کتب کی تصدیق کرتی ہے اور ان کی شہادت دیتی ہے "(ولکن تصدیق الذی بین یدیہ)۔

علاوہ ازیں جس چیز کی انسان کو ضرورت ہے اور جو کچھ اس کی سعادت اور تکامل کے لیے درکار ہے وہ ان آیات میں آیا ہے (وتفصیل کل شیءٍ)۔

اسی بناء پر یہ حق جو کرنے والوں کے لیے سرمایۂ ہدایت ہے اور تمام ایمان لانے والوں کے لیے باعثِ رحمت ہے (وھدی ورحمۃ لقوم یؤمنون)۔

گویا مندرجہ بالا آیت اس نکتے کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہے کہ خوبصورت اور دل انگیز جعلی داستانیں تو بہت ہیں اور تمام دنیا میں ہمیشہ خیالی اور دلکش افسانے بہت رہے ہیں ـــ کہیں کوئی یہ تصور نہ کرے کہ یوسفؑ کی سرگزشت یا قرآن میں آنے والے دیگر انبیاء

کے واقعات بھی اسی قبیل سے ہیں۔

یہ امر بہت اہم ہے کہ یہ عبرت انگیز اور جھنجوڑنے والے واقعات عین حقیقت ہیں اور ان میں نہ ذرہ بھر انحراف نہیں اور نہ کوئی خارجی چیز ان میں شامل کی گئی ہے۔ اسی بنا پر ان کی تاثیر بہت زیادہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ خیالی افسانہ کتنا ہی جاذب نظر، ہلا دینے والا اور مرتب منظم ہو اس کی تاثیر ایک حقیقی واقعے کی نسبت کچھ بھی نہیں ہے ___ کیونکہ:

اولاً ___ جس وقت سننے والا اور پڑھنے والا داستان کے زیادہ ہیجان انگیز لمحات تک پہنچتا ہے اور اس سے لرزنے لگتا ہے تو اچانک یہ خیال بجلی کے کرنٹ کی طرح اس کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایک خیالی اور تصوراتی چیز سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

ثانیاً ___ یہ واقعات اور داستانیں در اصل انہیں پیش کرنے والے کی فکر کو بیان کرتی ہیں۔ وہ اپنے افکار اور خواہشات کا نچوڑ داستان کے ہیرو کے کردار میں مجسم کرتا ہے۔

لہٰذا ایک خیالی داستان ایک انسان کی فکر سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور یہ چیز ایک عینی حقیقت سے بہت مختلف ہے۔ خیالی بات کہنے والے کی نصیحت اور وعظ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی لیکن انسانوں کی حقیقی تاریخ کی یہ صورت نہیں ہے وہ تو نتیجہ خیز، پُر برکت اور ہر لحاظ سے راہ کشا ہوتی ہے۔

سورۂ یوسفؑ کا اختتام

پروردگارا!

ہمیں چشمِ بینا، گوشِ شنوا اور قلبِ دانا مرحمت فرما۔

تاکہ ہم گزشتہ لوگوں کی سرگزشتوں سے اپنی نجات کے راستے تلاش کر سکیں اور ان مشکلات سے نکل جائیں کہ جن میں اس وقت ہم غوطہ زن ہیں۔

خداوندا!

ہمیں تیز نگاہ عطا فرما۔

تاکہ ہم اقوامِ عالم کے انجام سے سبق حاصل کریں اور کامیابی کے بعد اختلاف و انتشار کی بنا پر دردناک ترین شکستوں سے دوچار ہونے والی اقوام کو ہم دیکھیں اور اس طرح ہم اس راستے پر نہ چلیں جس پر وہ قومیں چلی ہیں۔

بارالٰہا!

ہمیں ایسی خالص نیت عطا فرما ___ کہ

ہم نفس کے دیو کے سر پر پاؤں رکھ دیں اور

ایسی معرفت عطا فرما ___ کہ

ہم کامیابی پر مغرور نہ ہوں ___ اور

ایسی گرفت و بخشش عطا فرما کہ

اگر دوسرا ہم سے بہتر کام انجام دے تو وہ کام ہم اس کے سپرد کردیں۔

اگر چہ ہیں تو ہمیں جرأت فرمائے تو ہم تمام مشکلات پر کامیابی حاصل کرسکتے ہیں اور ہم اسلام و قرآن کا چراغ ساری دنیا میں روشن رکھ سکتے ہیں۔

سورہ رعد

- مکّہ میں نازل ہوئی
- اس کی ۴۳ آیتیں ہیں

سورۂ رعد کے مضامین و مشتملات

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ مکی سورتیں چونکہ دعوت پیغمبرؐ کے آغاز میں اور مشرکین کے ساتھ سخت اور شدید مقابلے کے موقع پر نازل ہوئی ہیں لہٰذا زیادہ تر عقائد کے مسائل ان میں موجود ہیں خصوصاً توحید کی دعوت، شرک سے مقابلہ اور معاد و قیامت کے اثبات ان میں موجود ہیں جب کہ مدنی سورتیں کہ جو اسلام کی وسعت اور اسلامی حکومت کی تشکیل کے بعد نازل ہوئی ہیں وہ معاشرے کی ضروریات کے مطابق اجتماعی نظام سے مربوط احکام و مسائل کے متعلق بحث کرتی ہیں۔

زیرِ بحث سورہ ــــ سورہ رعد ــــ کہ جو مکی سورتوں میں سے ہے اسی پروگرام کے ذیل میں ہے اس میں قرآن کی حقانیت و عظمت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد توحید سے متعلق آیات ہیں، اسرارِ خلقت و آفرینش کا ذکر ہے کہ جو خدا کی ذات پاک کی نشانیاں ہیں۔

کبھی بغیر ستون کے کھڑے آسمان کا ذکر ہے، کبھی حکم خدا سے آفتاب و ماہتاب کی تسخیر کے بارے میں تذکرہ ہے، کبھی زمین بچھانے کی بات ہے، کبھی پہاڑوں، نہروں، درختوں اور پھلوں کی خلقت کا ذکر ہے اور کبھی رات کے آرام بخش پردوں کا تذکرہ ہے کہ جو دن کو چھپا دیتے ہیں۔

قرآن کبھی لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر انگور کے باغوں، نخلستانوں اور لہلہاتی کھیتیوں میں لے جاتا ہے اور ان کے عجائب و غرائب شمار کرتا ہے اور پھر معاد و قیامت، انسان کی نئی زندگی اور پروردگار کی دادگاہِ عدل کے بارے میں بحث کرتا ہے اور یہ بحث مبداء و معاد کے تعارف، لوگوں کی ذمہ داریوں کے بیان اور یہ کہ ان کی سرنوشت میں ہر طرح کا تغیر ان کے اپنے ہاتھ میں ہے، کے اصول کے تذکرے پر مکمل ہوتی ہے۔

قرآن دوبارہ مسئلہ توحید کی طرف لوٹتا ہے۔ رعد کی سنگین آواز اور برق کی وحشت انگیز کڑک کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور پھر آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں کے عظمتِ پروردگار کے سامنے سجدہ کرنے کی بات کرتا ہے۔

پھر آنکھوں اور کانوں کو کھولنے اور بینائی و دانائی کی بیداری کے لیے انسان کے اپنے ہاتھوں بنائے گئے بتوں کی بے وقعتی کا تذکرہ کرتا ہے، انسانوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور حق و باطل میں تمیز کے لیے مثالیں پیش کرتا ہے ــــ زندہ اور محسوس مثالیں۔ سب کے لیے قابلِ ادراک مثالیں۔

اور چونکہ توحید و معاد کا آخری اور اصلی ثمرہ ہی اصلاحی و عملی پروگرام ہیں ــــ لہٰذا ان تمام مباحث کے بعد قرآن اس سورہ میں ایفائے عہد، صلۂ رحمی، صبر و استقامت، آشکار و پنہاں انفاق اور ترکِ انتقام جوئی کی دعوت دیتا ہے۔

پھر دوبارہ نشاندہی کرتا ہے کہ دنیا کی زندگی ناپائیدار ہے اور سکون و اطمینان خدا پر ایمان کے سائے کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔
آخر میں لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر تاریخ کی پہنائیوں کی طرف کھینچ لے جاتا ہے اور گزر جانے والی باغی اور سرکش قوموں، کہ جنہوں نے حق پوشی کی یا لوگوں کو حق سے روکا، کے انجام کی نشاندہی کرتا ہے اور ہلا دینے والے الفاظ میں کافروں کو تہدید کرتے ہوئے یہ سورہ اختتام کو پہنچتا ہے۔

لہٰذا ــــ سورۂ رعد عقائد و ایمان سے شروع ہوتی ہے ــــ اور اعمال، کردار اور انسان ساز پروگراموں کے ذکر پر تمام ہو جاتی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

۱۔ الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○

۲۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ○

۳۔ وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِی الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○

۴۔ وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○

ترجمہ

رحمٰن ورحیم خدا کے نام سے

۱۔ المر یہ (آسمانی) کتاب کی آیات ہیں اور جو کچھ تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ پر نازل ہوا ہے حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

۲۔ خدا وہی ہے جس نے آسمان کو قابلِ مشاہدہ ستون کے بغیر پیدا کیا پھر عرش کا کنٹرول سنبھالا (اور تدبیرِ عالم کی مہار اپنے ہاتھ میں لی) اور آفتاب و ماہتاب کو مسخر کیا کہ ان میں سے ہر ایک معین زمانے تک حرکت رکھتے ہیں، وہی کاموں کی تدبیر کرتا ہے، (تمہارے لیے) آیات کی تشریح کرتا ہے تا کہ تم اپنے پروردگار کی ملاقات کا یقین حاصل کرو۔

۳۔ وہ وہی ہے جس نے زمین کو بچھایا اور اس میں پہاڑ اور نہریں بنائیں اور اس میں تمام پھلوں کے دو جفت پیدا کیے۔ وہی دن کو رات (کا سیاہ پردہ) اوڑھاتا ہے۔ ان میں اُن کے لیے آیات ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔

۴۔ اور روئے زمین میں ایسے قطعات ہیں جو ایک دوسرے سے ملے ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ نیز انگور کے باغات، کھیتیاں اور نخلستان ہیں کہ جو کبھی ایک ہی پائے پر اُگتے ہیں اور کبھی دو پایوں پر۔ وہ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود ان میں سے بعض کو پھل کے لحاظ سے ہم دوسرے پر برتری دیتے ہیں۔ ان میں اُن کے لیے نشانیاں ہیں جو اپنی عقل استعمال کرتے ہیں۔

تفسیر

آسمان و زمین اور سبزہ زار خدا کی نشانیاں ہیں

اس سورہ کے آغاز میں ہم پھر قرآن کے حروفِ مقطعات کا سامنا کر رہے ہیں۔ ایسے الفاظ قرآن کی ۲۹ سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں۔ البتہ یہاں آنے والے حروف دراصل "الٓمٓ" اور "الٓرٰ" کا مرکب ہیں جو چند دیگر سورتوں کی ابتداء میں الگ الگ آئے ہیں۔ درحقیقت یہ وہ واحد سورۃ ہے جس کی ابتداء میں "الٓمٓرٰ" نظر آتا ہے اور چونکہ ہر سورہ کی ابتداء میں جو حروفِ مقطعات آتے ہیں وہ اس سورہ کے مضامین کے ساتھ براہِ راست تعلق رکھتے ہیں لہٰذا احتمال ہے کہ یہ ترکیب جو سورہ رعد کی ابتداء میں آئی ہے اس طرف اشارہ ہے کہ سورہ رعد کے مضامین ان دونوں قسم کی سورتوں کے مضامین کے جامع ہیں جن کی ابتداء میں "الٓمٓ" اور "الٓرٰ" آیا ہے اور اتفاق کی بات ہے کہ ان سورتوں کے مضامین میں غور و خوض کرنے سے اس امر کی تائید ہوتی ہے۔

قرآن کے حروف مقطعات کی تفسیر کے بارے میں اب تک ہم نے سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران اور سورۂ اعراف کے آغاز میں تفصیلی بحث کی ہے کہ جس کے تکرار کی ہم ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

بہرحال اس سورہ کی سب سے پہلی آیت عظمتِ قرآن کے بارے میں گفتگو کرتی ہے۔

"یہ عظیم آسمانی کتاب کی آیات ہیں" (تلك اٰیٰت الكتٰب)[1] "اور جو کچھ تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ پر نازل ہوا ہے وہ حق ہے" (والذی انزل الیك من ربك الحق)۔ اور اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ حقائق بیان کرنے والا جہانِ آفرینش اور اس کے انسان سے روابط کا عینی شاہد ہے۔

یہ ایسا حق ہے جو باطل میں ملا ہوا نہیں ہے۔ اسی لیے اس کی حقانیت کی نشانیاں اس کے چہرے سے ہویدا ہیں اور یہ مزید استدلال کی ضرورت نہیں رکھتا۔

لیکن اس کے باوجود بوالہوس اور نادان لوگ، کہ جن کی اکثریت ہے، ان آیات پر ایمان نہیں لاتے (ولکن اکثر الناس لا یؤمنون)

کیونکہ اگر انسان کو اس کی اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور وہ پاک دل عالم کی پیروی نہ کرے کہ جو روحِ حیات میں اس کی ہدایت اور تربیت کرے اور اس طرح وہ ہوا و ہوس کی پیروی کرنے میں بھی آزاد ہو تو اکثر وہ اپنے راستے سے بھٹک کر بے راہ روی کا شکار ہو جائے گا۔ لیکن اگر خدائی مربی اور راہ حق کے ہادی ان انسانوں کے امام اور پیشوا ہوں اور وہ اپنے آپ کو ان کے اختیار میں دے دیں تو پھر اکثریت راہِ حق پر چلے گی۔

اس کے بعد توحید اور عالمِ آفرینش میں خدا کی نشانیوں کے اہم دلائل کی تشریح کی گئی ہے اور خاکی انسان کو آسمانوں کی وسعت میں گردش کرنے پر ابھارا گیا ہے اور اس کے لیے ان عظیم کرّوں، ان کے نظامِ حرکت اور ان کے اسرار کی نشاندہی کی گئی ہے تاکہ وہ اس کی لامتناہی اور بے پایاں قدرت و حکمت کو جان سکے۔ کس قدر خوبصورتی سے فرمایا گیا ہے: خدا وہی ہے کہ جو آسمانوں کو جیسا کہ تم دیکھتے ہو بغیر ستون کے قائم کیے ہوئے ہے یا وہ انہیں غیر مرئی ستونوں کے ساتھ بلند کیے ہوئے ہے (اللّٰه الذی رفع السمٰوٰت بغیر عمد ترونها)[2]۔

"بغیر عمد ترونها" کے بارے میں علماء نے دو تفسیریں بیان کی ہیں:

پہلی یہ کہ "جس طرح تم دیکھتے ہو آسمان بغیر ستون کے ہے (گویا اصل میں ایسے تھا: ترونها بغیر عمد)۔

دوسری یہ کہ "ترونها" صفت ہے "عمد" کے لیے کہ جس کا معنی یہ ہے کہ آسمانوں کو بغیر کسی مرئی ستون کے بلند کیا گیا ہے جس کا لازمہ یہ ہے کہ آسمان کے لیے ستون ہے لیکن ایسا ستون جو غیر مرئی ہے۔

---

[1] جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ "تلك" اسم اشارہ بعید ہے، اس کا انتخاب قریب کے اشارہ "ھذہ" کی بجائے قرآنی آیات کی عظمت و رفعت کے لیے کنایہ ہے۔

[2] "عمد" (بر وزن "صمد") اور "عُمُد" (بر وزن "رُسُل") دونوں "عمود" بمعنی "ستون" کی جمع ہیں اگرچہ ادبی لحاظ سے پہلے کو جمع اور دوسرے کو اسم جمع سمجھا جاتا ہے (مجمع البیان۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں)۔

یہی بات امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے حسین بن خالد کی حدیث میں آئی ہے، وہ کہتا ہے:

میں نے امام ابوالحسن رضاؑ سے پوچھا: یہ جو خدا کہتا ہے "والسماء ذات الحبک" (اس آسمان کی قسم جو راستوں کا حامل ہے) اس سے کیا مراد ہے؟

امام نے فرمایا

اس آسمان کے زمین کی طرف راستے ہیں۔

حسین بن خالد کہتے ہیں: میں نے عرض کیا:

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آسمان زمین کے ساتھ ارتباطی راستہ رکھتا ہو حالانکہ خدا فرماتا ہے، آسمان ستون کے بغیر ہیں۔

اس پر امام نے فرمایا:

سبحان الله ! الیس الله یقول : بغیر عمد ترونها

سبحان اللہ! کیا خدا نے نہیں فرمایا: بغیر ایسے ستون کے جو قابلِ مشاہدہ ہو؟

فقلت بلی

راوی کہتا ہے: میں نے کہا: جی ہاں

فقال ثم عمد ولکن لا ترونها

فرمایا: پس ستون تو ہیں لیکن تم انہیں نہیں دیکھ پاتے[1]

اس حدیث کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو زیرِ بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں آئی ہے، اس آیت نے ایک سائنسی حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا ہے کہ جو نزولِ آیات کے وقت کسی پر آشکار نہیں تھی کیونکہ اس زمانے میں بطلیموس کی ہیئت اپنی پوری طاقت کے ساتھ دنیا کے سائنسی مسائل اور لوگوں کے افکار و نظریات پر حکمران تھی اور اس کے مطابق آسمان ایک دوسرے پر پیاز کے چھلکوں کی طرح کرات کی شکل میں تھے۔ ظاہر ہے اس طرح تو ان میں سے کوئی بھی معلق اور ستون کے بغیر نہ تھا بلکہ ہر ایک دوسرے کا سہارا لیے ہوئے تھا لیکن ان آیات کے نزول کے تقریباً ایک ہزار سال بعد انسانی علم اس مقام پر پہنچا ہے کہ پیاز کے چھلکوں والے افلاک کی بات موہوم ہے۔ واقعیت یہ ہے کہ آسمانی کرات میں سے ہر ایک اپنے مدار و جگہ پر بغیر کسی سہارے کے ثابت اور معلق ہے اور وہ واحد چیز جو انہیں اپنی جگہ پر قائم رکھے ہوئے ہے وہ قوت جاذبہ اور دافعہ کا اعتدال ہے کہ جن میں سے ایک ان کرات کے جرم سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری ان کی حرکت کے ساتھ مربوط ہے۔

جاذبہ و دافعہ کا یہ اعتدال ایک غیر مرئی ستون کی شکل میں آسمانی کرات کو اپنی جگہ پر قائم رکھے ہوئے ہے۔

اس سلسلے میں ایک حدیث جو امیر المومنین علیؑ سے نقل ہوئی ہے بہت ہی جاذبِ نظر ہے۔ اس حدیث کے مطابق امام علیہ السلام نے فرمایا:

---

[1] یہ حدیث تفسیر برہان میں تفسیر علی بن ابراہیم اور تفسیر عیاشی کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ (برہان جلد ۲ صفحہ ۲۷۵)

ھذہ النجوم التی فی السماء مدائن مثل المدائن الذی فی الارض مربوطۃ کل مدینۃ الی عمود من نور [1]

یہ ستارے جو آسمان میں ہیں یہ زمین کے شہروں کی طرح شہر ہیں کہ جن میں سے ہر شہر دوسرے شہر کے ساتھ (ہر ستارہ دوسرے ستارے کے ساتھ) نور کے ایک ستون کے ذریعے مربوط ہے۔

کیا اس زمانے کے افق ادبیات میں قوتِ جاذبہ کی امواج اور ان کے قوتِ دافعہ میں اعتدال کے لیے "غیر مرئی ستون" اور "نورانی ستون" سے بڑھ کر روشن اور رسا تعبیر ہو سکتی تھی؟ [2]

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: خدا نے بغیر ستون کے ان آسمانوں کو پیدا کرنے کے بعد کہ جو اس کی لامتناہی عظمت و قدرت کی واضح نشانی ہیں عرش کا کنٹرول سنبھالا (یعنی عالمِ ہستی کی حکومت اپنے قبضے میں لی) (ثم استوی علی العرش)۔

"عرش" کے معنی اور اس پر خدا کے تسلط کے مفہوم کے سلسلے میں سورہ اعراف کی آیہ ۵۴ کے ذیل میں کافی بحث ہو چکی ہے [3]

آسمانوں کی خلقت اور ان پر پروردگار کی حکومت کا ذکر کرنے کے بعد سورج اور چاند کی تسخیر کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "وہ وہی ہے جس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا اور انہیں فرمانبردار اور خدمت گزار قرار دیا" (وسخر الشمس والقمر)۔

اس سے بڑھ کر تسخیر کیا ہو گی کہ یہ سب اس کے فرمان کے سامنے سرنگوں ہیں نیز انسانوں اور تمام زندہ موجودات کے خدمت گزار ہیں، نور چھڑکتے ہیں، ایک عالم کو روشن کرتے ہیں، موجودات کا بستر گرم رکھتے ہیں، موجوداتِ زندہ کی پرورش کرتے ہیں اور دریاؤں میں مدوجزر پیدا کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ تمام حرکتوں اور برکتوں کا سرچشمہ ہیں۔

لیکن جہانِ مادہ کا یہ نظام جاودانی اور ابدی نہیں ہے اور شمس و قمر میں سے ہر ایک، ایک مدتِ معین تک اپنے راستے پر حرکت جاری رکھے ہوئے ہے (کل یجری لاجل مسمّی)۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے کہ یہ حرکات، گردشیں، آمد و شد اور تبدیلیاں بغیر کسی حساب و کتاب کے اور بے نتیجہ و بے مقصد نہیں ہیں بلکہ "وہی ہے جو تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے" اور ہر حرکت کے لیے حساب اور ہر حساب کے لیے ہدف اور مقصد نظر میں رکھتا ہے (یدبر الامر)۔

"وہ اپنی آیات تمہارے لیے شمار کرتا ہے اور ان کی باریکیاں تفصیل سے بیان کرتا ہے تاکہ تمہیں لقائے پروردگار اور دوسرے جہان کا یقین پیدا ہو" (یفصل الآیات لعلکم بلقاء ربکم توقنون)۔

گزشتہ آیت انسان کو آسمانوں پر لے جاتی ہے اور عالمِ بالا میں اسے آیات الٰہی کی طرف متوجہ کرتی ہے دوسری آیت انسان کو توحید کی آیات کے مطالعے کی دعوت دیتی ہے، انسان کو زمین، پہاڑوں، نہروں، انواع و اقسام کے پھلوں اور سورج کے طلوع و

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۵۷۴ منقول از تفسیر علی بن ابراہیم قمی۔

[2] مزید وضاحت کے لیے کتاب "قرآن و آخرین پیغمبر" صفحہ ۱۶۶ کے بعد کی طرف رجوع فرمائیں۔

[3] تفسیر نمونہ جلد ۶ صفحہ ۱۵۸ کی طرف رجوع فرمائیں۔

پر غور کرنے کی طرف متوجہ کرتی ہے تاکہ وہ سوچ بچار کرے کہ اس کا یہ مقام آسائش و آرام پہلے کیا تھا اور وہ اس شکل میں کیسے آیا

قرآن کہتا ہے: وہ وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا (وهو الذی مد الارض)۔ اس نے اسے یوں پھیلایا کہ وہ انسانی زندگی اور نباتات و حیوانات کی پرورش کے قابل ہو۔ تند اور خطرناک گڑھوں اور ڈھلوانوں میں پہاڑ داخل کر دیئے اور انہیں پھر دوں کو مٹی میں تبدیل کر کے پُر کیا اور ان کی سطح کو قابلِ حیات بنایا حالانکہ ابتدا میں ان کے پیچ و خم ایسے تھے جن میں انسان کے لیے زندگی بسر کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اس جملے میں "مد الارض" سے یہ احتمال بھی ہے کہ جیسا کہ ماہرین ارض بھی کہتے ہیں ابتداء میں ساری زمین پانی کے نیچے ڈھکی ہوئی تھی پھر پانی گڑھوں میں چلا گیا اور خشکیاں تدریجاً پانی سے نمایاں ہونے لگیں اور روز بروز ان میں وسعت پیدا ہوتی گئی یہاں تک کہ انہوں نے موجودہ صورت اختیار کر لی۔

اس کے بعد پہاڑوں کی پیدائش کے مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: خدا نے زمین میں پہاڑ بنائے ہیں (وجعل فیها رواسی)۔

وہی پہاڑ کہ جن کا قرآن کی دوسری آیات میں "اوتاد" (یعنی "زمین کی میخیں") کے طور پر تعارف کروایا گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ نیچے سے پہاڑوں نے ایک دوسرے میں پنجے گاڑے ہوئے ہیں اور زرہ کی طرح ساری سطح زمین کو ڈھانپا ہوا ہے تاکہ اندرونی دباؤ بھی ختم کر سکیں اور باہر سے چاند کی بہت زیادہ قوتِ جاذبہ اور مد و جزر کو بھی روکے رکھیں، اس طرح سے تزلزل اور دائمی زلزلوں کو ختم کر سکیں اور کرۂ زمین کو انسانی زندگی کے آرام و سکون کے لیے برقرار رکھیں۔

زمین کے پھیلانے اور بچھانے کے بعد پہاڑوں کا ذکر گویا اس طرف اشارہ ہے کہ زمین نہ اس طرح سے پھیلائی گئی ہے کہ اس میں کوئی پستی و بلندی نہ ہو کیونکہ اس صورت میں بارشیں اور پانی اس پر نہ ہوتے اور یا ہر جگہ ایک جوہڑ کی صورت میں تبدیل ہو جاتی اور اس کی سطح پر دائمی طوفان جاری رہتے لیکن پہاڑوں کی پیدائش سے ان دونوں صورتوں سے امان مل گئی ہے اور وہ ساری زمین پہاڑوں اور دروں پر مشتمل ہے کہ زندگی کے قابل ہی نہ ہو بلکہ اس میں بھی طور پر ہموار بھی ہے اور اس میں پہاڑ اور درے بھی ہیں جو نوعِ بشر اور دیگر زندہ موجودات کی زندگی کے لیے بہترین ترکیب ہے۔

اس کے بعد ان پانیوں اور دریاؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو روئے زمین پر چلتے رہتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے: اور اس میں دریا جاری ہیں (وانهاراً)۔

زمین کی آبیاری کے نظام کا پہاڑوں سے ارتباط اور پہاڑوں کا دریاؤں سے تعلق بہت جاذب نظر ہے کیونکہ زمین کے بہت سے پہاڑوں کی چوٹیوں اور دروں کے شگافوں میں برف کی صورت میں یہ دریا ذخیرہ ہوتے ہیں جو تدریجاً پانی کی شکل اختیار کرتے ہیں اور قانونِ جاذبہ کے مطابق بلند تر مقامات سے زیریں اور کشادہ علاقوں کی طرف سفر کرتے ہیں اور بغیر کسی قوت کی احتیاج کے سال بھر طبیعی طور پر بہت وسیع زمینوں کی آبیاری کرتے ہیں اور انہیں سیراب کرتے ہیں اگر زمینوں میں مناسب ڈھلوان نہ ہوتی اور پانی اس شکل میں پہاڑوں پر ذخیرہ نہ ہوتا تو زیادہ تر خشک علاقوں کی آبیاری کا امکان نہ ہوتا اور اگر آبیاری ممکن بھی ہوتی تو بہت زیادہ خارج کی ضرورت پڑتی۔

اس کے بعد غذائی مواد اور ان پھلوں کا ذکر ہے کہ جو زمین، پانی اور سورج کی روشنی سے وجود میں آتے ہیں اور انسانی غذا کا بہترین وسیلہ ہیں ارشاد ہوتا ہے: اور تمام پھلوں میں سے جوڑا جوڑا زمین پر قرار دیئے گئے ہیں (ومن کل الثمرات جعل فیها زوجین اثنین)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ پھل بھی زندہ موجودات ہیں اور ان میں بھی نر اور مادہ نطفے موجود ہیں کہ جو تلقیح سے بارآور ہوتے ہیں۔

دانش مند "لینہ" اور مشہور ماہر نباتات "سوئڈی" اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواسط میں یہ بات معلوم کرنے میں کامیاب ہوئے کہ عالم نباتات میں زوجیت اور جنت کا معاملہ تقریباً عمومی اور کلی قانون ہے اور نباتات بھی حیوانات کی طرح نر اور مادہ کے نطفہ کی آمیزش سے بارآور ہوتے ہیں اور پھل دیتے ہیں جب کہ قرآن مجید نے اس سے گیارہ سو سال پہلے اس حقیقت کو فاش کر دیا تھا۔ یہ خود قرآن مجید کا ایک علمی معجزہ ہے کہ جس سے اس عظیم آسمانی کتاب کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ لینہ سے پہلے بہت سے ماہرین اجمالی طور پر بعض نباتات میں نر اور مادہ کا وجود معلوم کر چکے تھے یہاں تک کہ عام لوگ بھی جانتے تھے کہ اگر کھجور کے درخت پر "گرد" نہ دیں یعنی نر کا نطفہ مادہ حصوں پر نہ چھڑکا جائے تو وہ پھل نہیں دے گا لیکن کوئی شخص ٹھیک طرح سے یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ قانون تقریباً سب کے لیے ہے یہاں تک کہ لینہ اسے معلوم کرنے میں کامیاب ہوا مگر جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ قرآن صدیوں پہلے اس حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹا چکا تھا۔

انسان اور دیگر تمام زندہ موجودات کی زندگی، بالخصوص نباتات، گیاہ اور پھلوں کی زندگی رات اور دن کے دقیق نظام کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا آیت کے دوسرے حصے میں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا رات کے ذریعے دن کو ڈھانپ دیتا ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے (یغشی الیل النهار)۔

کیونکہ اگر رات کا سکون بخش پردہ نہ ہو تو سورج کا دائمی نور تمام سبزوں اور نباتات کو جلا دے اور روئے زمین پر پھلوں کا بلکہ تمام زندہ موجودات کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہے۔

کرہ ماہتاب میں اگرچہ دن ہمیشہ نہیں رہتا لیکن وہاں دنوں کی لمبائی کرہ زمین کے پندرہ رات دن کے برابر اور دن کے وسط میں کرہ ماہتاب کا درجہ حرارت اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ اگر پانی یا کوئی دوسری بہنے والی چیز ہو تو ابلنے لگے بلکہ اس کا درجہ حرارت اس سے بھی بڑھ جائے۔ کوئی زندہ موجود کہ جسے ہم زمین پر پہچانتے ہیں عام حالات میں یہ گرمی برداشت نہیں کر سکتا۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: جو امور بیان کیے گئے ہیں ان میں آیات اور نشانیاں ہیں، ان کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں (ان فی ذلک لاٰیات لقوم یتفکرون)۔

وہ لوگ جو اس بدیع اور تعجب خیز نظام میں سوچ بچار کرتے ہیں —— نور و ظلمت کے نظام میں، آسمانی کرات اور ان کی گردش کے نظام میں، آفتاب و مہتاب کی نور افشانی اور ان کی انسانوں کے لیے خدمت گزاری کے نظام میں، زمین بچھانے کے نظام میں، پہاڑوں اور دریاؤں کی پیدائش کے اسرار میں اور نباتات اور پھلوں کے نظام میں —— جی ہاں! جو لوگ اس نظام میں غور و فکر کرتے ہیں وہ ان میں قدرت لایزال کی آیات اور پروردگار کی حکمت بے پایاں واضح اور روشن طور پر دیکھتے ہیں۔

زیر بحث آخری آیت میں زمین شناسی اور نباتات شناسی کے جاذب نظر نکات کے ایک سلسلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک ایک حساب شدہ نظام خلقت کی نشانی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: زمین میں مختلف قطعات اور ٹکڑے موجود ہیں

کہ جا ایک دوسرے کے پاس اور ہمسائیگی میں ہیں (و فی الارض قطع متجاورات)[1]۔

باوجودیکہ یہ سب قطعات ایک دوسرے سے متصل اور مربوط ہیں، ہر ایک کی ساخت اور استعداد خود اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ بعض محکم ہیں اور بعض نرم، بعض نمکین ہیں اور بعض شیریں اور ان میں سے ہر ایک خاص نباتات، درختوں، پھلوں اور زراعتوں کی پرورش کی استعداد رکھتا ہے۔

انسان اور زمین میں رہنے والے جانداروں کی ضروریات چونکہ بہت زیادہ اور مختلف ہیں لہٰذا زمین کا ہر قطعہ گویا ان میں سے ایک ضرورت کو پورا کرنے کی ماموریت رکھتا ہے اور اگر سب قطعات ایک ہی طرح کے ہوتے یا یہ استعدادیں ان میں صحیح طور پر تقسیم نہ ہوتیں تو انسان غذائی مواد، دواؤں اور دیگر ضروریات کے لحاظ سے کیسی کیسی کمیابیوں میں گرفتار ہوتا لیکن ماموریت کی اس حساب شدہ تقسیم کی وجہ سے اور مختلف قطعات زمین کو پرورش کی مختلف استعدادیں دیئے جانے کے باعث یہ ضروریات مکمل طور پر پوری ہو جاتی ہیں۔

نیز یہ کہ "اسی زمین میں انواع و اقسام کے انگوروں، زراعتوں اور کھجوروں کے باغات اور پودے موجود ہیں" (وجنات من اعناب و زرع و نخیل)[2]۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ درخت اور ان کی مختلف انواع و اقسام کبھی تو ایک ہی پایہ و بنیاد پر اگتی ہیں اور کبھی مختلف پایوں اور بنیادوں پر (صنوان وغیر صنوان)[3]۔

"صنوان" جمع ہے "صنو" کی کہ جو دراصل شاخ کے معنی میں ہے کہ جو درخت کے اصلی تنے سے نکلتی ہے اس بناء پر "صنوان" کا معنی ہے "ایک تنے سے پھوٹنے والی مختلف شاخیں"۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان شاخوں میں سے ہر ایک پھل کی ایک خاص قسم دیتی ہے۔ یہ جملہ درختوں کی پیوند کی استعداد کے مسئلے کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ کبھی ایک ہی پایہ اور شاخ پر چند مختلف پیوند لگائے جاتے ہیں اور ان پیوندوں میں سے ایک نشوونما حاصل کرتا ہے اور اس سے پھل کی ایک خاص قسم حاصل ہوتی ہے۔۔۔ مٹی ایک، جڑ ایک اور شاخ ایک لیکن اس کا پھل اور محصول مختلف ہوتا ہے۔

زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ "وہ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں" (یسقٰی بماء واحد)۔

ان تمام چیزوں کے باوجود "ہم ان میں سے بعض درختوں کو بعض دوسرے درختوں پر پھل کے لحاظ سے برتری اور فضیلت دیتے ہیں"

---

[1] "متجاورۃ" "جار" کے مادہ سے ہمسایہ اور نزدیک کے معنی میں ہے لیکن جب "قطع متجاورات" فرمایا گیا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مختلف قطعات ہیں کہ جو ایک دوسرے کے پاس پاس ہیں۔۔۔ اور اگر وہ سب کے سب یکساں ہوتے تو اس تعبیر کا کوئی معنی نہ ہوتا۔

[2] "اعناب" "عنب" کی جمع ہے اور "نخیل" "نخل" کی جمع ہے اور شاید جمع کا صیغہ یہاں انگور اور کھجور کی مختلف انواع کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ان دو قسم کے پھلوں میں سے ہر ایک کی شاید ذائقے اور رنگ کے اعتبار سے کئی سو اقسام ہیں۔

[3] "صنو" کے لیے ایک اور معنی بھی ذکر ہوا ہے اور وہ ہے "شبیہ" لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ معنی بھی مذکورہ بالا معنی سے لیا گیا ہے۔

(ونفضل بعضها علی بعض فی الاکل)۔

یہاں تک کہ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ ایک ہی درخت میں یا ایک ہی شاخ میں ایک ہی جنس کے پھل لگے ہوتے ہیں مگر ان کا ذائقہ اور رنگ مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح پھولوں کی دنیا میں ہم نے بہت دیکھا ہے کہ ایک ہی پودے میں بلکہ ایک ہی شاخ پر بالکل مختلف رنگوں والے پھول اُگے ہوتے ہیں۔

یہ کیسی تجربہ گاہ ہے اور کیسی اسرار آمیز لیبارٹری درختوں کی شاخوں میں لگائی گئی ہے کہ جو بالکل ایک ہی مواد سے بالکل مختلف ترکیبات کو جنم دیتی ہے کہ جن میں سے ہر ایک انسانی ضروریات کے ایک حصے کو پورا کرتی ہے۔

کیا ان اسرار میں سے ہر ایک کسی ایک حکیم و عالم مبداء کے وجود کی دلیل نہیں کہ جو اس نظام کی رہبری کرتا ہے۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے، ان امور میں عظمت خدا کی نشانیاں ہیں، ان کے لیے جو عقل اور سوچ بچار رکھتے ہیں (ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یعقلون)۔

چند اہم نکات

۱۔ توحید اور قیامت میں تعلق: زیر بحث پہلی آیت کے آغاز میں اسرار خلقت اور توحید کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن آیت کے آخر میں ہے:

یفصل الاٰیات لعلکم بلقاء ربکم توقنون۔

خدا تمہارے لیے اپنی آیات کی تشریح کرتا ہے تاکہ تم قیامت اور معاد پر ایمان لے آؤ۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ مسئلہ توحید اور مسئلہ معاد کے درمیان کونسا تعلق ہے کہ جس کی بناء پر ان کا ذکر ایک دوسرے کے نتیجے کے حوالے سے کیا گیا ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے کہ:

اولاً اس جہان کے ایجاد کرنے میں خدا کی قدرت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس کے اعادہ کی بھی قدرت رکھتا ہے، جیسا کہ سورہ اعراف کی آیہ ۲۹ میں ہے:

کما بدأکم تعودون۔

جیسے اس نے تمہیں ابتداء میں پیدا کیا ہے ویسے ہی پلٹائے گا۔

اور سورہ یٰسٓ کے اواخر میں ہے:

کیا وہ خدا کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، ان کی مثل ایجاد کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

ثانیاً جیسا کہ ہم نے معاد و قیامت کی مباحث میں کہا ہے کہ اگر عالم آخرت نہ ہو تو اس جہان کی خلقت فضول اور بے ہودہ ہوگی کیونکہ فقط یہ زندگی اس وسیع جہان کی خلقت کا مقصد نہیں ہو سکتی۔ قرآن مجید معاد سے مربوط آیات (مثلاً سورہ واقعہ آیہ ۶۲) میں کہتا ہے:

ولقد علمتم النشأة الاولیٰ فلولا تذکرون

تم نے جو اس جہان کو دیکھا تو پھر دھیان کیوں نہیں دیتے کہ یقیناً اس کے بعد ایک اور جہان ہوگا۔[1]

۲۔ قرآن کے سائنسی معجزات: قرآن مجید میں بہت سی آیات ایسی ہیں جو ایسے سائنسی اسرار کے ایک پہلو سے پردہ اٹھاتی ہیں کہ جو اس زمانے کے ماہرین کی نظروں سے پوشیدہ تھے اور یہ امر خود قرآنی اعجاز اور عظمت کی نشانی ہے۔ وہ محققین کہ جنہوں نے اعجازِ قرآن کے سلسلے میں بحث کی ہے اکثر و بیشتر ان آیات کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ان میں سے ایک آیت سطورِ بالا میں ذکر ہوئی ہے کہ جو عالمِ نباتات میں زوجیت اور جنت ہونے کے بارے میں گفتگو کرتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے عالمِ نباتات میں زوجیت کا مسئلہ جزوی طور پر تو عرصۂ قدیم سے جانا پہچانا تھا لیکن ایک کلی اور عمومی قانون کے طور پر پہلی مرتبہ یورپ میں اٹھارھویں صدی کے وسط میں ایک اٹلی سائنسدان "لینہ" نے اس کا انکشاف کیا لیکن قرآن مسلمانوں کو ایک ہزار سال بلکہ اس سے بھی قبل اس کی خبر دے چکا تھا۔

یہ مسئلہ سورہ لقمان کی آیہ ۱۰ میں بھی بیان ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وانزلنا من السماء ماءً فانبتنا فیھا من کل زوج کریم

ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے ہم نے زمین پر زوج اور جنت سے مفید گیاہ اگایا۔

بعض دوسری آیات میں بھی اس مسئلے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

۳۔ سورج اور چاند کی تسخیر: ہم نے مندرجہ بالا آیات میں پڑھا کہ خدا نے سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے۔ قرآن مجید میں بہت سی ایسی آیات ہیں کہ جو کہتی ہیں کہ آسمانی کرات، زمینی موجودات اور رات دن وغیرہ سب انسان کے لیے مسخر ہیں۔ ایک موقع پر ہے:

وسخر لکم الانھار

خدا نے تمہارے لیے دریاؤں کو مسخر کیا ہے۔ (ابراہیم - ۳۲)

ایک اور موقع پر ہے:

وسخر لکم الفلک

تمہارے لیے کشتی کو مسخر کیا ہے۔ (ابراہیم - ۳۲)

ایک اور جگہ پر ہے:

وسخر لکم الیل والنھار

رات اور دن کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے۔ (نحل - ۱۲)

ایک اور مقام پر ہے:

---

[1] مزید وضاحت کے لیے کتاب "معاد و جہان پس از مرگ" کی طرف رجوع کریں۔

وسخر لکم الشمس والقمر

سورج اور چاند تمہارے لیے مسخر کیے ہیں (ابراہیم - ۳۳)

ایک اور جگہ پر ہے:

وهو الذی سخر البحر لتأکلوا منه لحما طريا

تمہارے لیے دریا مسخر کیا ہے تاکہ اس سے تازہ گوشت کھاؤ۔ (نحل - ۱۴)

ایک اور مقام پر ہے:

الم تر ان الله سخر لکم ما فی الارض

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ خدا نے ان تمام چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے جو روئے زمین پر ہیں۔ (حج - ۶۵)

اور ایک موقع پر ہے:

وسخر لکم ما فی السموٰت وما فی الارض جمیعا منه

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کو خدا نے تمہارے لیے مسخر کیا ہے (جاثیہ - ۱۳)

ان تمام آیات سے مجموعی طور پر اچھی طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ:

اولاً انسان اس جہان کا سب سے اکمل اور ترقی یافتہ موجود ہے اور اسلام کی جہان بینی کی نظر سے اسے اس قدر مقام دیا گیا ہے کہ دوسرے تمام موجودات کو اس انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے کہ جو "خلیفۃ اللہ" ہے اور اس کا دل مقام نورِ خدا ہے۔

ثانیاً ان آیات میں تسخیر اس معنی میں نہیں کہ یہ تمام چیزیں انسان کے تحتِ فرمان ہیں بلکہ اس قدر ہے کہ یہ اس کے فائدے اور منافع کے لیے اور اس کی خدمت کے لیے حرکت کر رہے ہیں۔

مثلاً ـــ آسمانی کرات اس کے لیے نور افشانی کرتے ہیں یا ان سے دیگر فوائد حاصل ہوتے ہیں، وہ اس کی تسخیر میں ہیں۔

کوئی مکتب و مذہب اس قدر بلند انسانی مقام کا قائل نہیں اور کسی فلسفہ میں انسان یہ حیثیت اور مقام نہیں رکھتا ـــ اور یہ دین اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس نے انسانی وجود کی اہمیت اس حد تک بلند کر دی ہے کہ جس سے آگاہی انسانی تربیت اور ارتقا کے لیے گہرے اثرات مرتب کرتی ہے کیونکہ جب انسان یہ سوچے کہ خدا نے یہ تمام نعمتیں اسے بخشی ہیں اور ـــ

ابر و باد و ماہ و خورشید در کارند

یعنی ـــ بادل، ہوا، چاند اور سورج سب مصروفِ کار ہیں اور سب اس کے فرماں بردار اور خدمت گزار ہیں۔

ایسا انسان غفلت اور پستی کے لیے تیار نہیں ہوتا، اپنے آپ کو خواہشات و شہوات کا اسیر نہیں کرتا اور ثروت و مقام اور زر و زور کا غلام نہیں بنتا ـــ وہ غلامی کی زنجیریں توڑ کر آسمانوں کی اوج پر پرواز کرتا ہے۔

کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ سورج اور چاند انسان کے مسخر نہیں ہیں حالانکہ وہ اپنی نور افشانی سے حیاتِ انسانی کو روشن اور گرم کیے ہوئے ہیں ـــ اگر سورج کی روشنی نہ ہو تو کرۂ ارض پر کوئی جنبش و حرکت نہ ہو۔

دوسری طرف سورج کی قوت جاذبہ زمین کی حرکت کو اس کے مدار میں منظم کرتی ہے۔

دریاؤں اور سمندروں کا مد و جزر چاند کی مدد سے پیدا ہوتا ہے کہ جو خود بہت سی برکات اور منافع کا سرچشمہ ہے۔
کشتیاں، دریا، نہریں اور دن رات ہر ایک کسی نہ کسی طرح انسان کی خدمت کرتے ہیں اور اس کے فائدے کے لیے رواں دواں ہیں۔
ان تسخیرات اور ان کے حساب شدہ نظام میں غور و فکر کیا جائے تو یہ خالق کی عظمت، قدرت اور حکمت کی واضح دلیل ہیں۔

۵۔ وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

۶۔ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ○

ترجمہ

۵۔ اور اگر تو کسی چیز پر تعجب کرنا چاہتا ہے تو ان کی گفتگو عجیب ہے کہ جو کہتے ہیں کہ کیا جس وقت ہم مٹی ہوگئے تو ہم دوبارہ زندہ ہوں گے اور کیا) ہم نئی خلقت کے ساتھ پلٹ آئیں گے۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو اپنے پروردگار سے کافر ہوگئے ہیں اور یہ وہ ہیں جن کی گردن میں زنجیریں ہیں اور یہ اہل نار ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے

۶۔ وہ تجھ سے حسنہ (اور رحمت) سے پہلے جلدی سے سیئہ (اور عذاب) کا تقاضا کرتے ہیں حالانکہ ان سے پہلے عبرت انگیز بلائیں اور مصیبتیں نازل ہوئی ہیں اور اگرچہ لوگ ظلم کرتے ہیں تیرا پروردگار ان کے لیے صاحب مغفرت ہے اور تیرا پروردگار عذاب شدید بھی رکھتا ہے۔

تفسیر

قیامت کے بارے میں کافروں کا تعجب

عظمت الٰہی کی نشانیوں کے بارے میں جو آیات گزری ہیں ان کے بعد زیر بحث پہلی آیت میں مسئلہ معاد پیش کیا گیا ہے اور مسئلہ مبدأ و معاد میں جو خاص ربط اور تعلق ہے اس کی بنیاد پر اس بحث کو شکل دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اگر تم کسی چیز پر تعجب کرنا چاہتے ہو تو ان کی اس بات پر تعجب کرو کہ وہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو ہمیں نئی خلقت دی جائے گی (و ان تعجب فعجب قولهم

ءاذا کنا ترابا ءانا لفی خلق جدید[1]

بڑی تعجب ہے جو تمام جاہل قوموں کو مسئلہ معاد کے بارے میں تھا۔ وہ موت کے بعد حیاتِ نو اور خلقتِ جدید کو محال سمجھتے تھے حالانکہ گزشتہ آیات میں اور دیگر قرآنی آیات میں اس مسئلے کا اچھی طرح سے جواب دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ آغازِ خلقت اور تجدیدِ خلقت میں کیا فرق ہے۔ وہ ذات جو آغازِ خلقت میں انہیں پیدا کرنے پر قادر تھی وہ اس پر بھی قادر ہے کہ ان کے بدن کو حیاتِ نو عطا کرے۔ گویا یہ اپنی خلقت کی ابتدا کو بھول چکے ہیں تبھی تو اس کی تجدید کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن ان لوگوں کی موجودہ کیفیت اور انجام کو تین جملوں میں بیان کرتا ہے۔

پہلا کہتا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کے کافر ہو گئے ہیں (اولئک الذین کفروا بربھم)۔ کیونکہ اگر یہ لوگ خدا کو اور اس کی ربوبیت کو قبول کرتے تو پھر معاد اور تجدیدِ حیاتِ انسانی کے بارے میں شک نہ کرتے لہٰذا مسئلہ معاد میں ان کی خرابی مسئلہ توحید و ربوبیت الٰہی کے بارے میں ان کی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

دوسرا یہ کہ کفر اور بے ایمانی اختیار کرنے کی وجہ سے اور توحید کے پرچم آزادی کے سائے سے نکل جانے کی وجہ سے انھوں نے اپنے آپ کو طوق و زنجیر میں گرفتار کر لیا ہے۔ انہوں نے بت پرستی، ہوس پرستی، مادہ پرستی اور جہالت و خرافات کے طوق اپنے ہاتھوں اپنی گردن میں ڈالے ہیں "اور ان کی گردن میں یہ طوق ہیں" (واولئک الاغلال فی اعناقھم)۔

"اس کیفیت اور اس کردار کی وجہ سے ایسے لوگ یقیناً اہلِ دوزخ ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے" اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی نتیجہ اور توقع نہیں ہے (واولئک اصحاب النار ھم فیھا خلدون)۔

بعد والی آیت میں مشرکین کی ایک اور غیر منطقی بات پیش کی گئی ہے۔ فرمایا: بجائے اس کے کہ وہ تیرے ذریعے خدا سے رحمت کا تقاضا کرتے عذاب، کیفرِ کردار اور سزا میں تعجیل کا تقاضا کرتے ہیں (ویستعجلونک بالسیئة قبل الحسنة)۔

یہ قوم اس قدر ہٹ دھرم اور جاہل کیوں ہے۔ یہ لوگ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اگر تو سچ کہتا ہے تو ہم پر اس طرح یا اس طرح رحمتِ خدا نازل کروا بلکہ کہتے ہیں کہ اگر تیری بات سچی ہے تو ہم پر عذابِ خدا نازل کر۔

کیا ان کا خیال ہے کہ خدا کی سزا اور عذاب کی بات غلط ہے "حالانکہ گزشتہ زمانوں میں سرکش امتوں پر عذاب نازل ہوئے" جن کی خبریں صفحاتِ تاریخ پر اور سرزمین کے دل پر ثبت ہیں (وقد خلت من قبلھم المثلت)[2]

---

[1] "وان تعجب فعجب قولھم" — اس جملے کا درحقیقت یہ معنی ہے کہ اگر تو چاہتا ہے کہ کسی چیز کے بارے میں تعجب کرے تو ان کی بات پر تعجب کر کیونکہ یہ بہت ہی تعجب کی بات ہے اور "فعجب قولھم" در اصل جزاء شرط کی جزا ہے۔

مندرجہ بالا جملے کے بارے میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے: اگر ان کی بت پرستی پر تعجب کرتے ہو تو صرف یہی باعثِ تعجب نہیں بلکہ ان کی طرف سے معاد کا انکار بھی باعثِ تعجب ہے۔

البتہ پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

[2] "مثلات" "مثلة" کی جمع ہے۔ یہ ان عذابوں اور سزاؤں کے معنی میں ہے جو گزشتہ امتوں پر اس طرح سے نازل ہوئیں کہ ضرب المثل ہو گئیں۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے، لوگوں کی برائیوں، قباحتوں اور ظلم و ستم کے مقابلے میں خدا صاحبِ مغفرت ہے اور شدید العقاب بھی ہے (وان ربک لذو مغفرة للناس علی ظلمھم وان ربک لشدید العقاب)۔

اس کی شدتِ عقاب و سزا اس کی رحمتِ عام کے لیے ہرگز رکاوٹ نہیں جیسا کہ اس کی رحمتِ عام شدتِ عقاب و سزا میں رکاوٹ نہیں ہے۔

یہ اشتباہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ظالموں کو موقع دیتا ہے کہ جو کچھ وہ چاہیں کریں کیونکہ ایسے مواقع پر تو وہ شدید العقاب ہے۔ پروردگار کی یہ دو صفات یعنی "ذو مغفرة" اور "شدید العقاب" کے آثار کا تعلق خود انسان کے وجود سے ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **خلقتِ نو کے بارے میں تعجب کیوں؟** قرآن کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کی مشکلات میں سے ایک مشرک قوموں کے سامنے معادِ جسمانی کے اثبات کا مسئلہ تھا کیونکہ وہ لوگ ہمیشہ اس بات پر تعجب کرتے تھے کہ کس طرح سے انسان مٹی ہونے کے بعد دوبارہ حیات کی طرف پلٹ آئے گا۔ یہ جو محلِ بحث آیات میں ہے:

ءاذا کنا ترابا ءانا لفی خلق جدید

کیا جب ہم مٹی ہو جائیں تو دوبارہ حیات نو پائیں گے۔

ایسی ہی تعبیرات تھوڑے بہت فرق کے ساتھ قرآن کی سات دیگر آیات میں موجود ہیں، جو یہ ہیں:

مومنون — ۳۵، مومنون — ۸۲، نمل — ۶۷، صٰفٰت — ۱۶، صٰفٰت — ۵۳، ق — ۳ اور واقعہ — ۴۷۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ اعتراض ان کی نگاہ میں بہت ہی اہم تھا۔ تبھی تو ہر جگہ اسی کا سہارا لیتے تھے لیکن قرآن مجید بہت ہی مختصر الفاظ میں انہیں دو ٹوک اور قاطع جواب دیتا ہے۔ مثلاً سورہ اعراف کی آیہ ۲۹ میں:

کما بدأکم تعودون

جیسا کہ ابتداء میں تمہیں پیدا کیا گیا ہے اسی طرح پھر پلٹائے جاؤ گے۔

چند الفاظ میں یہ ایک دندان شکن جواب ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

وھو اھون علیہ

تمہاری بازگشت تو تمہارے آغاز سے بھی سادہ اور آسان ہے۔ (روم — ۲۷)

کیونکہ ابتداء میں تم کچھ بھی نہیں تھے لیکن اب کم از کم بوسیدہ ہڈی یا مٹی کی صورت میں تو تم موجود ہو۔

بعض مقامات پر قرآن لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر وسیع کائنات زمین و آسمان میں عظمتِ قدرتِ خدا کا مشاہدہ کراتا ہے اور کہتا ہے:

کیا وہ ذات جو یہ سب کرات، کہکشائیں، ثوابت اور سیارے پیدا کر سکتی ہے اس کے اعادہ پر قادر نہیں ہے۔ (یٰسین ۸۱)

۲۔ **کیا خدا ستمگروں کو بخشش دیتا ہے؟** مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ ستمگار لوگوں کے ظلم کے باوجود خدا صاحبِ مغفرت و بخشش ہے۔ مسلم ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ خدا اپنی عفو و بخشش ان ظالموں کے شاملِ حال کرتا ہے جو اپنے ظلم پر اصرار کرتے ہیں

بلکہ وہ چاہتا ہے کہ ظالموں کو بھی اس وسیلے سے بازگشت اور اپنی اصلاح کا امکان فراہم کرے۔ دوسرے جملے میں ان کے انجام کی طرف اشارہ موجود ہے کہ "تیرا پروردگار شدید العقاب ہے"۔

ضمناً اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہانِ کبیرہ (کہ جن میں سے ایک ظلم ہے) بھی قابلِ بخشش ہیں (تمام تر شرائط کے ساتھ)۔ یہ آیت اور اس جیسی دیگر آیات اس طرح کے خطابات کا دو ٹوک اور قاطع جواب دیتی ہیں جو قدیم زمانے سے معتزلہ کے حوالے سے نقل ہوتی ہے کہ جو کہتے ہیں کہ گناہانِ کبیرہ کبھی بھی نہیں بخشے جائیں گے۔

بہرحال پروردگار کی "وسیع مغفرت" اور اس کے "شدید عقاب" کا ذکر در حقیقت سب کو میانہ راہ پر اور خوف و رجا کے درمیان لاتا ہے کہ جس کا اہم عامل انسان کی تربیت ہے کہ نہ بالکل رحمتِ الٰہی سے مایوس ہو جائے چاہے اس کا جرم سنگین بھی ہو اور نہ ہی کبھی اپنے آپ کو اس کی سزا سے مامون سمجھے چاہے اس کا گناہ خفیف ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لیے ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے روایت ہے:

لولا عفو الله و تجاوزه ما هنأ احد العيش، و لولا وعيد الله و عقابه لاتكل كل واحد

اگر خدا کی عفو و بخشش نہ ہوتی تو زندگی ہرگز کسی کے حلق میں گوارا نہ ہوتی اور اگر خدائی تہدید اور سزائیں نہ ہوتیں تو ہر شخص اس کی رحمت کے نام پر جو چاہتا انجام دیتا۔[1]

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ گناہ انجام دیتے ہوئے بڑے غرور سے کہتے ہیں کہ "خدا کریم ہے" در حقیقت انہوں نے خدا کے کرم پر بھروسہ نہیں کیا وہ جھوٹ بولتے ہیں اور در اصل میں وہ پروردگار کی سزا اور عذاب سے بے اعتنائی کرتے ہیں۔

---

[1] مجمع البیان صفحہ ۲۷۸ جلد ۵ و ۶ زیرِ بحث آیت کے ذیل میں، تفسیر قرطبی جلد ۴ صفحہ ۳۴۹۷۔

۷۔ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۗ إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ ۖ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝

ترجمہ

۷۔ اور وہ جو کافر ہو گئے کہتے ہیں کہ اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر آیت (اور معجزہ) کیوں نازل نہیں ہوا۔ تو تو صرف ڈرانے والا ہے اور ہر گروہ کے لیے ہدایت کرنے والا ہوتا ہے (اور یہ تو سب بہانے ہیں نہ کہ حقیقت کی جستجو)۔

تفسیر

پھر بہانہ سازی

گذشتہ آیات میں کچھ اشارے مسئلہ توحید کے متعلق کیے گئے ہیں اور ایک اشارہ مسئلہ معاد کی طرف کیا گیا ہے۔ اس کے بعد زیر بحث آیت میں ہٹ دھرم مشرکین کی طرف سے "نبوت" کے بارے میں ایک اعتراض بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کفار کہتے ہیں: اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر کیوں کوئی معجزہ اور نشانی نازل نہیں ہوتی (ویقول الذین کفروا لولا انزل علیہ اٰیۃ من ربہ)۔

واضح ہے کہ پیغمبر کی ذمہ داریوں میں سے ایک یہ ہے کہ اپنی حقانیت کی سند کے طور پر وحی الٰہی سے اپنے تعلق کے ثبوت میں معجزات پیش کرے اور مثلاً متلاشیانِ حق نبوت کی دعوت میں شک و تردد کے موقع پر حق رکھتے ہیں کہ معجزے کا مطالبہ کریں لیکن اگر نبوت کے دلائل دوسرے طریقے سے آشکار اور واضح ہوں تو پھر وہ حق نہیں رکھتے لیکن ایک نکتے کی طرف بھرپور توجہ کرنا چاہیے کہ مخالفین انبیاء ہمیشہ حسن نیت کے حامل نہیں ہوتے تھے یعنی معجزات حق معلوم کرنے کے لیے طلب نہیں کرتے تھے بلکہ ہٹ دھرمی اور حق کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کے لیے ہر وقت عجیب اور عجیب و غریب خارقِ عادت کا تقاضا کرتے تھے۔ ایسے معجزات کو جنہیں "معجزاتِ اقتراحی" کہا جاتا ہے ہرگز کشفِ حقیقت کے لیے نہیں تھے۔ اسی لیے انبیاء ان کا تقاضا تسلیم نہیں کرتے تھے۔ درحقیقت ان ہٹ دھرم کفار کا یہ خیال تھا کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دعویٰ ہے کہ میں ہر معجزہ انجام دینے پر قادر ہوں اور معجزہ گر ہوں اور یہاں بیٹھا ہوں جو شخص بھی کسی معجزے کا تقاضا کرے گا وہ میں پیش کروں گا۔ لیکن انبیاء یہ حقیقت بیان کرتے کہ ایسے لوگوں کی خواہشات ٹھکرا دیتے تھے کہ معجزات خدا کے ہاتھ میں ہیں اور اسی کے حکم سے انجام پاتے ہیں اور ہماری ذمہ داری لوگوں کی تعلیم و تربیت ہے۔

اسی بہانہ پر زیر بحث آیت میں ہے کہ خدا تعالیٰ اس گفتگو کے بعد فرماتا ہے: اے پیغمبر! تو تو صرف ڈرانے والا ہے اور ہر قوم و ملت

کے لیے ہادی ملا ہوتا ہے (انما انت منذر ولکل قوم هاد)۔

دو سوال اور ان کے جواب

۱۔ **کافروں کا جواب کیسے ہوا؟** سوال پیدا ہوا کہ "انما انت منذر ولکل قوم هاد" کس طرح کافروں کی معجزہ طلبی کا جواب ہو سکتا ہے۔

جو بات مندرجہ بالا سطروں میں کہی گئی ہے اس کی طرف توجہ دینے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پیغمبر ایک ایسی شخصیت نہیں کہ ہر تقاضے، ہر مقصد اور ہر مراد کے لیے معجزہ ایجاد کرے۔ پہلے تو اس کی ذمہ داری ہے "انذار" اور انہیں ڈرانا جو بے راہ چلتے ہیں اور صراطِ مستقیم کی دعوت دینا۔ البتہ جس مقام پر انذار اور ڈرانے کی تکمیل کے لیے اور گمراہوں کو صراطِ مستقیم پر لانے کے لیے معجزے کی ضرورت ہو مسلم ہے کہ پیغمبر کوتاہی نہیں کرے گا۔ البتہ ان ہٹ دھرم لوگوں کے جواب میں ہرگز اس کی ایسی کوئی ذمہ داری نہیں جو بالکل راستے پر نہیں آتے۔

دراصل قرآن کہتا ہے کہ یہ کفار پیغمبر کی اصلی ذمہ داری بھول چکے ہیں اور وہ ہے انذار، ڈرانا اور خدا کی طرف دعوت دینا اور انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ اس کی بنیادی ذمہ داری معجزہ دکھانا ہے۔

۲۔ **"ولکل قوم هاد" سے کیا مراد ہے؟** کچھ مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ دونوں صفات "منذر" اور "ہادی" پیغمبر اکرمؐ کی طرف لوٹتی ہیں۔ ان کے خیال میں دراصل یہ جملہ یوں ہے:

انت منذر وهاد لکل قوم

تو ہر قوم اور ہر گروہ کے لیے ڈرانے والا اور ہادی ہے۔

لیکن یہ تفسیر مندرجہ بالا آیت کے ظاہر کے خلاف ہے کیونکہ واؤ نے "لکل قوم هاد" کو "انما انت منذر" سے جدا کر دیا ہے۔ ہاں البتہ اگر لفظ "هاد"، "لکل قوم" سے پہلے ہوتا تو یہ معنی پورے طور پر قابلِ قبول تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔

کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں مقصد یہ تھا کہ حق کی طرف دعوت کرنے والوں کی دو قسمیں بیان کی جائیں۔ پہلی قسم ان دعوت کرنے والوں کی جو انذار کریں اور ڈرائیں اور دوسری قسم ان دعوت کرنے والوں کی جو ہدایت کریں۔

شاید آپ سوال کریں گے کہ "انذار" اور "ہدایت" میں کیا فرق ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "انذار" اس لیے ہے کہ گمراہی اور بے راہ روی سے راستے کی طرف بلایا جائے اور صراطِ مستقیم پر پہنچایا جائے لیکن "ہدایت" اس لیے ہے کہ لوگوں کو راستے پر آ جانے کے بعد آگے لے جایا جائے۔

حقیقت میں "منذر"، "علت محدثہ" یعنی ایجاد کرنے والے سبب، کی طرح ہے اور "ہادی"، "علت مبقیہ" یعنی باقی رکھنے والے اور آگے لے جانے والے سبب، کی مانند ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے ہم "رسول" اور "امام" سے تعبیر کرتے ہیں۔ رسول شریعت کی بنیاد رکھتا ہے اور امام شریعت کا محافظ و نگہبان ہے (اس میں شک نہیں کہ دیگر مواقع پر خود ذاتِ پیغمبر پر لفظ "ہادی" کا اطلاق ہوا ہے لیکن زیرِ بحث آیت میں "منذر" کے ذکر کے قرینے سے ہم سمجھتے ہیں کہ "ہادی" سے یہاں مراد وہ شخص ہے جو بعد از پیغمبر جاری و ساری

سکے اور اس کی شریعت کا محافظ و نگہبان ہو۔

متعدد روایات کہ جو پیغمبر اسلامؐ سے مروی ہیں اور شیعہ سنی کتب میں موجود ہیں ان میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ:

میں منذر ہوں اور علی ہادی ہیں۔

یہ روایات مندرجہ بالا تفسیر کی مکمل طور پر تائید کرتی ہیں۔ چند ایک روایات ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) اسی آیت کے ذیل میں فخر الدین رازی ابن عباس سے نقل کرتے ہیں:

وضع رسول الله يده على صدره فقال انا المنذر ثم اوما الى منكب علیؑ وقال

انت الهادی بك يهتدی المهتدون من بعدی

رسول اللہ نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر مارا اور فرمایا: میں منذر ہوں۔ پھر علی کے کندھے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا تو ہادی ہے اور تیرے ذریعے میرے بعد ہدایت پانے والے ہدایت پائیں گے۔[1]

یہ روایت اہل سنت کے مشہور عالم علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں، اسی طرح علامہ ابن صباغ مالکی نے "فصول المہمہ" میں، گنجی شافعی نے کفایۃ الطالب میں، طبری نے اپنی تفسیر میں، ابوحیان اندلسی نے اپنی تفسیر "بحر المحیط" میں، علامہ نیشاپوری نے اپنی تفسیر میں اور اسی طرح دیگر بہت سے علماء نے نقل کی ہے۔

(۲) حموینی جو اہل سنت کے مشہور عالم ہیں اپنی کتاب "فرائد السمطین" میں ابوہریرہ اسلمی سے اس طرح نقل کرتے ہیں:

ان المراد بالهادی علی (ع)

ہادی سے مراد حضرت علیؑ ہیں۔

(۳) "حبیب السیر" کے مؤلف میر غیاث الدین اپنی کتاب کی دوسری جلد ص ۱۲ پر اس طرح لکھتے ہیں:

قد ثبت بطرق متعددة انه لما نزل قوله تعالىٰ "انما انت منذر ولكل قوم هاد" قال لعلی

"انا المنذر وانت الهادی بك يا علی يهتدی المهتدون من بعدی"

متعدد طرق سے نقل ہوا ہے کہ جب آیت "انما انت منذر ولکل قوم ھاد" نازل ہوئی تو پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا: "میں منذر ہوں اور تو ہادی ہے اور میرے بعد ہدایت پانے والوں کی تیرے ذریعے ہدایت ہوگی۔"

آلوسی نے "روح المعانی" میں، شبلنجی نے "نور الابصار" میں اور شیخ سلیمان قندوزی نے "ینابیع المودۃ" میں یہی حدیث انہی الفاظ میں یا اس کے قریب قریب الفاظ میں نقل کی ہے۔

اکثر روایات میں اس حدیث کے راوی اگرچہ ابن عباس ہی ہیں تاہم یہ روایت ابن عباس ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ حموینی کی نقل کے مطابق خود حضرت علیؑ سے بھی مروی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

المنذر النبی والهادی رجل من بنی هاشم يعنی نفسه

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۱۹ ص ۱۴۔

منذر پیغمبر ہیں، ہادی بنی ہاشم میں سے ایک شخص ہے کہ اس سے مراد خود آپ کی ذات ہے[۱]

اس حدیث میں اگرچہ مسئلہ ولایت اور خلافت بلافصل کی تصریح نہیں کی گئی تاہم اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ہدایت اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے حضرت علیؑ میں منحصر نہ تھی بلکہ تمام سچے علماء اور رسول اللہ کے خاص اصحاب یہ کام انجام دیتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ ہادی کے طور پر حضرت علیؑ کا تعارف آپ کے خاص امتیاز اور خصوصیت کی وجہ سے ہے۔ آپ بہترین اور افضل ترین ہادی کے مصداق ہیں اور اس قسم کا مطلب ولایت اور خلافت پیغمبر سے جدا نہیں ہو سکتا۔

---

۱ مزید وضاحت کے لیے کتاب نفیس "احقاق الحق" جلد ۳ صفحہ ۸۸ سے بعد اور مختلف شیعہ سنی حضرات کی کتابوں کی طرف رجوع کریں۔

۸۔ اَللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَحۡمِلُ کُلُّ اُنۡثٰی وَ مَا تَغِیۡضُ الۡاَرۡحَامُ وَ مَا تَزۡدَادُ ؕ وَ کُلُّ شَیۡءٍ عِنۡدَہٗ بِمِقۡدَارٍ ○

۹۔ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَ الشَّہَادَۃِ الۡکَبِیۡرُ الۡمُتَعَالِ ○

۱۰۔ سَوَآءٌ مِّنۡکُمۡ مَّنۡ اَسَرَّ الۡقَوۡلَ وَ مَنۡ جَہَرَ بِہٖ وَ مَنۡ ہُوَ مُسۡتَخۡفٍۭ بِالَّیۡلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّہَارِ ○

ترجمہ

۸۔ خدا ان تمام جنینوں سے آگاہ ہے جن کا ہر مادہ انسان یا مادہ جانور حامل ہے اور جسے رحم کم کرتے ہیں (اور مقررہ مدت سے پہلے جنتے ہیں) اور جسے زیادہ کرتے ہیں اور اس کے ہاں ہر چیز کی مقدار معین ہے۔

۹۔ وہ غیب و شہود سے آگاہ ہے اور بزرگ و متعال ہے۔

۱۰۔ اُسے فرق نہیں پڑتا کہ تم میں سے کچھ پنہاں گفتگو کرتے ہیں یا آشکار اور وہ جو رات کو خفیہ حرکت کرتے ہیں یا دن کی روشنی میں۔

تفسیر

خدا کا بے پایاں علم

ان آیات میں پروردگار کی کچھ صفات بھی ہیں اور یہ آیات توحید اور معاد کی بحث کی تکمیل بھی کرتی ہیں۔ یہاں پروردگار کے وسیع علم اور ہر چیز کے بارے میں اس کی آگاہی کے متعلق گفتگو ہے۔ وہی علم جو نظام آفرینش، عجائبات خلقت اور دلائل توحید کا سرچشمہ ہے۔ وہی علم جو قیامت اور اس کی عظیم عدالت کی بنیاد ہے۔ ان آیات میں علم کے دونوں پہلوؤں (نظام آفرینش کا علم اور بندوں کے اعمال کا علم) کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: خدا ان جنینوں (ان بچوں جو شکم مادر میں ہوتے ہیں) سے آگاہ ہے کہ جنہیں ہر عورت اور ہر مادہ جانور اپنے شکم میں اٹھائے ہوتا ہے (اللہ یعلم ما تحمل کل انثیٰ)۔

اور اسی طرح انہیں بھی جانتا ہے جنہیں رحم وقت مقررہ سے پہلے جن دیتے ہیں (و ما تغیض الارحام)۔[1]

اور نیز ان سے بھی باخبر ہے جنہیں رحم وقت مقررہ سے زیادہ روک رکھتے ہیں (و ما تزداد)۔

مندرجہ بالا تینوں جملوں کی تفسیر کے بارے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے۔

جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے بعض مفسرین حمل کی تین قسموں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ یعنی کبھی وہ وقت مقررہ پر پیدا ہوتا ہے، کبھی وقت سے پہلے (گویا رحم اسکا کچھ وقت کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے) اور کبھی وقت مقررہ کے بعد۔ خدا ان تمام کو جانتا ہے۔ وہ جنین کی تاریخ تولد اور لمحۂ ولادت سے بے کم و کاست آگاہ ہے اور یہ ایسے امور میں سے ہے جسے کوئی شخص اور کوئی مشینری تعیین نہیں کر سکتی۔ یہ علم پروردگار کی ذات پاک سے مخصوص ہے اور اس کی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ رحموں اور جنینوں کی استعداد بالکل مختلف ہوتی ہے اور کوئی شخص بھی ان اختلافات سے تمام اور کامل آگاہ نہیں ہے۔

بعض دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ یہ تین جملے حمل کے دنوں میں رحم کی مختلف حالتوں کی طرف اشارہ ہیں۔ پہلا جملہ خود جنین کی طرف اشارہ ہے کہ رحم اسے محفوظ کر لیتا ہے۔ دوسرا جملہ خون حیض کی طرف اشارہ ہے جو رحم میں گرتا ہے اور جنین اسے جذب کر لیتا ہے، اسے چوستا ہے اور اسے نگل لیتا ہے اور تیسرا جملہ اضافی خون کی طرف اشارہ ہے جو حمل کے دنوں میں کبھی کبھی باہر گرتا ہے یا ولادت کے وقت یا اس کے بعد رحم سے الگ ہوتا ہے۔[2]

آیت کی تفسیر کے سلسلے میں دیگر احتمالات بھی ذکر کیے گئے ہیں کہ جن میں سے کوئی بھی مختلف ہونے کے باوجود دوسرے سے متضاد نہیں ہے اور ہو سکتا ہے یہ آیت ان تمام تفاسیر کی طرف اشارہ ہو اگرچہ ظاہری مفہوم وہی ہے جو پہلی تفسیر کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ لفظ «حمل» "جنین کے اٹھانے" کا معنی دیتا ہے اور اس کے قرینے سے «تغیض» اور «تزداد» کے الفاظ دوران حمل کی کمی اور بیشی کی طرف اشارہ ہیں۔

ایک حدیث جو امام محمد باقر علیہ السلام یا امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے اس طرح ہے:

الغیض کل حمل دون تسعة اشهر، و ما تزداد کل شیء یزداد علی تسعة اشهر

«غیض» ہر اس حمل کو کہتے ہیں جس کی مدت ۹ ماہ سے کم ہو اور «ما تزداد» ہر وہ چیز ہے جو ۹ ماہ سے زیادہ ہو۔

اس حدیث کے آخر میں فرماتے ہیں:

و کلما رأت المرأة الدم الخالص فی حملها فانها تزداد بعدد الایام التی زاد فیها فی حملها من الدم

---

[1] «تغیض» «غیض» کے مادہ سے ہے۔ یہ اصل میں بہنے والی چیز کو نگل جانے اور اسے جذب کر لینے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے یہ لفظ نقصان اور فساد کے معنی میں بھی آیا ہے۔ «غیض» ایسے مکان اور جگہ کو کہا جاتا ہے جس میں پانی کھڑا ہو جائے اور زمین اسے نگل جائے۔ «لیلة غائضة» تاریک رات کے معنی میں ہے جس کی تاریکی نے ... سارا نور نگل لیا ہو۔

[2] تفسیر المیزان میں آیت کی اس تفسیر کی تائید کے ضمن میں صاحب تفسیر فرماتے ہیں کہ اہل بیت کی بعض روایات اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں اور جو کچھ ابن عباس سے منقول ہوا ہے وہ بھی احتمالاً اسی معنی پر منطبق ہوتا ہے۔
لیکن جو روایات تفسیر نور الثقلین میں اس آیت کے ذیل میں اہل بیت سے نقل ہوئی ہیں وہ زیادہ تر اسی پہلے معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ رحم خون سے الگ رکھتے ہیں۔

جب عورت حمل کی حالت میں خالص خون دیکھے تو اس خون کے ایام کی تعداد کے برابر حمل کی مدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔[1]

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: ہر چیز خدا کے ہاں معین مقدار کی حامل ہے (وکل شیء عندہ بمقدار)۔ کہیں یہ خیال نہ ہو کہ مدت حمل کی یہ کمی بیشی بغیر کسی حساب کتاب کے اور بغیر کسی سبب کے ہے بلکہ اس مدت کی ہر گھڑی اور ہر لحظہ نپا تلا ہے۔

بعد والی آیت درحقیقت گذشتہ آیت میں بیان کی گئی بات کی دلیل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا غیب و شہود (اور پنہاں و آشکار) سب کو جانتا ہے (عالم الغیب والشھادۃ)۔

غیب و شہود کے بارے میں اس کی آگاہی اس بناء پر ہے کہ "وہ بزرگ و برتر ہے، ہر چیز کے لیے متعال ہے اور ہر چیز پر مسلط ہے" اسی بناء پر وہ ہر جگہ حاضر ہے اور کوئی چیز اس کی نگاہِ علم سے پوشیدہ نہیں ہے (الکبیر المتعال)۔

اس بحث کی تکمیل کے لیے اور اس کے علم بے پایاں کے بارے میں تاکید کے لیے مزید فرمایا گیا ہے "خدا کے لیے ان لوگوں میں کوئی فرق نہیں کہ جو اپنی بات چھپاتے ہیں اور وہ جو آشکار کرتے ہیں وہ سب کچھ جانتا اور سنتا ہے (سواء منکم من اسر القول ومن جھر بہ)۔

نیز اس کے لیے ان لوگوں میں کچھ فرق نہیں کہ جو خفیہ طور پر رات کی تاریکی میں اور ظلمت کے پردوں میں قدم اٹھاتے ہیں اور وہ کہ جو آشکارا روز روشن میں اپنے کاروبار کے لیے نکلتے ہیں (ومن ھو مستخف باللیل وسارب بالنھار)۔[2]

اصولی طور پر اس ہستی کے لیے نور و ظلمت، تاریکی و روشنی اور غیب و شہود کوئی مفہوم نہیں رکھتے جو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ وہ یکساں طور پر ان سب سے آگاہ اور باخبر ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **قرآن اور جنین شناسی:** قرآن مجید میں بارہا جنین، اس کے عجائب و غرائب اور نظام کی طرف توحید، خدا شناسی اور حضرت حق کے علم بے پایاں کی ایک دلیل کے طور پر اشارہ ہوا ہے۔ البتہ جنین شناسی ایک بالکل نیا علم ہے۔ گذشتہ زمانے میں علماء اور سائنسدان جنین اور اس کے مختلف مراحل کے بارے میں بہت محدود اطلاعات رکھتے تھے لیکن علم اور سائنس کی پیش رفت کے ساتھ اس علم میں تیزی سے غیر معمولی ترقی ہوئی ہے اور اس خاموش اور بے آواز دنیا کے بہت سے اسرار و عجائب منکشف ہوئے ہیں۔ اس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ جنین کی خلقت، اس کے تحول اور تکامل میں خدا شناسی کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔

اس موجود کی کون خبر پا سکتا ہے جو ہر کسی کی دسترس سے باہر ہو قرآنی الفاظ میں جو "ظلمات ثلاث" (تین تاریکیوں) میں موجود ہو اور جس کی زندگی انتہائی ظریف اور دقیق ہو۔ کون اسے ضروری مقدار میں غذا بہم پہنچا سکتا ہے اور کون تمام مراحل میں اس کی ہدایت کر سکتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں جب خدا فرماتا ہے کہ "خدا جانتا ہے کہ ہر مادہ جانور کے رحم میں کیا ہے" تو اس کا یہ مفہوم نہیں کہ وہ صرف اس کی جنسیت (یعنی نر یا مادہ ہونے) کے بارے میں آگاہ ہے بلکہ اس کی تمام مشخصات، استعداد، ذوق اور طاقت کہ جو بالقوۃ اس میں پوشیدہ ہے کے متعلق آگاہ ہے

---

[1] نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۴۸۹۔

[2] "سارب" اصل میں "سرب" (بروزن "ضرب") کے مادہ سے "جاری پانی" کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ اس انسان کے بارے میں استعمال ہونے لگا کہ جو کسی کام کے پیچھے [illegible]

اور یہ وہ امور ہیں جن کے بارے میں کوئی شخص کسی بھی ذریعے سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتا۔

اس بناء پر چنین میں حساب شدہ نظاموں کی موجودگی اور دقیق و پیچیدہ ارتقاء میں اس کی راہبری ایک عالم و قادر مبداء کے بغیر ممکن نہیں۔

۲۔ **ہر چیز کی ایک حد اور مقدار ہے:** قرآن مجید کی مختلف آیات میں ہے کہ ہر چیز کی ایک حد ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتی۔

سورہ طلاق آیہ ۳ میں ہے:

قد جعل الله لکل شیء قدرا

خدا نے ہر چیز کے لیے ایک مقدار معین کی ہے۔

سورہ حجر آیہ ۲۱ میں ہے:

وان من شیء الا عندنا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم

ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم ایک معین مقدار کے سوا نازل نہیں کرتے۔

زیر بحث آیات میں بھی ہم نے پڑھا ہے:

و کل شیء عنده بمقدار

اور تمام چیزوں کی اس کے ہاں ایک مقدار ہے۔

یہ سب آیات اس امر کی طرف اشارہ ہیں کہ اس عالم کی کوئی چیز حساب کتاب کے بغیر نہیں ہے یہاں تک کہ طبیعی دنیا میں جن موجودات کو ہم بغیر حساب کتاب کے فرض کر لیتے ہیں وہ سب دقیق اور جچا تلا حساب رکھتی ہیں چاہے ہم اسے جانیں یا نہ جانیں۔ اصولی طور پر خدا کے حکیم ہونے کا بھی اس کے علاوہ کوئی مفہوم نہیں کہ ہر چیز کی خلقت میں ایک پروگرام، حد اور مقدار معین ہوتی ہے۔ جن اسرار خلقت کو ہم نے آج علوم کے ذریعے معلوم کیا ہے وہ اس حقیقت کی پورے طور پر تاکید کرتے ہیں۔ مثلاً انسان کا خون کہ جو اس کے وجود کی زندگی کا سب سے اہم مادہ ہے اور جو تمام ضروری مواد کو انسانی بدن کے تمام خلیوں تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے بیس سے زیادہ عناصر کا مرکب ہے۔ ان عناصر کا تناسب اور کیفیت اس قدر دقیق اور جچی تلی ہے کہ اس میں تھوڑے سے تغیر سے بھی انسانی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدن کی خرابیوں کو پہچاننے کے لیے فوراً خون ٹیسٹ کرتے ہیں اور شوگر، چربی، البومن، آئرن اور دیگر اجزائے ترکیبی کا اندازہ لگایا جاتا ہے اور ان اجزاء کی کمی بیشی سے فوراً بدن کی بیماریوں کے علل و اسباب معلوم کر لیے جاتے ہیں۔

ان کا خون ہی ایسی دقیق ترکیب نہیں رکھتا بلکہ یہی صورت تمام عالم ہستی کی ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ کرنے سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کبھی کبھار وہ چیزیں جنہیں ہم عالم ہستی کی بے نظمیاں خیال کرتے ہیں دراصل ہمارے علم کی نارسائی اور ناپختگی سے مربوط ہیں ایک موحد اور سچا خدا پرست عالم کے بارے میں کبھی بھی ایسا تصور نہیں کر سکتا اور علوم کی تدریجی پیش رفت اسی حقیقت کی گواہ ہے۔

اس گفتگو سے ہم یہ سبق بھی سیکھ سکتے ہیں کہ انسانی معاشرہ جو پورے نظام ہستی کا ایک حصہ ہے اگر صحیح زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ "کل شیء عنده بمقدار" کا اصول اس کے سارے وجود پر حکمران ہو وہ ہر قسم کے افراط و تفریط سے بچے اور ہر اس کام سے پرہیز کرے جو بغیر کسی حساب کتاب کے ہو اور اس کے تمام اجتماعی اصول جچے تلے ہونے چاہئیں۔

۳۔ **خدا کے لیے غیب و شہود برابر ہیں:** زیرِ بحث آیات میں یہ بات ذکر ہوئی ہے کہ غیب و شہود بارگاہِ خداوندی میں واضح اور روشن ہے۔ بنیادی طور پر غیب و شہود دو نسبتی مفہوم ہیں کہ جو ایسے موجود کے بارے میں استعمال ہوتے ہیں جس کا علم اور ہستی محدود ہوں۔ مثلاً ہم حواسِ خمسہ کے حامل ہیں تو جو کچھ ہماری آنکھوں، قوتِ سماعت اور دیگر حواس کی پہنچ کے اندر ہے وہ ہمارے لیے "شہود" ہے اور جو کچھ ہماری دید و شنید سے باہر ہے ہمارے لیے وہ "غیب" ہے۔ فرض کیا اگر ہماری نگاہ کی قدرت لا محدود ہوتی، ہم اشیاء کے ظاہر و باطن کو دیکھ سکتے اور ذراتِ عالم کے اندر ہماری نظر اتر جاتی تو تمام چیزیں ہمارے لیے "شہود" ہو جاتیں۔

خدا کی ذاتِ پاک کے علاوہ باقی تمام چیزیں چونکہ محدود ہیں لہٰذا ان تمام چیزوں کے لیے غیب و شہود موجود ہے لیکن ذاتِ الٰہی چونکہ لامحدود ہے اور ہر جگہ موجود ہے لہٰذا اس کے لیے تمام چیزیں شہود ہیں اور اس کی ذاتِ پاک کے بارے میں "غیب" کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔ اگر ہم کہتے ہیں کہ خدا "عالم الغیب والشھادۃ" ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے لیے غیب یا شہود ہے اُس کے لیے یکساں اور شہود ہے۔

اگر ہم روشنی میں اپنی ہتھیلی کی طرف دیکھیں تو کیا ممکن ہے کہ جو کچھ اس میں ہے ہم اس سے بے خبر رہ جائیں۔ عالمِ ہستی علمِ خدا کے سامنے اس سے بھی کئی درجے زیادہ واضح و آشکار ہے۔

۴۔ **علمِ خدا کی طرف توجہ کے تربیتی آثار:** یہ جو ہم مندرجہ بالا آیات میں پڑھتے ہیں کہ خدا پنہاں و آشکار چیزوں کو، رات اور دن کی آمد و رفت کو اور تمہاری تمام حرکات کو یکساں طور پر جانتا ہے اور اس کے علم کی بارگاہ میں یہ سب آشکار ہیں۔ اس حقیقت پر اگر ہم حقیقی ایمان رکھتے ہوں اور یہ احساس رکھتے ہوں کہ وہ ہمارے اوپر ہر وقت نگران ہے تو اس سے ہماری روح، فکر، گفتار اور کردار میں ایک بہت گہرا انقلاب پیدا ہو جائے گا۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے امام صادق علیہ السلام سے سوال کیا: آپ کی زندگی کا پروگرام کیا ہے؟

آپ نے چند امور بیان فرمانے کے بعد فرمایا:

علمت ان اللّٰہ مطلع علی فاستحییت

میرا ایک پروگرام یہ ہے کہ میں نے جان لیا ہے کہ خدا میرے تمام کاموں سے آگاہ ہے اور ان کے بارے میں باخبر ہے لہٰذا میں اس کی نافرمانی سے حیا کرتا ہوں۔

تاریخِ اسلام میں اور حقیقی مسلمانوں کی روزمرہ زندگی میں ہم اس حقیقت کے بہت سے جلوے مشاہدہ کرتے ہیں کہتے ہیں ایک باپ بیٹا ایک باغ میں پہنچے۔ باپ باغ کے مالک کی اجازت کے بغیر پھل توڑنے کے لیے درخت پر چڑھ گیا۔ اس کا بیٹا جو بامعرفت نوجوان تھا کہنے لگا: ابا! نیچے اُتر آؤ۔

باپ پریشان ہوا اور ڈرا۔ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے فوراً نیچے اتر آیا۔ اس نے پوچھا: مجھے تو نظر نہیں آیا، کون تھا جو مجھے دیکھ رہا تھا؟

لڑکے نے کہا: تمہارے اوپر ہے۔

اس نے اوپر کی طرف دیکھا تو اسے کوئی چیز نظر نہ آئی۔

بیٹے نے کہا: میری مراد خدا ہے، جو ہم سب سے مافوق اور ہم سب پر محیط ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ ایک انسان کے دیکھنے سے تو تمہیں خوف آتا ہے لیکن خدا جو تمہیں ہر حالت میں دیکھ رہا ہے اس سے تجھے کوئی خوف نہیں آتا۔ یہ کیا ایمان ہے؟

۱۱۔ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْۗءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ۝

ترجمہ

۱۱۔ انسان کے لیے کچھ مامورین ہیں کہ جو پے در پے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے (غیر حتمی) حوادث سے محفوظ رکھتے ہیں لیکن خدا کسی قوم (اور ملت) کی سرنوشت کو نہیں بدلتا مگر یہ کہ وہ خود اسے تبدیل کریں اور جب خدا کسی قوم کے بارے میں (ان کے اعمال کی وجہ سے) برائی کا ارادہ کرتا ہے تو کوئی چیز اس کے لیے رکاوٹ نہیں ہوتی اور خدا کے علاوہ ان کا کوئی سرپرست نہیں ہوگا۔

تفسیر

غیبی محافظ

گزشتہ آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ خدا عالم الغیب والشہادۃ ہونے کی بناء پر لوگوں کے پنہاں اور آشکار سے باخبر ہے اور وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔

زیر بحث آیت میں مزید ارشاد فرمایا گیا ہے: اس کے علاوہ کہ خدا اپنے بندوں کا محافظ اور نگہبان ہے "کچھ مامورین ہیں کہ جو پے در پے آگے اور پیچھے سے حوادث سے انسان کی حفاظت کرتے ہیں" (له معقبات من بين يديه ومن خلفه يحفظونه من امر الله)[1]

لیکن اس بناء پر کوئی یہ اشتباہ نہ کرے کہ یہ حفاظت و نگہبانی غیر مشروط ہے اور انسان کہیں اپنے آپ کو برے کاموں میں ڈگلا دے یا کہیں انسان

---

[1] مفسرین میں اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ "له" کی ضمیر کس کی طرف لوٹتی ہے۔ مشہور تفسیر یہی ہے کہ یہ انسان کی طرف لوٹتی ہے جس کی طرف قبل کی آیت میں اشارہ ہوا ہے۔ بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ ضمیر پیغمبر یا خدا کی طرف لوٹتی ہے لیکن یہ احتمال زیر بحث آیت سے مناسبت نہیں رکھتا (غور کیجئے گا)۔

حوالے کر دیں گے، کا مرتکب نہ ہونے لگے اور اس طرح اپنے آپ کو عذاب کا مستوجب بنا کر بھی توقع رکھے کہ خدا اور اس کے مامور محافظین اس کی حفاظت کریں گے، مزید فرمایا گیا ہے: خدا کسی قوم و ملت کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے آپ میں تبدیلی پیدا نہ کرے (ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتٰی یغیروا ما بانفسھم)۔ دوبارہ اس لیے کہ کوئی غلط فہمی نہ ہو کہ ان فی حافظت کے مامور ہونے کے باوجود گناہ و خطا اور خدائی تقاضا کا کیا معنی ہے، آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: جس وقت خدا کسی قوم کے لیے برائی کا ارادہ کرتا ہے تو پھر وہ قطعی اور بازگشت کی کوئی صورت نہیں ہے (و اذا اراد اللہ بقوم سوءاً فلا مرد لہ)۔

"اور خدا کے علاوہ ان کا کوئی والی و ناصر اور یار و مددگار نہیں ہو سکتا" (و ما لھم من دونہ من وال)۔

اسی بناء پر جب کسی قوم کے لیے خدا کی طرف سے عذاب، سزا اور نابودی کا فرمان صادر ہو جاتا ہے تو محافظین اور نگہبان الگ ہو جاتے ہیں اور انسان کو حوادث کے سپرد کر دیتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ "معقبات" کیا ہیں؟ جیسا کہ طبرسی نے مجمع البیان میں اور بعض دوسرے بزرگ مفسرین نے کہا ہے "معقبات" جمع ہے "معقبہ" کی جب کہ خود "معقبہ" بھی "معقب" کی جمع ہے اور یہ اس گروہ کو کہتے ہیں جس کے افراد پے در پے ایک دوسرے کی نیابت میں کسی کام کے لیے نکلیں۔

اس آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ خدا تعالٰی نے کچھ فرشتوں کی یہ ڈیوٹی لگائی ہے کہ وہ رات دن باری باری انسان کے پاس آئیں اور آگے اور پیچھے سے اس کی حفاظت کریں۔

بے شک انسان اپنی زندگی میں بہت سی آفات و بلیات سے دوچار ہے۔ اندرونی و بیرونی حوادث، طرح طرح کی بیماریاں، جراثیم اور مختلف قسم کے حادثات و خطرات کہ جو زمین و آسمان سے ابھرتے ہیں انسان کو گھیرے ہوئے ہیں۔ خصوصاً بچپن کے زمانے میں جب کہ وہ پیش آنے والے حوادث سے انسان بہت کم آگاہ ہوتا ہے، اسے کوئی تجربہ نہیں ہوتا، ہر قدم پر اسے کوئی نہ کوئی خطرہ درپیش ہوتا ہے اور کبھی تو انسان تعجب کرتا ہے کہ ان تمام حوادث سے بچہ کس طرح بچ نکلتا ہے اور بڑا ہو جاتا ہے خصوصاً ایسے گھرانوں میں جہاں ماں باپ مسائل سے بالکل آگاہ بھی نہیں ہوتے یا ان کے پاس وسائل نہیں ہوتے۔ خاص طور پر دیہات میں پلنے بڑھنے والے وہ بچے جو محرومیوں کا شکار ہوتے ہیں اور بیماری اور خطرات کے عوامل میں گھرے ہوتے ہیں۔

اگر ان مسائل پر ہم حقیقی طور پر غور و فکر کریں تو ہم محسوس کریں گے کہ ایک محافظ طاقت ہے کہ جو ان حوادث سے ہماری حفاظت کرتی ہے اور سپر اور ڈھال کی طرح آگے اور پیچھے سے ہماری محافظ و نگہبان ہے۔

بہت سے مواقع پر انسان کو خطرناک حادثات پیش آتے ہیں اور وہ معجزانہ طور پر ان سے بچ نکلتا ہے اس طرح سے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ سب چیزیں اتفاقی نہیں ہیں بلکہ ایک محافظ طاقت اس کی نگہبانی کر رہی ہے۔

پیشوایانِ اسلام سے مروی بہت سی روایات بھی اس پر تاکید کرتی ہیں۔ ایک روایت میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ زیرِ بحث آیت کی تفسیر میں آپ نے فرمایا:

"یحفظ بامر اللہ من ان یقع فی رکی او یقع علیہ حائط او یصیبہ شیء حتی اذا جاء القدر

خلوا بینه وبین یدفعونه الی المقادیر وهما ملکان یحفظانه باللیل وملکان من نهار یتعاقبانه۔

مگر خدا سے انسان کی حفاظت ہوتی ہے اور کنویں میں گرنے سے یا دیوار اوپر آپڑنے سے یا کسی اور حادثے سے مگر جب حتمی مقدرات پہنچیں تو محافظین ایک طرف ہو جاتے ہیں اور اسے حوادث کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اور دو فرشتے انسان کی رات کو حفاظت کرتے ہیں اور (ان کے علاوہ) دو فرشتے دن کے وقت باری باری ذمہ داری پوری کرتے ہیں[1]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

مامن عبد الا ومعه ملکان یحفظانه فاذا جاء الامر من عند الله خلیا بینه وبین امر الله

کوئی بھی ایسا بندہ نہیں کہ جس کے ساتھ دو فرشتے نہ ہوں کہ جو اس کی حفاظت کرتے ہوں لیکن جب خدا کا قطعی فرمان آپہنچتا ہے تو وہ اسے حوادث کے سپرد کر دیتے ہیں[2] (اس بناء پر وہ انسان کی حفاظت صرف ان حوادث سے کرتے ہیں جن کے بارے میں خدا کا قطعی حکم نہیں ہوتا)۔

نہج البلاغہ میں بھی ہے کہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا:

ان مع کل انسان ملکین یحفظانه فاذا جاء القدر خلیا بینه وبینه

ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں کہ جو اس کی حفاظت کرتے ہیں لیکن جب حتمی مقدرات آپہنچتے ہیں تو وہ اسے چھوڑ دیتے ہیں۔[3]

اسی طرح نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں فرشتوں کی تعریف اور ان کے مختلف گروہوں کے بارے میں ہے:

ومنهم الحفظة لعباده

ان میں سے ایک گروہ خدا کے بندوں کا محافظ ہے۔

البتہ حتمی طور پر صرف طبیعی علوم کے ذریعے ان فرشتوں کے وجود کے بارے میں عدم آگاہی ان کے وجود کی نفی کی دلیل نہیں ہو سکتی اور یہ بات زیر بحث آیت ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ قرآن مجید اور اسی طرح دیگر مذاہب بہت سے ایسے امور کی خبر دیتے ہیں جو حس انسانی سے ماوراء ہیں کہ جن کے بارے میں انسان عام ذرائع سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتا۔

اس سے قطع نظر جیسا کہ ہم نے مندرجہ بالا سطور میں کہا ہے ہماری روزمرہ کی زندگی میں بھی اس محافظ قوت کی واضح نشانیاں نظر آتی ہیں اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ بہت سے تباہ کن حوادث سے ہم معجزانہ طور پر نجات حاصل کرتے ہیں کہ جن کی تفسیر عام طریقے سے نہیں ہو سکتی یا انہیں اتفاق قرار دینا مشکل ہے۔

خود ہم نے اپنی زندگی میں اس کے نمونے دیکھے ہیں کہ جو واقعاً حیرت انگیز ہیں کہ جو مجھ جیسے جلدی یقین نہ کرنے والے شخص کے لیے بھی

---

[1] و [2] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۲۸۰۔

[3] نہج البلاغہ کلمات قصار جملہ ۲۰۱۔

اس غیر مرئی محافظ کے وجود کے لیے دلیل تھے۔

۲۔ **تبدیلی ہمیشہ خود ہمارے ہاتھوں سے آتی ہے:** "ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم" یہ جملہ قرآن میں دو مواقع پر مختصر سے فرق کے ساتھ آیا ہے اس میں ایک عمومی اور کلی قانون بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک حیات ساز، انقلاب آفریں اور خبردار اور ہوشیار کرنے والا قانون ہے۔

یہ قانون اسلام میں جہان بینی اور معاشرہ شناسی کی بنیاد ہے ــــ یہ قانون ہم سے کہتا ہے کہ تمہاری تقدیر ہر چیز اور ہر شخص سے پہلے خود تمہارے ہاتھ میں ہے اور قوموں کی خوش بختی و بدبختی کے سلسلے میں تبدیلی اور تغیر پہلے درجے میں خود انہی سے وابستہ ہے۔ قسمت، اقبال، اتفاقات اور اوضاعِ فلکی کی تاثیر وغیرہ کوئی بھی بنیاد نہیں رکھتی۔ اساس و بنیاد یہی ہے کہ ہر شخص خود چاہے تو سربلند اور کامیاب ہو یا اس کے علاوہ خود چاہے تو اپنے آپ کو ذلت، زبوں حالی اور شکست کے سپرد کردے۔ یہاں تک کہ لطفِ الٰہی یا عذابِ الٰہی کسی ملت پر بغیر کسی مقدمہ اور تمہید کے نہیں بلکہ یہ ملتوں کا اپنا ارادہ، خواہش اور ان کے اندرونی تغیرات ہیں کہ جو انہیں لطفِ خدا یا عذابِ خدا کا مستحق بناتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں اسلام کے اجتماعی پروگرام کے ایک اہم ترین گوشے سے آگاہ کرنے والا یہ قانون ہم سے کہتا ہے کہ ہر قسم کے بیرونی تغیر اور تبدیلیاں ملتوں اور قوموں کے اندرونی تغیرات پر منحصر ہوتی ہیں اور کسی قوم کو پیش آنے والی ہر قسم کی فتح و شکست کا سرچشمہ اس کے اندر ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ لوگ کہ جو اپنا دامن بچانے کے لیے ہر وقت "بیرونی عوامل" کے پیچھے پھرتے ہیں اور ہمیشہ اقتدار پرست اور استعماری طاقتوں کو اپنی بدبختی کا عامل شمار کرتے ہیں بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ اگر کسی معاشرے کے اندر ان جیسی طاقتوں کو کوئی مرکز حاصل نہ ہو تو یہ کچھ بھی نہیں کرسکتیں۔

اہم بات یہ ہے کہ ان توسیع پسندوں، استعماری قوتوں اور سپر طاقتوں کی چھاؤنیاں اور مراکز ہم اپنے معاشرے سے درہم برہم کردیں اور ان کی سرکوبی کریں تاکہ ان کے لیے نفوذ کی کوئی راہ ہی باقی نہ رہے۔

یہ طاقتیں شیطان کی مانند ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ قرآن کے بقول شیطان ان لوگوں پر دسترس حاصل نہیں کرسکتا جو "عباد اللہ مخلصین" ہیں۔ وہ صرف ان لوگوں پر غلبہ حاصل کرتا ہے جنہوں نے اپنے وجود کے اندر شیطان کے لیے کوئی جگہ بنا رکھی ہے۔

قرآن کی اس بنیادی تعلیم کا تقاضا ہے کہ بدبختیوں اور ناکامیوں کو ختم کرنے کے لیے اندرونی انقلاب کی طرف بڑھیں۔ ایک فکری اور ثقافتی انقلاب کی طرف، ایک ایمانی اور اخلاقی انقلاب کی طرف۔ بدبختیوں کے چنگل میں گرفتاری کے وقت اپنے کمزور پہلوؤں کو فوراً تلاش کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنی روح سے اپنی کمزوری کے داغ توبہ اور حق کی طرف بازگشت کے پانی سے دھونے چاہئیں۔ اس طرح ہم ایک نیا جنم لیں گے، نیا نورِ بصیرت ملے گا اور نئی قوت حرکت پیدا ہوگی اور اس کے ذریعے ہم اپنی ناکامیوں اور شکستوں کو کامیابی میں بدل سکتے ہیں۔ یہ کامیابی اس طرح سے ممکن نہیں کہ ہم اپنے کمزور پہلوؤں کو خود خواہی اور خود غرضی کے پردوں میں چھپا دیں اور عوامل شکست کو اپنے معاشرے کے باہر تلاش کرتے پھریں۔

پہلے مسلمانوں کی فتح و کامرانی اور بعد والے مسلمانوں کی شکست کے عوامل پر اب تک بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے بہت سی مباحث سنگلاخ زمین پر چل جانے اور بے سمت چلنے کے مترادف ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ کامیابی اور ناکامی کے عوامل خود مسلمانوں کے فکری، اعتقادی اور اخلاقی تغیرات میں تلاش کریں۔ خود مسلمانوں کی عملی زندگی کا مطالعہ کریں نہ کہ اس سے ہٹ کر۔

دورِ حاضر کے انقلابات کہ جن میں سے ایک ہماری ملت کا انقلاب ہے اسی طرح اگر ہم الجزائر، افغانستان اور دیگر مقامات کی انقلابی جدوجہد کا مطالعہ کریں تو ہم ان میں واضح طور پر اس قرآنی اصل کی حاکمیت کا مشاہدہ کریں گے۔

ہاں — سامراجی حکومتوں اور توسیع پسند سپر طاقتوں نے تو اپنی روش نہیں بدلی لیکن جب ہم اندر سے تبدیل ہو گئے تو ہر چیز بدل گئی۔
ہم دیکھتے ہیں کہ صرف وہی رہبر اور قائد کامیاب ہوئے ہیں کہ جنہوں نے اس بنیادی قانون کے مطابق اپنی ملت کی رہبری کی ہے اور اس میں ایک انقلاب پیدا کیا ہے۔

تاریخ اسلام اور دورِ حاضر کی تاریخ اس اساسی و بنیادی اور جاودانی و دائمی قانون کی صداقت کے شواہد سے بھری پڑی ہے کہ جن کے تفصیلی ذکر سے ہماری بحث ہمیں اس تفسیر کی روش سے دُور لے جائے گی۔

۱۲۔ هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ يُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۚ

۱۳۔ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ۭ

۱۴۔ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ۭ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ

۱۵۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۩

ترجمہ

۱۲۔ وہ وہی ہے جو تمہیں بجلی دکھاتا ہے کہ جو خوف کا بھی باعث ہے اور امید کا بھی نیز وہ بوجھل بادل پیدا کرتا ہے

۱۳۔ اور گرج اس کی تسبیح اور حمد کرتی ہے اور فرشتے (بھی) اس کے خوف سے (مشغول تسبیح ہیں) اور وہ صاعقے بھیجتا ہے اور جسے چاہتا ہے اس میں گرفتار کرتا ہے حالانکہ وہ (خدا کی ان آیات کا مشاہدہ کرنے کے باوجود) خدا کے بارے میں مجادلے میں مشغول ہیں اور اس کی قدرت لامتناہی (اور عذاب دردناک) ہے۔

۱۴۔ حق کی دعوت اس کی طرف سے ہے اور جو (مشرک) لوگ غیر خدا کو پکارتے ہیں ان کی پکار کا وہ کوئی جواب نہیں دیتے یہ لوگ اس شخص کی طرح ہیں جو پانی کی طرف اپنی ہتھیلیاں کھولتا ہے تاکہ پانی اس کے منہ تک

پہنچ جائے لیکن وہ کبھی نہیں پہنچے گا اور کافروں کی پکار ضلالت (اور گمراہی) کے سوا کچھ نہیں۔

۱۵۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے طوعاً یا کرہاً خدا کے لیے سجدہ ریز ہے۔ اسی طرح دن رات اُن کے سائے بھی (سجدہ گزار ہیں)۔

تفسیر

عظمتِ الٰہی کی کچھ اور نشانیاں

قرآن یہاں ایک مرتبہ پھر آیاتِ توحید، عظمت پروردگار کی نشانیاں اور اسرارِ آفرینش بیان کر رہا ہے۔ عالم طبیعت میں نمودار ہونے والی مختلف نعمتوں کی نشاندہی کی گئی ہے نیز ان کے اسرار کی طرف مختصر اور پرمعنی اشارے کرتے ہوئے خدا نے بندوں کو زیادہ قریب کر کے ان کے دلوں پر ایمان و معرفت کی نور پاشی کی گئی ہے۔

پہلے بادلوں میں پیدا ہونے والی بجلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ وہی ہے جو تمہیں وہ بجلی دکھاتا ہے جو خوف اور اُمید کا باعث ہے (هو الذی یریکم البرق خوفا وطمعا)۔

ایک طرف تو اس کی شعاعِ درخشاں آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اور رعد کی رعب دار آواز جو اس سے اٹھتی ہے بعض اوقات تمہیں وحشت زدہ کر دیتی ہے۔ اس سے جو آتش سوزی کے خطرات پیدا ہوتے ہیں وہ خوف و اضطراب پیدا کر دیتے ہیں خصوصاً جو لوگ بیابانوں میں زندگی بسر کرتے ہیں یا بیابانوں سے گزر رہے ہوتے ہیں انہیں اس سے بہت وحشت آتی ہے۔

دوسری طرف عموماً چونکہ اس کے ساتھ ساتھ موٹے قطروں والی بارش بھی ہوتی ہے جو بیابانوں کے تشنہ کاموں اور پیاسوں کو خوشخبر یا بارش کی نوید دیتی ہے اور اس سے درخت اور نباتات سیراب ہوتے ہیں لہٰذا اس سے ان کے دل میں ایک اُمید بھی پیدا ہوتی ہے اور یوں وہ خوف و اُمید کے ملے جلے احساسات سے گزارتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: وہ وہی ہے جو بوجھل اور بھاری بادل پیدا کرتا ہے کہ جو پیاسی زمینوں کی آبیاری کر سکتے ہیں (و ینشیء السحاب الثقال)۔

رعد و برق کی برکتیں

ہم جانتے ہیں کہ سائنسی لحاظ سے برق اس طرح سے پیدا ہوتی ہے کہ بادل کے دو ٹکڑے مختلف بجلی کے لحاظ سے (مثبت اور منفی پول کی صورت میں) ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں اور ان سے بالکل اسی طرح سے کرنٹ پیدا ہوتا ہے جیسے بجلی کے دو تار جن میں مختلف (مثبت اور منفی فیز PHASE) کی بجلی ہو، جب ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں تو بہت زیادہ کرنٹ پیدا ہوتا ہے اور اصطلاح کے مطابق

واضح راہنمائی کرنے والا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔

پس ایک طرف بجلی کی برکات ہیں اور دوسری طرف یہ آتش سوزاں کبھی وجود رکھتی ہے کہ جس کی ایک قسم "صاعقہ" ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بجلی کی ایک چنگاری انسانوں کو یا درختوں کو جلا ڈالے۔ یہ چیز اگرچہ کم اور نادر ہے اور اس سے بچا بھی جا سکتا ہے تاہم خوف و ہراس کا عامل بن سکتی ہے۔

اس طرح سے یہ جو ہم نے آیت بالا میں پڑھا ہے کہ برق خوف کا سبب بھی ہے اور اُمید کا بھی ـــ ہو سکتا ہے کہ یہ ان تمام امور کی طرف اشارہ ہو۔

نیز یہ بھی ممکن ہے کہ جملہ "و ینشئ السحاب الثقال" جو مندرجہ بالا آیت کے آخر میں آیا ہے وہ بجلی کی اسی خاصیت کے ساتھ مربوط ہو کر جو بادلوں کو بارش کے ابھی بھری ہوئی پشت والے قطروں سے بوجھل کرتی ہے۔

بعد والی آیت میں "رعد" کی آواز کا ذکر ہے کہ جو برق سے جدا نہیں ہے۔ فرمایا گیا ہے: رعد خدا کی تسبیح اور حمد کرتی ہے" (و یسبح الرعد بحمدہ)۔

جی ہاں! عالم طبیعت کی یہ سخت آواز کہ جو بہت بڑی آواز کے لیے ضرب المثل ہے چونکہ بجلی سے منسلک ہے اور دونوں ایک ہی مقصد کو پورا کرتی ہیں اور بہت اہم اور مفید بھی خدمات انجام دیتی ہیں کہ جن کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے عملی طور پر خدا کی تسبیح کرتی ہیں دوسری طرف "رعد" "برق" کی زبانِ گویا ہے جو نظامِ آفرینش اور عظمتِ خالق کی تعریف کرتی ہے۔

یہ وہی چیز ہے جسے ہم "زبانِ حال" کہتے ہیں ـ ایک جامع کتاب، ایک قصیدہ غرا، ایک خوبصورت اور دل انگیز مصوری کا نمونہ اور ایک مستحکم و منظم عمارت سب اپنی زبانِ حال سے اپنے لکھنے والے، دیکھنے والے، نقاش اور معمار کے علم و دانش اور ذوق و مہارت کی بات کرتے ہیں اور انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

اس عالم ہستی کا ہر ذرہ اسرار آمیز ہے اور بہت ہی دقیق اور حساب شدہ نظام رکھتا ہے۔ سب ذرات کائنات خدا کی پاکیزگی اور ہر قسم کے نقص و عیب سے اس کے منزہ ہونے کی حکایت کرتے ہیں (کیا تسبیح ـــ منزہ اور پاک جاننے کے علاوہ کچھ اور ہے؟) اور سب کے سب اس کی قدرت اور علم و حکمت کی خبر دیتے ہیں (کیا حمد ـــ صفات کمال بیان کرنے کے علاوہ کچھ اور ہے؟)[1]

فلاسفہ کی ایک جماعت نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس جہان کے تمام ذرات میں سے ہر ایک ایک قسم کا عقل و شعور رکھتا ہے اور عقل و شعور کی بنا پر خدا کی تسبیح و تقدیس کرتا ہے ، صرف زبانِ حال سے اور اپنے وجود سے کہ جو وجودِ خدا کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ زبانِ قال سے بھی اس کی تعریف کرتا ہے۔

نہ صرف یہ کہ صدائے رعد اور عالم مادہ کے دیگر اجزاء اس کی تسبیح کرتے ہیں بلکہ تمام فرشتے بھی خدا کے خوف و خشیت سے اس کی تسبیح میں مشغول ہیں" (و الملائکة من خیفته)[2]

---

[1] "تسبیح تکوینی" کے موضوع پر مزید وضاحت کے لیے ... آیہ شریفہ "و ان من شیء الا یسبح بحمده و لکن لا تفقهون تسبیحهم" (بنی اسرائیل ـــ ۴۴) کے ذیل میں آئے گی۔

[2] شیخ طبرسی مجمع البیان میں فرماتے ہیں:
"خیفة" اور "خوف" ... [illegible]

وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں فرمانِ خدا پر عمل کرنے میں اور نظام ہستی کے بارے میں عائد شدہ اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی نہ ہو جائے اور اس طرح کہیں وہ عذابِ الٰہی میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جو احساسِ مسئولیت رکھتے ہیں ان کے لیے یہ امر خوف کا باعث ہوتی ہیں ـــــ ایک اسلامی خوف کہ جو انسان کو سعی و کاوش اور تحرک پر آمادہ کرتا اور ابھارتا ہے۔

"رعد و برق" کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے "صواعق" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا صواعق کو بھیجتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان کے ذریعے تکلیف پہنچاتا ہے (ویرسل الصواعق فیصیب بھا من یشاء)۔

لیکن ـــــ ان سب چیزوں کے باوجود ـــــ عالمِ آفرینش، وسیع آسمان و زمین، نباتات، رعد و برق اور اس طرح کی دیگر چیزوں میں عظمتِ الٰہی کی آیات دیکھنے کے باوجود ـــــ حوادث یہاں تک کہ ایک آسمانی شعلے کے سامنے انسانی طاقت کی بے بسی کا مشاہدہ کرنے کے باوجود ـــــ بے خبروں کا ایک گروہ خدا کے بارے میں مجادلے اور جنگ کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے (وھم یجادلون فی اللّٰہ)۔

حالانکہ خدا کی قدرت لامتناہی ہے، اس کا عذاب دردناک ہے اور اس کی سزا بڑی سخت ہے (وھو شدید المحال)۔

"محال" اصل میں "حیلہ" سے ہے اور "حیلہ" ہر قسم کی مخفی اور پنہاں چارہ اندیشی کے معنی میں ہے (غلط کوششوں اور چارہ جوئیوں کے معنی میں نہیں کہ جس میں یہ لفظ فارسی زبان میں مشہور ہو چکا ہے)۔ یہ بات مسلم ہے کہ جو چارہ جوئی پر بہت زیادہ قدرت رکھتا ہے وہ وہی ہے جو قدرت کے لحاظ سے بھی غیر معمولی ہے اور علم و حکمت کے لحاظ سے بھی اور اس بناء پر وہ اپنے دشمنوں پر مسلط اور کامیاب ہوتا ہے اور کسی کو اُس کے مرکزِ قدرت سے نکل بھاگنے کا یارا نہیں ہے اسی لیے مفسرین میں سے ہر ایک نے "شدید المحال" کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ سب نے اس کے مفہوم کی بنیاد مذکورہ معنی کو قرار دیا ہے۔ بعض نے اسے "شدید القوۃ"، بعض نے "شدید العذاب"، بعض نے "شدید القدرۃ" اور بعض نے "شدید الاخذ" کے معنی میں اور اس جیسے الفاظ میں اس کی تفسیر کی ہے [1]

زیرِ بحث آخری آیت دو مطالب کی طرف اشارہ کرتی ہے:۔

پہلا یہ کہ دعوتِ حق (اور حقیقی دعا) خدا کے لیے ہے "(لہ دعوۃ الحق)۔ یعنی جس وقت ہم اسے پکاریں تو وہ سنتا ہے اور ہماری پکار کا جواب دیتا ہے اور وہ بندوں کی دعا سے آگاہی بھی رکھتا ہے اور ان کی آرزوؤں کو پورا کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے اس لیے اسے پکارنا اور اُس کی مقدس ذات سے تقاضا کرنا حق ہے نہ کہ باطل اور بے اساس و بے بنیاد۔

دوسرا یہ ہے کہ بتوں کو پکارنا اور ان سے درخواست اور دعا کرنا دعائے باطل ہے کیونکہ "جن لوگوں کو مشرکین خدا کے علاوہ پکارتے ہیں اور اپنی تمناؤں کو پورا کرنے کے لیے جن کا سہارا لیتے ہیں وہ ہرگز انہیں جواب نہیں دیں گے اور ان کی دعا قبول نہیں کریں گے (والذین یدعون من دونہ لا یستجیبون لھم بشیء)۔

جی ہاں ـــــ باطل کو پکارنا ایسا ہی ہے کیونکہ وہ خیالی تصور سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور بتوں کے لیے وہ جیسے بھی علم و قدرت کے قائل ہوں سب موہوم، بے پایا اور بے اساس ہے۔

---

[1] بعض "محال" کو "حیلہ" کے مادہ سے نہیں سمجھتے بلکہ "محل" اور "ماحل" کے مادہ سے قرار دیتے ہیں کہ جو مکر، جدال اور عذاب سے ملنے والی سزا دینے کے لیے مصمم ارادہ کرنے کے معنی سے لیا گیا ہے لیکن جو کچھ ہم نے متن میں کہا ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اگرچہ دونوں معانی قریب الافق ہیں۔

کیا حیثیت، واقعیت اور منبع خیر و برکت کے سوا "حق" کہلاتا ہے اور خیال، توہم اور منبع شر و فساد کو "باطل" کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد جیسا کہ قرآن کی روش ہے اس عقلی بات کو ثابت کرنے کے لیے وہ ایک خوبصورت حسی اور رسا مثال پیش کرتے ہوئے کہتا ہے وہ کہ جو غیر خدا کو پکارتے ہیں، اس شخص کی طرح ہیں جو ایسے پانی کے کنارے بیٹھا ہو جس کی سطح اس کی دسترس میں نہ ہو اور وہ اس امید سے پانی کی طرف اشارہ کرتا ہو کہ وہ اس کے دہن میں پہنچ جائے حالانکہ وہ ہرگز نہیں پہنچے گا۔ یہ کیسا بے ہودہ اور فضول خواب و خیال ہے (الا کباسط کفیہ الی الماء لیبلغ فاہ وما ھو ببالغہ)۔

کیا کنویں کے کنارے بیٹھ کر پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اشارے سے پانی منہ تک پہنچایا جا سکتا ہے؟ ایسا کام کسی دیوانے اور سادہ لوح شخص کا کوئی نہیں کرسکتا ہے۔

مذکورہ جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ بت پرستوں کو ایک شخص سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو پوری طرح کھول کر اتنی شکل میں پانی میں داخل کرتا ہے اور اس انتظار میں ہے کہ پانی اس کے ہاتھ میں ٹھہر جائے حالانکہ پانی سے نکلتے ہی پانی کے قطرے انگلیوں کی طرف سے نکل جائیں گے اور کچھ باقی نہیں رہے گا۔

مفسرین نے اس جملے کے لیے ایک تیسری تفسیر بھی ذکر کی ہے اور وہ یہ کہ بت پرست جو اپنی مشکلات کے حل کے لیے بتوں کے پاس جاتے ہیں اس شخص کی طرح ہیں جو چاہتا ہے کہ پانی اپنی مٹھی میں بند رکھے۔ کیا کبھی پانی کو مٹھی میں بند رکھا جا سکتا ہے۔ یہ بات عربوں میں بطور ضرب المثل لی گئی ہے کہ جب وہ اس شخص کے لیے کوئی مثال ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ جو بے ہودہ اور فضول کوشش کرتا ہے تو کہتے ہیں:

ھو کقابض الماء بالید

وہ اس شخص کی طرح ہے جو پانی کو ہاتھ سے پکڑنا چاہتا ہے۔

ایک عرب شاعر کہتا ہے:

فاصبحت فیما کان بینی و بینھا

من الود مثل قابض الماء بالید

میری حالت تو یوں ہوگئی کہ میں اپنے اور اس کے درمیان محبت برقرار رکھنے کے لیے اس شخص کی طرح ہوگیا کہ جو پانی کو ہاتھ میں روک رکھے۔[1]

آیت کے آخر میں اس بات کی تاکید کے لیے قرآن کہتا ہے: کافروں کا بتوں سے دعا اور درخواست کرنا گمراہی میں قدم اٹھانے کے علاوہ کچھ نہیں (وما دعاء الکافرین الا فی ضلال)۔

اس سے بڑھ کر کیا گمراہی ہو سکتی ہے کہ انسان اس راستے میں اپنی کوششیں صرف کرے کہ جو کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچائے گا اور اس راستے میں وہ اپنے آپ کو خستہ و بے حال کرلے لیکن اسے کوئی نتیجہ اور فائدہ حاصل نہ ہو۔

زیر بحث آخری آیت میں یہ نشاندہی کرنے کے لیے کہ بت پرست عالم ہستی کے کاروان سے کس طرح الگ ہو گئے ہیں اور تنہا جا رہے کا

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۵ صفحہ [illegible]

میں سرگرداں ہیں فرمایا گیا ہے: آسمانوں اور زمین کے تمام رہنے والے اطاعت و تسلیم سے یا کراہت و ناپسندیدگی سے سربسجود ہیں اور اسی طرح ان کے سائے بھی صبح و شام سجدہ ریز ہیں (وللہ یسجد من فی السمٰوٰت والارض طوعًا وکرھًا وظللھم بالغدو والاٰصال)۔

چند اہم نکات

۱۔ موجودات کے سجدہ کرنے سے کیا مراد ہے: ایسے مواقع پر سجدہ خضوع و خشوع، انتہائی قسم کی تواضع و انکساری اور سرِ تسلیم خم کرنے کے معنی میں ہے یعنی تمام فرشتے، انسان اور سب صاحبانِ عقل و فکر خدا کے سامنے متواضع ہیں اور اس کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں البتہ کچھ مخلوقات کا سجدہ صرف تکوینی پہلو رکھتا ہے یعنی وہ عالمِ آفرینش کے قوانین کے سامنے خاضع ہیں لیکن کچھ مخلوقات سجودِ تکوینی کے علاوہ سجودِ تشریعی کی بھی حامل ہیں۔

سجودِ تشریعی — یعنی اپنے ارادے اور رضا و رغبت سے کیے جانے والے سجدے۔

جب کہ سجودِ تکوینی کی مثال یہ ہے کہ جب کوئی مخلوق موت و حیات، نشو و نما، رشد و کمال اور سلامتی و بیماری وغیرہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہے تو تسلیم و خضوع کی یہ حالت درحقیقت قوانینِ آفرینش کے لیے ان کی طرف سے ایک قسم کا سجدہ تکوینی ہے۔

۲۔ "طوعًا و کرھًا" سے مراد: ہو سکتا ہے یہ اس طرف اشارہ ہو کہ مومنین بارگاہِ پروردگار میں رضا و رغبت سے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور اس کے سامنے خضوع کرتے ہیں لیکن غیر مومنین اگرچہ ایسے سجدے کے لیے تیار نہیں ہیں تاہم ان کے وجود کے تمام ذرات قوانینِ آفرینش کے پیشِ نظر فرمانِ خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں، وہ چاہیں یا نہ چاہیں۔

ضمناً توجہ رہے کہ "کُرہ" (بروزن "جرم") اس کراہت کے معنی میں ہے جس کا سرچشمہ انسان کا اندر اور باطن ہے اور "کَرہ" (بروزن "فتح") اس کراہت کے معنی میں ہے جس کا عامل بیرونی اور خارجی ہو۔ زیرِ بحث مقام پر چونکہ غیر مومنین خارج از ذات عوامل کے زیرِ اثر قوانینِ آفرینش کے مقہور و مغلوب ہیں اس لیے "کَرہ" (بروزن "شرح") استعمال ہوا ہے۔

"طوعًا و کرھًا" کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ "طوعًا" سے مراد عالمِ خلقت کے وہ واقعات ہیں جو ایک موجود کی فطری اور طبعی رضا و رغبت کے موافق ہیں (مثلاً زندہ رہنے کے لیے موجودِ زندہ کی رغبت) اور "کرھًا" سے مراد وہ میلان ہے جو ایک موجود کو خارج سے لاحق ہو۔ مثلاً جراثیم کے حملے سے ایک زندہ موجود کی موت۔

۳۔ "ظلال" کا مفہوم: "ظلال" جمع ہے "ظل" کی جو "سایہ" کے معنی میں ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں اس لفظ کا ذکر نشاندہی کرتا ہے کہ سجدہ سے مراد صرف تشریعی سجدہ نہیں کیونکہ موجودات کے سائے تو اپنا کوئی ارادہ و اختیار نہیں رکھتے بلکہ وہ تو روشنی کی چمک کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ اس بناء پر یہاں کا سجدہ تکوینی ہے — یعنی وہ قوانینِ آفرینش کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔

البتہ لفظ "ظلال" کے ذکر کا یہ مطلب نہیں کہ زمین و آسمان کی تمام موجودات کا وجود مادی ہے اور ان سب کا سایہ ہوتا ہے بلکہ یہ صرف ان موجودات کی طرف اشارہ ہے کہ جن کا سایہ ہوتا ہے۔ مثلاً جب کہا جاتا ہے کہ شہر کے علماء اور ان کے فرزندوں نے فلاں مجلس میں شرکت کی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے فرزندوں نے شرکت کی کہ جن کے فرزند تھے۔ اس جملے سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ شہر کے تمام علماء صاحبِ اولاد ہیں (غور کیجیے گا)۔

بہرحال سایہ اگرچہ ایک عدمی چیز کے علاوہ کچھ نہیں کہ جو روشنی کا فقدان اور نہ ہونا ہی ہے لیکن چونکہ ہر طرف سے نور کا وجود اس کا احاطہ کیے ہوتا ہے لہٰذا اس کی بھی ایک موجودیت ہے اور وہ بھی آثار رکھتا ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں اس لفظ کی تصریح شاید تاکید کے لیے ہے کہ موجودات کے سائے تک بارگاہ خداوندی میں سربسجود ہیں۔

۴۔ **"آصال" اور "غدو" کا مطلب:** یہ "اصل" (بروزن "دہل") کی جمع ہے اور "اصل" بھی "اصیل" کی جمع ہے کہ جو "اصل" کے مادہ سے لی گئی ہے اور یہ دن کے آخری حصے کو کہتے ہیں اس لیے کہ دن کا یہ حصہ رات کی اصل اور بنیاد شمار ہوتا ہے۔

نیز "غدو" جمع ہے "غداۃ" کی کہ جو دن کے پہلے حصے کے معنی میں ہے (اور بعض اوقات یہ مصدری معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے)۔

اگرچہ حکم خدا کے سامنے عالم ہستی کی موجودات کا سجدہ اور خضوع صبح اور عصر کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر وقت ہے پھر بھی ان دو مواقع کا ذکر یا تو اس امر کے دوام کے لیے کنایہ ہے مثلاً ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص صبح و شام تحصیل علم میں مشغول ہے یعنی ہمیشہ تحصیل علم میں محو ہے اور یا اس بنا پر ہے کہ گزشتہ جملے میں موجودات کے سایوں کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی اور سائے دن کے آغاز اور اختتام پر دیگر اوقات کی نسبت زیادہ ہوتے ہیں۔

۱۶۔ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِى الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَىْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝

ترجمہ

۱۶۔ کہو: آسمانوں اور زمین کا پروردگار کون ہے؟ کہہ دو: "اللہ" پھر کہو: تم نے اپنے لیے اس کے علاوہ اولیاء (اور خدا) بنالیے ہیں، کہ جو اپنے سود و زیاں کے (بھی) مالک نہیں ہیں (چہ جائیکہ تمہارے)۔ کہو: کیا بینا اور نابینا برابر ہیں یا ظلمتیں اور نور برابر ہیں؟ کیا انہوں نے انہیں خدا کا اس لیے شریک قرار دیا ہے کہ وہ خدا کی طرح خلقت رکھتے ہیں اور یہ خلقتیں ان کے لیے مشتبہ ہو گئی ہیں؟ کہہ دو: خدا ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہے یکتا و کامیاب۔

تفسیر

بت پرستی آخر کیوں؟

گزشتہ آیات میں وجودِ خدا کی معرفت کے بارے میں بہت سی بحثیں تھیں۔ اس آیت میں مشرکین اور بت پرستوں کے اشتباہ کے بارے میں بحث کی گئی ہے اور اس کے بارے میں مختلف پہلوؤں سے گفتگو کی گئی ہے۔

پہلے پیغمبر کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار اور مدبر کون ہے (قل من رب السمٰوٰت والارض)۔

اس کے بعد بغیر اس کے کہ پیغمبر ان کے جواب کے انتظار میں رہے حکم دیا گیا ہے کہ اس سوال کا جواب خود دو، کہو: "اللہ" (قل اللہ)۔
پھر انہیں یوں ملامت کی گئی ہے، ان سے کہو، کیا تم نے غیر خدا کو اپنے لیے اولیاء، سہارا اور معبود قرار دے لیا ہے حالانکہ یہ بت تو اپنے

نفع ونقصان کے مالک نہیں ہیں (قل افاتخذتم من دونہ اولیاء لایملکون لانفسہم نفعاً ولا ضراً)۔

درحقیقت پہلے "خدا کی ربوبیت" کے حوالے سے بحث کی گئی ہے نیز یہ کہ وہی عالم کا مالک و مدبر ہے ہر خیر و نیکی اسی کی جانب سے ہے اور وہ تنہا ہر چیز کو وجود کرنے کی طاقت رکھتا ہے یعنی جب کہ تم یہ بات قبول کرتے ہو کہ خالق اور پروردگار وہ ہے تو اب جو مانگنا ہے اسی سے مانگو، نہ کہ بتوں سے کہ جو تمہاری کوئی مشکل حل نہیں کر سکتے۔ پھر اس سے بھی بڑھ کر فرمایا گیا ہے کہ وہ تو اپنے نفع و نقصان تک کے مالک نہیں ہیں چہ جائیکہ تمہارے۔ ان حالات میں وہ تمہاری کونسی مشکل آسان کر سکتے ہیں جس کی بناء پر تم ان کی پرستش کرتے ہو جب وہ اپنے لیے بے بس ہیں تو تم ان سے کیا توقع رکھتے ہو۔

اس کے بعد دو واضح اور صریح مثالوں کے ذریعے "موحد" اور "مشرک" کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کہو کیا نابینا اور بینا برابر ہیں (قل ھل یستوی الاعمیٰ والبصیر)۔

جس طرح نابینا اور بینا برابر نہیں ہیں اسی طرح کافر اور مومن بھی برابر نہیں ہیں اور بتوں کو "اللہ" کا شریک قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دوسرا یہ کہ: کیا ظلمات اور نور برابر ہیں (ام ھل تستوی الظلمات والنور)۔

وہ ظلمت ــــ کہ جو انحراف، گمراہی، اشتباہ اور خوف و خطر کا مرکز ہے اسے اس نور کے برابر کیسے سمجھا جا سکتا ہے جو رہنما اور حیات بخش ہے۔ کس طرح سے بتوں کو کہ جو محض ظلمات ہیں خدا کے ساتھ شریک کیا جا سکتا ہے کہ جو عالم ہستی کا نور مطلق ہے۔ ایمان اور توحید کہ جو نور کا سرچشمہ ہے اسے شرک و بت پرستی سے کیا نسبت کہ جو ظلمت کی روح رواں ہے۔

اس کے بعد ایک طریقے سے مشرکین کے عقیدے کا بطلان ثابت کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ کہ جنہوں نے خدا کے لیے شریک قرار دیئے ہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بھی خدا کی طرح خلق کیا ہے اور یہ خلقت ان کے لیے مشتبہ ہو گئی ہے اور انہیں یہ گمان ہو گیا ہے کہ بت بھی خدا کی طرح عبادت کے مستحق ہیں کیونکہ ان کی نظر میں بت بھی وہی کام کرتے ہیں کہ جو خدا کرتا ہے (ام جعلوا للہ شرکاء خلقوا کخلقہ فتشابہ الخلق علیہم)۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بت پرست بھی بتوں کے بارے میں ایسا عقیدہ نہیں رکھتے۔ وہ بھی خدا کو تمام چیزوں کا خالق سمجھتے ہیں اور عالم خلقت کو فقط اس سے مربوط شمار کرتے ہیں۔

اسی لیے فوراً فرمایا گیا ہے: کہہ دو خدا ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہے یکتا و کامیاب (قل اللہ خالق کل شیء وھو الواحد القھار)۔

چند اہم نکات

۱۔ **خالقیت و ربوبیت معبودیت سے مربوط ہے:** ان نظریات سے پہلے آیہ نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ جو خالق ہے وہ رب اور مدبر بھی ہے کیونکہ خلقت ایک دائمی اور مسلسل امر ہے ایسا نہیں ہے کہ خدا تمام عالم موجودات کو پیدا کر کے ایک طرف بیٹھ جائے بلکہ فیض ہستی خدا کی طرف سے دائمی طور پر ہوتا ہے اور ہر موجود اس کی پاک ذات سے ہستی اور وجود حاصل کرتا رہتا ہے۔ اس بناء پر تعریف کا پورا اور عالم ہستی کی تدبیر، انتہائے خلقت کی طرح خدا کے ہاتھ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سعادتیں اور نفع و نقصان کا مالک وہی ہے اور اس کے علاوہ جس کے پاس جو کچھ بھی ہے اسی کی طرف سے ہے ــــ اس کے باوجود کیا خدا کے علاوہ کوئی معبودیت کے اہل ہے؟

۲۔ خود ہی سوال اور خود ہی جواب: محل بحث آیت سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ خدا اپنے پیغمبر کو کیوں حکم دیتا ہے کہ مشرکین سے سوال کریں کہ آسمان و زمین کا پروردگار اور مالک کون ہے اور اس کے بعد بغیر جواب کا انتظار کیے اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس سوال کا جواب دیں اور اس کے بعد بلا فاصلہ ان مشرکین کو سرزنش کی گئی ہے کہ وہ بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں۔

یہ سوال و جواب کا کیسا طریقہ ہے؟

ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ بعض اوقات ایک سوال کا جواب اس قدر واضح ہوتا ہے کہ وہ اس بات کا محتاج نہیں ہوتا کہ مد مقابل کے جواب کا انتظار کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ ہم کسی سے سوال کرتے ہیں کہ اس وقت رات ہے یا دن اور پھر بلا فاصلہ ہم خود جواب دیتے ہیں کہ یقیناً رات ہے۔ یہ در اصل اس امر کے لیے ایک لطیف کنایہ ہے کہ یہ بات اس قدر واضح ہے کہ جواب کی محتاج نہیں ہے۔

علاوہ ازیں مشرکین خالقیت کو خدا کے ساتھ مخصوص سمجھتے تھے اور وہ ہرگز یہ بات نہیں کہتے تھے کہ بت زمین و آسمان کے خالق ہیں بلکہ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ شفیع ہیں اور انسان کو نفع و نقصان پہنچانے پر قادر ہیں اور اسی بناء پر ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ان کی عبادت کرنا چاہیے۔ لیکن چونکہ "خالقیت" اور "ربوبیت" (عالم ہستی کی تدبیر اور اس کے نظام کو چلانا) ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے لہٰذا مشرکین پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے اور انہیں کہا جا سکتا ہے کہ تم جو خالقیت کو خدا کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہو تو ربوبیت کو بھی اس کے ساتھ مخصوص سمجھو اور اس کے ساتھ عبادت بھی اسی سے مخصوص ہو گی۔

۳۔ چشم بینا اور روشنی لازم و ملزوم ہیں: آیت میں "نابینا و بینا" اور "ظلمات و نور" دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ گویا یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ایک حقیقت بینی کے مشاہدہ کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ چشم بینا کی بھی اور نور کی شعاعوں کی بھی۔ ان میں سے کوئی ایک نہ ہو تو مشاہدہ ممکن نہیں۔ لہٰذا سوچنا چاہیے کہ ان لوگوں کی کیا حالت ہو گی کہ جو ان دونوں سے محروم ہوں، بینائی سے بھی اور نور سے بھی۔ اس کا حقیقی مصداق مشرکین ہیں کہ جن کی چشم بصیرت بھی اندھی ہے اور جن کی زندگی کو بھی کفر و بت پرستی کی تاریکی نے گھیر رکھا ہے اسی لیے وہ تاریک گھاٹیوں اور گڑھوں میں سرگرداں ہیں۔ جب کہ ان کے برعکس مومنین نگاہ بینا رکھتے ہیں، ان کا پروگرام واضح ہے اور انہوں نے نورِ وحی اور تعلیماتِ انبیاء کی مدد سے اپنی زندگی کو صحیح راستے پر ڈال لیا ہے۔

۴۔ کیا خدا کی خالقیت جبر و اکراہ کی دلیل ہے؟ نظریہ جبر کے بعض طرفداروں نے محل بحث آیت کے جملے "اللہ خالق کل شیء" سے اپنا مقصد ثابت کرنے کے لیے استدلال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کاموں کا خالق بھی خدا ہے یعنی ہمارا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے۔

اس بات کا دو طریقوں سے جواب دیا جا سکتا ہے:

پہلا یہ کہ اس آیت کے دوسرے جملے اس بات کی پورے طور پر نفی کرتے ہیں کیونکہ ان میں بت پرستوں کو بڑی ملامت کی گئی ہے اگر واقعاً ہم اپنے اعمال میں کوئی اختیار نہیں رکھتے تو پھر تنبیہ اور سرزنش کس بناء پر؟ اگر خدا چاہتا ہے کہ ہم بت پرست رہیں تو پھر وہ کیوں سرزنش کرتا ہے اور کیوں ہدایت کے لیے اور راہ بدلنے کے لیے استدلال کرتا ہے۔ یہ سب چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ لوگ اپنی راہ انتخاب کرنے میں آزاد اور مختار ہیں۔

دوسرا یہ کہ ہر چیز میں خالقیت بالذات خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن پھر بھی یہ چیز اپنے افعال میں ہمارے مختار ہونے کے منافی

نہیں ہے کیونکہ ہماری طاقت اور ہماری عقل بلکہ ہمارے ارادے کی آزادی سب کے سب اسی کی جانب سے ہیں۔ اس بناء پر ایک لحاظ سے وہ بھی خالق ہے (تمام چیزوں کا خالق حتیٰ کہ ہمارے افعال و اعمال کا خالق) اور ہم بھی فاعل مختار ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے طول میں ہیں نہ کہ عرض میں۔ وہ فعل کے تمام وسائل اور ذرائع پیدا کرنے والا ہے اور ہم خیر یا شر کے راستے پر ان وسائل سے استفادہ کرنے والے ہیں۔

یہ بالکل اس طرح ہے جس طرح سے کوئی شخص بجلی گھر یا پانی سپلائی کا مرکز تیار کر کے ہمارے اختیار میں دے دیتا ہے۔ مسلّم ہے کہ ہم بجلی یا پانی سے جس طرح کا بھی استفادہ کریں اس کی مدد کے بغیر ممکن نہ تھا لیکن اس کے باوجود آخری فیصلہ خود ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم اس بجلی سے کسی قریب المرگ بیمار کے لیے آپریشن تھیٹر کو روشن کریں یا ایک جنائی کے مرکز کو۔ اسی طرح پانی سے کسی تشنہ لب کو سیراب کریں یا درختوں اور پھولوں کے پودوں کی آبیاری کریں یا کسی بے گناہ کے گھر کی بنیادوں میں پانی ڈال کر اسے تباہ کر دیں۔

۱۷۔ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِیَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا ؕ وَمِمَّا یُوْقِدُوْنَ عَلَیْهِ فِی النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْیَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ○

ترجمہ

۱۷۔ خدا نے آسمان سے پانی بھیجا اور ہر وادی اور دریا سے ان کی مقدار کے مطابق سیلاب امنڈ پڑا پھر پانی کے ریلوں پر جھاگ پیدا ہو گئی اور جن (بھٹیوں) میں زیورات یا اسباب زندگی تیار کرنے کے لیے آگ روشن کرتے ہیں ان سے بھی جھاگ نکلنے لگی ـــــ اس طرح خدا حق اور باطل کے لیے مثال بیان کرتا ہے لیکن جھاگ ایک طرف ہو جاتی ہے اور لوگوں کے لیے فائدہ رساں چیز (پانی یا خالص دھات) زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ خدا اسی طرح سے مثال بیان کرتا ہے۔

تفسیر

حق و باطل کی منظر کشی

قرآن کہ جو تعلیم و تربیت کی کتاب ہے اس کی روش ہے کہ وہ مسائل عینی کی بنیاد پر گفتگو کرتا ہے لہٰذا اس میں پیچیدہ مسائل کو ذہن نشین کروانے کے لیے لوگوں کی روزمرہ زندگی سے عمدہ، خوبصورت اور حسّی مثالیں پیش کی گئی ہیں زیر نظر آیت میں بھی توحید و شرک، ایمان و کفر اور حق و باطل کے بارے میں گزشتہ آیات میں ذکر کیے گئے حقائق کا مجسم کرنے کے لیے ایک بہت ہی رسا اور عمدہ مثال بیان کی گئی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے، خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا ہے (انزل من السماء ماء)۔ زندگی بخش اور حیات آفریں پانی ـــــ نشوونما اور حرکت کا سرچشمہ پانی۔

اس وقت یہ پانی زمین کے دروں، گڑھوں، دریاؤں اور نہروں میں ان کی وسعت کے مطابق سما جاتا ہے (فسالت اودیة بقدرها)۔

چھوٹی چھوٹی ندیاں ایک دوسرے سے گلے ملتی ہیں ـــ تو دریا وجود میں آتے ہیں ـــ دریا باہم مل جائیں تو دامن کوہسار سے سیلاب عظیم اُمڈ پڑتا ہے ـــ پانی کناروں اور سروں سے بلند ہو جاتا ہے اور جو کچھ اس کی راہ میں آتا ہے اسے بہائے جاتا ہے۔ ایسے میں پانی کی موجیں اور لہریں جب آپس میں ٹکراتی ہیں تو جھاگ پیدا ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: سیلاب کے اوپر جھاگ اٹھتی ہے (فاحتمل السیل زبدًا رابیًا)۔

"رابیًا" کا مادہ "ربو" (بروزن "غلو") ہے۔ یہ بلندی و برتری کے معنی میں ہے۔ "ربا" کہ جو سود یا اضافی رقم یا اضافی جنس کے معنی میں ہے وہ بھی اسی مادہ سے اسی معنی میں ہے کیونکہ یہ اضافے اور زیادتی کا معنی دیتا ہے۔

جھاگ صرف بارش برسنے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ جو دھاتیں آگ کے ذریعے پگھلتی ہیں تاکہ ان سے زیورات یا دیگر اسباب زندگی تیار کیے جائیں ان سے بھی پانی کی جھاگ کی طرح جھاگ نکلتی ہے (ومما یوقدون علیه فی النار ابتغاء حلیة او متاع زبد مثله)[1]

یہ ایک ایسی وسیع مثال بیان کی گئی ہے جو صرف پانی سے متعلق نہیں ہے بلکہ دھاتوں کے بارے میں بھی ہے چاہے وہ دھاتیں زیورات بنانے کے لیے استعمال ہوتی ہوں یا دیگر اسباب حیات تیار کرنے کے کام آتی ہوں۔ اس کے بعد نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس طرح خدا حق اور باطل کے لیے مثال بیان کرتا ہے (کذٰلک یضرب الله الحق والباطل)۔

پھر اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: لیکن جھاگ ایک طرف ہو جاتی ہے اور وہ پانی کہ جو لوگوں کے لیے مفید اور سودمند ہوتا ہے زمین میں باقی رہ جاتا ہے (فاما الزبد فیذهب جفاء واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض)۔

فضول شور یلی اور اندر سے خالی جھاگ کہ جو ہمیشہ اوپر اوپر ہوتی ہے لیکن کوئی فائدہ بخش نہیں ہوتی اسے ایک طرف پھینک دینا چاہیے لیکن خاموش، بے صدا، متواضع، مفید اور سودمند پانی باقی رہ جاتا ہے اور اگر زمین کے اوپر نہ ہو تو زمین کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ وہاں چشموں اور کنوؤں کی صورت میں زمین سے نکل آتا ہے اور تشنہ کاموں کو سیراب کرتا ہے۔ درختوں کو بار آور اور گلوں کو شگفتہ اور پھلوں کو تیار کرتا ہے اور ہر چیز کو سرو سامانِ حیات عطا کرتا ہے۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے طور پر اور اس آیت میں زیادہ غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس طرح خدا مثالیں بیان کرتا ہے (کذٰلک یضرب الله الامثال)۔

چند اہم نکات

اس معنی خیز مثال میں نہایت موزوں الفاظ اور جملے استعمال ہوئے ہیں۔ حق و باطل کی منظر کشی نہایت عمدگی سے کی گئی ہے۔ اس میں بہت سے حقائق پوشیدہ ہیں۔ ان میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کرتے ہیں۔

---

[1] اس جملے کا لفظی ترجمہ یہ ہے:

جس چیز پر زیور اور متاع حاصل کرنے کے لیے آگ روشن کرتے ہیں اس سے پانی کی جھاگ کی طرح جھاگ حاصل ہوتی ہے۔

یہ تعبیر ان کٹھالیوں کی طرف اشارہ ہے جن میں دھاتیں پگھلانے کے لیے ان کے نیچے بھی آگ ہوتی ہے اور اوپر بھی۔ اس طرح سے نیچے آگ ہوتی ہے پھر اس کے اوپر ایسے پتھر کہ جن میں بہت سا مواد ہوتا ہے ڈالے جاتے ہیں اور پھر ان کے اوپر بھی آگ ڈالتے ہیں۔ یہ بہترین قسم کی کٹھالی ہے کہ جس میں آگ نے پگھلنے کے قابل مواد کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہوتا ہے۔

۱۔ حق و باطل کی شناخت کے لیے علامتیں: حق و باطل کی پہچان کہ جو درحقیقت واقعیت اور حقیقت کو خالی اور جعلی باتوں سے الگ کرنے کا نام ہے بعض اوقات انسان کے لیے اس قدر مشکل اور پیچیدہ ہو جاتی ہے کہ کسی حتمی اور قطعی علامت کو تلاش کرنا پڑتا ہے اور علامتوں کے ذریعے حقائق کو اوہام سے اور حق کو باطل سے جدا کرکے پہچاننا پڑتا ہے۔ قرآن نے مذکورہ مثال میں ان علامتوں کو اس طرح سے بیان کیا ہے:

الف: حق ہمیشہ مفید اور سود مند ہوتا ہے۔ آب شیریں کی طرح کہ جو باعث حیات ہے لیکن باطل بے فائدہ اور فضول ہوتا ہے۔ پانی کے اوپر والی جھاگ کسی کو سیراب کرتی ہے نہ درخت اگاتی ہے۔ کٹھالی میں پگھلنے والی دھاتوں سے نکلنے والی جھاگ بھی نہ زیور بنانے کے کام آتی ہے نہ زندگی کا کوئی اور ساز و سامان۔ اگر اس جھاگ کا کوئی مصرف ہے تو پست اور بے وقعت جو کسی حساب شمار میں نہیں آتا۔ جیسے خس و خاشاک کو جلانے کے کام لایا جائے۔

ب: باطل ہمیشہ متکبر، بالانشین اور قال و قیل اور شور و غوغا سے پُر لیکن اندر سے خالی اور کھوکھلا ہوتا ہے لیکن حق متواضع، کم صدا، باعمل، بامقصد اور وزنی ہوتا ہے۔[1]

ج: حق ہمیشہ اپنے اوپر تکیہ کرتا ہے لیکن باطل حق کی آبرو کا سہارا لیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو حق کے لباس میں پیش کرے اور اس کے مقام سے استفادہ کرے۔ جیسے کہا جاتا ہے:

"ہر دروغی از راست فروغ می گیرد"

یعنی— ہر دروغ اور جھوٹ سچ سے فروغ حاصل کرتا ہے۔

کیونکہ اگر سچ بات دنیا میں نہ ہوتی تو کوئی شخص کبھی جھوٹ کا اعتبار نہ کرتا اور اگر خالص جنس دنیا میں نہ ہوتی تو کوئی ملاوٹی اور جعلی چیز سے فریب نہ کھاتا۔ اس بناء پر باطل کا کم عمر فروغ اور وقتی آبرو بھی حق کی وجہ سے ہے لیکن حق ہر جگہ اپنے اوپر بھروسہ کرتا ہے اور اپنی آبرو کا سہارا لیتا ہے۔

۲۔ "زبد" کیا ہے؟ "زبد" پانی کے اوپر والی یا ہر قسم کی جھاگ کو کہتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ آب شیریں پر بہت کم جھاگ آتی ہے کیونکہ پانی کے خارجی اجسام سے آلودہ ہونے کی وجہ سے جھاگ پیدا ہوتی ہے۔ یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر حق اپنی اصل صفائی اور پاکیزگی پر ہے تو اس کے اطراف میں باطل کی جھاگ کبھی پیدا نہ ہوگی لیکن جب حق آلودہ اور گندے ماحول میں جا پڑے اور حقیقت خرافات میں کھو جائے، درستی نادرستی سے مل جائے اور پاکیزگی ناپاکی سے خلط ملط ہو جائے تو باطل کی جھاگ اس کے ساتھ ظاہر ہو جاتی ہے۔

اسی امر کی طرف حضرت علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

---

[1] حضرت علی علیہ السلام اپنے متعلق اور اپنے دشمنوں، جیسے اصحاب جمل تھے، کے بارے میں فرماتے ہیں:

وقد ارعدوا وابرقوا ومع هذين الامرين الفشل ولسنا نرعد حتى نوقع ولا نسيل حتى نمطر

وہ رعد و برق کی سی گرج چمک دکھاتے ہیں لیکن انجام کار سستی اور ناتوانی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا لیکن اس کے برعکس ہم جب تک کوئی کام انجام نہ دے لیں گرج چمک نہیں دکھاتے نہ ہم جب تک سیراب نہ کر لیں طوفان نہیں اٹھاتے (ہمارا پروگرام عمل ہے نہ کہ باتیں کرنا)۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۹)۔

لو ان الباطل خلص من مزاج الحق لم یخف علی المرتادین ولو ان الحق خلص من لبس الباطل انقطعت عنہ السن المعاندین

اگر باطل حق سے دُھل جائے تو حق کے متلاشیوں کے لیے مخفی نہ رہے اور اگر حق باطل سے جدا ہو جائے تو بدگو لوگوں کی زبان اس سے منقطع ہو جائے گی۔[1]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں در حقیقت تین تشبیہیں ہیں۔

۱۔ آسمان وحی سے آیاتِ قرآن کا نزول — جسے بارش کے حیات بخش قطرات کے برسنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۲۔ انسانوں کے دلوں کو ایسی زمینوں، دروں اور گہرائیوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو اپنی وسعت اور ظرف کے لحاظ سے استفادہ کرتے ہیں۔

۳۔ "شیطانی وسوسوں" کو پانی پر پیدا ہونے والی ایسی گندی جھاگ سے تشبیہ دی گئی ہے جو پانی سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ پانی کے گرنے کی جگہ کی گندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی بنا پر نفس اور شیطان کے وسوسے خدائی تعلیمات میں سے نہیں ہیں بلکہ انسان کے دل کی آلودگی میں سے ہیں۔ بہرحال آخر کار یہ وسوسے مومنین کے دلوں سے برطرف ہو جاتے ہیں اور وحی کا آبِ شیریں باقی رہ جاتا ہے جو انسانوں کی ہدایت اور حیات کا موجب ہے۔

۳۔ فائدہ ہمیشہ اہلیت کے اعتبار سے ہوتا ہے: اس آیت سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ خدائی فیض کے بہاؤ میں کسی قسم کا کوئی بخل، محدودیت اور ممنوعیت نہیں ہے۔ جیسا کہ آسمانی بادل ہر جگہ بغیر کسی قید کے برستے ہیں اور زمین کے مختلف حصے اور درے اپنے وجود کی وسعت کے اعتبار سے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جو زمین چھوٹی ہے اس کا حصہ کم ہے اور جو بڑی ہے اس کا حصہ زیادہ ہے۔ انسانوں کے دل اور روحیں بھی خدائی فیض سے اسی اعتبار سے مستفید ہوتی ہیں۔

۴۔ باطل سرگرداں ہے: جس وقت سیلِ آب کسی صاف صحرا تک پہنچتا ہے اور پانی کا جوش و خروش مدہم پڑ جاتا ہے تو جو چیزیں پانی سے مخلوط ہوتی ہیں آہستہ آہستہ تہ نشین ہو جاتی ہیں اور جھاگ ختم ہو جاتی ہے۔ صاف و شیریں پانی نمایاں ہو جاتا ہے۔ باطل بھی اسی طرح پریشان حال ہے وہ مفاد اٹھانے کے چکر میں ہے لیکن جس وقت سکون آتا ہے اور ہر شخص اپنے مقام پر بیٹھ جاتا ہے حقیقی معیار اور ضابطے سامنے نکل ظاہر ہوتے ہیں تو پھر باطل کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی اور وہ جلد ہی رفو چکر ہو جاتا ہے۔

۵۔ باطل صرف ایک لباس میں نہیں ہوتا: باطل کی خصوصیات میں سے ہے کہ لمحہ بہ لمحہ شکلیں اور لباس بدلتا رہتا ہے تاکہ اگر اُسے ایک بہروپ میں پہچان لیا جائے تو وہ دوسرے میں اپنے تئیں چھپا لے۔

مندرجہ بالا آیت میں بھی اس معاملے کی طرف ایک لطیف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جھاگ نہ صرف پانی پر ظاہر ہوتی ہے بلکہ ہر بھٹی، ہر کٹھالی اور سانچے میں سے کہ جس میں دھاتوں کو پگھلایا جاتا ہے حتیٰ جھاگ نئی شکل میں اور نئے لباس میں آشکار ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں حق و باطل ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہر بہنے والی چیز میں جھاگ اپنی خاص شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم شکلیں

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۵۰۔

بدلنے سے دھوکا نہ کھانا چاہیے اور ہر جگہ باطل کو اس کی مخصوص صفات سے پہچان لیں کیونکہ اس کی صفات ہر جگہ ایک ہی طرح کی ہیں اور جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ان صفات کے حوالے سے باطل کو پہچان کر اسے حق سے الگ کر دینا چاہیے۔

۶۔ ہر موجود کی بقاء اس کے فائدے سے وابستہ ہے، اس سلسلے میں زیر بحث آیت میں ہے کہ جو چیز لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے باقی رہ جاتی ہے (واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض)۔

یعنی صرف پانی کہ جو باعثِ حیات ہے باقی رہ جاتا ہے اور جھاگ ختم ہو جاتی ہے بلکہ دھات بھی چاہے وہ زینت کے لیے ہو چاہے سامانِ زندگی تیار کرنے کے لیے اس میں سے بھی خالص دھات جو مفید، سود مند یا صاف و شفاف اور خوبصورت و زیبا ہوتی ہے باقی رہ جاتی ہے اور جھاگ کو دور پھینک دیتی ہے۔

اسی طرح سے انسان، گروہ، مکاتب فکر اور پروگرام جس قدر سود مند ہیں اسی قدر بقا و حیات کا حق رکھتے ہیں اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی انسان یا باطل مکتب و مذہب ایک مدت تک باقی رہ جاتا ہے تو اس کی وجہ بھی حق کی وہ مقدار ہے جو اس میں ملا ہوا ہے اور وہ اتنی مقدار کے لیے حقِ حیات پیدا کر چکا ہے۔

۷۔ حق باطل کو کس طرح باہر نکال پھینکتا ہے؟ لفظ "جفاء" جو گر جانے اور باہر کی طرف جا پڑنے کے معنی میں ہے اپنے اندر ایک لطیف نکتہ لیے ہوئے ہے اور وہ یہ کہ باطل اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ اپنی حفاظت نہیں کر سکتا اور ہمہ وقت معاشرے سے باہر جا گرنا چاہتا ہے اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جب حق جوش میں آتا ہے اور جس وقت حق میں حرکت اور جوش و خروش پیدا ہوتا ہے تو باطل کسی برتن کی جھاگ کی طرح اچھل کر باہر جا پڑتا ہے اور یہ بات خود اس امر کی دلیل ہے کہ حق کو ہمیشہ جنبش اور جوش و خروش میں رہنا چاہیے تاکہ باطل کو اپنے سے دور رکھے۔

۸۔ باطل اپنی بقا کے لیے حق کا مقروض ہے، جیسا کہ ہم نے آیت کی تفسیر میں کہا ہے اگر پانی نہ ہو تو جھاگ کبھی بھی اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی، اسی طرح اگر حق نہ ہو تو باطل کے لیے فروغ و ظہور ممکن نہیں۔ اگر صالح اور اچھے لوگ نہ ہوتے تو کوئی شخص خائن کا دھوکا یا افراد سے خائف نہ ہوتا اور ان کے فریب میں نہ آتا لہٰذا باطل کا یہ چند روزہ جولان اور فروغ بھی فروغِ حق سے بہرہ وری ہے،

کاں دروغ از راست می گیرد فروغ

جھوٹ سچ سے فروغ پاتا ہے۔

۹۔ حق اور باطل میں ہمیشہ مقابلہ رہتا ہے، قرآن نے یہاں حق و باطل کو مجسم کرنے کے لیے ایک ایسی مثال دی ہے جو کسی مکان و زمان سے مخصوص نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جو دنیا کے مختلف علاقوں میں انسانوں کے سامنے آتا رہتا ہے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ حق و باطل کے مابین جنگ کوئی وقتی اور مقامی جنگ نہیں ہے۔ صاف اور آلودہ پانی کی یہ ندیاں مخلوق پر مسلسل بہتے جانے تک اسی طرح جاری رہیں گی مگر یہ کہ ایک آئیڈیل معاشرہ وجود میں آ جائے (مثلاً حضرت مہدی علیہ السلام کے دورِ قیام کا معاشرہ)۔ جو اس مقابلے کے اختتام کا اعلان ہوگا۔ حق کا لشکر کامیاب ہو جائے گا۔ باطل کی بساط الٹ جائے گی۔ بشریت اپنی تاریخ کے نئے مرحلے میں داخل ہوگی اور جب تک یہ تاریخی مرحلہ نہ آ جائے ہر جگہ حق و باطل کے تصادم کی انتظار میں رہنا چاہیے اور باطل کے مقابلے کے لیے ضروری اہتمام کرنا چاہیے۔

۱۰۔ زندگی جہاد و جستجو کے سائے میں: زیر بحث آیت میں دی گئی خوبصورت مثال انسانی زندگی کی اس بنیادی حقیقت کو بھی واضح کرتی ہے کہ زندگی بغیر جہاد کے اور بقا و سربلندی بغیر سعی و کوشش کے ممکن نہیں ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ لوگ وسائل زندگی یا زیور کی تیاری کے لیے جو کچھ بھٹیوں اور کٹھالیوں میں ڈالتے ہیں اس میں سے ہمیشہ غیر ضروری مواد نکلتا ہے اور جھاگ پیدا ہوتی ہے اور یہ دو قسم کے وسائل یعنی ضروری اور غیر ضروری وسائل (ابتغاء حلیۃ او متاع) حاصل کرنے کے لیے اصلی مواد کو جو عالم طبیعت میں اصلی شکل میں نہیں مل سکتا اور ہمیشہ دوسری چیزوں میں ملا ہوتا ہے اسے آگ کی کٹھالی میں ڈال پڑتا ہے اور اسے پاک صاف کرنا پڑتا ہے تاکہ خالص دھات میسر آسکے اور یہ کام سعی و جستجو کے بغیر ممکن نہیں۔

اصولی طور پر دنیاوی زندگی کا مزاج یہ ہے کہ گلوں کے ساتھ خار، نوش کے ساتھ نیش، اور کامیابیوں کے ساتھ مشکلات ہوتی ہیں۔ قدیم زمانے کی کہاوت ہے کہ:

خزانے ویرانوں میں ہوتے ہیں اور ہر خزانے کے اوپر ایک اژدہا سویا ہوا ہے۔

کیا یہ ویرانے اور اژدہا سوائے مشکلات کے کسی اور چیز کا نام ہے کہ جو کامیابی کے راستے میں موجود ہیں۔

ایرانی داستانوں میں بھی رستم کی داستان میں ہے کہ وہ کامیابی تک پہنچنے کے لیے مجبور تھا کہ سات خوان سے گزرے کہ جن میں سے ہر ایک انبوہ مشکلات کی طرف اشارہ ہے کہ جو ہر مثبت کام کے راستے میں درپیش ہوتی ہیں۔

بہر حال قرآن نے یہ حقیقت بارہا بیان فرمائی ہے کہ انسان کوئی کامیابی مشکلات اور تکالیف اٹھائے بغیر حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے قرآن میں مختلف عبارتیں ہیں۔ سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۱۴ میں ہے:

ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما یأتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستهم البأساء و الضراء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین اٰمنوا معه متی نصر الله الا ان نصر الله قریب

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم آسانی سے جنت میں جا پہنچو گے اور تمہیں وہ حوادث پیش نہیں آئیں گے جو گزشتہ لوگوں کو درپیش ہوئے۔ وہی لوگ کہ جنہیں دشواریاں اور تکلیفیں درپیش ہوئیں اور وہ ایسے دکھ درد میں مبتلا ہوئے کہ پیغمبر اور ان کے ساتھ اہل ایمان کہنے لگے خدا کی مدد کہاں ہے تو ان بہت ہی سخت اور دردناک لمحات میں خدائی نصرت ان کے پاس آپہنچی اور ان سے کہا گیا کہ خدا کی مدد قریب ہے۔

قرآنی مثالیں

مباحث کی توضیح و تفسیر میں مثال کی تاثیر ناقابل انکار ہے۔ اسی بناء پر کسی بھی علم میں حقائق کے اثبات اور تفہیم کے لیے اور انہیں ذہن کے قریب لانے کے لیے ہم مثال پیش کرنے سے بے نیاز نہیں ہیں۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک برمحل مثال کہ جو مقصد سے پوری طرح ہم آہنگ ہو اور اس پر منطبق ہو مطلب کو آسمان سے زمین پہ لے آتی ہے اور اسے سب کے لیے قابل فہم بنا دیتی ہے۔

بہر حال کہا جا سکتا ہے کہ مختلف علمی، تربیتی، اجتماعی اور اخلاقی مباحث میں مثال مندرجہ ذیل موثر اثرات رکھتی ہے۔

۱۔ مثال مسائل کو حسی بنا دیتی ہے: انسان چونکہ زیادہ تر محسوسات سے مانوس ہے اور پیچیدہ عقلی حقائق نسبتاً اس کی دسترس سے دور ہوتے ہیں لہٰذا حسی مثالیں ان معقول اور دراز فاصلوں کو سمیٹ دیتی ہیں اور انہیں محسوسات کے آستانے پر لا کھڑا کرتی ہیں اور ان کے ادراک کو دلچسپ، شیریں اور اطمینان بخش بنا دیتی ہیں۔

۲۔ مثال راستے کو مختصر کر دیتی ہے: بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک گہرا منطقی اور عقلی مسئلہ ثابت کرنے کے لیے انسان کو مختلف استدلالات کا سہارا لینا پڑتا ہے مگر پھر بھی اس کے گرد ابہام موجود رہتا ہے لیکن ایک واضح اور مقصد سے ہم آہنگ مثال راستہ اس قدر مختصر کر دیتی ہے کہ استدلال کی تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے اور متعدد استدلالات کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔

۳۔ مثال مسائل کو سب کے لیے یکساں بنا دیتی ہے: بہت سے علمی مسائل کو جو اپنی اصلی صورت میں صرف خواص کے لیے قابل فہم ہیں اور عامۃ الناس اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا پاتے لیکن جب ساتھ مثال موجود ہو اور اس کے ذریعے وہ قابلِ فہم ہو جائیں تو ان سے سب لوگ مستفید ہوں گے چاہے وہ علم و دانش کے اعتبار سے جس درجے پر بھی ہوں۔ لہٰذا مثالیں علم و دانش کو عمومیت دینے کے اعتبار سے ناقابلِ انکار کار آمد چیز ہیں۔

۴۔ مثال مسائل کو زیادہ قابلِ اطمینان بنا دیتی ہے: کلیات عقلی جس قدر بھی مستدل اور منطقی ہوں جب تک ذہن تک رہتے ہیں ان کے بارے میں کافی اطمینان پیدا نہیں ہوتا کیونکہ انسان حیطۂ اطمینان کو عینیت اور ظاہری وجود میں ڈھونڈتا ہے اور مثال عقلی مسائل کو عینیت بخشتی ہے اور انہیں عالمِ خارج میں واضح کر دیتی ہے۔ اسی لیے باور کرنے، قبول کرنے اور اطمینان حاصل کرنے کے لیے مثال بہت موثر ہوتی ہے۔

۵۔ مثال ہٹ دھرموں کو خاموش کر دیتی ہے: اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مسائل کلیات مستدل اور منطقی صورت میں پیش کیے جائیں تو ایک ہٹ دھرم شخص ان پر قائل نہیں ہوتا اور اسی طرح ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے لیکن جب مسئلہ مثال کے قالب میں ڈھالا جائے تو اس کے لیے راستہ بند ہو جاتا ہے اور اس میں بہانہ جوئی کی مجال نہیں رہتی۔

نامناسب نہیں ہوگا اگر ہم اس موضوع کے لیے چند مثالیں پیش کریں تاکہ واضح ہو جائے کہ مثال میں کس قدر اثر ہے۔

جو لوگ یہ اعتراض کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ صرف ماں سے کس طرح پیدا ہو گئے اور کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص بغیر باپ کے پیدا ہو جائے قرآن ان کے جواب میں فرماتا ہے:

ان مثل عیسیٰ عند اللّٰہ کمثل اٰدم خلقہ من تراب

عیسیٰ کی مثال خدا کے نزدیک آدم کی سی ہے کہ جسے اس نے مٹی سے پیدا کیا۔ (آلِ عمران — ۵۹)

مذکورہ طریقے سے غور کریں کہ ہم جس قدر بھی ہٹ دھرم لوگوں کے سامنے کہیں کہ یہ کام خدا کی لامتناہی قدرت کے سامنے نہایت معمولی ہے پھر بھی ممکن ہے وہ بہانے ڈھونڈیں لیکن جب ان سے یہ کہیں کہ کیا تم یہ مانتے ہو کہ حضرت آدم جو پہلے انسان تھے مٹی سے پیدا ہوئے تھے تو جو خدا ایسی قدرت رکھتا ہے وہ کسی بشر کو بغیر باپ کے پیدا کیوں نہیں کر سکتا۔

جو منافقوں نے اپنے نفاق کے زیرِ سایہ چند دن ظاہراً سکون و آرام سے بسر کیے ہیں قرآن مجید ان کے بارے میں ایک خوبصورت مثال پیش کرتا ہے۔ قرآن انہیں ایسے مسافر سے تشبیہ دیتا ہے جو تاریک بیابان سے گزر رہا ہے۔ رات اندھیری ہے بجلی چمک رہی ہے۔ بادل گرج

سے یعنی مسافر اندھیری، طوفان اور بارش میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ وہ اس طرح سے سرگرداں بھٹکتا ہے کسی طرف کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا ایسے میں جب آسمانی بجلی چمکتی ہے تو بیابان کی فضا چند لمحوں کے لیے روشن ہو جاتی ہے اور وہ ارادہ کرتا ہے کہ کسی طرف جائے تاکہ اسے راستہ مل جائے لیکن جلد ہی وہ بجلی خاموش ہو جاتی ہے اور وہ اسی طرح بیابان میں سرگرداں رہ جاتا ہے۔

(بقرہ - ۲۰)

کیا سرگرداں منافق کی حالت کی تصویر کشی کے لیے کہ جو اپنی روحِ نفاق اور منافقانہ عمل سے اپنی زندگی کا سفر جاری رکھنا چاہتا ہو اس سے زیادہ جاذبِ نظر مثال ہو سکتی ہے؟

یا یہ کہ جب ہم کچھ لوگوں سے کہتے ہیں کہ راہِ خدا میں خرچ کرو تو خدا تمہیں کئی گنا زیادہ اجر دے گا تو ہو سکتا ہے کہ عام لوگ اس بات کا مفہوم پوری طرح نہ سمجھ سکیں لیکن جب یہ کہا جائے کہ راہِ خدا میں خرچ کرنا اس بیج کی مانند ہے جسے زمین میں ڈالا جائے کہ جس سے سات خوشے اگتے ہیں اور ہر خوشے میں ہو سکتا ہے ایک سو دانے ہوں تو پھر یہ مسئلہ پوری طرح سے قابلِ فہم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

مثل الذین ینفقون اموالهم فی سبیل الله کمثل حبة انبتت سبع سنابل فی کل سنبلة مائة حبة

(البقرہ - ۲۶۱)

عام طور پر ہم کہتے ہیں کہ ریاکاری والے اعمال فضول اور بے کار ہیں اور انسان کو ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہو سکتا ہے یہ بات کچھ لوگوں کے لیے ناقابلِ فہم ہو کہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک فائدہ مند عمل مثلاً ایک ہسپتال یا ایک مدرسہ اگر دکھاوے اور ریاکاری کی خاطر ہو تو بارگاہِ قدرت میں بے وقعت ہو لیکن قرآن ایک مثال کے ذریعے اس بات کو پوری طرح سے قابلِ فہم اور دلچسپ بنا دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فمثله کمثل صفوان علیه تراب فاصابه وابل فترکه صلدا

ایسے اشخاص کا عمل پتھر کے ایک ٹکڑے کی مانند ہے کہ جس پر کچھ مٹی ڈال دی گئی ہو اور اس میں کچھ بیج چھڑک دیا جائے۔ تو جس وقت بارش برستی ہے تو بجائے اس کے کہ بیج بار آور ہو بارش اسے پتھر پر چڑھی ہوئی مٹی کے ساتھ دھو ڈالتی ہے اور اسے ایک طرف پھینک دیتی ہے۔

(بقرہ - ۲۶۴)

ریاکاری اور بے بنیاد اعمال کی بھی یہی حالت ہے۔

ہم دور نہ نکل جائیں اسی زیرِ بحث مثال میں کہ جو حق و باطل کے مابین مقابلے کے بارے میں ہے اس میں معاملے کی کیسی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے اور اسے دقیق طور پر مجسم کیا گیا ہے۔ تمہید، نتائج اور حق و باطل کی مخصوص صفات اور آثار میں سے ہر ایک کو اس ایک مثال میں اس طرح سے منعکس کیا گیا ہے کہ مسئلہ سب لوگوں کے لیے قابلِ فہم اور اطمینان بخش ہو گیا ہے۔ اس کے ذیل میں کہے گئے حقائق بہت معلوم افراد کو قانع کر دینے والے ہیں نیز تمام چیزوں سے قطع نظر یہ مثال طولانی مباحث کی زحمت سے بچا دیتی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک مادہ پرست امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا:

قرآن میں ہے کہ جس وقت دوزخیوں کے جسم کا چمڑا آگ کی شدت سے جل جائے گا تو ہم اسے دوسرا چمڑا پہنا دیں گے تاکہ وہ عذاب کا ذائقہ اچھی طرح سے چکھیں۔ اس دوسرے چمڑے کا کیا گناہ ہے کہ اسے سزا اور عذاب دیا جائے۔

اس کے جواب میں امامؑ نے فرمایا:

وہ چڑا بعینہ پہلے والا چڑا بھی ہے اور اس کا غیر بھی ہے۔

سوال کرنے والا اس جواب سے مطمئن نہ ہوا اور اس جواب سے کچھ نہ سمجھ سکا لیکن امامؑ نے ایک نا طق مثال کے ذریعے معاملہ اس طرح سے واضح کر دیا کہ گفتگو کی گنجائش باقی نہ رہی۔ آپؑ نے فرمایا:

دیکھو! تم ایک پرانی اور خراب اینٹ کو ریزہ ریزہ کر دیتے ہو پھر اسی خاک کو بھگو کر سانچے میں ڈالتے ہو اور اس سے ایک نئی اینٹ بناتے ہو۔ یہ وہی پہلے والی اینٹ ہے اور ایک لحاظ سے اس کی غیر بھی ہے[1]

یہاں ایک نکتے کا ذکر بہت ضروری ہے اور وہ یہ کہ مثال اپنے ان تمام مفید اور موثر اثرات کے باوجود اپنا بنیادی تقاضا تبھی پورا کر سکتی ہے جب وہ اس مطلب سے ہم آہنگ ہو جس کے لیے اسے پیش کیا جا رہا ہے ورنہ مثال خود گمراہ کنندہ ہو گی یعنی جیسے ایک صحیح اور ہم آہنگ مثال مفید اور موثر ہے اسی طرح ایک انحرافی اور غلط مثال گمراہی اور تباہی کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔

اسی بنا پر منافقین اور بد اندیش افراد ہمیشہ لوگوں کو گمراہ کرنے اور سادہ لوح افراد کو غافل کرنے کے لیے انحرافی اور غلط مثالوں کا سہارا لیتے رہیں اور اپنے مقصد کے لیے مثال سے مدد لیتے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ ہم انحرافی اور غلط مثالوں سے فائدہ اٹھانے والے ایسے افراد پر پوری توجہ سے نظر رکھیں۔

---

[1] اس حدیث کی تشریح تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۱ (اردو ترجمہ) میں ملاحظہ فرمائیں۔ وہاں یہ حدیث مجالس شیخ اور احتجاج طبرسی کے حوالے سے ذکر کی گئی ہے۔

۱۸۔ لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

ترجمہ

۱۸۔ ان لوگوں کے لیے کہ جنہوں نے اپنے پروردگار کی دعوت کو قبول کیا ہے نیک (انجام، جزا اور) نتیجہ ہے اور وہ کہ جنہوں نے اس کی دعوت کو قبول نہیں کیا (وہ عذابِ الٰہی کی وحشت میں اس طرح غرق ہوں گے کہ) اگر وہ سب کچھ جو زمین پر ہے اور اس کی مثل ان کی ملکیت ہو اور وہ یہ سب کچھ عذاب سے نجات کے لیے دے دیں (لیکن وہ ان سے قبول نہیں کیا جائے گا) ان کے لیے برا حساب ہے اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کس قدر برا ٹھکانا ہے۔

تفسیر

جنہوں نے دعوتِ حق کو قبول کر لیا

گزشتہ آیت میں حق و باطل کا چہرہ نمایاں کرنے کے لیے ایک رسا اور فصیح و بلیغ مثال پیش کی گئی تھی۔ اس کے بعد اب اس مقام پر ان لوگوں کے انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جنہوں نے دعوتِ حق کو قبول کر لیا اور اس کے گرویدہ ہو گئے نیز ان افراد کا انجام بیان کیا گیا ہے جنہوں نے حق سے روگردانی کرتے ہوئے باطل کی طرف رخ کیا۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اپنے پروردگار کی دعوت کو قبول کر لیا ہے نیک جزا، سود مند نتیجہ اور عاقبت محمود ہے (للذین استجابوا لربهم الحسنیٰ)۔

"حسنیٰ" (نیکی) کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں ہر خیر و سعادت شامل ہے۔ نیک خصائل اور اخلاقی فضائل سے لے کر پاک و پاکیزہ اجتماعی زندگی، دشمن پر کامیابی اور بہشتِ جاوداں تک سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اور وہ کہ جنہوں نے پروردگار کی یہ دعوت قبول نہیں کی ان کا انجام اس قدر برا اور درد ناک ہے کہ اگر تمام روئے زمین اور اس کی مثل بھی ان کی ملکیت میں ہو اور وہ یہ سب کچھ اس برے انجام سے نجات کے لیے دینے پر آمادہ ہوں

تو بھی ان سے یہ سب کچھ قبول نہیں کیا جائے گا (والذین لم یستجیبوا لہ لو ان لھم ما فی الارض جمیعا ومثلہ معہ لافتدوا بہ)۔

ان کے لیے عذاب اور سزا کے عظیم ہونے کی تصویر کشی کے لیے اس سے بڑھ کر رسا اور عمدہ تعبیر نہیں ہو سکتی کہ ایک انسان تمام روئے زمین بلکہ اس کے دوگنی کا مالک ہو اور وہ یہ سب کچھ اپنے آپ کو بچانے کے لیے دے دے مگر وہ اس کے لیے فائدہ مند نہ ہو۔

یہ جملہ درحقیقت اس طرف اشارہ ہے کہ ایک انسان کی آخری آرزو کہ جس سے برتر کا تصور نہیں ہو سکتا یہ ہے کہ وہ تمام روئے زمین کا مالک ہو لیکن سرکشوں اور دعوتِ حق کے مخالفوں کو دیے جانے والے عذاب کی شدت اس حد تک ہے کہ وہ اس بات پر تیار ہوں کہ یہ آخری دنیاوی ہدف بلکہ اس سے بھی برتر و بالاتر کو فدیہ کے طور پر دے کر آزاد ہو جائیں اور بالفرض اگر ان سے یہ قبول کر بھی لیا جاتا تو یہ صرف عذاب سے نجات ہوتی۔ لیکن دعوتِ حق قبول کرنے والوں کے لیے جو انتہائی عظیم جزائیں ہیں ان کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ "مثلہ معہ" صرف اسی معنی میں نہیں کہ پورے کرۂ زمین کی مانند ان کے پاس مزید ہو بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اس سے بڑھ کر جتنی زیادہ دولت و سلطنت کے مالک ہو جائیں وہ اپنی نجات کے لیے سب کچھ دینے پر تیار ہوں گے۔ اس کی وجہ بھی واضح ہے۔ انسان چونکہ ہر چیز اپنے لیے چاہتا ہے اور جب وہ خود عذاب میں غرق ہو تو پھر تمام دنیا کی مالکیت کا اسے کیا فائدہ۔

اس بدبختی (ساری دنیا دے کر بھی نجات حاصل نہ ہونا) کے بعد ایک اور بدبختی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، ان کا حساب کتاب سخت اور برا ہوگا (اولٰئک لھم سوء الحساب)۔

"سوء الحساب" سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں مفسرین کے مختلف نظریات ہیں۔

بعض کا نظریہ ہے اس سے مراد ایسا حساب ہے کہ جو بہت دقیق اور باریک بین ہو اور جس میں کوئی درگزر نہ ہو کیونکہ "سوء الحساب" ظلم و ستم کے معنی میں خدائے عادل کے بارے میں کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔ حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث بھی اسی تفسیر کی تائید کرتی ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ امامؑ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا:

فلاں شخص کو تجھ سے کیوں شکایت ہے۔

اس نے عرض کیا:

اسے یہ شکایت ہے کہ میں نے اپنا حق اس سے آخر تک لیا ہے۔

جب امامؑ نے یہ بات سنی تو غضب ناک ہو کر بیٹھ گئے، پھر فرمایا:

كأنك اذا استقصيت حقك لم تسىء ارأيت ما حكى الله عز وجل، ويخافون سوء الحساب، اتراهم يخافون الله ان يجور عليهم لا والله ما خافوا الا الاستقصاء فسماه الله عز وجل سوء الحساب فمن استقصى فقد اساء

گویا تیرا گمان ہے کہ اگر تو آخری مرحلے تک اپنا حق لے لے تو تو نے کوئی برا نہیں کیا۔ ایسا نہیں ہے۔ کیا تو نے خدا کا یہ ارشاد نہیں دیکھا کہ جس میں اس نے فرمایا ہے:

و يخافون سوء الحساب:

(اور وہ برے حساب سے ڈرتے ہیں)۔ (رعد - ۲۱)

کیا تیرا خیال ہے کہ وہ اس سے ڈرتے ہیں کہ خدا ان پر ظلم کرے گا؟ بخدا ایسا نہیں وہ تو اس سے ڈرتے ہیں کہ خدا ان کا حساب دقیق طور پر لے اور آخری مرحلے تک پہنچائے۔ خدا نے اس کا نام "سوء الحساب" رکھا ہے لہٰذا جس شخص نے حساب کرنے میں سخت گیری کی اس نے بُرا حساب کیا ہے[1]

بعض دوسرے مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ "سوء الحساب" سے مراد یہ ہے کہ ان کا محاسبہ سرزنش کے ساتھ ہوگا۔ اس سے ایک تو اس حساب کی دہشت ہوگی اور اس کے علاوہ بھی وہ سرزنش کی تکلیف سے گزریں گے۔

بعض دیگر مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ "سوء الحساب" سے مراد "سوء الجزاء" (بُرا بدلہ) ہے یعنی ان کے لیے بُری سزا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے ہم کہیں کہ فلاں شخص کا حساب پاک ہے یا فلاں شخص کا حساب تاریک ہے یعنی ان کے حساب کا نتیجہ اچھا یا بُرا ہے یا یہ کہ ہم کہیں کہ فلاں شخص کا حساب اس کے ہاتھ میں دے دو یعنی اس کے کام کے مطابق اسے سزا یا بدلہ دو۔

یہ تینوں تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ سب کی سب آیت کی مراد ہوں یعنی ایسے افراد کو سخت حساب سے گزرنا ہوگا اور محاسبے کے ساتھ ساتھ انہیں سرزنش بھی ہوگی اور حساب کے بعد انہیں بے کم و کاست سزا بھی دی جائے گی۔

آیت کے آخر میں ان کے لیے تیسرے عذاب یا سزا کے آخری نتیجے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے: ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور یہ کیسا بُرا ٹھکانا ہے (ومأواهم جهنم وبئس المهاد)۔

"مهاد" اصل میں "مهد" کے مادے سے تیار اور مہیا کرنے کے معنی میں ہے نیز یہ لفظ بستر کے معنی میں بھی آیا ہے کہ جس سے انسان آرام اور استراحت کے موقع پر استفادہ کرتا ہے کیونکہ وہ اسے استراحت کرنے کے لیے تیار اور آمادہ کرتا ہے۔

یہ لفظ اس طرف اشارہ ہے کہ ایسے سرکش افراد بجائے بستر استراحت پر آرام کرنے کے آگ کے جلا دینے والے شعلوں پر ہوں گے۔

ایک نکتہ

آیات الٰہی سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک وہ گروہ ہے خدا کی بارگاہ میں جن کا حساب آسانی اور سہولت سے ہوگا اور اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں کسی قسم کی سخت گیری نہیں کرے گا۔ ارشاد الٰہی ہے:

فاما من اوتى كتابه بيمينه فسوف يحاسب حسابا يسيرا

اس دن جسے نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اس سے آسان حساب لیا جائے گا۔ (انشقاق — ۷، ۸)

اس کے برعکس کچھ ایسے لوگ ہیں جن سے "شدت" کے ساتھ حساب لیا جائے گا۔ ان سے ذرہ ذرہ اور مثقال بھر کا حساب نہایت باریک بینی سے لیا جائے گا۔ جیسا کہ بعض شہروں کے لوگ سرکش اور گنہگار تھے، ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

فحاسبناها حسابا شديدا وعذبناها عذابا نكرا

پس ہم نے ان کا بڑی سختی سے حساب لیا اور انہیں بُرے عذاب کی سزا دی۔ (طلاق — ۸)

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۲۹۵ [illegible] اور حدیث اگرچہ اس سورہ کی آیہ ۲۱ کی تفسیر کے ضمن میں آئی ہے لیکن واضح ہے کہ یہ "سوء الحساب" کا عمومی مفہوم بیان کرتی ہے۔

اسی طرح زیرِ بحث آیت میں "سوء الحساب" کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔

یہ اس بناء پر ہے کہ کچھ لوگ دنیاوی زندگی میں دوسروں سے حساب لینے میں بہت زیادہ سختی کرتے ہیں یعنی بال کی کھال اتارنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اپنے حق کا آخری پیسہ تک وصول کریں اور جب دوسرے سے کوئی خطا سرزد ہو جاتی ہے تو آخری حد امکان تک اُسے سزا دیتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو اپنی بیوی، اولاد، بھائیوں اور دوستوں تک سے ذرہ بھر درگذر نہیں کرتے اور چونکہ دوسرے جہان کی زندگی اس جہان کا ردِ عمل ہے لہٰذا خدا بھی ان کے حساب کتاب میں ایسی سخت گیری کرے گا تاکہ انہوں نے جو کام بھی کیا ہے اس کے جواب دہ ہوں اور احسان کے بارے میں کچھ بھی درگذر اور چشم پوشی نہیں کی جائے گی۔ اس کے برعکس کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو آسان گیر اور بہت زیادہ درگزر کرنے والے ہیں اور نہایت شفیق و مہربان ہیں۔ خصوصاً دوستوں اور جان پہچان والے افراد یا جن پر ان کا کوئی حق ہے یا جو افراد ضعیف اور کمزور ہیں ان کے لیے ایسے مہربان اور بزرگوار ہیں کہ کوشش کرتے ہیں کہ ایسے بہت سے مواقع پر اپنے آپ کو غافل ظاہر کریں اور بعض کی غلطیوں اور گناہوں سے چشم پوشی کر لیتے ہیں البتہ یہاں گناہوں سے مراد ایسے گناہ ہیں جو شخصی اور انفرادی پہلو رکھتے ہیں۔ خدا ایسے افراد کے لیے آسانی فراہم کرتا ہے۔ انہیں اپنی عفوِ بے پایاں اور رحمتِ وسیعہ سے نوازتا ہے اور انہیں آسانی سے حساب کی منزل سے گزار دیتا ہے۔

یہ بات تمام انسانوں کے لیے، خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو کسی امر کے سربراہ یا نگران ہوتے ہیں اور لوگوں سے ان کا رابطہ اور تعلق ہوتا ہے ان کے لیے ایک عظیم درس ہے۔

۱۹۔ أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَىٰ ۚ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝

۲۰۔ الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنْقُضُونَ الْمِيثَاقَ ۝

۲۱۔ وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ ۝

۲۲۔ وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝

۲۳۔ جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ ۝

۲۴۔ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ ۚ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝

ترجمہ

۱۹۔ کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ تیرے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے حق ہے، اُس شخص کی طرح ہے جو نابینا ہے؟ بس سمجھدار لوگ ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

۲۰۔ وہی کہ جو عہدِ الٰہی کو وفا کرتے ہیں اور پیمان شکنی نہیں کرتے۔

۲۱۔ وہی کہ جو وہ پیوند برقرار رکھتے ہیں کہ جن کے بارے میں خدا نے حکم دیا ہے اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور (روزِ قیامت کے) حساب کی برائی سے ڈرتے ہیں۔

۲۲۔ اور وہ کہ جو اپنے پروردگار کی (پاک) ذات کے لیے صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے انہیں جو روزی دی ہے اس میں سے پنہاں اور آشکار خرچ کرتے ہیں اور حسنات کے ذریعے سیئات کو ختم کرتے ہیں۔ ان کے لیے آخرت میں اچھا گھر ہے۔

۲۳۔ وہ جنت کے سدا بہار باغوں میں داخل ہوں گے اسی طرح ان کے آباء، ازواج اور اولاد میں سے صالح افراد بھی (داخلِ بہشت ہوں گے) اور ہر دروازے سے ان کے لیے فرشتے داخل ہوں گے۔

۲۴۔ (اور ان سے کہیں گے) سلام ہو تم پر، صبر و استقامت کی بناء پر۔ تمہیں یہ آخری گھر کیسا اچھا نصیب ہوا ہے۔

تفسیر

اہلِ شعور کا طرزِ عمل ــــ جنت کے آٹھ دروازے

زیرِ نظر آیات میں حق کے طرفداروں کے اسلامی طرزِ عمل کے جزئیات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ آیات گزشتہ آیات کی بحث کو مکمل کرتی ہیں۔

زیرِ نظر پہلی آیت میں استفہامِ انکاری کی صورت میں فرمایا گیا ہے: کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ تیرے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے حق ہے، اس شخص جیسا ہے جو نابینا ہے (افمن یعلم انما انزل الیک من ربک الحق کمن ھو اعمٰی)۔

یہ کیسی عمدہ تعبیر ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ جو شخص جانتا ہے کہ یہ قرآن برحق ہے یہ اس کی مانند ہے کہ جو نہیں جانتا بلکہ فرمایا جو جانتا ہے وہ اندھے کی طرح ہے۔ یہ تعبیر اس امر کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ اس حقیقت کو نہ جاننا کسی طرح بھی ممکن نہیں سوائے اس کے کہ انسان کے دل کی آنکھ بالکل بے کار ہو چکی ہو ورنہ کیسے ممکن ہے کہ چشمِ بینا رکھنے والا رُخِ آفتاب نہ دیکھ سکے اور اس قرآن کی عظمت بالکل نورِ آفتاب کی مانند ہے۔

اسی لیے آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: صرف وہ لوگ نصیحت پاتے ہیں جو اولو الالباب ہیں اور صاحبانِ فکر و نظر ہیں (انما یتذکر اولوا الالباب)۔

"الباب" جمع ہے "لب" کی جو ہر چیز کے "مغز" کے معنی میں ہے۔ اسی بناء پر "اولوا الالباب" کا متضاد بے مغز، کھوکھلے اور وہ افراد ہیں جن کے اندر کچھ نہ ہو۔

بعض عظیم مفسرین کے بقول یہ آیت لوگوں کو حصولِ علم اور جہالت کا زیادہ سے زیادہ مقابلہ کرنے کی تاکید کرتی ہے کیونکہ اس میں بے علم اور دانش سے محروم افراد کو نابینا قرار دیا گیا ہے۔

اس کے بعد "اولوا الالباب" کی تفسیر کے طور پر صاحبانِ حق کے طرزِ عمل کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ سب سے پہلے [illegible]

نہیں کرتے (الذین یوفون بعهد الله ولا ینقضون المیثاق)۔

اس میں شک نہیں کہ "عهد الله" (عہد الٰہی) کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ اس میں فطری عہد و پیمان کہ جو خدا نے تقاضائے فطرت کے مطابق انسان سے لیے ہیں وہ بھی شامل ہیں۔ مثلاً توحید اور حق و عدالت سے انسان کی فطری محبت کا عہد۔ اسی طرح عقلی عہد و پیمان یعنی وہ عہد کہ جو خود فکر، سوچ بچار اور قوتِ عقل کے نتیجے میں ناگزیر ہو جاتے ہیں جیسے عالم ہستی اور مبدا و معاد کے حقائق کا ادراک انسان پر خود فکر کے نتیجے میں کر لیتا ہے۔ اسی طرح اس میں شرعی پیمان بھی شامل ہیں یعنی وہ پیمان جو پیغمبر نے مومنین سے لیا ہے کہ وہ احکام خداوندی کی اطاعت کریں گے اور اس کی نافرمانی اور گناہ ترک کر دیں گے۔

یونہی وہ پیمان کہ جو انسان دوسرے انسانوں سے باندھتا ہے عہد الٰہی کے مفہوم میں شامل ہیں کیونکہ خدا ہی کا حکم ہے کہ یہ پیمان بھی پورے کیے جائیں بلکہ ایسے پیمان تشریعی بھی ہیں اور عقلی بھی۔

اہلِ شعور کے لائحہ عمل کا دوسرا حصہ رشتے ناتوں کی حفاظت اور پاسداری ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے: یہ وہی لوگ ہیں جو ان رشتوں اور رابطوں کو قائم رکھتے ہیں جن کی حفاظت کا خدا نے حکم دیا ہے (والذین یصلون ما امر الله به ان یوصل)۔

اس سلسلے میں اس سے زیادہ وسیع تعبیر نہیں مل سکتی کیونکہ انسان کا تعلق خدا سے بھی ہے، انبیاء سے بھی ہے اور رہبروں سے بھی ہے انسان کا رابطہ باقی تمام انسانوں کے ساتھ بھی ہے چاہے وہ دوست ہوں، ہمسائے ہوں رشتہ دار ہوں، دینی بھائی ہوں یا ہم نوع ہوں۔ اس کا تعلق خود اپنے ساتھ ہے۔ مندرجہ بالا حکم میں تمام رشتے ناتوں کو محترم شمار کیا گیا ہے۔ سب کا حق ادا کرنا چاہیے اور ایسا کام انجام نہیں دینا چاہیے جس سے ان میں سے کسی ایک سے تعلق منقطع ہونے تک جا پہنچے۔

درحقیقت انسان ایک ایسا موجود نہیں جو دوسرے سے کٹ کر اور جدا ہو کر رہ سکے بلکہ اس کا وجود سرتاپا رشتے ناتوں، تعلق اور روابط سے تشکیل پاتا ہے۔

ایک طرف سے اس کا تعلق پیدا کرنے والے کی بارگاہ سے ایسا ہے کہ اگر یہ اسے منقطع کرے تو نابود ہو جائے جیسے ایک بلب کا رابطہ اگر بجلی پیدا کرنے والے مرکز سے کٹ جائے۔ لہٰذا جیسے تکوینی لحاظ سے انسان اس عظیم مبداء سے تعلق رکھتا ہے چاہیے کہ تشریعی اعتبار سے بھی اُس کے ساتھ اطاعت کا رشتہ برقرار رکھے۔

دوسری طرف اس کا رشتہ پیغمبر اور امام جیسے رہبر، راہنما اور پیشوا کے حوالے سے ہے اور اگر یہ رشتہ ٹوٹ گیا تو انسان بے راہ رو اور سرگرداں ہو جائے گا۔

تیسری طرف انسان کا ایک رشتہ پورے انسانی معاشرے سے بھی ہے خصوصاً ان افراد سے جو اس پر زیادہ حق رکھتے ہیں جیسے ماں باپ، رشتہ دار، دوست اور مربی۔

چوتھی طرف اپنی ذات سے بھی اس کا ایک تعلق ہے اس لحاظ سے وہ اپنے مصالح کی حفاظت اور اپنی ترقی اور کمال تک پہنچنے کا ذمہ دار ہے۔

درحقیقت ان تمام رشتوں اور رابطوں کو برقرار رکھنا "یصلون ما امر الله به ان یوصل" کا مصداق ہے اور ان میں سے کسی کو منقطع کرنا "ما امر الله به ان یوصل" کو منقطع کرنا ہے کیونکہ خدا نے ان تمام کے "وصل" کا حکم دیا ہے۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے ان احادیث کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جو آیت کی تفسیر میں کبھی خاندان اور رشتہ داروں سے تعلق کو قائم رکھنے کا کہتی ہیں، کبھی امام اور پیشوائے دین سے مربوط رہنے کا کہتی ہیں، کبھی آل محمد سے رابطے کا حکم دیتی ہیں اور کبھی تمام اہل ایمان سے تعلق کا کہتی ہیں۔

مثلاً ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ سے "الذین یصلون ما امر اللہ بہ ان یوصل" کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا گیا تو ـــ

فقال قرابتك

فرمایا: تیرے اپنے قریبی مراد ہیں[1]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام ہی سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

نزلت فی رحم آل محمد و قد یکون فی قرابتك

یہ جملہ آل محمد کے رشتے کے بارے میں ہے نیز تیرے اپنے قریبیوں کے بارے میں بھی ہے۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ اس حدیث کے آخر میں ہے کہ امامؑ نے فرمایا:

فلا تکونن ممن یقول للشیء انه فی شیء واحد

تو ایسا شخص نہ ہو جا کہ جو آیت کے معنی کو ایک ہی مصداق میں منحصر کر دے[2]

یہ جملہ آیاتِ قرآنی کے معانی کی وسعت کی طرف ایک واضح اشارہ ہے جس کی ہم نے بارہا نشاندہی کی ہے۔

نیز ایک تیسری حدیث بھی اسی عظیم راہنما سے مروی ہے جس میں آپؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

هو صلة الامام فی کل سنة بما قل او کثر ثم قال و ما ارید بذلك الا تزکیتکم

اس سے مراد مسلمانوں کے امام اور پیشوا سے ہر حال مالی امداد کے ذریعے رشتہ برقرار رکھنا ہے چاہے وہ کم ہو یا زیادہ۔

اس کے بعد آپؑ نے فرمایا:

اس کام سے میری مراد صرف یہ ہے کہ تمہیں پاک و پاکیزہ کروں[3]

حامیانِ حق کا تیسرا اور چوتھا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور قیامت کی عدالت کے حساب کی برائی سے خوف کھاتے ہیں (و یخشون ربهم و یخافون سوء الحساب)۔

اس سلسلے میں کہ "خشیت" اور "خوف" میں کیا فرق ہے جب کہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہیں، بعض نے کہا ہے کہ خشیت وہ خوف ہے جو دوسرے کے احترام اور علم و یقین کی بنیاد پر ہو۔ لہٰذا قرآن میں یہ حالت علماء سے مخصوص شمار کی گئی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء

---

[1] نورالثقلین جلد ۲ صفحہ ۴۹۳۔

[2] نورالثقلین جلد ۲ صفحہ ۴۹۳۔

[3] نورالثقلین جلد ۲ صفحہ ۴۹۵۔

بندگانِ خدا میں سے صرف علماء اس سے خشیت رکھتے ہیں۔
(فاطر۔ ۲۸)

لیکن قرآن میں یہ لفظ جہاں جہاں استعمال ہوا ہے ان بہت سے مواقع کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ لفظ بالکل "خوف" کے مترادف کے طور پر آیا ہے اور اس کا ہم معنی ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا پروردگار سے ڈرنا اس کے حساب کتاب اور عذاب و سزا سے ڈرنے کے علاوہ کوئی اور خوف ہے، اور اگر ایسا ہے تو پھر "یخشون ربھم" اور "یخافون سوء الحساب" کے درمیان کیا فرق ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ خدا سے ڈرنا ہمیشہ اور لازماً اس کے عذاب اور حساب کتاب سے ڈرنے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ خوف اس کے مقام کی عظمت کا احساس ہے اور بندگی کی ذمہ داری کے سنگین ہونے کے خیال سے ہے (یہاں تک کہ سزا اور عذاب کی طرف توجہ کے بغیر بھی یہ احساس پیدا ہو سکتا ہے)۔ اہلِ ایمان کے دلوں میں یہ احساس خود بخود ایک خوف اور وحشت کی حالت پیدا کرتا ہے۔ وہ خوف جو ایمان کی پیداوار ہے، عظمتِ الٰہی سے آگہی کا نتیجہ ہے اور اس کی بارگاہ میں احساسِ مسئولیت کی بدولت ہے (سورہ فاطر کی آیہ ممکن ہے اسی معنی کی طرف اشارہ ہو)۔

ایک اور سوال یہاں "سوء الحساب" کے حوالے سے سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ کیا قیامت میں در اصل محاسبۂ اعمال کے موقع پر بعض افراد کو "بدحسابی" کا سامنا کرنا پڑے گا۔

گزشتہ چند آیات کے ذیل میں ہم اس سوال کا جواب ذکر کر چکے ہیں۔ وہاں بھی بالکل یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔ وہاں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سے مراد کسی در گزر کے بغیر تمام جزئیات کا باریک بینی سے حساب لیا جانا ہے۔ اصطلاحاً بال کی کھال اتارنا کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک جاذبِ نظر حدیث بھی وارد ہوئی ہے جو وہاں بیان کی جا چکی ہے۔

نیز جیسا کہ ہم نے وہاں کہا ہے یہ احتمال بھی ہے کہ "سوء الحساب" سے مراد ایسا محاسبہ ہو کہ جس میں سرزنش بھی شامل ہو۔ بعض نے "سوء الحساب" کی تفسیر "سوء الجزاء" یعنی بری سزا کے طور پر کی ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں کا حساب چکا دو یعنی اسے سزا دو۔

ہم نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "سوء الحساب" کا ایک جامع مفہوم ہے اور اس میں یہ تمام معانی شامل ہیں۔

ان کا پانچواں طرزِ عمل تمام مشکلات کے مقابلے میں صبر و استقامت ہے، وہ مشکلات کہ جو اطاعت، ترکِ گناہ، دشمن کے خلاف جہاد اور ظلم و سرکشی کے مقابلے کے راستے میں پیش آتی ہیں[1] وہ صبر و استقامت بھی پروردگار کی رضا اور خوشنودی کی خاطر ہو۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے صبر و استقامت سے کام لیتے ہیں (والذین صبروا ابتغاء وجہ ربھم)۔

ہم بارہا صبر کے معنی کہ جو استقامت کے وسیع مفہوم کا حامل ہے، کے بارے میں وضاحت کر چکے ہیں۔ "ابتغاء وجہ ربھم" تو اس کے دو میں سے ایک معنی ہیں۔

پہلا یہ کہ "وجہ" ایسا مواقع پر "عظمت" کے معنی میں ہے جیسے کسی اہم نظریے اور رائے کے بارے میں کہا جاتا ہے؛

---

[1] صبر صرف اطاعت، معصیت سے بچنے اور مصیبت کے موقع پر منحصر نہیں ہے بلکہ نعمت کے موقع پر بھی صبر کرنا چاہیے یعنی وہ انسان کو مغرور اور بے لگام نہ بنا دے۔

کہ جو ان میں سے ایک چیز انسان کے رشتے کو "خدا" سے مستحکم کرتی ہے اور دوسری "مخلوق" سے قوی کر۔

یہاں اگر ہم "مما رزقناهم" کی طرف توجہ دیں تو وہ ہر قسم کی عنایت و بخشش کے بارے میں ہے چاہے مال ہو یا علم، طاقت و حیثیت ہو یا کوئی اور وسائل ایسا ہونا ضروری بھی ہے کیونکہ انفاق اور خرچ کرنے کا ایک پہلو نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ یہ خرچ تمام پہلوؤں سے اور تمام نعمات سے ہونا چاہیے۔

"سرا و علانیة" (پنہاں اور آشکار) — یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف ایک اور اشارہ ہے کہ وہ اپنے مصارف میں اس حقیقت کی طرف بھی نظر رکھتے ہیں کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اگر انفاق مخفی طور پر ہو تو وہ زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ مثلاً اگر دوسرے کی حیثیت کا تقاضا ہو کہ اسے مخفی رکھا جائے یا انفاق کرنے والا ریا اور دکھاوے سے بچنا چاہتا ہو اور کبھی انفاق آشکار طور پر کیا جائے تو اس کا اثر زیادہ وسیع ہوتا ہے مثلاً ایسے مواقع پر جب کہ ایسا کرنا دوسروں کی تشویق کا باعث بنے اور انہیں اس عمل کی اقتدا کی ترغیب دے اور انفاق کرنے والے کا ایک عمل ایسے سینکڑوں اور ہزاروں کاموں کا سبب بنے۔

یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ ایک مثبت عمل کی انجام دہی کے لیے قرآن کس قدر باریک بینی سے کام لیتا ہے وہ صرف اس کام کی طرف توجہ نہیں کرتا بلکہ تاکید کرتا ہے کہ اس عمل کی بھی خیر ہو اور اس کے انجام پانے کی کیفیت بھی اچھی ہو (ایسے مواقع پر جہاں ایک کام کی انجام دہی مختلف کیفیات سے ممکن ہو)۔

آخر میں ان کا آٹھواں اور آخری طرز عمل بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ وہ "حسنات" (نیکیوں) کے ذریعے اپنی "سیئات" (برائیوں) کو ختم کر دیتے ہیں (ویدرءون بالحسنة السيئة)۔

اس معنی میں کہ وہ ایک گناہ اور لغزش کے ارتکاب پر صرف پشیمان ہونے اور ندامت و استغفار پر قناعت نہیں کرتے بلکہ عملی طور پر تلافی کے لیے قدم اٹھاتے ہیں اور جس قدر ان کا گناہ اور لغزش زیادہ ہو اسی قدر حسنات اور نیکیاں بھی زیادہ سے زیادہ انجام دیتے ہیں تاکہ اپنے اور معاشرے کے وجود سے گناہ کی آلودگی کو حسنات کے پانی سے دھو ڈالیں۔

"یدرءون" "درء" (بروزن "زرع") کے مادہ سے دفع کرنے کے معنی میں ہے۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ برائی کی تلافی برائی کے ذریعے نہیں کرتے بلکہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اگر کسی شخص کی طرف سے انہیں برائی پہنچے تو اس کے حق میں نیکی انجام دے کر اسے شرمندہ ہونے اور تجدید نظر پر آمادہ کریں۔ جیسا کہ سورہ فصلت کی آیہ ۳۴ میں ہے:

ادفع بالتی هی احسن فاذا الذی بینک و بینه عداوة کانه ولی حمیم

بدی کو اس طریقے سے اپنے سے دور کر جو زیادہ اچھا ہے کیونکہ اس موقع پر وہ شخص جس کے اور تیرے درمیان عداوت ہے اپنا چہرہ یوں بدل لیتا ہے گویا وہ تیرا مخلص اور پکا دوست ہے۔

بہر حال اس میں کوئی مانع نہیں کہ زیر بحث آیت دونوں مفاہیم لیے ہوئے ہو۔ احادیث اسلامی میں بھی کچھ احادیث دونوں تفاسیر بیان کرتی ہیں۔

ایک حدیث پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے، آپ معاذ بن جبل سے فرماتے ہیں:

اذا عملت سيئة فاعمل بجنبها حسنة تمحها

جب کوئی بُرا کام کر بیٹھو تو اس کے ساتھ ہی کوئی ایسا نیک کام انجام دو جو اُسے محو کر دے۔[1]

نہج البلاغہ میں حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

عاتب اخاك بالاحسان اليه واردد شره بالانعام عليه۔

اپنے بھائی کو غلط کام انجام دینے پر نیکی کے ذریعے سرزنش کرو اور اس کے شر کو انعام و احسان کے ذریعے اس کی طرف پلٹا دو۔[2]

البتہ اس طرف توجہ رہے کہ یہ ایک اخلاقی حکم ہے جو بعض مواقع سے مخصوص ہے کہ جہاں اس قسم کا طرزِ عمل موثر ہوتا ہے ورنہ حدود جاری کرنا اور بدکاروں کو سزا دینا اسلام کے قوانین میں سے ہے اور ان تمام افراد کے لیے یکساں طور پر ہے کہ جو اس کے دائرے میں آتے ہیں۔

مختلف طرزِ عمل کے ذکر کے بعد " اولوا الالباب "، صاحبانِ فکر و نظر، طرفدارانِ حق اور ایسے طریقوں پر عمل کرنے والوں کے انجام کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : دوسرا گھر جو نیک اور اچھی عاقبت کا حامل ہے، ان کے لیے ہے (اولٰئك لهم عقبى الدار)۔[3]

بعد والی آیت میں اس نیک انجام اور عاقبت خیر کی تشریح کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : ان کا انجام کار جنت کے دائمی باغات ہیں کہ جن میں وہ خود بھی داخل ہوں گے اور ان کے صالح اور نیک آباؤ اجداد، ازواج اور اولاد بھی (جنات عدن يدخلونها ومن صلح من ابائهم وازواجهم وذريٰتهم)۔ اور جو چیز ان عظیم اور بے پایاں نعمتوں کی تکمیل کرتی ہے یہ ہے کہ ہر دروازے سے ان کے لیے فرشتے داخل ہوں گے (والملٰئكة يدخلون عليهم من كل باب)۔ اور انہیں کہیں گے : تم پر سلام ہو تمہارے صبر و استقامت کی بناء پر (سلام عليكم بما صبرتم)۔ ذمہ داریوں کی انجام دہی میں اور شدائد و مصائب برداشت کرنے میں تمہارا صبر و استقامت ہے جو اس سلامتی کا باعث ہوا ہے۔ یہاں انتہائی امن، آرام اور سکون سے رہو گے۔ یہاں نہ جنگ و جدل ہے، نہ نزاع ہے، نہ دکھ ہے، نہ مخالفت ہے اور نہ جھگڑا، ہر جگہ امن ہی امن ہے اور تمام چیزیں تمہارے سامنے مجسم کتاں ہیں اور ایسا آرام و سکون جس میں اضطرابِ قلب کا شائبہ تک نہیں وہ یہیں پر ہے۔

آخر میں ارشاد ہوتا ہے : یہ کیسا اچھا انجام اور کیسی اچھی عاقبت ہے (فنعم عقبى الدار)۔

چند اہم نکات

۱۔ صرف " صبر " کا ذکر کیوں ہوا ہے ؟ " سلام عليكم بما صبرتم " کے جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتے اہلِ جنت سے یوں کہیں گے : تم پر تمہارے صبر و استقامت کی وجہ سے سلام ہو۔ حالانکہ مندرجہ بالا آیات میں ان کے آٹھ قسم کے اچھے کاموں اور اہم طرزِ ہائے عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن اس جملے میں آٹھ امور میں سے صرف " صبر " کی نشاندہی کی گئی ہے۔

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۱۵۸۔

[3] " عقبیٰ " عاقبت اور انجام کار کے معنی میں ہے چاہے اچھا ہو یا بُرا لیکن قرینہ حالیہ و مقالیہ کی طرف توجہ کی جائے تو مذکورہ آیت میں اس سے مراد اچھی عاقبت ہے۔

اسی امر کی وجہ حضرت علیؑ کے ایک زندہ اور پُرمعنی بیان سے بخوبی سمجھی جا سکتی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

ان الصبر من الایمان کالرأس من الجسد ولا خیر فی جسد لا رأس معه ولا فی ایمان لا صبر معه.

صبر کی ایمان سے وہی نسبت ہے جو سر کی جسم سے ہے۔ بدن سر کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا اور ایمان بھی صبر کے بغیر کوئی وقعت نہیں رکھتا۔[1]

درحقیقت تمام انفرادی اور اجتماعی اصلاحی پروگراموں کا سہارا صبر و شکیبائی اور استقامت ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ان میں سے کچھ بھی انجام نہیں پا سکتا کیونکہ ہر مثبت کام کی راہ میں مشکلات اور رکاوٹیں ہوتی ہیں کہ جن پر صبر و استقامت کی قوت کے بغیر کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ نہ ایفائے عہد صبر و استقامت کے بغیر ممکن ہے، نہ خدائی رشتوں کی حفاظت اس کے بغیر ہو سکتی ہے، نہ اس کے بغیر خدا اور عدالتِ قیامت کا خوف ہوتا ہے، نہ اس کے بنا قیامِ نماز ممکن ہے، نہ خدائی نعمتوں میں سے اس کے بغیر خرچ ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے بغیر حسنات کے ذریعہ خطاؤں کی تلافی ہو سکتی ہے۔

۲۔ جنت کے دروازے: آیاتِ قرآن سے بھی اور روایات سے بھی یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ جنت کے دروازے ہیں لیکن یہ متعدد دروازے اس بنا پر نہیں ہیں کہ جنت میں داخل ہونے والوں کی تعداد اس قدر ہے کہ اگر وہ ایک ہی دروازے سے داخل ہونا چاہیں تو زحمت ہوگی، نہ ہی اس کی وجہ یہ ہے کہ طبقات میں اختلاف ہے اور جس کی بنا پر ہر گروہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک دروازے سے گزرے، نہ ہی اس کی وجہ راستے کی نزدیکی یا دوری ہے اور نہ ہی دروازوں کی کثرت خوبصورتی، زیبائی اور تنوع کا باعث ہے۔ اصولی طور پر جنت کے دروازے دنیا کے دروازوں کی طرح نہیں ہیں کہ جو باغات، محلات اور مکانات میں داخل ہونے کے لیے ہوتے ہیں بلکہ یہ مختلف اعمال و کردار کی طرف اشارہ ہیں کہ جو جنت میں داخل ہونے کا سبب ہوں گے۔ اسی لیے چند ایک احادیث میں ہے کہ جنت کے دروازوں کے مختلف نام ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام "باب المجاہدین" (مجاہدین کا دروازہ) ہے اور مجاہدین اسی اسلحہ سے مسلح ہو کر اس دروازے سے جنت میں داخل ہوں گے کہ جس کے ساتھ وہ جہاد کرتے تھے اور فرشتے انہیں خوش آمدید کہیں گے۔[2]

ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: (واعلموا ان للجنة ثمانية ابواب عرض كل باب منها مسيرة اربعين سنة).

جان لو کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں کہ جن میں سے ہر دروازے کا عرض چالیس سال کی مسافت کے برابر ہے۔[3]

یہ حدیث نشاندہی کرتی ہے کہ ایسے مواقع پر دروازے کا مفہوم ہماری روزمرہ کی گفتگو سے وسیع تر ہے۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ قرآن حکیم میں ہے کہ جہنم کے سات دروازے ہیں:

---

1. نہج البلاغہ، کلمات قصار جملہ ۸۲۔
2. منہاج البراعۃ فی شرح نہج البلاغہ جلد ۳ صفحہ ۳۹۹۔
3. خصال صدوق ابواب الثمانیہ۔

(بما سبقت ابواب) (مجمع - ۴۴)

اور روایات کے مطابق جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جہنم میں پہنچنے کے راستوں کی نسبت سعادت اور بہشت جاوداں تک پہنچنے کے راستے زیادہ ہیں اور خدا کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔ جیسا کہ دعائے جوشن کبیر کے الفاظ ہیں:

یامن سبقت رحمتہ غضبہ

اس سے بھی زیادہ جاذب نظر امر یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں بھی "اولوا الالباب" کے طرزِ عمل کے بارے میں آٹھ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جن میں سے ہر ایک دراصل جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے اور سعادتِ جاوداں تک پہنچنے کا راستہ ہے۔

۳۔ اہلِ جنت سے وابستگی رکھنے والے ان سے جا ملیں گے: نہ صرف مندرجہ بالا آیت بلکہ قرآن کی دوسری آیات بھی یہ بات صراحت سے بیان کرتی ہیں کہ جنت میں اہلِ بہشت اور ان کے ماں باپ، بیویاں اولاد میں سے جو نیک اور صالح ہوں گے داخل ہوں گے۔ یہ درحقیقت ان پر خدائی نعمات کی تکمیل ہے تاکہ وہ وہاں کسی قسم کی کمی محسوس نہ کریں یہاں تک کہ جن افراد سے ان کا لگاؤ ہے ان کی جدائی بھی نہ ہو۔ نیز چونکہ اس دارِ آخرت میں کہ جو نیا اور کامل گھر ہے ہر چیز تازہ اور نئی ہو جاتی ہے لہٰذا وہ لوگ بھی تازہ اور نئے جذبوں کے ساتھ اور زیادہ خلوص و محبت کے ساتھ وہاں داخل ہوں گے، ایسی مہر و محبت کہ جو نعماتِ بہشت کی قدر و قیمت کئی گنا کر دے گی۔

مندرجہ بالا آیت میں اگرچہ صرف ماں باپ، اولاد اور ازواج کا ذکر ہے لیکن درحقیقت وہاں تمام وابستگان اکٹھے ہوں گے کیونکہ اولاد اور ماں باپ (یا باپ دادا) کی موجودگی بہن بھائیوں کے بغیر بلکہ دیگر وابستگان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تھوڑا سا غور و خوض کیا جائے تو یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کیونکہ جب کوئی شخص جنتی ہو گا تو اس کا نیک اور صالح باپ بھی اس سے جا ملے گا اور چونکہ نیک باپ جنتی ہے لہٰذا اس کے تمام بیٹے اس سے آملیں گے۔ اس طرح بھائی آپس میں مل جائیں گے اور اسی طرح دیگر وابستگان اور عزیز اقربا سب اکٹھے ہو جائیں گے (غور کیجیے گا)۔

۴۔ جناتِ عدن کیا ہے؟ "جنات" کا معنی ہے "باغات" اور "عدن" کا معنی ہے "طولانی توقف" اور یہاں ابدیت اور ہمیشگی کے معنی میں ہے اور یہ جو "معدن" (کان) کو "معدن" کہتے ہیں وہ بھی اس جگہ کسی مادے کے طولانی توقف کی بناء پر ہے۔

قرآن کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت اہلِ بہشت کے لیے ابدی، اور جاودانی گھر ہے لیکن جیسا کہ ہم نے سورہ توبہ کی آیہ ۷۲ کے ذیل میں کہا ہے، قرآن کی چند ایک آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جناتِ عدن جنت میں ایک خصوصی مقام ہے جو جنت کے دیگر باغات سے امتیاز رکھتا ہے اور اس میں صرف تین طرح کے لوگ رہیں گے انبیاء و مرسلین، صدیقین (یعنی انبیاء کے خاص دوست احباب) اور شہداء[1]

۵۔ گناہ کے آثار دُھلنا: اجمالی طور پر "حسنات" اور "سیئات" ایک دوسرے پر متقابل اثر رکھتے ہیں اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ہم اس چیز کے نمونے اپنی روز مرہ زندگی میں بھی مشاہدہ کرتے ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان سالہا سال زحمت اٹھاتا ہے اور بہت زیادہ محنت و مشقت کر کے سرمایہ جمع کرتا ہے لیکن ایک نا سمجھی، ہوا و ہوس کی پیروی یا بے پرواہی سے اسے کھو دیتا ہے یہ

---

[1] مزید وضاحت کے لیے جلد ۸ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

بالکل مادی حسنات کو گنوا بیٹھنے کے اور کچھ نہیں ہے جسے قرآن میں "حبط" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس کبھی انسان بہت سی غلطیوں کا مرتکب ہوتا ہے اور ان کے باعث سنگین خسارے کے بوجھ تلے دب جاتا ہے لیکن ایک عقلمندانہ عمل سے یا عاشقانہ جہاد کے ذریعے ان سب نقصانات کی تلافی کر دیتا ہے۔ مثلاً ہمارے زمانے کے اسی اسلامی انقلاب میں ہم نے بہت سے افراد دیکھے ہیں کہ وہ سابق ظالم و جابر نظام میں بہت سے گناہوں کے مرتکب ہوئے تھے اور اسی وجہ سے وہ جیل میں تھے لیکن جب ملک کے دشمنوں کے خلاف جہاد شروع ہوا تو اس وقت ان کی فوجی مہارت کی بناء پر انہیں میدانِ جنگ میں آنے کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے بھی بے نظیر شجاعت و فداکاری سے یکے دشمن پر حملہ شروع کیا۔ اس دوران ان میں سے بعض شہید ہو گئے اور بعض زندہ ہیں۔ دونوں صورتوں میں انہوں نے اپنی گزشتہ غلطیوں کی تلافی کر لی۔

زیرِ بحث آیات کہ جن میں فرمایا گیا ہے:

وید رءون بالحسنۃ السیئۃ

اہلِ ایمان عقلاء اور اربابِ فکر و نظر اپنی برائیوں کو نیکیوں کے ذریعے دور کرتے ہیں۔

یہ اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے کیونکہ غیر معصوم انسان کبھی کبھی غلطیوں اور لغزشوں میں گرفتار ہو جاتا ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس کے بعد وہ ان کی تلافی کی فکر میں رہے نہ صرف گناہ کے اجتماعی آثار کو اپنے اعمالِ خیر کے ساتھ دھو ڈالے بلکہ وہ ظلمت گناہ جو انسان کے قلب و روح پر جا پڑتی ہے اسے بھی حسنات کے ذریعے دور کرے اور اسے فطری نورانیت اور شفافیت کی طرف پلٹائے۔ قرآن کی زبان میں اسی کام کو "تکفیر" (لغاپانا) اور پاک کرنا کہتے ہیں (اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۱ صفحہ ۵۰۶ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں)۔

البتہ جیسا کہ ہم مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں لکھ چکے ہیں ہو سکتا ہے "وید رءون بالحسنۃ" ایک اور اہم اخلاقی فضیلت کی طرف اشارہ ہو اور وہ یہ کہ اولوا الالباب، دوسروں کی برائی کا برائی سے جواب نہیں دیتے اور انتقام لینے کی بجائے نیکی اور اچھائی کرتے ہیں تاکہ دوسرا خود شرمندہ ہو جائے، پاکیزگی کی طرف پلٹ آئے اور اپنی اصلاح کرے۔

۲۵۔ وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْۗءُ الدَّارِ ۝

۲۶۔ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۝ ع

ترجمہ

۲۵۔ اور وہ کہ جو عہد الٰہی کو مستحکم ہونے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور ان رشتوں کو قطع کر دیتے ہیں جنہیں قائم رکھنے کا حکم خدا نے دیا ہے اور روئے زمین میں فساد کرتے ہیں ان کے لیے لعنت اور آخرت کے گھر کی بدی (اور سزا) ہے۔

۲۶۔ خدا جسے چاہتا ہے (اور اہل سمجھتا ہے) وسیع رزق دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے (اور مستحق سمجھتا ہے) تنگ کر دیتا ہے لیکن وہ دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے ہیں جب کہ آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی متاع ناچیز ہے۔

تفسیر

دنیا پرست تباہ کار

چونکہ نیک و بد ہمیشہ ایک دوسرے سے موازنہ کرنے سے اچھی طرح واضح ہو جاتے ہیں لہٰذا "اولوا الالباب" اور حق پرست افراد کہ جن کا تفصیلی ذکر گزشتہ آیات میں آیا ہے کی صفات بیان کرنے کے بعد محل بحث آیات کے پہلے حصے میں مفسدین اور وہ کہ جو واقعی اپنی عقل و فکر گنوا بیٹھے ہیں کی چند بنیادی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: اور وہ کہ جو عہدِ خداوندی کو محکم کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور ان رشتوں کو منقطع کر دیتے ہیں جنہیں قائم رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے اور روئے زمین میں فساد برپا کرتے ہیں ان پر لعنت ہے اور دارِ آخرت کا عذاب ان کے لیے ضروری ہے (والذین ینقضون عہد اللّٰہ من بعد میثاقہ و یقطعون ما امر اللّٰہ بہ ان یوصل و یفسدون

فی الارض اولٰئک لھم اللعنۃ و لھم سوء الدار)۔

درحقیقت ان کے تمام اعتقادی و عملی مفاسد کا خلاصہ مذکورہ تین جملوں میں بیان کر دیا گیا ہے۔

(۱) خدائی عہد و پیمان کو توڑنا جس میں فطری، عقلی اور شرعی عہد و پیمان شامل ہیں۔

(۲) روابط اور رشتوں کو منقطع کرنا۔ خدا سے رابطہ، خدائی رہبروں سے رابطہ، مخلوق سے رابطہ اور اپنے آپ سے رابطہ۔

(۳) آخری حصہ کہ جو پہلے دو حصوں کا نتیجہ ہے ـــ روئے زمین میں فساد کرنا۔

جو شخص پیمانِ الٰہی توڑتا ہے اور ہر طرف کے رشتوں کو منقطع کر دیتا ہے کیا وہ فتنہ و فساد کے علاوہ کوئی کام انجام دے سکتا ہے، یہ کاوشیں ان لوگوں کی جانب سے مادی مقاصد کے لیے حتیٰ کہ خیالی مقاصد کے لیے کی جاتی ہیں اور ان کے نتیجے میں وہ کسی بلند مقصد کے قریب ہونے کی بجائے دور ہو جاتے ہیں کیونکہ "لعنت" رحمتِ خدا سے دوری کے معنی میں ہے۔[1]

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ اس آیت میں اور گزشتہ آیت میں "دار" (گھر اور سرائے) بصورتِ مطلق آیا ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ حقیقی گھر آخرت والا گھر ہی ہے کیونکہ دوسرا ہر گھر آخر کار حل پذیر ہو گا اور ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔

بعد والی آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ روزی اور اس کی کمی بیشی خدا کے ہاتھ میں ہے، خدا جسے چاہتا ہے وسیع رزق دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے (اللّٰہ یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ زیادہ سے زیادہ مال سمیٹنے کے لیے روئے زمین پر فساد کرتے ہیں وہ خدائی رشتوں کو توڑتے ہیں اور خدا کے ساتھ عہد شکنی کرتے ہیں تاکہ مادی زندگی کے لیے زیادہ سے زیادہ مفادات حاصل کر سکیں لیکن وہ اس حقیقت کی طرف توجہ نہیں دیتے کہ رزق اور اس میں کمی بیشی خدا کے ہاتھ میں ہے۔

علاوہ ازیں یہ جملہ ایک سوال کا جواب بھی ہو سکتا ہے جو آیت میں صراحت سے نہیں آیا اور وہ یہ کہ گزشتہ آیات میں حق و باطل کے طرفدار دو گروہوں کے ذکر کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ خدا اپنے رزق اور نعمات سے کس طرح نوازتا ہے تو آیت اس سوال کے جواب میں کہتی ہے کہ روزی اور اس کی کمی بیشی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ بہرصورت یہ روزی جلد گزر جانے والی متاع ہے جب کہ وہ چیز جسے اہمیت دی جانا چاہیے وہ آخرت کا گھر اور ابدی سعادت ہے۔

تاہم اس کے بارے میں اہم نکتہ یہ ہے کہ رزق کے لیے "مشیتِ الٰہی" یہ نہیں کہ خدا بغیر حساب کے اور اسباب سے فائدہ اٹھائے بغیر کسی کو رزقِ فراواں دے دے یا اس کی روزی کم کر دے بلکہ اس کی مشیت کی بنیاد یہ ہے کہ انسان اسے اس عالم کے اسباب کے اندر تلاش کرے کیونکہ: "ابی اللّٰہ ان یجری الامور الا باسبابھا" ـــ یعنی ـــ خدا چاہتا ہے کہ تمام امور اسباب کے ساتھ ہی رونما ہوں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: عہد شکنی اور فساد فی الارض کرنے والے دنیاوی زندگی پر ہی خوش ہیں حالانکہ آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی متاعِ ناچیز سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی (و فرحوا بالحیٰوۃ الدنیا و ما الحیٰوۃ الدنیا فی الاٰخرۃ الا متاع)۔

---

[1] راغب نے کتاب مفردات میں کہا ہے: "لعن" اس طرح سے دھتکار دینے کے معنی میں ہے کہ جس میں غصہ شامل ہو۔ جب آخرت میں خدا کی طرف اس لفظ کی اضافت ہو تو سزا کے معنی میں ہے اور دنیا میں رحمت سے منقطع ہونے کے معنی میں ہے اور اگر لوگوں کی طرف سے ہو تو نفرین کے معنی میں ہے۔

نکرہ کی صورت میں "متاع" کا ذکر اس کا حقیر ہونا ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ جیسا کہ ہم فارسی میں کہتے ہیں:

فلاں موضوع "متاعی" بیش نیست

فلاں چیز "ایک متاع" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

یعنی ایک بے وقعت متاع ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ "مفسد فی الارض" کون ہے؟: "فساد" کہ جو "صلاح" (درستی) کا متضاد ہے ہر قسم کی تخریب کاری اور تباہ کاری کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ راغب نے مفردات میں کہا ہے:

الفساد خروج الشیء عن الاعتدال قلیلا کان او کثیرا ویضاده الصلاح ویستعمل ذلک فی النفس والبدن والاشیاء الخارجة عن الاستقامة

چیزیں حالت اعتدال سے کسی طرح بھی خارج ہو جائیں، کم یا زیادہ، اسے فساد کہتے ہیں۔ اس کا متضاد "صلاح" ہے۔ یہ جان و بدن اور ان تمام اشیاء میں کہ جو اعتدال سے نکل جاتی ہیں متصور ہوتا ہے۔

اس بناء پر تمام خرابیاں جو مختلف کاموں میں پیدا ہوتی ہیں اور تمام انفرادی یا اجتماعی مسائل میں ہر قسم کا افراط و تفریط "فساد" کا مصداق ہیں۔

قرآن مجید میں بھی بہت سے مواقع پر "فساد" اور "صلاح" ایک دوسرے کے مقابلے میں آئے ہیں۔ سورہ شعراء کی آیت ۱۵۲ میں ہے:

الذین یفسدون فی الارض ولا یصلحون

وہ لوگ کہ جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۰ میں ہے:

واللہ یعلم المفسد من المصلح

خدا مفسدین کو مصلحین میں سے پہچانتا ہے۔

سورہ اعراف کی آیت ۱۴۲ میں ہے:

واصلح ولا تتبع سبیل المفسدین

اصلاح کرو اور مفسدین کی راہ کی پیروی نہ کرو۔

بعض مواقع پر ایمان اور عمل صالح کو فساد کے مقابلے میں قرار دیا گیا ہے:

ام نجعل الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض

کیا ہم ایمان لانے والوں اور عمل صالح بجا لانے والوں کو مفسدین فی الارض کی طرح قرار دیں۔ (ص ـ ۲۸)

دوسری طرف بہت سی آیات قرآن میں لفظ "فساد" کو "فی الارض" کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ جو نشاندہی کرتا ہے کہ مسئلے کے اجتماعی پہلوؤں پر نگاہ ہے۔ یہ تعبیر قرآن میں ۲۰ سے زیادہ مواقع پر دکھائی دیتی ہے۔

تیسری طرف قرآن مجید کی مختلف آیات میں "فساد" اور "افساد" ایسے گناہوں کے ساتھ آیا ہے کہ جو شاید زیادہ تر مصداق کی حیثیت

رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض گناہ بہت بڑے ہیں اور بعض چھوٹے ہیں۔ کبھی تو خدا اور رسول سے جنگ کے ہم پلہ ہو کر آیا ہے، مثلاً:

انما جزاؤا الذین یحاربون اللہ و رسولہ و یسعون فی الارض فسادا

ان لوگوں کی جزا جو خدا اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد کے در پے ہیں ...... (مائدہ ۳۳)

کبھی نسل اور زراعت کو تباہ کرنے کے ہم پلہ قرار پایا ہے، مثلاً

و اذا تولٰی سعٰی فی الارض لیفسد فیھا و یھلک الحرث و النسل

اور جہاں منہ پھیرا تو ادھر ادھر دوڑ دھوپ کرنے لگا تاکہ زمین میں فساد پھیلائے اور زراعت اور نسل کا ستیاناس کر دے

(بقرہ - ۲۰۵)

کبھی اس کا ذکر ان رشتوں کو منقطع کرنے کے ساتھ آیا ہے جنہیں قائم رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے، مثلاً:

الذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقہ و یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل و یفسدون فی الارض

وہ لوگ کہ جو اس سے میثاق باندھنے کے بعد عہد الٰہی کو توڑ دیتے ہیں اور جن رشتوں کو خدا نے جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں قطع کر دیتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں۔ (بقرہ - ۲۷)

کبھی اسے بڑا بننے کی خواہش اور سرکشی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، مثلاً:

تلک الدار الاٰخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علوا فی الارض و لا فسادا

یہ آخرت کا گھر ہے جو ہم نے ان لوگوں کے لیے قرار دیا ہے جو زمین پر بڑا بننے کی خواہش اور فساد برپا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔

(قصص - ۸۳)

کبھی قرآن "فرعون" کو مفسد گردانتا ہے اور دریائے نیل میں غرق ہوتے وقت اس کے توبہ کرنے کے متعلق کہتا ہے:

الاٰن و قد عصیت قبل و کنت من المفسدین

اب ایمان لاتا ہے حالانکہ پہلے تو نے نافرمانی کی اور تو مفسدین میں سے تھا۔ (یونس - ۹۱)

کبھی یہی لفظ "فساد فی الارض" چوری کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے متعلق ہے کہ انہوں نے چوری کی تہمت لگنے کے بعد کہا:

تاللہ لقد علمتم ما جئنا لنفسد فی الارض و ما کنا سارقین

بخدا تم جانتے ہو کہ ہم سرزمین مصر میں فساد کرنے نہیں آئے اور ہم کبھی بھی چور نہ تھے۔ (یوسف - ۷۳)

کبھی یہ لفظ کم فروشی کے ہم پلہ ہو کر آیا ہے، جیسا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعہ میں ہے کہ وہ اپنی قوم سے کہتے ہیں:

و لا تبخسوا الناس اشیاءھم و لا تعثوا فی الارض مفسدین

کم فروشی نہ کرو اور لوگوں کے حق میں کمی نہ کرو اور زمین پر فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ (ہود - ۸۵)

اور کبھی نظام عالم ہستی اور جہان خلقت کو خراب اور تباہ کرنے کے معنی میں آیا ہے:

لو کان فیھما اٰلھۃ الا اللہ لفسدتا

اگر زمین و آسمان میں اللہ کہ جو خدائے یگانہ ہے کے علاوہ اور خدا ہوتے تو یہ فاسد، خراب اور برباد ہو جاتے۔ (انبیاء - ۲۲)

ان تمام آیات سے کہ جو قرآن کی مختلف سورتوں میں آئی ہیں اچھی طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ "فساد" بطور کلی یا "فساد فی الارض" ایک بہت ہی وسیع معنی رکھتا ہے۔ اس کے مفہوم میں بڑے بڑے جرائم مثلاً فرعون اور دوسرے آمروں کے جرائم اسراف سے کر ترازو میں بیہاں تک کہ کم فروشی اور لین دین میں دھوکا بازی جیسے گناہ بھی شامل ہیں۔ فساد کے وسیع مفہوم یعنی حد اعتدال سے ہر قسم کا اخراج کی طرف توجہ رکھی جائے تو یہ وسعت پوری طرح قابل فہم ہے۔

نیز اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ عذاب اور سزاؤں کو میزانِ جرم کے مطابق ہونا چاہیے واضح ہوتا ہے کہ ان "مفسدین" میں سے ہر گروہ کو ایک الگ سزا ملنا چاہیے اور سب کے لیے ایک جیسی سزا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ سورہ مائدہ کی آیہ ۳۳ کہ جس میں "مفسد فی الارض" کا ذکر "خدا اور رسول کے محارب" کے ساتھ آیا ہے، ان کے لیے چار قسم کی سزائیں ہیں۔ یقیناً حاکم شرع کے ذمہ ہے کہ وہ ان چار سزاؤں (قتل کرنا، سولی پر لٹکانا، ہاتھ پاؤں کاٹنا اور جلا وطن کرنا) میں سے جرم کی مقدار کے مطابق ایک سزا منتخب کرے، یہاں سے فقہاء نے فقہی کتب میں محارب اور مفسد فی الارض کی بحث میں ان سزاؤں کی شرائط اور حدود تفصیل سے بیان کی ہیں۔[1]

ایسے مفاسد کی بیخ کنی کے لیے ہر موقع پر کسی ذریعے سے متمسک ہونا پڑے گا۔ کبھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پہلا مرحلہ یعنی پند و نصیحت اور تذکر ہی کافی ہوتا ہے لیکن کبھی ایسا وقت آجاتا ہے کہ شدت عمل کے آخری درجہ یعنی جنگ کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

ضمناً فساد فی الارض کی تعبیر ہمیں انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ایک حقیقت کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور وہ یہ کہ اجتماعی مفاسد عام طور پر کسی خاص مقام سے تعلق نہیں رکھتے اور انہیں کسی ایک علاقے میں محصور نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کی وسعت پورے معاشرے اور پوری زمین تک ہوتی ہے اور ایک گروہ سے دوسرے گروہ کی طرف سرایت کرتے ہیں۔

آیاتِ قرآنی سے یہ نکتہ بھی اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ بعثت انبیاء کے عظیم مقاصد میں سے ایک (وسیع مفہوم میں) زمین سے فساد ختم کرنا ہے۔ جیسا کہ خدا کے عظیم پیغمبر حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں قرآن حکیم میں ہے کہ وہ اپنی سرکش قوم کے فساد کے مقابلے میں کہتے ہیں:

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت

میرا ہدف صرف یہ ہے کہ جتنا میری استطاعت میں ہے فساد کے خلاف جنگ کروں اور اصلاح کروں۔ (ہود - ۸۸)

۲۔ روزی خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن ......: مندرجہ بالا آیات ہی نہیں جو کہتی ہیں کہ روزی کی کمی بیشی خدا کے ہاتھ میں ہے بلکہ قرآن کی مختلف آیات سے واضح طور پر یہی مفہوم حاصل ہوتا ہے کہ خدا جس شخص کی چاہتا ہے روزی وسیع کر دیتا ہے اور جس کی چاہتا ہے کم کر دیتا ہے لیکن اس کا وہ مطلب نہیں جو بعض جاہل لوگ خیال کرتے ہیں کہ کوشش و کار کردگی سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیے اور گوشہ نشین ہو جانا چاہیے تاکہ جو کچھ مقدر میں ہے خدا دے دے۔ ان لوگوں کی منفی سوچ مذہب کو افیون قرار دینے والوں کے لیے بڑی اہم سند ہے

---

[1] ہم نے بھی سورہ مائدہ کی آیہ ۳۳ کے ذیل میں (جلد ۴ صفحہ ۳۱۱) اس سلسلے میں ضروری وضاحت کی ہے (اردو ترجمہ دیکھیے)۔

یہ لوگ دو بنیادی نکتوں سے غافل ہیں :

پہلا یہ کہ خدا کا چاہنا اور اس کی مشیت و ارادہ جس کی طرف ان آیات میں اشارہ ہوا ہے وہ کوئی بن پسند اور بغیر کسی کلیہ قاعدہ والا معاملہ نہیں بلکہ اسی طرح ہے جس طرح ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ خدا کی مشیت و ارادہ اس کی حکمت سے جدا نہیں ہے بلکہ ہمیشہ لیاقت اور اہلیت پر موقوف ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ مسئلہ عالم اسباب کی نفی کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ عالم اسباب یعنی جہان تکوین بھی اس کی مشیت تکوینی ہے اور وہ کبھی بھی اس کی مشیت تشریعی سے جدا نہیں ہوتی۔

زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رزق کی وسعت و تنگی کے بارے میں خدا کا ارادہ کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہے کہ جو انسان کی زندگی پر حکم فرما ہیں۔ کوشش، ہمت اور اخلاص اور اس کے برعکس سستی، تن آسانی، ذہنی اور نیتوں کی آلودگی اس میں تعیر خیز اثر رکھتی ہے اسی بناء پر قرآن مجید نے بار ہا انسان کو اس کی کوشش اور جہد و فعالیت کا مرہون منت شمار کیا ہے اور زندگی میں اس کے حصہ کو سعی و کوشش کی میزان پر رکھا ہے۔ اسی لیے وسائل الشیعہ کی کتاب تجارت میں ایک باب حصول رزق کے لیے کوشش سے متعلق ہے نیز کچھ ابواب بیکاری، زیادہ سونے اور ضروریاتِ زندگی کے حصول میں سستی کی مذمت کے بارے میں بھی ہیں۔

ان ابواب میں منقول احادیث میں سے ایک حدیث جو امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے یہ ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

ان الاشياء لما ازدوجت ازدوج الكسل والعجز فنتجا بينهما الفقر

جب سے طرح طرح کی موجودات نے ایک دوسرے سے ازدواج کیا تو سستی اور عجز و ناتوانی نے آپس میں شادی کی اور ان سے جو بچہ پیدا ہوا وہ "فقر" تھا۔[1]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

لا تكسلوا فی طلب معايشكم فان اٰباءنا كانوا يركضون فيها ويطلبونها

حصول رزق میں ضروریات زندگی مہیا کرنے میں سستی سے کام نہ لو کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد ان کے حصول میں دوڑا کرتے تھے اور ان کے لیے تلاش و جستجو کرتے تھے۔[2]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے :

انی لا بغض الرجل ان يكون كسلانا عن امر دنياه، ومن كسل عن امر دنياه فهو عن امر اٰخرته اكسل۔

میں ایسے شخص سے ناراض ہوں جو اپنے کارِ دنیا میں سست ہو کیونکہ جو کارِ دنیا میں سست ہے (اگرچہ وہ اس کا نتیجہ جلد بھگتے گا تاہم) وہ آخرت کے معاملے میں زیادہ سست ہو گا۔[3]

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صفحہ ۳۸

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صفحہ ۳۸

[3] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صفحہ ۳۷

نیز امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

ان اللہ تعالیٰ لیبغض العبد النوام، ان اللہ لیبغض العبد الفارغ

یقیناً خدا تعالیٰ زیادہ سونے والے اور بیکار شخص سے ناراض ہے[1]

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صفحہ ۳۷ ۔

۲۷۔ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ ○

۲۸۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللَّهِ ۗ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ○

۲۹۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ ○

ترجمہ

۲۷۔ جو لوگ کافر ہوگئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے آیت (اور معجزہ) کیوں نازل نہیں ہوتا۔ کہہ دو: خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جو شخص اس کی طرف پلٹ آتا ہے اُسے ہدایت کرتا ہے (معجزے کی کمی نہیں ان کی ہٹ دھرمی رکاوٹ کا باعث ہے)۔

۲۸۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور ان کے دل یادِ خدا سے مطمئن (اور پُر سکون) ہیں یاد رکھو کہ یادِ خدا سے دل مطمئن ہوتے ہیں۔

۲۹۔ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال انجام دیے پاکیزہ ترین (زندگی) اور بہترین انجام ان کا نصیب ہے۔

تفسیر

یادِ الٰہی باعثِ تسکینِ دل ہے

اس سورت میں چونکہ توحید، معاد اور رسالتِ پیغمبر کے بارے میں بہت سی مباحث ہیں لہٰذا زیرِ بحث پہلی آیت دوبارہ پیغمبر اسلامؐ کی دعوت کے مسئلے کی طرف لے جاتی ہے۔ اس میں ہٹ دھرم منکرین کا ایک اعتراض بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، کافر کہتے ہیں کہ اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر معجزہ نازل کیوں نہیں ہوتا (ویقول الذین کفروا لولا انزل علیہ اٰیۃ من ربہ)۔

لفظ "یقول" فعل مضارع ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بار بار اعتراض کرتے تھے اور باوجودیکہ انہوں نے رسول اللہ سے بارہا معجزات دیکھے تھے (اور ہر پیغمبر کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی حقانیت کے ثبوت میں کچھ معجزات پیش کرے) پھر بھی وہ بہانے تراشتے تھے اور گزشتہ معجزات کو نظر انداز کر دیتے تھے اور اپنی من پسند کے نئے معجزے کا تقاضا کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ لوگ اور تمام ہٹ دھرم منکرین ہمیشہ اپنی مرضی کے معجزات ڈھونڈتے رہتے تھے اور توقع رکھتے تھے کہ پیغمبر ایک جادوگر کی طرح کہیں بیٹھ جائیں اور ان میں سے ہر کوئی جائے اور جو معجزہ طلب کرے وہ فوراً پیش کر دیں اور اگر پھر بھی یہ نہ چاہیں تو ایمان نہ لائیں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ پہلے درجے میں انبیاء کی ذمہ داری ہے کہ تبلیغ، تعلیم اور تنبیہ کا ذریعہ اختیار کریں۔ معجزات تو استثنائی امور ہیں کہ جو حسب ضرورت (وہ بھی حکم خدا سے نہ کہ پیغمبر کی خواہش کے مطابق) انجام پاتے ہیں لیکن ہم بارہا آیاتِ قرآنی میں پڑھتے ہیں کہ دشمنوں کے کئی گروہ اس حقیقت کی پرواہ کیے بغیر ہمیشہ انبیاء کے خلاف مزاحمت کرتے رہے ہیں اور اس قسم کی فرمائشیں کرتے رہے ہیں۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: اے پیغمبر! ان سے کہہ دو خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جو شخص اس کی طرف لوٹے اسے ہدایت کرتا ہے (قل ان اللہ یضل من یشاء و یھدی الیہ من اناب)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تمہارے لیے معجزے کے لحاظ سے کوئی کمی نہیں کیونکہ پیغمبر نے کافی مقدار میں معجزات دکھائے ہیں کمی خود تمہارے وجود کے اندر ہے۔ ہٹ دھرمیاں، تعصبات، جہالتیں اور وہ گناہ جو توفیق کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں تمہارے ایمان لانے میں حائل ہیں۔ لہٰذا خدا کی طرف لوٹ آؤ، توبہ کرو، جہالت و غرور اور خود خواہی کے پردے اپنی نگاہ و فکر سے ہٹاؤ تاکہ واضح طور پر جمالِ حق کا مشاہدہ کر سکو کیونکہ

جمالِ یار ندارد نقاب و پردہ ولی
غبار رہ بنشان تا نظر توانی کرد

جمالِ دوست پر تو کوئی نقاب نہیں ہے لیکن راستے کا گرد و غبار ہٹا دو تاکہ میں اسے دیکھ سکوں۔

بعد والی آیت میں "من اناب" (جو خدا کی طرف پلٹ آئے ہیں) کی بہت عمدہ تفسیر بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور ان کے دل ذکر الٰہی سے مطمئن اور پرسکون ہیں (الذین اٰمنوا و تطمئن قلوبھم بذکر اللہ)۔

اس کے بعد ایک دائمی اور وسیع اصول کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے: آگاہ رہو کہ یاد الٰہی سے دل مطمئن ہوتے ہیں اور قرار پاتے ہیں (الا بذکر اللہ تطمئن القلوب)۔

زیر بحث آخری آیت میں اہل ایمان کا انجام کار بیان کر کے گزشتہ آیت کا مضمون یوں مکمل کیا گیا ہے: وہ لوگ کہ جو ایمان لائے اور انہوں نے صالح اعمال انجام دیے ان کے لیے بہترین زندگی ہے اور ان کا انجام کار بہترین ہوگا (الذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحٰت طوبٰی لھم و حسن ماٰب)۔

بہت سے بزرگ مفسرین نے لفظ "طوبٰی" کو "اطیب" کا مؤنث سمجھا ہے جس کا مفہوم ہے بہتر، پاکیزہ تر یا بہترین اور پاکیزہ ترین۔ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس کا متعلق محذوف ہے اس لفظ کا مفہوم ہر لحاظ سے وسیع اور غیر محدود ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "طوبٰی لھم" کے ذریعے ان کے لیے تمام سعادتوں اور پاکیزگیوں کی پیش بینی کی گئی ہے۔ ان کے لیے تمام چیزوں میں سے بہترین مہیا ہوں گی۔ بہترین زندگی، بہترین نعمتیں، بہترین آرام و سکون، بہترین دوست احباب اور پروردگار کی بہترین اور خاص مہربانیاں —— یہ سب کی سب

ایمان اور عملِ صالح کی مرہونِ منت ہیں ـــــ اور بیان کے لیے جو ہے جو عقیدے کے لحاظ سے محکم اور عمل کے لحاظ سے پاک، فعال، درست کار اور خدمت گذار ہیں۔

لہٰذا اس لفظ کی مختلف مفسرین کی طرف سے جو مختلف تفسیریں ہوئی ہیں وہ سب اس کی مصداق ہیں۔ یہاں تک کہ مجمع البیان میں اس کے دس معانی ذکر ہوئے ہیں جو حقیقت میں اس کے وسیع معنی کے مختلف مصادیق ہیں۔

کئی ایک روایات میں بھی ہے کہ "طوبیٰ" ایک درخت ہے جس کی جڑیں جنت میں رسول اللہ یا حضرت علیؑ کے گھروں میں ہیں اور اس کی شاخیں ہر جگہ تمام مومنین اور ان کے گھروں پر سایہ فگن ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ روایات ان عظیم پیشواؤں اور ان کے پیروکاروں کے درمیان ان کے مقام رہبری اور نہ ٹوٹنے والے رشتوں کی تصویر کشی کرتی ہوں جن کا نتیجہ ایسی طرح طرح کی نعمات ہیں۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں لفظ "طوبیٰ" مؤنث کے طور پر آیا ہے اور "اطیب" نہیں آیا کہ جو مذکر ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حیات یا نعمت کی صفت ہے اور یہ دونوں الفاظ مونث ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ یادِ الٰہی سے دل کو کیسے سکون ملتا ہے؟ انسانوں کی زندگی میں اضطراب اور پریشانی ہمیشہ سے ایک بڑی مصیبت کے طور پر موجود رہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اس کے اثرات پوری طرح محسوس ہوتے ہیں۔ سکون و قرار ہمیشہ سے انسان کی زندگی کی ایک قیمتی گمشدہ چیز رہی ہے۔ اس کی تلاش میں انسان ہر دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ اگر ہم پوری تاریخ بشر میں صحیح یا غلط طریقے سے کی گئی ان کوششوں کا ذکر کریں کہ جو سکون و قرار حاصل کرنے کے لیے کی گئیں تو بہت ہی ضخیم کتاب بن جائے۔

بعض ماہرین اور علماء کہتے ہیں کہ بعض ہمہ گیر بیماریاں جب پھیلتی ہیں اور وباء کی صورت اختیار کر لیتی ہیں تو جو افراد ظاہراً اس وبائی بیماری کی وجہ سے مرتے ہیں ان میں سے اکثر خوف اور پریشانی کی وجہ سے دم توڑ دیتے ہیں تھوڑے ہی افراد ایسے ہوتے ہیں جو حقیقتاً اس وبائی بیماری میں مبتلا ہو کر ختم ہوتے ہیں۔

اصولی طور پر سکون و پریشانی فرد اور معاشرے کی سلامتی و بیماری اور سعادت و بدبختی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے اور یہ ایسی چیز نہیں ہے جس سے آسانی سے گزر جایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک بہت سی کتابیں پریشانی اور اضطرابِ قلب پر قابو پانے اور آرام و سکون حاصل کرنے کے طریقوں پر لکھی گئی ہیں۔

تاریخ بشر ایسے غم انگیز مناظر سے بھری پڑی ہے کہ انسان نے تلاشِ سکون میں ہر چیز کی طرف ہاتھ بڑھایا، وادی وادی پھرا اور طرح طرح کی عادتیں اپنائیں ـــــ

لیکن قرآن نے ایک مختصر اور پُر معنیٰ جملے میں انتہائی اطمینان کے لیے نزدیک ترین راستے کی نشاندہی کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جان لو کہ یادِ خدا دلوں کے لیے آرام بخش اور باعثِ سکون ہے۔

اس قرآنی حقیقت کی وضاحت کے لیے ـــــ مندرجہ ذیل توضیح کی طرف توجہ کیجئے۔

پریشانی اور اضطراب کے عوامل (۱) اضطراب و پریشانی کبھی تاریک اور مبہم مستقبل کی فکر کی بناء پر ہوتی ہے۔ نعمتوں کا زوال، دشمن

کے چنگل میں گرفتاری، ضعف و کمزوری، بیماری، ناتوانی، درماندگی اور حاجتمندی کا احتمال ــــ یہ سب چیزیں انسان کو پریشان کردیتی ہیں لیکن قادر و متعال اور رحیم و مہربان خدا پر ایمان ــــ وہ خدا کہ جو ہمیشہ سے اپنے بندوں کی کفالت اپنے ذمہ لیے ہوئے ہے، ایسی پریشانیوں کو دور کرسکتا ہے اور اسے سکون دے سکتا ہے۔ اس کی یاد یہ ہو سکتی ہے کہ آنے والے حوادث کے مقابلے میں تو درماندہ اور بے یار و مددگار نہیں ہے تو توانا، قادر اور مہربان خدا رکھتا ہے۔

۲۔ کبھی ماضی کی تاریک زندگی فکرِ انسانی کو اپنی طرف مشغول رکھتی ہے اور ہمیشہ اسے پریشان کیے رہتی ہے ــــ ان گناہوں پر پریشانی کہ جو اس نے انجام دیے ہیں اور وہ کوتاہیاں اور لغزشیں جو اس سے سرزد ہوئی ہیں اسے ستاتی رہتی ہیں لیکن اس طرف توجہ کہ خدا غفار، توبہ قبول کرنے والا، رحیم اور غفور ہے، اسے سکون دیتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ اس کی بارگاہ میں تقصیر و کوتاہی پر معذرت چاہو، گزشتہ گناہوں پر عذر خواہی کرو اور ان کی تلافی کی کوشش کرو کیونکہ وہ بخشنے والا ہے اور تلافی ممکن ہے۔

۳۔ کبھی طبیعی اور مادی عوامل کے مقابلے میں انسان کی کمزوری و ناتوانی اور کبھی داخلی و خارجی دشمنوں کی کثرت اسے پریشان کردیتی ہے کہ میں ان طاقتور دشمنوں کے مقابلے میں میدانِ جہاد میں کیا کروں یا ان سے دیگر مقابلوں میں میں کیا کرسکتا ہوں ــــ لیکن جب وہ خدا کو یاد کرتا ہے اور اس کی قدرت و رحمت پر بھروسہ کرتا ہے ــــ وہ قدرت کہ جو تمام طاقتوں سے برتر ہے اور کوئی اس کے مقابلے کی ہمت نہیں رکھتا ــــ تو اس کے دل کو سکون آجاتا ہے اور وہ اپنے آپ سے کہتا ہے ــــ ہاں! میں اکیلا نہیں ہوں، خدا کے سامنے میں میری طاقت لامتناہی ہے۔

جنگوں میں مجاہدین راہِ خدا کا جذبہ ــــ گزشتہ زمانہ ہو یا موجودہ ــــ اور ان کی تعجب انگیز اور خیرہ کن جنگیں ــــ یہاں تک کہ ان مواقع پر بھی جب کہ وہ یک و تنہا ہوتے ہیں ــــ ان سے وہ سکون و اطمینان واضح ہوتا ہے کہ جو صرف سایۂ ایمان میں پیدا ہوتا ہے۔

جب ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں یا کانوں سے سنتے ہیں کہ ایک افسر رشید خیرہ کن معرکے میں اپنی بینائی بالکل کھو بیٹھتا ہے اور وہ مجروح بدن کے ساتھ ہسپتال میں چارپائی پر پڑا ہوتا ہے لیکن ایسے سکونِ دل اور اطمینانِ قلب سے گفتگو کر رہا ہوتا ہے گویا اس کے بدن پر کوئی خراش تک نہیں آئی ــــ اس سے ہم ذکرِ خدا کے زیرِ سایہ پُر اعجاز سکون کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔[1]

۴۔ کبھی انسان کی تکلیف وہ پریشانیوں کی بنیاد زندگی کے بے مقصد ہونے کا احساس ہوتا ہے لیکن جو شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے اور زندگی میں تکامل و کمال حاصل کرنے کو ایک عظیم مقصد کے طور پر اپنائے ہوئے ہے اور زندگی کے تمام امور و حوادث کو اسی مقصد کی روشنی میں دیکھتا ہے اسے نہ زندگی کے بے کار ہونے کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی وہ بے ہدف اور ٹھکرائے ہوئے افراد کی طرح مضطرب و سرگرداں ہوتا ہے۔

۵۔ پریشانی کا ایک اور عامل یہ ہے کہ انسان بعض اوقات ایک ہدف تک پہنچنے کے لیے بہت زیادہ زحمت اٹھاتا ہے لیکن اسے کوئی ایسا فرد نظر نہیں آتا جو اس کی زحمت و مشقت کا قدردان ہو۔ یہ ناقدری اسے شدید دکھ دیتی ہے اور اسے ایک عالمِ اضطراب و پریشانی میں غرق کردیتی ہے لیکن جب وہ احساس کرتا ہے کہ کوئی ہے جو اس کی تمام مساعی اور کاوشوں سے آگاہ ہے، وہ ان سب کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا

---

[1] ایسے واقعات ہم پر دشمنوں کی مسلط کردہ ایران عراق جنگ میں ایک نہیں بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں ہیں۔ یہ واقعات مجاہدین بدر و دیگر اسلامی جنگوں کے مجاہدین کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

ہے اور وہ ان سب کا اجر و ثواب دے گا تو پھر وہ کیوں پریشان اور بے چین ہوگا۔

(۶) بدگمانیاں، توہمات اور بے ہودہ خیالات بھی پریشانی کے عوامل میں سے ہیں۔ بہت سے لوگ ان کی وجہ سے اپنی زندگی میں رنج اٹھاتے ہیں لیکن کیونکر انکار کیا جاسکتا ہے کہ خدا کے لطف و کرم کی یاد نیز اس حکم کی طرف توجہ کر ہر صاحب ایمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ حسن ظن سے کام لے اسے یہ پریشانی جاتی رہتی ہے اور اس کی جگہ سکون و اطمینان لے لیتا ہے۔

(۷) دنیا پرستی اور مادی زندگی کی رنگینیوں پر دلباختگی انسانوں کے اضطراب و پریشانی کا ایک بہت بڑا عامل رہا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات لباس، جوتے، ٹوپی یا ہزاروں چیزوں میں سے کسی ایک کا خاص رنگ نہ مل سکے تو دنیا پرست کئی گھنٹے، کئی دن یا کئی ہفتے پریشان اور بے آرام رہتے ہیں لیکن خدا پر ایمان اور ایسی چیزوں سے مومن کی آزادی ایسی تمام پریشانیوں کو ختم کر دیتی ہے کیونکہ ایک مومن ہمیشہ اسلامی زہد کا حامل ہوتا ہے اور وہ مادی زندگی کی رنگینیوں کا قیدی نہیں ہوتا۔

جس وقت انسانی روح اتنی وسعت حاصل کرے کہ وہ علی علیہ السلام کی طرح کہے:

دنیاکم ھذہ اھون عندی من ورقة فی فم جرادة تقضمھا

تمہاری دنیا میری نظر میں درخت کے اس پتے سے بھی حقیر ہے جو ایک ٹڈی دل کے منہ میں ہو جسے وہ چبا رہی ہو۔[۱]

تو پھر —— کسی مادی چیز تک اس کا نہ پہنچنا یا اسے کھو بیٹھنا انسانی روح کا سکون کیسے درہم برہم کرسکتا ہے اور اس کے دل و دماغ میں کیونکر پریشانی پیدا کرسکتا ہے۔

(۸) پریشانی کا ایک اور اہم عامل موت کا خوف بھی ہے یہ خوف ہمیشہ انسانوں کی روح کو ستائے رکھتا ہے۔ موت کا امکان چونکہ صرف زیادہ بڑی عمر میں ہی نہیں بلکہ دوسرے سالوں میں بھی ہے، خصوصاً بیماریوں، جنگوں اور بدامنیوں کی حالت میں لہٰذا یہ وحشت اور خوف عمومی ہوسکتا ہے۔

البتہ اگر ہم عالم شناسی کے حوالے سے موت کو فنا اور ہر چیز کے خاتمے کے معنی میں سمجھیں (جیسا کہ مادی نظریہ رکھنے والوں کا خیال ہے) تو پھر یہ اضطراب، بالکل بجا ہے۔ ایسی موت سے واقعاً ڈرنا چاہیے جو انسان کی تمام آرزوؤں اور کامیابیوں کا آخری نقطہ ہو لیکن اگر خدا پر ایمان کی وجہ سے موت کو ایک وسیع تر اور اعلیٰ تر زندگی کا دریچہ سمجھا جائے اور موت سے گزرنے کو زندان کے دالان سے گزر کر ایک آزاد فضا تک پہنچنا شمار کیا جائے تو پھر یہ پریشانی بے معنی ہے بلکہ ایسی موت اگر ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے آئے تو اسے پسند کیا جانا چاہیے اور وہ چاہے جانے کے قابل ہے۔

پریشانی کے عوامل انہی میں منحصر نہیں ہیں بلکہ اس کے اور بھی بہت سے عوامل شمار کیے جاسکتے ہیں لیکن یہ بات قابل قبول ہے کہ زیادہ تر پریشانیوں کی بازگشت مذکورہ عوامل ہی کی طرف ہے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ عوامل خدا پر ایمان کے مقابلے میں پگھل جاتے ہیں، بے رنگ ہو جاتے ہیں اور نابود ہو جاتے ہیں تو پھر ہمیں اس بات کی تصدیق کرنا پڑے گی کہ خدا کی یاد دلوں کے سکون و قرار کا باعث ہے —— (الا بذکر اللہ تطمئن القلوب)[۲]

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۴۔

۲۔ مزید وضاحت کے لیے کتاب "دو راہِ عظیم برنگ اضطراب و ناامیدی" کی طرف رجوع فرمائیں۔

۲۔ کیا خوفِ خدا اور اطمینان باہم مطابقت رکھتے ہیں؟ بعض مفسرین نے یہاں ایک اعتراض اٹھایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم مذکورہ آیت میں پڑھتے ہیں کہ یادِ خدا دلوں کے سکون و اطمینان کا باعث ہے جب کہ دوسری طرف سورہ انفال کی آیہ ۲ میں ہے:

انما المؤمنون الذین اذا ذکر اللّٰہ وجلت قلوبھم

مومن وہ ہیں کہ جس وقت خدا کا ذکر کیا جائے تو ان کا دل دھڑکنے لگتا ہے۔

کیا یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ آرام و سکون سے مراد مادی عوامل کے مقابلے میں سکون ہے کہ جو عام لوگوں کو پریشان کیے رکھتے ہیں جن کے واضح نمونے ہم نے سطورِ بالا میں پیش کیے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اہلِ ایمان اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں پریشان نہ ہوں دوسرے لفظوں میں جو چیز ان میں نہیں ہوتی وہ ویران گر پریشانیاں ہیں جو دنیا میں عام طور پر ہوتی ہیں باقی رہی اصلاحی پریشانی کہ جو انسان کو خدا اور مخلوق کے بارے میں احساسِ ذمہ داری پر ہوتی ہے اور جو زندگی میں مثبت کردار ادا کرنے پر آمادہ کرتی ہے وہ ان میں موجود ہوتی ہے اور اسے ہونا بھی چاہیے اور خوفِ خدا سے مراد بھی یہی ہے۔[1]

۳۔ "ذکرِ خدا" کیا ہے اور کس طرح ہے؟ جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے "ذکر" کبھی مطالب و معارف کے حفظ کے معنی میں آتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ لفظ "حفظ" اس کی ابتداء میں بولا جاتا ہے اور لفظ "ذکر" اسے جاری رکھتے ہوئے اور کبھی کسی چیز کو زبان سے یا دل میں یاد کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے علماء نے کہا ہے کہ "ذکر" دو قسم کا ہے "ذکرِ قلبی" "ذکرِ زبانی"۔ ان میں سے ہر ایک پھر دو طرح کا ہے یا تو فراموشی کے بعد ذکر یا بغیر فراموشی کے ذکر۔

بہرحال زیرِ بحث آیت میں ذکرِ خدا کہ جو دلوں کے لیے باعثِ سکون ہے اسے مراد یہ نہیں کہ اس کا نام زبان پر لایا جائے اور بار بار تسبیح تہلیل اور تکبیر کہی جائے بلکہ مراد یہ ہے کہ پورے دل کے ساتھ اللہ کی طرف اور اس کی عظمت، اس کے علم اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کی طرف متوجہ رہا جائے اور یہ توجہ انسان میں جہاد و کوشش اور نیکیوں کی طرف حرکت کی بنیاد بنے اور اس کے اور گناہ کے درمیان ایک مضبوط بند کا کردار ادا کرے۔ یہ ہے وہ ذکر جس کے لیے روایاتِ اسلامی میں اس قدر آثار و برکات بیان ہوئی ہیں۔

ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ پیغمبرِ اکرمؐ نے حضرت علیؑ سے جو وصیتیں کیں ان میں سے ایک یہ تھی:

یا علی ثلاث لا تطیقھا ھذہ الامۃ المواساۃ للاخ فی مالہ وانصاف الناس من نفسہ و ذکر اللّٰہ علی کل حال، ولیس ھو سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر ولکن اذا ورد علی ما یحرم علیہ خاف اللّٰہ عزوجل عندہ و ترکہ۔

یا علی! تین کام ایسے ہیں جن کی اس امت میں طاقت نہیں ہے (اور ہر شخص یہ کام نہیں کر سکتا)، مال میں دینی بھائیوں کے

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۴ ص ۳۸۸ (اردو ترجمہ) پر بھی ہم نے اس سلسلے میں وضاحت کی ہے۔

ساتھ مواسات کرنا، اپنی طرف سے لوگوں کا حق ادا کرنا اور ہر حالت میں خدا کو یاد رکھنا لیکن خدا کی یاد (صرف) سبحان اللہ و الحمد للہ و لا الہ الا اللہ واللہ اکبر نہیں ہے بلکہ یادِ خدا یہ ہے کہ جس وقت انسان کسی فعل حرام کا سامنا کرے تو خدا سے ڈرے اور اسے ترک کر دے [1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

الذکر ذکران ذکر اللہ عزو جل عند المصیبۃ و افضل من ذالک ذکر اللہ عند ما حرم اللہ علیک فیکون حاجزاً۔

ذکر دو قسم کا ہے۔ ایک تو خدا کو مصیبت کے وقت یاد رکھنا (اور صبر و استقامت سے کام لینا) اور اس سے افضل و برتر یہ ہے کہ محرمات کے مقابلے میں خدا کو یاد رکھا جائے اور اس کے اور حرام کام کے درمیان دیوار کھڑی کر دی جائے [2]

یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں ذکرِ خدا کا تعارف ایک سپر اور دفاعی ہتھیار کے طور پر کروایا گیا ہے۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایک روز پیغمبر اکرمؐ نے اپنے اصحاب کی طرف رُخ کر کے ارشاد فرمایا:

اتخذوا جنتا

فقالوا: یا رسول اللہ امن عدو قد اظلنا؟

قال: لا، ولکن من النار قولوا سبحان اللہ والحمد للہ و لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر۔

اپنے لیے سپر مہیا کرو۔

اصحاب نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا دشمنوں کے مقابلے میں کہ جنہوں نے ہمیں گھیر رکھا ہے اور ہم پر سایہ کیے ہوئے ہیں؟

فرمایا: نہیں بلکہ جہنم (کی آگ) سے کہو: سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر (خدا کی پاکیزگی بیان کرو، اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرو، اس کے علاوہ کسی کو معبود نہ بناؤ اور اسے ہر چیز سے برتر سمجھو) [3]

جو ہم دیکھتے ہیں کہ چند ایک احادیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعارف "ذکر اللہ" کے طور پر ہوا ہے تو وہ بھی اس بنا پر ہے کہ وہ لوگوں کو خدا یاد دلاتے ہیں اور ان کی تربیت کرتے ہیں۔ امام صادق علیہ السلام سے "الا بذکر اللہ تطمئن القلوب" کی تفسیر کے ضمن میں نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

بمحمد تطمئن القلوب و ھو ذکر اللہ و حجابہ

محمد کے ذریعے دلوں کو سکون ہوتا ہے، وہ ہی خدا کا ذکر اور اس کا حجاب۔

---

[1] و [2] و [3] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۴۹۳۔

۳۰۔ كَذَٰلِكَ أَرْسَلْنَاكَ فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا أُمَمٌ لِتَتْلُوَ عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَٰنِ ۚ قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ ○

۳۱۔ وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ ۗ بَلْ لِلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا ۗ أَفَلَمْ يَيْأَسِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا ۗ وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُمْ بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِنْ دَارِهِمْ حَتَّىٰ يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ○

۳۲۔ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِنْ قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ ۖ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ○

ترجمہ

۳۰۔ جیسا کہ (ہم نے گزشتہ انبیاء کو بھیجا) تجھے بھی ایک امت کے درمیان بھیجا کہ جس سے پہلے دوسری امتیں آئیں اور چلی گئیں، تاکہ ہم نے جو کچھ تجھ پر وحی کی ہے ان کے سامنے پڑھو حالانکہ وہ رحمان (وہ خدا کہ جس کی رحمت سب پر محیط ہے) سے کفر کرتے ہیں۔ کہہ دو وہ میرا پروردگار ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں میں نے اس پر توکل کیا ہے اور میری بازگشت اس کی طرف ہے۔

۳۱۔ اگر قرآن کی وجہ سے پہاڑ چلنے لگ جائیں اور زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور اس کے ذریعے مُردوں کے ساتھ گفتگو کی جائے (وہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے)، لیکن یہ سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے۔ کیا وہ

لوگ جو ایمان لائے ہیں نہیں جانتے کہ اگر خدا چاہے تو تمام لوگوں کو (جبراً) ہدایت کر دے (لیکن جبری ہدایت کا کوئی فائدہ نہیں) اور کافروں پر ان کے اعمال کی وجہ سے مسلسل سرکوبی کرنے والی مصیبتیں ٹوٹتی رہیں گی یا ان کے گھروں کے ارد گرد نازل ہوں گی یہاں تک کہ خدا کا آخری وعدہ پورا ہو، خدا اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

۳۲۔ (انہوں نے صرف تیرا مذاق نہیں اڑایا بلکہ) تجھ سے پہلے انبیاء سے بھی انہوں نے استہزاء کیا۔ میں نے کافروں کو مہلت دی اور پھر ان کی گرفت کی، تو نے دیکھا (میری) سزا کیسی تھی؟

شانِ نزول

مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آیت صلح حدیبیہ کے بارے میں ہجرت کے چھٹے سال نازل ہوئی۔ جب صلح نامہ لکھا جانے لگا تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا:

لکھو: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس پر سہیل بن عمرو اور دیگر مشرکین کہنے لگے: ہم رحمان کو نہیں پہچانتے، رحمٰن تو صرف ایک ہی ہے اور وہ یمامہ میں ہے (ان کی مراد مسیلمہ کذاب سے تھی کہ جو نبوت کا دعویدار تھا)، بلکہ لکھو: باسمک اللّٰھم

زمانہ جاہلیت میں اسی طرح لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے کہا:

لکھو: یہ صلح نامہ ہے جو محمد رسول اللہ ......

ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ مشرکین قریش کہنے لگے: اگر تم خدا کے رسول ہوتے اور ہم تم سے جنگ کرتے اور خانہ خدا کا راستہ تم پر بند کرتے تو ہم بڑے ظالم ہوتے (جھگڑا تو تمہاری اس رسالت کا ہی ہے) بلکہ لکھو "یہ صلح نامہ محمد بن عبد اللہ کا ہے"۔

اس وقت اصحاب پیغمبر بھڑک اٹھے۔ کہنے لگے: ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم ان سے جنگ کریں۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: نہیں، جس طرح یہ کہتے ہیں ویسے لکھو۔

اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور خدا کے نام "رحمٰن" کے سلسلے میں ان کی بہانہ جوئی، ہٹ دھرمی اور مخالفت پر ان کی شدید سرزنش کی گئی کیونکہ یہ تو خدا کی قطعی صفات میں سے ہے۔

یہ شانِ نزول اس صورت میں صحیح ہے جب ہم اس سورہ کو مدنی سمجھیں تاکہ یہ صلح حدیبیہ کے واقعے سے مطابقت اختیار کر سکے لیکن اگر جیسا کہ مشہور ہے اسے مکی سمجھیں تو پھر اس بحث کی نوبت نہیں آئے گی مگر یہ کہ اس آیہ کی شانِ نزول کو مشرکین کی اس گفتگو کا جواب سمجھا جائے جو سورہ فرقان میں آئی ہے۔ انہوں نے "رحمٰن" کو سجدہ کرنے کی دعوت پیغمبر کے جواب میں کہا ہے کہ ہم رحمٰن کو نہیں پہچانتے:

اسجدو الرحمٰن قالوا وما الرحمٰن

(جب ان سے کہا گیا کہ) رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہنے لگے رحمٰن کون ؟ (فرقان - ۶۰)

بہرحال مندرجہ بالا آیت شان نزول سے قطع نظر بھی ایک واضح مفہوم رکھتی ہے کہ جو اس کی تفسیر میں بیان کیا جائے گا۔ دوسری آیت کی شان نزول کے بارے میں بھی بعض عظیم مفسرین نے کہا ہے کہ یہ مشرکین مکہ کی ایک جماعت کے جواب میں نازل ہوئی ہے۔ یہ لوگ خانہ کعبہ کی پشت کی طرف بیٹھے تھے۔ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کی طرف کسی کو یہ پیغام دے کر بھیجا:

اگر تو چاہتا ہے کہ ہم تیری پیروی کریں تو مکہ کے ان پہاڑوں کو اپنے قرآن کے ذریعے پیچھے ہٹا دے تاکہ ہماری یہ تنگ زمین کسی حد تک وسیع ہو جائے۔ نیز زمین میں شگاف کر کے اس میں چشمے اور نہریں جاری کر دے تاکہ ہم درخت لگائیں اور زراعت کریں تو اپنے گمان میں داؤد سے کم نہیں ہے کہ جس کے لیے خدا نے پہاڑوں کو مسخر کر رکھا تھا کہ جو اس سے ہم آواز ہو کر خدا کی تسبیح کرتے تھے یا یہ کہ ہمارے لیے ہوا کو مسخر کر دے تاکہ ہم اس کے دوش پر سوار ہو کر شام کی طرف جائیں اور اپنی مشکلات حل کر کے اپنی ضروریات پوری کریں اور اسی دن واپس لوٹ آئیں جیسا کہ سلیمان کے لیے مسخر تھی اور تو اپنے گمان میں سلیمان سے کم نہیں ہے نیز اپنے دادا "قصی" (قبیلہ قریش کے جدِ اعلیٰ) یا ہمارے مردوں میں سے کسی اور شخص کو جسے چاہے زندہ کر دے تاکہ ہم اس سے سوال کریں کہ کیا جو کچھ تو کہتا ہے حق ہے یا باطل۔ کیونکہ عیسیٰ مردوں کو زندہ کرتا تھا اور تو عیسیٰ سے کم تر نہیں ہے۔

اس پر دوسری زیر بحث آیت نازل ہوئی اور ان سے کہا گیا کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے نہ کہ ایمان لانے کے لیے کیونکہ ایمان لانے کے لیے درکار کافی معجزات پیش کیے جا چکے ہیں۔

تفسیر

ہٹ دھرم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے

ان آیات میں ہم پھر نبوت کی بحث کی طرف پلٹتے ہیں۔ ان میں مشرکین کی گفتگو کا ایک اور حصہ پیش کیا گیا ہے نیز نبوت کے بارے میں ان کی گفتگو کا واضح جواب دیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جیسے ہم نے گزشتہ انبیاء کو گزشتہ قوموں کی ہدایت کے لیے بھیجا تھا تجھے بھی ایک امت کے درمیان بھیجا ہے کہ جس سے پہلے امتیں آئیں اور چلی گئیں (کذٰلک ارسلنٰک فی امۃ قد خلت من قبلھا امم)۔ مقصد یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے تجھ پر وحی کیا ہے وہ قرآن کے سامنے پڑھے (لتتلوا علیھم الذی اوحینا الیک)۔ حالانکہ وہ "رحمٰن" (وہ خدا کہ جس کی رحمت اور وسیع و عام فیض مومن و کافر اور یہود و نصاریٰ سب پر محیط ہے) کا انکار کرتے ہیں (وھم یکفرون بالرحمٰن)۔ کہہ دے کہ تم انکار کرتے ہو تو رحمٰن کہ جس کا فیض و رحمت عام ہے میرا پروردگار ہے (قل ھو ربی)۔ جب اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، میں اس پر توکل کرتا ہوں اور میری بازگشت اسی کی طرف ہے (لا الٰہ الا ھو علیہ توکلت و الیہ متاب)۔

اس کے بعد ان بہانہ تراش افراد کے جواب میں کہ جو ہر چیز پر اعتراض کرتے ہیں، فرماتا ہے: یہاں تک کہ اگر قرآن کے ذریعے پہاڑ چلنے لگ جائیں اور زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور اس کے ذریعے مردوں سے گفتگو بھی ہو پھر بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے (ولو ان قرانا سیرت به الجبال او قطعت به الارض او کلم به الموتی)۔

لیکن یہ تمام کام خدا کے اختیار میں ہے اور وہ جتنا ضروری سمجھتا ہے انجام دیتا ہے (بل الله الامر جمیعًا)۔

مگر تم لوگ حق کے طالب نہیں ہو، اگر ہوتے تو جس قدر اعجاز کی نشانیاں اس پیغمبر سے صادر ہوئی ہیں ایمان لانے کے لیے کافی ہیں، یہ تو سب بہانے ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے، کیا وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں نہیں جانتے کہ اگر خدا چاہے تو تمام لوگوں کو جبراً ہدایت کر دے (افلم یایئس الذین امنوا ان لو یشاء الله لهدی الناس جمیعًا)[۱]۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ داخلی یا خارجی طور پر جبری طریقے سے منکرین اور ہٹ دھرم افراد تک کو بھی ایمان لانے پر آمادہ کر سکتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور اس کی قدرت کے سامنے کوئی کام مشکل نہیں ہے لیکن وہ ہرگز ایسا نہیں کرے گا کیونکہ ایسا جبری ایمان بے وقعت ہے۔ ایسا ایمان اس معنویت اور کمال سے محروم ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے، اس کے باوجود کفار ہمیشہ اپنے اعمال کے سبب تباہ کن مصائب کے حملے سے دوچار ہیں یہ مصائب مختلف بلاؤں کی صورت میں نازل ہوتے ہیں اور کبھی ان پر مجاہدین اسلام کے تباہ کن حملوں کی صورت میں آتے ہیں (ولا یزال الذین کفروا تصیبهم بما صنعوا قارعة)۔

یہ مصائب اگر ان کے گھروں پر نازل نہ ہوں تو ان کے گھروں کے آس پاس نازل ہوں گے (او تحل قریبًا من دارهم) تاکہ وہ عبرت حاصل کریں، حرکت میں آئیں اور خدا کی طرف لوٹ آئیں۔

یہ تنبیہیں اسی طرح جاری رہیں گی یہاں تک کہ خدا کا آخری حکم آ پہنچے (حتی یاتی وعد الله)۔

یہ آخری حکم ہو سکتا ہے موت کی طرف یا روزِ قیامت کی طرف اشارہ ہو یا بقول بعض کے فتح مکہ کی طرف اشارہ ہو کہ جس نے دشمن کی ساری طاقت کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔

بہر حال خدا کا وعدہ حتمی ہے "اور خدا کبھی بھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا" (ان الله لا یخلف المیعاد)۔

زیر نظر آخری آیت پیغمبر اکرمؐ کی طرف روئے سخن کیے ہوئے کہتی ہے: صرف تمہی نہیں ہو کہ جسے اس کافر گروہ کے طرح طرح کے تقاضوں

---

[۱] "اَفَلَمْ یَایْئَسِ" "یأس" کے مادہ سے ناامیدی کے معنی میں ہے مگر بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں علم کے معنی میں ہے لیکن (فخر رازی کے مطابق) "کچھ لوگوں" کے بقول کہیں نہیں دیکھا گیا کہ "یئست" "علمت" کے معنی میں ہو۔ مفردات میں راغب کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ "یأس" یہاں اپنے اسی مشہور معنی میں ہے لیکن ہر مایوسی کے لیے ضروری ہے کہ اس کام کے نہ ہو سکنے کا علم ہو۔ اس بنا پر یہاں کے یأس کے ہونے کا لازمہ ان کا علم ہے لیکن راغب کی اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ یہاں یأس وجود کے علم کے معنی میں نہیں ہے بلکہ عدم کے علم کے معنی میں ہے اور یہ مفہوم آیت کے مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتا اس بنا پر حق وہی ہے جو مشہور مفسرین نے کہا ہے اور اس کے لیے اقوال عرب سے کئی شواہد پیش کیے گئے ہیں اور ان کے نمونے فخر رازی نے اپنی تفسیر میں پیش کیے ہیں (غور کیجئے گا)۔

اور من پسند معجزوں کی فرمائش کے ذریعے تمسخر اور استہزاء کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ یہ تو پوری تاریخ انبیاء میں ہوتا رہا ہے "اور تجھ سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا تمسخر اڑایا گیا ہے" (ولقد استھزئ برسل من قبلك)۔

لیکن ہم نے ان کافروں کو فوراً عذاب نہیں کیا بلکہ "ہم نے انہیں مہلت دی" (فامليت للذين كفروا) ماس لیے کہ شاید بیدار ہو جائیں اور شاید براہِ حق کی طرف پلٹ آئیں یا کم از کم ان پر کافی اتمامِ حجت ہو جائے کیونکہ اگر وہ بدکار اور گنہگار ہیں تو خدا کی مہربانی اس کا لطف و کرم اور حکمت بھی تو موجود ہے۔

بہر حال یہ مہلت و تاخیر اس معنی میں نہیں کہ ان کی سزا اور کیفرِ کردار کو فراموش کر دیا جائے لہٰذا اس مہلت کے بعد ہم نے انہیں گرفت کی اور تو نے دیکھا کہ ہم نے انہیں کس طرح سزا دی" یہ انجام تیری ہٹ دھرم قوم کے بھی انتظار میں ہے (ثم اخذ تھم فكيف كان عقاب)۔

چند اہم نکات

۱۔ لفظ "رحمٰن" کیوں استعمال کیا گیا ہے؟ مندرجہ بالا آیات اور ان کے بارے میں مذکور شانِ نزول نشاندہی کرتی ہیں کہ قریش کو لفظ "رحمٰن" سے خدا کی توصیف و تعریف پسند نہیں تھی کیونکہ ایسی کوئی چیز ان کے درمیان رائج نہ تھی لہٰذا وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے حالانکہ مندرجہ بالا آیات میں اسی کی تاکید کی گئی ہے کیونکہ اس لفظ میں ایک خاص لطف پوشیدہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ خدا کی صفتِ رحمانیت اس کے لطفِ عام کی طرف اشارہ ہے کہ جو دوست اور دشمن سب پر پھیلا ہے اور مومن اور کافر سب کے شاملِ حال ہے جب کہ اس کے مقابلے میں صفتِ رحیمیت خدا کی صفتِ خاص ہے اور صالح اور مومن بندوں کے بارے میں ہے۔

یعنی — تم کس طرح اس خدا پر ایمان نہیں لاتے ہو کہ جو منبع لطف و کرم ہے یہاں تک کہ اپنے دشمنوں کو بھی اپنے لطف و رحمت سے نوازتا ہے۔ یہ تمہاری انتہائی نادانی ہے۔

۲۔ **پیغمبر اکرمؐ نے معجزات کا تقاضا کیوں پورا نہ کیا** یہاں ہمیں پھر ان لوگوں کی گفتگو کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کہ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوائے قرآن کے اور کوئی معجزہ نہیں رکھتے تھے۔ یہ لوگ زیرِ نظر آیات اور اس قسم کی دیگر آیات سے مدد لیتے ہیں کیونکہ ان آیات کا ظہور یہ بتاتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے مختلف معجزات کی فرمائش کو ٹھکرا دیا۔ وہ لوگ پہاڑوں کو ان کی جگہ سے پیچھے ہٹانے کا، وہاں کی زمین میں شگاف کر کے چشمے اور نہریں جاری کرنے کا اور مُردوں کے زندہ ہو کر گفتگو کرنے کا تقاضا کر رہے تھے لیکن آپؐ نے ان کی درخواست رد کر دی۔

لیکن — ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ معجزہ ان لوگوں کو کہ جو حقیقت طلب ہیں صرف حقیقت کا چہرہ دکھانے کے لیے ہے نہ یہ کہ پیغمبر ایک معجزہ گر بن جائے اور جو شخص جس عمل کی بھی فرمائش کرے وہ اسے انجام دیتا جائے چاہے وہ اسے قبول کرنے کے لیے بھی تیار نہ ہو۔

من پسند کے معجزات کی ایسی فرمائش صرف ایسے ہٹ دھرم اور کوتاہ فکر افراد کی طرف سے کی جاتی ہے کہ جو کسی حق کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور اتفاق کی بات ہے کہ اس امر کی نشانیاں مندرجہ بالا آیات میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ آخری زیرِ بحث آیت میں ہم نے دیکھا ہے کہ گفتگو ان کی طرف سے پیغمبر کا مذاق اڑانے کے سلسلے میں آئی ہے یعنی وہ لوگ حق کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے

بلکہ ایسی فرمائشوں سے ان کا مقصود پیغمبر اکرمؐ کا تمسخر اڑانا تھا۔

علاوہ ازیں ان آیات کے بارے میں جو شان ہائے نزول ہم نے پڑھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے تقاضا کیا تھا کہ وہ گزشتہ بزرگوں میں سے کسی ایک کو زندہ کردیں تاکہ وہ ان سے پوچھیں کہ کیا آپ حق پر ہیں یا باطل پر حالانکہ اگر پیغمبر اس قسم کا معجزہ (مردوں کو زندہ کرنا) پیش کردیں تو پھر اس بات کے پوچھنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ پیغمبر حق پر ہیں یا باطل پر۔ یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ وہ متعصب، ہٹ دھرم اور معاند افراد تھے اور ان کا مقصد حق کی جستجو نہ تھا۔ وہ ہمیشہ عجیب و غریب فرمائشیں کرتے رہتے تھے اور آخرکار وہ ایمان بھی نہیں لاتے تھے۔

سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۹۰ کے ذیل میں ہم انشاء اللہ دوبارہ اس مسئلے کی وضاحت کریں گے۔

۳۔ "قارعۃ" کیا ہے؟ "قارعۃ" "قرع" کے مادہ سے ہے جو کہ کھٹکھٹانے کے معنی میں ہے۔ اس بناء پر "قارعۃ" کا معنی ہے کھٹکھٹانے والی۔ یہاں ایسے امور کی طرف اشارہ ہے جو انسان کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور اسے تنبیہ کرتے ہیں اور اگر بیدار ہونے کے لیے آمادہ ہو تو اسے بیدار کرتے ہیں۔

درحقیقت "قارعۃ" کا ایک وسیع معنی ہے کہ جس میں ہر قسم کی انفرادی یا اجتماعی مصیبتوں، مشکلات اور دردناک حوادث کا مفہوم شامل ہے۔ اسی لیے بعض مفسرین اسے جنگوں، خشک سالیوں، قتل ہونے اور قید ہونے کے معنی میں سمجھتے ہیں جب کہ بعض دوسرے اسے صرف ان جنگوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو صدر اسلام میں "سریہ" کے عنوان سے ہوئیں۔ "سریہ" ان جنگوں کو کہا جاتا ہے جن میں پیغمبر اسلامؐ خود شریک نہیں ہوئے بلکہ ان میں آپؐ نے اپنے اصحاب و انصار کو مامور فرمایا لیکن مسلم ہے کہ "قارعۃ" ان امور میں سے کسی ایک کے لیے مختص نہیں اور اس کے مفہوم میں یہ تمام امور شامل ہیں۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ زیر بحث آیات میں ہے کہ یہ تباہ کن حوادث خود انہیں پہنچتے تھے یا ان کے گھر کے آس پاس رونما ہوتے تھے یعنی اگر وہ خود ان بیدار کرنے والے اور تنبیہ کرنے والے حوادث میں مبتلا نہ ہوں تو بھی یہ ان کے اڑوس پڑوس یا ان کے نزدیک رونما ہوتے ہیں۔ تو کیا یہ ان کی بیداری کے لیے کافی نہیں۔

۳۳۔ اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ؕ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ○

۳۴۔ لَهُمْ عَذَابٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ○

ترجمہ

۳۳۔ کیا وہ کہ جو سب کے سروں پر موجود ہے (اور سب کا نگران اور نگہبان ہے) اور سب کے اعمال دیکھتا ہے (اس کی مانند ہے کہ جو ان میں سے کوئی صفت نہیں رکھتا)۔ انہوں نے خدا کے لیے شریک قرار دیئے ہیں۔ کہہ دو: ان کے نام لو، کیا اسے ایسی چیز کی خبر دیتے ہو کہ روئے زمین میں جس کے وجود سے وہ بے خبر ہے یا ظاہری اور کھوکھلی باتیں کرتے ہو (نہیں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے)، بلکہ کافروں کے سامنے ان کے جھوٹ مزین کیے گئے ہیں (اور اندرونی ناپاکی کی بناء پر ان کا خیال ہے کہ یہ حقیقت پر مبنی ہیں) اور وہ (خدا کی) راہ سے روک دیئے گئے ہیں اور جسے خدا گمراہ کر دے اس کے لیے کوئی راہنما نہیں ہوگا۔

۳۴۔ ان کے لیے دنیا میں (دردناک) عذاب ہے اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت ہے اور خدا کے مقابلے میں کوئی ان کا دفاع نہیں کر سکتا۔

تفسیر

کس طرح خدا کو بتوں کا شریک بناتے ہو؟

ان آیات میں قرآن پھر توحید اور شرک کی بحث کی جانب لوٹتا ہے اور لوگوں کو اس واضح دلیل سے خطاب کرتا ہے، کیا وہ کہ جو

تمام عالم ہستی میں ہر چیز کا محافظ ہے اور جس نے سب کو اپنی تدبیر کے زیر پردہ قرار دیا ہے اور تمام لوگوں کے اعمال سے باخبر ہے اس کی طرح ہے کہ جس میں ان صفات میں سے کوئی بھی نہیں (افمن ھو قائم علی کل نفس بما کسبت)۔[1]

درحقیقت مندرجہ بالا جملہ وضاحت سے کہتا ہے کہ خدا نے تمام چیزوں کا اس طرح سے احاطہ کر رکھا ہے کہ گویا وہ سب کے سروں پر کھڑا ہے، جو کچھ انجام دیتا ہے وہ اسے دیکھتا ہے، جانتا ہے، اس کا حساب و کتاب رکھتا ہے، اس کی جزا و سزا دیتا ہے اور تصرف و تدبیر کرتا ہے۔ اس بناء پر لفظ "قائم" ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جس میں یہ تمام امور شامل ہیں اگرچہ بعض مفسرین نے ان میں ایک پہلو لے لیا ہے۔

اس کے بعد گزشتہ بحث کی تکمیل اور آئندہ بحث کی تمہید کے طور پر فرمایا گیا ہے: انہوں نے خدا کے شریک قرار دیئے ہیں (وجعلوا للہ شرکاء)۔

فوراً ہی انہیں چند طریقوں سے جواب دیا گیا ہے:

پہلا یہ کہ — فرمایا: ان شریکوں کے نام لو (قل سموھم)۔

نام لینے سے یا تو یہ مراد ہے کہ ان کی وقعت اور قدر و قیمت اتنی بھی نہیں کہ ان کا نام و نشان بھی ہو یعنی تم چند بے نام و نشان اور بے وقعت موجودات کو قادر و متعال پروردگار کے کس طرح ہم پلہ قرار دیتے ہو؟

یا مراد یہ ہے کہ ان کی صفات بیان کرو تاکہ ہم دیکھیں کہ کیا وہ عبودیت کے لائق ہیں۔ مثلاً اللہ کے بارے میں ہم کہتے ہیں وہ خالق، رازق، زندگی بخشنے والا، عالم، قادر اور بزرگ و برتر ہے تو کیا تم یہ صفات بتوں کے لیے استعمال کر سکتے ہو یا اس کے برعکس اگر ان کا ذکر کرنا چاہیں تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ پتھر، لکڑی کے بے حس و حرکت بت کہ جو عقل و شعور سے عاری ہیں اور اپنے عبادت کرنے والوں کے محتاج ہیں، مختصر یہ کہ ہر چیز سے عاری بت — تو پھر ان دونوں کو کس طرح ایک جیسا قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ بات شرم انگیز نہیں ہے؟

یا یہ مراد ہے کہ ان کے کام شمار کرو۔ کیا اب تک انہوں نے کسی کو کوئی نقصان پہنچایا ہے یا کسی کو کوئی فائدہ پہنچایا ہے، کسی کی مشکل حل کی ہے یا کسی کام میں مدد کی ہے؟ تو ان حالات میں کونسی عقل اجازت دیتی ہے کہ انہیں خدا کا ہم پلہ قرار دیا جائے کہ جو تمام برکات و نعمات، سود و زیاں اور جزا و سزا کا مالک ہے۔

البتہ کوئی مانع نہیں کہ یہ تمام معانی "سموھم" (ان کے نام لو) کے جملے میں جمع ہوں۔

دوسرا یہ کہ اس قسم کا کوئی شریک کیسے ہو سکتا ہے جب کہ وہ خدا جو تمہارے خیال میں ان کا شریک ہے ان کے وجود کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں رکھتا جب کہ اس کا علم تمام جہان پر محیط ہے۔ کیا اسے اس چیز کی خبر دیتے ہو جس کے وجود کو وہ زمین میں نہیں جانتا (ام تنبئونہ بما لا یعلم فی الارض)۔

---

[1] درحقیقت مندرجہ بالا جملہ مبتدا پر مشتمل ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، تقدیر میں اس طرح تھا:

افمن ھو قائم علی کل نفس بما کسبت کمن لیس کذٰلک

یعنی — کیا وہ کہ جو اس صفت کا حامل ہے اس جیسا ہے کہ جو اس سے عاری ہے۔

یہ تعبیر در حقیقت مد مقابل کی بے ہودہ اور فضول گفتگو کو ختم کرنے کے لیے بہترین راستہ ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے کوئی شخص آپ سے کہتا ہے کہ کل رات فلاں شخص تمہارے گھر میں مہمان تھا اور آپ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ تم مجھے ایسے مہمان کی خبر دیتے ہو جس کی مجھے اطلاع نہیں ہے یعنی کیا یہ ممکن ہے کوئی شخص میرا مہمان ہو اور میں اس سے بے خبر ہوں اور تم اس سے آگاہ ہو۔

تیسرا یہ کہ در اصل خود تم بھی دل میں ایسی چیز کا ایمان نہیں رکھتے "صرف ایک کھوکھلی ظاہری بات کا سہارا لیے ہوئے ہو کہ جس میں کوئی حقیقی مفہوم موجود نہیں ہے" (ام بظاھر من القول)۔

اسی بناء پر یہ مشرکین جب زندگی کی کسی سخت گھاٹی میں جب ہر طرف سے بند ہو کر پھنس جاتے ہیں تو "اللہ" کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ وہ دلی طور پر جانتے ہیں کہ بتوں سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ خدا ان کی حالت سورہ عنکبوت کی آیہ ۶۵ میں بیان فرماتا ہے جب کہ وہ کسی کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور سخت طوفان میں گھر جاتے ہیں تو صرف خدا کا رُخ کرتے ہیں۔

چوتھا یہ کہ یہ مشرکین صحیح شعور نہیں رکھتے اور چونکہ ہوا و ہوس اور اندھی تقلید میں گرفتار ہیں لہٰذا عقلمندانہ اور صحیح فیصلہ نہیں کر پاتے۔ اسی بناء پر اس گمراہی میں آن پڑے ہیں "پیغمبر اور مومنین کے خلاف ان کی سازشوں کو اور ان کے جھوٹ، تہمتوں اور بہتانوں کو (ان کی اندرونی ناپاکی کی بناء پر) مزین کر دیا گیا ہے" یہاں تک کہ انہوں نے ان بے وقعت اور بے نام و نشان موجودات کو خدا کا شریک جان لیا ہے (بل زين للذين كفروا مكرهم وصدوا عن السبيل) اور جس شخص کو خدا گمراہ قرار دے اس کی ہدایت کسی کے بس میں نہیں ہے (ومن يضلل الله فماله من هاد)۔

ہم نے بار ہا کہا ہے کہ یہ گمراہی جبری معنی میں نہیں ہے اور نہ یہ بغیر کسی شرط اور بنیاد کے من پسند کا مسئلہ ہے بلکہ خدا کی طرف سے گمراہی خود انسان کے غلط کاموں کے عکس العمل کے معنی میں ہے یہ اس کے اپنے اعمال کا رد عمل ہے کہ جو اسے گمراہیوں کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ چونکہ ایسے اعمال میں خدا نے یہ خاصیت پیدا کی ہے لہٰذا اس کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے۔

زیر بحث آخری آیت میں دنیا و آخرت میں ان کی دردناک سزاؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان میں فطرتاً شکست و ناکامی، سیاہ روزی اور ذلت و رسوائی شامل ہیں۔ فرمایا گیا ہے "ان کے لیے دنیاوی زندگی میں بھی سزا ہے اور آخرت کی سزا زیادہ سخت اور شدید تر ہے (لهم عذاب في الحيوة الدنيا ولعذاب الآخرة اشق)۔ کیونکہ وہ سزا دائمی بھی ہے، جسمانی و روحانی بھی اور اس میں طرح طرح کا عذاب شامل ہے اور اگر وہ یہ گمان کریں کہ اس سے بچ نکلنے کے لیے ان کے پاس کوئی راستہ یا وسیلہ ہے تو وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ "خدا کے مقابلے میں انہیں کوئی چیز نہیں بچا سکتی" (وما لهم من الله من واق)۔

۳۵۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۖ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ أُكُلُهَا دَائِمٌ وَظِلُّهَا ۚ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوا ۖ وَّعُقْبَى الْكَافِرِينَ النَّارُ ○

ترجمہ

۳۵۔ وہ جنت کہ جس کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ اس کے پھل دائمی ہیں اور اس کے سائے ہمیشہ کے لیے ہیں۔ یہ انجام ان لوگوں کیلیے ہے جنہوں نے پرہیزگاری اختیار کی ہے اور کافروں کا انجام آگ ہے۔

تفسیر

اس سورہ کی آیات میں توحید، قیامت اور دیگر اسلامی معارف کا بار بار ذکر آیا ہے۔ اس آیت میں معاد کے بارے میں خصوصاً جنت کی نعمتوں اور دوزخ کے عذاب کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جنت کے وہ باغ کہ جن کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے ایسے ہیں کہ جن کے درختوں کے نیچے پانی کی نہریں رواں دواں ہیں (مثل الجنة التی وعد المتقون تجری من تحتها الانهار[1])۔

"مثل" کی تعبیر شاید اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ آخرت کے گھر کے باغات اور دیگر نعمتوں کی اس محدود جہان میں رہنے والوں کے لیے کسی بیان سے تعریف نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ جہان بعد از موت کے جہان کے مقابلے میں نہایت چھوٹا ہے۔ اس جہان کے لوگوں کے لیے وہاں کی چیزوں کو صرف "مثل" اور اشاراتی گفتگو میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ جیسے ایک بچہ جو عالم جنین میں ہے اگر عقل و شعور رکھتا ہو تو اس کے سامنے اس دنیا کی نعمتوں کی وضاحت ہرگز نہیں ہو سکتی۔ صرف ناقص اور کم رنگ مثالیں پیش

---

[1] اس جملے کی ترکیب کے سلسلے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔ بعض "مثل" کو مبتدا اور "تجری" کو اس کی خبر سمجھتے ہیں۔ بعض "مثل" کو مبتدا اور اس کی خبر کو محذوف خیال کرتے ہیں اور اس کی تقدیر یوں ہے:

فیما نقص علیکم مثل الجنة

وہ چیزیں کہ جو ہم تم سے بیان کرتے ہیں ان میں سے جنت کی مثال ہے۔

کی جا سکتی ہے۔

باغاتِ بہشت کی دوسری صفت یہ ہے کہ اس کے پھل دائمی ہیں (اکلھا دائم)۔ نہ کہ اس جہان کے پھلوں کی طرح کہ جو موسمی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کسی خاص موسم میں پیدا ہوتا ہے بلکہ کسی آفت کی وجہ سے ممکن ہے کسی سال بالکل نہ ہو لیکن جنت کے پھلوں کو نہ کوئی آفت درپیش ہے اور نہ وہ کسی موسم کے محتاج ہیں بلکہ سچے مومنین کے ایمان کی طرح قائم و دائم ہیں۔ اسی طرح ان درختوں کا سایہ بھی دائمی ہے (وظلھا)۔ ان کے سائے دنیا کے درختوں کے سائے کی طرح نہیں ہیں کہ ہو سکتا ہے دن کے وقت جب کہ وقت صبح سورج ایک طرف سے چمکتا ہے ان کے سائے سطح باغ میں گہرے ہوں لیکن جب آفتاب عمودی شکل میں چمکتا ہے تو وہ کم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح فصلِ بہار میں گرمیوں میں جب کہ درخت پتوں سے بھرے ہوتے ہیں ان کا سایہ ہوتا ہے مگر فصل خزاں میں اور سردیوں میں جب درخت برہنہ ہو جاتے ہیں ان کا سایہ بھی جاتا رہتا ہے۔ (البتہ دنیا میں کہیں کہیں سدا بہار درختوں کے نمونے بھی موجود ہیں کہ جو ہمیشہ پھل پھول دیتے رہتے ہیں۔ یہ درخت ایسے علاقوں میں ہوتے ہیں جہاں خزاں کی خشکی اور فصلِ سرما نہیں ہوتی)۔

خلاصہ یہ کہ جنت کے سائے اس کی تمام نعمتوں کی طرح جاودانی ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ باغاتِ بہشت کے لیے خزاں نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں نورِ آفتاب یا اس جیسی کوئی چیز ہے ورنہ جہاں شعاعِ نور نہ ہو وہاں سائے کا کوئی مفہوم نہیں ہے یہ جو سورہ دہر کی آیہ ۱۳ میں ہے:

لا یرون فیھا شمسا ولا زمھریرا

وہاں شدت کی دھوپ دیکھیں گے اور نہ زیادہ سردی۔

ہو سکتا ہے یہ موسم کے اعتدال کی طرف اشارہ ہو کیونکہ سوزش آفتاب اور اسی طرح سخت سردی جنت میں نہیں ہے نہ یہ کہ وہاں سورج بالکل نہیں چمکتا۔

کرۂ آفتاب کا خاموش ہو جانا بھی اس کے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانے کی دلیل نہیں ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے:

قیامت میں زمین و آسمان دوسرے (نئے اور وسیع تر) زمین و آسمان میں تبدیل ہو جائیں گے۔

لہٰذا اگر کہا جائے کہ جہاں سورج کی تمازت اور تپش نہیں وہاں پھر سایہ کس لیے ہے؟ تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ سائے کا لطف صرف تمازتِ آفتاب سے بچنے میں نہیں ہے بلکہ پتوں سے طبعی اور اوپر جانے والی رطوبت کہ جو نشاط بخش آکسیجن سے ملی ہوتی ہے سائے کو ایک خاص قسم کی لطافت اور تازگی بھی دیتی ہے۔ اسی لیے درخت کا سایہ کمرے کی چھت کے سائے کی طرح ہرگز خشک اور بے روح نہیں ہوتا۔

جنت کی یہ تین صفات بیان کرنے کے بعد، آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ ہے پرہیزگاروں کا انجام، لیکن کافروں کا انجام آگ ہے (تلک عقبی الذین اتقوا وعقبی الکافرین النار)۔

جنت کی نعمتوں کا ذکر اس خوبصورت اور زیبا تعبیر کے ذریعے لطافت اور تفصیل کے ساتھ ہوا ہے لیکن دوزخیوں کے بارے میں ایک مختصر سا خشک اور سخت جملہ ہے کہ ان کا انجام کار جہنم ہے۔

اٹھاتے تھے۔

آیت کے آخر میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کی اور اس کی مخالفت اور ہٹ دھرمی کی پرواہ نہ کرو بلکہ اپنے حقیقی خط اور صراطِ مستقیم پر قائم رہو اور کہو : میں مامور ہوں کہ صرف اللہ کی پرستش کروں کہ جو یکتا و یگانہ خدا ہے اور اس کے لیے کسی شریک کا قائل نہ ہوں میں صرف اس کی طرف دعوت دیتا ہوں اور میری اور سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے" (قل انما امرت ان اعبد اللّٰہ ولا اشرك به الیه ادعوا و الیه مآب)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ سچے موحد اور حقیقی خدا پرست کا خدا کے فرامین کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ کوئی راستہ اور پروگرام نہیں ہے وہ ان تمام امور کے لیے فرماں بردار ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں کچھ ماننے اور کچھ نہ ماننے کا قائل نہیں ہوتا۔ ایسا نہیں کہ جس چیز کے بارے میں اس کی رغبت ہو اسے قبول کر لے اور جس کے بارے میں میلان نہ ہو اس کی مخالفت کرے اور انکار کر دے۔

ایک اہم نکتہ

ایمان اور جماعتی وابستگیاں : زیر نظر آیت میں ہم نے دیکھا ہے کہ خدا کس طرح یہود و نصاریٰ میں سے سچے مومنین کو "اہلِ کتاب" سے تعبیر کرتا ہے اور جو لوگ اپنے تعصبات اور ہوا و ہوس کے تابع تھے انہیں "احزاب" قرار دے رہا ہے۔ یہ امر صدر اسلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم عصر یہود و نصاریٰ میں منحصر نہیں بلکہ حقیقی مومنین اور ایمان کے دعویداروں میں ہمیشہ یہی فرق رہا ہے کہ سچے مومنین فرامین حق کے سامنے تسلیم محض ہوتے ہیں اور ان میں تفریق و تبعیض کے قائل نہیں ہوتے یعنی اپنی خواہش و رغبت کو ان کے تحت رکھتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے اہل کتاب اور اہلِ ایمان کا لقب سجتا ہے۔

لیکن وہ گروہ "نؤمن ببعض ونکفر ببعض" کا مصداق ہیں یعنی جو کچھ ان کی ذاتی سوچ، رغبت اور ہوا و ہوس سے ہم آہنگ ہے اسے قبول کر لیتے اور جو کچھ ایسا نہیں اس کا انکار کر دیتے ہیں یا جو کچھ ان کے فائدے میں ہے اسے مان لیتے ہیں اور جو ان کے ذاتی مفادات کے خلاف ہے اس کا انکار کر دیتے ہیں وہ نہ حقیقی مسلمان ہیں اور نہ سچے مومن بلکہ وہ تو جماعتی وابستگیاں رکھتے اور اپنے مقاصد دین میں تلاش کرتے ہیں اسی لیے تعلیماتِ اسلام اور احکام دین میں ہمیشہ تبعیض کے قائل ہوتے ہیں۔

کی جا سکتی ہے۔

باغاتِ بہشت کی دوسری صفت یہ ہے کہ اس کے پھل دائمی ہیں (اکلها دائم)۔ نہ کہ اس جہان کے پھلوں کی طرح کہ جو موسمی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کسی خاص موسم میں پیدا ہوتا ہے بلکہ کسی آفت کی وجہ سے ممکن ہے کسی سال بالکل نہ ہو لیکن جنت کے پھلوں کو نہ کوئی آفت درپیش ہے اور نہ وہ کسی موسم کے محتاج ہیں بلکہ سچے مومنین کے ایمان کی طرح قائم و دائم ہیں۔ اسی طرح ان درختوں کا سایہ بھی دائمی ہے (و ظلها)۔ ان کے سائے دنیا کے درختوں کے سائے کی طرح نہیں ہیں کہ جو ہنگام دن کے وقت جب کہ وقت صبح سورج ایک طرف سے چمکتا ہے ان کے سائے سطح باغ میں گھیرے ہوں لیکن جب آفتاب عمودی شکل میں چمکتا ہے تو وہ کم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح فصلِ بہار میں گرمیوں میں جب کہ درخت پتوں سے بھرے ہوتے ہیں ان کا سایہ ہوتا ہے مگر فصلِ خزاں میں اور سردیوں میں جب درخت برہنہ ہو جاتے ہیں ان کا سایہ بھی جاتا رہتا ہے۔ (البتہ دنیا میں کہیں کہیں سدا بہار درختوں کے نمونے بھی موجود ہیں کہ جو ہمیشہ پھل پھول دیتے رہتے ہیں۔ یہ درخت ایسے علاقوں میں ہوتے ہیں جہاں خزاں کی خشکی اور فصلِ سرما نہیں ہوتی)۔

خلاصہ یہ کہ جنت کے سائے اس کی تمام نعمتوں کی طرح جاودانی ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ باغاتِ بہشت کے لیے خزاں نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں نور آفتاب یا اس جیسی کوئی چیز ہے ورنہ جہاں شعاع نور نہ ہو وہاں سائے کا کوئی مفہوم نہیں ہے یہ جو سورہ دہر کی آیہ ۱۳ میں ہے:

لا یرون فیها شمسا ولا زمهریرا

وہاں شدت کی دھوپ دیکھیں گے اور نہ زیادہ سردی۔

ہو سکتا ہے یہ موسم کے اعتدال کی طرف اشارہ ہو کیونکہ سوزش آفتاب اور اسی طرح سخت سردی جنت میں نہیں ہے نہ یہ کہ وہاں سورج بالکل نہیں چمکتا۔

کرۂ آفتاب کا خاموش ہو جانا بھی اس کے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانے کی دلیل نہیں ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے:

قیامت میں زمین و آسمان دوسرے (نئے اور وسیع تر) زمین و آسمان میں تبدیل ہو جائیں گے۔

لہٰذا اگر کہا جائے کہ جہاں سورج کی تمازت اور تپش نہیں وہاں پھر سایہ کس لیے ہے؟ تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ سائے کا لطف صرف تمازتِ آفتاب سے بچنے میں نہیں ہے بلکہ پتوں سے طبعی اور اوپر جانے والی رطوبت کہ جو نشاط بخش آکسیجن سے ملی ہوتی ہے سائے کو ایک خاص قسم کی لطافت اور تازگی بھی دیتی ہے۔ اسی لیے درخت کا سایہ کمرے کی چھت کے سائے کی طرح ہرگز خشک اور بے رَوح نہیں ہوتا۔

جنت کی یہ تین صفات بیان کرنے کے بعد، آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے، یہ ہے پرہیزگاروں کا انجام، لیکن کافروں کا انجام آگ ہے (تلک عقبی الذین اتقوا وعقبی الکافرین النار)۔

جنت کی نعمتوں کا ذکر اس خوبصورت اور زیبا تعبیر کے ذریعے لطافت اور تفصیل کے ساتھ ہوا ہے لیکن دوزخیوں کے بارے میں ایک مختصر سا خشک اور سخت جملہ ہے کہ ان کا انجام کار جہنم ہے۔

۳۶- وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ ۖ وَمِنَ الْأَحْزَابِ مَنْ يُنْكِرُ بَعْضَهُ ۚ قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهِ ۚ إِلَيْهِ أَدْعُو وَإِلَيْهِ مَآبِ ○

ترجمہ

۳۶- اور وہ کہ جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دی ہے وہ اس پر خوش ہیں کہ جو تجھ پر نازل ہوا ہے اور بعض احزاب (اور گروہ) اس کے ایک حصہ کا انکار کرتے ہیں۔ کہہ دو: میں مامور ہوں کہ اللہ کی عبادت کروں اور اس کے لیے شریک قرار نہ دوں۔ میں اس کی طرف دعوت دیتا ہوں اور (سب کی) بازگشت اسی کی طرف ہے۔

تفسیر

خدا پرست اور دیگر گروہ

اس آیت میں آیات قرآن کے نزول پر لوگوں کے مختلف ردعمل کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ حقیقت کے متلاشی اور حق جو افراد کس طرح جو کچھ پیغمبر پر نازل ہوتا تھا اس پر سر تسلیم خم کرتے تھے اور خوش ہوتے تھے جب کہ مخالف اور ہٹ دھرم افراد اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دے رکھی ہے وہ اس پر خوش ہوتے ہیں جو کچھ تجھ پر نازل ہوتا ہے (والذین اٰتیناھم الکتٰب یفرحون بما انزل الیک)۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "اٰتیناھم الکتاب" اور اس قسم کی تعبیر پورے قرآن میں عام طور پر یہود و نصاریٰ اور ان جیسے آسمانی مذاہب کے پیروکاروں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، تو اس میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ یہاں بھی انہی کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہود و نصاریٰ اور ان جیسے دوسرے جویانِ حق تجھ پر ان آیات کے نزول پر مسرور ہوتے ہیں کیونکہ ایک طرف تو وہ انہیں ان نشانیوں سے ہم آہنگ پاتے ہیں جو ان کے پاس ہیں اور دوسری طرف یہ ان کے لیے ان خرافات سے نیز یہود و نصاریٰ

اور دیگر مذاہب کے ان عالم نما جاہلوں کے شر سے آزادی اور نجات کا سبب ہیں جنہوں نے انہیں قید و بند میں جکڑ رکھا ہے اور فکری آزادی اور تکامل و ارتقائے انسانی سے محروم کر رکھا ہے۔

یہ جو بعض بزرگ مفسرین نے کہا ہے کہ "الذین اٰتیناھم الکتاب" سے مراد حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب انصار ہیں، بہت بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ مسلمانوں کے لیے ایسی تعبیر کا استعمال معمول نہیں ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات "بما انزل الیک" سے مطابقت نہیں رکھتی[1]

نیز جو کچھ کہا گیا ہے سورہ رعد کا مکی ہونا اس کے منافی نہیں کیونکہ یہودیوں کا اصلی مرکز اگرچہ مدینہ اور خیبر تھا اور عیسائیوں کا اصلی مرکز نجران وغیرہ تھا پھر بھی اس میں شک نہیں کہ وہ مکہ آتے جاتے تھے اور مکہ میں ان کے افکار و نظریات اور ثقافت کا تھوڑا بہت اثر تھا۔ اسی بناء پر مکہ کے لوگ ان نشانیوں کی بناء پر کہ جو یہودی خدا کے آخری پیغمبر کے بارے میں بیان کرتے تھے ان میں سے ایسے پیغمبر کے ظہور کے انتظار میں رہتے تھے۔ (اس سلسلے میں ورقہ بن نوفل اور اس قسم کے دیگر افراد کے واقعات مشہور ہیں)۔

قرآن مجید کی دیگر سورتوں میں بھی اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ اہل کتاب میں سے سچے مومنین پیغمبر اسلامؐ پر آیات قرآن کے نزول سے خوش تھے۔ سورہ قصص کی آیہ ۵۲ میں ہے:

الذین اٰتیناھم الکتٰب من قبلہ ھم بہ یؤمنون

جنہیں ہم نے اس سے پہلے آسمانی کتاب دی تھی وہ اس قرآن پر ایمان رکھتے تھے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے، لیکن احزاب میں سے ایک جماعت تجھ پر نازل ہونے والی بعض آیات کا انکار کرتی ہے (ومن الاحزاب من ینکر بعضہ)۔

اس گروہ سے مراد یہود و نصاریٰ کی وہی جماعت ہے کہ جس پر قومی و مذہبی تعصب اور ایسے دوسرے تعصبات کا غلبہ تھا اسی بناء پر قرآن انہیں "اہل کتاب" نہیں کہتا کیونکہ وہ اپنی آسمانی کتب کے سامنے بھی سر تسلیم خم نہیں کیے ہوئے۔ بلکہ حقیقت میں وہ "احزاب" اور مختلف گروہ تھے کہ جو صرف اپنے اپنے گروہ کے راستے پر چلتے تھے۔ یہ گروہ ہر اس چیز کا انکار کر دیتے تھے کہ جو ان کے اپنے میلان، طریقے اور پہلے سے کیے گئے فیصلوں سے ہم آہنگ نہ ہوتی۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ "احزاب" مشرکین کی طرف اشارہ ہو کیونکہ سورہ احزاب میں بھی ان کا اس لفظ کے ذریعے ذکر کیا گیا ہے۔ اصل میں ان کا کوئی دین و مذہب نہ تھا بلکہ وہ بکھرے ہوئے گروہ اور احزاب تھے کہ جو قرآن اور اسلام کی مخالفت میں متحد تھے۔

عظیم مفسر مرحوم طبرسی اور بعض دوسرے مفسرین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ مندرجہ بالا آیت صفتِ رحمٰن کے ساتھ خداوند عالم کی توصیف سے بت پرستوں کے انکار کی طرف اشارہ ہے جب کہ اہل کتاب خصوصاً یہودی اس توصیف سے آشنائی کی بناء پر قرآنی آیات میں لفظ "رحمٰن" کی موجودگی پر خوشی کا اظہار کرتے تھے اور مشرکین مکہ کہ جو اس صفت سے ناآشنا تھے اس کا مذاق

---

[1] کیونکہ اس بات کا لازمہ یہ ہے کہ "ما انزل الیک" "الکتاب" ہی ہو کیونکہ اس صورت میں دونوں قرآن کی طرف اشارہ ہیں حالانکہ تو مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ "الکتاب" سے مراد اور ہے اور "ما انزل الیک" سے مراد کچھ اور ہے۔

اترتے تھے۔

آیت کے آخر میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کی اور اس کی مخالفت اور ہٹ دھرمی کی پرواہ نہ کرو بلکہ اپنے حقیقی خط اور صراطِ مستقیم پر قائم رہو اور کہو: میں مامور ہوں کہ صرف اللہ کی پرستش کروں کہ جو یکتا و یگانہ خدا ہے اور اس کے لیے کسی شریک کا قائل نہ ہوں میں صرف اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور میری اور سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے" (قل انما امرت ان اعبد اللہ ولا اشرك به الیہ ادعوا و الیہ مآب)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ سچے موحد اور حقیقی خدا پرست کا خدا کے فرامین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے علاوہ کوئی راستہ اور پروگرام نہیں ہے وہ ان تمام امور کے لیے فرماں بردار ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں کچھ ماننے اور کچھ نہ ماننے کا قائل نہیں ہوتا۔ ایسا نہیں کہ جس چیز کے بارے میں اس کی رغبت ہو اسے قبول کر لے اور جس کے بارے میں میلان نہ ہو اس کی مخالفت کرے اور انکار کر دے۔

ایک اہم نکتہ

ایمان اور جماعتی وابستگیاں: زیر نظر آیت میں ہم نے دیکھا ہے کہ خدا کس طرح یہود و نصاریٰ میں سے سچے مومنین کو "اہلِ کتاب" سے تعبیر کرتا ہے اور جو لوگ اپنے تعصبات اور ہوا و ہوس کے تابع تھے انہیں "احزاب" قرار دے رہا ہے۔ یہ امر صدر اسلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم عصر یہود و نصاریٰ میں منحصر نہیں بلکہ حقیقی مومنین اور ایمان کے دعویداروں میں ہمیشہ یہی فرق رہا ہے کہ سچے مومنین فرامینِ حق کے سامنے تسلیم محض ہوتے ہیں اور ان میں تفریق و تبعیض کے قائل نہیں ہوتے یعنی اپنی خواہش و رغبت کو ان کے تحت رکھتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے اہل کتاب اور اہلِ ایمان کا لقب سجتا ہے۔

لیکن وہ کہ جو "نؤمن ببعض ونكفر ببعض" کا مصداق ہیں یعنی جو کچھ ان کی ذاتی سوچ، رغبت اور ہوا و ہوس سے ہم آہنگ ہے اسے قبول کر لیتے اور جو کچھ ایسا نہیں اس کا انکار کر دیتے ہیں یا جو کچھ ان کے فائدے میں ہے اسے مان لیتے ہیں اور جو ان کے ذاتی مفادات کے خلاف ہے اس کا انکار کر دیتے ہیں وہ نہ حقیقی مسلمان ہیں اور نہ سچے مومن بلکہ وہ تو جماعتی وابستگیاں رکھتے اور اپنے مقاصد دین میں تلاش کرتے ہیں اسی لیے تعلیماتِ اسلام اور احکامِ دین میں ہمیشہ تبعیض کے قائل ہوتے ہیں۔

۳۷۔ وَكَذٰلِكَ اَنۡزَلۡنٰهُ حُكۡمًا عَرَبِيًّا ؕ وَلَـئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ بَعۡدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا وَاقٍ ۝

۳۸۔ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلًا مِّنۡ قَبۡلِكَ وَجَعَلۡنَا لَهُمۡ اَزۡوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوۡلٍ اَنۡ يَّاۡتِىَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝

۳۹۔ يَمۡحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثۡبِتُ ۖۚ وَعِنۡدَهٗۤ اُمُّ الۡكِتٰبِ ۝

۴۰۔ وَاِنۡ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعۡضَ الَّذِىۡ نَعِدُهُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ وَعَلَيۡنَا الۡحِسَابُ ۝

ترجمہ

۳۷۔ جس طرح (کہ ہم نے گزشتہ انبیاء کو آسمانی کتاب دی ہے) تجھ پر بھی واضح اور صریح فرمان نازل کیا ہے اور تیرے پاس آگاہی آجانے کے بعد اگر تو ان کی خواہشات کی پیروی کرے تو خدا کے سامنے کوئی تیری حمایت کرنے والا اور بچانے والا نہیں ہوگا۔

۳۸۔ اور ہم نے تجھ سے پہلے رسول بھیجے ہیں اور ان کی بیویاں اور اولاد بھی تھی اور کوئی رسول حکم خدا کے بغیر (اپنی طرف سے) کوئی معجزہ نہیں لا سکتا تھا، ہر زمانہ ایک کتاب رکھتا ہے (اور ہر کام کے لیے وقت مقرر ہے)۔

۳۹۔ خدا جسے چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثبات عطا کرتا ہے اور ام الکتاب اس کے

ان کے اعتراض سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یا تو تاریخ انبیاء سے ناواقف تھے یا اپنے آپ کو نادانی اور جہالت میں رکھے ہوئے تھے ورنہ یہ اعتراض نہ کرتے۔

دوسرا یہ کہ انہیں توقع تھی کہ وہ جو معجزہ بھی تجویز کریں اور جو بھی ان کی خواہشات کا تقاضا ہو آپ اسے انجام دیں (چاہے وہ ایمان لائیں یا نہ لائیں) لیکن انہیں جاننا چاہیے کہ "کوئی رسول حکم خدا کے بغیر کوئی معجزہ پیش نہیں کر سکتا" (وما کان لرسول ان یاتی بآیة الا باذن الله)۔

تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا تھا کہ پیغمبر اسلام کیوں آئے ہیں اور انہوں نے تورات یا انجیل کے احکام کو کیوں تبدیل کر دیا ہے کیا یہ آسمانی کتب نہیں ہیں اور خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوئیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا اپنا حکم تبدیل کر دے؟ (یہ اعتراض خصوصاً اس امر سے پوری طرح ہم آہنگ ہے کہ یہودی نسخ احکام کے ناممکن ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے)۔

زیر نظر آیت اپنے آخری جملے میں انہیں جواب دیتی ہے: ہر زمانے کے لیے ایک حکم اور قانون مقرر ہوا ہے (تاکہ بشریت اپنے آخری بلوغ تک پہنچ جائے اور آخری حکم صادر ہو) (لکل اجل کتاب)۔

لہٰذا مقام تعجب نہیں کہ ایک دن وہ تورات نازل کرے، دوسرے دن انجیل نازل کرے اور پھر قرآن۔ کیونکہ انسانی احتیاجات کے لیے مختلف اور گوناگوں پروگراموں کی ضرورت ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "لکل اجل کتاب" ان لوگوں کا جواب ہو جو کہتے ہیں کہ اگر پیغمبر سچ کہتا ہے تو پھر کیوں خدائی عذاب اس کے مخالفین کا قلع قمع نہیں کرتا۔ قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ ہر چیز کا ایک وقت ہے اور کوئی چیز حساب کتاب کے بغیر نہیں ہے۔ سزا اور عذاب کا وقت بھی آ پہنچے گا[1]

جو کچھ گزشتہ آیت کے آخر میں کہا گیا ہے بعد والی آیت اس کے لیے تاکید و استدلال کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ یہ کہ حوادث اور حکم کے لیے ایک معین زمانہ ہے جیسا کہ کہا گیا ہے:

ان الامور مرهونة باوقاتها

اور اگر دیکھتے ہو کہ بعض آسمانی کتب دیگر کتب کی جگہ لیتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا جس چیز کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے جیسے وہ اپنے ارادے اور حکمت کے تقاضے سے کچھ امور کا اثبات کرتا ہے نیز کتاب اصل اور ام الکتاب اس کے پاس ہے (یمحوا الله ما یشاء و یثبت و عنده ام الکتاب)۔

آخر میں مزید تاکید کے طور پر ان عذابوں کا ذکر ہے کہ پیغمبر جن کا وعدہ کرتے تھے اور وہ ان کا انتظار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اعتراض کرتے تھے کہ تمہارے وعدے نے عمل شکل کیوں اختیار نہیں کی۔ ارشاد ہوتا ہے: اور بعض امور کہ جن کا ہم نے وعدہ کر رکھا ہے (یعنی تیری کامیابی، ان کی شکست، تیرے پیروکاروں کی دہائی اور ان کے پیروکاروں کی اسارت) ہم تجھے تیری زندگی میں دکھائیں یا ان وعدوں

---

[1] البتہ اس معنی کے مطابق، جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے، ضروری ہے کہ اس جملے میں تقدیم و تاخیر کا قائل ہونا چاہیے گا اور یہ کہنا چاہیے گا کہ تقدیر میں "لکل کتاب اجل" تھا (غور کیجئے گا)۔

۳۷۔ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ۟

۳۸۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۟

۳۹۔ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ۟

۴۰۔ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۟

ترجمہ

۳۷۔ جس طرح (کہ ہم نے گزشتہ انبیاء کو آسمانی کتاب دی ہے) تجھ پر بھی واضح اور صریح فرمان نازل کیا ہے اور تیرے پاس آگاہی آجانے کے بعد اگر تو ان کی خواہشات کی پیروی کرے تو خدا کے سامنے کوئی تیری حمایت کرنے والا اور بچانے والا نہیں ہوگا۔

۳۸۔ اور ہم نے تجھ سے پہلے رسول بھیجے ہیں اور ان کی بیویاں اور اولاد بھی تھی اور کوئی رسول حکم خدا کے بغیر (اپنی طرف سے) کوئی معجزہ نہیں لا سکتا تھا، ہر زمانہ ایک کتاب رکھتا ہے (اور ہر کام کے لیے وقت مقرر ہے)۔

۳۹۔ خدا جسے چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثبات عطا کرتا ہے اور ام الکتاب اس کے

پاس ہے۔

۴۰۔ اور وہ بعض سزائیں کہ جن کا ہم نے اُن سے وعدہ کیا ہے تجھے دکھائیں یا (ان سزاؤں کے آنے سے پہلے) ہم تجھے مار دیں تو ہر حالت میں تو فقط ابلاغ پر مامور ہے اور (ان کا) حساب ہمارے ذمہ ہے۔

تفسیر

قطعی اور قابلِ تغیر حوادث

ان آیات میں بھی نبوت سے مربوط مسائل کا سلسلہ جاری ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: جیسے ہم نے اہلِ کتاب اور گزشتہ انبیاء پر آسمانی کتاب نازل کی ویسے ہی یہ قرآن بھی تم پر نازل کیا ہے اس حالت میں کہ یہ واضح و آشکار احکام پر مشتمل ہے (وکذلک انزلناہ حکما عربیا)۔

جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے "عربی" فصیح اور واضح گفتگو کے معنی میں ہے:

الفصیح البین من الکلام

لہٰذا جس وقت کہا جاتا ہے "امرأۃ عروبۃ" تو اس کا مفہوم ہے: "وہ عورت جو اپنی عفت و پاکدامنی سے آگاہ ہو"

اس کے بعد راغب مزید کہتا ہے:

قولہ حکما عربیا قیل معناہ مفصحا یحق الحق و یبطل الباطل

یہ جو خدا نے فرمایا ہے "حکما عربیا" اس کا مفہوم ہے ایسی واضح اور آشکار گفتگو جو حق کو ثابت کرتی ہے اور باطل کا بطلان کرتی ہے۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ "عربی" یہاں "شریف" کے معنی میں ہے کیونکہ لغت میں یہ لفظ اس معنی میں بھی آیا ہے۔

اس طرح اس صفت سے قرآن کی توصیف سے مراد یہ ہے کہ اس کے احکام واضح و آشکار ہیں اور اس سے غلط فائدہ اٹھانے اور مختلف تعبیروں کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی لیے اس تعبیر کے بعد دیگر آیات میں استقامت، ٹیڑھا پن نہ ہونے اور یا علم آگہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورہ زمر کی آیت ۲۸ میں ہے:

قرآنا عربیا غیر ذی عوج

یہ آشکار قرآن ہے کہ جو ہر قسم کی کجی اور ٹیڑھے پن سے پاک ہے۔

سورہ حم السجدہ کی آیہ ۳ میں ہے:

كتاب فصلت اٰياته قرانًا عربيًا لقوم يعلمون

یہ وہ کتاب ہے کہ جس کی آیات تشریح شدہ ہیں اور یہ اُن کے لیے واضح و آشکار قرآن ہے کہ جو جاننا چاہیں۔

اس طرح اس آیت میں قبل اور بعد کا جملہ تاکید کرتا ہے کہ "عربیت" سے مراد بیان کا واضح، روشن اور پیچ و خم سے خالی ہونا چاہیے۔

یہ تعبیر قرآن کی سات سورتوں میں آئی ہے لیکن چند ایک مواقع پر "لسان عربی مبین" اور اس قسم کے دیگر الفاظ بھی آئے ہیں۔ ممکن ہے وہ بھی اسی معنی یعنی بیان کا روشن، واضح اور ابہام سے خالی ہونا، میں ہو۔

البتہ اس خاص موقع پر ہو سکتا ہے عربی زبان کی طرف اشارہ ہو کیونکہ خدا ہر نبی کو اس کی اپنی قوم کی زبان میں بھیجتا تھا تاکہ وہ سب سے پہلے اپنی قوم کو ہدایت کرے اس کے بعد اس انقلاب کا دامن دوسری جگہوں تک پھیلائے۔

اس کے بعد تہدید آمیز اور قاطع لہجے میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اب جب کہ حقیقت تجھ پر آشکار ہو جائے تو اس کے بعد اگر تو اُن کی خواہشات کی پیروی کرے تو تجھے خدائی نتائج کا سامنا کرنا ہوگا اور خدا کے سامنے کوئی تیری حمایت کرنے والا اور بچانے والا نہیں ہوگا۔ (ولئن اتبعت اهواءهم بعد ما جاءك من العلم ما لك من الله من ولي ولا واق)۔

پیغمبر اکرمؐ کے مقام عصمت، معرفت اور علم و آگہی کی وجہ سے اگرچہ ان کے لیے انحراف کا احتمال یقیناً نہیں ہے لیکن یہ انداز اولاً تو واضح کرتے ہیں کہ خدا کسی شخص کے ساتھ خصوصی ارتباط نہیں رکھتا بالفاظ دیگر اس کی کسی سے کوئی رشتہ داری نہیں ہے یہاں تک کہ اگر پیغمبر کا مقام بلند و بالا ہے تو ان کی تسلیم و عبودیت اور ایمان و استقامت کی بناء پر ہے۔

ثانیاً یہ بات دوسروں کے لیے تاکید ہے کہ جہاں پیغمبر جیسی ہستی راہ حق سے انحراف اور باطل راستے کی طرف میلان کی صورت میں خدائی سزا سے بچ نہیں سکتی تو پھر دوسروں کی حیثیت واضح ہے۔

یہ بعینہٖ اس طرح ہے کہ کوئی شخص اپنے اچھے اور نیک بیٹے کو مخاطب کرکے کہے، اگر تو اپنا ہاتھ غلط کاریوں سے آلودہ کرے تو میں تجھے سزا دوں گا تاکہ دوسروں کو اپنا حساب کتاب معلوم ہو جائے۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ "ولی" (سرپرست و محافظ) اور "واق" (نگہدار) اگرچہ معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مشابہ ہیں تاہم ان میں فرق یہ ہے کہ ایک مثبت پہلو کو بیان کرتا ہے اور دوسرا منفی پہلو کو۔ ایک نصرت و مدد کرنے والے کے معنی میں ہے اور دوسرا دفاع اور حفاظت کرنے والے کے معنی میں ہے۔

بعد والی آیت درحقیقت ان مختلف اعتراضات کا جواب ہے کہ جو دشمن آپ پر کرتے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ کہتا تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ پیغمبر نوع بشر میں سے ہو اور اس کی بیوی اور بچے ہوں تو مندرجہ بالا آیت انہیں جواب دیتے ہوئے کہتی ہے: یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہم نے تجھ سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیجے ہیں۔ ان کی بیویاں بھی تھیں اور اولاد بھی (ولقد ارسلنا رسلاً من قبلك وجعلنا لهم ازواجا و ذرية)[1]

---

[1] بعض مفسرین نے اس آیت کے لیے ایک شانِ نزول ذکر کی ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کا جواب ہے جنہوں نے پیغمبر اکرمؐ کی ایک سے زیادہ ازواج پر اعتراض کیا تھا حالانکہ سورہ رعد مکی ہے اور مکہ میں تعدد ازواج کا معاملہ در پیش نہیں تھا۔

ان کے اعتراض سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یا تو تاریخ انبیاء سے ناواقف تھے یا انہوں نے اپنے آپ کو نادانی اور جہالت میں رکھے ہوئے تھے ورنہ یہ اعتراض نہ کرتے۔

دوسرا یہ کہ انہیں توقع تھی کہ وہ جو معجزہ بھی تجویز کریں اور جو بھی ان کی خواہشات کا تقاضا ہو آپ اسے انجام دیں (چاہے وہ ایمان لائیں یا نہ لائیں) لیکن انہیں جاننا چاہیے کہ کوئی رسول حکم خدا کے بغیر کوئی معجزہ پیش نہیں کر سکتا" (وما کان لرسول ان یاتی بایة الا باذن الله)۔

تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا تھا کہ پیغمبر اسلام کیوں آئے ہیں اور انہوں نے تورات یا انجیل کے احکام کو کیوں تبدیل کر دیا ہے کیا یہ آسمانی کتب نہیں ہیں اور خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوئیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا اپنا حکم تبدیل کر دے؟ (یہ اعتراض خصوصاً اس امر سے پوری طرح ہم آہنگ ہے کہ یہودی نسخ احکام کے ناممکن ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے)۔

زیر نظر آیت اپنے آخری جملے میں انہیں جواب دیتی ہے، ہر زمانے کے لیے ایک حکم اور قانون مقرر ہوا ہے (تاکہ بشریت اپنے آخری بلوغ تک پہنچ جائے اور آخری حکم صادر ہو) (لکل اجل کتاب)۔

لہٰذا مقام تعجب نہیں کہ ایک دن وہ تورات نازل کرے، دوسرے دن انجیل نازل کرے اور پھر قرآن۔ کیونکہ انسانی حیات کے لیے مختلف اور گوناگوں پروگراموں کی ضرورت ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "لکل اجل کتاب" ان لوگوں کا جواب ہو جو کہتے ہیں کہ اگر پیغمبر سچ کہتا ہے تو پھر کیوں خدائی عذاب اس کے مخالفین کا قلع قمع نہیں کرتا۔ قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ ہر چیز کا ایک وقت ہے اور کوئی چیز حساب کتاب کے بغیر نہیں ہے۔ سزا اور عذاب کا وقت بھی آ پہنچے گا[1]

جو کچھ گذشتہ آیت کے آخر میں کہا گیا ہے بعد والی آیت اس کے لیے تاکید و استدلال کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ یہ کہ ہر حادثے اور حکم کے لیے ایک معین زمانہ ہے جیسا کہ کہا گیا ہے:

ان الامور مرهونة باوقاتها

اور اگر دیکھتے ہو کہ بعض آسمانی کتب دیگر کتب کی جگہ لیتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا جو چیز چاہتا ہے محو کر دیتا ہے جیسے وہ اپنے ارادے اور حکمت کے تقاضے سے کچھ امور کا اثبات کرتا ہے نیز کتاب اصلی اور ام الکتاب اس کے پاس ہے (یمحوا الله ما یشاء و یثبت و عنده ام الکتاب)۔

آخر میں مزید تاکید کے طور پر ان عذابوں کا ذکر ہے کہ پیغمبر جن کا وعدہ کرتے تھے اور وہ ان کا انتظار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اعتراض کرتے تھے کہ تمہارے وعدے نے عملی شکل کیوں اختیار نہیں کی۔ ارشاد ہوتا ہے، اور بعض امور کہ جن کا ہم نے وعدہ کر رکھا ہے (یعنی تیری کامیابی، ان کی شکست، تیرے پیروکاروں کی رہائی اور ان کے پیروکاروں کی اسارت) ہم تجھے تیری زندگی میں دکھائیں یا ان وعدوں

---

[1] البتہ اس معنی کے مطابق جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے مندرجہ بالا جملے میں تقدیم و تاخیر کا قائل ہونا پڑے گا اور یہ کہنا پڑے گا کہ تقدیر میں "لکل کتاب اجل" تھا (غور کیجیے گا)۔

پر عمل درآمد سے پہلے تجھے اس دنیا سے لے جائیں تیری ذمہ داری بہر صورت ابلاغ رسالت ہے اور ہماری ذمہ داری ان سے حساب لینا ہے (وان ما نرینک بعض الذی نعدھم او نتوفینک فانما علیک البلاغ و علینا الحساب)۔

دو اہم نکات

۱۔ لوحِ محو و اثبات اور ام الکتاب: "یمحوا اللّٰہ مایشاء و یثبت" مندرجہ بالا آیات میں اگرچہ انبیاء پر نزولِ معجزات یا آسمانی کتب کے نازل ہونے کے بارے میں آیا ہے لیکن اس میں ایک عمومی قانون بیان کیا گیا ہے کہ جس کی طرف مختلف منابعِ اسلامی میں بھی اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ تحقق موجودات اور عالم کے مختلف حوادث کے دو مرحلے ہیں۔ ایک مرحلہ قطعیت ہے کہ جس میں کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا (مذکورہ بالا آیت میں "ام الکتاب" اسی کی طرف اشارہ ہے) دوسرا مرحلہ غیر قطعی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ مشروط ہے کہ اس مرحلے میں تبدیلی ممکن ہے لہٰذا اسے مرحلہ محو و اثبات کہتے ہیں۔

کبھی انہیں "لوحِ محفوظ" اور "لوحِ محو و اثبات" بھی کہا جاتا ہے۔ گویا ان میں سے ایک لوح میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور وہ بالکل محفوظ ہے لیکن دوسری میں ممکن ہے کوئی چیز لکھی جائے اور پھر وہ محو ہو جائے اور اس کی جگہ دوسری چیز لکھی جائے

حقیقتِ امر یہ ہے کہ کبھی ایک حادثہ پر ہم اس کے ناقص اسباب کے ساتھ نظر ڈالتے ہیں۔ مثلاً زہرِ قاتل کی طبیعت کا تقاضا ہے کہ انسان کو ختم کر دے، اسے نظر میں رکھتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ جو شخص اسے کھائے گا مر جائے گا مگر اس سے بے خبر ہوتے ہیں کہ اس زہر کے لیے ایک "ضدِ زہر" بھی ہے اگر اس کے بعد اسے کھا لیا تو اس کے اثرات ختم ہو جائیں گے (البتہ ممکن ہے ہم بے خبر تو نہ ہوں لیکن اس "ضدِ زہر" کے بارے میں بات کرنا مناسب نہ سمجھیں)۔

اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ حادثہ یعنی زہر کھانے سے موت، قطعی پہلو نہیں رکھتا یعنی اس مقام پر "لوحِ محو و اثبات" ہے کہ جس میں دوسرے حوادث پر نظر رکھتے ہوئے تغیر ممکن ہے لیکن اگر حادثے کو اس کی علتِ تامہ یعنی مقتضی کے وجود، تمام شرائط کی موجودگی اور تمام موانع کے خاتمے کے ساتھ نظر میں رکھیں (مندرجہ بالا مثال میں زہر کھانے اور "ضدِ زہر" نہ کھانے کے ساتھ نظر میں رکھیں) تو پھر یہاں حادثہ قطعی ہے اصطلاح کے مطابق اس کی جگہ لوحِ محفوظ اور ام الکتاب میں ہے اور اس میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔

یہ بات ایک اور طرح بیان کی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ خدا کے علم کے دو مرحلے ہیں۔ "مقتضیات اور علل ناقصہ کا علم" اور "علل تامہ کا علم"۔ جو دوسرے مرحلے سے مربوط ہے اسے علم الکتاب اور لوحِ محفوظ کہا جاتا ہے اور جو پہلے مرحلے سے مربوط ہے اسے لوحِ محو و اثبات سے تعبیر کرتے ہیں ورنہ آسمان کے کسی گوشے میں کوئی لوح اور تختی نہیں رکھی ہوئی کہ جس پر کوئی چیز لکھی جاتی ہو یا مٹا کر اس پر دوسری چیز لکھی جاتی ہو۔

یہاں سے منابع اسلامی کے مطالعے سے سامنے آنے والے بہت سے سوالات کا جواب دیا جا سکتا ہے کیونکہ کبھی کبھی روایات یا بعض قرآنی آیات میں ہم پڑھتے ہیں کہ فلاں کام فلاں نتیجے کا سبب بنتا ہے لیکن ہم بعض اوقات اس میں ایسا نتیجہ نہیں دیکھتے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ اس نتیجے کا حصول بعض شرائط یا موانع کا حامل ہوتا ہے کہ جو شرط پوری نہ ہونے یا رکاوٹ دور نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہو پاتا۔

نیز بہت سی روایات کہ جو لوحِ محفوظ، لوحِ محو و اثبات اور انبیاء و ائمہ علیہم السلام کے علم کے بارے میں ہیں ان کا مفہوم اس بحث سے واضح ہو جاتا ہے۔ ان میں سے چند روایات ہم بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:

(۱) امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے مندرجہ بالا آیت کے بارے میں رسول اللہؐ سے سوال کیا تو حضورؐ نے فرمایا:

لاقرن عينيك بتفسيرها و لاقرن عين امتي بعدي بتفسيرها الصدقة على وجهها و بر الوالدين و اصطناع المعروف يحول الشقاء سعادة، و يزيد في العمر، و يقي مصارع السوء.

اس آیت کی تفسیر سے میں تیری آنکھوں کو روشن کروں گا اور اسی طرح اپنے بعد اپنی امت کی آنکھوں کو۔ ضرورت مندوں کی صحیح طریقے سے مدد کرنا، ماں باپ سے نیکی کرنا اور ہر اچھے کام کو انجام دینا شقاوت کو سعادت میں بدل دیتا ہے، زندگی کو طولانی کر دیتا ہے اور خطرات سے بچاتا ہے[1]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ سعادت و شقاوت کوئی حتمی اور ناقابل تغیر امر نہیں۔ یہاں تک کہ اگر انسان نے ایسے اعمال انجام دیئے ہوں کہ جن کی وجہ سے بدبختوں کی صف میں شامل ہو تو وہ اپنی جگہ تبدیل کر کے اور نیکیوں کا رُخ کر کے خصوصاً مخلوق خدا کی مدد اور خدمت کر کے اپنی سرنوشت کو بدل سکتا ہے کیونکہ ان امور کا مقام لوحِ محو و اثبات ہے نہ کہ ام الکتاب۔

توجہ رہے کہ جو کچھ مندرجہ بالا حدیث میں آیا ہے وہ مفہوم آیت کا ایک حصہ ہے کہ جو ایک مثال کے طور پر بیان ہوا ہے۔

(۲) امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

من الامور امور محتومة كائنة لا محالة، و من الامور امور موقوفة عند الله، يقدم فيها ما يشاء و يمحو ما يشاء و يثبت منها ما يشاء...

کچھ امور و حوادث حتمی ہیں کہ جو یقیناً رونما ہوتے ہیں اور بعض خدا کے ہاں کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہوتے ہیں وہ جس میں مصلحت دیکھتا ہے اسے مقدم کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثبت کر دیتا ہے[2]

نیز منقول ہے کہ امام علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام فرمایا کرتے تھے:

لو لا اية في كتاب الله لحدثتكم بما كان و ما يكون الى يوم القيامة، فقلت له اية اية فقال قال الله: يمحوا الله ما يشاء و يثبت و عنده ام الكتاب

اگر قرآن میں ایک آیت نہ ہوتی تو میں گزشتہ اور آئندہ قیامت تک کے حوادث کی تمہیں خبر دیتا۔

---

[1] و [2] المیزان جلد ۱۱ صفحہ [illegible]۔

راوی حدیث کہتا ہے: میں نے عرض کیا کہ کونسی آیت ہے تو فرمایا:

خدا فرماتا ہے: یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت وعندہ ام الکتاب[1]

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مختلف حوادث کے متعلق دین کے عظیم راہبروں کے کم از کم کچھ علوم لوح محو و اثبات سے مربوط ہیں اور لوح محفوظ اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ خدا سے مخصوص ہے اور وہ اس کے کچھ حصے کی کہ جس میں مصلحت سمجھتا ہے اپنے خاص بندوں کو تعلیم دے دیتا ہے۔

رمضان المبارک کی راتوں کی دعاؤں میں ہم پڑھتے ہیں:

وان کنت من الاشقیاء فامحنی من الاشقیاء واکتبنی من السعداء

اگر میں شقاوت مندوں میں سے ہوں تو ان میں سے حذف کر کے مجھے سعادت مندوں میں لکھ دے (یعنی مجھے اس کام کی توفیق دے)۔

بہرحال جیسا کہ کہا جا چکا ہے محو و اثبات کا ایک جامع مفہوم ہے۔ شرائط کی تبدیلی اور موانع کی موجودگی کے زیر اثر اس میں ہر قسم کی تبدیلی شامل ہے اور یہ جو بعض مفسرین نے کسی خاص مصداق کی نشاندہی کی ہے مثلاً انہوں نے کہا ہے کہ یہ توبہ کے زیر اثر گناہوں کے محو ہونے یا حالات بدلنے سے روزی کم یا زیادہ ہونے یا اس قسم کے امور کی طرف اشارہ ہے۔۔ ان میں سے ہر بات اسی صورت میں صحیح ہو سکتی ہے جب مراد ایک مصداق بیان کرنا ہو۔

۲۔ بدا کیا ہے؟ شیعہ اور سنی میں جو ایک پیچیدہ سی بحث پیدا ہو گئی ہے وہ مسئلہ بدا کے بارے میں ہے۔

فخر رازی اپنی تفسیر میں زیر بحث آیت کے ذیل میں کہتا ہے:

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ خدا کے لیے بدا جائز ہے اور ان کے نزدیک بدا کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص ایک چیز کا معتقد ہو پھر ظاہر ہو جائے کہ حقیقت اس کے اعتقاد کے برخلاف ہے اور یہ بات ثابت کرنے کے لیے انہوں نے "یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت" کی آیت کا سہارا لیا ہے۔

فخر رازی مزید کہتا ہے:

یہ عقیدہ باطل ہے کیونکہ علم خدا اس کی ذات کے لوازم میں سے ہے اور جو ایسا ہو اس میں تغیر و تبدل محال ہے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسئلہ بدا کے بارے میں شیعہ عقیدہ سے عدم آگاہی اور لاعلمی کے سبب بہت سے اہل سنت بھائیوں نے شیعوں کی طرف ایسی ناروا نسبتیں دی ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے:

لغت میں لفظ "بداء" آشکار ہونے اور پوری طرح واضح ہونے کے معنی میں ہے نیز یہ لفظ پشیمانی کے معنی میں بھی آیا ہے کیونکہ جو شخص پشیمان ہوتا ہے یقیناً اسے کوئی نئی چیز پیش آئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس معنی کے لحاظ سے خدا کے بارے میں بداء کا کوئی مفہوم نہیں اور ممکن نہیں۔ اور کسی عقلمند اور

---

[1] نور الثقلین، جلد ۲ صفحہ ۵۱۲۔

دانا کے لیے ممکن نہیں کہ اُسے یہ احتمال ہو کہ کوئی مطلب خدا سے پوشیدہ ہوتا ہے اور پھر وقت گزرنے سے اس پر آشکار ہو جاتا ہے یہ مسلّم طور پر یہ بات صریح کفر ہے اور کھٹکنے والی ہے۔ اس بات کا لازمی مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذاتِ پاک کی طرف جہالت کی نسبت دی جائے اور اس کی ذات کو محلِ تغیر اور محلِ حوادث سمجھا جائے حاشا وکلا۔ شیعہ امامیہ ذاتِ مقدس پروردگار اور خدائے لایزال کے بارے میں ایسا احتمال ہرگز نہیں رکھتے۔

جس معنی میں شیعہ بداء کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اس پر اصرار کرتے ہیں اور جس کے مطابق روایاتِ اہلبیتؑ میں آیا ہے کہ:

ما عرف اللّٰہ حق معرفتہ من لم یعرفہ بالبداء

جس نے خدا کو بداء کے ساتھ نہیں پہچانا اُس نے ٹھیک طرح سے خدا کو نہیں پہچانا۔

وہ یہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم علل و اسباب کے ظواہر کے مطابق محسوس کرتے ہیں کہ ایک واقعہ وقوع پذیر ہوگا یا کسی پیغمبر کو ایسا واقعہ پیش آنے کی خبر دی گئی حالانکہ ہم بعد میں دیکھتے ہیں ایسا واقع نہیں ہوا تو اس موقع پر ہم کہتے ہیں کہ "بداء" واقع ہوا ہے یعنی جس امر کو ہم واقع شدہ سمجھتے تھے اور اس کے رونما ہونے کو یقینی جانتے تھے اس کے خلاف ظاہر ہوا۔

اس بات کی بنیاد اور اصلی علت وہی ہے جو گزشتہ بحث میں بیان ہو چکی ہے اور وہ یہ کہ بعض اوقات ہماری نگاہ کا تعلق صرف علل ناقصہ سے ہوتا ہے اور ہم شرائط و موانع نہیں دیکھ پاتے اور ہم اس کے مطابق فیصلہ کر لیتے ہیں اور اس کے بعد جب شرط کے فقدان یا مانع کے وجود سے سامنا کرنا پڑتا ہے اور جس کی ہم توقع کر رہے ہوتے ہیں اس کے خلاف واقع ہو جاتا ہے تو پھر ہم ان مسائل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

اسی طرح کبھی پیغمبر یا امام لوحِ محو و اثبات سے آگاہی حاصل کر لیتے ہیں جب کہ یہ طبعاً قابلِ تغیر ہے اور پھر موانع پیش آنے اور شرائط مفقود ہونے کی بناء پر اس طرح رونما نہیں ہوتا۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے نسخ اور "بداء" کا آپس میں موازنہ کرنا چاہیے۔ ہم جانتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کے نزدیک نسخِ احکام جائز ہے۔ یعنی ممکن ہے ایک حکم شریعت میں نازل ہو اور لوگ سمجھیں کہ یہ ابدی حکم ہے لیکن پھر وہ ذاتِ پیغمبر کے ذریعے منسوخ قرار پا جائے اور اس کی جگہ دوسرا حکم آ جائے (جیسے ہم نے تفسیر، فقہ اور حدیث میں قبلہ کی تبدیلی کے بارے میں پڑھا ہے)۔

یہ درحقیقت "بداء" کی ایک قسم ہے لیکن عام طور پر امورِ تشریعی اور احکام و قوانین میں اسے نسخ کہتے ہیں اور امورِ تکوینی میں اس کی نظیر کو "بداء" کا نام دیتے ہیں۔ اسی بناء پر بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ نسخِ احکام ایک قسم کا بداء ہے اور امورِ تکوینی میں بداء ایک قسم کا نسخ ہے۔ کیا کوئی شخص ایسے منطقی امر کا انکار کر سکتا ہے سوائے ایسے شخص کے جو علتِ تامہ اور علتِ ناقصہ کے درمیان فرق نہ کر سکے یا یہ کہ وہ شیعیانِ اہلبیت کے خلاف ہونے والے ہوس پراپیگنڈا کا شکار ہو جائے اور اس کا تعصب اسے اجازت نہ دے کہ شیعہ عقائد کا مطالعہ خود ان کی کتب سے کرے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ فخرالدین رازی نے "یمحوا اللّٰہ ما یشاء و یثبت" کے ذیل میں بداء کے بارے میں شیعوں کے عقیدے کی بات تو کی ہے لیکن اُس نے اس مسئلے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی کہ بداء اسی محو و اثبات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اُس نے تو اپنے مخصوص تعصب کی بناء پر صرف شیعوں پر کڑی نکتہ چینی کی ہے کہ وہ بداء کے قائل کیوں ہیں۔

اجازت دیجیئے کہ مسئلہ بداء کے بارے میں چند ایسے نمونے پیش کیے جائیں کہ جنہیں سب نے قبول کیا ہے۔

(۱) حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ میں ہم نے پڑھا ہے کہ ان کی قوم کی نافرمانی سبب بنی کہ عذاب الٰہی اُن کی طرف آئے اور اس عظیم پیغمبر نے بھی چونکہ انہیں قابلِ ہدایت نہ سمجھا اور انہیں مستحقِ عذاب جانا تو انہیں چھوڑ کر چلے گئے لیکن اچانک "بداء" واقع ہوا۔ اس قوم کے ایک عالم نے جب آثارِ عذاب دیکھے تو انہیں جمع کیا اور توبہ کی دعوت دی۔ سب نے اس کی بات مان لی اور وہ عذاب کہ جس کی نشانیاں ظاہر ہو چکی تھیں ٹل گیا۔

فلولا كانت قرية أمنت فنفعها ايمانها الا قوم يونس لما أمنوا كشفنا عنهم عذاب الخزى فى الحيٰوة الدنيا ومتعناهم الى حين

(یونس ـ ۹۸)

(۲) اسلامی تواریخ میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک دلہن کے بارے میں خبر دی کہ وہ اسی شب زفاف مر جائے گی لیکن وہ آپ کی پیش گوئی کے برخلاف زندہ رہی جب آپ سے ماجرا پوچھا گیا تو فرمایا:

کیا تم نے اس سلسلے میں کوئی صدقہ دیا ہے۔

انہوں نے کہا:

جی ہاں

تو آپ نے فرمایا:

صدقہ حتمی بلاؤں کو دور کر دیتا ہے[1]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے درحقیقت لوحِ محو و اثبات سے ارتباط کی وجہ سے ایسے واقعہ کے رونما ہونے کی خبر دی تھی حالانکہ یہ واقعہ مشروط تھا (شرط یہ تھی کہ اس میں صدقہ کی طرح کا کوئی مانع پیدا نہ ہو) لیکن جب مانع پیدا ہو گیا تو نتیجہ کوئی اور نکل آیا۔

(۳) بہادر بت شکن ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں قرآن میں ہے کہ وہ اسماعیل کو ذبح کرنے پر مامور ہوئے اور اس ماموریت کے بعد اپنے بیٹے کو قربان گاہ میں لے گئے لیکن جب انہوں نے ثابت کر دیا کہ میں پوری طرح آمادہ ہوں تو بداء واقع ہو گیا اور واضح ہو گیا کہ یہ ایک امتحان تھا اس عظیم پیغمبر اور ان کے فرزند ارجمند کی اطاعت و تسلیم کو آزمایا جائے۔

(۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ہے کہ پہلے وہ مامور ہوئے کہ اپنی قوم سے تیس دن تک علیحدہ رہیں اور احکام تورات حاصل کرنے کے لیے خدائی وعدہ گاہ کی طرف جائیں لیکن پھر (بنی اسرائیل کی آزمائش کے لیے) اس مدت کو دس دن بڑھا دیا گیا۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ بداء کے ایسے واقعات کا کیا فائدہ؟

اس سوال کا جواب ان امور میں توجہ کرنے سے ظاہراً مشکل نہیں رہتا جن کا سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے کیونکہ بعض اوقات

---

[1] بحار الانوار، چاپ قدیم، جلد ۲ صفحہ ۱۳۱ از امالی صدوق۔

اہم مسائل مثلاً کسی شخص کی آزمائش، کسی قوم کا امتحان، توبہ اور خدائی بازگشت (جیسے داستانِ یونس میں آیا ہے) صدقہ، حاجتمندوں کی مدد اور نیک کاموں کے زیرِ اثر دردناک حوادث برطرف ہو جاتے ہیں۔ ایسے امور تقاضا کرتے ہیں کہ آئندہ کے واقعات پہلے اس طرح سے منظم ہوں اور پھر شرائط و حالات بدلنے سے وہ بھی بدل جائیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ ان کی سرنوشت خود انہی کے ہاتھ ہے اور روش کی تبدیلی سے وہ اپنی تقدیر بدلنے پر قادر ہیں اور یہ بداء کا بہت بڑا فائدہ ہے (غور کیجئے گا) اور جو ہم نے پڑھا ہے کہ جس شخص نے خدا کو بداء کے ساتھ نہیں پہچانا وہ اس کی پوری معرفت نہیں رکھتا، یہ بھی انہی حقائق کی طرف اشارہ ہے اسی لیے ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا،

ما بعث الله عزوجل نبيًا حتى يأخذ عليه ثلاث خصال الاقرار بالعبودية، وخلع الانداد، وان الله يقدم ما يشاء ويوخر ما يشاء

خدا نے کسی پیغمبر کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس سے یہ تین پیمان لیے۔ پروردگار کی بندگی کا اقرار، ہر قسم کے شرک کی نفی اور یہ کہ خدا جس چیز کو چاہتا ہے مقدم کرتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے مؤخر کرتا ہے [1]

حقیقت میں پہلا پیمان خدا کی اطاعت اور اس کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے سے مربوط ہے دوسرا عہد شرک کے خلاف قیام کرنے سے متعلق ہے اور تیسرا مسئلہ بداء سے مربوط ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ حالات تبدیل کر کے اپنے آپ کو لطفِ الٰہی یا عذابِ خدا کا حقدار بنا لیتا ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا پہلوؤں کی بناء پر علماء شیعہ نے کہا ہے کہ جب "بداء" کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے تو یہ "ابداء" کے معنی میں ہوتی ہے یعنی کسی ایسی چیز کو ظاہر کر دینا جو پہلے ظاہر نہ ہوا اور جس کی پیشین گوئی نہ کی جا سکتی ہو۔

لیکن — شیعوں کی طرف یہ نسبت دینا کہ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا کبھی کبھی اپنے کام پر پشیمان ہو جاتا ہے یا کسی ایسی چیز سے باخبر ہو جاتا ہے جس سے پہلے آگاہ نہ ہو — یہ بہت بڑی زیادتی ہے اور ایسی تہمت ہے جسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔

اسی لیے آئمہ معصومین علیہم السلام سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا،

من زعم ان الله عزوجل يبدو له فى شىء لم يعلمه امس فابرؤا منه

جو شخص یہ گمان کرے کہ خدا پر کوئی ایسی چیز آج آشکار ہوتی ہے جسے وہ کل نہیں جانتا تھا تو ایسے شخص سے بیزاری اختیار کرو [2]

---

[1] اصولِ کافی جلد ۱ صفحہ ۱۱۴، سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۶۱۔

[2] سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۶۱۔

۴۱- أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۚ وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ○

۴۲- وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا ۖ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۗ وَسَيَعْلَمُ الْكُفَّارُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ○

۴۳- وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ○

ترجمہ

۴۱- کیا تم نے دیکھا نہیں کہ ہم ہمیشہ زمین کے اطراف (وجوانب) کو کم کرتے رہتے ہیں (معاشرے، تمدن اور علماء تدریجاً ختم ہوتے رہتے ہیں) اور خدا حکومت کرتا ہے اور کسی شخص کو اسے روکنے یا اس کے احکام رد کرنے کا یارا نہیں اور وہ سریع الحساب ہے۔

۴۲- وہ لوگ جنہوں نے ان سے پہلے سازشیں کیں اور منصوبے بنائے لیکن منصوبہ بنانا تو خدا کا کام ہے کہ جو ہر شخص کے کام سے آگاہ ہے اور عنقریب کفار جان لیں گے کہ دوسرے گھر میں (نیک و بد) انجام کس کا ہے۔

۴۳- جو کافر ہو گئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ تو رسول نہیں ہے۔ کہہ دے کہ خدا اور وہ لوگ کہ جن کے پاس علم کتاب (اور قرآن کی آگاہی) ہے (میری) گواہی کے لیے کافی ہیں۔

تفسیر

انسان اور معاشرے ختم ہو جاتے ہیں، خدا باقی رہتا ہے

گزشتہ آیات میں سخن رسول اللہ کی رسالت کے منکرین کی طرف تھا۔ ان آیات میں اس بحث کو جاری رکھا گیا ہے۔ متعدد یہ ہے

کہ انہیں تنبیہ کی جائے، انہیں بیدار کیا جائے، ان کے سامنے استدلال کیا جائے الغرض مختلف طریقوں سے انہیں عقل راہ پر لگا کر غور و فکر کرنے اور پھر اپنی حالت کی اصلاح کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

پہلا ارشاد ہوتا ہے ان مغرور اور ہٹ دھرم افراد نے دیکھا نہیں کہ ہم مسلسل زمین کے اطراف و جوانب کو کم کرتے رہتے ہیں (اولم یروا انا نأتی الارض ننقصها من اطرافها)۔

واضح ہے کہ زمین سے یہاں مراد اہلِ زمین ہیں۔ یعنی کیا وہ اس واقعیت کی طرف نگاہ نہیں کرتے کہ ہمیشہ اقوام، تمدن اور حکومتیں زوال پذیر ہوتی ہیں۔ وہ قومیں کہ جو ان سے زیادہ قوی تھیں، زیادہ طاقتور تھیں اور زیادہ سرکش تھیں، ان سب نے اپنے منہ مٹی میں چھپا لیے، یہاں تک کہ علماء، بزرگ اور دانشور کہ جو زمین کا سہارا تھے انھوں نے بھی اس جہان سے آنکھیں بند کر لیں اور ابدیت کے ساتھ وابستہ ہوگئے کیا یہ ہمہ گیر قانونِ حیات کہ جو تمام افراد، تمام انسانی معاشروں اور ہر چھوٹے بڑے پر جاری و ساری ہے ان کے بیدار ہونے کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ اس چند روزہ زندگی کو ابدی نہ سمجھیں اور اسے غفلت میں نہ گزار دیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے، حکومت اور فرمان جاری کرنا خدا کے لیے ہے اور کسی شخص میں اس کے فرمان کو رد کرنے اور اسے روکنے کا یارا نہیں ہے (واللّٰہ یحکم لا معقب لحکمہ) اور وہ سریع الحساب ہے (وھو سریع الحساب)۔

اس بناء پر ایک طرف تو اس نے تمام افراد اور سب قوموں کی پیشانی پر قانونِ فنا رقم کر دیا ہے اور دوسری طرف کسی کی مجال نہیں کہ اس فرمان کو یا خدا کے دوسرے فرامین کو بدل سکے اور تیسری طرف وہ بندوں سے بڑی تیزی سے حساب لیتا ہے اور اس طرح سے اس کی جزاء قطعی ہے

کئی ایک روایات کہ جو تفسیر برہان، نور الثقلین، دیگر تفاسیر اور کتب حدیث میں آئی ہیں ان میں زیرِ نظر آیت کی تفسیر علماء اور دانشمند بیان کی گئی ہے کیونکہ ان کا فقدان زمین اور اسلامی معاشرے میں کمی اور نقصان کا سبب بنتا ہے۔

مفسرِ بزرگ طبرسی اس آیت کی تفسیر میں امام صادق علیہ السلام کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں:

ننقصها بذهاب علمائها، و فقهائها و خیار اهلها

ہم زمین میں اس کے علماء، فقہا اور نیک لوگوں کے چلے جانے سے کمی واقع کریں گے [1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ جس وقت حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام شہید ہوئے تو عبداللہ بن عمر نے یہ آیت پڑھی:

انا نأتی الارض ننقصها من اطرافها

اس کے بعد کہا:

یا امیر المؤمنین لقد کنت الطرف الاکبر فی العلم، الیوم نقص علم الاسلام و مضی رکن الایمان

اے امیرالمومنین آپ عالم انسانیت میں علم کی بہت بڑی طرف تھے۔ آپ کی شہادت سے آج اسلام کا علم و دانش

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۳۰۱

نقصان کی طرف جھک گیا اور ایمان کا ستون گر گیا[1]

البتہ ـــــ جیسا کہ ہم نے کہا ہے آیت کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ اس میں ہر قسم کا نقصان اور کمی شامل ہیں چاہے وہ افراد ہوں، یا معاشرے یا بطور کلی اہل زمین۔ یہ تمام لوگوں کے لیے جرس بیداری ہے چاہے وہ نیک ہوں یا برے حتیٰ کہ علماء اور دانشمندوں کے لیے بھی کہ جو انسانی معاشروں کے ستون ہیں جب کہ ان میں سے کسی ایک کے چلے جانے سے پوری دنیا کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہ سب کے لیے بولتی ہوئی اور ہلا دینے والی صدائے ہوشیار باش ہے۔

باقی رہا یہ کہ بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ زمین کے نقصان سے مراد کفار کی زمینوں کا کم ہونا اور مسلمان علاقوں میں اضافہ ہونا ہے اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی یہ معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اس وقت تو ایسی فتوحات نہیں تھیں کہ کفار جنہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور قرآن ان کی طرف اشارہ کرتا۔

نیز یہ جو بعض مفسرین کہ جو علوم طبیعی میں مستغرق ہیں وہ زیر نظر آیت کو قطبین کی طرف سے زمین کے کم ہونے اور استوائی جانب سے زیادہ ابھرنے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، بہت بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ قرآن کی زیر نظر آیت میں یہ چیز بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔

بعد والی آیت میں اسی بحث کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا گیا ہے، صرف یہی گروہ نہیں کہ جو سازشوں اور مکر و فریب کے ساتھ تمہارے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ہے بلکہ ان سے پہلے والے بھی سازشیں اور مکاریاں کیا کرتے تھے" (وقد مکر الذین من قبلھم)۔

لیکن ان کے منصوبے نقش بر آب ہو گئے اور ان کی سازشیں حکم خدا سے بے اثر ہو کر رہ گئیں کیونکہ وہ ہر شخص کے حالات خود اس سے بہتر جانتا ہے بلکہ تمام منصوبے خدا کے لیے ہیں" (فللہ المکر جمیعًا) وہ ہے کہ جو ہر شخص کے کسب و کار سے آگاہ ہے اور "وہ جانتا ہے کہ ہر شخص کیا انجام دیتا ہے" (یعلم ما تکسب کل نفس)۔

اور پھر تہدید کے لہجے میں انہیں ان کے انجام کار سے ڈراتے ہوئے فرمایا گیا ہے، کفار بہت ہی جلد جان لیں گے کہ انجام کار اور نیک و بد عاقبت دوسرے جہان میں کس کس کے لیے ہے (وسیعلم الکفار لمن عقبی الدار)۔

جس طرح سے یہ سورت قرآن اور کتاب اللہ کے ذکر سے شروع ہوئی تھی اسی طرح زیر بحث آخری آیت میں قرآن کے معجزہ ہونے پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے اور اسی پر سورہ رعد ختم ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، یہ کافر کہتے ہیں کہ تو رسول نہیں ہے (ویقول الذین کفروا لست مرسلًا) یہ لوگ ہر روز ایک نیا بہانہ تراشتے ہیں، ہر وقت معجزے کا تقاضا کرتے ہیں اور پھر بھی انکار کرتے ہیں کہ تو پیغمبر نہیں ہے۔

ان کے جواب میں کہو، یہی کافی ہے کہ دو ہستیاں میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہیں ایک اللہ اور دوسرا وہ کہ جس کے پاس کتاب کا علم اور قرآن کی آگہی موجود ہے (قل کفٰی باللہ شھیدًا بینی وبینکم ومن عندہ علم الکتاب)۔

ایک تو خود خدا جانتا ہے کہ میں اس کا بھیجا ہوا ہوں اور دوسرے وہ لوگ کہ جو میری اس آسمانی کتاب یعنی قرآن کے بارے میں کافی آگاہی رکھتے ہیں وہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کتاب انسانی دماغ کی ساختہ نہیں ہے اور ممکن نہیں ہے کہ خدائے بزرگ کے سوا کسی اور کی ہو۔ یہ بھی مختلف پہلوؤں سے قرآن کے اعجاز ہونے کے بارے میں ایک تاکید ہے۔ اس کی تفصیل ہم دیگر مقامات پر خصوصاً کتاب "قرآن کا اعجاز

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۳۰۱۔

پیام بر" میں بیان کر چکے ہیں۔

جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے اس کی بناء پر "من عندہ علم الکتاب" سے مراد مضامین قرآن مجید سے آگاہ افراد ہیں۔ لیکن بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ اہل کتاب کے علماء کی طرف اشارہ ہے۔

بہت سی روایات میں آیا ہے کہ "من عندہ علم الکتاب" سے مراد حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام اور دیگر آئمہ ہدیٰ علیہم السلام ہیں۔ اس سلسلے کی روایات تفسیر نور الثقلین اور تفسیر برہان میں جمع کر دی گئی ہیں۔

لیکن یہ روایات اس بات کی دلیل نہیں کہ مفہوم آیت اسی پر منحصر ہے۔ جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ یہ ایک مصداق یا مصادیق تام کی طرف اشارہ ہیں۔ بہرحال یہ روایات پہلی تفسیر کہ جسے ہم نے انتخاب کیا ہے کی تائید کرتی ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ہم اپنی گفتگو پیغمبر اکرمؐ سے منقول ایک روایت پر ختم کریں۔

ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبر گرامی سے "قال الذی عندہ علم من الکتاب" (اس شخص نے کہا کہ جس کے پاس کتاب میں سے علم تھا)[1] کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

ذاك وصی اخی سلیمان بن داؤد

وہ میرے بھائی سلیمان بن داؤد کا وصی اور جانشین تھا۔

ابو سعید کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: "قل کفی باللہ شھیدا بینی و بینکم و من عندہ علم الکتاب" کس کے بارے میں ہے اور کس کی طرف اشارہ ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا:

ذالك اخی علی بن ابی طالب

وہ میرے بھائی علی بن ابی طالب ہیں[2]

پروردگارا! اپنی رحمت کے دروازے ہم پر کھول دے اور اپنی کتاب کا علم ہم پر ارزانی فرما۔

بارالہٰا! قرآن کی آگہی سے ہمارے دل اس طرح سے روشن اور ہماری فکر کو ایسا توانا بنا کہ ہم تجھے چھوڑ کر تیرے غیر کی طرف نہ جائیں کسی چیز کو تیری مشیت پر مقدم نہ کریں، خود غرضیوں، تنگ نظریوں اور خود بینیوں کے تنگ و تاریک گڑھوں میں نہ گریں، تیرے بندوں کے درمیان تفرقہ نہ ڈالیں، اپنے اسلامی انقلاب کو خطرے کی طرف کھینچ نہ لے جائیں اور اسلام، قرآن اور ملت اسلامی کی مصلحتوں کو سب چیزوں پر مقدم رکھیں۔

خداوندا! عراق کے ظالم حکام کو خواب غفلت سے بیدار کر کہ جنہوں نے یہ خانماں سوز، ویران گر اور تباہ کن جنگ دشمنان اسلام کی تحریک سے ہم پر مسلط کی ہے اور اگر وہ بیدار ہونے والے نہیں تو انہیں نابود فرما اور ہمیں اپنی کتاب کے زیر سایہ آگاہی عطا فرما کہ جس سے

---

[1] یہ آیت حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ کے ضمن میں ہے۔

[2] المیزان جلد ۱۱ صفحہ ۴۲۶۔

ہم حق وعدالت کے دشمنوں پر کامیابی کے لیے تمام جائز اور ممکنہ وسائل سے استفادہ کریں۔

آمین یارب العالمین

سورہ رعد کی تفسیر اختتام پذیر ہوئی ہے

ادارہ امامیہ قرأت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآن پاک (تفسیر نمونہ جلد ۵)
کا یہ نسخہ از حمد تا والناس بغور پڑھا ہے
تسلی ہے کہ کتابت کی غلطیوں کے لحاظ سے
بالکل غلط نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب
حافظ محمد طفیل (شمس العلماء فاضل)
منتظم / مہتمم
امامیہ قرآت کالج
اندرون موچی دروازہ۔ لاہور

اشاریے سے پہلے

زیرِ نظر اشاریہ تفسیرِ نمونہ کے قارئین اور محققین کی سہولت کے لیے خود مصباح القرآن ٹرسٹ نے مرتب کروایا ہے۔

یاد رہے کہ فارسی کی اصل اشاعتوں میں اشاریہ موجود نہیں ہے۔ اس طرح مصباح القرآن ٹرسٹ کو اس سلسلے میں پہل کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہو رہا ہے۔

ہماری کوشش ہوگی کہ آئندہ دیگر جلدوں کی اشاعتوں میں بھی اشاریہ شامل کرکے انہیں مفید تر بنایا جائے۔

اشاریوں کی عام روِش سے ہٹ کر زیرِ نظر اشاریہ میں تفسیر میں موجود قرآنی لغت کے زیادہ دِقت طلب الفاظ کو بھی شامل کردیا گیا ہے۔ جن کتابوں سے مؤلفِ محترم نے استفادہ کیا ہے ان کی تفصیلی فہرست بھی پیش کردی گئی ہے۔

عالمِ پیری میں یہ کٹھن اور پُرزحمت کام محترم سید شکیل حسنین موسوی نے انجام دیا ہے۔ خُدا تعالیٰ اُن کی توفیقات میں اضافہ کرے اور انہیں خدمتِ اسلام اور قرآن کے لیے طولِ عمر سے نوازے۔

آپ کی آراء اور تنقید اس سلسلے کو بہتر اور مؤثر بنانے کے لیے مُفید ثابت ہوسکتی ہے۔

انچارج
شعبۂ تصحیح و ترتیب
مصباح القرآن ٹرسٹ

[illegible]

اشاریہ

تفسیر نمونہ ——— جلد ۵

ترتیب و تزئین ----- سید شکیل حسین موسوی
----- سید محمد حسین زیدی الباھروی

مضامین:

اُصول و عقائد

(توحید)

اسمائے باری تعالیٰ

عدل

نبوت

امامت

قیامت

معجزہ

اخلاقیات

اخلاق حسنہ

اخلاق سیئہ

اقوامِ سابقہ

(قوم فرعون)

حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کا قوم فرعون سے جہاد

قوم ثمود

قوم شعیب (اصحابِ مدین)

قوم عاد

قوم لوطؑ

قومِ یونسؑ

قومِ نوحؑ

کفار

حضرت ابراہیم علیہ السلام

ابن سیرین

ابو عقیلؓ انصاری

زلیخا

سلمان فارسیؓ

حضرت شعیبؑ

شیطان

حضرت صالح علیہ السلام

عبداللہ بن عباسؓ

عبداللہ بن عمرؓ

حضرت علی ابن ابیطالبؑ

حضرت علی ابن الحسینؑ (امام چہارم)

حضرت علی ابنِ موسیٰ رضا (امام ہشتم)

عمر بن لحی

علی بن یقطین

حضرت لوط علیہ السلام

حضرت محمدؐ ابن عبداللہ (ختم المرسلینؐ)

حضرت امام محمد باقرؑ (امام پنجم)

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ (امام ہفتم)

مؤمنِ آلِ فرعون

حضرت نوحؑ

علماء و دانشور

اشرافی قدس سرہ

حاکم نیشاپوری

حموینی

خوارزمی

راغب (صاحب مفردات)

سوئیڈی (ماہر نباتات)

طباطبائی (صاحب المیزان) طبرسی (تفسیر مجمع البیان)

طبرسی

فخر الدین رازی

قرطبی (صاحب جامع الاحکام)

مغازلی

کتبِ آسمانی

قرآنِ مجید

کتبِ تفسیر و تاریخ و سیر

لغاتِ قرآن

(ا)

(ب)

(ح)

(خ)

(د)

(ذ)

(ر)

(غ)

(ف)

(ق)

(ک)

(ل)

(م)

(غ)

(ف)

(ق)

(ک)

(ل)

(م)

(ن)

(و)

(ی)

متفرق موضوعات

آباؤ اجداد کا مذہب

اتباع کے لائق کون ہے؟

آخر کار لطفِ الٰہی اپنا کام کریگا

ارادہ کی آزادی

اسباقِ عبرت

استعمار کا مفہوم

استغفار

آسمان، زمین، سبزہ زار اللہ کی نشانیاں ہیں

ایمان

بُت پرست گمان کی پیروی کرتے ہیں

بُت پرستی کس لیے؟

بُتوں کو خدا کا شریک بناتے ہو؟

بدبخت و سعادت مند گروہ

برادرانِ یوسفؑ

بروقت ایمان

صبرِ جمیل کیا ہے

صبر کی اہمیت

طبقاتی تفاوت

طوعاً و کرہاً سے کیا مراد ہے

طوفانِ نوحؑ

طوفانِ نوحؑ میں درسِ عبرت

ظالم

ظالمین

عربی زبان کی اہمیت

عزیزِ مصر کا محل اور تعبیرِ خواب

عظمتِ الٰہی کی نشانیاں

علمِ الٰہی کے تین پہلو

علمِ تعبیرِ خواب

علمِ خدا کی طرف توجہ کے تربیتی آثار

علمِ غیب

غافل اور بے ایمان افراد

غلہ کی قیمت کیوں واپس کردی

فاسقین

فضل اور رحمت میں فرق

قانون بنانے کا حق صرف اللہ کو ہے

کشتی نوحؑ

کفار

کوہ جودی

کیا خدا کی خالقیت جبر و اکراہ کی دلیل ہے؟

کیا خدا لوگوں کو گمراہ کرتا ہے؟

کیا دل احساسات کا مرکز ہے؟

کیا رسُول پاکؐ کو شک تھا؟

کیا غیر خدا کو سجدہ جائز ہے؟

گناہ و سزا میں عدم مساوات

گناہوں کی نیکیوں کے ذریعہ تلافی

گواہ کون تھا؟

لقائے الٰہی کا مفہوم

"لِکُلِّ قَوْمٍ هَادٍ" سے کیا مراد ہے؟

لواطت کی حرمت کا فلسفہ

لوحِ محو و اثبات اور امّ الکتاب

مستکبرین

مسئلہ بداء کیا ہے؟

مصر میں زوجۂ عزیز کے عشق کا چرچا

مشرکین

معاشرہ کی پاکیزگی نہ کہ انتقام

معاشرے کیوں تباہ ہوئے؟

معقبات کیا ہیں؟

مکتب و مسلک کے اثرات

"موجودات کا سجدہ کرنا" سے کیا مراد ہے؟

منافقین

مؤمنین

ناقۂ صالحؑ

نزول عذاب کے وقت توبہ قبول نہ ہوگی

نشان زدہ پتھر

نصرتِ الٰہی سے یوسفؑ کی بیگناہی تک

نفس

نوحؑ کے بیٹے کا دردناک انجام

ہر چیز کی ایک حد و مقدار ہے

ہر قوم کے لیے ہادی ہے، یہ معجزہ کا جواب کیسے؟

ہماری ہر کیفیت کی نگرانی ہو رہی ہے

یوسفؑ کی قمیص کون لے کر گیا

یہ دعویٰ دار عام طور پر مشرک ہیں

مقامات

سدوم

شام

فلسطین

کنعان

کوہِ جودی

مدین

مصر

نینوا

مطبوعات مصباح القرآن ٹرسٹ

انوار القرآن MQT 208/1	ترجمہ و حواشی علامہ سید ذیشان حیدر جوادی	250/- روپے
انوار القرآن (سادہ) MQT 208/2	ترجمہ و حواشی علامہ سید ذیشان حیدر جوادی	300/- روپے
انوار القرآن (سادہ گلٹ) MQT 208/3	ترجمہ و حواشی علامہ سید ذیشان حیدر جوادی	350/- روپے
انوار القرآن (سادہ) MQT 208/4	ترجمہ و حواشی علامہ سید ذیشان حیدر جوادی	400/- روپے
انوار القرآن (سادہ گلٹ) MQT 208/5	ترجمہ و حواشی علامہ سید ذیشان حیدر جوادی	450/- روپے
انوار القرآن (آرٹ پیپر) MQT 208/6	ترجمہ و حواشی علامہ سید ذیشان حیدر جوادی	750/- روپے
انوار القرآن (عکسی ایڈیشن) MQT 208/7	ترجمہ و حواشی علامہ سید ذیشان حیدر جوادی	850/- روپے
قرآن الکریم (کمپیوٹر) MQT 209/1	ترجمہ و حواشی علامہ سید صفدر حسین نجفی	250/- روپے
قرآن الکریم (سادہ) MQT 209/2	ترجمہ و حواشی علامہ سید صفدر حسین نجفی	300/- روپے
قرآن الکریم (سادہ گلٹ) MQT 209/3	ترجمہ و حواشی علامہ سید صفدر حسین نجفی	350/- روپے
قرآن الکریم (آفسٹ پیپر) MQT 209/4	ترجمہ و حواشی علامہ سید صفدر حسین نجفی	500/- روپے
قرآن الکریم (عکسی ایڈیشن) MQT 209/5	ترجمہ و حواشی علامہ سید صفدر حسین نجفی	600/- روپے
قرآن حکیم MQT 210/1	ترجمہ و حواشی علامہ سید مبارک حسین النقوی	350/- روپے
قرآن پاک (کمپیوٹر) MQT 211/1	ترجمہ و حواشی علامہ سید علی نقی النقوی	250/- روپے
قرآن پاک (سادہ) MQT 211/2	ترجمہ و حواشی علامہ سید علی نقی النقوی	300/- روپے
قرآن پاک (سادہ) MQT 211/3	ترجمہ و حواشی علامہ سید علی نقی النقوی	350/- روپے
قرآن پاک (آرٹ پیپر) MQT 211/4	ترجمہ و حواشی علامہ سید علی نقی النقوی	600/- روپے
قرآن پاک (عکسی ایڈیشن) MQT 211/5	ترجمہ و حواشی علامہ سید علی نقی النقوی	700/- روپے
قرآن پاک (کمپیوٹر) MQT 213/1	ترجمہ مولانا حافظ سید فرمان علی	250/- روپے
قرآن پاک (سادہ) MQT 213/2	ترجمہ مولانا حافظ سید فرمان علی	300/- روپے
قرآن پاک (سادہ گلٹ) MQT 213/3	ترجمہ مولانا حافظ سید فرمان علی	350/- روپے
قرآن پاک (سادہ گلٹ) MQT 213/4	ترجمہ مولانا حافظ سید فرمان علی	400/- روپے
قرآن پاک (آرٹ پیپر) MQT 213/5	ترجمہ مولانا حافظ سید فرمان علی	900/- روپے
قرآن پاک (عکسی ایڈیشن) MQT 213/6	ترجمہ مولانا حافظ سید فرمان علی	1000/- روپے
قرآن پاک (عکسی ایڈیشن) MQT 214/7	ترجمہ مولانا حافظ سید فرمان علی	3000/- روپے
قرآن پاک (پاکٹ سائز)	ترجمہ مولانا حافظ سید فرمان علی	100/- روپے
تفسیر نمونہ جدید (15 جلدیں)	مترجم علامہ سید صفدر حسین نجفی	200/- روپے فی جلد
تفسیر موضوعی (10 جلدیں)	ترجمہ علامہ سید صفدر حسین نجفی	150/- روپے فی جلد
تفسیر فصل الخطاب (7 جلدیں)	ترجمہ علامہ سید علی نقی النقوی	200/- روپے فی جلد
تفسیر پیام قرآن (6 جلدیں)	ترجمہ علامہ سید صفدر حسین نجفی	150/- روپے فی جلد
میزان الحکمت (8 جلدیں)	آیت اللہ محمدی ری شہری	300/- روپے فی جلد

کتاب	مصنف / مترجم	ہدیہ
انوار القرآن	ترجمہ و حواشی مولانا ذیشان حیدر جوادی	ہدیہ ۲۰۰ روپے
میزان الحکمت (جلد اول)	ترجمہ مولانا محمد علی فاضل	ہدیہ ۲۵۰ روپے
تاریخ قرآن	ڈاکٹر محمود رامیار	ہدیہ ۱۵۰ روپے
قرآن اہلبیت کی نظر میں	جعفر الہادی ترجمہ شفا نجفی	ہدیہ ۲۰ روپے
قرآن فہمی	استاد مطہری شہید ترجمہ سید انوار احمد بلگرامی	ہدیہ ۱۵ روپے
معاد قرآن کی نظر میں	آیت اللہ مظاہری ترجمہ 〃	ہدیہ ۲۵ روپے
مدینۃ العلم (ارشادات پیغمبر اکرمؐ)	ترجمہ سید جاوید جعفری	ہدیہ ۲۰ روپے
خطبہ مونقہ (ارشادات علیؑ ابن ابی طالب)	〃	ہدیہ ۱۰ روپے
اسلام میں مقام قرآن و عترت	ترجمہ سید محمد حسین زیدی	ہدیہ ۳۰ روپے
صحیفہ پنجتن پاک	آغا حسن رضا غدیری	ہدیہ ۲۰ روپے
تحفۃ الابرار	〃	ہدیہ ۱۵ روپے
رد دہریت	کیپٹن فہیم رضا	ہدیہ ۲۵ روپے
اسلامی اقتصادیات	حافظ سید ریاض حسین نجفی	ہدیہ ۱۵ روپے
آئین تربیت	ترجمہ ثاقب نقوی، قیصر عباس	ہدیہ ۴۰ روپے
خلاصہ الغدیر	مولانا رضی جعفر نقوی	ہدیہ ۲۵ روپے
مسئلہ خمس	مولانا ابن حسن نجفی	ہدیہ ۲۵ روپے
تعلیمات اسلام	مولانا شیخ علی مدد نجفی	ہدیہ ۱۵ روپے
خاندان اور انسان	مولانا ذیشان حیدر جوادی	ہدیہ ۲۵ روپے
توحید القرآن	مولانا محمد ہاشم زنگی پوری	ہدیہ ۵۰ روپے
شیعہ اور تحریف قرآن	آقائے علی میلانی	ہدیہ ۲۵ روپے
مبانی حکومت اسلامی	آیت اللہ جعفر سبحانی	ہدیہ ۴۰ روپے
میراث انبیاء	سید مجتبیٰ حسین	ہدیہ ۴۰ روپے
معاد	آقائے محمد تقی فلسفی	ہدیہ ۱۰۰ روپے